

# دل پھولوں کی بستی



نگہت عبداللہ



نگہت عابدی

خواتین ڈائجسٹ  
اردو بازار کراچی

## دل پھولوں کی بستی

صبح کے لیے کپڑے استری کرتے ہوئے اُس نے اچانک جھجھانے والی خاموشی کو محسوس کیا اور بالکل غیر ارادی طور پر سراونچا کر کے جھپٹ کو دیکھنے لگی۔ اصل میں سارا ہنگامہ اوپر برہا تھا اور یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہی بڑے بیٹا اور بھائی کا آپس کا جھگڑا جس نے سارے گھر کا سکون غارت کر رکھا تھا۔ اور دونوں میں سے کسی کو احساس نہیں تھا حالانکہ شادی کو نو دس سال ہو چکے تھے۔ ایک ہی پختہ فیملی جو کہ سات آٹھ سال کا تھا۔ اُس کی خاطر بھی دونوں آپس میں سمجھوتا کرنے کو تیار نہیں تھے۔ بڑے بیٹا اپنی ضد پر اڑے ہوئے تھے اور بھائی اپنی ضد چھوڑنے کو تیار نہیں تھیں۔ اماں جی اور ابا جی بھائی کو تو کچھ نہیں کہتے تھے البتہ بڑے بیٹا کو سمجھانے میں انہوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اور بتا نہیں کیوں ماں باپ کی ہر بات پر سر جھکانے والے بڑے بیٹا ایک یہی بات ماں کے نہیں دے رہے تھے۔ سر جھکا کر عاجزی سے کہتے۔

”ابا جی! آپ اس معاملے میں نہیں بولیں“

حالانکہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ اصل میں بھائی بہت بڑے گھر کی تھیں۔ زمانہ طالب علمی میں ہی غالباً ان کی بھینا کے ساتھ انڈرائیٹنگ ہو گئی تھی اور شادی کا پیغام بھی ان کی ہی طرف سے آیا تھا اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ بڑے بیٹا تھے ہی بہت لائق خالق۔ مخلصی اور بہت ہندو ستم۔ اس کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کو بھی بہت اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ماں باپ۔ ان سے چھوٹے بین بھائی، غلیل، شکیل، عدیل اور ایک بہن آسیہ۔ گو کہ اُس وقت ابا جی بھی ملازمت کرتے تھے اور ڈیڑھ دو سال میں ان سے چھوٹے غلیل بھی ابا کا سہارا بننے والے تھے۔ ایسے میں اگر بیٹا چاہتے تو اپنا الگ گھر بسا سکتے تھے لیکن ایک توان میں خود غریبی نہیں سمجھتی دوسرے انہیں ماں باپ بہن بھائیوں کا خیال بھی تھا اور خصوصاً اپنے بھائیوں کے لیے وہ مثال بننا چاہتے تھے۔ یعنی اُن کے خیال میں اگر آج وہ اپنا گھر بسا کر الگ ہو گئے تو اپنی باری آتے پر اُن کے بھائی بھی ایسا ہی کریں گے اور آخر میں اُن کے ماں باپ اکیلے رہ جائیں گے۔

گو یاد دہانہ شی سے سوچتے ہوئے انہوں نے ہیلہ بھائی کو شادی سے پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ وہ کسی قیمت پر اپنے ماں باپ اپنا گھر نہیں چھوڑیں گے اور اس وقت یقیناً محبت پوری خداتوں پر تھی۔ جب ہی ہیلہ بھائی نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی بلکہ بڑے بیٹا سے وعدہ کیا کہ وہ ہیشاُن کے ساتھ اسی گھر میں خوش رہیں گی اور بس ابتدائی چند ماہ ہی انہوں نے ہنسی خوشی گزارے تھے اس

کے بعد انہیں یہ گھر بہت چھوٹا لگنے لگا۔ پہلے دیے لفظوں میں پھر واضح الفاظ میں کہ وہ یہاں نہیں رہ سکیں۔ یہاں ان کا دم گھٹتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

اُس وقت وہ یعنی اسیا صلاح الدین کافی چھوٹی تھی۔ غالباً ساتویں آٹھویں میں پڑھتی تھی تب اُسے نیند بھائی کا روز روز واد ملنا چاہا اور بڑے عیشا کو تنگ کرنا سخت برا لگتا تھا اور اب جبکہ وہ میڈیکل کے آخری سال میں تھی تو اُسے بڑے عیشا پر غصہ آتا تھا کہ آخر وہ نیند بھائی کی بات مان کیوں نہیں لیتے۔ خواجہ اپنا اپنی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ کم از کم نیند کا ہی خیال کر لیں۔ بے جا راجہ پھر ہر روز کے جھگڑوں سے کیسا سہم کر رہ گیا ہے۔ نیند بھائی کے بچوں کی طرح شرارتی ہے۔ ان کی طرح ہنستا کھیلتا ہے پتا نہیں پڑھائی میں کیسا ہے۔

وہ سوچتے ہوئے استری شدہ کپڑے پہن کر رہی تھی کہ میمونہ بھائی دروازے سے جھانک کر آہستہ آواز میں پوچھنے لگیں۔

”اے۔ چائے پیو گی؟“  
اُس نے چونک کر دیکھا اور اُن کے سر گوشانہ انداز پر ہنس کر کہہ دی۔

”مذہب یوں گی لیکن کیا چائے پینے پر پابندی لگ چکی ہے؟“

”نہیں تو۔“ میمونہ بھائی کا انداز نہ سمجھنے والا تھا۔

”پھر اپنی رازداری سے کیوں پوچھ رہی ہیں؟“

”ابھی بتائی ہوں، پہلے چائے لے لوں۔“ میمونہ بھائی کہتے ہوئے وہیں سے پلٹ گئیں۔ کچھ دیر بعد دو گگ لے کر آئیں اور انک اُسے ہنسا کر کہنے لگیں۔

”جیسے تم رازداری کہہ رہی ہو وہ خوف ہے۔“

”کیسا خوف؟“  
”وہ تو سننا نہیں تم نے۔ ابھی اوپر کتنا شور تھا۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ آج نیند بھائی کچھ زیادہ ہی غصے میں تھیں۔“

میمونہ بھائی ابھی بھی آواز دبا کر بول رہی تھیں۔ قصداً وہ خدا سا ہنسی پھر اُن کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر کہہ دی۔

”یہ اُن کا معاملہ ہے بھائی! آپ کیوں ڈر رہی ہیں۔ پھر یہ تو روز کا معمول ہے۔ اتنے سالوں سے آپ خود دیکھ رہی ہیں اور اب تک تو آپ کو عادی ہو جانا چاہیے۔“

”عادی تو میں ہو چکی ہوں اور اتنی کم از کم کسی دن اُن کا جھگڑا نہ ہو تو مجھے تشویش ہونے لگتی ہے۔“

”اپنی بات پر میمونہ بھائی خود ہی ہنسی پھر کہنے لگیں۔“ نیند بھائی کو تکلیف کیا ہے۔ انا جی نے اوپر لکھا اور دشمن انہیں دے دیا ہے۔ ہم کو کون سے تو بالکل الگ تھلک ہی ہیں پھر اُن کا الگ گھر کا مطالبہ

پر میری سمجھ میں نہیں آتا۔“

”ان کا مسئلہ الگ گھر نہیں ہے بھائی! اصل بات یہ ہے کہ وہ ہمارے ماحول میں ایڈجسٹ ہی نہیں ہو پائیں۔ ہے تو یہ حقیقت لیکن سچ یہی ہے کہ وہ آزادی چاہتی ہیں۔“

وہ تا سرف بھرے انداز میں سیدھی سادی میمونہ بھائی کو سمجھاتے ہوئے کہنے لگی۔

”کلب، پارٹیز، آواز مردوں سے میل جول یہ ساری باتیں ہمارے ہاں محبوب سمجھی جاتی ہیں اور نیند بھائی یہاں رہ کر یہ سب نہیں کر پائیں۔ اس لیے الگ گھر چاہتی ہیں۔ وہ بھی ہم سے بہت دور۔“

”لیکن چندا اُن کی شادی کو نو دس سال ہوئے ہیں۔ پھر بچے کی مال بھی ہیں۔“

”یہ ساری باتیں ہم، ہمارے طبقے کی عورتیں سوچتی ہیں بھائی۔ انہیں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ آپ نے اُن کے انداز نہیں دیکھے اور اسرار نہیں انہیں سے بھی شادی شدہ عورت لگتی ہیں؟“ میمونہ بھائی نے غمی میں سر ہلا کر

گیں۔ اُن کی نگاہوں میں نیند بھائی کا سراپا سایا ہوا تھا۔ وہ موضوع بدلنے کی خاطر پوچھنے لگی۔  
”نیند بھائی اور بچے سوچتے کیا؟“

”نہیں، غلیل دونوں کو ہوم ورک کر رہے تھے۔“ میمونہ بھائی کو جیسے ہی احساس ہوا کہ وہ اتنی دیر سے یہاں بیٹھی ہیں۔ فوراً چائے کے خالی مگ اٹھا کر کھڑی ہو گئیں تو وہ ہنستے ہوئے کہہ دی۔

”آپ کو بھی ہوم ورک کرنا ہے؟“

”نہیں میرا آج کا ہوم ورک ختم ہو گیا۔“ میمونہ بھائی ہنستی ہوئی چلی گئیں تو کچھ دیر تک وہ اُن کے بارے میں سوچتی رہی پھر اپنی کتابیں لے کر بیٹھ گئی۔

صبح کا ذہن بک وقت شاہ سکندر جیات نے اُٹھتے ہی کھرکی کے پردے سمیٹ دیے اور تازہ ہوا میں چند گہرے سانس لینے کے بعد واش روم کا رخ کیا۔ اُسے تیار ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگتی تھی اور کم وقت میں ہی اُس کی تیاری بھر پور ہوتی تھی۔ ٹھیک بندہ منٹ بعد قدامت آئینے میں اُس نے خود پر بس ایک نظر ڈالی۔ آسمانی شلوار سوٹ پر سیاہ ڈیسٹ کوٹ نے اُس کی وجاہت میں اضافہ کر دیا تھا۔ قیمتی رسٹ وائج کلائی پر سجتا ہوا پتے کمرے سے نکل کر بابا جان کے کمرے میں آیا تو جا نماز پر بیٹھے ہوئے بابا جان نے آہٹ پر گردن موڑ کر اُسے دیکھا۔

”السلام علیک بابا جان! اے اس نے مؤذبانہ سلام کیا۔“

”جیتے۔“ ہو۔ کہاں کی تیاری ہے؟“ دعا دینے کے ساتھ ہی بابا جان نے پوچھا۔

”میں ایک کام سے کراچی جا رہا ہوں۔ آپ کوئی کام ہو تو تھکے؟“

”کراچی تا تو کوئی کام نہیں ہے البتہ زمینوں پر جانا تھا۔ کم کم تک لوٹو گے؟“

بابا جان نے قدرے سوچتے ہوئے انداز میں کہتے ہوئے اُس سے واپسی کا پوچھا۔

”شاید شام تک۔“

”یقین سے کہو تو پھر ہم کل تمہارے ساتھ چلیں گے دروازے اُن بارون کو بھیج دیتے ہیں۔“

”اگر میرا آپ کے ساتھ جانا ضروری ہے تو پھر میں یقیناً شام تک آ جاؤں گا۔“ اُس نے کہا تو بابا جان ہنس کر کہہ دیے۔

”ٹھیک ہے۔ ہم کل چلیں گے۔“

”مجھے اجازت ہے؟“

”ہوں۔ اپنی بی بی جان سے پوچھ لو۔ انہیں شہر سے کوئی کام ہو تو۔“

”بی بہتر۔“  
وہ انہیں سلام کرتے ہوئے کمرے سے نکل آیا۔ پھر بی بی جان سے بہت عجلت میں بات کر کے باہر آیا تو مورچہ طلوع ہو رہا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ اپنی کمرے لینڈ کروڈز میں کراچی جا رہا تھا اور اُسے اپنا تو کوئی کام نہیں تھا بلکہ اُس کے دوست احمد حسن کی بہن کو کچھ نمبروں کی کمی کے باعث میڈیکل میں ایڈمیشن نہیں مل رہا تھا اور احمد حسن نے سفارش کے طور پر اُسے بلایا تھا۔ وہ کیونکر وعدہ کر چکا تھا اس لیے آج اس کا جانا ناگزیر تھا۔ پھر ویرت کا معاملہ تھا دروازے معمولی کاموں کے لیے وہ خود زحمت نہیں کرتا تھا۔ بہر حال تین گھنٹے کا سفر ڈھائی گھنٹے میں طے کر کے وہ احمد حسن کے گھر پہنچا تو وہ منتظر تھا۔ ادھر چاہتا تھا کہ پہلے اُس کی کچھ خاطر مدارت کرے لیکن وہ منع کرتے ہوئے بولا۔

”نہیں احمد حسن! جو ضروری کام ہے پہلے وہ کر لینا چاہیے۔ تم چلو گے یا؟“

”میں چل رہا ہوں۔ احمد حسن فوراً دوسری طرف سے آ کر اس کے برابر بیٹھ گیا تو اس نے گاڑی آگے بڑھادی پھر پوچھنے لگا۔

”گھر میں سب چیزیں تھیں؟“

”اللہ کا شکر ہے۔ بس وہ نائٹ نے ایڈمیشن نہ ہونے کی وجہ سے رو رو کر برا حال کیا ہوا ہے۔“



احمد حسن نے بتاتے ہوئے اُسے یوں دیکھا جیسے اس کی طرف سے کوئی یقین چاہتا ہو لیکن اُس نے قہراً خاموشی اختیار کر لی۔ اور جب اُس کا کام ہو گیا یعنی نالندہ کا ایڈمیشن تب مسکرا کر بولا۔

”میرا خیال ہے۔ نالندہ کے لیے یہ بڑی خوشخبری ہوگی۔“  
 ”واقعی اور خوشخبری سے باہر ہو جانے کی نالندہ کی خوشی کے خیال سے احمد حسن خوش ہو کر بولا۔“  
 ”جلو پھر اُس روٹی ہوئی تو کی کوئی ہنسائیں؟“ اُس نے کہا پھر معاً خیال آئے پر رک کر بولا۔ ”ایسا کرو احمد حسن تم جا کر نالندہ کو خوشخبری سننا اور اُس سے کہنا اپنے ہاتھوں سے میرے لیے شامی کباب بنا رکھے۔ میں دوپہر کے کھانے تک پہنچ جاؤں گا۔“

”ابھی کہاں جا رہے ہو؟“ اُس کے غمگین بھرے انداز پر احمد حسن نے فوراً پوچھا۔  
 ”بی بی جان کا ایک کام ہے۔ بس منشا کر آتا ہوں۔ کہو تو نہیں ڈرا پ کرتا جاؤں؟“ اس نے گاڑی کا لالک کھولتے ہوئے پوچھا۔  
 ”میں چلا جاؤں گا۔ تو پر اہم۔ بس تم یہ یاد رکھنا کہ کھانا نہیں ہمارے ساتھ کھانا ہے۔“ احمد حسن نے تاکید کرنی ضروری سمجھی۔  
 ”یاد رکھوں گا۔ وہ مسکراتا ہو گا گاڑی میں بیٹھ گیا۔“

بھرنی بی جان کے کام سے فارغ ہو کر اُس کا دل چاہا وہیں سے واپسی کی راہ لے۔ احمد حسن سے اگلی ملاقات پر معذرت کر کے گا۔ پھر نالندہ کا خیال آیا جس نے یقیناً اُس کے لیے خاص اہتمام سے شامی کباب بنا رکھے ہونگے۔ یوں ہی بقول احمد حسن وہ درود کر بلکان ہو رہی تھی اور اس کے نہ جانے پھر پھر دے بیٹھ جانے کی۔ بس اُسے باخیاں کر کے اُس نے واپسی کا خیال ترک کر دیا اور گاڑی احمد حسن کے گھر کے راستے پر ڈال دی۔  
 دو بج رہے تھے اور اُسے واپس بھی آج ہی جانا تھا، کیونکہ بابا جان سے کہہ چکا تھا۔ اسی حساب سے وہ واپسی کا سوچنے لگا کہ چار بجے تک پہنچے پر وہ ساڑھے چھ سات بجے تک حویلی پہنچ جائے گا۔ اور گرمیوں کے دن تھے۔ سات بجے کو شام بھی پوری طرح نہیں اُترتی تھی۔ گویا وہ اطمینان سے ہو گیا اور گاڑی کی اسپید بڑھا دی تاکہ سگنل بند ہونے سے پہلے نکل جائے۔ لیکن اس سے پہلے ہی ریڈ سگنل آن ہو گیا۔ اُس نے کچھ جھنجھلا کر گھڑی پر نظر ڈالی پھر لوہی وائیلز جانب گردن موڑی تو یکبخت ساری جھنجھلاہٹ دور ہو گئی۔ حالانکہ وہ کوئی دل چھینک شہر کا نوجوان نہیں تھا نہ ہی کسی خوبصورت لڑکی کو پہلی بار دیکھ رہا تھا اور وہ کوئی بہت زیادہ حسین و جمیل بھی نہیں تھی لیکن کوئی بات تو فز و دھمی اُس میں جو شاہ سکندر حیات کی نظر میں اُس پر عطر گئی تھیں۔ سگنل ٹران ہو گیا۔ پیچھے گاڑیوں کے ہارن غور چلنے لگے تب اُس نے چونک کر گاڑی اگلے بڑھائی لیکن سارا دھیان وہیں رہ گیا تھا۔

پریکٹیکل کی وجہ سے آج اُسے اپنے میں خاصی دیر ہو گئی تھی۔ سب لوگ کھانا کھا چکے تھے کپڑے بدل کر کچن میں آگئی اور کھانا گرم کرنے لگی۔ پھر ایک پلیٹ میں سالن اور ڈاٹ پاٹ سے ایک روٹی نکال کر وہ ڈائننگ روم کے بھانے اُٹا کر بی کے کمرے میں آگئی۔

”آئیں بیٹا؟“ اُٹا کر بی اُسے دیکھ کر بولیں۔  
 ”جی اور دیکھ لیں، کھانا بھی کھا رہی ہوں۔ پھر آپ کہیں گی میں نے کچھ کھایا نہیں۔“ وہ ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔  
 ”اتنی سی روٹی کھاؤ گی تو یہی کہوں گی؟“ اُٹا کر بی نے اُس کی منہ کی منہ میں روٹی کو دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”یہ بھی بہت ہے اُٹا کر بی اگر میں تو کھانے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ تم بھی نیل دروازے میں آ کر پوچھنے لگا۔“

”اُٹا کر بی! میں آپ کے پاس سو جاؤں، ادھر ادھر سو گیا مجھے سونے نہیں دے رہے۔“  
 ”آج او میرے بچے۔ میری جان! اُٹا کر بی جان نہ پکارتے ہوئے نیل کے لیے بائیں پھیلا دیں اور

اُس نے کھانا چھوڑ کر نیل کو اُٹا کر بی کی آغوش میں سماتے ہوئے دیکھا پھر دھیمی آواز میں پوچھنے لگی۔  
 ”کیا ہوا اُٹا کر بی۔ نیل بھائی کہاں ہیں؟“  
 ”بیکے گئی ہوں گی۔ یعنی اُٹا کر بی کو خود بتا نہیں تھا۔ اپنے طور پر فرض کر لیا۔ وہ ان کی بے بسی محسوس کرتے ہوئے نیل سے کہنے لگی۔“

”نیل بیٹا! آپ میرے کمرے میں چلے جاؤ۔ ابھی میں بھی آ رہی ہوں پھر ہم مل کر سوئیں گے۔“  
 ”بھئی بھئی کہاں کہاں گی؟“ نیل اُٹا کر بی کی آغوش سے نکل کر پوچھنے لگا تو وہ اُس کا گال تھپک کر بولی۔

”کہانی رات میں۔ ابھی ہم سوئیں گے۔ جلو شامش۔“  
 نیل دوسرے پتوں کی طرح کبھی ضد نہیں کرتا تھا۔ جو کہ وہ اُٹا کر بی لیا۔ پتا نہیں یہ بات اُس کی فطرت میں شامل تھی یا اپنے ماں باپ کی طرف سے نظر انداز ہونے پر عدم تحفظ کا شکار ہونے کے ساتھ اندر سے خائف تھا۔ ابھی بھی چپ چاپ جا کر تو قدرے توقف سے وہ اُٹا کر بی سے کہنے لگی۔

”اُٹا کر بی! آپ بڑے بھیا تو سمجھائیں۔ ان کے لیے بھائی کی بات مان لینا ہی بہتر ہے۔ آخر وہ کیوں اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں۔ بچے کا بھی کوئی خیال نہیں۔“  
 ”میں کیا کروں۔ اتنی دفع تو کہہ چکی ہوں۔ اور ابھی کا کہنا بھی ٹھیک ہے کہ یہاں تو نیل کو دیکھنے والے ہم سب ہیں۔ اکیلے گھر میں نیل اُسے چھوڑ کر جانے کی تب بچے کا کیا حال ہوگا؟ اُٹا کر بی اس معاملے میں خاصی مجبور نظر آئیں۔“

”جیٹ مشکل میں ہیں بڑے بھیا۔ پتا نہیں کیا ہوگا؟“ وہ کہتے ہوئے آنکھ کھری ہوئی۔  
 ”اللہ بہتر کرے والا ہے۔“ اُٹا کر بی نے کہی۔ ”کھینچی۔ پھر اُسے نیل کے پاس جانے کا کہا تو وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ نیل کی آنکھوں میں دیند بھری ہوئی تھی لیکن اُس کے انتظار میں زبردستی آنکھیں کھولے ہوئے تھا۔“

”کیا بات ہے جاندا تم سوئے نہیں؟“ وہ اس کے پاس لیٹتے ہوئے بولی۔  
 ”میں آپ کا انتظار کر رہا تھا پھو پھو۔“

”سو رہی بیٹا! میں اُٹا کر بی سے بات کرنے بیٹھ گئی۔ جلو سو جاؤ۔“  
 وہ اُس کی پیشانی پر حوٹ کر ہستہ ہستہ چھیننے لگی۔ نیل فوراً سو گیا اور کچھ دیر بعد اُسے بھی نیند آگئی تھی۔  
 شام میں اچانک طور سے اُس کی آنکھ کھل گئی تو وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔ دل بھی زبرد زبرد سے دھڑکنے لگا تھا کیونکہ نیند میں سے اُٹھی تھی اُس لیے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہوا ہے۔ سوئے ہوئے نیل کی طرف سے اطمینان کر کے کمرے سے نکل کر آئی تو ادھر سے آتی میوز بھائی نے بتایا کہ اسلام آباد سے شکیل بھائی بھائی پتوں سمیت آئے ہیں۔ اُس نے خوش ہو کر اُٹا کر بی کے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی اور کمرے میں ہی اسی تیزی سے داخل ہوئی تو اُٹا کر بی اُسے دیکھ کر بولیں۔

”لو آئی آئی۔“  
 ”السلام علیکم۔“ اُس نے سلام کیا پھر پہلے بھائی سے ملی اس کے بعد بھائی کے گلے لگ گئی۔  
 ”بھئی پتوں سے تو ملو۔ اتنا یاد کرتے ہیں تمہیں؟“ شکیل بھائی نے کہا تو سہما بھائی سے الگ ہو کر اُس نے ٹیڈ اور اشعر کو ایک ساتھ بازوؤں میں لے لیا پھر اُن سے پوچھنے لگی۔

”چچا جانا۔ تم دونوں میں سے کون زیادہ یاد کرتا ہے مجھے؟“  
 ”دونوں۔“ پتوں سے پہلے سہما بھائی بول پڑیں۔ ”دونوں بہت یاد کرتے ہیں تمہیں۔“  
 ”اور آپ؟“ اُس نے شہزاد سے پوچھا تو سہما بھائی نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔  
 ”مجھے قسمت ہی نہیں ملتی۔“ وہ ہنس پڑی۔  
 تب ہی میوز بھائی چلے اور پتوں کے لیے سکرائٹس لے کر آئیں تو وہ اس کے بعد کے کام

سوچ کر کہے سے نکل آئی۔ پھر پہلے نبیل کو اٹھا کر اس کا منہ ہاتھ دھلایا اس کے بعد خود منہ ہاتھ دھو کر سیدھا کچن کا رخ کیا۔  
 شکیل بھائی ابھی چھ ماہ پہلے ہی ٹرانسفر ہو کر اسلام آباد آئے تھے۔ اس سے پہلے ہمیں کراچی میں ان کی جانب مئی اور اسی گھر میں سب کے ساتھ رہتے تھے۔ سولہ بھائی کے اس گھر میں سب مل جل کر محبت سے رہتے تھے۔ جیسی کو سیما بھائی کا اسلام آباد میں دل نہیں دل لگتا تھا۔ ہر تیسرے دن ان کا فون آتا اور تنہائی کا رونا رونق مٹیں۔ لیکن کیا کرتیں مجبور تھیں۔ رہنا بہر حال انہیں میل کے ساتھ تھا۔ ابھی بھی شکیل بھائی آفس ٹوڑ کر صرف دو دن کے لیے آئے تھے اور وہ بھی خد کر کے ساتھ چلی آئیں۔ رات میں شکیل بھائی، اماں جی کے سامنے باقاعدہ ان کی شکایت لے کر بیٹھ گئے۔  
 ہمیں آفس کے کام سے آ کر ہاتھ اماں جی! یہ خواہ مخواہ تیار ہو گئیں۔ بتائیے دو دن میں ان کی طبیعت بہر ہو جلنے لگی!

”صرف دو دن! اماں جی نے تعجب سے پوچھا۔  
 ”جی! اس سے زیادہ ایک دن نہیں اور بچوں کے سکول کی وجہ سے انہیں یہاں چھوڑ بھی نہیں سکتا! شکیل بھائی نے کہا تو اماں جی ان کے بچلے بھائی کی طرف داری میں کہنے لگیں۔  
 ”کیا کرے بچی بے جہاد۔ وہاں اکیلے گھبراتے ہو گئی۔  
 ”لیجئے اب تو انہیں اور شرم دے رہی ہیں“ شکیل بھائی نے سر ہٹا دیا اور سیما بھائی بیٹھ گئیں۔  
 دو دن گھر میں خوب رونی رہی۔ احمد اور سونیا بھی سمیٹے اور اشعر کے آنے سے بہت خوش تھے۔ البتہ نبیل اسی طرح جب چپ سا رہا۔ گوکہ ان سے بڑا عقدا پھر بھی وہ چاروں اس پر رعب جم رہے تھے۔ اس وقت وہ۔ یہی دیکھ رہی تھی۔ سمیٹے نہ کہا۔  
 ”نبیل! تم وہاں بیٹھ جاؤ“ وہ بیٹھ گیا۔ پھر اصرار نہ کیا۔  
 ”نبیل وہ کرسی اٹھا لاؤ“ اور وہ اس کے حکم کی تعمیل میں کھڑا ہو گیا۔ بالآخر اس سے رہا نہیں گیا۔ سب کو ہلا کر لاٹن سے کھڑا کرتے ہوئے بولی۔  
 ”کتنی بڑی بات ہے۔ نبیل تم سب سے بڑا ہے اور تم لوگ بھلے اس کی عزت کرنے کے اس پر رعب جم رہے ہو“  
 ”میمو! نبیل نے“ سمیٹے جلنے کیا کہنے جا رہی تھی کہ وہ فوراً لوٹ کر بولی۔  
 ”اول ہوں۔ نبیل نہیں۔ نبیل بھائی کہہ رہے ہیں۔ تو اس نے قدرے تعجب سے  
 ”نہیں پیو! پیو! میں نبیل بھائی نہیں کہوں گی“ سمیٹے بیور کر بولی۔ تو اس نے قدرے تعجب سے پوچھا۔

”نبیل!“  
 ”میمو! مجھے مامے کا“ سمیٹے کی معصومیت جو غالباً یہ سمجھ رہی تھی کہ بڑا بھائی مار تا ضرور ہے۔  
 ”بالکل نہیں!“ اس نے سمیٹے کو قریب بلا لیا اور بازو کے حلقے میں لے کر بولی: ”نبیل بہت اچھا بچہ ہے کسی کو نہیں مار سکتا۔ اب اسے نبیل بھائی کہو گی تو یہ آپ کا خیال رکھے گا!“  
 ”اشعر! بھی؟“ سمیٹے کو فوراً چھوٹے بھائی کا خیال آیا۔  
 ”ہاں اشعر! بھی! احمد اور سونیا کا بھی سب کا خیال رکھے گا!“  
 ”اور پیو! نبیل بھائی کا خیال کون رکھے گا؟“  
 آہنی سی سونیا نے آہنی سمجھداری سے پوچھا کہ وہ بے ساختہ ہنس پڑی پھر نبیل کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب کرتے ہوئے بولی۔

”میں۔ بلکہ ہم سب نبیل کا خیال رکھیں گے“  
 ”جی میمو! نبیل اور سیما بھائی لاؤں سے نکلیں اور اسے بچوں میں گھرے دیکھ کر سیما بھائی ہنسنے

ہوئے بولیں۔

”لوہر مستقبل قریب کی ڈاکٹر صاحبہ بچوں کے ساتھ کھیل رہی ہیں لا“  
 ”جناب! میں ان پر دلیر سرج کر رہی ہوں! وہ دھمک کر بولی۔  
 ”ماشاء اللہ! دو دنوں بعد وہیں کرسیاں اس کے قریب کھینچ کر بیٹھ گئیں تو اس نے پہلے بچوں کو اکام سے کھینے کی تاکید کی پھر ان کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔  
 ”تو صبح ایک جا رہی ہیں!“

”ہاں دیکھو اپنے بھتیجا کو۔ ایک دن اور نہیں رگ رہے! سیما بھائی کا بالکل جلنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ منہ پچلا کر بولیں۔

”آپ نے غلطی کی ناں بھائی! اگلے بیٹھے بچوں کی چٹیاں ہو رہی ہیں! اب اطمینان سے آئیں۔ شکیل بھائی تو جب بھی آئیں گے ایسے ہی آئیں گے! وہ بھائی کی تجویز کا احساس کر کے بولی۔  
 ”ہاں تمہارے بھائی بھی۔ یہی کہہ رہے تھے۔ خیر تم چلو ہمارے ساتھ۔ آج کل اسلام آباد کا موسم بہت اچھا ہے!“

”سیما بھائی نے محبت سے اسے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔  
 ”میں کیسے جا سکتی ہوں بھائی! آپ کو خیال ہے میرا آخری سال ہے۔ اس کے بعد انشاء اللہ فرار ہوؤں گی!“  
 اس نے کہا تبھی نبیل بھائی انگلی میں کی رنگ گھاٹی اپنے مخصوص انداز میں اونچی ہیل کی ٹنگ نکال کر آئیں اور پیسے بادل غواستہ ان کے قریب رک کر سیما بھائی سے پوچھنے لگیں۔  
 ”تم صبح جا رہی ہو؟“

”جی!“ سیما بھائی مختصر جواب دے کر خاموش ہو گئیں۔ تب وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔  
 ”بیٹھیں بھائی!“

”نہیں۔ بس تم بیٹھو۔ اچھا سیما! صبح تو جب تم جاؤ گی میں سو رہی ہوں گی!“  
 اس کے بعد کچھ کہا نہیں لیکن انداز کو باہمی وقت خدا حافظ کا ساتھ۔ اور جلنے لگیں کہ نبیل دیکھ کر بھاگا گیا۔

”مٹی!“ نبیل نے ان کی ٹانگوں سے لپٹ کر لپکا لا تو وہ اسے بازو سے پکڑ کر پرے دھکیلتے ہوئے بولیں۔  
 ”یہ کیا بد قیسی ہے۔ اپنے باپ کے ساتھ کیا کرو رہے ہو چلے!“  
 ”اس نے ساتھ ہی ٹنگ نکال کر کرنی میرٹھیاں چڑھ گئیں تو وہ جو بلا ارادہ ان کے پیچھے دیکھنے لگی تھی سر جھٹک کر دوبارہ بیٹھ گئی۔ کہ نظر نبیل پر پڑی۔ بچہ ماں کی بے رحمی کو شدت سے محسوس کر رہا تھا اس نے اندر ہی اندر گڑھتے ہوئے اسے ہلا کر اپنے ساتھ لگا لیا۔

وہ ابھی بابا احان کے ساتھ زمینوں سے لوٹا تھا۔ شاور لینے کے بعد جلنے اس نے اپنے کپے میں ہی منگولی لٹی تھی۔ اور رگ رگ کر جلنے کے سبب لپکتے ہوئے وہ کپے سے نکل کر ٹیڑھیں پر اٹھ کر ہوا تو سلونی شام میں اسے وہ بڑی شدت سے یاد آئی جسے تین روز پہلے اس نے بتی و صوب میں سرک کے کنارے غالباً بس کے انتظار میں کھڑے دیکھا تھا اور ان تین دنوں میں مسلسل تو نہیں لیکن وقفے وقفے سے فرد اس کا دھیان اس کی طرف کیا تھا۔ اور وہ خود حیران ہو رہا تھا کہ اس طرح تو اس نے کبھی کسی کے بارے میں نہیں سوچا تھا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ صنف نازک کو اس نے کبھی اہمیت دی ہی نہیں تھی۔ گزشتہ سال جب شہر بانو اور شاہ ہارون کی منگنی کے ساتھ بدلے میں اس کی مہر انصار سے نسبت ملے ہوئی تھی تب بھی اس کے اندر کوئی خوشگوار احساس نہیں جاگا تھا۔ نہ ہی اس کے بعد مہر النساء کا اس کے سامنے آنے سے گریز کرنا یا اچانک سامنا ہو جانے پر لجا نا اسے متوجہ کر سکا۔ جبکہ وہ بہت خوبصورت بھی تھی لیکن ساری بات تو دل کی ہے۔ کب کہاں بے اختیار ہو جائے کچھ بتا نہیں جاتا اور شاہ سکندر حیات

نہیں خیر رات تو وہاں نہیں ٹھہر سکتا۔ سب بچے ساتھ ہیں اس کے اور شاہ یونس کے بھی ۛ  
اس نے بی بی جان کی بات سن کر مزید کچھ نہیں کہا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔

اسی روز کی طرح وہ پستی ہوئی دھوپ میں بس کے انتظار میں کھڑی نظر آئی اور اُسے دیکھتے ہی شاہ بکد جات  
کو اپنے کرائی آنے کا مقصد سمجھ میں آیا۔ اور واقعی وہ حیران رہ گیا یعنی صرف اس لڑکی کو دیکھنے کی خاطر وہ شاہ پور  
سے یہاں آتا تھا۔

”نہیں یہ اُس نے اس حقیقت کو جھٹلانا چاہا لیکن کسی طرح حقیقت جھٹلانی نہیں گئی۔ اُسے دیکھ کر ہی

تو اس کا اضطراب اچانک ختم کیا تھا۔ درگزر شدہ دو گھنٹے سے انتہائی مضطرب حالت میں گاڑی مختلف  
سڑکوں پر دوڑاتے ہوئے وہ مسلسل یہی سوچ رہا تھا کہ وہ یہاں کس کام سے آیا ہے۔ حالانکہ کل شام  
بی بی جان کے استفسار پر اس نے کہا تھا سو کام ہوتے ہیں اور ہوتے بھی تھے، لیکن آج تو کوئی کام نہیں  
تھا پھر بھی کسے لگ رہا تھا جیسے وہ کسی خاص مقصد سے آیا ہو اور اب مقصد کا ادراک اُسے سخت  
حیرت میں مبتلا کر گیا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ خیر سے نکلتا وہ بس میں سوار ہو کر نظروں سے اوجھل  
ہو گئی اور اپنے پیچھے منظر میں جو وہ خلا چھوڑ گئی تھی اُسے شدت سے محسوس کرتے ہوئے وہ چونک  
کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اور وہ تو کہیں نظر نہیں آتی البتہ نالہ اُسے دیکھ کر بھاگ آئی۔

”ارے کندہ بجائی آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟“

”وہ ایک کام سے آیا تھا؟“ وہ پوچھ کر بولا۔

”کچھ گئی کسی کا ایڈمیشن کروانے آئے ہوں گے“ نالہ نے کہا تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”خیر اب ایسا اندیشہ بھی نہیں بچا کہ میرے کہنے پر وہ تم جیسی نالائق لڑکیوں سے کالج بھر دیں؟“

”جی، میں نالائق نہیں ہوں“ نالہ منہ جھٹلا کر بولی۔

”اچھا چلو بیٹھو، میں تمہاری طرف جا رہا ہوں“ اُس نے دوسری طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا تو  
نالہ رک کر شوق سے پوچھنے لگی۔

”ابنی دوستوں کو نہیں بلالوں؟“

”کیا؟ میں تمہیں اتنا فالو نظر آتا ہوں؟ چلو بیٹھو۔“

اُس نے ناگواری اور رعب سے کہا تو نالہ بڑ بڑا کر بولی دوسری طرف سے آ کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر خاموشی  
سے ڈراما ٹوکرنے کے بعد وہ پوچھنے لگا۔

”تمہاری کلاسز شروع ہو گئیں؟“

”جی“ نالہ ابھی اُس کے رعب سے نکلے نہیں تھی جیہی اُس کے حلق سے مشکل سے آواز نکلی اور  
وہ سمجھ کر قہقہہ انجان سا بن گیا۔

پھر اُس نے جا کر نالہ کو اُس کے گھر پر اتار کر چلا جانے کیونکہ احمد حسن اس وقت گھر پر نہیں  
تھا لیکن نالہ نے اسے جانے نہیں دیا۔ گو کہ اس گھر میں اس سے کوئی پردہ نہیں تھا پھر بھی نالہ اور  
اس کی امی کے ساتھ دو پہر کا کھانا کھاتے ہوئے وہ کچھ جھجک رہا تھا۔ کھانے کے دوران نالہ کی امی نے  
اس کے گھر کے ایک ایک فرد کی خیریت پوچھی پھر کہنے لگیں۔

”کبھی اپنی بی بی جان اور بہنوں کو ملے؟“

”نہیں ان کا کراچی آنا جانا رہا ہے۔ لیکن کبھی کبھار البتہ مری اسلام آباد سال میں دو بار جاتی ہیں وہ  
بچی بچوں کی وجہ سے۔“

اس نے بتایا تو انہوں نے ناممبھی کے عالم میں کہا۔

”بچوں کی وجہ سے؟“

”جی، اصل میں میرے بھائیوں کے بچے مری کاؤنٹیٹ میں پڑھتے ہیں، جھٹیوں کے علاوہ جب بی بی  
جان کا دل چاہتا ہے خود جا کر ان سے مل آتی ہیں۔“

پہلی بار اپنے دل کو اپنے اختیار سے باہر محسوس کر رہا تھا۔  
”بجائی! اب کوئی بی جان بلا رہی ہیں؟“ عتب سے شہر بانے پکار کر کہا تو اس نے اپنے خیال سے چونک  
کر جلت کر دیکھا اور کوئی پوچھ لیا۔

”خیریت؟“  
”خیریت نہیں لگتی بجائی! بی بی جان کچھ ناراض لگ رہی ہیں؟“ شہر بانے کہا تو وہ اپنی طرف اشارہ  
کے کئے بولا۔

”مجھ سے؟“  
”جی نہیں آپ سے یا کسی اور سے۔ آپ چلیں تو؟“  
”ہاں چل رہا ہوں۔“ وہ چلے کا خالی کپ اُسے فکرا کر بی بی جان کی ناراضگی سوچتا ہوا میٹھاں اتر کر آیا تو وہ بڑے  
بال کرے میں بیٹھی نظر آئیں۔ اُس نے قریب آ کر سلام کیا تو بی بی جان اُسے دیکھ کر قدرے غمگی سے  
بولیں۔

”ماشاء اللہ۔ تین دن بعد لوٹے ہو، اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ پہلے ماں کو اپنی صورت دکھا دو؟“  
”سوری بی بی جان!“ وہ اپنی کوتاہی پر تادم ہوا اور ان کے قریب بیٹھ کر ان کے گرد اپنے بازوؤں  
کا گھیرا بنا کر صفائی پیش کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ”اصل میں راستوں کی گرد سے طبیعت بوجھل ہو رہی تھی سوچا  
پہلے نہالوں پھر آپ کی خدمت میں پیش ہوں گا۔“

”کچھ کھا لیتے ہیں؟“ بی بی جان نے اپنا آب چھڑاتے ہوئے پوچھا۔  
”جیسے بی بی چکا ہوں، اور کھانا رات میں ہی کھاؤں گا؟“ گویا اس وقت اُس نے کچھ بھی کھانے  
سے انکار کر دیا۔

”اتنی گرمی میں چائے، کتنی بار منع کیا ہے، کم از کم گرمی نہیں چلے نہیں پیا کر، دمخت خراب  
کر رہے؟“ بی بی جان نے حسب عادت چائے کا سن کر ٹوکنا ضروری سمجھا۔

”بی بی جان جس چیز کی عادت ہو وہ پھر گرمی سردی نہیں دیکھتی، شہر یہ بتائیے خاموشی کیسی ہے  
میرا مطلب ہے بچے سب کہاں ہیں؟“

اُس نے اچانک خاموشی محسوس کرتے ہوئے اپنے بھتیجے بھتیجیوں کے بارے میں پوچھا۔  
”بچے سب شاہ جہانگیر کے ساتھ تمہارے چچا جان کی طرف گئے ہیں؟“

”خیریت؟“  
”ہاں صبح مہر الساء آئی تھی تو شہر بانوں نے اُسے روک لیا ابھی سب اُسے چھوڑنے گئے ہیں جہانگیر  
جا رہا تھا تو بچے بھی ساتھ تیار ہو گئے۔“

بی بی جان نے بتایا تو وہ ذرا سے کندھے اچکا کر رہ گیا۔ پھر قدرے توقف سے پُرسوج انداز میں  
بولی۔

”میں صبح کراچی جاؤں گا۔“  
”کیوں؟“ ابھی اُس دن تو گئے تھے؟“ بی بی جان نے ٹوکے ہوئے کہا۔

”بی بی جان! سو کام ہوتے ہیں، پھر کراچی کون سا دور ہے۔ ابھی جاؤ ابھی آؤ۔“  
اُس نے کام کی نوعیت نہیں بتائی، پھر اٹھتے ہوئے بولا۔

”میں اپنے کمرے میں ہوں، جہانگیر بجائی آئیں تو کھے بلا لیجئے گا۔“  
”جہانگیر کو تمہارے چچا اتنی جلدی تو نہیں آنے دیں گے؟“ بی بی جان نے کہا تو وہ جاتے جلا  
رک کر بولا۔

”کیا مطلب؟“ رات وین رکیں گے؟“

”اچھا اچھا!“ انہوں نے سمجھ کر سر ہلایا پھر کرسی دھکیل کر اٹھتے ہوئے بولیں: ”گری ہیٹ ہے تم ایسا کرو سکندر رنجیدہ آرام کر لو۔ احمد حسن کے کمرے میں یا نالکھ سے کپڑے لے کر آ کر دے“۔  
 ”جی۔“ وہ انہی قدر کہہ کر سوچنے لگا کہ آبا اُسے یہاں لے کر چاہیے یا دالہسی کی راہ لے۔  
 چلیں سکندر بھائی کہاں پہلنا ہے احمد بھائی کے کمرے میں یا۔“  
 ”میرا خیال ہے مجھے گیسٹ روم میں پہنچا دو یا ایک بل میں فیصلہ کر کے وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔“

میونہ بھائی کے ہاں تیسرے بچے کی آمد تھی۔ اماں جی انہیں لے کر ہاسٹل گئی ہوئی تھیں اور نبیلہ بھائی تو یوں ہی گھر پر نہیں رہتی تھیں۔ وہ کالج سے لوٹی تو تینوں بچے نبیل احمد اور سونیا۔ آبا جی کے پاس بیٹھے نظر آئے۔ اُسے دیکھتے ہی سونیا وہیں سے پکار کر لولی۔  
 ”بھو بھو! اماں جی اور امی نہیں ہیں۔“

”کہاں گئی ہیں؟“ اُس نے پوچھا لیکن پھر فوراً ہی اُسے میونہ بھائی کی کنڈیشن یاد آئی تو اس سے پہلے کہ سونیا آبا جی کے سامنے کچھ اُلٹا سیدھا بولتی وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ پھر نہ اتنے دھوکے نکلے تو پہلے آبا جی اور بچوں سے کھانے کا پوچھا۔

”ہم کھا چکے ہیں بیٹی۔ تم کھا لو یا آبا جی نے کہا۔“  
 ”بھئی ابھی بھوک نہیں ہے یا اُس نے کہا پھر آبا جی کے آرام کے خیال سے تینوں بچوں کو لے کر اپنے کمرے میں آگئی۔  
 ”جلو اب تم سب آرام سے سو جاؤ۔ شام میں اٹھو گے تو میں ایک پیارا سا گول مٹول سا مٹنا دکھاؤں گی۔“  
 اپنے تئیں اُس نے بچوں کو لالچ دیا لیکن سونیا بڑے آرام سے بولی۔

”مجھے پتا ہے۔ امی لینے گئی ہیں۔“  
 ”چلا کو ماسی! تمہیں لینے پتا ہے؟“ وہ سونیا کے چھوٹے گال پر ہلکے سے چٹکی کاٹ کر بولی۔  
 ”اماں جی نے بتایا ہے۔ کہہ رہی تھیں۔ ہم تمہارے لیے مٹنا سناجھان لینے جا رہے ہیں۔“  
 یقیناً اماں جی انہیں بہلا کر گئی ہوں گی اور سونیا نے ان کا حرف بہ حرف دہرایا۔ پھر بولنے لگی۔  
 ”بھو بھو! وہ مٹنا سناجھان میرا ہو گا ناں۔ نبیل کا تو نہیں ہو گا۔“  
 ”کیوں نبیل کا کیوں نہیں ہو گا؟“ اُس نے نبیل کے معصوم چہرے پر نظر ڈال کر پوچھا۔  
 ”اُس لیے جاری امی لے کر آئیں گی۔ نبیل کی امی تو۔“

”سونیا۔“ اُس نے فوراً ٹوٹ کر دیا۔ بڑی بات ہے بیٹا! ایسی باتیں نہیں کرتے۔ نبیل بھی تمہارا بھائی ہے اور تم سب کو مل جل کر رہنا ہے۔“  
 ”بھو بھو! سونیا گندی بچی ہے۔ یہ نبیل بھائی کو نبیل کہتی ہے۔“ احمد نے خود کو سمجھا دیکر ہنسنے لگا۔  
 ”نہیں۔ میں گندی بچی نہیں ہوں۔ سونیا کو سخت برا لگا۔ رونے لگی تو وہ اُسے اپنے بازوؤں میں لے کر لولی۔

”نہیں! اُم! سونیا بہت اچھی بچی ہے۔“  
 ”مٹا بیل پر نظر پڑی۔ وہ سونیا کو روکتے ہوئے چپ چاپ دیکھ رہا تھا۔ تب وہ بہت پیار سے اُسے مخاطب کر کے بولی۔  
 ”کیا بات ہے نبیل تم کیوں خاموش ہو۔“ جواب میں معصوم بچے کے سینے میں جانے کب سے دلی ہوئی گہری سانس آہ کی صورت خارج ہوئی تو اُس نے تڑپ کر اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔  
 ”میرا جان۔“ وہ بس یہی کہہ کر کیڑی کھانسی وقت عدیل بھائی آگئے اور زوردار سلام کے ساتھ لپٹا دیا۔  
 ”نیا بھتیجا مبارک ہو۔“

”نیا بھتیجا۔“ اُس نے چونک کر دیکھا پھر بولنے لگی: ”آپ ہاسٹل سے آ رہے ہیں۔؟“  
 ”نہیں آؤں۔“ عدیل بھائی سونیا کو گود میں اٹھا کر اُس کی جگہ بیٹھتے ہوئے بولے۔  
 ”پھر آپ کو کیسے پتا چلا۔؟“

”اماں جی کا فون آتا تھا غلطی سے۔ یعنی نہ ملنا چاہ رہی تھیں خلیل بھائی کے مل گئے میرے۔“  
 عدیل بھائی محفوظ انداز میں بتا کر بیٹھے تو وہ بھی نہیں بڑی پھر بولنے لگی۔  
 ”اور کچھ کہا اماں جی نے۔؟“ عدیل بھائی سونیا کو گود لے کر اپنے من لگ گئے تھے۔ جب ہی اُس کی بات سنی نہیں۔ اُس نے کچھ دیر انتظار کیا پھر قدر سے اونچی آواز میں اُن سے کھانے کا پوچھا۔  
 ”ہاں، کھانا کھاؤں گا؟“ انہوں نے کہا تو وہ اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔

اگلے دن صبح اُس کی سمجھ میں نہیں آ گیا کہ اُسے کیونکہ اماں جی اور میونہ بھائی دونوں نہیں تھیں اور اس کا کالج جانا ناگزیر تھا۔ بچوں کو تو اُس نے آرام سے اسکول بھیج دیا۔ اس کے بعد مسئلہ دوسرے کا ہوا کا تھا جنھوں کے اسکول سے واپس آنے پر انہیں اٹینڈ کرنا اور اُس وقت تک وہ کالج سے نہیں لوٹی تھی۔

”کیا بات ہے تمہیں کالج نہیں جانا؟“ عدیل بھائی نے اُسے تیار نہ دیکھ کر پوچھا۔ روزانہ صبح وہ انہی کے ساتھ جاتی تھی۔

”کیا کروں بھائی! جانا بھی ضروری ہے۔“ وہ پریشانی سے گویا ہوئی۔

”پھر کیا مسئلہ ہے۔؟“

”اتناں جی اور بھائی نہیں ہیں۔ بچے اسکول سے آئیں گے تو پریشان ہوں گے، کیا کروں، چھٹی کر لوں۔“

”نہیں چھٹی کرنے سے تمہارا نقصان ہو گا۔ ایسا کرو نبیلہ بھائی سے کہہ آؤ۔ وہ دیکھ لیں گی بچوں کو۔“  
 عدیل بھائی بڑے آرام سے کہہ کر تیار ہونے چلے گئے اور وہ شش و پنج میں پڑ گئی۔

”نامن۔ نبیلہ بھائی ایک اپنے بچے کا تو خیال کرتی نہیں ہیں۔“  
 اُس نے نبیلہ بھائی کے پاس جانے کا خیال جھٹ دیا اور آبا جی کے پکارنے پر کچن سے نکل کر برآمدے میں آئی تو وہ کہنے لگی۔

”بیٹا! بچوں کی فکر نہیں کرو! میں ہوں ناں! لیکن آبا جی! آپ کھانا تو نہیں پکا سکتے۔ اور بچے تو آتے ہی کھانا مانگیں گے۔“  
 ”کھانا بازار سے آجائے گا۔ اور خلیل میاں بھی ابھی ہاسٹل کا چکر لگا کر آجائیں گے۔ کوئی پریشانی نہیں ہوگی، تم جاؤ۔“

آبا جی نے اسے اطمینان دلایا اور وہ سے عدیل بھائی چلائے۔

”جلدی کرو آسیہ! صرف دس منٹ ہیں۔“

”دس منٹ۔“ وہ تیار ہونے اپنے کمرے کی طرف بھاگی تھی۔

اور جب یہ طے ہو گیا تھا کہ وہ صرف اُس لڑکی کی خاطر میلوں مسافت طے کر کے آیا تھا تو اب خود اُس نے طے کر لیا تھا کہ اُس تک رسائی حاصل کیے بنا وہ واپس نہیں جائے گا کیونکہ گزشتہ نام اُس نے تین بار واپس کا مقدمہ کیا اُسے لگا وہ کل پھر آئے گا۔ اور روزانہ شاہ پور سے آجائے گا اُس کے لیے کوئی اتنا مشکل تو نہیں تھا لیکن بس یہ خیال کہ وہاں باا جان اُسے کسی کام میں مصروف کر سکتے تھے۔  
 اور وہ جانتا تھا کہ اب وہ کوئی کام نہیں کر سکے گا۔ جب تک اُس کے بارے میں جان نہ لے۔  
 وہ جو کوئی بھی بھی پہلی نظر میں نہ صرف اُسے اچھی لگی بلکہ اُس کے حواسوں پر چھا گئی تھی اور شاہ سکندر نیات کے لیے یہ بھی تو حیران کن بات۔ اُس کے ساتھ وہ اپنی کوفیات سے لطف بھی لے رہا تھا

اور اُسے عجیب سا بھی لگ رہا تھا۔ کیونکہ اُس نے صفت نازک کو کبھی اتنی اہمیت نہیں دی تھی۔ حالانکہ وہ کوئی کھدو یا جذبات سے عاری شخص نہیں تھا۔ البتہ معنہ و ضرور تھا۔ اور شاید یہ اس کا حق بھی تھا۔ بے پناہ وجاہت کے ساتھ تو بڑا دون جیسی شان و شوکت ہر ایک کے حقیقت میں تو نہیں آتی۔ پھر خود سے واقف بھی تھا۔ جانتا تھا کہ جس راستے پر قدم رکھتا ہے وہ خود ہر رشک کو ہے۔ بہ حال یہ اس کی زندگی کا پہلا تجربہ تھا کہ وہ خود کسی لڑکی کی تلاش میں جا رہا تھا۔ یورپی تدریس کے ساتھ اور یہ نتیجہ کر کے کہ اپنی تین رائوں کی بے خوابی اور دنوں کا انتظار اس کے کھاتے میں ڈال آئے گا۔

اتنا زعم۔ یعنی اُسے یقین تھا کہ اُسے دیکھ کر وہ اپنی نیندیں گھوٹا بیٹھے گی۔ اتنا تو وہ جان گیا تھا کہ وہ میڈیکل کالج کی اسٹوڈنٹ ہے۔ کیونکہ اوّل روز وہ سینڈ کوٹ پر نظر آئی تھی، اور کل اُسے دیکھنے کے بعد نہیں سے اس نے نالندہ کو یک کیا تھا۔ اور وہ چاہتا تو نالندہ کے ذریعے آسانی سے اس کا نام پتا جان سکتا تھا لیکن اپنے دل پر گزرنے والی واردات میں فی الحال وہ کسی کو شریک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پھر اس جستجو کا ایک الگ مزہ تھا۔ گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے اُس نے گاڑی کی اسپید کم کر دی۔ پھر جیسے ہی سامنے دیکھا وہ بہت عجلت میں رو کر اس کوئی نظر آئی، اور اسی بل وہ اسپید بڑھا کر گاڑی یوں اُس کے قریب لے گیا جیسے اُسے چیلنا ہوا نکل جانے کا۔ حقیقتاً دیکھنے والوں کو بھی یہی لگا اور وہ جو اسی طرف دیکھ کر چل رہی تھی، وہ ایک گاڑی کو اتنی اسپید سے اپنی طرف آنے دیکھ کر لو کھلا گئی اور بہت کو ششش سے بھی اپنے حواس قابو میں نہیں رکھ سکی۔ ادھر ادھر کئی گاڑیوں کے بریک چر چراتے اور اس نے بھی گاڑی روکی تو لیکن اُسے بھی سی ضرب لگانے کے بعد۔

پھر پہلی کی تیزی سے اتر کر اس کے قریب آیا تو پتہ چل گیا کہ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس کے گرد لوگ جمع ہونے لگے تب اس نے جلدی سے اسے بازوؤں پر اٹھایا اور اپنی گاڑی کی پچھلی نشست پر لٹا دیا۔ پھر ایک ہی نظر میں سب کو دیکھ کر بولا۔  
”زادہ چوٹ نہیں ہے، میں انہیں اسپید لے جاتا ہوں تا اس کے ساتھ ہی ڈرائیونگ پر بیٹھا اُس نے نگاہیں آگے بڑھا دی۔ اور راستے میں جو پیلا کلینک نظر آیا۔ وہ وہیں رُک گیا۔۔۔ ابتدائی مرحلے سے گزرنے کے بعد اُسے طبی امداد ملنے تک وہ قدرے بے چین رہا۔ پھر سکون سے ہو کر اُس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے کے ساتھ اُس کا تفصیلی جائزہ لینے لگا، کہ آخر اس میں ایسی کیا بات ہے اور کوئی بات تو تھی جو اس کی جستجو بڑھتی جا رہی تھی۔ سمجھنے لے چپ چاپ سرک گئے۔

وہ اگر بیڈ پر بے حس و حرکت بڑی تھی تو وہ بھی اپنی جگہ جم کر رہ گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہاں وہاں زندگی ہے ہی نہیں محسوس کی جانے والی خاموشی تھی۔ مگر اُس کی پلکوں نے ذرا سی حرکت کی تو جیسے ہر شے متحرک ہو گئی۔

وہ جو ایک ٹک اُسے دیکھ رہا تھا۔ تیزی سے اُس کے بیڈ کے قریب آگیا۔ دوسرے بل اُس

نے آنکھیں کھولیں تو نظروں کے عین سامنے ایک اجنبی کو دیکھ کر ذہنی طور پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا بلکہ وہ چپ چاپ اُسے دیکھنے لگی۔ تب بیڈ کی پیڑ پر ایک ہاتھ جاکر وہ قدرے جھک کر پوچھنے لگا۔

”کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“ کو کر اُس کی آواز دھیمی تھی پھر بھی اُس کا سوا ہوا ذہن یکلفت پیدا ہونے کے ساتھ بے شمار سوالات کی زد میں آگیا۔ بولی تو پیشانی پر لمبی سی ناگواری کی شکلیں نمودار ہو گئیں۔

”کون ہیں آپ؟“  
”خاکسار کو سکندر رکھتے ہیں۔ شاہ سکندر حیات۔“

گھٹی موخیاں تھے اُس کے لبوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ تھی کہ وہ اندر ہی اندر تیز بڑی ہو کر اُس پر سے نظریں ہٹا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی، پھر اٹھنا چاہتی تھی کہ وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔

”پلیز! اجنبی آپ آرام کریں!“ وہ کہتے ہوئے اُنکے کمرے کی طرف لگی۔ اور کہیں چوٹ کا احساس ہوا تو لیکن شکریہ میں جھجک ہوئی۔ وہ کہتے ہوئے اُنکے کمرے کی طرف لگی۔ اور کہیں چوٹ کا احساس ہوا تو لیکن قصداً اُس نے خود کو دیکھنے اور جاننے کی کوشش نہیں کی۔

”ابھی آپ ٹھیک نہیں ہیں۔ پلیز آپ!“  
”مجھے یہاں کون لایا ہے؟“ وہ اُس کی بات کاٹ کر بولنے لگی۔  
”ظاہر ہے میں۔ اور پلیز اب آپ یہ مت کہیں کہ کیوں لائے ہیں۔ مجھے وہیں مرجانے دیتے

غیرہ وغیرہ۔“  
اُس نے کہا تو وہ ہونٹ پیچھ کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ تب سکندر حیات سوچ کر بولا۔  
”میرا خیال ہے۔ میں ڈاکٹر کو لے آؤں۔ وہی بتائیں گے کہ آپ گھر جا سکتی ہیں یا نہیں۔“

وہ خاموش رہی اور جب وہ کمرے سے نکل گیا تب اپنے بدن کو جگہ جگہ سے چھو کر دیکھنے لگی کہ کہاں چوٹ آئی ہے۔ باہاں بازوؤں کا اس سے کہیں تک چھل گیا تھا اور گاڑی کی ٹکر کے باعث کمزری شدید درد کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ ہتھکڑیوں کا نشان نہیں تھا پھر بھی ٹکر کے علاوہ بھی اُسے کہیں درد کا احساس ہو رہا تھا۔ اور ابھی وہ جھجک سے دیکھنے نہیں باقی تھی کہ کمرے کے دروازے پر آواز سن کر دوبارہ اسی طرح بیٹھ گئی۔ سکندر حیات ڈاکٹر کے ساتھ اندر آیا اور خاموشی سے ایک طرف کھڑ ہو گیا۔

”کہیں تکلیف تو نہیں ہے۔“ ڈاکٹر نے معاند کرتے ہوئے اُس سے پوچھا۔  
”کم مین درد ہے اور شاید میرے پیس میں موقیع آگئی ہے۔“

وہ یوں بولی جیسے ہر ایک کے لیے اسے تکلیف کے ساتھ شدید کوفت میں مبتلا کر رہی ہو۔ ڈاکٹر نے چیک کرنے کے بعد اُس کے شے کی تصدیق کی۔ پھر میڈیسن لکھنے کے ساتھ سکندر حیات سے کہنے لگا۔  
”کوئی تشویش کی بات نہیں ہے۔ فکر کریں معمولی ایکسیڈنٹ تھا۔ یہ میڈیسن فوراً لے لیں۔ اور چائیاں تو ابھی انہیں گھر لے جا سکتے ہیں۔“

وہ ڈاکٹر کی آخری بات پر مٹھا کر دیکھنے لگی۔  
”تھیک ہو۔“ سکندر حیات نے ڈاکٹر کے ہاتھ سے ہر چالے لیا پھر اُس کے ساتھ ہی کمرے سے نکل گیا تو وہ خود کو دوبارہ اُس کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہ کر سکی۔

کچھ دیر بعد وہ پورے اعتماد سے کمرے میں داخل ہوا جیسے وہ اس کی قریبی عزیز ہو۔ لیکن جب اُس پر نظر پڑی تو جھجک گیا۔ کیونکہ اُس کے ہر انداز سے ناگواری ظاہر ہو رہی تھی۔

”آئی ایم سوری۔ میں ناک کرنا بھول گیا۔“ وہ کچھ نہیں بولی تو قدرے رُک کر کہنے لگا۔  
”اب کیا پروگرام ہے آپ کا۔ میرا مطلب ہے گھر چلیں گی تو چلیں میں آپ کو چھوڑ دوں؟“

”بہت بہت شکریہ سکندر حیات صاحب! آپ تو پہلے ہی اتنی زحمت اٹھانا پڑی۔“  
”اُسے رسیات بھانے کا خیال آیا تو فوراً اپنی ناگواری چھپا گئی۔

”مجھے بالکل زحمت نہیں ہونی مس!۔ وہ ہلکا سا سیدھے سادے انداز میں کہہ کر اُس کو اور سوائڈ نظروں سے دیکھنے لگا تو وہ جیسے ناچار بولی تھی۔

”اسیہ! پہلے مرحلے کی کامیابی پر اس کی آنکھیں ایک لحظہ کو پکس پھر فوراً سنبھل کر کہنے لگا۔  
”میرا خیال ہے مس! اسید! مجھے آپ کو گھٹک چھوڑنے میں کوئی زحمت نہیں ہوگی۔“

”جو سکتا ہے، پھر بھی میں جلی جاؤں گی۔“ اُس نے ایک طرح سے انکار کر دیا۔  
”کیسے جائیں گی۔ آپ تو چل بھی نہیں سکتیں۔ میرا مطلب ہے آپ کے پیس میں موقیع؟“

اُس نے فوراً احساس دلایا تو وہ خاموش ہو کر اپنے پیرو کو دیکھنے لگی۔ واقعی چلتا مشکل تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اس کے ساتھ جانا مناسب نہیں لگ رہا تھا اور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے۔  
 ”آپ کیا سوچنے لگیں؟“ بالآخر اُسے ٹوٹنا پڑا۔ اندر ہی اندر پریشان ہونے کے ساتھ خود کو یقین بھی دلایا تھا کہ اس لڑکی کے پاس اُس کے ساتھ جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔  
 ”جی۔“ اُس نے چونک کر دیکھا پھر لمبی میں سر ہلا کر بولی۔

”جیس بھی آپ کے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔“  
 اُس نے کہا تو اُسے ایک دم سے گھر کا خیال آیا اور وہ پریشان ہو گئی۔ کیونکہ آج تو یوں بھی اُسے جلدی گھر جانا تھا۔ بیٹھے آج ہی کو تنگ کر رہے ہوں گے اور چاہیں کھانا بھی کھا یا ہوگا کہ نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور ان ساری باتوں کا خیال آنے کے باوجود وہ اُسے دیکھ کر حتمی انداز میں بولی۔  
 ”سوری، میں آپ کے ساتھ نہیں جاسکتی۔“



۱ ص صاف انکار پر شاہ سکندر حیات کو سخت توہین کا احساس ہوا۔ اس کی پیشانی پر گرہی لکیریں نمودار ہوئیں۔ اس کی بچی اگر کوئی اور ہوتی یا ہوتا تو وہ ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر اُسے اٹھا کر باہر پھینک دیتا لیکن اس کے سامنے وہ خود کو بے بس محسوس کر رہا تھا۔ اور یہی بے بسی ہی تو اُس کی کمزوری کا سبب بنی تھی۔ مختصر ڈی کو شش سے خود پر قابو پا کر قدرے خوشگوار لہجے میں بولا۔  
 ”اوکے، جیسے آپ کی مرضی، اور میرا خیال ہے اس سے پہلے کہ آپ مجھے گینٹ لاسٹ کہیں مجھے خود ہی چلے جانا چاہیے۔“  
 ”نہیں پلےز۔ آپ کچھ دیر رک جائیں۔“ اُس نے کچھ مدت سے کہا تو وہ حیران ہو کر دیکھنے لگا۔ سمجھ کچھ نہیں پایا تھا کہ وہ کیوں روک رہی ہے۔ کوئی سوال نہیں کیا تب وہ ادھر ادھر دیکھ کر پوچھنے لگی۔  
 ”وہ میری کتابیں اور میرا بیگ؟“

”میری گاڑی میں ہے۔ لے کر آتا ہوں۔“ وہ کہتے ہوئے جانے لگا تو وہ فوراً بولی۔  
 ”ایک منٹ، ایک فنون کرنا ہے اگر آپ۔“  
 ”جی، مانتا ہوں۔“ وہ دروازے کے قریب رک کر پوری توہین سے دیکھنے لگا تو وہ نمبر بتا کر کہنے لگی۔  
 ”عدیل صاحب ہوں گے۔ ان سے کہئے گا، مجھے یہاں سے لے جائیں۔“  
 ”عدیل صاحب؟“ اُس نے سوچتے ہوئے انداز میں دہرایا اور کمرے سے نکل گیا۔ تو وہ بد ڈکی بنی پیرس کو کر سونچنے لگی۔

یعنی یہ حادثہ بھی آج ہی ہونا تھا۔ کتنے پریشان ہو رہے ہوں گے اباجی اور بچے۔ پریکٹیکل کے دلوں میں بھی وہ اتنی لیٹ نہیں ہوتی تھی۔ بہت دیر ہو گئی۔  
 اُس نے وقت دیکھنے کے لیے کلائی پر نظر ڈالی۔ گھڑی نہیں تھی۔ اور پہلا خیال یہی آیا کہ وہیں روڈ پر کہیں گر گئی ہوگی۔ اُسے انسو نہیں بلکہ دنگ ہونے لگا۔ کیونکہ وہ گھڑی اُسے بہت عزیز تھی۔ جب اُس نے میزک میں فرسٹ کلاس مقرر ہو کر بیٹھ لی تھی تب اباجی نے اُسے دیکھی۔ مگر اس کے بعد مختلف مباحثوں پر بحث ہوئی۔ اُسے بہت اچھی اور خوبصورت گھڑیاں دی تھیں لیکن اس سب سے پہلی اور اہم کی دنی ہوئی گھڑی کی اہمیت اس کے نزدیک سب سے زیادہ تھی کہ اُسے دیکھنے ہوئے جہاں وہ اپنی پہلی خانہ دار کا سیانی پر اسی روز کی طرح مسرور ہوتی تو اُن اُس کے اندر مزید کامیابیاں حاصل کرنے کا عزم پختہ ہو جاتا تھا۔ زرتشتہ قد سالوں سے وہ اس کی ساتھی تھی۔ اپنی خالی کلائی کو بہت نرمی سے وہ

دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے چھونے لگی۔ مٹا خیال آیا کہ وہ جو عدیل بجائی کو فون کرنے گیا تھا وہ ابھی تک واپس نہیں آیا۔

”کہیں چلا تو نہیں گیا؟“  
 وہ اُس نے جانے کا سوچ کر کچھ الجھنے لگی کیونکہ یہی بہت تھا کہ وہ اُسے یہاں تک لایا تھا۔ اس کے بعد میڈلین اور ڈاکٹر کی فیس غالباً اُس نے ادا کر دی تھی اور اُس نے عدیل بجائی کو بلایا ہی اس لیے تھا کہ وہ جو خرچ کر چکا ہے اُسے لوٹا دیں۔ خواہ مخواہ ایک اجنبی کا مقروض ہونا اُسے بالکل اچھا نہیں لگا۔ اور اگر وہ چلا گیا مگر تو واقعی بہت مشکل ہو جائے گی۔ وہ اسی صبح پیرس سوچ رہی تھی کہ کورڈور میں قدموں کی آواز سن کر فوراً دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ عدیل بجائی کے ساتھ اندر داخل ہوا تو اُسے کچھ اطمینان ہوا۔  
 ”کیا ہوا اسی؟“ تم غیبت سے تو ہو؟“

عدیل بجائی کی پریشانی فطری تھی۔ لیکن اُس کے پاس بیٹھے اور سر سے پاؤں تک اُسے دیکھنے لگے۔  
 ”میں شک ہوں بجائی، زیادہ جوت نہیں آئی، اُس نے سکڑا کر عدیل بجائی کی پریشانی کم کرنے کی کوشش کی۔ پھر کہنے لگی، اگر پیرس میں موج زانی تو میں آپ کو رحمت نہ دیتی۔ خود ہی گھر پہنچ جاتی۔“  
 ”خینکس گاڈ، لیکن یہ ہوا کیسے؟“ اتنی لاپرواہ تو تم نہیں ہو؟“ عدیل بجائی نے شکر کرنے کے ساتھ پوچھا۔  
 ”بس وہ؟“ وہ جانتے کیلئے کہنے جا رہی تھی کہ نظر خاموش کھڑے سکندر حیات پر بڑی تو عدیل بجائی کو اُس کی طرف متوجہ کرتے ہوئے بولی۔

”میرا خیال ہے بجائی، اپنے آپ ان کا شکریہ ادا کریں۔“  
 اور عدیل بجائی کو جیسے اُس کی موہو دگی کا احساس ہوا فوراً اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر اُس کا ہاتھ تھام کر بولے۔  
 ”میں بہت ممنون ہوں شاہ سکندر حیات آپ کا۔ بہت احسان کیا ہے آپ نے ہم پر۔“  
 ”کوئی احسان نہیں۔ آپ پلیز مجھے شرمندہ نہیں کریں۔“  
 وہ کہہ رہا تھا اور بالکل اچانک عدیل بجائی سے ہوتی ہوئی اُس کی نظرس اُس پر جا پھری تھیں۔

پتا ہے شہر باتو اکبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے شاہ سکندر کو میری ذرہ برابر پروا نہیں ہے بلکہ شاید بڑے سے میرے وجود کو ہی تسلیم نہیں کرتا۔“  
 فوراً کے گرد سنگ مرمر کی بنی چار دیواری کے قریب رک کر مہر النساء نے افسردگی سے کہا تو بانو چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔ پھر اُس کا ہاتھ تھام کر بولی۔  
 ”کھلی ہو تم، بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بجائی سکندر کو تمہاری پروا نہ ہو؟“  
 ”ایسا ہی ہے شہر باتو۔ وہ کسی اور دنیا میں رہتا ہے۔“ مہر النساء نے جھک کر پانی میں ہاتھ دالتے ہوئے کہا۔

بجائی سکندر کی دنیا صرف اور صرف تم ہو مہر و اور تمہاری دنیا سے نکل کر وہ کہیں نہیں جاسکتے۔“  
 بانو نے اُسے یقین دلایا۔  
 ”پھر وہ مجھ سے ناراض کیوں ہے؟“ مہر النساء اُس کا یقین کر کے ممی بے یقین سی تھی۔  
 ”جسے تم ناراضگی سمجھ رہی ہو وہ محبت کا ایک انداز ہے۔ شہر باتو نے اُسے چھیڑا۔  
 ”خینکس ہے۔“ میں ہاروں بجائی سے کہوں گی وہ بھی محبت کا ایسا ہی انداز اپنائیں۔“ مہر النساء نے فوراً اتارا۔  
 ”نامن۔ شاہ ہاروں کبھی تمہاری بات نہیں مانے گا۔“ شہر باتو کے لہجے کا زعم تار ہا تھا کہ اُسے اپنی تہ پختہ مہر و سا ہے۔ مہر النساء نے پانی میں سے ہاتھ کھینچ لیا۔ پھر اُسے دیکھ کر کہنے لگی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا شہر بانو نے انھیں نکالیں تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ بڑی دلاؤیز ہنسی تھی۔

وہ جوان دونوں اپنی کوئی ایک کلاس میں نہیں کرنا چاہتی تھی۔ پھر میں مومج کے باعث تین دن سے بستہ پر پڑی تھی اور بے حد جھنجھلا کر سوچ رہی تھی کہ اگر اس روز کا بجائی نہ جاتی تو عارضہ بھی نہ ہوتا لیکن زندگی میں آنے والے حادثوں کو کون روک سکتا ہے۔ اس روز نہ سہی پھر کسی دن یہ حادثہ تو اس کے ساتھ ہونا ہی تھا۔ جس میں کسی گاڑی سے ٹکرا نا شرط نہیں۔ اس کے ساتھ بس اتفاق تھا اور اصل حادثے کی خبر تو کسی کو نہیں تھی۔ جو اس کی نیندیں اڑالے گیا تھا۔ اس وقت اس سے ہٹ کر وہ صرف اپنے تعلیمی نقصان کا سوچ کر جھنجھلا رہی تھی۔ ظاہر ہے میڈیکل میں اس کا آخری سال تھا۔

”مجھو مجھو! کیا بہت درد ہو رہا ہے؟“  
”اُس کی جھنجھلاہٹ سے نیل بھی سمجھا کہ وہ درد سے بے چین ہو رہی ہے۔ اُس کا چہرہ انھوں میں لے کر یوں پوچھنے لگا جسے اُس کی تکلیف کو محسوس کر رہا ہو۔“  
”نہیں بیٹا! کوئی درد و درد نہیں ہو رہا۔ وہ نیچے کی اتری شکل دیکھ کر قصداً مسکرائی۔ دیکھو بالکل ٹھیک ہوں میں۔ بس ذرا چلنے میں پاؤں میں تھوڑی سی تکلیف ہوتی ہے۔ صبح تک وہ بھی نہیں ہوگی۔ پھر میں آرام سے کالج جا سکوں گی۔“

”نہیں مجھو! اب آپ کالج نہیں جائیں۔“  
”کیوں؟“ وہ سمجھ گئی تھی نیل کیوں منع کر رہا ہے پھر بھی انجان بن کر پوچھا۔  
”پھر آپ کی ٹکڑ ہو جائے گی۔“ نیل کا غصہ فوراً ظاہر ہو گیا۔  
”ارے نہیں میری جان ابار بار تھوڑی ایسا ہوتا ہے۔“ اُس نے نیل کا سر اپنے سینے پر رکھ لیا اور اُس کے گرد اپنے دونوں بازو لپیٹ کر مٹا کسی خیال میں گھر کر بولی۔

”وہ تو جس سے ٹکرا نا ہوتا ہے، اُس سے ٹکر ہوتی ہے اور پتا نہیں دوبارہ کبھی۔ لا حول و لا قوہ یہ تم نے مجھے کہاں اُلجھا دیا۔ جاؤ دیکھو اترا اور سونا کیا کر رہے ہیں۔“  
”نیل نے حیران ہو کر اُسے دیکھا پھر چپ چاپ کمرے سے نکل گیا تو اپنی حماقت پر پہلے اُس نے خود کو ڈکا پھر آپ ہی آپ ہنس پڑی۔

گزشتہ تین دنوں سے اُس سے ایسی ہی حماقتیں سرزد ہو رہی تھیں۔ بات کرتے کرتے اچانک ذہن بند ٹک جاتا اور پہلے پتا ہی نہ چلتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ اور یہ بھی غلیظ تھا کہ ابھی زیادہ تر نیچے ہی اُس کے پاس رہتے تھے۔ میمونہ بھائی تو اپنا پیشل سے آکر ابھی اپنے کمرے تک ہی محدود تھیں اور بے جاری اتان جی کو گھر کے سارے کام کرنے پڑ رہے تھے۔ کسی دقت اُس کے کمرے میں آکر کھڑے کھڑے اُس کا احوال پوچھ جاتیں۔ رات میں پتا نہیں کیسے بنید بھائی بڑی فراغت سے اُس کے پاس آئیں۔ کتنی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔ پھر اُس سے آئندہ کے بارے میں پوچھنے لگیں۔

”یہ تمہارا آخری سال ہے اُس کے بعد کیا کرو گی؟“  
”ظاہر ہے ہاؤس جاب۔“ اُس نے سیدھا سادا جواب دیا تو بنیلہ بھائی غصت سے بولیں۔  
”مشکل ہے۔ کیونکہ میں نے دیکھا ہے ہاں لڑکیاں سارا پڑھا لکھا جو بھلے ہیں جھوٹکی ہیں۔“  
اُس نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ اور وہ مزید گویا ہوئیں۔

”تمہارے ساتھ بھی یہی ہوگا۔ ادھر امتحانوں سے فارغ ہوئی نہیں کہ اتان جی اور آجی تمہاری شادی کی فکر میں لگ جائیں گے، ہے ناں؟“  
”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ وہ جز بڑی ہو کر بولی۔

”یہی تو غلط ہے۔ پڑھ کر کبھی دی جاووں بیسی بات کہ میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“

”کتنا یقین ہے تمہیں بارون بھائی پر۔ میں بھی ایسا ہی یقین چاہتی ہوں جو شاہ سکندر نے کبھی میری جیوتی میں نہیں ڈالا۔ بتاؤ یہ محبت کا کون سا انداز ہے؟“  
”تم ناحق بدگمان ہو رہی ہو۔ ہر ساری بات مزاح کی ہے۔ کوئی اظہار کرتا ہے اور کسی کو اظہار کرنا اچھا نہیں لگتا۔“  
”تم جھٹک کہہ رہی ہو لیکن جذبے کسی اظہار کے محتاج نہیں ہوتے شہر بانو۔ میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ۔ بارون بھائی نے کبھی تم سے یہ نہیں کہا ہوگا کہ انہیں تم سے محبت ہے۔ اس کے باوجود تمہیں ان کی محبت کا یقین ہے۔ بتاؤ کیوں؟“  
”مہر النساء براہ راست اُس کی آنکھوں میں انھیں ڈال کر سوالیہ نشان بن گئی۔

”یہ تو تجھے بھی نہیں معلوم۔“  
”شہر بانو کو کوئی جواب نہیں سوجھا تو دامن بچایا۔ اور مہر النساء ذرا سا ہنسی۔ تاسف بھری ہنسی تھی۔ جس پر شہر بانو اندر ہی اندر جزبہ زور ہو کر بولی۔

”سنو۔ میں پھر کہوں گی کہ تم ناحق بدگمان ہو رہی ہو۔ کیا سکندر بھائی کی انگلی میں تمہارے نام کی انگوٹھی نہیں ہے؟“  
”ایک اسی خیال کے سہارے تو اپنے تمام خدشات کو مات دیئے میں لگی ہوئی ہوں۔“  
”مہر النساء کے بچپن کی گفتگوں جھپٹائے نہیں تھیں۔ دوبارہ پانی پر جھٹکنا چاہتی تھی کہ گیت سے داخل ہوتی گرے لیکن گروزر کو دیکھ کر اپنا دوش بٹا سنبالنے میں لگ گئی۔ اُس کے ہر انداز سے گھبراہٹ خفاں تھی جسے محسوس کر کے شہر بانو نے لیٹ کر دیکھا۔ شاہ سکندر حیات گاڑی سے اتر رہا تھا۔ تب کچھ سوچ کر شہر بانو نے اُسے اس طرف آنے کا اشارہ کیا پھر مہر النساء کی طرف ہل کر سرگوشی میں بولی۔

”دیکھ لو۔ کئی دور سے بندھے چلے آ رہے ہیں۔“  
”کون؟“ مہر النساء نے چونک کر اُسے دیکھا۔

”جن سے آئی بدگمان ہو۔“ شہر بانو نے شرارت سے کہا اور جواب میں دیکھ کر کہنا چاہتی تھی کہ۔  
”سکندر حیات کے قریب آنے پر ذرا سا درج ہو کر کھڑی ہو گئی۔“  
”السلام علیکم بھائی۔“ شہر بانو نے فوراً سنبھل کر اُسے سلام کیا۔

”وسلام۔ کیسی ہو؟“ سکندر حیات نے بہن کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔  
”میں تو جھٹک ہوں بھائی۔ البتہ لوگوں کو آپ سے بڑی شکایتیں ہو گئی ہیں۔“  
شہر بانو کا اشارہ مہر النساء کی طرف تھا وہ سمجھ گیا اور اتفاق سے بہت اچھے موڈ میں تھا بلکہ مسرت سے عالم میں جیسے ہی سونچنے سے بولا۔

”لوگ براہ راست شکایت کریں تو بات بھی بنے۔“  
”ابھی بات بن جاتی ہے یا شہر بانو بیٹے ہوئے بولی اور مہر النساء کو کندھوں سے تمام کر اُس کی طرف موڑنا چاہتی تھی لیکن مہر و جلدی سے اُس کا ہاتھ ہٹا کر چند قدم آگے چلی گئی کیونکہ اس طرح وہ شاہ سکندر حیات کا سامنا نہیں کر سکتی تھی۔ جب دل پوری قوت سے دھککنے لگا تھا اور اپنے جبر سے اتنی قویں قزح وہ خود بھی محسوس کر رہی تھی۔ شاہ سکندر نے بہن کو دیکھ کر ذرا سے کندھے اچکائے پھر بی بی جان کا پوچھ کر اندر چلا گیا تب شہر بانو نے لپک کر زور سے مہر النساء کے بازو میں چٹکی کاٹی۔

”اب بتاؤ، کون کس سے ناراض ہے؟“  
”مجھے نہیں پتا۔“ اپنی دھڑکنوں پر قابو پاتے میں معروف مہر النساء دھیرے سے بولی۔  
”بڑی بے ایمان ہو تم۔ خراخواہ میرے بھائی پر شک کرتی ہو؟ شہر بانو اس موقع سے فائدہ اٹھا اُسے وہم سے نکالنا چاہتی تھی کہ شاہ سکندر کو اُس کی پروا نہیں۔ اور وہ چھپ کر بولی۔  
”خراخواہ تو نہیں۔“

بہت کچھ سوچ ڈالا تھا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ اس کی ہر سوچ پر اپنا نام لکھ گیا تھا۔

کلاسز آف ہوتے ہی اُس نے لائبریری کا رخ کیا۔ پانچ دن کی عرصہ حاضری سے واقعی اُس کا بہت نقصان ہوا تھا۔ اور اتنا ہی تراج بھی اُسے نہیں آئے دے رہی تھیں لیکن وہ مندرکہ علی آئی۔ ساتھ ہی اماں جی سے یہ بھی کہہ آئی تھی کہ اُس کی دلچسپی دیر میں ہوگی کیونکہ اُسے گزشتہ دنوں کے نوٹس تارنے تھے۔ لائبریری میں اس وقت خاصا سکون تھا۔ جتنے اسٹوڈنٹس موجود تھے سب اپنے کام میں مصروف تھے وہ ایک نظر میں سب کا جائزہ لے کر آخری بیس پر آئی تھی اور فائل کھول کر اپنے کام میں مصروف ہوئی تو وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا چار بج چکے تھے اور مسلسل لکھتے لکھتے اُس کی انگلیاں دکھنے لگی تھیں۔ پھر بھی اُس نے باقی نہیں روکا کیونکہ اب دو تین صفحے لکھنے رہ گئے تھے اور کل پریکٹس دینے کے بجائے اُس نے سوچا اسی وقت مکمل کر لے۔ وقت گزرنے کا احساس بھی تھا ابھی وہ اور تیز باغیچہ چلنے لگی۔ تبھی اُس کی نظروں کے عین سامنے وہ گھڑی آگئی جس کے کھولنے کا ہلکا سا جھکاؤ اُس کے اندر سے جھٹکا نہیں ہوا تھا۔ اُس کا چلتا ہوا ہاتھ رک گیا اور بے اختیار سر اٹھانچا گیا تو بہت قریب شاہ سکندر حیات ہونٹوں میں دلخیز مسکراہٹ دہانے لگا تھا۔

”آہ“ سراسیمہ سی آپ کہنے کی کوشش میں اس کے ہونٹ نیم دا ہو کر رہ گئے۔  
”جی شاہ سکندر حیات!“ وہ ایک ہاتھ سینے پر رکھ کر ذرا سا جھکا تو وہ اُس پر سے نظریں ہٹا کر اپنی گھڑی ہاتھ میں لے کر پوچھنے لگی۔

”یہ آپ کو کہاں سے ملی؟“  
”اُس روز میرے پاس رہ گئی تھی بلکہ میں نے قصداً اپنے پاس رکھ لی تھی!“ شاہ سکندر نے صاف گونی سے کہا۔  
”کیوں؟“

”دوبارہ ملاقات کو بہانا چاہیے تھا!“ اتنی جرات پر اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ لیکن وہ کمزور لڑکی نہیں تھی نہ ہی اتنی جلدی خود کو اُس پر عیاں کرنا چاہتی تھی جب ہی پہلے میں قدرے ناگواری سے سو کر بولی۔  
”کیوں؟“

”یہ تو آپ اپنے آپ سے پوچھیں!“ وہ کہتے ہوئے اُس کے دامن جاب کرسی کیچنگ کر بیٹھ گیا تو اُس نے ایک لحاظ کو اسے دیکھا پھر گویا بات ختم کرنے کی عرض سے بولی۔  
”بہر حال آپ کا بہت بہت شکریہ!“  
”کس بات کا؟“

”گھڑی لوٹانے کا!“ وہ کچھ بے نیازی سے کہہ کر اپنی چیزیں سیٹھنے لگی۔ اندازاً ایسا تھا جسے ابھی اُنھ کے چل دے گی۔ اور واقعی فائل سینے سے لگا کر گھڑی ہوئی تو وہ ایک دم سجدہ ہو کر گرلا۔  
”سینس مس! میں اتنی دور سے آپ کو صرف گھڑی لوٹانے نہیں آیا!“ وہ پھر کچھ کہتے رہ گئی اور ادھر ادھر دیکھ کر بولی۔

”میر خیال ہے۔ یہاں بیٹھنا مناسب نہیں ہے۔“  
”میرا بھی یہی خیال ہے!“ وہ فوراً کھڑا ہو گیا۔ دونوں باہر نکل کر آئے تب وہ کہنے لگا۔  
”میں پہلے آپ کے گھر گیا تھا۔ وہاں آپ کے آبا جی سے ملاقات ہوئی۔ اُن سے میں نے آپ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا۔ آپ یہاں ملیں گی۔“  
”جی!“ وہ واقعی بے حد حیران ہوئی۔ ”آپ نے آبا جی سے میرے بارے میں پوچھا۔“

نبیلہ بھابی پہلے تیز ہو کر بولیں پھر جیسے موڈ میں آکر اُسے سمجھانے لگیں۔  
”دیکھو۔ تم بہت ذہین لڑکی ہو۔ اپنے پیشے میں بہت نام کما سکتی ہو۔ ہمیں گائے بکری بننے کی ضرورت نہیں ہے کوہاں باب جس کھونٹے سے چاہیں باندھ دیں۔ ہمیں اپنے بارے میں سوچنے کا حق ہے اس حق کو ضرور استعمال کرنا۔ سمجھ رہی ہوں؟“

وہ ایک لفظ جی تک نہیں کہہ سکی۔ کچھ کم صدم سے انداز میں دیکھنے لگی۔ تب نبیلہ بھابی اُس کا ہاتھ ہلا کہنے لگیں۔

”مجھے غلط مت سمجھو۔ میں تمہیں اسکا نہیں رہی بلکہ تم پر تمہاری اہمیت واضح کر رہی ہوں۔ میٹرک سے پوزیشن لیتی آ رہی ہو۔ مزید کامیابیاں تمہاری منتظر ہیں۔ اسکا لریٹ پرائیٹ آرس ایس کے پابہ جا سکتی ہو لیکن میں جانتی ہوں اماں جی اور آبا جی پرکز تمہیں باہر نہیں جانے دیں گے۔ اس کے برعکس دیکھنا کہ وہ تمہاری شادی پر زور دیں گے اور میں یہ نہیں کہہ رہی کہ شادی نہیں کرنا، ضرور کرنا لیکن ایسے شخص کے ساتھ جو تمہاری صلاحیتوں کا اعتراف کرنے کے ساتھ انہیں استعمال کرنے کی تمہیں پوری آزادی اور ایسا شخص تمہارا ہم پیشہ ہی ہو سکتا ہے۔“

انہوں نے کچھ دیر خاموش ہو کر ٹوٹتی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھا پھر رازداری سے پوچھنے لگیں۔  
”اس عرصے میں کسی نے پروپوز تو کیا ہوگا تمہیں؟“ اُسے بہت شرم آئی کیونکہ نبیلہ بھابی کے سا اُس کی بے تکلفی نہیں تھی۔ سر جھکا کر دھیرے سے بولی۔

”نہیں بھابی!“  
”اس میں قصور کس کا ہے۔ سراسر تمہارا کیونکہ کتابوں سے ہٹ کر کبھی ادھر ادھر دیکھا ہی نہیں ہوگا اُن سے۔“

نبیلہ بھابی یوں افسوس سے بولیں جیسے اُس نے وقت گنوا دیا ہو۔  
”شاید ایسا ہی ہے۔ اُس نے اعتراف کیا۔“

”شاید نہیں یقیناً۔ بہت اچھی طرح جانتی ہوں میں تمہیں۔ اور بتاؤ تو کون سا معاملہ مل جائے گا تمہیں ڈگری کے ساتھ اعزازی سند ملے گی؟“

نبیلہ بھابی جل کر بولیں اور وہ بمشکل اپنی ہنسی روک پائی۔ پھر ایک طرح سے اپنی جان چھڑانے کا خاطر اُن کے ہاتھ مقام کر بولی۔

”بھابی! آپ کے ہوتے ہوئے مجھے کیا ضرورت ہے اپنے بارے میں سوچنے کی؟“

”صدقے تمہاری سعادت مندی کے۔“ نبیلہ بھابی کا انداز تیار ہوا تھا کہ انہیں اُس کی بات پسند نہیں آئی۔ مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے اُنھ گھڑی ہوئیں پھر دروازے تک جا کر پلٹ کر بولیں۔

”سنو! میری باتوں پر سنجیدگی سے غور کرنا۔“

”جی!“ اُس نے فوراً سر ہلایا اور اُن کے چلتے ہی گہری سانس کیچ کر بھڈکی بنی پر سر رکھ لیا۔ اُسے نبیلہ بھابی کی باتوں سے اختلاف نہیں تھا لیکن اتفاق کرتے ہوئے بھی وہ خود کو بے بس محسوس کر رہی تھی۔

یہ صحیح ہے کہ گزشتہ چار سالوں میں اُس نے کتابوں سے ہٹ کر کبھی ادھر ادھر دیکھا ہی نہیں تھا اور گو کہ ابھی وقت اُس کی دسترس میں تھا لیکن اب وہ کہاں دیکھتی۔ یہاں وہاں ہر طرف ایک ہی جہاں تھی جس کے بارے میں وہ صرف اتنا جانتی تھی کہ اُس کا نام شاہ سکندر حیات ہے۔ حالانکہ اُس روز وہ کلینک سے ہی رجسٹر نہیں ہو گیا تھا بلکہ اسے اور عدیل بھابی کو گھر تک چھوڑنے آیا تھا اور عدیل بھابی اُس سے اتنے متاثر ہوئے تھے کہ صرف اسے بٹھایا بلکہ اُس کی خاطر مدارت بھی کی تھی۔ آبا جی بھی اُس سے ملے تھے اور ظاہر ہے اُس نے اپنے بارے میں بہت کچھ بتایا ہوگا لیکن وہ کیونکہ اُس روز سے اپنے کرتے ہی تک محدود تھی۔ اس لیے کچھ زیادہ نہیں جان سکی تھی۔ البتہ اپنے آپ اُس کے بارے میں



”کیوں نہیں پوچھنا چاہیے تھا؟“ وہ نظارہ بہت پسند لگی۔ پوچھ رہا تھا لیکن اُس کی آنکھوں میں چمکتی شوقی چٹنی نہیں رہ سکی۔ جس پر وہ خشکی سے دیکھنے لگی۔ تو فوراً ساہنس کر وہ کہنے لگا۔  
”بس فوراً سی غلطی ہوگئی ہے۔ مائل بات کچھ لوں ہے کہ میں نے آپ کے آبا جی سے آپ کی خیریت معلوم کی تھی جس پر انہوں نے بتایا کہ آپ اب بالکل ٹھیک ہیں اور آج کا دن بھی اچھا ہے۔“  
اور آپ سہلے سے یہاں چلے آئے ہر وہ فوراً آگئی۔

”بڑا لگا آپ کو میرا آنا؟“ ایک بل میں وہ اُسے اپنی گرفت میں لے گیا اور اُس کے لیے خود کو چھپانا ممکن نہیں رہا۔ جان گئی خواہ کتنی بھی کوشش کرے کامیابی نہیں ہوگی۔ سر جھکا کر دھیر سے بولی۔

”نہیں؟“ ”شکریہ“ وہ بے حد سرشار ہو گیا۔ اپنی گاڑی کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ”چلیے آپ کو گھر ڈراپ کروں؟“  
”نو ٹینکس۔ میں چلی جاؤں گی۔“ اُس نے مہربانی سے منع کیا تو شاہ سکندر نے مزید اصرار نہیں کیا اور کچھ دیر تک کمر بستہ لگا۔

”مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے لیکن ابھی نہ وقت ہے نہ یہ جگہ مناسب ہے۔ میں پھر آؤں گا۔ کب؟ دن اور وقت آپ بتا دیں۔ جگہ نہیں ملے کروں گا۔“ اُس کی بات پر وہ شش و پنج میں پڑ گئی۔ وہ جذباتی لڑکی نہیں تھی ہوا کچھ بند کر کے اُس کی بات مان لیتی اور مشکل یہ تھی کہ اُسے مایوس بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ بہت سوچ کر بولی۔  
”میرا خیال ہے آپ میرے گھر کا راستہ دیکھ چکے ہیں کبھی دن بھی آجلیے؟“  
”آپ نے شاید ٹھیک سے میری بات سمجھ لی تھیں۔ جگہ میں ملے کروں گا۔ آپ صرف دن اور وقت بتائیے۔“ اُس نے زور دے کر کہا تو وہ بے بسی سے بولی۔

”میں نہیں بتا سکتی۔“ اور اُس نے کیوں کا سوال ہی نہیں اٹھایا خود ہی ملے کر کے بولا۔  
”ٹھیک ہے آج ہی کے دن۔ جب گھر کی کسٹنیاں AM سے نکل کر PM کی طرف پہلا قدم بڑھائیں گی۔ یاد رکھیں گا۔ خلاصہ فطرت۔“

وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا اور بہت خاموشی سے اُسے جلتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اُس کی گاڑی نظروں سے اوجھل ہوگئی تب اپنے اطراف دیکھتے ہوئے وہ جیسے ہوش میں آگئی۔ اور گھٹانے تک وہ سوچ کر خود کو سخت سست کہتی رہی کہ اتنی دیر باتیں کرنے کے باوجود بھی وہ اس کے بارے میں کچھ نہ جان سکی تھی۔ یعنی ابھی بھی وہ اس کے لیے سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔ پھر گھر کے گیٹ میں داخل ہوتے ہوئے معاہدے یاد آیا کہ اس کے پاس اُسے سے پہلے وہ یہاں سے ہو کر گیا ہے۔ اُس نے تو یہ بھی کہا تھا۔ اسے بتا نہیں سچ کہا تھا یا محض اُسے چھپنا مقصود تھا۔ وہ بہر حال کچھ فیورٹ سی ہوگئی کہ اُس کی آمد کو کہیں کوئی اُسے تو منسوب نہیں کر رہا۔ یہ شاید اُس کے دل کا چور تھا۔ خود وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی آئی۔  
کچھ دیر بسنے اور منہ اچھو دھوئے میں قندار ڈال گئی۔ اس کے بعد بالوں میں برش کر رہی تھی کہ میمورنڈم اُس کے لیے چائے لے کر آئیں۔ وہ سچ مجھے حد ضرمند ہوئی۔

”آپ مجھے کمال کرتی ہیں بھائی۔ میں خود تنہا لیتی۔“  
”آئی تو تنہا ہی ہوئی آئی ہو۔ میمورنڈم بھائی کہے گا۔ پر پر رکھ کر آرام سے اُس کے بیڈ پر بیٹھ گئیں۔ تو وہ پوچھ رہی تھی کہ کبھی؟“  
”امان جی کے پاس۔ تیل کی ماش کر رہی میں اُسے اور ہاں اُس چھوٹے کا نام آبا جی نے عرصہ کھا ہے۔“  
بھائی نے بتایا تو وہ خوش ہو کر بولی۔

”ماشاء اللہ اور آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“  
”ٹھیک ہیں۔ بس ذرا لا میمورنڈم بھائی جانے کیوں خاموش ہو گئیں تو اُس نے فوراً ٹوکا۔“  
”ذرا کیا؟“

”جیسو ڈور۔ اب کنواری لڑکی سے کیا کہوں؟“  
”جانب ایہ کنواری لڑکی تقریباً ڈاکٹر مان جی جی ہے۔ بتائے کیا تکلیف ہے؟ وہ اپنی اہمیت جتلاتے ہوئے فوراً آنکھیں اُڑا کر ان کی کلائی تھامنا چاہتی تھی کہ وہ اپنا ہاتھ کھینچ کر لو لیں۔“  
”بس رہنے دو۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ چلو تم اپنی چائے پیو۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے آپ مجھے؟“  
”نہیں نہیں، میں نہیں پوری ڈاکٹر مان جی ہوں۔ میمورنڈم بھائی نے درمیان ہی میں اُس کی بات اچک لی۔“  
”تو اس ڈاکٹر کا مشورہ یہ ہے کہ ابھی آپ کو کرام کی ضرورت ہے۔“  
”خلک کے لیے اپنا مشورہ اپنے پاس رکھو۔ سدا دن امتلا جی کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتے دیکھیں۔ ایمان سے اتنی شرم آتی ہے۔ ابھی مگر کوئی ان کے حوالے کر کے میں چکے سے چڑھیں۔ اُن کی تھی لا میمورنڈم بھائی باقاعدہ اُس کے سامنے ہاتھ توڑ کر لو لیں۔“

”بہت اچھا کرتی ہیں امتلا جی اور آپ کو کچھ میں کیا کام تھا؟“ اُس نے ان کی جھنجھلاہٹ کو یکسر نظر انداز کر دیا۔  
”ہام تو اب کروں گی۔ یعنی رات کا کھانا پکا ڈالوں گی۔ میمورنڈم بھائی نے بھی جیسے اُسے چڑایا لیکن وہ ہنس پڑی۔“  
”آپ بھی کمال ہیں۔ لوگ تو کام نہ کرنے کے ہمارے ڈھونڈتے ہیں۔“  
”اللہ کا شکر ہے۔ لوگوں کی وہ قسم اس گھر میں نہیں پائی جاتی۔ تم بھی تو چار دن میں بیزار ہو گئی تھیں۔ میمورنڈم بھائی نے کہا تو وہ تائید کرتے ہوئے بولی۔

”واقعی؟ وہ تو شکر ہے معمولی تو ہیں تھیں۔ اگر کہیں سیریس ایکسیڈنٹ ہوتا تو؟“  
”اللہ کرے۔ اسے ہاں ایکسیڈنٹ پر یاد آیا آج وہ آیا تھا۔ کیا تاہم ہے اس کا وہ جو تیس روڈ سے اٹھا کر کلیک لے گیا تھا۔ کیا نام تھا بھلا اُس کا؟“  
”میمورنڈم بھائی بتا کر اُس سے پوچھنے لگیں تو وہ اپنی بے ترتیب ہوتی دھڑکنوں سے گھبرا کر اُن کے پاس سے آنکھیں ہٹے ہوئے بولی۔

”پتا نہیں شاید سکندر؟“  
”ہاں سکندر۔ یاد آیا۔ شاہ سکندر حیات؟“  
”کیوں۔ میرا مطلب ہے کیوں آیا تھا؟“ اُس نے کن اکھیوں سے میمورنڈم بھائی کو دیکھ کر پوچھا۔  
”پتا نہیں۔ تو بھئی سامنے چلا آیا ہو گا۔ آبا جی تو بہت تعریف کر رہے تھے اُس کی۔“  
”میمورنڈم بھائی کا انداز سرسری تھا جس پر وہ قدرے اطمینان سے ہوگئی تھی۔

انہی تھیں جاننے والی خاموشی کو محسوس کرتے ہی شاہ سکندر حیات جو تک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اُس کے نتیجے جھنجھکیاں ابھی یہاں آکھ پھولی کھلتے ہوئے بہت شور مچا رہے تھے۔ اور اب کوئی بھی نہیں تھا۔ شام گہری ہو رہی تھی اور یقیناً انہیں بی بی جان نے اندر بلا لیا ہو گا۔ کیونکہ دنوں وقت ملنے پر بی بی جان تھوڑے پھول کو بارہ درہ کی طرف نہیں جانے دیتی تھیں۔ شاہ سکندر کا ذہن پھر دیر کو ادھر ادھر بھٹکا پھر وہ کسوٹی سے اُس لڑکی کو سوچنے لگا جس سے ملنے کے بعد سے اُسے اپنی زندگی میں کچھ بچل کا احساس ہونے لگا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے سیدھی سپاٹ زندگی جس میں روزمرہ کے معمولات جیسے بیٹھ سے ملے تھے۔ اور بی بی پردہ مٹھن بھی تھا لیکن اب اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ خود کو بھلا تا رہا ہے۔ جب بھی اُس

کے اندر کسی بے نام سی آرزو نے انگڑائی لی وہ یہ کہہ کر خود کو اطمینان دلاتا کہ کیا کمی ہے۔ میرے پاس سہ کچھ تو ہے۔ اور واقعی سب کچھ تھا لیکن دل کی دنیا خالی۔ ویران کھنڈر جس میں مہر النساء کی محبت بھی پھول نہیں کھلا سکی تھی۔ حالانکہ وہ بے خبر نہیں تھا۔ لیکن کیا کرتا۔ اس کا دل بھی مہر النساء کی طرف مائل ہو سکا۔ اس وقت بھی نہیں جب بابا جان نے ان دونوں کی نسبت طے کی تھی اور اس نے احتجاج کیا کہ کیا تھا کہ کسی اور کا خیال نہیں تھا۔ اور اب خیال، خراب بلکہ دل کی دنیا میں بھی جو پھل بھی مٹی وہ اسے لگ رہی تھی۔ بڑے برکیت لمحات تھے جب وہ تصور میں اسے مخاطب کر رہا تھا۔ تبھی ملازم جیرا آواز سے اس کا تصور چٹکا چور ہو گیا۔ بے حد ناگواری سے اسے دیکھ کر غصے سے بولا۔

”کیا بات ہے؟“

”اوجی، تسال نول وڈے شاہ جی نے یاد کیا اسے“

جیرا اس کے غصے سے سہم کر بولی تو وہ مزید سوال جواب کیے بغیر اُٹھ کر اندر چلا آیا۔ بابا جان خلاف معمول اس وقت ہال کمرے میں بی بی جان کے پاس بیٹھے نظر آئے۔ وہ انہیں سلام کرتے ہوئے فاصلے پر بیٹھ گیا تو بی بی جان فوراً اس کی طرف متوجہ ہو کر بولیں۔

”ہم تمہاری آیا اور بانو کی طرف جا رہے ہیں۔ تم بھی چلو“

”میں۔ میرا مطلب ہے اس وقت۔ خیریت تو ہے؟“ اس نے کھوجتی ہوئی نظروں سے باری بار کو دیکھ کر پوچھا۔

”سب خیریت سے بیٹا، بس تمہاری بی بی جان کو اچانک بیٹی کی یاد تازہ ہو گئی ہے۔“

بابا جان نے اس کی تشویش پر تسلی دیتے ہوئے کہا تو بی بی جان کچھ ناراض سی ہو کر بولیں۔

”اچانک تو نہیں شاہ جی، اتنے دنوں سے کہہ رہی ہوں نور بانو کی کوئی خیر خبر نہیں آئی اور اب تو گھبرا رہا ہے۔“

”بڑے یوتھ کی مال۔ بچوں کے سامنے روتے نہیں ہیں۔ بی بی جان کی آواز بھرتے پر بابا جان۔ انہیں نو کا پھر اس سے پوچھنے لگے۔

”چل رہے ہو سکندر؟“

”اگر آپ کا حکم ہے تو مال نہیں سکتا۔ وہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

”جیتے رہو بیٹا! لیکن یہ راجہ نہیں ہے۔ چلتا چاہو تو چلو۔“ بابا جان نے اس کی مرضی پر چھوڑ دیا۔

”مشکریہ بابا جان! پھر آپ ہوا کیسے۔ میں پھر کسی دن چلا جاؤں گا۔“ اس نے فوراً شکریے کے ساتھ سے معذرت کر لی۔

”اچھی بات ہے۔ ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے۔ ہم آتے ہیں۔“

بابا جان نے کہا تو وہ باہر نکل آیا۔ اور ڈرائیور سے گاڑی نکالنے کا کہہ کر وہیں ٹک کر بابا جان بی بی جان کا انتظار کرنے لگا۔ پھر انہیں رخصت کرنے کے بعد اندر آ رہا تھا کہ معاً شہر بانو کا خیال آیا وہ بی بی جان کے ساتھ نہیں گئی۔ یہی پوچھنے وہ اس کے کمرے کی طرف چل پڑا۔

”شہر بانو! شاہ سکندر نے پہلے پکارا پھر اس کے کمرے کا دروازہ کھولا تو وہ دوپٹا سنبھالتے ہو کھڑی ہوئی۔

”بی بی جان!“

”تم بی بی جان کے ساتھ نہیں گئیں۔ آپا کی طرف؟“ اس نے پوچھا۔

”میں تو جانا چاہتی تھی لیکن بی بی جان نے منع کر دیا۔ شہر بانو نے کہا۔ انداز سے ظاہر تھا کہ اسے افسوس ہے۔

”کیوں۔ کیوں منع کیا بی بی جان نے؟“

”پتا نہیں۔“

”اچھا جائے دو۔ میں تمہیں کراچی لے جاؤں گا۔ وہ میرا دوست ہے ناں احمد حسن، اس کی امی اکثر کہتی ہیں کہ بی بی جان اور شہر بانو کو لے کر آؤ۔ اس بار میں تمہیں ضرور لے جاؤں گا۔“

اس نے مسکرا کر ایک طرح سے اسے بھلائی کی کوشش کی لیکن وہ منہ پھلا کر بولی۔

”بی بی جان نہیں جانے دیں گی۔“

”میں کہوں گا بی بی جان سے اور دیکھنا وہ منع نہیں کریں گی۔ چلو اب جلدی سے موڑ ٹھیک کرو۔ وہ اس کا سر ہلا کر لولا تو وہ ذرا سا ہنسی پھر ہو چھٹے لگی۔

”آپ کب جائیں گے کراچی؟“

”چار دن رہ گئے ہیں۔ وہ جیسے دن گن رہا تھا۔ بے حسیابی میں اُسی حساب سے کہہ گیا پھر فوراً احساس ہونے پر قدرے پشیمان ہوا۔ ”میرا مطلب ہے۔ تین چار دن میں چلیں گے۔ تمہیں کچھ لینا ہے وہاں سے؟“

”جی۔ میں بہت ساری شاپنگ کروں گی۔ شہر بانو خوش ہو کر بولی۔

”اچھی بات ہے۔ وہ اس کے خوش ہونے پر اطمینان سے ہو گیا۔ پھر جاتے جاتے ٹک کر بولا۔ اب ذرا اچھی سی جائے میرے کمرے میں معبود دو۔“

”ایک منٹ رکھ بھائی!“ شہر بانو کچھ یاد آنے پر اسے روکے ہوئے الماری کی طرف بڑھ گئی۔ وہ خاموشی سے دیکھنے لگا۔ شہر بانو الماری میں سے ایک پیکٹ نکال کر اس کے قریب آئی اور دونوں ہاتھوں پر پیکٹ رکھ کر اس کے سامنے کرتے ہوئے بولی۔

”یہ مہر النساء نے آپ کے لیے بھیجا ہے۔“

”کیا ہے اس میں؟“ اس کا سارا اشتیاق پل میں رخصت ہو گیا۔

”بخدا میں نے کھول کر نہیں دیکھا۔ ہزار تحفے کے باوجود۔“

”شہر بانو خوشی سے مسکرا رہی تھی۔ اور وہ ایک سرسری نظر پیکٹ پر ڈال کر کہنے لگا۔

”میری طرف سے اجازت ہے۔ بے شک کھول کر دیکھو۔ اس کے بعد مہر النساء کو لونا کر کہنا کہ اسے کسی ایسے شخص کے لیے سنبھال رکھے جو اس کی قدر کر سکے۔“

”بھائی!“ شہر بانو کا دل انجانے انڈیشوں سے کانپ کر رہ گیا اور وہ فوراً اس کے کمرے سے نکل گیا تھا۔

اتنا جی آج کل سارا وقت عمر کے ساتھ لگی رہتی تھیں۔ اسے تیل کی مالش کرنا پھر نہلا نا اس کے بعد پاؤں آٹھوں میں بھر بھر سرمر۔ پھر اپنے پاس ہی سلا لیتیں۔ بس دودھ کے اوقات میں ہی وہ میمونہ بھابی کے پاس نظر آتا تھا۔ اور میمونہ بھابی بڑے آرام سے تھیں۔ اس وقت کچن میں اس کے پاس کھڑی کہہ رہی تھیں۔

”میں نے تو صرف بچے پیدا کیے ہیں۔ ان کی پرورش کی تکلیفیں تو میں جانتی ہی نہیں۔“

”دعا میں دیں اماں جی کو؟“ اس نے کھولتا ہوا پانی کی پاٹ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”اماں جی کو میری دعاؤں کی کیا ضرورت ہے۔ البتہ تمہارے لیے دعا کرتی ہوں کہ اللہ تمہیں اماں جی جیسی ماس دے۔“

میمونہ بھابی نے بڑے غلوں سے کہا۔

”بیٹے۔ اگر میری قیمت میں سر سے ساس ہی نہ ہو تو؟“

”اس نے شرارت سے کہا اور میمونہ بھابی اپنی ذمہ میں بول گئیں۔

”کیوں نہ ہو ضرور ہوگی۔“

”اب کہہ دیجئے جیسا ساس کے بنا بھی کوئی زندگی ہے۔“

”بالکل! اپنے لیے تو میں۔ یہی کہوں گی۔ پتا ہے اسلام آباد سے سیما کا فون آیا تھا۔ بہت اصرار سے

اتماں جی اور اتاجی کو بھاری تھی۔ اور میں اس وقت سے یہ سوچ کر پریشان ہو رہی ہوں کہ اگر اتماں اور اتاجی کچھ دنوں کے لیے بھی اسلام آباد چلے گئے تو ہمارا کیا ہوگا؟  
 میمونہ بھائی نے ساس سسر کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے بتایا تو وہ بڑے آرام سے بولی۔  
 ”فکر نہیں کریں، ہم بھی ساتھ چلیں گے۔“  
 ”ہاں سارا گھر جانے گا۔ ہمیں تو کھانا ہے اسلام آباد۔“

”اچھا چلیں، پہلے چلے پی لیں۔“  
 وہ مڑے اٹھا کر بولی اور میمونہ بھائی کے ساتھ کچن سے نکل کر اتماں جی کے کمرے میں آئی تو وہاں امرا سونیا اتماں جی کی گود سے عمر کو لینے کی ضد کر رہے تھے اور اتماں جی انہیں ڈانٹ رہی تھیں۔  
 ”کیوں تنگ کر رہے ہو اتماں جی کو۔ چلو کھاؤ یہاں سے۔“  
 میمونہ بھائی نے سختی سے ڈانٹ کر دونوں کو بھٹکا یا تو اتماں جی ان پر ناراض ہونے لگیں۔  
 ”ہائیں دلہن! اس طرح ڈانٹتے ہیں بیٹوں کو۔ دیکھو تو کیسے چھوٹا سامنے کر گئے ہیں یا میمونہ بھائی تو کچھ نہیں بولیں لیکن وہ کہے بغیر نہیں رہ سکی۔“  
 ”اور جو آپ ڈانٹ رہی تھیں اتماں جی۔“

”میں کب ڈانٹ رہی تھی؟“  
 ”خیر چھوڑیں، اچلے نہیں۔ وہ مڑے میں کب سیدھے کرتے ہوئے بولی۔ پھر چلے بنا کر پہلے آنا پھر میمونہ بھائی کو دئی۔ اور اپنا کپ لے کر تخت پر آرام سے بیٹھ گئی۔ تب ایک دم نبیل کا خیال آ پونچھنے لگی۔“

”نبیل نظر نہیں آیا۔ اوپر سے کیا؟“  
 ”نہیں، بڑی دلہن آج اسے اپنے ساتھ لے گئی ہیں۔“  
 اتماں جی نے ناگوار سے انداز میں بتایا تو اس نے مزید کچھ پوچھنے کا ارادہ ترک کر دیا اور تدریس سے محض اتماں جی کو خوش کرنے کی خاطر کہنے لگی۔  
 ”اتماں جی! اب عدیل بھائی کی شادی کر دیں۔ گھر کی رونق میں اضافہ ہو جائے گا۔“  
 ”ہاں اتماں جی! اب تو ماشاء اللہ عدیل ابھی پوسٹ پر ہے۔ اس کی شادی ہو جانی چاہیے۔ میمونہ نے فوراً اس کی تائید کرتے ہوئے کہا، لیکن اتماں جی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پہلے کیا سوچنے لگا۔  
 ”آپ کو چاہیے عدیل بھائی باہر جانے کا سوچ رہے ہیں؟ اس نے کہا تو اتماں جی جو تنگ کر گئیں۔“

”مے سے کس نے کہا؟“  
 ”خود عدیل بھائی نے۔ کسی جرمن فرم میں ایلائی کر رکھا ہے انہوں نے۔ مجھ سے کہہ رہے تھے میرا پائمنٹ ہو جائے تو پھر میں جرمنی چلا جاؤں گا۔ آپ کو نہیں بتایا انہوں نے؟“  
 ”آخر میں اس نے کچھ عجیب سے پوچھا پھر خود ہی کہنے لگی۔“  
 ”آپ پریشان ہو جاتی ہیں ناں۔ اس لیے نہیں بتایا ہوگا۔“  
 ”حالانکہ یہ پریشانی کی نہیں خوشی کی بات ہے۔“ میمونہ بھائی کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کر کمرے سے نکل گئیں۔

”بھائی ٹھیک کہہ رہی ہیں اتماں جی۔“  
 ”ہاں تم سب بھینک بکتے ہو۔ ایک میں ہی غلط سوچتی ہوں۔“  
 اتماں جی رنجیدہ ہو کر بولیں۔ انہیں انہوں اس بات کا ہٹکا کہ عدیل بھائی نے انہیں نہیں بتا وہ اندر ہی اندر ہتھیان ہوئے تھی کہ ناحق یہ موضوع چھیڑا۔ پھر ان کی دہلوانی کی خاطر ان کے گلے ڈال کر بولی۔

”آپ سمجھ غلط نہیں سوچ سکتیں اتماں جی۔ خیر چھوڑیں اس قصے کو عدیل بھائی کی شادی کی بات کریں۔ کوئی لڑکی ہے آپ کی نظر میں؟“  
 ”ہاں۔ ایک دولڑکیاں تو ہیں نظر میں لیکن میں سوچ رہی ہوں تم امتحانوں سے فارغ ہو جاؤ پھر تم دونوں کی ایک ساتھ کہیں بات چلاؤں گی؟“  
 اتماں جی نے پرسوج انداز میں کہا تو وہ کچھ ٹھنک سی گئی۔ بہت دھیرے سے ان کے گلے میں سے بازو کھینچ کر تدریس سمٹ کر پیچھے ہٹی تو نبیلہ بھائی کی بات یاد آئی۔  
 ”تمہارے ہاں لڑکیاں سارا بڑھا کھا چولے میں بھر سکتی ہیں۔ دیکھنا تمہارے ساتھ بھی یہی ہوگا۔ ادھر امتحانوں سے فارغ ہوئیں نہیں کہ اتماں جی تمہاری شادی کی فکر میں لگ جائیں گی۔“  
 اتماں جی اب اسی موضوع پر رول رہی تھیں۔ وہ کچھ غائب و معانی سے سنتی رہی پھر اسی خاموشی سے ان کے پاس سے اٹھ کر آگئی اور اس رات وہ بہت سنجیدگی سے نبیلہ بھائی کی باتوں کو سوچ رہی تھی ورنہ اس سے پہلے وہ بڑے آرام سے نظر انداز کر چکی تھی۔ کیونکہ نبیلہ بھائی خود سری و ہٹ دھرمی کے باعث اپنا وقتا رکھتی تھیں۔ اس لیے خیال یہی آتا تھا کہ جو عورت اپنا گھر نہیں بنایا رہی۔ وہ دوسرے کو کیا اچھا سبق سکھائے گی۔ اور اب اسے لگ رہا تھا جیسے وہ ٹھیک کہہ رہی تھیں اور انہوں نے یہ بھی تو کہا تھا کہ

”تہیں اپنے بارے میں سوچنے کا حق ہے اور اس حق کو مزور استعمال کرنا۔“  
 اور جب وہ اپنے بارے میں سوچنے لگی تو اس کا دل اندر ہی اندر ٹھہرنے لگا کہ ہر سوچ پر وہ قابض تھا جو اس کے ساتھ دن اور وقت طے کر گیا تھا۔ گو کہ وہ جذباتی لڑکی نہیں تھی نہ ہی ایڈیٹرزم پر یقین رکھتی تھی لیکن کیا کرتی کہ مقابل شاہ سکندر حیات آگیا تھا جس کی وجہ سے وہ ابھی تک وہ سر راہ نظر آتا تب بھی شاید وہ ایک بل کو ٹھہر کر اسے مزور دیکھتی جبکہ اب تو وہ خود جل کر آگیا تھا اور مزید ریٹ بڑھانے کا خواہش مند بھی تھا۔ وہ جا بھی تو اسے نہیں روک سکتی تھی۔ جیسے اب بہت کوشش کے باوجود اس سے ہٹ کر نہیں سوچ جا رہی تھی۔ حالانکہ ابھی تک وہ اس کے لیے سوالیہ نشان تھا لیکن وہ جو کوئی بھی تھا۔ آسیہ صلاح الدین اس سے متاثر ہو چکی تھی۔ اور ایسی ہر کوشش میں ناکامی کے بعد بالآخر اس نے ہار مان لی اور نبیلہ بھائی کی باتوں کی روشنی میں سوچتے ہوئے اس نے پہلے ہی قدم پر شاہ سکندر حیات کا ہاتھ تھامنے کی خواہش کو دبا یا نہیں تھا۔ جیسا کہ نبیلہ بھائی نے کہا تھا۔  
 ”میں یہ نہیں کہہ رہی کہ شادی نہیں کرنا، مزور کرنا لیکن اپنے شخص کے ساتھ جو تھاری صداقتوں کا اعتراف کرنے کے ساتھ انہیں استعمال کرنے کی ہمیں پوری آزادی دے اور ایسا شخص تمہارا ہم پیشہ ہی ہو سکتا ہے۔“

اور نبیلہ بھائی کی اس بات سے اتفاق کرتے ہوئے وہ سوچنے لگی کہ اگر شاہ سکندر حیات اس کا ہم پیشہ میں سے تب بھی وہ پہلے مقام پر اسے اپنے ارادوں سے آگاہ کر دے گی اور اگر وہ اس کے لیے سنجیدہ و اتو پیر یقیناً اس کی مزید تعلیم اور پھر پریکٹس پر اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ یوں اپنے طور پر وہ سارے نمونوں پر سوچ کر اطمینان سے ہو گئی تھی۔  
 اور جس روز شاہ سکندر حیات کو رانا تھا۔ اس روز پہلی بار اس کا دھیان لکچر کے بجائے اونٹن اور دھونگیاں پر بھی نظر پڑی۔ جس کی سونیاں پی ایم کی حدود میں داخل ہو چکی ہیں۔ اور وہ تشدد خود پر جبر کے بیٹھی تھی۔ پیر یڈ آف ہونے کے بعد بھی وہ فوراً باہر نہیں نکلی بتائیں کہ اس کی زبانش مطر تھی یا اپنی بہر حال اس کے طے کیے ہوئے وقت کے ہونے ایک گھنٹہ بعد وہ برنگل کر آئی تو پہلی نظر اسی پر پڑی جو اس کے اسباب سے چند قدم آگے اپنی گاڑی کے ساتھ ٹینک لگائے کھڑا تھا۔ پچھو ویر کو واقعی وہ بڑی طرح زبردستی لیکن پھر بہت جلد خود پر قابو پا کر قدم اس کی طرف بٹھا دیے۔ اور اس کے قریب پہنچ کر فوراً معذرت کرتے ہوئے بولی۔

”سوری مجھے بتا ہی نہیں چلا وقت کا۔ آپ کو شاید کافی انتظار کرنا پڑا۔“  
 ”مجھ آپ کا انتظار کرنا اچھا لگا۔ پلیز اس نے کہتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھول کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ بانکسی پس و پیش کے بعد بیٹھ گئی۔“  
 ”کیسی ہیں آپ؟“ وہ ڈرائیونگ پر بیٹھا تو اسے دیکھ کر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

”ٹھیک ہوں۔“ اس نے قصداً سیدھا سا جواب دیا۔  
 ”میری آمد کا یقین تھا آپ کو؟“ شاہ سکندر نے بڑی خوبصورتی سے اسے گھیرنے کی کوشش کی لیکن وہ سہولت سے دامن بچا کر بولی۔

”یہ خیال ہے۔ ان باتوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے آپ اپنی آمد کا مقصد بیان کر دیں۔“  
 ”جلدی کیا ہے۔ کہیں اطمینان سے بیٹھ کر بات کریں گے۔“

شاہ سکندر نے قدرے بے نیازی سے کہہ کر گاڑی کی اسپید بڑھا دی اور وہ کیونکہ خود کو بہت براعات و ظاہر کر رہی تھی اس لیے ذرا سے کندھے اچکا کر کھینچنے سے باہر دیکھنے لگی۔ تمام راستے اس کے دیکھنے ہوئے تھے۔ جب شاہ سکندر نے ایک فائنو اسٹار ہوٹل کے سامنے گاڑی روکی تو وہ یونہی گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”کیا بات ہے کچھ پریشان ہیں؟“ شاہ سکندر نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھا اور وہ اس کی بات نظر انداز کر کے بولی۔

”میں زیلہ دیر نہیں رکوں گی۔“  
 ”آپ کا اختیار صرف اتنے دنوں کے لیے تھا اور اب۔“

وہ بات ادھوری چھوڑ کر نئے اتر گیا، پھر اس کی طرف کا دروازہ کھولا تو وہ خود کو اس کے رحم و کرم پر محسوس کر کے کچھ پریشان سی ہو گئی لیکن جب اس کے ساتھ چلنے لگی تو اپنا آپ بہت محفوظ بہت اچھا لگا کر شہر و فلوں کا سارا اضطراب ساری بے چینی ختم گئی اور اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے وہ پہلی بار اسے دیکھ کر ذرا سا مسکرائی تو وہ خوشگوار سے احساس میں گھر کر بولا۔

”شکریہ۔“  
 ”کس بات کا؟“ اس نے یونہی پوچھ لیا۔

”تمہاری مسکراہٹ نے میرے اس یقین پر مہر ثبت کر دی ہے آسید کہ تمہاری زندگی میں میں اس مقام پر فائز ہو چکا ہوں جہاں مجھ سے پہلے کوئی نہ تھا۔“ میرے بعد کوئی ہو سکتا ہے۔“

شاہ سکندر نے بہت یقین سے کہا پھر نیل پر اپنا ہاتھ پھیلا کر رکھ دیا۔ اس نے دزدیدہ نظروں سے اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ کو دیکھا اور سوچ کر کہنے لگی۔

”میرا ہاتھ تمہارے سے پہلے سوچ بیچھے شاہ سکندر! کہ میں کوئی بہت عام سی لڑکی نہیں ہوں۔ میرے خواب میری سوچیں صرف ایک خوبصورت گھرنک محدود نہیں ہیں۔ جس مقصد کے تحت میں نے تعلیم حاصل کی اسے میں پس پشت نہیں ڈال سکتی۔ میرے نزدیک یہ سراسر بددیانتی ہوگی۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں ناں؟“

آخر میں اس نے اچانک سر اٹھا کر پوچھا تو وہ جو بہت غور سے اس کی بات سن رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اثبات میں سر ہلانے لگا اور کچھ دیر تک کھڑک بولا۔

”میں تمہارے مقصد کی راہ میں حائل نہیں ہوں گا بلکہ تم بہت جلد اپنے ساتھ یاؤ گی۔ اور کچھ۔“  
 ”اور؟“ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ گلاس ڈور سے داخل ہوئی بیٹھنے والی کو دیکھ کر اظہار اس کے ہونٹوں میں ی رہ گئے۔ بیٹھنے والی اکیلی نہیں تھیں ان کے ساتھ جو کوئی بھی تھا بہت بے تکلفی سے ان کی کمریم بازو ڈالے ہوئے تھا اور وہ یہ تو جانتی تھی کہ بیٹھنے والی آزاد ماحول کی پروردہ آزاد خیال خاتون ہیں لیکن

آزادی ہے۔ راہ روی کی حد چھو لے گی۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ کوئی اور اگر میسر ہو جاتی کے ایسی بات کرتا تو شاید وہ کبھی یقین نہ کرتی اور اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بھی وہ بھٹانے کی کوشش نہ کرتی لیکن سامنے منظر بہت واضح تھا۔ آف وائٹ سلک کے شلوار سوٹ میں دوپٹے سے بے نیاز بی کہیں سے بھی نیل کی ماں نہیں لگ رہی تھیں۔ نا انہیں بڑے ہیتا کی عزت کا خیال تھا۔ غیر کے اعلیٰ فائز ام کوئی نہ تھا۔ اور وہ سناٹے میں بیٹھتی تھی۔

”فائلز ام کہاں کھو گئیں؟“ شاہ سکندر نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرا کر کہا تو وہ یونہی گھم سی بیٹھ گئی۔

”جیت تو تمہارے سامنے موجود ہے۔“ شاہ سکندر نے مسکرا کر اپنی بات پوری کی تو وہ ذرا سا چوکی ہوئی طرف سے اپنے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر سر کو ذرا سا جھٹکا دینے کے بعد کہنے لگی۔

”خیال سے چلنا چاہیے۔“  
 ”اگر تم جیہ کر رہا ہے کہ میری ہر بات کو یونہی نظر انداز کر دو گی۔“ شاہ سکندر کا موڈ یکلخت بگڑ گیا۔

”میری بات نہیں سنی جا سکتی نہیں کہ تمہارا اختیار اٹھانے کے لئے تمک تھا۔ اب جب میں جا ہوں گا تب اسکو کی۔ انداز میں۔“

”یہ خدا! وہ اندر ہی اندر سہم کر رہ گئی۔“



شاہ سکندر نے کچھ دیر خاموش ہو کر مئے دیکھا۔ پھر اپنے لیے پر نام ہو کر کہنے لگا۔  
 ”اگر ام سوری۔“ مجھے تم سے اس طرح بات کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اصل میں میں۔“

”یہ شاہ سکندر۔“ وہ عاجزی سے ٹوٹ کر بولی۔ ”میں یہاں بہت دسترب ہر رہی ہوں۔ آپ میری کیفیت سن سکتے ہیں۔ چلیں باقی باتیں رستے میں۔“

”اگر تم جلد میں آنا ہوں۔“ وہ اس کی عاجزی نظر انداز نہیں کر سکا۔ بلکہ کچھ ٹھٹھک سا گیا تھا۔ جیہی اس کی بات مان کر جانے کا کہا تو وہ ممنون نظروں سے دیکھتی ہوئی جلدی سے باہر نکل آئی اور۔

”مندر کے آتے تک وہ خود دیر قابو پا چکی تھی۔“

شاہ سکندر کا ارادہ آسید کو گھر تک چھوڑنے کا تھا۔ لیکن وہ راستے ہی میں آکر گئی تب اس سے اگلی ملاقات طے کر کے وہ احمد حسن کے گھر کی طرف چل پڑا۔ جہاں سے اسے شہر باز کو لینا تھا۔ اپنے وعدے کے وہ شہر باز کو ساتھ لے آیا تھا۔ لیکن ابھی اسے شائبہ کہ ان باقی تھی۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی پھر اسے سمجھ گیا۔ وہ اسپید بڑھا کر منٹوں میں احمد حسن کے گھر پہنچ گیا۔ شہر باز شدت سے اس کی منتظر تھی۔ ملکی کہیں میں وہ بالکل یونہی ہوئی تھی۔ لیکن اسے داہنی کا خیال تھا۔ بی بی جان نے بہت تاکید اٹھا کر شام دھنسنے سے پہلے واپس آجانا۔ اس لیے شاہ سکندر کو دیکھتے ہی وہ منہ پھلا کر بولی۔

”جانی! آئی دیر لگا دی۔“ آپ ہم بازار کو نہیں جاسکیں گے۔“

”نکسین کرو۔“ یہاں بازار بہت دیر تک کھلے رہتے ہیں۔ تمہاری شاپنگ آرام سے ہو جائے گی۔“ شاہ سکندر سے اطمینان دلایا۔

”میری شاپنگ تو آرام سے ہو سکتی ہے اور جو بی بی جان نے جلدی آنے کو کہا تھا۔“ شہر باز نے اسے آگے لے لیا۔

”آپ کیا کروں، دیر ہو گئی۔“ جلدی مل جلدی سے چلے پلاؤ پھر ہم چلتے ہیں۔ اور ہاں احمد حسن آفس سے ہیں۔ وہ شہر باز سے بات کرتے ہوئے ایک دم نا امل کی طرف متوجہ ہو گیا۔  
 ”احمد بھائی ابھی نہیں آئے۔ آتے ہی ہوں گے۔“ ہائلڈ نے کہا تو وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”اچھا تم جانتے تو بلاؤ گے“ سکندر بھائی اور وہ بھی بیٹ اچھی سی لیکن آپ کو میری ایک بات جانتے تو نہیں آپ کو پلاری ہی ہوں۔

”کیا؟“ وہ سوالیہ لفظوں سے دیکھنے لگا۔  
”آج آپ لوگ یہیں تنگ جاؤں، جہاں پہلے ہی کا دن ہے۔ ساحل پر چلیں گے بہت مزہ آئے گا، ٹائلٹ نے خوش ہو کر پروگرام بنایا تو وہ فوراً شہر بالو کو دیکھنے لگا کہ آیا دونوں نے پہلے سے یہ پروگرام بنایا ہے یا وہ ٹائلٹ کی خواہش ہے۔ اور اس کے دیکھنے پر شہر بالو نے اشارے سے منع کر دیا، تب وہ ٹائلٹ کے معذرت کرتے ہوئے نکلے۔

”سوری ٹائلٹ، آج ہمارا ٹکنا ممکن نہیں ہے۔ پھر کسی دن بلکہ خاص چھٹی ہی کے دن میں شہر بالو کو لے آؤں گا۔“

”مجھے بتا تھا آپ میری بات نہیں مانیں گے، ٹائلٹ روٹھ کر بولی۔  
”اور آپ تم مجھے جانتے بھی نہیں بلاؤ گے؟“  
”نہیں خیر چلنے تو ضرور بلاؤں گی، ٹائلٹ فوراً خشکی بھول کر چائے بنانے چلی گئی تو وہ شہر بالو سے کہے ”تم آئی سے مل لو اور اُن سے جانے کی اجازت بھی لے لو۔ شہر بالو خاموشی سے چلی گئی تب وہ دریا ٹائلٹس جھیل پر آرام سے بیٹھ گیا۔ اُس نے سوچا تھا۔ وہ آج ہی شہر بالو کو آسمان کے گھر سے جانے کا لیکن وقت ہی نہیں تھا۔ چائے پینے کے بعد اُس نے احمد حسن کا انتظار بھی نہیں کیا اور اُس کی امی سے دو جلد آنے کا کہہ کر شہر بالو کو خانیک کے لیے طارق روڈ لے گیا۔

شہر بالو بی بی جان کے درے بہت جلدی کر رہی تھی، حالانکہ اُس نے بار بار اطمینان دلایا کہ بی بی جان ناراضگی کو وہ خود فیس کرے گا۔ وہ آرام سے خریداری کر رہے۔ لیکن شہر بالو بہت جلدی فارغ ہو گئی ”بس جہاں آجے اور کچھ نہیں لینا، شہر بالو نے مزید کچھ بھی خریدنے سے انکار کر دیا۔  
”چلو پھر کسی دن صرف اور صرف تہیاری شاپنگ کے لیے آئیں گے، وہ دیکھ گیا شہر بالو کو بی بی جان کی ناراضگی خیال پر لیٹان کر رہا ہے۔ جیسی مزید اصرار نہیں کیا۔

”شام تو یہیں ہوگی، ہر رات میں یہیں گے شہر بالو نے گاڑی میں بیٹھے ہی کہا۔  
”ہوں، اُس نے زیادہ کوسجہ نہیں دی، اور احتیاط سے گاڑی بیک کرتے لگا۔ پھر جب کشادہ شکر تب اُس کا دھیان بنانے کی خاطر پوچھنے لگا۔  
”کیسا وقت گزرا تھا، ٹائلٹ اور اُس کی امی کے ساتھ؟“  
”جیت اچھا، کبھی آپ انہیں شاہ پور سے کرا آئیں ناں؟“  
”مہ نے دعوت دی انہیں؟“

”ہاں؟“  
”پھر ضرور آئیں گی، اُس نے کہا تو شہر بالو تعجب سے پوچھنے لگی۔  
”کیوں آپ نے کبھی نہیں بلایا انہیں؟“  
”یہ بات نہیں ہے اصل میں وہ شاید اس انتظار میں تھیں کہ پہلے میرے گھر سے کوئی آئے۔ آج ہو تو اب وہ بھی آئیں گی، اُس نے کہا تو شہر بالو فوراً بولی۔

”پھر تو مجھے بہت پہلے آنا چاہیے تھا۔“  
”یوں؟“ وہ یوں بیکر خاموش ہو گیا، اصل بات شروع کرنے سے پہلے کی خاموشی تھی۔ ایک طرح سے ذہن کو تیار کر رہا تھا اور دیگر بات کہاں سے شروع کرے۔ پھر ایکدم سے یاد آنے پر بظاہر سرسری ا پوچھنے لگا۔  
”سنو، تم نے مہر انسہ کو اس کا پیکٹ لوٹا دیا تھا؟“  
”نہیں، یا شہر بالو جو برسی میں ہی۔“

”کیوں؟“ سنو سرسری انداز لیکن پیشانی پر گہری لکیر نمودار ہو گئی تھی۔  
”کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ اس کا اتنی محنت سے دیا ہوا تحفہ کیوں لوٹنا چاہتے ہیں؟ شہر بالو نے اُن کی سوال کر کے گویا اُس کی تشکل آسان کر دی، برصے آرام سے بولا۔

”یہی بتانے کے لیے تو میں نہیں لے کر آیا تھا۔ لیکن انیس ہتھاری اُس سے ملاقات نہیں کرا سکا؟“  
”گس ہے؟“ شہر بالو تجو ابی انداز میں بہت دور سے سنائی دی، شہر بالو نے اُس کی روز ہو گیا تھا، لیکن مسلسل خود کو پلاری بھی لکھا کہ شاہ سکندر کسی قیمت پر مہر انسہ سے منہ نہیں موڑ سکتا، کیونکہ بدے میں وہ شاہ لادن سے منسوب ہے۔ اُس کا بھائی اتنا خود غرض نہیں ہو سکتا کہ اپنی کسی خواہش سے مغلوب ہو کر بہن کے ارمانوں کا حقن کر دے۔ کتنا مان تھا بہن کو اپنے بھائی پر جسے ٹوٹنے میں ایک بل لگا۔

”آسیہ سے؟“ وہ اسی قدر کہہ کر خاموش ہو گیا، بلکہ انتظار کرتے لگا کہ وہ سوال پر سوال کرے گی۔ کون ہے کہاں رہتی ہے۔ آپ کو کہاں ملی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن دوسری طرف سنا تھا۔ جسے محسوس کر کے شاہ سکندر نے اپنے طور پر آخری بات کہی۔

”خیر آسمان سے تہیاری بھی ملاقات ہو جائے گی، لیکن بی بی جان کو تم ابھی بتا دینا کہ میں مہر انسہ سے شادی نہیں کروں گا، اور مارے صدمے کے شہر بالو سے بولا ہی نہیں گیا۔ ورنہ زیادہ نہیں تو اتنا ضرور کہیں کہ وہ یہ بات خود بی بی جان سے کہہ دے، اسے دریا میں ڈالتے۔ اور شاہ سکندر نے اس کے بعد کچھ کہنا ضروری ہی نہیں تھا، بتانے پر شہر بالو کی کیفیت سمجھ نہیں رہا تھا یا اقلہ نظر انداز کر رہا تھا، باقی داغ دھن کے معجزیوں انجان بنارہا جسے وہ اُس کے ساتھ موجود ہی نہ ہو۔

پھر سوچی کے برصے گھٹ سے داخل ہو کر گاڑی ابھی ڈرائیو سے پر رنگ رہی تھی کہ شہر بالو بہت جلدت میں اُن کی تیز تیز دوسروں سے اندر چلی گئی، وہ ہونٹ جھینے اُسے دھکتا رہا۔ پھر گل خان کو لیکار کر کے گاڑی پورج میں کھڑی کرنے کا کہہ کر اندر آتا تو سیدھا بی بی جان کے کمرے کا رخ کیا۔ بی بی جان عشا کی نماز پڑھنے میں مصروف تھیں۔ وہ خاموشی سے ایک طرف بیٹھ کر اُن کے فارغ ہونے کا انتظار کرتے لگا۔

میونہر بھائی کے ساتھ بات کرتے ہوئے وہ ایکدم خاموش ہو گئی، کیونکہ ادھر سے منیلہ بھائی آ رہی تھیں۔ اور ان پر نظر پڑتے ہی اُسے دوہرا واقعہ یاد آ گیا تھا۔ حسب عادت منیلہ بھائی سرسری انداز میں ہیلو کہتی ہوتی اُن دونوں کے قریب سے گزرتی رہی تھیں، تب بھی وہ ایسے ہی کچھ کہہ کر سمیٹتی تھی۔  
”کیا انڈیز میں؟“ ایمان سے مجھے تو رشک آتا ہے۔“ میونہر بھائی نے کہا تو وہ چونک کر بلو چھنے لگی۔  
”کیا کیا؟“

”میں کہہ رہی ہوں اصل زندگی تو منیلہ بھائی کی ہے۔ کوئی فکر ہی نہیں، آرام سے دن چڑھے تک سو رہی ہیں۔ اس کے بعد جہاں دل چاہے جانے کو تیار کوئی ٹرک لوگ نہیں آ رہا، دیکھو کس شان سے آئی ہیں۔ میونہر بھائی کے لیے میں حسرت نہیں محسوس کرتی بلکہ کچھ مذاق کا عنصر تھا۔ وہ ذرا سا مسکرائی اور اس کو صوف سے پھٹنے کی خاطر بولی۔  
”ہم کیا باتیں کر رہے تھے۔ ہاں عدیل بھائی کی شادی، اماں جی بتا رہی تھیں اُن کی نظر میں ایک دو لڑکیاں ہیں۔“

”اچھا، کون ہے؟“ میونہر بھائی نے دلچسپی سے پوچھا۔ تو اُس نے کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔  
”بتائیں؟“

”ہاں میں تم نے پوچھا نہیں اماں جی سے؟“ میونہر بھائی نے تعجب سے کہا۔  
”یہی پوچھتی، انہوں نے عدیل بھائی کے ساتھ میری شادی کا ذکر قبضہ کر دیا تھا، اس لیے میں خاموشی سے اُن کے پاس سے اٹھ گئی تھی یا اس نے اپنی مجبوری بتائی تو میونہر بھائی ہنسے لگیں۔

”آپ نہیں کہیں رہی ہیں؟“  
”ہاں یوں ہی۔ ویسے میری کچھ مین رہیں آتا کہ ہمارے ہاں لڑکیاں اتنا پڑھ لکھ کر بھی اپنی شادی کے ذکر نہیں کرتیں۔“

پر خاموش کیوں ہو جاتی ہیں؟ میمونہ بھائی نے بڑے مخطوط سے انداز میں کہا۔

”بھئی کیا کریں؟ اسے میمونہ بھائی کے مخطوط ہونے پر مبنی آئی۔  
”میں نے کم از کم اپنی مرضی تو ضرور بتایا کرتی۔ ویسے ہتھاری کیا مرضی ہے؟“ میمونہ بھائی نے اتنا اچانک بول چا کر وہ چلی گئی۔

”میری کیا مرضی ہو سکتی ہے؟“

”کیوں نہیں؟ آخر اپنے بارے میں کچھ سوچا تو ہو گا تم نے؟“  
”ابھی تک تو نہیں سوچا۔ لیکن اب ضرور سوچوں گی۔ اس نے لیے پھلے انداز میں بات اٹائی تھی عدیل بھائی اپنے کمرے سے نکل کر آئے اور انہیں دیکھ کر لوٹے۔

”نوٹو، دو غائبین جہاں بٹھ جائیں؟“

”تم بھی آ جاؤ؟“ میمونہ بھائی نے کہا تو اس نے کرسی کھینچ کر آگے کر دی۔

”بھئی یارونی کہاں ہے؟“ عدیل بھائی نے پیچھے ہی پوچھا۔

”مجھے سب سونگئے۔“ میمونہ بھائی نے بتایا تو وہ تعجب سے بولے۔

”اتنی جلدی؟“

”بہت شور کر رہے تھے، ہمارے خلیل بھائی نے ڈانٹ کر سلايا ہے۔“

”یہ زیادتی ہے۔ مجھ سے کہا تو میں انہیں باہر لے جاتا، یوں بھی کل چھٹی ہے۔ نیل بھی سو گیا؟“

عدیل بھائی نے آخر میں اس سے پوچھا۔

”نیل کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ شام میں بڑے بھیا اُسے ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے وہاں

سے واپسی پر کچھ دیر آسٹاں جی کے پاس لیٹا پھر بڑے بھیا اسے اوپر لے گئے۔“ اس نے بتایا تو عدیل بھائی

تشویش سے پوچھنے لگے۔

”زادہ طبیعت خراب تو نہیں ہے؟“

”نہیں موسیٰ بخار ہے۔ مع تنگ انشاء اللہ اتر جائے گا۔“ اس نے تسلی دی پھر پوچھنے لگی: ”آپ کے

لیے چلتے لاؤں؟“

”نہیں پہلے ہی نیند نہیں آرہی۔“ عدیل بھائی نے منع کیا تو میمونہ بھائی انہیں دیکھ کر شرارت سے ہنسنے

پہلے لڑکیں۔

”بچہ جوان ہو گیا ہے اب اکیلے میں اسے نیند نہیں آتی۔“

”اٹ یہ میمونہ بھائی! اسے بے حد شرم آئی اور عدیل بھائی بھی اس کی موجودگی کے باعث سٹپا کر

لوٹے۔

”آپ تو خاموش ہی رہا کریں؟“

”کیوں خاموش رہا کروں؟ خلیل کہتے ہیں۔ تم بولیں تو ہوں بہت اچھی لگتی ہو۔“ میمونہ بھائی نے ایک ادا سے

کہا جس پر وہ سبے ساتھ ہنس اور ہنسی تو عدیل بھائی کو بھی آئی لیکن منہ بنا کر لوٹے۔

”اؤں یوں بڑے بدذوق ہیں خلیل بھائی یا پھر انہوں نے آپ کو خاموش دیکھا نہیں ہو گا؟“

”تمہارا مطلب ہے؟“

”جناب آپ خاموش بھی بہت اچھی لگتی ہیں۔ کیوں آسیم؟“ عدیل بھائی نے اس سے تائید چاہی۔

”بیانی! مجھے تو میمونہ بھائی ہر حالت میں اچھی ہی لگتی ہیں۔“ اس نے کہا تو عدیل بھائی مصنوعی حیر

سے بولے۔

”ماہیں تم جھوٹ بھی بولتی ہو؟“

”کوئی جھوٹ نہیں۔ بالکل سچ کہہ رہی ہے یہ۔“ قدرے جوش میں میمونہ بھائی کی آواز اونچی ہو گئی تھی۔

غالباً ان کی آواز پر ہی خلیل بھائی کی آنکھ کھل اور اسوں نے وہیں سے انہیں دیکھ لیا۔

”جلیے۔“ آپ کے جوان کو نیند نہیں آرہی؟ عدیل بھائی کو بدلدہ اُتارنے کا موقع مل گیا۔ سرگوشی میں

بھانج کو چھیڑ کر کہا تو وہ انہیں گھورتے ہوئے اُٹھ کر چلی گئیں۔ تب عدیل بھائی بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔

”جلو بھی آسیم، تم بھی سو جا کر۔“

”جی جانی! میں ذرا چین دیکھ لوں۔“ دہکتے ہوئے اُٹھ کر کچن میں آگئی۔ دو چار برتن میز پر رکھے تھے انہیں

دھویا پھر لائٹ آف کر کے نکلی تو میز پر بڑے بھیا کو دیکھ کر ٹھٹھک کر وہیں رُک گئی۔

”کیا بات ہے بڑے بھیا۔ کچھ چاہیے؟“ بڑے بھیا آخری تری بھی تک آئے تو اس نے پوچھ لیا۔

”ہاں، نہیں؟“ بڑے بھیا کا ذہن جیسے کام نہیں کر رہا تھا۔ پھر سوچ کر بولے: ”ہاں وہ تم ذرا نیل کو دیکھ

لو، بہت بے چین ہو رہا ہے۔ بخار بھی تیز ہو گیا ہے۔“

”جیس؟“ وہ کچھ پریشان سی ہو کر بڑے بھیا سے پہلے ہی میز پر چلیا نکلتی ہوئی اوپر آگئی۔ اس بخار

کی حالت میں بھی نیل کمرے میں اکیلا تھا۔ اسے مقصود تھے پھر بہت رحم آیا۔ جس کی ماں دوسرے کمرے میں

اطمینان سے سو رہی تھی۔ وہ اندر جی اندر کڑھتی ہوئی نیل کو جیک کر کے نکلی، بخار بہت تیز تھا لیکن بڑے

بھیا کے سامنے اس نے تشویش ظاہر نہیں کی۔ بلکہ تسلی دی۔

”پہریشانی کی بات نہیں ہے بڑے بھیا۔ بخار اتر جائے گا، اسے میں اپنے پاس لے جاتی ہوں۔“

”نہیں بیٹا۔ اسے یہیں رہنے دو۔ تمہیں تنگ کرے گا؟“

”نہیں بھیا! میرے پاس یہ آرام سے سوتے گا۔“ وہ کہہ کر نیل کو اٹھانے لگی کر بڑے بھیا آگے بڑھ

آئے۔

”نکو۔ میں لے چلتا ہوں۔ تم سے اٹھا یا نہیں جائے گا؟“ وہ پیچھے ہٹ گئی پھر اسی طرح بڑے بھیا کے پیچھے

چلتی ہوئی میز پر آکر اپنے کمرے میں آئی۔ اور جب بڑے بھیا نیل کو اس کے میز پر لٹا کر چلے گئے۔

تب وہ کٹورے میں ٹھنڈا پانی لے کر آئی اور اس میں کچھ اچھو بھلو کر نیل کے ماتھے پر رکھنے لگی۔ تقریباً

آدھے گھنٹے بعد جا کر کچن بخار کم ہوا۔ تب وہ قدرے اطمینان سے ہو کر اس کے ساتھ لیٹ گئی۔ ابھی بھی

اسے نیند نہیں آرہی تھی اور اس نے سونے کی کوشش بھی نہیں کی۔ کچھ دیر تک نیند بھائی کے بارے میں

سوچتی رہی پھر سر تھک کر ان کی طرف سے دھیان ہٹا یا تو ذہن کے درہیزوں پر شاہ مسکندر حیات دستک

دینے چلا آیا۔ اب وہ اس کے لیے سواہی نشان نہیں تھا۔ واپسی کے راستے میں اس نے اپنے بارے میں

اُسے بتا دیا تھا۔

چار سال سے وہ امریکہ میں تھا۔ وہاں سے ایک ریکل میں ماٹر کر کے گزشتہ سال لوٹا تھا اور ظاہر ہے بڑے

زمیندار کا بیٹا تھا۔ اسے نوکری کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک طرح سے شاہی زندگی گزار رہا تھا۔ اور اُسے

اس نے یقین دلایا تھا کہ شاہ پور میں وہ اُسے پورا مائیکل کیمبرگ روادے گا۔ اور اس کے لیے کوئی

بڑی بات بھی نہیں تھی۔ اس وقت اُسے سوچتے ہوئے وہ خود کو کبھی حویل اور کبھی مائیکل میں چلتا پھرتا

فکس کر رہی تھی۔

صبح تک بیل کا بخار اُتر چکا تھا۔ بڑے بھیا اُٹھتے ہی نیچے اُتر کر آئے۔ اُس وقت وہ نیل کو اپنے

ماتھے سے ناشتہ کر رہی تھی۔ بڑے بھیا کو دیکھ کر ابھی جگہ سے اُٹھنے لگی کہ انہوں نے ماتھے سے بیٹھے نہتے

کا اشارہ کیا پھر نیل کے قریب آ کر پوچھنے لگے۔

”اب کیسی طبیعت ہے بیٹا؟“

”پاپا! میں تو ذات کو آپ سے پاس سویا تھا پھر پھر پھر کے پاس کیسے آگیا؟“ ان کی بات کا جواب

دینے پر نیل غالباً جو سوچ رہا تھا وہی پوچھ لیا۔

”آپ کو س لے کر آئی تھی؟“ بڑے بھیا نے نیلے وہ بول بڑی۔

”اب بخار تو نہیں ہے اسے؟“ بڑے بھیا اس سے پوچھنے لگے۔

”نہیں بھیا! بالکل نہیں ہے۔ آپ بیٹیں ناں۔“ اُس نے پھر اُٹھنا چاہا۔

”بس چلتا ہوں، تم اس کا خیال رکھنا؟“ بڑے بھیا جانے کیوں نظر میں چرا کر لوٹے اور فوڈا کمرے سے

نکل گئے۔  
 ”بھو بھو! کیا کہاں ہیں؟“ نبیل نے پوچھا تو وہ جو بڑے بھیا کے جانے پر اُن کے پیچھے دیکھ رہی تھی چونک کر بولی۔  
 ”سو رہی ہیں۔ چلو تم جلدی سے یہ خیمہ کرو بھرا اور سونیا آجائیں گے تو تم اُن کے ساتھ باتوں میں لگ جاؤ گے۔“  
 ”بس بھو بھو! اچھا نہیں لگ رہا۔ نبیل نے منہ بنایا تو اُس نے ہنسی سے ہنسی میں رکھ دیا۔ اور اُسے آرام سے بیٹھنے کی تلقین کرتے ہوئے اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔  
 ”بھو بھو! بہت سارے دن گزر گئے۔ اس کے امتحانوں میں صرف دو مہینے رہ گئے تھے۔ اور وہ بالکل اپنے کمرے میں بند ہو کر رہ گئی۔ سب جانتے تھے امتحانوں کی وجہ سے وہ سب سے کٹ جاتی ہے اور کوئی اُسے دُشرب بھی نہیں کرتا تھا۔ پھر اب تو اُس کا آخری سال تھا۔ اس لیے میونہ جہاں بھی اس کے کمرے میں کم ہی آتی تھیں۔ ورنہ انہیں کہاں چپن آتا تھا۔ جب تک گھنٹوں کے حساب سے اس سے باتیں نہ کر لیں۔ اُن کا کھانا نہیں پرتا تھا۔  
 اب ہجاری سارا وقت اماں جی کے پاس بیٹھی اُن کی سُنی دیتی تھیں۔ کسی کسی وقت اُسے چائے دینے جاتیں تو اُن کی ہنسی شکل دیکھ کر وہ مسکرا کر کہتی۔  
 ”بس جہاں کچھ دنوں کی بات ہے پھر ہم بہت فراغت سے مل بیٹھیں گے۔“  
 ”یہ کچھ دن ہی تو نہیں گزر رہے؟ اُس وقت اُس کے تسلی دینے پر وہ اُٹھا کر بولیں۔  
 ”اچھا چلیں میرے چائے پیئے تک آپ یہیں بیٹھ جائیں۔ اور اتنے وقت میں جتنا بول سکتی ہیں بولیں۔ اُسے اُن پر رحم آگیا۔ کتاب بند کر کے ایک طرف رکھی اور چائے کا کپ اٹھا کر پوری طرح اُن کی طرف متوجہ ہو کر میونہ جہاں بہت خوش ہو کر بیٹھیں لیکن پھر فوراً ہی بھڑکی ہو گئیں۔  
 ”کیا سوچا؟“ وہ حیران ہوئی۔  
 ”اُس وقت نہیں بیٹھ سکتی۔ مہمان کو چائے وغیرہ بھجوانی ہے۔ میونہ جہاں نے عجلت میں بتایا۔  
 ”کون آیا ہے؟“ اُس نے پوچھ لیا۔  
 ”وہ آیا ہے عدیل کے ساتھ۔ لیکن نام ہے اس کا شاہ سکندر۔ میونہ جہاں ایسے ہی عجلت میں بتاتے ہوئے چلی گئیں۔ اگر ایک لمحہ بھی ٹھہرتیں تو اُس کی دھڑکنوں کی آواز سن سکتی تھیں۔  
 ”کیسا اذکھا خوشگوار احساس تھا کہ وہ ہیں اُس کے پاس موجود ہے۔ ایک بل کو پلکیں مونہ کر اُس نے اُس کی موجودگی کو شدت سے محسوس کیا۔ پھر جلدی سے چائے پی کر خالی کپ رکھنے کے، مہمانے کپن میں آئی تو عدیل جہاں میونہ جہاں سے کہہ رہے تھے۔  
 ”جانے فرسٹ کلاس ہونی چاہیے جہاں اور یہ ٹرالی میں کیا سجا رکھا ہے آپ نے۔ ہٹائیے یہ سب میں اور سامان لے کر آتا ہوں۔“  
 ”ادوفہ۔ تم تو بول کر رہے ہو، جیسے کوئی نواب آیا ہو۔“ میونہ جہاں کو بھینچا کر بولیں۔  
 ”نواب سے کبھی نہیں۔ عدیل جہاں کہتے ہوئے بہت نیازی میں باہر نکل گئے، تب وہ آگے بڑھ کر آئی اور ٹرالی پر نظر ڈالتے ہوئے بولی۔  
 ”یہ سب ٹھیک تو ہے اور کیا چاہیے عدیل جہاں کو؟“  
 ”چنانچہ، ایسے ہی اس کے آنے پر بولکھلا جاتا ہے۔ خیر، ہٹاؤ یہ سب۔ میونہ جہاں نے کہا تو وہ ٹرالی میں کھی مختلف لوازمات سپر ہی بلٹیں نکال کر رک پر رکھنے لگی۔  
 ”کچھ دیر بعد عدیل جہاں جانے کی کچھ لے کر آگئے۔ اور شاہ پرزائے تھا کہ میونہ جہاں سے کہنے لگے۔  
 ”جہاں پلینز آپ آپ اندر لے آئیے گا؟“  
 ”نہیں بھئی، میں نہیں پکار لوں گی خود ہی آکرے جانا، جہاں نے حذر پر نظر ڈالتے ہوئے گویا اپنے حزاب چلیے گا احساس دلایا۔ تب وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

”میں بے آؤں گی جہاں۔ آپ جانتیں۔ عدیل جہاں نے کچھ چونک کر اُسے دیکھا لیکن وہ شاہ پرزائے کھولنے میں مصروف ہو چکی تھی۔ پھر نے سر سے لڑائی سجا کر میونہ جہاں کو اس میں چائے رکھنے کا کہا اور ہاتھوں سے بال ہٹک کر لے لگی۔  
 ”تیرا خیال ہے دوپٹہ کوئی ڈھنگ کا اور ڈھ۔“ میونہ جہاں نے کہا تو وہ مسکرا کر بولی۔  
 ”یہ بھی ٹھیک ہے۔“ پھر ٹرالی دھکیلے ہوئے ڈرائنگ روم میں آئی تو سامنے آبا جی کو بیٹھے دیکھ کر قدرے جھجک کر دروازے کے پاس ہی رُک گئی۔ پھر وہیں سے پلٹا چاہتی تھی کہ آبا جی نے اُسے اُسے اشارہ کر دیا۔  
 ”السلام علیکم! شاہ سکندر اُسے دیکھ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں میں جو جھجک لہرائی تھی اُسے یکسر نظر انداز کر کے وہ سادہ سے انداز میں پوچھنے لگی۔  
 ”کیسے ہیں آپ؟“  
 ”ٹھیک ہیں۔ آپ کیسے ہیں؟“ اُس نے ذرا سا سر ہلانے کے ساتھ اُسے بیٹھے کا اشارہ کیا پھر عدیل جہاں کو بول دیکھنے لگی جیسے پوچھ رہی ہو میرے لیے کیا حکم ہے۔ اور عدیل جہاں اُسے میرا بی کے فرائض سونپ کر خود اٹھانے سے اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ تباہیوں دووں کس ممنوعہ پر بات کر رہے تھے۔ جہاں نے سلسلہ دُعا تھا دوبارہ وہیں سے شروع ہو گیا۔ اُس نے ٹرالی میں سے نکال کر تمام لوازمات نبیل پر رکھے پھر چائے بنانے کے لیے ٹرالی کھینچتے ہوئے آبا جی کے پاس آ بیٹھی۔  
 ”آنا کھٹک کر ڈالا آپ نے؟“ عدیل جہاں کے کہنے پر وہ ٹیبل کی طرف متوجہ ہو کر گر لولا۔  
 ”کچھ بھی نہیں ہے آپ نہیں تو؟“ عدیل جہاں نے پلٹ اٹھا کر اس کی طرف بڑھائی تو وہ کہنے لگا۔  
 ”پیلے آبا جی کو؟“  
 ”نہ تو سامان، میں بس چائے پیوں گا۔“ آبا جی نے کہا تو اُس نے ایک اچھٹی نظر اُس پر ڈالی جو بڑے ہی کپ سیدھے کر رہی تھی پھر اُلکیم سر اُچا کر کے اس سے پوچھنے لگی۔  
 ”آپ چینی کتنی لیں گے؟“  
 ”ایک پیوچ۔“ وہ اس کے اجنبی انداز پر محظوظ ہو کر گر لولا۔ پھر پوچھنے لگا۔ ”آپ کی پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟“  
 ”بس اب تو ڈاکٹر بننے والی ہے اُس سے پہلے عدیل جہاں بول پڑے۔  
 ”اچھا۔ مگر ہم بی وغیرہ کر لیتی ہیں۔ شاہ سکندر نے ازراہ مذاق کہا تو وہ بھی اُس کے انداز میں بولی۔  
 ”مگر ہم بی نہیں جیسے ہمارا بھی کر لیتی ہوں۔“ شاہ سکندر کے ساتھ عدیل جہاں بھی بے ساختہ ہنسنے اور آبا جی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔  
 ”میری بیٹی بہت قابل ہے۔“  
 ”اسی لیے میں کہتا ہوں آبا جی کہ اسے ایف آر سی الیں کے لیے باہر بھیج دیں۔ عدیل جہاں نے کہا تو اُس نے چونک کر انہیں دیکھا لیکن دھیان آبا جی کی طرف تھا کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں اور آبا جی نے اُن کے جواب میں کچھ نہیں کہا بلکہ ممنوعہ ہی بدل گئے۔  
 ”شاہ سکندر کچھ نے نہیں رہے۔ لوناں بیٹیا۔ اور اُس نے دیکھا شاہ سکندر اطمینان سے ہو گیا تھا۔  
 تب وہ باری باری سب کو چائے ٹھا کر کمرے سے نکل آئی۔ اور نبیل برآمدے میں بیٹھے کیرم بورڈ فیل رہے تھے۔ اُس نے کچھ دیر رُک کر ان کے کھیل کو دیکھا پھر اتنا جی کے کمرے میں آئی میونہ جہاں بھی وہیں موجود تھیں۔ اسے دیکھتے ہی پوچھنے لگیں۔  
 ”مہمان چلا گیا؟“  
 ”نہیں میں چلی آئی۔“ اپنے ہی کسی خیال میں رہ کر اس نے کہا اور اماں جی کے پاس بیٹھ گئی۔

تبی ہولی طویل دوپہر میں ختم ہونے میں ہی نہیں آکر رہی تھیں۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے بنبر بانو نے ٹیس پر بڑک کر دُرُنگ نظر ڈال کر دھوپ میں سرختے جگ رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں زیادہ دیر تک دھوپ میں نہیں دیکھ سکیں۔ اس طرف سے رُخ موزا آؤ آئینوں کے سامنے وارے سے بٹنے لگے۔ کچھ دیر بعد منظر صاف ہوا تو تیب وہ سست روی سے اپنے کمرے میں آگئی۔ ان طویل دوپہروں میں ہمیشہ وہ بھرپور زندگی گزارتی تھی۔

لیکن جس روز سے شاہ سکندر نے اپنا بوجھ اُس کے کانہوں پر ڈالا تھا۔ دوپہر کو کیا رات کی نیندیں بھی اُچاٹ ہوئی تھیں۔ اور خود شاہ سکندر گتے آرام سے تھا۔ اُس کا اطمینان دیکھ کر تو بنبر بانو کے اندر الاؤ دیک اٹھتا تھا۔ یعنی اُسے احساس ہی نہیں تھا کہ وہ کتنی محنت کا خزانہ کرنے جا رہا ہے۔ اپنی محنت میں اتنا خود غرض ہو گیا کہ بہن کا بھی خیال نہیں اُٹا اپنا بوجھ اُس پر ڈال دیا۔

”بی بی جان سے کہہ دینا میں تمہارا سارے شادی نہیں کروں گا۔“ آج صبح بھی وہ اُسے بہت تاکید سے کہہ گیا تھا اور اُس کے لیے بی بی جان تک اُس کا پیغام بھی بنا کچھ مشکل تو نہیں تھا۔ لیکن اس نے بعد اُٹھنے والے طوفان کو سوچ کر ہی وہ اب تک خاموش تھی۔ جانتی تھی کہ اُس طوفان میں اس کا بھی اتنا ہی نقصان ہو گا جتنا ہم انسان کا۔ اتنے دن اُس نے بہت کوشش کی کہ خود کو فریب دینے کی کہ شاہ سکندر کا انکار اُس کی زندگی پر اتنا انداز نہیں ہو گا۔ لیکن اُسے کامیابی نہیں ہوئی۔ یہ نہیں تھا کہ اُسے اپنی یا شاہ بارون کی محبت پر ہر سانس میں تھکا۔ بہت یقین تھا۔ لیکن اس کے ساتھ وہ بی بی جان کی روایات کو بھی اچھی طرح جانتی تھی۔

اس لیے اپنے دل میں کسی خوشی بھی کو جگہ نہیں دے سکی۔ مسلسل ذہنی اشتراک کے باعث اُسے اپنا بوجھ کسی نامعلوم ٹکے میں جکڑا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ شام میں بی بی جان کے بلانے پر وہ اُن کے کمرے میں آئی تو دل جا بان کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ کم از کم دل کا بوجھ تو ہلکا ہو رہی جائے گا لیکن وہ ایسا نہیں کر سکی۔ کیونکہ بی بی جان پہلے ہی کچھ برہم دکھائی دے رہی تھیں۔

”سکندر آج پھر کراچی گیا ہے۔“ وہ جیسے ہی بی بی جان کہنے لگیں: میں نے تمہارے بابا جان سے پوچھا ہے اُن کا تو ایسا کوئی کام نہیں ہے پھر سکندر کس کام سے ہر چوتھے دن کراچی جاتا جاتا ہے؟ میں کیا کہہ سکتی ہوں؟ فردی طور پر وہ بھی کہہ سکی کیونکہ کچھ نہیں پانتی تھی کہ بی بی جان اُسے شاہ سکندر کا یہ بیانیوں بتا رہی ہیں یا اُس سے سوال کر رہی ہیں۔

”کیوں اُس روز تمہیں بھی تو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ کوئی خاص خریداری بھی نہیں کی تم نے پھر سارا دن کہاں رہے؟“ بی بی جان نے اُسے کھوجتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔

”میں سارا دن جہاں کے ساتھ نہیں تھی بی بی جان؛ وہ مجھے اپنے دوست احمد حسن کے گھر چھوڑ کر کسی کام سے چلے گئے تھے۔ سہمہ پیر میں والہاں آئے تھے مجھے شاپنگ کے لیے لے گئے اور وہاں سے ہم سیدھا یہاں چلے آئے تھے۔“ اُس نے کچھ رُک کر صاف گویا بتایا تو بی بی جان بوچھنے لگیں۔

”احمد حسن کے گھر کون کون ہے؟“

”الان والدہ اور جھوٹی بہن۔ دونوں بہت اچھی ہیں۔ مجھ سے بہت محبت سے ملیں۔“ اُس نے بتانے کے ساتھ تعریف بھی کی۔

”سکندر کے سامنے آتی ہیں وہ خواتین، پردہ نہیں کرتیں۔“ بی بی جان کے مشکوک انداز پر وہ جمر بنز کر بولی۔

”نہیں۔“

”ہوں۔“ بی بی جان ہنسا رہا بھر کر جلنے کیا سوچنے میں لگ گئیں۔ اُسے اُلجھن ہونے لگی۔ قدرے توقع سے محبت کر کے بولی۔

”اہل شادی کسی غلط فہمی کا شکار ہو رہی ہیں بی بی جان سکندر جہاں نائلہ کو بالکل بہنوں کی طرح بچہ

ہیں۔“ بی بی جان نے ایسی تیز نظر سے گھورا کہ وہ اندر ہی اندر سہم کر رہ گئی۔ اور وہاں سے اُٹھنے کا بہ

سوچنے لگی۔ بنبر بانو میں بتداری ماں ہوں۔ مجھ سے اگر تم کچھ پچھانا بھی چاہو گی تو نہیں چھپا سکو گی۔“ بی بی جان نے پہلے اُسے گویا تینہ کی پھر کہنے لگیں۔

”میں دیکھ رہی ہوں جس روز سے تم سکندر کے ساتھ کراچی سے ہو کر آئی ہو پریشان ہو۔ ایسی کیا بات ہوئی ہے وہاں یا تم نے کیا دیکھا ہے؟“

”میں کچھ نہیں جانتی بی بی جان؛“ وہ انھوں میں چہرہ ہچکا کر رو پڑی۔

”کیا نہیں جانتیں؟“ بی بی جان نے اُس کا رد ناقصاً نظر انداز کر دیا۔ اور ایسے جھمٹے لیے میں پوچھا کہ

وہ ڈر کر جلدی سے بولی۔

”اُس کے بارے میں، میں کچھ نہیں جانتی۔ جہاں نے بھی زیادہ کچھ نہیں بتایا بس اتنا کہا ہے کہ وہ

مہر النساء سے شادی نہیں کروں گے۔“

”کیا؟“ بی بی جان چکر لگیں۔ ”یہ یہ کہہ کر سکندر نے تم سے؟“

”اُسی روز، جب میں اُن کے ساتھ کراچی تھی کبھی بدشکل مرحلے سے گزر کر اب وہ در سے پرسکون ہو

گئی تھی۔“

”اور تم نے اُس روز مجھے کیوں نہیں بتایا؟“

”بتانا چاہتی تھی اور جہاں نے تو بہت تاکید کی تھی کہ میں فوراً آپ کو بتا دوں لیکن میری بہت نہیں

ہوئی۔“ اُس نے صاف گویا سے اپنی بے بسی ظاہر کی تو بی بی جان کچھ دیر تک اُسے دیکھی رہیں پھر کمری سانس

کے ساتھ جیسے اپنے آپ سے بولی۔

”تو شاہ سکندر کسی ٹوک کے چکر میں ہر تیسرے چوتھے روز کراچی جاتا ہے؟ پھر اکیدم نرم پڑ کر اُس

کا ہاتھ تھپک کر کہنے لگیں۔

”تم اپنے دل و دماغ پر کوئی بوجھ مت ڈالو۔ ماں باپ کے ہوتے تہیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت

ہے جہلا اور سزا بھی یہ بات اپنے تک ہی رکھنا۔“

”جی۔“ اُس نے جھکے ہوئے سر کو آہستہ سے ہلایا پھر بوچھنے لگی۔ ”میں جاؤں بی بی جان؟“

”ہاں اور دیکھو سکندر آئے تو اسے میرے پاس بھیج دینا بی بی جان کی اجازت ملے ہی وہ اُن کے کمرے

سے نکل آتی۔“

بڑی جہانی تباہی کس بات پر جبریں کو ڈانٹ رہی تھیں۔ وہ کیسے نظر انداز کر کے راہداری میں مُڑ

گئی اور وہاں سے برآمدے میں نکل آئی شاہ سکندر نے صبح سے اپنے جانے کا بتایا تھا لیکن والہاں کا کوئی

ذکر نہیں کیا تھا اور جلنے آج اُس کی والہاں ممکن تھی یا نہیں۔ وہ کتنی دیر تک دوش پر قبل کر اُس کا انتظار

کرتی رہی۔ پھر تھک کر فوراً سے کی منڈیر پر آجی۔ دن بھر کی گرمی کے بعد اب کچھ ہوا چلنے لگی تھی۔

شاہ لوہاں جات اور شاہ جہانگیر جات کے بچے یوں جھگڑتے ہوئے کمروں سے نکلے جیسے انہیں قدر سے

رہائی ملی ہو۔ ان کے شور پر وہ آپ ہی آپ اُن کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ اور کچھ دیر تک انہیں کیستے اور ایک

دوسرے کے پیچھے جھگڑتے ہوئے دیکھ رہی پھر اکتا کر اُٹھنے کو بھی کہ بڑے ٹیٹ سے داخل ہوتی پھر و

کو دیکھ کر اُس نے اُٹھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اُس کا دھیان شاہ سکندر کی طرف تھا۔ اور وہ انتظار بھی اُسی

کا کر رہی تھی۔ لیکن اُس کی بجائے شاہ مارون کے ساتھ مہر النساء کو دیکھ کر اُس کا دل اندر ہی اندر پیٹنے لگا۔

ہنسی کی طرح وہ بے اختیار مہر النساء کی طرف لپکی بھی نہیں بلکہ اُس طرح اپنی جگہ بیٹھ رہی۔ شاہ مارون نے

انداز جاتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے اُسے سلام کیا تیب وہ کچھ ہوش میں آکر کھڑی ہو گئی۔ اور مہر النساء کو

دیکھ کر کوشش سے مسکراتے ہوئے بولی۔

”آنا ہی تھا تو صبح سے آئیں۔“

”باقاعدہ پروگرام کے تحت نہیں آئی۔ وہ تو ابھی مارون جہاں آ رہے تھے مجھ سے پوچھا چلو گی اور میں

جل پڑی۔“ مہر النساء نے یوں بتایا جیسے اُس کے سن کی مراد برائی ہو۔



”اچھا کیا۔ آؤ اندر چلیں۔“ وہ ہمیشہ کی طرح مہر الساد کو چھوڑنے کی بجائے نظریں چلا کر بولی۔  
”تم یہاں اکیلے بیٹھی کیا کر رہی تھیں؟“ مہر الساد نے اُس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھنی پوچھ لیا اور وہ  
بلارا دہ سچ بول گئی۔  
”میں سکندر بھائی کا انتظار کر رہی تھی۔“

”کہاں گئے ہیں؟“ مہر الساد کے لیے جسے ہمیشہ والی بے قراری تھی۔ اور اس بار وہ سنبھل کر بولی۔  
”کراچی۔ اصل میں، میں نے اُن سے کچھ چیزیں منگوائیں تھیں خصوصاً دو تین ناول جن کا کچھ شدت  
سے انتظار تھا۔ اور میں نے جہاں سے کہا بھی تھا کہ آج مجھے ہر حال میں مل جائے چاہیں۔ لیکن دیکھو ابھی  
تک نہیں آئے۔“

”بہت غیر ذمہ دار ہیں مبادے جہاں اور لاہر واہ بھی؟“ مہر الساد نے کہا تو وہ ہمیشہ کی طرح اُسے جھٹلا  
نہیں سکی۔ بلکہ یوں بن گئی جیسے اُس کی بات سنی ہی نہیں۔ اور اندر داخل ہو کر کہنے لگی۔  
”تم تو بی جان سے مل لو پھر اوپر آ جانا۔ بی بی جان اپنے کمرے میں ہوں گی۔“ مہر الساد کچھ کہے بغیر  
بی بی جان کے کمرے کی طرف مڑ گئی اور وہ اوپر چل آئی۔

اس وقت مہر الساد کی آمد نے اُسے خاصا پریشان کر دیا تھا۔ کیونکہ ذہنی طور پر وہ بہت اب سیٹھ  
تھی۔ اور اُسے خدشہ تھا کہ کہیں مہر الساد کے سامنے بے دھیانی میں وہ کوئی ایسی بات نہ کہہ جائے جو اُسے  
شبہ میں مبتلا کر دے۔ جیسا اُس کے اوپر آنے تک وہ مسلسل خود پر قابو پانے میں لگی رہی۔  
”آف، اتنی گرمی میں کیسے بیٹھی ہو۔ پردے تو ہٹا دو، مہر الساد نے کمرے میں آتے ہی کہا تو اُس نے  
جلدی سے پیلے پیلے کاٹن آن کیا پھر کھڑکی سے پردے ہٹائے۔ مہر الساد نے اپنا بڑا سا دوپٹہ اتار  
کر ایک طرف رکھا پھر کھڑکی کے قریب آ کر اندھیرے میں دیکھتے ہوئے بولی۔  
”بارش ہونے کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ لیکن شکر ہے ہوا چلتی لگی ہے۔ دن میں کتنی گرمی تھی۔“

”ہوں؟“ وہ اپنے ذہن کو حاضر رکھنے کی خاطر پوری توجہ سے اُس کی بات سن رہی تھی۔ لیکن جواب میں صرف  
”ہوں کہہ کر رہ گئی۔“

”کیا بات ہے؟“ کچھ دیر بعد مہر الساد اُس کی خاموشی محسوس کر کے ٹوکتے ہوئے بولی: ”آج تم کچھ چپ  
چپ سی ہو۔ بی بی جان نے بھی زیادہ بات نہیں کی۔“

”بی بی جان آج کچھ غصے میں ہیں؟“ اُس نے پوچھنی بات بنا ڈالی۔  
”جی ہریت؟“

”ہاں بس۔“ وہ اسی قدر کہہ سکی پھر فوراً موضوع بدلتے ہوئے کہنے لگی: ”یاد آ رہا ہو۔ میں کراچی سے بہت  
اچھے گاؤں کی ٹیکس لائن ہوں سنو گی؟“  
”معلوم؟“ مہر الساد نے اشتیاق سے کہا تو وہ فوراً ایک کسے پاس آ کر کیٹ دیکھنے لگی۔ لیکن بھر یاد آ یا کہ  
اُس روز اُس نے ساری چیزیں الماری میں رکھ دی تھیں۔ رکت چھوڑ کر الماری کھولی اور جیسے ہی شاہر کاٹنے  
لگی اُسے رکھا مہر الساد کا کیٹ جو اُس نے شاہر سکندر کے لیے دیا تھا۔ نیچے آ رہا جیسے اُس سے پہلے ہی مہر الساد  
نے پیک کر اٹھا لیا اور بہت خاموشی غلوں سے اُسے دیکھنے لگی تھی۔

”میں جانتا ہوں تمہارا وقت کتنا قیمتی ہے۔ اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب جب تک تم امتحانوں سے  
فارغ نہیں ہو جاؤ گی شہر تو کیا تمہارے خیالوں میں بھی نہیں آؤ گا۔“ شاہر سکندر کے بلا سے پر وہ آگے بڑھی  
معتی لیکن شاہر بھی جی جی وہ اُس سے آئندہ احتیاط کا وعدہ کرتے ہوئے بلا۔ تو اُس کی آخری بات پر وہ اپنی  
بے ساختہ مسکراہٹ چھپانے کی خاطر چہرہ موڑ کر لہروں کی سرکشی دیکھنے لگی۔ لیکن وہ اُس کی مسکراہٹ دیکھ کر  
تھکا پھیر بھی قصداً انجان بن کر چند قدیم آگے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ قریب آ کر پوچھنے لگی۔  
”جب آپ جانتے ہیں میرا کچھ قیمتی ہے پھر ملنے پر اتنا اصرار کیوں تھا؟“

”میں شاہر پور جانے سے پہلے یہ یقین چاہتا ہوں کہ ہر قسم کے حالات میں تم میرا ساتھ دو گی۔“ شاہر سکندر

اُس کے چہرے پر نظریں جاکر کہا۔  
”کیا مطلب؟“ وہ کچھ اُلجھ گئی۔ اور اُس نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ ادھر ادھر لوں دیکھنے لگا۔  
جیسے بیٹھنے کی جگہ تلاش کر رہا ہو۔ پھر جیسے اپنے آپ سے بولا۔  
”میرا خیال ہے یہاں تک نہیں ہے آؤ ادھر ریسٹورنٹ میں بیٹھتے ہیں؟“ وہ کچھ نہیں بولی خاموشی سے  
اُس کے ساتھ چل پڑی۔ ریسٹوران میں داخل ہو کر شاہر سکندر نے ایک میبل کی طرف مڑا ہوا تھا کہ اُسے وہاں  
بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اپنی مدد آب کے تحت کھڑے اٹھا کر اُس میں سینڈویچز اور ڈرنکس رکھنے لگا۔  
پھر آ کر کمرے اُس کے سامنے رکھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

”کیسے یاد آ م آپ کے لیے؟“  
”ہائیز آسید نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا اور اُس کے بیٹھنے پر کہنے لگی۔  
”ترتے جبر کا امتحان اب پھر کبھی لے لیجئے گا۔ اس وقت میں سخت الجھن محسوس کر رہی ہوں۔“  
”سوری، میں تمہیں الجھنا یا پریشان کرنا نہیں چاہتا اور نہ ہی تم پریشان ہونا۔ وہ ایک دم سنجیدہ

ہو کر بولا۔  
”کیا کوئی ایسی بات ہے؟“ آسید کے لیے میں آپ ہی آپ اندر بیٹھ سٹ آئے تو وہ اُس کی آنکھوں  
میں دیکھ کر قصداً مسکرایا پھر کہنے لگا۔

”جی نہیں تم کچھ بھی رہو۔ میں تو تمہیں بہت ناچاہتا ہوں کہ تمہارے امتحانوں کے فوراً بعد میں اپنے  
گھر والوں کو آؤں گا۔ تمہیں اب تمہارے گھر والوں کو کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا ناں۔“ وہ جو اس پر نظریں  
جمائے بیٹھی تھی۔ اُس کی بات پر نہ شمالی نہ جنوبی اسی طرح اُسے دیکھتے رہتی پھر پلکیں جھکا کر بولی۔  
”میرا خیال ہے اصل بات کچھ اور ہے۔“

”اصل بات یہی ہے۔ باقی ساری باتیں اس کے بعد کی ہیں؟“ وہ فوراً بولا۔  
”میں سن رہی ہوں۔ آپ بلا جھجک باقی ساری باتیں بھی کہہ ڈالیے؟“ وہ مزید شفاف سطح پر انگلی سے  
آڑی ترچھی لکیریں کھینچتے ہوئے بولی تو وہ کچھ دیر تک اُس کی جھکی ہوئی پلکیوں کو دیکھتا رہا پھر سوچ کر کہنے  
لگا۔

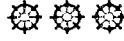
”مجھے غلط نہیں سمجھنا آسید، میں تمہارے ساتھ اتنا ہی غصہ ہوں جتنا اپنے آپ کے ساتھ۔ میں  
نے تمہیں دیکھا۔ پسند کیا اور پھر تمہیں اپنانے کا فیصلہ کر کے ہی میں نے تمہاری طرف پیش رفت کی۔ اگر  
محض دوستی یا وقت گزری کا خیال ہوتا تو میں کبھی تمہارے گھر تک نہ پہنچتا۔ ہر حال کچھ یقین ہے تمہارے  
گھر میں کوئی بھی مجھے ناپسند نہیں کرتا۔ لیکن اصل مسئلہ میرے گھر کا ہے۔ جہاں برادری کے باہر شادی  
کا تقوید ہی نہیں ہے۔“ وہ جو سر جھکائے سکون سے اُس کی بات سن رہی تھی۔ ذرا سی پلکیں اٹھا کر اُسے دیکھنے  
لگی۔ لیکن وہ اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ جیسا کہ نہیں۔

”صرف جامد لاؤنگ وجہ سے آپس ہی میں رشتے طے کر دیے جاتے ہیں۔ اگر اچانک تم نے آ کر میری  
زندگی میں پہنچ کر نہ چلی ہو تو شاید بلکہ یقیناً میری زندگی کی نا ڈھکی ایک محفوض دھارے پر بہہ نکلتی۔ لیکن  
اب ایسا نہیں ہے۔ بلکہ تم سے بہت کم سوچ بھی نہیں سکتا اور میری پہلی کوشش یہی ہو گی کہ میرے  
والدین غصے سے میرے فیصلے کو قبول کر لیں۔ دوسری صورت میں؟“ وہ خاموش ہو کر ایک دم اُس کی آنکھوں  
میں دیکھنے لگا۔ تو وہ ہونٹ جھینچ کر نظروں کا ڈاؤن پر دل گئی۔ شاہر سکندر سمجھ نہیں پایا کہ وہ کیا سوچ رہی  
ہے۔ پھر اُسے قوت سے کہنے لگا۔

”تم نے پوچھا نہیں کہ دوسری صورت میں کیا ہو گا؟“  
”میں جانتی ہوں، دوسری صورت میں آپ سب چھوڑ کر چلے آئیں گے؟“ اُس نے کہا تو وہ فوراً بے تاب

سے بولا۔  
”اور میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ اس صورت میں تم میرا کتنا ساتھ دو گی؟“ اُس کی بے تاب شدت سے  
محسوس کرنے کے باوجود وہ فوراً جواب دے کر بجائے سوچ کر بولی۔

”بی بی جان! وہ شہر باؤنے آپ کو بتایا ہوگا۔ میرا مطلب ہے، آسیہ کے بارے میں!“  
 بی بی جان بہت خاموش نظروں سے اُسے دیکھنے لگی تھیں۔ وہ اپنے آپ رگ گیا۔ اور محض اُن کی نظروں  
 سے بچنے کی خاطر اُلٹھ کر کھڑکی سے دُرا سا پردہ سرکایا پھر وہیں سے کہنے لگا۔  
 ”اگر نہیں بتایا تو میں بتا رہا ہوں کہ میں آسیہ کو پسند کرتا ہوں۔ اور اُس سے شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں۔“  
 کتنے درمیدار اُسے احساس ہوا کہ بی بی جان نے کچھ کہا نہیں۔ پلٹ کر دیکھا تو ایک پل کر اُس کی رنگ میں ہلکی گردش  
 قسم کی جتنی سانسے باباجان کھڑے تھے۔



شاہ سکندر نے سکینڈ کے ہزاروں حصے میں خود پر قابو پایا اور سرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔  
 ”بڑی مبارک ساعت ہے کہ بی بی جان اور باباجان میرے کمرے میں موجود ہیں۔ ایسے موقع پر وہ کیا  
 باتیں کہیں گی ان کو۔“  
 ”سکندر حیات! ہمیں جیکو دینے کی کوشش مت کرو، تم جانتے ہو ہم ہر اچھری پسند نہیں کرتے۔“  
 باباجان نے ٹوٹے ہوئے غصہ ناک لہجے میں کہا تو وہ اُن کے غصہ سے مرعوب ہوا بھی تو ظاہر نہیں کیا  
 بت سبیل کر بولا۔  
 ”میں بھی ہر اچھری پسند نہیں کرتا باباجان پوچھ لیجیے بی بی جان سے۔ سیدھے صاف لفظوں میں نہیں  
 نہیں بتایا ہے کہ۔“  
 ”اُن سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے برخوردار ہم تہا دی بات سن چکے ہیں۔ اب تم سن لو کہ ہمارے فیصلے  
 ہر کچھ ہوتے ہیں۔“  
 باباجان نے فوراً ہی اس انداز میں اُس پر واضح کیا کہ مزید اس سلسلے میں کچھ نہیں سنیں گے اور وہ بھی  
 دُرا بولی پڑا۔

”میں آپ کے فیصلے کو چیلنج نہیں کر رہا باباجان۔“  
 ”پھر تیار امقدار کیا ہے؟“  
 ”آپ دیکھیں میری بات سنیں، وہ چاہتا تھا سہولت سے بیٹھ کر اپنا مدعا بیان کرے۔ لیکن باباجان  
 سادہ نہیں ہوئے۔“  
 ”مہتمماری کوئی بات نہیں سنیں گے۔ اس لیے کہ ہم انسا سے تہا دی نسبت ہم نے بالا ہی بالا طے نہیں  
 تھی۔ تم نے پوچھ کر تہا دی مرقعی سے یہ رشتہ طے ہوا تھا۔ کیوں پولیس کی ماں؟ باباجان نے ایکدم بی بی جان کو  
 مایہ کیا تو وہ جو بہت خاموشی سے بابا بیٹے کی گفتگو سن رہی تھیں۔ اثبات میں سر ہلانے لگیں۔  
 ”تو پوچھو اس سے کہ اب اسے میرا انسا میں کون سے عیب نظر آنے لگے جو۔“  
 ”خدا کے لیے باباجان! ایسی باتیں نہیں کریں۔ وہ عاجزی سے بولا، ”میں ایسے کسی سبب سے مہر انسا کو  
 جکٹ نہیں کر رہا۔ بلاشبہ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔“  
 ”اور میں اچھی لڑکی اس کھڑی بہو بننے گی۔ باباجان کے حتمی انداز پر وہ ہونٹ بھیج کر بی بی جان کو دیکھنے لگا  
 شاید وہ کہیں کچھ پھر ان کی طرف سے مایوس ہو کر قدرے جرات سے بولا۔  
 ”مرازم میں تو اسے بیاتے نہیں جاؤں گا۔“  
 ”کیا کہا۔“ استانی غصے سے باباجان کی آواز بیٹھ گئی۔ ”سُرخ آنکھوں سے اُسے دیکھتے ہوئے چند قدم  
 اُسے مگر رک گئے۔ اور کمر دھڑک اُس پر نظر میں جھانکے رہنے کے بعد کہنے لگے۔  
 ”مرازمی وقت تمہیں ٹوٹ کر سکتے ہیں۔ یا اگر چاہیں تو عاقبت کر کے حیشہ کے لیے اپنی زندگی سے نکال دیں۔  
 ت تو ایک ہی ہے۔ لیکن ہم ایسا نہیں کریں گے۔ بجائے ہو کیوں؟“  
 اس قدر ٹھہرا ہوا سفاک تہج تھا کہ اس کو پل جوان کا پورا وجود سن ہو گیا۔ بہت کوشش کے باوجود وہ

”گو کہ میرے بارے میں سوچنے اور فیصلہ کرنے کا اختیار میرے والدین کو ہے۔ لیکن میں جانتی  
 میری مرقعی کے لیے وہ خود سے کوئی فیصلہ نہیں کریں گے، اور شاہ سکندر جیات آپ ہی سے تو کہ  
 کہ آپ میری زندگی میں اُس مقام پر فائز ہو چکے ہیں۔ جہاں آپ سے پہلے کون تھا نہ آپ کے  
 کوئی ہو سکتا ہے۔“  
 ”آسیہ! شاہ سکندر نے بے اختیار اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ تو وہ گھبرا کر بولی۔

”پلیز! کچھ خیال کریں۔“  
 ”سواری!“ وہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔  
 ”میرا خیال ہے چلنا چاہیے۔ وہ گھڑی دیکھ کر بولی۔ اور فوراً کھڑی بھی ہو گئی تو مجبوراً شاہ سکندر  
 اٹھنا پڑا۔  
 ”والہیں کے رستے میں وہ لقصاً اس موقع سے ہٹ کر ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ اور جب وہ  
 اسٹاپ پر اُترنے لگی تب روک کر کہنے لگا۔  
 ”سنو! تم ابھی کچھ مدت سوچنا۔ میرا مطلب ہے اپنے ذہن پر بوجھ مت ڈالنا۔ ہو سکتا ہے تم  
 امتحانوں کے بعد جب میں اُن دنوں میرے ساتھ بی بی جان اور باباجان بھی ہوں۔ وہ کیا کہی۔ ذر  
 پلانے پر اکتفا کیا۔ پھر نیچے اُتر کر اُسے دیکھنے لگی تو وہ مسکرا کر بولا۔  
 ”جلدی آؤں گا۔ خدا حافظ۔“ اس کے ساتھ ہی گاڑی آگے بڑھائی اور ویو مرمیں اُسے دیکھنے  
 لمحہ بر لمحہ دور ہونے کے باوجود اُسے اپنے ساتھ ساتھ محسوس ہو رہی تھی۔

شاہ سکندر تمام راستہ ہی سوچتا آیا تھا کہ اگر شہر باؤنے بی بی جان کو آسیہ کے بارے میں  
 بتایا ہوگا تو آپ وہ خود ہی سبلی فرصت میں بی بی جان سے بات کرنے کا۔ کیونکہ اب زیادہ دن  
 تھے۔ اور وہ جانتا تھا کہ بی بی جان اور باباجان آسانی سے نہیں مانیں گے، اگر مہر انسا سے اُس کی لڑ  
 طے نہ ہو تو ہوتی تب بھی اُن کا ماننا مشکل تھا۔ اور اب تو ظاہر ہے اُن کے پاس جواز موجود تھا۔  
 حوالی آتے ہی اُس نے سیدھا اپنے کمرے کا رخ کیا۔ خیال تھا شادی لینے کے بعد پہلے شہر باؤنے  
 گا۔ لیکن جیسے ہی مناد نے گھر کا کسی وقت بی بی جان اُس کے کمرے میں آگئیں۔ انہیں دیکھ کر وہ  
 ہونے کے ساتھ کچھ نادام ہو کر بولا۔  
 ”میں ابھی آپ ہی کے پاس آ رہا تھا بی بی جان۔“ بی بی جان اُس کے میڈ پر آرام  
 گئیں اور اُس کی بات یکسر نظر انداز کرتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

”کراچی سے آ رہے ہو؟“  
 ”جی ہاں۔“ وہ دزدیدہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔ لیکن اُن کے چہرے پر کوئی غیر معمولی تا  
 تھا۔  
 ”بھڑے کہاں تھے؟“  
 ”جی ہاں میں۔“

”وہاں کوئی ننگہ کیوں نہیں خرید لیتے۔ اکثر جانا ہوتا ہے۔ تمہارے باباجان بھی جاتے رہتے۔  
 گھر بیٹا جیسے۔ میں کہوں گی تمہارے باباجان سے۔ بی بی جان نے سرسری سے انداز میں کہا پھر  
 کہ وہ اُن کے گفتگوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”میں نہیں ناں بی بی جان، کہاں جا رہی ہیں؟“  
 ”میں تمہارے لیے جاتی ہے جھوٹی ہوں۔ سفر سے آ رہے ہو۔“  
 ”ہاں چائے کی غائش تو ہے۔ لیکن آپ بیٹھیں، میں جہاں سے کہہ آ رہی ہوں۔“ وہ کہتا ہوا کہ  
 نکل آیا۔ زندگی اُترتے ہی جہاں نظر آئی۔ اُسے جلدی سے جانے لائے گا کہ وہ دیں گے پلٹ  
 بی بی جان کے پاس بیٹھے ہی ہیں چنانک بلا ارادہ ہی کہنے لگا۔

اُن کی طرف دیکھ نہیں سکا۔  
 ”کیونکہ ابھی میرا سنا کو اس حویلی کی بہو بننا ہے۔ جسے تم بیاہ کر لاؤ گے۔“  
 بابا جان اُسے ٹوٹ کر نہ کہنے کا سبب بتا کر فوراً اُس کے کمرے سے چلے گئے۔ اور جب بی بی جان  
 پیچھے جانے لگیں تب ایک دم ہوش میں آکر وہ ایک ہی جست میں اُن کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اور اُن کے  
 کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”بی بی جان! میں آپ کو اور بابا جان کو ناراض نہیں کرنا چاہتا۔“  
 ”اور کس طرح ناراض کرو گے؟“ بی بی جان کے شاکی لہجے پر وہ زنج پر کر بولا۔

”آپ میری بات تو سنیں!“  
 ”نہیں سکندر راجا! جو کچھ تمہارے بابا جان کہہ گئے ہیں اُسے حرف آخر سمجھو۔“  
 بی بی جان نے اُس کی بات سننے سے صاف انکار کر دیا۔ تو گہری سانس لیچھنے ہوئے اُس نے اُن  
 کندھوں پر سے ہاتھ ہٹا لیے پھر اُن کے سامنے سے ہٹے ہوئے بولا۔  
 ”کہہ دیجیے بابا جان سے کہ میرا سنا کو بیاہنے میں نہیں میری لاش جلنے گی۔“  
 بی بی جان نے دل کر اُسے دیکھا تھا۔

شاہ سکندر کے لیے کوئی بات غیر متوقع نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا بابا جان اور بی بی جان کو رام کرنا آسان  
 پھر بھی وہ مایوس نہیں تھا۔ اور ابھی تو بات شروع ہوئی تھی۔ اُس کے خیال میں پہلے حملے پر ہی ہونا  
 بابا جان اُسے ٹوٹ کرنے کی دھکی دیں گے۔ پھر کھڑن ناراضگی کا اظہار اُس کے بعد آپ ہی آپ  
 جائیں گے۔ اُس وقت وہ یہی سب سوچتا ہوا اپنے کمرے سے نکل کر ٹیس پر آ کھڑا ہوا۔ شام اُن  
 پہلے اُسے بے پناہ خاموشی کا احساس ہوا تو جیسے اُس کے آس پاس بلکہ پوری حویلی میں اور کوئی نہ  
 نہ ہو۔ پھر اچانک ہلچل مچ گئی۔ اُس نے رینگ پر ہاتھ رکھ کر کیچے جھانک کر دیکھا۔ بابا جان شاہ لا  
 کے ساتھ بہت تیز قدموں سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے اُن کے پیچھے دو تین ملازم بھاگتے  
 باوجود درمیانی فاصلہ کم نہیں ہونے دے رہے تھے۔  
 اُس نے بہت خاموشی سے بابا جان اور شاہ یونس کو گاڑی میں بیٹھتے ہوئے دیکھا اور جب گاڑی  
 ہونی حویلی کی حدود سے نکل کر سیاہ چلتی ہوئی سڑک پر گڑے پھرنے کی تپ تک اُسے بیلا خیال یہی آیا  
 وقت بابا جان کہاں گئے ہیں۔ اور اس خیال کے ساتھ ہی وہ کچھ ٹھٹھک گیا۔ کیونکہ یہ بابا جان  
 نہیں تھا۔ اور ابھی وہ اس غیر معمولی بات پر غور کر رہی رہا تھا کہ عقب سے شاہ جہانگیر نے اُسے

”سکندر!“  
 ”جی بھائی!“ وہ بے اختیار فوراً پلٹ کر انہیں دیکھنے لگا تو قریب آکر انہوں نے یونہی  
 ”کہاں کیا کر رہے ہو؟“  
 ”کچھ نہیں بابا جان کو دیکھ رہا تھا، کہاں گئے ہیں؟“ اُس کی سوچ آپ ہی آپ سوال کی صورت  
 آگئی۔  
 ”بابا جان کہاں گئے ہیں؟“ شاہ جہانگیر نے اُن کا اُس سے پوچھا۔ انداز ایسا تھا جیسے انہیں  
 جلنے کی خبر ہی نہیں۔

”جانتا نہیں، میں نے ابھی انہیں جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ یونس بھائی بھی ساتھ تھے۔“  
 ”اچھا! کچھ نہیں معلوم؟“ شاہ جہانگیر کے بے نیازی دکھانے پر وہ خاموش ہو کر اُن کا  
 دھڑاتے ہوئے شاہ جہانگیر نے خود گاڑی کے انداز میں کہا۔  
 ”شام ہو رہی ہے۔ پھر اُسے دیکھ کر بولے۔“ آؤ اندر چلے ہیں۔“  
 ”جی!“ وہ ان کے ساتھ اپنے کمرے میں آگیا۔ ٹیوب لائٹ اُن کی پھر انہیں بیٹھنے کا

”گلتا ہے۔ آپ کو بچتے یا آدھے ہیں۔“  
 ”ہاں ہاں! بس اب جلدی سے چھٹیاں ہوں تو جا کر انہیں لے آؤں یہ شاہ جہانگیر بیٹھے ہوئے بولے۔  
 ”میرا تو خیال ہے بھائی! بچوں کو کراچی کے کسی اچھے اسکول میں داخل کرادیں۔ قریب بھی ہے ہر

”نہیں یار! بچے کراچی کی آب و ہوا پسند نہیں ہے۔ موسموں کا ہوتا ہی نہیں چلتا۔“  
 ”سوں!“ وہ کیا نکتہ جس اُن کی نائید کر کے رہ گیا۔

”سنائے۔ نہیں کراچی کا موسم راس آگیا ہے۔“  
 شاہ جہانگیر نے نفی خیز سکرا سٹ کے ساتھ کہا تو وہ ذرا سا چونکا پھر اُن کا اشارہ سمجھ کر اُس کے ہونٹ  
 ے ساتھ مسکراہٹ کی گرفت میں آگئے۔ جبکہ نظروں میں وہ خوبصورت سراپا آن سما تھا جس کی خاطر وہ اپنی  
 بذاتی روایات تو کیا ساری دنیا سے لڑ سکتا تھا۔ شاہ جہانگیر نے گہری نظروں سے اُسے کھوجا پھر کہنے

”محنت حاققت کی ہے تم نے، جانتے ہو اس کا انجام کیا ہوگا؟“  
 ”زیادہ سے زیادہ بابا جان مجھے ٹوٹ کر دیں گے۔“ اُس نے اتنے آرام سے کہا کہ شاہ جہانگیر کو واقعی

”بس اپنے بارے میں سوچ لیا تم نے، اور ہم سب؟ ہم سب کی کوئی اہمیت نہیں تمہاری نظر میں۔“  
 ”یہ بات نہیں ہے بھائی!“ وہ نظروں چرا گیا۔

”پھر؟“  
 ”میں نے کوئی جرم کوئی گناہ نہیں کیا۔ اپنی زندگی جینا چاہتا ہوں۔ آپ اگر جان ہی گئے ہیں تو میرے بجائے

”بی بی جان اور بابا جان کو سمجھائیں۔“  
 ”کیا کہاؤں؟“ شاہ جہانگیر نے اپنی نشست کا انداز بدلتے ہوئے پوچھا تو وہ انہیں اپنی بات تو جہ

”میں کوئی لمبی چوڑی تمہید نہیں باندھنا چاہتا بھائی، سیدھی صاف بات یہ ہے کہ میں اسیہ سے شادی  
 یا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے اگر بی بی جان اور بابا جان خوشی سے راضی ہو جائیں تو اچھی بات ہے دوسری  
 ورت میں میں خود یہاں سے چلا جاؤں گا۔“

”گویا فیصلہ کر چکے ہو؟“ شاہ جہانگیر نے کہتے ہوئے سگریٹ ہونٹوں میں دبایا اور سگائے کے بعد کہنے

”ٹھیک ہے۔ میں مانتا ہوں کچھ حادثات اچانک زندگی کا رخ موڑ دیتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب  
 نہیں ہے کہ بندہ ایک دم سے ہتھار ڈال دے۔ اُس لڑک کی طرف پیش رفت سے پہلے نہیں کم از کم یہ تو

”چننا چاہیے تھا کہ ہیں شہر بانو اس گھر میں منسوب ہے جہاں تمہاری نسبت مٹھ چلے ہے۔“  
 ”میں اگر یہ سب سوچتا تب بھی خود کو اُس کی طرف بڑھنے سے نہیں روک سکتا تھا۔“  
 اُس نے صاف گوئی سے اپنی بے بسی کا اظہار کیا تو شاہ جہانگیر نے ہنسیوں اچکا کر تعجب سے اُسے

”کیا پھر کہنے لگے۔“  
 ”مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنے جذباتی ہو، اور اب تو نادان بھی کہوں گا۔ کیا ضرورت تھی اتنی جلد بازی کا

”نظم بکرنے کی۔ کچھ حکمت عملی کے کام لیتے؟“ اُس نے نہ سمجھنے والے انداز میں دیکھا تو کہنے لگے۔  
 ”ایک دم سے یہ کہہ دینا کہ میرا سنا سے شادی نہیں کروں گا، حاققت کے ساتھ خود غرضی بھی ہے۔ کتنی  
 مذاکیاں متاثر ہوں گی تمہارے انکار سے اگر پہلے نہیں سوچا تو اب سوچو۔ جلد دوسروں کو چھوڑ دو صرف اپنے

بارے میں سوچ کر بتا دیکر یہاں سے نکل کر کیا کر دے؟  
 ”ظاہر ہے، آسیہ سے شادی۔ وہ بنا سوچے بول گیا تو شاہ جہانگیر ذرا سا مسکرائے۔  
 ”تہار کے ذہن پر صرف آسیہ سوار ہے۔ باقی داؤے کیا کرتی ہے؟“  
 ”انہوں نے پہل بار اُس لڑکی کے بارے میں اشتیاق سے پوچھا۔  
 ”میرے بچے آخری سال میں تھی، میرا مطلب ہے آج کل فائنل امتحان دے رہی ہوگی؟“  
 وہ اُن کے سوال کا جواب دینے کے ساتھ آسیہ کی تعریف کرنے لگا۔  
 ”بیت ذہین لڑکی ہے، میری ک سے پوزیشن لیتی آ رہی ہے۔“  
 ”اُس کا مطلب ہے مستقبل قریب کی کامیاب ڈاکٹر؟“ انہوں نے سوچتے ہوئے انداز میں جیسے اپ  
 آپ سے کہا۔ پھر اُسے دیکھ کر تائید سے بولے۔  
 ”اسی لیے اسنے اطمینان سے جوتم، بابا جان عاق کر دیں یا تم خود سب چھوڑ کر چلے جاؤ۔ آگے کوئی  
 نہیں کرنا پڑے گا کہیں۔“  
 ”نہیں، جہانگیر بھائی، جوش جذبات سے اجانک اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔  
 ”اتنا بے غیرت نہیں ہوں میں کہ عورت کی گئی پر تکیہ کرے لگوں۔ میں اُسے لڑکی کی اجازت  
 اُس وقت دن کا جب میرے گھر میں اس کے پیسے کی ضرورت نہیں ہوگی۔“  
 ”اور اس سے پہلے کیا کر دے؟ شاہ جہانگیر کا انداز ہنوز تھا۔ جھٹھرا ہوا، دوستانہ، جیسے اُس سے  
 اگلوانے کا سوچ کر آئے ہوں۔  
 ”میں خود کیوں گا۔ لڑکی یا کوئی چھوٹا موٹا بزنس۔“  
 ”ہوں، یہی میں تم سے پوچھنا چاہتا تھا کہ یہاں سے نکل کر کیا کر دے اور تم نے فوراً آسیہ سے  
 کی بات کر دی۔“  
 ”انہوں نے کہا تو وہ اپنی جلد بازی پر جرحی سا ہو کر سر کھانے لگا۔  
 ”بہر حال، یہ سب اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ اس لیے میرا مشورہ مانو، بابا جانا  
 مت کرو۔“ انہوں نے کہا تو وہ پھر فوراً بول پڑا۔  
 ”میں آسیہ کو نہیں چھوڑ سکتا۔“  
 ”میں اُسے چھوڑنے کو نہیں کہہ رہا۔ اور نہ ہی میں یہ چاہتا ہوں کہ اُس کے لیے تم یہاں سے سارے  
 توڑ کر چلے جاؤ۔ بلکہ کوئی اور راستہ سوچو۔“  
 ”تمہارے پیش نظر صرف اپنی ذات نہیں ہونا چاہیے۔ یہ سراسر خود غرضی ہے۔ سمجھ رہے ہونا؟  
 چنانچہ اُسے کیا سمجھانا چاہیے تھے۔ وہ بے حد خاموش نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

آسیہ کو اپنا سابقہ ریکارڈ برقرار رکھنا تھا۔ اس لیے امتحانوں کے دوران اُس نے کسی خیال  
 قریب بیٹھنے نہیں دیا۔ پوری کیوں اور دلچسپی سے پڑھنے میں لگی رہی تھی۔ خدا خدا کر کے امتحان ختم ہو  
 جہاں اُس نے سکون کا سانس لیا وہاں اُس کے بھیجے جتنی باتیں خوش ہو گئے۔ کیونکہ امتحانوں کے دو  
 کو اُس کے کمرے میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اور سب نیچے اُس سے اتنے مانوس تھے، جب  
 دن بھر کی روداد اُسے سنا کر انہیں چین نہیں آتا تھا۔  
 وہ سب سے محبت بھی تو بہت کرتی تھی۔ اکثر اُن کے ساتھ بچہ بن جاتی۔ اُن کے کیل میں  
 ہوتی۔ اور ادھر اتنے دن وہ اپنے کمرے میں بند رہی تو ظاہر ہے بچے پریشان ہو گئے تھے۔ میو  
 الگ بولانی بولانی پھر رہی تھیں۔ اور وہ جو آخری یہ سچے کمرے کے بعد یہ سوچ کر سوئی تھی کہ اب لگے دن؟  
 گی، میمونہ بھائی نے سر شام ہی اُسے جھنجھوڑا لیا۔  
 ”بس اب فوراً اٹھ جاؤ۔ بچے پیار سے تمہاری صورت دیکھنے کو ترس گئے ہیں۔“

تو یہ آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔ وہ آنکھیں ملنے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ پھر انہیں دیکھ کر پوچھنے لگی۔ کہاں  
 جا رہے؟  
 ”اُسے اُمر اور سونا تو یہیں دھاوا بولنے والے تھے۔ بڑی مشکل سے انہیں روکا ہے۔ چلو اب تم  
 مدی سے منہ ہاتھ دھو کر آؤ۔ چائے بھی تیار رکھی ہے۔“  
 ”میونہ بھائی جانے چائے پینے کا بن بند کرن گئیں۔ غالباً اس خیال سے کہ کہیں وہ دوبارہ نہ سوجھے  
 درنا جا رہے اٹھنا پڑا۔ منہ ہاتھ دھو کر کمرے سے نکلی تو اُسے دیکھتے ہی اُمر اور سونیل نے شور مچا دیا۔  
 ”چھوڑ آگئیں، پیپو آگئیں۔“ وہ کھل کر سدا کی اور باری باری اُن کے کال چھو کر اماں جی کے پاس  
 نت بڑی پریشانی اور اُن کی گود سے عمر کو اٹھاتے ہوئے بولی۔  
 ”ماشاء اللہ، یہ تو بہت مبارک ہو گیا ہے کس پر گیا ہے؟“  
 ”تم تارو؟“ اماں جی نے کہا تو وہ فوراً سے عمر کو دیکھنے کے بعد بولی۔  
 ”مجھے تو بیل کی طرح لگ رہا ہے۔“  
 ”ہاں پشانی اور آنکھیں نیلی جیسی ہیں۔“  
 ”بیل سے کہاں؟“ اُسے اچانک بیل کی کمی محسوس ہوئی کدھر اُدھر دیکھ کر بوجھا۔  
 ”ابھی تمہارے آبا جی کے ساتھ باہر گیا ہے۔“ اماں جی نے بتایا بھی میمونہ بھائی چائے لے کر آئیں۔  
 ”اُسے دریاں نہیں رکھی پھر بیٹھیں تو کھینے لگیں۔“  
 ”بچوں کی چٹیاں ہونے وال ہیں، کیوں نہ ماناں جی اسلام آباد چلیں۔“  
 ”ہاں برسوں سینا کا فون آتا تھا۔ وہ بھی بہت اصرار سے بلارہی تھی۔ اب دیکھو تمہارے آبا جی کیا کہتے ہیں؟  
 اُن جی نے کہا تو وہ پوچھنے لگی۔  
 ”آبا جی منع کر دیں گے کیا؟“  
 ”نہیں، منع کیوں کر دیں گے۔ لیکن سارا گھر ایک ساتھ بھی تو نہیں جاسکتا ناں۔ یہاں خلیل اور عدیل لڑکی  
 لے گئیں انہیں بھی کہاں ملے گی اور اُن کے لیے گھر میں ایک عورت کا ہونا بھی ضروری ہے۔“  
 ”اماں جی کی بات سنی ٹھیک تھی، وہ تاخیر کرتے ہوئے میمونہ بھائی کو دیکھ کر شرارت سے بولی۔  
 ”یہ تو ہے، بس میمونہ بھائی یہیں رہ جائیں گی۔“  
 ”کیا؟“ میمونہ بھائی جمع بڑھی۔  
 ”میرا مطلب ہے، ابھی اماں جی اور آبا جی کو جانے دیں، ہم بعد میں چلیں گے میں، آپ اور بچے۔“  
 ”فوراً وضاحت کر کے خود ہی ہنس پڑی۔  
 ”نہیں اگر جانا ہو، تو پہلے تم دونوں چلی جانا بچے خوش ہو جائیں گے۔“  
 ”اماں جی نے کہا تو میمونہ بھائی کے اشارے پر اُسے خاموش رہنا پڑا۔ ورنہ وہ منع کرنا چاہتی تھی۔  
 ”اُسے شاہ سکندر کا خیال تھا، جانتی تھی کہ وہ بے خبر نہیں ہوگا۔ آج امتحان ختم ہوئے ہیں تو اب  
 آکا جانا رہے گا۔ اور جب تک کچھ طے نہ ہو جائے وہ کہیں نہیں جانا چاہتی تھی۔“  
 ”امتحانوں کی وجہ سے اُس نے ہر سوچ کو ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ لیکن یہ نہیں تھا کہ اُسے شاہ سکندر  
 یاں آیا ہی نہیں۔ بلکہ اُس کا خیال تو کوئی نہیں ہوا تھا، البتہ اُس کے بارے میں کچھ بھی سوچنے سے وہ گریز  
 کرتی تھی۔ اور اب وہ آزاد تھی۔ اُس رات درمیک وہ یہی سوچتی رہی کہ وہ جو کہہ کر گیا تھا کہ اس بار  
 بے والدین سے بات کرے گا۔ وہ مان گئے تو ٹھیک ورنہ سب چھوڑ آئے گا۔ تو جانے اُس کی آمد کس  
 نے ہوگی، البتہ والدین کو لے کر آئے گا یا نہ۔“  
 ”میر دو موٹوں میں اُس نے اُسی دقت سے اپنا دل انتظار کی دلمیز پر رکھ چھوڑا تھا۔  
 ”میر دو معمول کے مطابق اٹھ گئی۔ اور جب تک میمونہ بھائی بچوں کو اسکول کے لیے تیار کر دیں اُس نے  
 ستیا کر لیا۔ بڑے بیٹا بیل کے ساتھ نیچے اترے تو میمونہ بھائی نے اُمر اور سونیل کے ساتھ بیل کو

بھی بٹھالیا۔ اور تینوں کو ناشتا کرا کر اسکو بھیجا۔ اس کے بعد خلیل اور عدیل کی باری آئی تو اس کی نظر بڑے بھینکاؤں سے گزرتی تھی۔ لیکن وہ جا چکے تھے۔ پھر میری وہ میمونہ بھابی سے پوچھنے لگی۔

”بڑے بھینکا چلے گئے کیا؟“

”ہاں شاید“ میمونہ بھابی نے ہاتھ میں چائے دم کر رہی تھیں۔ مصروف انداز میں جواب دیا۔  
”ناشتا بھی نہیں کیا؟“ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے جب بڑے بھینکا کو دیکھا تھا تو اسی وہ انہیں روک کیوں نہیں لیا۔

”وہ ناشتا نہیں کرتے، شاید انہیں صدمہ ہو گئی ہے کہ اپنی بیوی ناشتا بنا کر دے گی تو کرس۔ ورنہ نہیں؟“

”میمونہ بھابی نے اپنا خیال ظاہر کیا پھر ٹیٹا ہاتھ اٹھا کر اُسے دیکھتی ہوئی بولیں۔

”میں یہ اندر دے آؤں۔ تم اب اپنے اور میرے لیے ناشتا بنا لو“

”اماں جی اور آبا جی؟“

”وہ اپنے بیٹوں کے ساتھ کر رہے ہیں؟“

میمونہ بھابی کہتے ہوئے چلی گئیں۔ تو اُس نے جلدی سے دو اونٹے ڈال کیے پھر کتلی میں مزید پا کر چوبلیا تیز کر دیا۔ اور جب تک میمونہ بھابی خلیل بھابی کو کسی آف کر کے آئیں تو وہ دُشے میں ناشتا رکھتی۔ انہیں دیکھتے ہی پوچھنے لگی۔

”کہاں بھینک گئی؟“

”اپنے کمرے میں چلو، کیونکہ میرا کمرہ اس وقت بیٹھنے کے قابل نہیں ہے۔

میومہ بھابی نے بولی ہوئی ہی نہیں اُس نے زیادہ دھیان نہیں دیا۔ اُن کے پیچھے اپنے کمرے میں داخلہ ناشتے کی طرے میل پر رکھ کر ٹیٹا کے قریب کھینچی۔ پھر بیٹھنے ہوئے کہنے لگی۔

”میرا دل چاہ رہا ہے۔ ایک کب چائے بنیل بھابی کو دے آؤں ہو سکتا ہے انہیں کچھ احسا

”اس کے لیے پہلے تمہیں چلہ کا فٹنا پڑے گا تاکہ تمہاری چائے کی پیالی میں کچھ اثر ہو۔

میونہ بھابی نے بظاہر بڑی سنجیدگی سے کہا پھر بھی اُسے بے ساختہ ہنسی آئی۔

”اب بھی کس کمال میں؟“

”اچھا چلو ناشتا کرو، اُس کے بعد جو دل چاہے کرنا۔“

میونہ بھابی نے ٹوک کر خود کھا ناشتہ شروع کر دیا تو وہ کب سیدھے کر کے اُن میں چائے ڈالنے

پھر ناشتے کے بعد وہ واقعی چائے کا کپ دے کر اوپر چلی آئی۔ بنیل بھابی بے خبر سو رہی تھیں

کی کھ میں نہیں آیا انہیں کیسے اٹھائے اندر ہی اندر ڈر رہی تھی کہ بتا نہیں اٹھائے جانے پر اُن کا دل

کیا ہو۔ گو کہ اُس کے ساتھ اُن کا رویہ شگ ہی تھا۔ لیکن جس طرح وہ بڑے بھینکا کے ساتھ تلخ کلاسی کو

اُس سے وہ اپنے آپ اُن سے خائف رہی تھی۔ کچھ درخشش و بے چینی میں کھڑی رہی۔ پھر پکارا تو آواز؟

نکلی یا شاید بے خبر سوئی بنیل بھابی تک نہیں پہنچی۔ تب آہستہ سے اُن کا کندھا ہلکا کر لوی۔

”بھابی جان! چائے لے بیٹھے۔“

”ہوں؟“ بنیل بھابی نے کسم کس ڈرا سی آنکھیں کھول کر اُسے دیکھا پھر وال کلاک پر نظر ڈالی جس کا

نوجوا رہی تھیں۔ اور غائبانہ وہ ابھی پوری طرح۔ میدا نہیں ہوئی تھیں جب ہی اٹھی ہوئی بولیں۔

”بارہ پنج رہے ہیں؟“

”نہیں، ابھی نو بجے ہیں۔“ وہ چائے کا کپ انہیں تھما کر دے ہوئے بولی۔

”تمہارا آج پیر نہیں ہے؟“ انہوں نے چائے کا کپ لے کر پوچھا۔

”نہیں کل آزی پیر تھا۔“

”اچھا، کیسے ہوئے پیر؟“

”بہت اچھے۔“  
”اُن کا مطلب ہے اس بار بھی ٹاپ کرو گی، دیری گڈ۔ اور یہ تم کھڑی کیوں ہو، بیٹھو نا۔ اب تو فارغ

ہی ہو۔ انہوں نے اُسے سر ہانے کے ساتھ بیٹھنے کو کہا تو وہ قدرے تکلف سے بیڈ کے کنارے بیٹھے ہوئے

بولی۔

”میں نے آپ کو جلد ہی اٹھا دیا۔“

”کوئی بات نہیں۔“ ویسے کوئی کام ہے بھیسے؟“ انہوں نے پوچھا تو وہ جڑبڑ ہو کر بولی۔

”نہیں، ابھی سب ناشتے سے فارغ ہوئے ہیں، میں نے سوچا آپ سے بھی پوچھ لوں۔“

”میں ناشتا نہیں کرتی۔“ خیر تم ساڈ آب کیا ارادے ہیں۔ بڑے آرام سے اسکا کرشپ پر باہر جاسکتی ہو۔

گوٹرن چائس ہے بس نہیں کرو۔“ انہوں نے اس کا ارادہ پوچھنے کے ساتھ مشورہ بھی دے ڈالا تو وہ قعد

مسکرا کر بولی۔

”میںیں پریکٹس کروں، بڑی بات ہے۔“

”ہاں بتا دے لیجئے یہی بڑی بات ہے۔“ بنیل بھابی قدرے استہزائیہ مہنیں تو وہ وہاں سے اٹھتے

کے بہانے ڈھونڈنے لگی، اور فوری طور پر یہی بہانا سوچا۔

”آپ کے لیے اور چائے لاؤں؟“

”نہیں بس۔“ اب شادروں کی بنیل بھابی کہتے ہوئے بیڈ سے اُتریں تو وہ بھی اُن کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

چلنے کا خالی کپ اٹھا یا اور اُسے لگی تو وہ نیکار کر بولیں۔

”سنو، نیل آئے تو ذرا اُسے جیک کر لیتا۔ مجھے اُس کی آواز بدلی ہوئی لگ رہی تھی۔“

”جی؟“ وہ اختصار سے کام لیتے اُن کے کمرے سے نکل آئی۔ پھر کتنے دن گزر گئے۔ بچوں کی چھٹیاں ہو

گئیں تو میونہ بھابی سنجیدگی سے اسلام آباد جانے کا پروگرام بنانے لگیں، جبکہ وہ پوری کوشش کر رہی تھی کہ

کسی طرح اُس کا جاننا نہ ہو سکے۔ لیکن اُس روز جب خلیل بھابی نے میمونہ بھابی کے ساتھ اُسے بھی تیار

کرنے کو کہا تو وہ سچ بخ پریشان ہو گئی تھی۔

”میں آسید کو چھوڑنے کو نہیں کہہ رہا اور نہ ہی یہ چاہتا ہوں کہ اُس کے لیے تم یہاں سے سارے ناتے

توڑ کر چلے جاؤ۔“ لکھ کوئی اور راستہ سوچو، شاہ جانا میرے اُس سے کہا تھا اور اُس وقت سے وہ الجھ رہا۔

تھا۔ بہت سوچنے کے بعد بھی اُسے کوئی تیسرا راستہ کچھ میں نہیں آیا۔ وہی دور راستے تھے کہ تھرا بالوں کی خاطر اپنی

جست خرابان کر دے یا سب چھوڑ کر چلا جائے۔ کیونکہ بابا جان اور پھر بی بی جان بھی اُس کی مزید کوئی بات

سننے پر تیار نہیں ہوئی تھیں، جس سے ظاہر تھا کہ وہ ہر قیمت پر ہمہ انسا کو ہونا کر لائیں گی۔ اس لیے میں دلوں

ل مسلسل ذہنی کش مکش کے بعد بالآخر اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اُس بڑی کی خاطر سب چھوڑ دے گا۔ جس نے

اُسے خوبصورت اور پر کیف لمحات بخشنے تھے گو کہ وہ ساتھ ہی نہ کوئی تیسرا پھر بھی اُس میں کوئی ایسی بات

غزور تھی کہ پہلی نظر میں ہی شاہ سکندر حیات اپنی ہستی کا غور تک بھلا بیٹھا تھا۔ اور اب یہ کسی طرح ممکن

نہیں تھا کہ وہ اُسے اپنی زندگی سے ہی نکال دے۔ جیسی اُس کے پاس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اور کیونکہ

شاہ جانا نے اُس روز سہولت سے اُس کی بات سنی تھی اُس لیے اُس نے سوچا وہ انہیں اپنے ارادوں سے

گاہ کر دے۔ اسی خیال سے وہ اُن کے کمرے میں آیا تو بھابی جان کو ایک چھوٹا سا سوٹ کیس تیار کرتے دیکھ

کر لویں پوچھ لیا۔

”کہاں کی تیار ہے؟“

”تمہارے بھائی جاس ہے میں مری، بچوں کو لینے۔“ بھابی جان بتاتے ہوئے الماری کی طرف بڑھ گئیں۔

”وہ سوٹ کیس پر نظر ڈال کر پوچھنے لگا۔“

”صرف بچوں کو لانا ہے یا کوئی اور کام بھی ہے؟“  
 ”تائیں۔ لودہ آگئے ان ہی سے پوچھ لو۔“ جہاں جان الماری بند کر کے پلیٹیں تو اندر آتے شاہ جہاں کو دیکھ کر بولیں۔  
 ”کیا پوچھنا ہے؟“ شاہ جہاں گہرے آواز سے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔  
 ”وہ آپ کی والدین کب ہوئی، میرا مطلب ہے مری سے؟“  
 ”پرسوں یا اُس کے لنگھنے دن، کیوں؟“ شاہ جہاں گہرے آواز سے پوچھا۔

”نک کر بولا۔“  
 ”مجھے آپ سے کچھ بات کرنی تھی۔ خیر آپ مری سے ہو آئیں۔ تب تک میں بھی کراچی کا چکر لگاؤں گا۔“  
 شاہ جہاں گہرے آواز سے کہا بات کرنی ہے۔ لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ فیصلہ بھی کر چکا ہے۔ کچھ گہری نظروں سے اُسے دیکھتے رہے پھر کہنے لگے۔  
 ”کراچی جانے کے بجائے میرے ساتھ چلو، اُس نے فوراً سر اٹھا کر دیکھا تو مسکرا کر بولے۔“ میں اہل سے بات کر رہی تھی۔“  
 ”میاں اطمینان سے بات نہیں ہو سکتی کیا؟“ وہ بھی مسکرایا تو وہ اس کا کندھا تھپک کر بولے۔  
 ”جادو، اپنے ایک دوسوٹ لاکر اس سوٹ کیس میں رکھ دو پھر نکلتے ہیں۔“

”لیکن؟“  
 ”لیکن؟“ وہ اچھل پڑی۔ ”آج ہی سبھی پوچھا ہے آپ نے؟“  
 ”وہ منع ہوئی کر رہ گئے۔ یہ بھی تمہارا اپنا گھر ہے کیوں میمونہ؟“ میما جہاں نے آخر میں میمونہ جہاں سے میڈیا جہاں تو وہ اُسے دیکھ کر معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔  
 ”اپنا گھر تو اس کا یہ ہے نہ وہ۔ وہ تو کوئی اور ہی گھر ہو گا جیسے یہ اپنا کہے گی۔“  
 ”وہ تو جب ہو گا تب۔ ابھی تو یہی اس کے گھر ہیں؟“ میما جہاں نے کہا تو وہ فوراً بولیں۔  
 ”بالکل یہی میرے گھر ہیں، میں، اماں جی کے پاس رہوں یا آپ کے پاس کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہاں می سب محبت کرنے والے ہیں، یہاں بھی کبھی کبھی تو مجھے خود پر رشک آتا ہے۔ زندگی میں کبھی مجھے بہن کی محسوس ہوتی تھی۔ اللہ نے آپ دونوں کی صورت وہ بھی پوری کر دی۔“  
 ”تیسری بھانج کا نام نہیں لیا تم نے؟“ میما جہاں نے خوشی سے کہا تو اُس نے چونک کر دیکھا پھر سنبھل بولی۔

”اصل میں جب بڑے بھائی شادی ہوئی اُس وقت میں کافی چھوٹی تھی اس لیے بیلہ جہاں کے ساتھ۔“  
 ”نکلتے نہیں ہو سکی۔ پھر ان کا مزاج بھی کچھ الگ ہے۔“  
 ”ابھی میں الگ الگ کا مطالعہ کرتی ہیں؟“ میما جہاں نے پوچھا تو اُس سے پہلے میمونہ جہاں بول پڑیں۔  
 ”اب مطالعہ نہیں کریں دھمکی دیتی ہیں کہ چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔“  
 ”بڑے بھائی غلطی کر رہے ہیں۔“ اُس سے پہلے کہ دونوں بھادھیں تیسری کے خلاف بولیں اُس نے سارا زام بڑے بھائی کے سر پر رکھ دیا۔

”بیلہ جہاں کا مطالعہ ناجائز نہیں ہے۔ بڑے بھائی کا مذاں ناجائز ہے۔ جب وہ انور ڈر سکتے ہیں تو پھر میں نہیں انہیں الگ گھر میں رکھتے۔ جیکہ اماں جی اور ابائی بھی اجازت دے رہے ہیں۔“  
 ”لو، تم بھانجے کے مقابلے میں جہاں کو غلط کہہ رہی ہو، میمونہ جہاں تعجب سے بولیں۔  
 ”میں حق بات کر رہی ہوں، خیر چھوڑیں۔ یہ ان کا معاملہ ہے، وہی جائیں یا اُس نے اس موضوع کو ختم کر دینا

شاہ پور سے کراچی اور وہاں سے بااں اسلام آباد تک کے سفر میں اُس نے آسیہ سے متعلق کوئی بات نہیں کی، کیونکہ پہلے ہی اُسے بے مری اور جلد بازی کا مظاہرہ کرنے کے بعد خالٹ کا سامنا کرنا پڑا تھا۔  
 لیے خاصا محتاط ہو گیا تھا۔ پھر رات میں شاہ جہاں گہرے آواز سے خود ہی بات چیت کر رہی۔  
 ”ہاں، اب تادو کیا سوچا ہے تم نے؟“ اور وہ مایوسی سے سر ہل کر کہنے لگا۔  
 ”مجھے ایسا کوئی راستہ نہیں آ جا جو مجھے بیک وقت دونوں مقام پر موجود کر سکے۔ بابا جہاں کے پر نہیں مایں گے اور میں آسیہ کو نہیں چھوڑ سکتا۔ بے شک بابا جہاں مجھ پر اپنے گھر کے دروازے دینے میں۔“  
 ”ایک منٹ۔“ شاہ جہاں گہرے آواز سے کہا تھا کہ تمہارے پیش نظر صرف ذات نہیں ہونی چاہیے۔ کیا نہیں شہر بانو سے ذرا محبت نہیں یا اپنی محبت میں اتنے خود غرض ہو کر شہر بانو کے لیے کئی نہیں ہے۔ جہاں جہاں؟“ وہ چڑچڑا کر آخر یہ کیوں سمجھ لیا جاتا ہے کہ اُسے شہر محبت نہیں یا اُس کا خیال نہیں اور اُس کے برعکس شاہ جہاں گہرے آواز سے بھڑکا ہوا تھا۔  
 ”میں تو تمہارا والد کو بھی نہیں ہے سکندر۔“

”بھڑ؟“  
 ”بھڑ؟“ یہ کیوں بھول رہے ہو کہ ہم شاہ (سید) ہیں۔ اور شاہوں کی بیٹیاں غیر خاندان میں نہیں بیا اپنے خاندان میں اور کون ہے جس کے ساتھ ہم شہر بانو کا رشتہ جوڑیں۔ اُس کے جوڑ کا نہیں تو کوئی ہے؟  
 بتاؤ جیسے نور بانو کے ساتھ ہوا۔ کیا کئی بھی اُس میں، لولی لولی بھی جو جہاں بچوں کے باپ سے بیا ہی تھی۔

ہی مناسب سمجھا پھر ادھر ادھر دیکھ کر بول: "بچوں کی آواز نہیں آرہی لگتا ہے سو گئے۔" ہاں اور اب میں بھی سونا چاہیے، ورنہ صبح اٹھ نہیں سکتی، یہاں والی لڑک پر نظر ڈالتے ہوئے ہوں تو اس نے ان کی تقلید کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں کہاں سوئی گئی؟"  
"ادھر تھیمہ اور اشعر کے کمرے میں چلی جاؤ ان دونوں کو ایک میڈ برکرو اور نیل تھامے ساتھ ہاں، وہ اکثر میرے پاس سوتا ہے۔" وہ کہتے ہوئے تھیمہ کے کمرے میں آئی تو ایک میڈ برنبر اشعر سو رہے تھے، دوسرے پریمریکل تھی وہ اسی کے پاس لیٹ گئی۔ اس وقت سے باتوں میں چلا تھا۔ اب لیٹتے ہی لمبے سفر کی تکان محسوس ہو رہی تھی۔ بدن میں ہلکے ہلکے درد کے باعث نیند بھی تھی۔ کچھ دیر بے چینی سے کروٹیں بدلتے کے بعد اس نے خود کو دھکا چھڑا کر لیکس موندلیں۔ تو دھار کی طرف منتقلی ہو گیا جہاں ان کے چلے آنے کے بعد خاموشی چھا گئی ہوئی۔ اور کپڑا اس خاموشی میں نہ سنا دینے لگیں، جن کی وہ شدت سے منتظر تھی۔ جیسا کہ آخری ملاقات میں شاہ سکندر نے کہا، سکتا ہے اس بار میں آؤں تو میرے ساتھ بی بی جان اور بابا جان بھی ہوں۔ اور اس کی بات یاد آنے نیند پر سوچنے لگی، کہ شاید وہ اپنے گھروالوں کو ہمارا کرنے میں لگا ہوگا۔ جیسی نہیں آیا۔ ادا تانہ گھروالے مائیں گے بھی یا نہیں، پھر ہر دو صورتوں میں وہ اماں بی اور بابا کی کارروائی سوچنے لگی، گو اور عدیل بھائی اس کی بہت تعریف کرتے تھے، وہ آتا تو اس کی بہت عزت کرتے اور اس کے بعد کتنی دیر تک اس کی باتیں کرتے تھے، پھر بھی اسے خدشہ ہوا کہ اگر شاہ سکندر اپنے گھروالوں میں ناکام رہا تو شاید ان کی بھی باتیں مائیں گے۔ لیکن اگر بابا بی اور عدیل بھائی کو بھی یہ معلوم ہو جائے کہ سکندر کی ہوں تو اب اس مقام سے آگے نیند نے اسے سوچنے کی مہلت نہیں دی تھی۔ صبح وہ بہت دیر سے اٹھی۔ اس وقت تک سب ناشتے سے فارغ ہو چکے تھے سیا بھائی کے باوجود اس نے اپنے لیے خود ہی ناشتا بنایا۔ دوسلاٹس گرم کیے، ایک انڈا اڑا لیا اور چائے لے بھاجوں کے پاس لاؤنج میں آ بیٹھی۔ وہ دونوں جانے کس موضوع پر بات کر رہی تھیں۔ اس نے ناہمک ان کی طرف دھیان نہیں دیا۔ نہ ہی ان دونوں نے اسے مخاطب کیا۔ جب وہ خالی برتن پین آئی تب سیا بھائی اسے دیکھ کر کہنے لگیں۔

"گو کہ تم یہاں نہ مان نہیں ہو، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آتے ہی کام میں لگ جاؤ۔"  
"اور میں یہاں پلنگ توڑنے بھی نہیں آئی۔ خیر چھوڑیں۔ یہ بتائیں پیچھے کہاں ہیں؟"

"ادھر براآمدے میں کھیل رہے ہیں!"  
"اسی خاموشی سے کیسے کھیل رہے ہیں؟" وہ تعجب سے کہتی وہیں سے پلٹ کر براآمدے میں آئی بچے دارنے کی شکل میں بیٹھے بڑے انہماک سے سیدھی سہرے بالوں والی گڑیا کو دیکھ رہے تھے اور بارے میں بتا کر اپنے طور پر انہیں حیران کر رہی تھی۔

"دیکھو، یہ روٹی بھی ہے یا سیمتہ نے گڑیا کے منہ سے چوٹی نکالی تو گڑیا دوست لگی جس پر بوجھ چہرے حیرت و خوشی سے چلنے لگے۔"  
"اب اسے چپ کرلو،" سونیال نے کہا تو سیمہ نے گڑیا کے منہ میں دوبارہ چوٹی لگا دی۔ گڑیا گئی تو نیل پوچھنے لگا۔

"یہ ہنستی بھی ہے؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"پتا نہیں۔ بس روتی ہے۔" سیمہ نے لاعلمی کا اظہار انہوں کے ساتھ کیا۔  
"متھاری طرح اور سونیا کی طرح۔" نیل نے کہا تو سونیا تڑخ کر بولی۔

"میں کب روتی ہوں؟"  
"جب میں تمہارے بال نوچتا ہوں؟" امر نے کہتے ہوئے سونیا کے بال پکڑ کر کھینچ لیے جس سے وہ دائی نے غمی تو وہ جو خاموشی سے اپنی موجودگی کا احساس دلانے بغیر ان کی باتیں سن رہی تھی۔ فوراً آگے بڑھ آئی سونیا کو گود میں اٹھا کر اس کی جگہ پر بیٹھتے ہوئے امر کو ڈانٹنے لگی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے، تم نے اس کے بال کیوں نوچے؟"

"ذود سے تھوڑی توچے ہیں، پوچھ لیں اس سے!"  
"اس سے کیا پوچھوں، میں خود دیکھ رہی تھی۔ بہت بڑی بات ہے۔ آئندہ خبردار اسے ہاتھ نہیں لگانا۔" سونیا کو چپ کرانے کے ساتھ امر کو تھیمہ کی، تو وہ تیسر ہو کر بولا۔

"یہ جھوٹ کیوں بولتی ہے؟"

"کیا جھوٹ بولا ہے اس نے؟" امر کے تیز بولنے پر اس کی پیشانی پر پرل پڑ گئے۔  
"کتنی ہے میں کب روتی ہوں اور اب دور رہی ہے۔" امر نے سونیا کا جھوٹ بتایا تو وہ سر دھک کر بولی۔  
"ہو تو ف ہو تم۔" پھر سب کو اٹھا کر اندر لے آئی۔ دونوں بھابیوں سہمی، گشت پر رات کر رہی تھیں۔ فی کھانے میں کیا پکنا چاہیے اور یہ بڑا میٹر حائل تھا۔ جیسی وہ ان سے کترا کر ادھر سے اخبار اکٹھا کرنے میں لگ گئی۔

دوہر میں کھانے کے بعد سیا بھائی نے سب بچوں کو سلاوا۔ میونہ بھابی بھی عمر کو بغل میں دبائے آرام سے لیٹیں۔ اندر اس نے پورا گھر جان مارا، کوئی ایک کتاب نہیں ملی، جسے پڑھنے میں وہ وقت گزارتی، محنت بھر رہی تھی۔ اس وقت تو وہی بھی لیس شام میں چلتا تھا۔ یعنی صبح کی نشریات کا آغاز نہیں ہوا تھا نہ ہی دی سی آر ام تھا۔ بلکہ محنت پابندی تھی۔ اس لیے مطالعے کی طرف رجحان زیادہ تھا۔ متوسط گھرانوں کی لڑکیاں ایسے نزاعت لے دون میں ناولز پڑھتیں۔ ان دنوں رضیہ بٹ اور ملکی کنول کے ناولوں کا بڑا چرچا تھا۔ اس نے سیا بھابی سے پچھا تو وہ مسکین سی شکل بنا کر بولیں۔

"کہاں اب بچوں میں کہاں فرصت ملتی ہے پڑھنے کی؟"

"مجھے نہیں پتا، آپ اس وقت مجھے کہیں سے منگو کر دیں؟" وہ بچوں کی طرح ضد کرتے ہوئے بولی۔  
"بہت بڑ ہو رہی ہوں اور اگر یہی عالم رہا تو دونوں میں واپس چلی جاؤں گی۔"  
"اڑے رسے۔ یعنی بلیک میلنگ۔" سیا بھابی ہنسیں پھر معانجہ یاد آنے پر کہنے لگیں۔ "اچھا ٹھہرا بھی پلے ہیں مجھے درزی سے اپنے کپڑے لینے میں تم کو میگزین وغیرہ لے لینا۔"

"چلیں۔" وہ فوراً تیار ہو گئی پھر اپنے حلیے پر نظر ڈال کر پوچھا۔ "دور تو نہیں جانا؟"

"نہیں بیدل کا راستہ ہے۔ جاؤ میونہ سے کہو سوئے نہیں ہم ابھی آتے ہیں۔" سیا بھابی کہتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئیں تو اس نے میونہ بھابی کے پاس جا کر لیس کپڑے کھڑے انہیں بتایا پھر اپنا پرس اٹھا کر واپس آئی تو سیا بھابی اپنے پرس میں جانے کی تلاش کرتی ہوئی آ رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ کچھ بول رہی تھیں۔

"کیا ہوا؟" ان کے قریب آنے پر اس نے پوچھ لیا۔

"میرے کپڑوں کی رسید اسی میں کبھی تھی، مل گئی یا انہوں نے رسید ہاتھ میں لے کر ہارس بند کیا پھر اُسے بھڑک کر لیں۔" جگڑو۔

"گھر کے قریب ہی ماکٹ تھی۔ گو کہ زیادہ بڑی نہیں تھی پھر بھی ضرورت کی ہر شے موجود تھی۔ اور کونو کم قاعدہ شاپنگ کا پروگرام نہیں تھا۔ اس لیے جو پہلی کتابوں کی دکان نظر آئی وہ اسی میں داخل ہوئے لگی کہ بھائی روک کر بولیں۔

"سو، وہ اس رو میں جو بھتی دکان ہے۔ میں دہان ہوں۔ تم اطمینان سے رسالے و سلاے دیکھ کر وہاں جیسے چاہیں!"

”اچھا، یہاں کیا کر رہے ہیں؟“ سیما بھائی نے براہ راست شاہ سکندر سے پوچھا۔  
 ”یہاں میں ایک کام کے سلسلے میں آیا ہوں۔ میرا قیام ہوٹل میں ہے اگر آپ آنا چاہیں تو۔۔۔“  
 ”خیر، اسیا بھائی درمیان میں لوگ کر پھراس سے بولیں۔“

جلد اسیس: یا ابھی کچھ اور لینا ہے؟  
 ”نہیں اور تو کچھ نہیں لینا۔“ اُس نے یوں کہا جیسے اُسے کچھ نہ لینے کا انوس ہو رہا ہو۔  
 ”جلد پھر ادکے سکندر صاحب:“ سیما بھائی نے ایک طرح سے اُسے خدا حافظ کہہ دیا۔ جبکہ وہ اندر ہی  
 اندر خاصی جزبہ ہو رہی تھی۔ بسست روی سے اُس کے قریب سے گزرنے لگی تو وہ دھیرے سے بولا۔

”سہی اسی جگہ:“ وہ اُس کی طرف دیکھ نہیں سکی۔ لیکن نفی میں سر ہلا کر معذوری کا اظہار کرتے ہوئے قدموں  
 کی رفتار تیز کر دی۔ اور جب تک سوڈ نہیں آیا تو وہ اُس کی نظروں کی گرفت سے نکل نہیں سکی۔ اس دوران  
 سیما بھائی جانے لگا یوں کہ وہ ابھی اُس نے سنا ہی نہیں۔

”کہاں کوئی ہو؟“ میری بات کا جواب تو وہ سیما بھائی نے اُس کے بازو میں چٹکی کاٹ کر کہا تب وہ  
 اپنے دھیان سے نکل کر شیطانی گئی۔  
 ”کیا۔ کیا پوچھ رہی ہیں آپ؟“  
 ”میں ان صاحب کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔ میں توجہ کراچی میں تھی۔ اسے کبھی گھر آتے جاتے نہیں  
 دیکھا۔“

”تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟“ وہ اپنا بازو سہلائی ہوئی بولی۔  
 ”اچھا غلط بیانی کر کے کہتی ہو میرا کیا مقصود ہے؟“  
 ”میں نے کوئی غلط بیانی نہیں کی۔ بیوی نہ بھائی سے پوچھ لیجئے گا۔“ وہ اُن کی گھورتی نظروں کے جواب میں  
 ہنسی ہوئی بولی اور سامنے ٹھہر کر بھاک کر گھٹ سے اندر داخل ہو گئی۔  
 اچانک پہلی محبت کا نشہ سارے احساسات پر چھا گیا تھا۔ وہ کچھ نہ کہتی تب بھی اُس کا انگ انگ  
 بول رہا تھا۔ اور اس مقام پر اس کا دل چاہا کوئی ہو جسے وہ اپنی زندگی کے اس خوبصورت راز میں شریک  
 کر سکے۔ اور یہ دونوں بھادیں ہی اُس سے بہت محبت کرنے والی اُس کی بہترین دوست تھیں۔

شاہ جہانگیر بچوں کو مری سے لے کر آئے تو جیسا کہ اُس کے ساتھ ملے کر کے گئے تھے، سیدھا ایر ہوٹل  
 پہنچ گئے۔ جہاں وہ لکٹیں لیے اُن کا منتظر تھا۔ سب بچوں کو باری باری پیار کرنے کے بعد وہ لکٹیں شاہ جہانگیر  
 کو تھاتا ہوا بولا۔

”ملائٹ جانے میں بس ادھا گھنٹہ ہے۔ آپ لاؤنج میں چلے جائیں۔“  
 ”تم کہاں جا رہے ہو؟“ شاہ جہانگیر نے اُس کے ہاتھ سے ٹکٹ لیتے ہوئے سرسری انداز میں پوچھا۔  
 ”کبیں نہیں، میرا مطلب ہے میں ابھی آپ کے ساتھ نہیں جا رہا۔“ اُس نے کہا تو شاہ جہانگیر ٹھٹھک کر بولے۔  
 ”کیوں؟“

”کوئی خاص بات نہیں ہے بھائی، بس میں کچھ دن تنہا رہنا چاہتا ہوں۔“ شاہ جہانگیر نے بغور اُسے  
 دیکھا پھر کہنے لگے۔

”دوچیز جتنا سوچو گے، اُٹھتے جاؤ گے؟“  
 ”سے نکر رہیں۔ میں خواہ کتنا سوچوں، کتنا اچھوں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔ بلکہ آپ پر بھروسہ کر کے میں  
 ایک طرح سے آپ کی بات مان چکا ہوں۔ اب آپ پھر بھروسہ کریں۔“

”اچھی بات ہے؟“ شاہ جہانگیر نے اُس کا کندھا تھپکا پھر پوچھنے لگے۔ ”کتنے دن رہو گے یہاں؟“  
 ”کچھ کہہ نہیں سکتا۔ دو دن، چار دن یا۔۔۔“  
 ”بس چار دن سے زیادہ نہیں۔ ٹھیک یا بچوں دن میں اپنے گھر پہنچا جائیے؟“ شاہ جہانگیر نے ٹوک

”نہیں، میں میرے پاس:“  
 ”اچھا، میں اپنے پڑپڑے لے کر آتی ہوں۔“ سیما بھائی آگے بڑھ گئیں تو اُس نے رک کر انہیں روک دیا  
 دکان میں داخل ہوتے دیکھا پھر قدم آگے بڑھنے، اور شیشے کے رک کے پاس رک کر اُس میں ترتیب  
 رکھی کتا ہیں دیکھنے لگی۔ حالانکہ چند نام سوچ کر آئی تھی۔ لیکن اب انتخاب کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ پھر جب  
 نے دیکھا سلیز بین کی نظر میں اُسی پر مبنی تھی تب جلدی سے ایک دو کتا بوں کے نام بتا کر دوسری طرف  
 گئی۔ اور ابھی نیچے کا مچھر تلاش کر رہی تھی کہ اُس آواز سماعتوں سے یوں ٹکرائی کہ وہ بے اختیار پلٹ کر  
 لگی، شاہ سکندر کا کوئی پرکھٹے شخص سے مخاطب تھا۔  
 ”ایکسکوز می، فون کر سکتا ہوں؟“ اور وہ جس طرح بے اختیار پلٹی تھی اُسی بے اختیاری سے اُس  
 قریب آکر بولی۔

”سیلو۔“ شاہ سکندر نے چونک کر دیکھا پھر خوشگوار حیرت میں گھر کر بولا۔  
 ”ا۔ س۔ م۔ م۔ تم یہاں کیسے؟“  
 ”کچھ کتا بین میں ہیں، اُس نے قصداً اُس کے سوال کو دوسرے معنی میں کر جواب دیا۔  
 ”نہیں میرا مطلب ہے یہاں اسلام آباد میں:“ اُس نے وضاحت کی تو ایک نظر گلاس ڈور سے باہر  
 بولی۔

”بھائی کے پاس آئی ہوں؟“  
 ”کون عدیل صاحب؟“  
 ”نہیں، وہ تو وہیں کراچی میں ہو رہے ہیں۔ اُن سے بڑے شکیل بھائی، ابھی کچھ عرصہ قبل یہاں سیٹل  
 ہیں۔ اور آپ؟“ آخر میں اس نے اُس کی یہاں موجودگی کا سبب پوچھا تو وہ ذرا سے کندھے اچکا کر بولا۔  
 ”میں اپنے بھائی کے ساتھ آیا ہوں۔ شاید میں نے نہیں بتایا تھا کہ میرے بھتیجے جیتجیاں مری کا لونا  
 پڑھتے ہیں۔ اب چلیاں ہوئی ہیں تو ہم انہیں لینے آئے ہیں۔“  
 ”لیکن آپ تو یہاں موجود ہیں۔“ اُس نے کہا تو وہ اُسے نظروں کی گرفت میں لیتا ہوا بولا۔  
 ”تیار دے لینے۔“

”اچھا:“ وہ ذرا سہمی: ”آپ کو کیسے معلوم کر میں یہاں ہوں؟“  
 ”معلوم تو نہیں تھا لیکن محسوس ہو رہا تھا کہ تم ہمیں اُس پاس کہیں موجود ہو:“ وہ اطراف سے بیگانہ  
 تھا تب اُس نے ذرا سا کھانسن کر احساس دلایا پھر کہنے لگی۔  
 ”آپ شاید فون کرنا چاہتے تھے؟“

”اب نہیں کرنا، اللہ تم اپنی کتابیں لے لو:“ اُس نے کہا تو وہ پلٹ کر سلیز بین کو دیکھنے لگی۔ وہ نہ  
 تھا۔ فون کتا بوں کا بیگٹ اُس کی طرف بڑھا دیا۔ جسے لے کر وہ پرس میں سے پیسے نکالنے لگی۔ لیکن اُس  
 پہلے ہی شاہ سکندر نے بے منٹ کر دی۔ وہ اس دیکھتی رہ گئی۔ پھر اُس کے ساتھ دکان سے نکلتے ہوئے  
 اُسے یاد نہیں رہا کہ اُس کے ساتھ سیما بھائی بھی ہیں اور اُسے ایک ابھی کے ساتھ دیکھ کر جانے دا  
 ”چلو کسی اچھی پیرسکون جگہ بیٹھتے ہیں:“ شاہ سکندر نے کہا تب اچانک اُسے سیما بھائی کا خیال آیا اد  
 وقت وہ آگئیں۔ اپنی دھن میں تھیں۔ شاہ سکندر کو اگر دیکھا بھی تو یہ خیال نہیں آیا کہ وہ اُس کے سا  
 ہے۔ اپنے انداز میں اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھنے لگیں۔

”مل گئے تھیں نا دلرز؟“ اور وہ سیما بھائی کو دیکھتے ہی شش و پنج میں گرفتار ہو گئی تھی کہ اُن کا لہ  
 کر اُسے باخا موٹی سے چل پڑے۔ جہی اُن کی بات کا جواب نہیں دے سکی۔ اور اس سے پہلے کہ وہ ٹوٹنے  
 نے اُن کی توجہ کھینچی۔

”آداب:“ سیما بھائی نے چونک کر شاہ سکندر کو دیکھا پھر کپکپ سے اُس کا کندھا دبا یا تو وہ سنبھل  
 ”بھائی! یہ شاہ سکندر حیات ہیں۔ عدیل بھائی کے درست، وہاں گھر میں ان کا آنا جانا رہتا۔“



کر کہا تو کچھ دیر سوچنے کے بعد اُس نے اثبات میں سر ہلادیا۔ پھر جب شاہ جہانگیر نے ان کو ملے کر لاؤنج میں چلے گئے تب خاصاً ملاحظہ کیا سوچ کر وہ بول چلا آیا۔

اُس کا خیال تھا ان چار دنوں میں وہ آسمیہ سے مل کر اُس کے جہانگیر کی رمان حاصل کرے گا۔ اس کا مقصد سب پر چھا جاتا تھا۔ گو کہ اُس کے لیے اُسے کسی تردد کی ضرورت نہیں تھی۔ اُس کی شخصیت بھی ہی اتنی متاثر کن نہ تھی۔ ملاقات میں ہی مقابل پر گرا اُس نے ذاتی تھی۔ جیسے آجانی اور عدل جہانی اُس کے گرد ویدہ تھے۔ اسی طرح وہ چاہتا تھا یہاں جو آسمیہ کے جہانگیر، بھالو جہانگیر ہی اُن پر بھی وہ اپنا اثر چھوڑ جائے تاکہ بعد میں جب وہ آسمیہ سے شاہ کی بات کرے تو اس طرف سے سب اُس پر اعتماد کریں۔ ورنہ اگر کسی ایک نے بھی بی بی جان اور بابا جان کے شرکت نہ کرنے پر اعتراض کیا یا یہ شرط رکھ دی کہ اُس کے والدین ہی اگر بات کریں تو اس کے لیے بہت مشکل ہو جائے گی۔

اور وہ اپنے گھر میں تو مشکل میں اور پریشان تھا ہی اس طرف سے کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور آسمیہ سے یہاں ملاقات کو وہ جو ایک خوبصورت اتفاق سمجھ رہا تھا تو اب اس اتفاق کو بھی اپنے منہ میں سوچنے لگا تھا۔ لیکن اپنی سوچوں کے برعکس اُسے شدید کوفت اور پریشان کا سامنا کرنا پڑا۔ یعنی اگلے تین دن وہ گھنٹوں کے حساب سے اسی بک شاپ کے آس پاس موجود رہا اور وہ نہیں آئی۔ گو کہ اُس آنے کا وعدہ تو کیا ہاں بھی نہیں جھری تھی پھر بھی اُسے یقین تھا اور اُس کا یقین ابھی ٹوٹا نہیں تھا نہ ہی وہ مایوس ہوا۔ اور اس آخری دن پھر اسی جگہ جا بیٹھا۔

جب سی بے قرار رہی تھی۔ اور اسی لیے قاری میں وہ قار دھونڈ رہا تھا تب اُس پر نظر پڑی۔ نسیل کہا تھا اُسے اسی طرف آ رہی تھی۔ وہ مزید صبر نہیں کر سکا۔ تین قدموں سے لمحوں میں درمیان کا فاصلہ میٹ کر اُس کے سامنے اُٹھ کر آگیا تو گزشتہ تین دنوں کی ساری کوفت بھلا کر بولا۔

”مجھے یقین تھا اُسے ضرور آؤ گی۔ اور وہ جو اُس کے اچانک سامنے آنے پر حیران تھی۔ نسیل کی موجودگی میرے اُس کے دلہانہ انداز پر پریشان ہوئی۔ اور کچھ گھبرا کر نسیل کو دیکھا تو وہ کہنے لگا۔

”پھر پھر یہ وہ واٹے انکل ہیں ناں جو آج آئی ہیں اُس کے پاس آئے ہیں۔“

”ہاں بیٹا! آپ نے انہیں سلام نہیں کیا؟ آسمیہ نے اُسے محتاط رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے نہیں کہا۔

”السلام علیکم، نسیل نے فوراً سلام کیا۔

”وسلام، کیسے ہو بیٹا! سراسر رسمی انداز تھا۔ پھر اُسے دیکھ کر بولا۔ ”چلو کہیں بیٹھ کر بات کریں گے؟“

”نہیں سکندر۔ میں۔“

”پلیز!، وہ فوراً ٹوک کر کہنے لگا۔ ”میں بس آج کا دن یہاں ہوں کل صبح کی فلائیٹ سے واپس جا رہا۔ اور یہ اتنے دن میں صرف تمہارے لیے یہاں رہا۔ روزانہ یہاں آکر تمہاری راہ دیکھتا رہا ہوں اور تمہیں یہاں کیا کروں؟“ وہ اُس کے خفا ہوئے پر بے بسی سے بولی۔

”میرے ساتھ چلو۔“

”نہیں شاہ سکندر! میں اس وقت بہت جلدی میں ہوں، میرا بیچاریہ فیصلوں سے گر گیا ہے۔ اُس لیے بیٹریج اور میڈیسن لینی ہے۔ اُس کی مجبوری سن کر وہ کبھی سانس کھینچتا ہوا بولا۔

”اُس کا مطلب ہے اب تم سے کراچی میں ملاقات ہوگی؟ اُس نے ذرا سا اثبات میں سر ہلایا پھر بولی۔

”آپ خفا تو نہیں ہیں؟ وہ خاموشی سے اُسے دیکھنے لگا اور جب اُس نے ذرا سی پلکیں اٹھا کر تب اُس کے ہونٹوں پر آپ ہی آپ مسکراہٹ پھیل گئی۔

”شکریہ! وہ منونیت سے کہیں آگے بڑھنے لگی۔ کہ وہ راستہ روک کر پوچھنے لگا۔

”یہاں کتنے دن ہو؟“

زیادہ سے زیادہ پندرہ دن۔ اگر اس سے پہلے کراچی سے بلاوا آگیا تو پھر ظاہر ہے پہلے حل جاون گی؟

”جھیک ہے پھر میں اسی حساب سے آؤں گا۔“ اُس نے کہا تو وہ بے اختیار پوچھ گئی۔

”کیسے؟“

”نہیں بارات کے ساتھ؟“ وہ قدرے شوخ ہو کر بولا تو وہ جھینپ کر آگے بڑھ گئی۔ شاہ سکندر نے اُسے ایک فزیکل اسٹوریس داخل ہوتے دیکھا پھر اُس کی واپس کا انتظار کرنے کے بجائے قریب سے ذرا قریبی رنگ کر اُس میں بیٹھ گیا۔

اگلے روز جب وہ پہلی فلائیٹ سے کراچی پہنچا تو ڈراپور گاڑی لیے موجود تھا۔ وہ سمجھ گیا اُسے۔ شاہ جہانگیر نے پہنچا ہوگا۔ اور اُن کا خدشہ سوچ کر وہ اپنے آپ مسکرایا تھا۔ پھر ڈرائیور نے اُس سے پوچھ کر گاڑی شاہ جہانگیر کے راستے پر پوری اسپید سے دوڑانی شروع کر دی۔

اور تین گھنٹوں کے اس سفر میں وہ پوری یکسوئی سے شاہ جہانگیر کی ایک ایک بات کو سوچتا رہا۔ اور اُن کے سامنے تو وہ اُن کی کسی ایک بات سے بھی اختلاف نہیں کر سکا تھا اور اب ہر بات عجیب سی لگ رہی تھی۔ آخر میں اُس نے سوچا وہ سب سے پہلے شاہ جہانگیر سے بات کرے گا۔ اُن سے

جے گا کہ وہ کبھی کبھار تیلی نہیں بن سکتا۔ بہتر یہ ہے کہ اُس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ اُس کے بعد ایک آخری کوشش کے طور پر وہ خود بابا جان سے بات کرے گا۔ اگر وہ آسمیہ کے ساتھ اُس کی شادی

رہے پر رضامند ہو گئے تو ٹھیک ورنہ!

گاڑی رکنے سے اُس کی سوچیں بھی اسی مقام پر ٹھہر گئیں۔ ڈرائیور نے فوراً اُس کی طرف کا

دروازہ کھولا تو گاڑی سے اترتے ہی اُسے غیر معمولی جیل پیل کا احساس ہوا۔ اپنے طور پر قیاس کرتا ہوا

وہ اندر آیا تو اُسے دیکھتے ہی بی بی جان کے پاس پہنچی روکیوں میں جیل بیٹھ گئی۔ وہ قصداً نظر انداز کرتا ہوا

بی بی جان کی طرف بڑھا۔ اور ابھی سلام اُس کے ہونٹوں میں تھا کہ بی بی جان خوش ہو کر بولیں۔

”ماشاء اللہ بڑی عمر ہے تمہاری۔ ابھی سب تیار ہو چھ رہی تھیں۔ تھکے ہوئے لگ رہے ہو، جادو

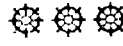
جلدی سے غسل لے لو پھر میں کھانا تمہارے کمرے میں بھجواتی ہوں۔“ وہ اس پر حیران ہوتا اپنے کمرے

میں جانے لگا کہ بی بی جان کی آواز نے اُس کے قدم روک لیے۔ وہ روکیوں سے گھبرا کر بولی۔

”اب تو کچھ لیا دو لہو کو۔ جادو اب ڈھونگ بنھنا لو، اور کوئی جیراں سے کھو بڑے شاہ بی کو خبر کرے

ناہ سکندر۔ کیا ہے؟“

خوشی سے بھرپور بی بی جان کی کھنکھاتی ہوئی آواز نے اُسے چکرا دیا تھا۔



فوری طور پر اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ بی بی جان اُس کے بارے میں کیا کہہ رہی ہیں۔ بے حد متوش

ظنوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔

کھلاکتی لڑکیاں۔ ڈھونگ اور۔ اور۔ اُس کے ذہن کو تھکا سا لگا۔ تب ہی عتب سے شاہ جہانگیر

نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور خوش دلی سے بولے۔

”اگے یار! گاڑی پہنچ گئی تھی ایر پورٹ؟“

”ہی۔“ وہ جو خاموش نظروں سے انہیں دیکھنے لگا تھا۔ ان کی بات کے جواب میں جی کہہ کر فوراً

دستِ بھر اشارہ کر کے پوچھنے لگا۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے جہانگیر؟“

”شادی! شاہ جہانگیر مختصر جواب دے کر غائب اُس کے اگلے سوال سے بچنے کی خاطر سامنے سے گزرتی

جیسا کہ کیا بات کرنے کے لیے وہ صبر نہیں کر سکا۔ اُن کا بازو کھینچ کر پوچھنے لگا۔  
 ”کس کی شادی؟“ شاہ جہانگیر نے پہلے جیسا کہ اشارہ کیا پھر اُسے دیکھ کر بولے۔  
 ”شہر بانو کی پہلے اُس سے مل لو۔ پھر شام تک تو گھر کے مردوں سے بھی اُس کا پردہ ہوجائے گا۔“  
 ”کیوں؟“

”جتنا نہیں یاد! یہ رمیں وہیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔“  
 شاہ جہانگیر خود کو خاصا انجان ظاہر کرتے ہوئے اُس کے بازو میں بازو ڈال کر سیڑھیاں چڑھ  
 لگے۔ پھر شہر بانو کے کمرے کے سامنے رُک کر پہلے اُسے اندر جانے کا اشارہ کیا تو اُس نے دستک  
 لیے باغیچہ بڑھایا لیکن پھر چانک کسی خیال کے تحت رُک کر بولا۔  
 ”آپ مجھ سے کچھ پتہ چلے ہیں۔ ابھی بی بی جان تو روکیوں سے بچو اور کہہ رہی تھیں۔“  
 ”بی بی جان جو کہہ رہی تھیں، وہ بھی ٹھیک ہے۔“ شاہ جہانگیر ایک دم سنجیدہ ہوئے ”شادی مرد  
 شہر بانو کی نہیں ٹھہاری بھی ہو رہی ہے۔ اور تم اس وقت کوئی اعتراض نہیں اٹھاؤ گے کیونکہ تم  
 سے وعدہ کر چکے ہو۔“  
 ”وعدہ میں نے خاموش رہنے کا کیا تھا۔ شادی کا نہیں۔“ اُس نے تلملہ کر احتجاج کیا اور شاہ جہانگیر بڑے  
 آرام سے بولے۔

”تو خاموش رہو۔“  
 ”کیا مطلب ہے آپ کا؟“  
 صبر کرنے کے لیے بھی وہ جیج پڑا تو شاہ جہانگیر نے انگوٹھے سے دروازے کی طرف اشارہ کر کے اُن  
 بہن کی موجودگی کا احساس دلایا پھر ایک دم اُس کا ہاتھ پکڑ کر دروازہ دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہو  
 سامنے بیڈ پر شہر بانو گھٹنوں کے گرد بازو پیلے پشانی گھٹنوں پر لٹکائے بیٹھی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آ  
 پر بھی اُس نے سر اٹھا نہیں کیا۔ جس سے ظاہر تھا کہ وہ ان کی باتیں نہیں تو اُڑ سُن چکی ہے۔  
 ”شہر بانو!“ شاہ جہانگیر نے پکارا تب اُس نے فدا سا سر اٹھا لیا لیکن ان دونوں کی طرف دیکھا  
 اور اس وقت شاہ سکندر کو اُس کا زور دیکھنا ہی غنیمت لگا۔ فوراً پلٹ کر جانے لگا کہ شاہ جہانگیر نے  
 کا بازو تمام لیا اور بہن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔  
 ”جب تک شہر بانو اس گھر سے رخصت نہیں ہو جاتی۔ نہیں خاموش رہنا ہے۔ یہی وعدہ لیا تھا نا  
 نے تم سے۔“ اُس نے بے حد خاموش نظروں سے انہیں دیکھا تو کہنے لگے۔  
 ”اب یہ تمہاری قسمت کہ اس کی رخصتی سے پہلے اس گھر میں مہر النساء کی ڈولی اُترنا طے پانی ہے۔“  
 ذہن ماؤن ہوئے لگا۔

”مجھے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہنا۔ جہیں کچھ کہنا ہو تو شہر بانو سے کہو۔ یہ سن سکتی ہے البتہ بو  
 حق اسے نہیں دیا گیا۔“  
 شاہ جہانگیر اسے سناتے میں جھوڑ کر کمرے سے نکل گئے تو کتنی دیر بعد اُس نے دھیرے دھیرے  
 گردن موڑ کر شہر بانو کو دیکھا۔ اُس نے دوبارہ پشانی گھٹنوں پر رکھ لی تھی۔ اُس کے وجود میں کوئی  
 نہیں تھی۔ پھر بھی اُس کا رونا محسوس کر کے وہ اُس کے پاس چلا آیا اور اہستہ سے اُس کے سر پر ہا  
 کر بولا۔

”رو نہ نہیں شہر بانو! میں جہانگیر بھائی سے کیا وعدہ نہیں توڑوں گا۔ پھر فوراً اُس کے کمرے  
 نکل آیا۔“  
 پھر شام اُترتے ہی حرمِ ملی کی رونق اور چہل پہل میں اضافہ ہو گیا تھا اور وہ اپنے کمرے کی کھڑک  
 بنظر لان میں جھکے رہتے لیکن فتنوں کو دیکھ رہا تھا لیکن اس کا ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا  
 سب کچھ اُٹا نانا ہو گیا یعنی اُسے اپنے محاذ پر لڑنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ کتنا بھرپور تھا اسے

آپ سر کر یہاں اپنی بات منوانے میں ناکام ہو گیا تو سب جھوڑ کر چلا جائے گا اور اس کے لیے وہ  
 نہ صرف خود جانتا بلکہ اسے کو بھی آگاہ کر دیتا تھا۔ سید کا خیال آتے ہی وہ یوں مضطرب ہوا کہ اُس کی نظروں  
 یہاں مڑاں اُسے تلاش کرنے لگی تھیں یہی زوردار آواز کے ساتھ دروازہ کھلا اور اُس کے کمرے پر چلتے  
 ہوئے اندر آ گئے۔

”یا ارم بھی لڑکیوں کی طرح مایوس بیٹھے ہو۔ چلو باز نکلو۔“  
 ابراہیم آتے ہی اس کا بازو پکڑ کر کھینچے ہوئے کہا لیکن وہ اپنی جگہ سے ہلاتک نہیں۔  
 ”گناہ ہے اسے ڈنڈا ڈولی کر کے لے جانا پڑے گا۔“  
 ”بڑی بے عزتی ہوگی سکندر! اپنے ساری لڑکیاں موجود ہیں۔ شرافت سے چلے چلو۔“  
 ناصر نے اُس پر صورت حال واضح کرتے ہوئے چلنے کو کہا۔ وہ تب بھی اسی طرح کھڑا رہا۔ خاموش ہو کر  
 خاموش رہنے کا وعدہ کر چکا تھا۔  
 پھر سب کے اصرار پر اسی خاموشی سے چھپا کر آتا تو چانک ڈھولک کی تھاپ تیز ہو گئی لیکن اُس  
 کے اندر کے سناتے میں کوئی پہل نہیں بچی تھی۔

اگر تم مل جاؤ زمانہ چھوڑ دیں گے ہم  
 تمہارے واسطے یہ ساری دنیا چھوڑ دیں گے ہم  
 اگر تم مل جاؤ  
 نہ ہو جس میں تم شامل وہ بہاریں ہم نہیں لیں گے  
 نظر جس میں دم آئے وہ شیش توڑ دیں گے ہم  
 اگر تم مل جاؤ  
 رہو لو کہ قریب بیٹھی وہ مغنیہ کے ساتھ ساتھ خود بھی گنگنا رہی تھی۔ صاف لگ رہا تھا جیسے اچانک  
 کسی نے اُس کے دل کے تاروں کو جھیر دیا ہو۔ آنکھوں میں کوئی حسین خیال یوں جھلک ایا کہ گنگنا تے  
 ہوں پر شیشی مسکان سج گئی تھی۔  
 بدن کے سامنے تمہارے رنگ میں رنگ ڈالیں  
 چلا کیا کر سکیں گے تم کو مجھ سے یہ جہاں دلے  
 محنت کی قسم تقدیر کا رخ موڑ دیں گے ہم  
 اگر تم مل جاؤ۔

سیا بھائی نے پہلی بار کمریہ بھائی کو اُس کی طرف متوجہ کیا۔ پھر دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر منس  
 پڑیں لیکن وہ اتنی عموماً کہ اسے ہنسی کی آواز سنائی ہی نہیں دیتی تھی۔ نہ یہ احساس کہ اس کے بعد  
 دوسرا گانا شروع ہو چکا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر اب بھی اگر تم مل جاؤ تھا۔  
 ”مل جانے کا لیکن خدا زمانہ چھوڑنے کی بات نہیں کرو۔“  
 سیا بھائی سے آخر ہاتھ نہیں گیا اتنی اونچی آواز میں کہ وہ اُچھل پڑی۔ پھر دونوں بھاو جوں کی شوخ  
 محنت خیز ہنسی سے جھینپ کر بولی۔

”کیا کہہ رہی ہیں آپ۔“  
 ”ہمارے کہنے کو کیا رہ گیا ہے۔ سب کچھ تو تم نے خود ہی کہہ دیا۔ کیوں بھائی؟“  
 میوز بھائی نے باقاعدہ اسے چھیننے کا آغاز کرنے کے ساتھ ہی سیا بھائی سے تائید چاہی تو وہ فوراً  
 بولیں۔

”اور کیا، ہمارا کام تو اب دُعا کرنا ہی رہ گیا ہے۔“  
 وہ پھر بھی اب یہ دونوں اس کا ناک میں دم کر دیں گی۔ اس لیے فوراً خود پر قابو پا کر مسکین سی شکل

بن کر بولی۔

”صرف دُعا“

”اے کیا بھتیجی! ہماری دُعاؤں کو ابھی ہاتھ اٹھاؤں تو کچھ دھماکے سے بندھ چلا آئے گا تمہارا وہ۔ کیا نام ہے اس کا؟“ میمونہ بھابی ہمیشہ اُس کے نام پر اٹک جاتی تھیں۔

”شاہ سکندر حیات۔“

”ہاں شاہ سکندر۔ بتاؤ اٹھاؤں ہاتھ“

”نہیں، وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے ہنس پڑی۔

”کیوں؟“ یہاں بھابی نے تعجب سے پوچھا تو اُس سے پہلے میمونہ بھابی بول پڑیں۔

”اے جتا ہے۔ میری دُعاؤں میں اثر نہیں ہے“

”یہ بات نہیں ہے، وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ان دونوں کے پاس آ بیٹھی اور ایک دم سنجیدہ ہو کر کہنے لگی۔

”دُعا کا مرملہ بعد میں آئے گا بھابی! پہلے اب اماں جی اور اماں جی سے تو بات کریں“

”اے اُن سے تو میں جلتے ہی بات کروں گی۔ تجھے یقین ہے، ادھر سے کوئی اعتراض نہیں اٹھے گا۔

کیونکہ اماں جی اور عبدل بھی اُس کی کتنی تعریف کرتے ہیں“

میمونہ بھابی نے کہا تو وہ یونہی بے نیالی میں انہیں دیکھنے لگی جس پر وہ پوچھنے لگیں۔

”میں غلط کہہ رہی ہوں یا نہیں کوئی اور خدشہ ہے“

”خدشہ؟“ وہ اپنے آپ سے پوچھنے لگی۔

”دیکھو آسیہ! جو بھی بات ہے صاف کہو کیونکہ ہمیں تمہاری وکالت کرنی ہے۔ ایسا نہ ہو بے خبری کی

بنا پر اُم سے کوئی غلطی ہو جائے“

”یہاں بھابی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ کچھ دیر تک انہیں دیکھتی رہی پھر سر جھٹکا کر کہنے لگی۔

”مجھے کوئی خدشہ نہیں ہے بھابی! اللہ شاہ سکندر کہہ رہے تھے کہ ان کے والدین شاید ہی راضی ہوں۔

کیونکہ اُن کے ہاں تاریاں خاندان ہی میں ہوتی ہیں“

”پھر تو اُسے تمہاری طرف نہیں بڑھنا چاہیے تھا؟“ یہاں بھابی بلا ارادہ فوراً کہہ گئیں لیکن پھر اپنی بات

کی نفی کرتے ہوئے بولیں۔

”نہیں خبریہ تو بے اختیاری جذبہ ہے۔ بندے کو کچھ یاد نہیں رہتا۔ ہاں تم جاؤ۔ ایسی صورت یوں

کیا کرے گا؟“

”کہہ رہے تھے ان کے والدین ناراض نہیں رہ سکیں گے“

”تک اُن کے والدین ناراض نہیں رہ سکیں گے“

”وہ یونہی سر جھٹکے رک رک کر بول رہی تھی۔ یہاں بھابی معاملے کی حد تک پہنچ کر پوچھنے لگیں۔

”وہ اپنے والدین کے سامنے تک انتظار کرے گا یا پہلے ہی شادی کرنا چاہتا ہے؟“

”وہ کچھ نہیں بولی لیکن جن نظروں سے یہاں بھابی کو دیکھا اس سے وہ کچھ کر لیں۔

”ہوں۔ پہلے شادی۔ اور کم از کم مطلب ہے۔ تم نے سوچ لیا ہے؟“

”میں تو بس آنا جاتی ہوں بھابی! اگر میری زندگی میں آئے والا وہ پہلا اور آخری شخص ہے، اُس

سے میری شادی اب سو اسی سال بعد یہ سوچنا اور فیصلہ کرنا آپ سب کا کام ہے“

اس کے مضبوط ہاتھ پر دونوں بھابیوں نے ایک لمحے کو ٹھٹھک کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

مذاق سے شروع ہو کر سنجیدگی کا روپ دھارتی ہی ماحول کو بوجھل کر گئی تھی۔

جانب اُسے احساس ہوا کہ اپنی محبت کرنے والی بھابیوں کو اُس نے مشکل میں ڈال دیا ہے۔

”اُس کی آنکھوں سے تھوڑا سا آنسو نیک کر اُس کے ہاتھوں کی پشت پر گرنے لگی۔

”اے! میمونہ بھابی کی نظریہ پڑی تو تڑپ کر اُس کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر ٹوکا۔“ اس میں

کی کیا بات ہے؟ اُس کے اُنسو اور روانی سے بہنے لگے۔

”بہشت پلکی اور دُک کی تو ہم دس سال بعد کا فیصلہ سنائیں گے“

”یہاں بھابی نے اُسے گلے لگاتے ہوئے کہا ساتھ ہی میمونہ بھابی کو جانے کیا اشارہ کیا کہ وہ آچل

کر بولیں۔

”دس سال، نہیں بھی۔ میں تو جلتے ہی اماں جی کی منتیں شروع کر دوں گی کہ فوراً آسیہ کو رخصت

کر دیں“

”شاہ سکندر کے ساتھ؟“ یہاں بھابی نے مزید لقمہ دے کر کڑا کیا۔

”ہاں، چاہے اُس کے اماں ابا آئیں یا نہ آئیں۔ کیوں آسیہ؟“

”آخر میں اُسے لگدلا دیا تو وہ اپنے آپ میں سمٹنے لگی۔

”ایسے نہیں، ہنس کر دکھاؤ“

”ساتھ کا نا بھی سننا؟ اگر تم مل جاؤ لیکن دیکھو زمانہ چھوڑنے کی بات نہیں کرنا“

”یہاں بھابی کی پیار بھری وارننگ پر وہ ہنس پڑی تو بھابیوں کی چھین چھڑے ماحول پھر سے

دشگوار ہو گیا تھا۔

”اماں جی۔ میں فیصلہ کو طلاق دے رہا ہوں“

”بڑے بیٹا کا پرسکون انداز بتا رہا تھا کہ یہ اچانک فیصلہ نہیں ہے بلکہ سارے طوفانوں سے گزرنے

کے بعد ہی وہ اماں جی اور اماں جی کے پاس آئے ہیں۔ اور اپنی بات کے رد عمل پر ٹھٹھکے بھی نہیں۔ یعنی اماں

جی اور اماں جی سنائے میں آگئے تھے اور وہ ہنوز اسی انداز میں گویا ہوئے۔

”میں جانتا ہوں میرا یہ اقدام آپ کو دکھ دے گا۔ اتنا عرصہ اگر میں خاموش رہا تو صرف یہی سوچ کر

لیکن اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ دس سال کا عرصہ کم نہیں ہوتا۔ میں تجھوتے پر تجھوتا کرنا کیا اس

ایمپر پر کہ شاید یہی وہ اس گھر کو اپنا گھر سمجھنے لگے لیکن“

”تجھوتے پر تجھوتے کر بولتے بولتے انہوں نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا پھر ہونٹ بیچ بیچ لے کر ابھی دُکھ

سے بولے۔

”اگر تم شروع ہی میں اُسے الگ گھر لے دیتے تو ہمیں اتنے بھگوتے نہ کڑے پڑتے“

”فیصلہ کہتے ہیں آپ تب تو دس دن میں ہی فیصلہ ہو جاتا“

”اُن کے ہاتھ میں نفی سمٹ آئی۔

”کیونکہ وہ اپنے ہر فعل میں آزاد ہو جاتی۔ اُس نے اپنی سوسائٹی کے لوگوں کو اگر اس گھر کا راستہ نہیں

دیکھا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اُسے آپ کا اماں جی کا یا میرا خیال رہا نہیں۔ ہم سب کی عزتوں کی

تواضع کے نزدیک میرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں رہی۔ وہ اپنا پرکاش کی عورت کسی طرح مڈل کلاس

سے اپنا تعلیق ظاہر نہیں کرنا چاہتی۔ اس لیے کسی کو اس گھر کا راستہ نہیں دکھایا اور اگر میں اُسے الگ گھر

لے دیتا تو جو کچھ وہ باہر کرتی پھرتی ہے۔ وہی میرے گھر میں بھی ہوتا“

”اُسے اپنی ذہنی بات بھی تو تم ہی کے دی بیٹا! جہاں مرضی آئی کبھی ٹوکا تم نے۔ اُسے تم نے قیوں ہی

کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں جیسے تمہارا اُس سے کوئی واسطہ ہی نہ ہو“

اماں جی بھی انہیں الزام دینے بیٹھ گئیں۔

”اور اب اتنے عرصے بعد تمہاری غیرت جاگے تو ایک دم سے اُسے چھوڑنے کی بات کر رہے ہو۔

”نہ بیٹا! ایسا ہمارے خاندان میں کبھی نہیں ہوا۔ اُسے آرام سے، پیار سے سمجھاؤ“

”آپ کا مطلب ہے۔ میں نے ایسی کوئی کرشمہ نہیں کی۔ ہر طرح سے سمجھا کر دیکھ لیا ہے اماں جی۔

اب تو میری قوت برداشت جواب دے چکی ہے۔  
ان کی بے بسی پر ابابی کو روک کر رکھئے۔

میرے بیٹا میرے  
بہت صبر کیا۔ مزید کی طاقت نہیں۔ اگر آپ لوگوں نے مجھ پر دباؤ والا تو کسی دن میرے دماغ کی شریانیں پھٹ جائیں گی۔

اللہ نہ کرے! اماں جی نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا۔  
"تو چھوڑ دس اُس کی طرف داری۔ مت گھبراؤ اُس کے ساتھ ہمدردی۔ وہ عورت ہرگز اس قابل نہیں ہے۔ نیل کی وجہ سے میں سناس کا بہت لحاظ رکھتا لیکن اُسے اُس کی بھی پروا نہیں ہے کتنے دن ہوئے ہیں نیل کو گئے ہوئے۔ ایک دن بھی اُس نے آپ سے پوچھا کہ وہ کب آئے گا؟"

ایک طویل عرصہ بعد وہ اتنا بول رہے تھے۔ گویا برسوں کا غبار تھا۔  
"پھر بھی بیٹا! نیل کا خیال کر کے تم ٹھنڈے دل سے سوچو۔"

اماں جی تسلی طرح اُن کے فیصلے کے حق میں نہیں تھیں۔ ایک آخری کوشش کے طور پر انہیں پڑا کا احساس دلایا تو وہ کہنے لگے۔

"نیل کا خیال ہی تو کر رہا ہوں۔ ماں کی بے توجہی سے مر رہا ہے اور جس دن اُس نے ماں کی بے راہ روی محسوس کر لی بالکل لوٹ جانے لگا۔  
نہ جانتے ہوئے بھی اُن کی زبان پر نیل کی بے راہ روی کا ذکر آگیا۔  
"بچے کی شخصیت کو بنانے اور بگاڑنے میں ماں کے کردار کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ کو میرا بچہ اپنے وجود پر یہی نادم ہوا کسی سے سراٹھا کر بات نہ کر سکے۔  
اس کے بعد اگر اُن کے پاس کہنے کو کچھ تھا بھی تو ابابی کو سر جھکائے دیکھ کر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے پھر جاتے جاتے بولے تھے۔"

"مجھے افسوس ہے۔ میں آپ کو روک دے رہا ہوں۔  
ان کے جانے کے بعد ابابی نے سراٹھا کر اماں جی کو دیکھا تو وہ رونے لگیں۔ پتا نہیں ان کے آنسوؤں کے ڈھکے پر چھلکے تھے یا اُس عورت کے لیے جو روک کا باعث تھی۔ ابابی نے بہر حال انہیں رونے سے منع نہیں کیا۔ بکری سانس لیچنے ہوئے بولے۔

"یہ سچ ہے میرے بیٹے نے اپنی طاقت سے زیادہ برداشت کیا۔ دعا کر! اللہ اسے سکون دے! اماں جی دوپٹے کے پورے آنسو صاف کرتے لگیں۔

شاید اس میں خدا کی مصلحت ہوگی۔

ابابی اُٹھتے ہوئے پیسے اپنے آپ سے بولے تبھی عدیل نے آکر سلام کیا تو جواب دے کر آیا۔ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ عشاء کی اذان ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ اماں جی نماز کی نیت سے اُٹھیں عدیل نے گھانا مانگا لیا۔

"نماز سے پہلے مجھے کھانا دے دیں اماں جی! پھر بیٹھے ہوئے اماں جی پر نظر پڑی تو ٹھک گئے۔  
"کیا بات ہے اماں جی! آپ رویوں رہی ہیں؟"

"کچھ نہیں۔  
اماں جی اُٹھنے لگیں تو عدیل نے جلدی سے اُن کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ اور انہیں بتانے پر آمادہ کرنے لگے۔ اسی وقت دوسرے نبیلہ بیانی گھر میں داخل ہوئیں اور دوسرے بڑے بیٹا بہت تیز کر میٹھیاں اُترتے ہوئے آگے بول بیٹھے انتظار میں تھے۔ یقیناً انہوں نے دوسرے نبیلہ کو اُترے ہوئے دیکھ لیا تھا اور بجائے اُن کا اوپر اُتارنے کرنے کے خود ہی نیچے آکر اُن کا راستہ روک لیا۔

کیا بات ہے؟ نبیلہ کا اپنا انداز تھا۔ غیر معمولی بات پر بھی اُس کے تنازع میں فرق نہیں آتا۔

پیشانی پر ہل ڈال کر بوقت "اس طرح راستے میں کھڑے ہونے کا مطلب ہے!"  
واپس لوٹ جاؤ! جہاں سے آئی ہو اور جس کے ساتھ آئی ہو۔  
اُن کے بچے کا منہ اُس بات کا منہ تھا کہ وہ ضبط کی انتہا پر کھڑے ہیں۔  
نبیلہ نے قدرے ٹپٹپٹا کر اماں جی اور عدیل کو دیکھا پھر اُن سے بولی۔  
"میں ہرگز نہیں اپنی اسلٹ کی اجازت نہیں دوں گی۔ جو کچھ کہنا ہے اور چل کر کہو۔"

"کہنے کے لئے کا وقت نکل گیا ہے نبیلہ! ایک ہفتہ پہلے میں نے تمہیں وارنٹ دی تھی۔ اپنی روش بدلو۔ اگر نہ بدل سکو تو اس گھر میں مت آنا۔ آج کی تاریخ کو دیکھ لو۔ یہی دن طے ہوا تھا ناں؟  
انہوں نے چیختے ہوئے پہلے میں اسے یاد دلایا تو وہ کھری سانس لیچ کر بولی۔  
"تو قہر نے فیصلہ کر لیا ہے!"

انہوں نے ہنٹ بھنٹ بھنٹ کر اثبات میں سر ہلایا تو اُس نے اُن پر سے نظریں ہٹا کر اماں جی کو روئے ہوئے اور عدیل کو کم کم دیکھا پھر درود یوار پر نظر ڈالنے کے بعد آخر میں انہیں دیکھتے ہوئے بولی۔  
"اگر میں نیچے درجے کی کوئی عام سی عورت ہوتی مقل احمد تو تمہاری منتیں کرنی یا پھر کوئی کہ جو کچھ تم نے میرے ساتھ کیا تو تمہاری۔"

"خبردار! وہ جو بہت ضبط کر رہے تھے۔ چیخ پڑے! تمہاری زبان پر میرے گھر کی کسی عورت کا نام نہ آئے۔"

"بہت پارسا ہیں تمہارے گھر کی عورتیں۔ ہا۔ وہ تملکارہنسی۔ بڑی ذہن تلی ہنسی تھی۔ عدیل اپنی جگہ سے اُٹھ کر دونوں کے درمیان آکھڑے ہوئے۔

"بڑے بیٹا، پلیز، آپ اوپر جائیں، پھر اس کی طرف پلٹے۔" بیانی پلیز۔  
"مت کہو اسے بیانی! طلاق دے رہا ہوں میں اسے!"

"طلاق دے رہا ہوں!"

"طلاق!"

نبیلہ کو اگر افسوس نہیں تھا تب بھی ایک لحظہ کو دل کا پناہ ضرور تھا۔ اس کے بعد کچھ نہ کہہ کر خود کو پھلے دھبے کی عورت ثابت کرنے سے روکتے روکتے بھی دہلیز پر کھڑی ہو کر وہ چیخ کر بولی تھی۔  
"عتیل احمد! مت بھولنا کہ تمہاری ایک بہن بھی ہے!"

اتنے شور اور ہنگامے میں اُس کا دم گھٹ رہا تھا۔ بی بی جان کی رسیں بھی تو ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھیں۔ جانے کس کس چیز پر اُس کا اور اُس کے پہلو میں کھڑی مہر النساء کا ہاتھ لکوا کر دونوں کے اوپر سے وار رہی تھیں۔

اگر یہ سب اُس کی خواہش کے مطابق ہو رہا ہوتا تو وہ کتنا خوش ہوتا۔ مجاہد توں اور کنز کی قیصرہ تھا۔ ہر طرف ملاحظہ ہوتا بلکہ برابر سے جواب بھی دیتا لیکن وہ تو ایسا کم کم کھڑا تھا کہ پہلو میں کھڑی مہر النساء کے وجود کا احساس بھی نہیں تھا۔

"بس کرس بی بی جان! ذہن تھک گئی ہے! آخر بڑی بیانی کو احساس ہوا تو بڑھ کر مہر النساء کو تمام لیا تو واقعی بیماریاں کپڑوں اور زیورات کے بوجھ سے جھکی جا رہی تھی۔ بی بی جان نے ہاتھ میں پکڑا تھا۔

نیمزل کو تھا یا پھر ایک طرف ہٹتے ہوئے مہر النساء سے بولیں۔  
"سنبھل کے۔ پہلے وہاں پاؤں آگے بڑھاؤ۔"

"جیل بھی شہزادے! تو بھی آگے بڑھ! چھوٹی بیانی نے اُس کے بازو میں جھکی کانتے ہوئے کہا اور اُس نے قدم کیا بڑھا یا کہ پھر کا ہی نہیں۔ پچھلے سب شور بجا ہی رہ گئیں۔

"ارے ابی! ذہن تو لیتے جاؤ! اُس نے جیسے سنا ہی نہیں۔ راہزاری سے نکل کر میٹھیاں چڑھنے

کے بجائے پچھلے طرف بارہ دری میں نکل آیا۔  
دن بھر کی جھلسا دینے والی گرمی کے بعد ابھی بھی گر کر ہوا نہیں چل رہی تھی پھر بھی قدرے سکون تھا۔  
ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ایک تو ذہنی انتشار دوسرے تھکا دینے والی رہیں اُس کے  
اعصاب تل کر گئی تھیں کتنی دیر تک وہ بالوں میں انگلیاں پھسلنے خود کو سہارا دینے کی کوشش کر  
رہا پھر اٹھ کر بیٹھنے لگا۔

جب ذہن کسی حد تک سوچنے کے قابل ہوا تب بھی وہ کیسوٹی سے کچھ نہیں سوچ سکا۔ البتہ اب  
آپ پر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اتنی آسانی سے کیسے سازش کا شکار ہو گیا۔ شاید اُس کے گمان  
بھی نہیں تھا کہ شاہ جہاں گھرنے جو اُس سے شہر بالو کی شادی تک خاموش رہنے کا وعدہ کیا تھا تو  
سے پہلے وہ اسے بھی پابند کر دے گا اور اسے پابند کر کے سب لوگ کتنے خوش تھے۔ اندر سے آتی ہمت  
کی آوازیں اُس کے ذہن پر ہتھوڑنے برسائے لیکن تو اس کا دل چاہا وہ اسی وقت سب کی خوشیوں  
رو دتا ہوا چلا جائے لیکن ابھی شہر بالو رخصت نہیں ہوئی تھی۔ کل تک اُسے انتظار کرنا تھا۔ اس کے لیے  
ایک پل یہاں نہیں ٹھہرے گا۔

اُس کا ذہن اچانک اپنے کل کے بارے میں سوچنے لگا تو پھر اسے کچھ خبر نہیں ہوئی۔ کتنی رات بید  
گئی۔ اندر باہر ہر طرف خاموشی چھا گئی تھی۔ شاید سب کو یقین تھا کہ وہ اپنے کمرے میں جا چکا ہے مگر  
اُسے ذمہ داری ہوا اس طرف نہیں آیا بلکہ سب اطمینان سے سو گئے تھے۔ اور وہ اپنا اگلا اقدام سوچنے  
بعد جب پوری طرح مطمئن ہو گیا تب وہاں سے اُٹھ کر اندر آیا۔

اس وقت گھڑی کی سوئیاں دو بج رہی تھیں۔ وہ مہر النساء کے سوجانے کا یقین کر کے اپنے کمرے پر  
آیا اور قصد اُس کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے سیدھا ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔

اس کا خیال تھا کہ پڑے بدل کر اسی خاموشی سے اس کمرے سے نکل کر نیچے ہیں جا کر سو جائے گا۔ اب  
تھیں اُس نے بہت احتیاط کی یعنی کوئی اُپٹ نہیں ہوئے دی۔ یا بھی وجہ پاؤں تھا۔ پھر کمرے پر  
کراہی احتیاط سے ڈرائنگ روم سے نکلا تھا کہ بے اختیار نظر پیچ پر پڑی اُس لڑکی پر جا ٹھہری جس کی  
غیر معمولی حسن کو بھی اُسے متاثر نہیں کر سکا تھا لیکن اس ایک پل میں جانے کیا سحر تھا جس کی طرف  
وہ یوں آکا کہ اس پر سے نظریں ہٹا ہی نہیں سکا۔ چنانچہ اُس کا انتظار کرتے کرتے وہ سو گئی تھی یا تو  
چمکیں موندتی تھیں۔ خود سے قدرے بے نیاز اور قدرے بے ترتیب سی ہو کر ہوش اُڑائے دے رہی  
تھی۔ اور اسی مدد ہوئی کے عالم میں اُس نے درمیانی فاصلہ سمیٹا تو اُس کے ہونٹ بے آواز جنبش کر  
تھے۔ مہر۔ مہر۔

اور یہ جیت کا نشہ نہیں تھا جس کا کیف ساری زندگی پر محیط ہو جاتا۔ اس کے برعکس وقتی جذبات  
تھے۔ نفسیاتی خواہش جس سے مغلوب ہو کر وہ اپنی اولین شہادت اُس کے نام کر گیا تھا جس کے ساتھ  
گزارنے پر اس کا دل آمادہ ہی نہیں تھا۔ اور گو کہ اُس نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ پھر بھی صبح ہونے سے  
پہلے بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اور بے حد وحشت زدہ سا مہر النساء کو دیکھنے لگا جو بالینے کے احساس سے  
نیند میں بھی مسکرا رہی تھی۔ جس سے وہ جنونی سا ہو کر اُسے صبح بھڑکنے لگا۔

”مہر۔ مہر النساء۔“  
”جی۔۔۔ وہ کھرا کھرا اٹھ بیٹھی۔“  
”تم یہاں کیوں آئی ہو؟“ عجیب سوال تھا۔ وہ پریشان ہو گئی۔

”جی۔۔۔“  
”تم نے مجھے روکا کیوں نہیں۔ تم نے مجھے روکا کیوں نہیں۔ وہ اُسے کندھوں سے تھام کر صبح بھڑکا۔  
لگا۔ تو بڑی مشکل سے اپنا آپ چھڑا کر وہ بیڈ سے اتر کر بولی۔  
آپ۔ شاید آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ پھر جلدی سے گلاس میں پانی ڈال کر لے آئی۔

لیجیے۔ پانی پی لیں۔“  
اُس نے گلاس لے کر ایک ہی سانس میں خالی کر دیا پھر بیڈ کی پشت پر سر رکھتا ہوا بولا۔  
”یہ اچھا نہیں ہوا مہر النساء یہ اچھا نہیں ہوا۔ اُس کے لیے بی بی نفی۔ مہر النساء کی سمجھ میں  
نہیں آتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اُس کے ہاتھ سے گلاس لے کر تھیل پر رکھا پھر قریب آکر بولی۔

آپ لیٹ جائیں، میں آپ کا سر دباؤتی ہوں۔“  
اُس کے اندر اچانک تنفر پھر گیا۔ ذرا سی آنکھیں کھول کر اُسے دیکھتا ہوا زہر خند سے بولا۔  
”کیا سمجھتی ہو تم، اس طرح میرا دل جیت لو گی۔“  
”جیسے تو آپ ہیں شاہ جہاں کو تو کتنی بڑا خوبصورت بڑا دلنشین انداز تھا اس کا لیکن شاہ سکندر حیات  
آپ پرش میں آچکا تھا۔ کچھ دیر تک اُس کی جھکی ہوئی ہلکوں کو دیکھتا رہا پھر پلو پھنے لگا۔

”بارے کا دکھ نہیں ہے نہیں؟“  
”دکھ۔ مہر النساء نے زہر خند دہرایا پھر جیسے اپنی ہار سوچ کر مسکرائی۔ اور ایسے ہی جھکی ہوئی  
نظر سے اسے دیکھ کر پوچھنے لگی۔  
”آپ کو جیتنے کی خوشی نہیں ہے؟“  
شاہ سکندر کی آنکھوں میں حیرت سمٹ آیا۔ کیا کہے اُس سے کہ جیسے وہ جیت کھ رہی ہے۔ وہ اس  
کی سب سے بڑی ہار ہے۔

کل جب مہر النساء کی ڈولی اس حویلی میں اُتری تھی تو حویلی کی رونق میں کمی لگنا اضافہ ہو گیا تھا اور وہ  
ساری رونقیں شہر بالو کے رخصت ہونے ہی سے ماند پڑ گئی تھیں۔  
رواج کے مطابق مہر النساء بھی اُس کے ساتھ نیکے چل گئی تھی۔ اور تین دن اُسے وہیں رہنا تھا۔ بہر حال  
شاہ سکندر کو اس سے کوئی اعتراض نہیں تھی۔ وہ شہر بالو کی رخصتی تک خاموش رہنے کا وعدہ نہ کیا تھا اور  
مزید خاموش رہنا اُس کے اختیار میں نہیں تھا نہ ہی صبح ہونے کا انتظار کر سکا۔ اسی وقت جا کر شاہ جہاں گھر  
کے کمرے کا دروازہ کھٹکھا دیا۔

”کون ہے آج؟“ اندر سے شاہ جہاں گھر کی آواز آئی تو اُس نے ہینڈل گھا کر دروازہ کھول دیا۔ لیکن  
سامنے بھائی پر نظر پڑی تو وہیں رگ کر بولا۔  
”بھائی! مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“

”ہاں ہاں۔“ بھائی معلوم ہے بلکہ یاد ہے۔ کچھ دن مبر کر لو۔ پھر اطمینان سے۔“  
”سہاں ایک ایک پل بھاری ہے۔“ وہ درمیان میں بول پڑا تو شاہ جہاں گھر نے اپنی بیگم کو دیکھ کر گویا  
اسے ان کی موجودگی کا احساس دلایا پھر اُسے دیکھ کر پوچھنے لگے۔  
”کیا صبح تک انتظار بھی نہیں کر سکتے؟“

”ارے ابھی تو وہ کئی ہے۔ اتنی بے قراری۔“  
”بھائی! ابھی تمہارے مطابق مہر النساء کے حوالے سے اُسے چھیڑ کر نہیں تو اُس نے شاہ جہاں گھر کو دیکھا۔  
”صبح۔“ انہوں نے اسی قدر کہا تو کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ ان کا دروازہ بند کر کے اپنے کمرے  
میں آیا۔

رات کے پندرہسوں لمحات کی خوشبو ابھی اُس کے کمرے سے گئی نہیں تھی، جو اُس کے سوچنے کی  
راہ میں عامل ہو کر بار بار اُس کا دھیان ہٹا دیتی۔ تب صبح لا کر اُس نے تیکے میں منہ چھپا لیا تھا۔  
پھر صبح ناچنے کے بعد وہ بی بی جان کے پاس آ بیٹھا۔ اُس کی بڑی بہن نور بانو بھی وہیں موجود تھیں۔  
اور اپنے جانے کی بات کر رہی تھیں۔ وہ سن کر کہنے لگا۔  
”اتنی جلدی کیوں جا رہی ہیں آپا! ابھی رہیں ناں۔“

”تم کہاں میرے پاس بیٹھتے ہو، سارا وقت تو اپنے کمرے میں بند رہتے ہو، نور بالو گلہ کر رہے ہو۔“  
 بولیں۔ ”میرے پاس آنے ہی نہیں ہو۔ اب میرا لڑکھو کو لے کر آنا۔“  
 ”جی۔“ وہ اسی قدر کہہ کر فوراً بی بی جان کو غیظ کر کے پوچھنے لگا۔ ”جہانگیر بھائی نے ناراض کیا؟“  
 ”ہاں، وہ تو سویرے ہی نکل گیا ہے۔“ بی بی جان نے بتایا تو وہ چونک گیا۔

”کہاں؟“  
 ”رقبے پر گیا ہے۔“  
 ”اکیلے؟“

”نہیں۔ مہارے بابا جان بھی ساتھ گئے ہیں۔“ پھر سرسری انداز میں پوچھنے لگیں۔ ”تمہیں کوئی لاؤ اس سے؟“  
 ”جی۔ نہیں۔“ وہ اکیدم اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر جاتے جاتے رگ کر بولا۔ ”بھائی! آئیں تو ان سے“  
 ”گاہ میں اس سے زیادہ انتظار نہیں کر سکتا تھا۔“  
 ”کیا کہہ رہے ہو؟“ بی بی جان نے ٹھیک سے سنا نہیں یا سمجھیں نہیں اور وہ اچانک سارے مصلحتوں کا دامن چھوڑ کر بیچ بڑھا۔

”میں جا رہا ہوں بی بی جان یہاں سے، جہنہ کے لیے، آپ نے اور بابا جان نے میری بات سنی ہی نہیں تھی اور جہانگیر بھائی نے اتنا احسان کیا کہ نہ صرف میری بات سنی بلکہ سمجھ کر لکھے یقین دلا یا تھا کہ وہ میرے سختی میں آپ لوگوں کو ہموار کریں گے۔ لیکن وہ میرے ساتھ فاضل ٹھیل سے اس سے زیادہ میں اپنی زندگی کے ساتھ کھینے کی اجازت کسی کو نہیں دے سکتا۔“  
 ”ک۔ کیا مطلب ہے مہاراجہ؟“ بی بی جان نے بوکھلا کر کہا اس سے اور دیکھا نور بالو کو صورت حال کو نہ سمجھتے ہوئے بھی پریشان ہو گئی تھیں۔

”آپ اب بھی طرح جانتی ہیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ مجھ سے غلطی ہوئی مجھ میں نے بھائی پر اعتبار ان سے کیسے کیا میں منتظر بالو کی طرح گونگا بہرا نہیں ہوں نہ ہی ان کے ہمارے کامتاج یہاں۔“  
 ”نکل کر اگر کچھ نہ کروں گا۔“ تب بھی پلٹ کر یہاں نہیں آؤں گا۔“  
 اس نے جانے کا فیصلہ بنا کر بی بی جان کے خواہش جھین لیے۔

”بابا جان کے الفاظ حرف آخر تھے ناں تو میرا فیصلہ بھی اہل ہے۔ ان ہی کی اولاد ہوں میں۔“  
 ”نئے اپنا سونپ کر لیا اب میری باری ہے۔ جا رہا ہوں میں۔“  
 وہ اپنے آپ میں نہیں تھا۔ درنہ اس سے پہلے بھی بی بی جان کے سامنے اتنی اونچی آواز بات نہیں کی تھی۔ جانے کیسے سارے لحاظ بھلا گیا۔

”سکندر، سکندر میرے بھائی،“ نور بالو اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی طرف لپکیں۔ ”کہاں جا رہے“  
 ”بی بی جان جاتی ہیں۔“ وہ نور بالو کے قریب آنے سے پہلے ہی دروازے کی طرف بڑھو۔  
 بی بی جان اکیدم ہوش میں آکر بیکار کر بولیں۔  
 ”سکندر! اپنے بابا جان کو تو آئے دو۔“ وہ اُن سنی کرتا آگے بڑھ گیا۔ تو بی بی جان شاہ یونس بہوؤں کو بیکار کرنے لگیں۔

”کوئی روکو اسے۔ میں مہارے بابا جان کو کیا جواب دوں گی؟“  
 اور غلطی شاہ جہانگیر کی تھی۔ اگر اس کی بات سن لیتے تو آرام سے سمجھا بھی سکتے تھے۔ جیسے پہلے رام کر لیا تھا۔ شاید اپنے طور پر انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ اب وہ کچھ نہیں کر سکتا اور وہ اس کو جو گیا تھا کہ بڑی بہن اور بھادیں منتیں کرتی رہ گئیں شاہ یونس نے ہر طرح روکنے کی کوشش کی وہ نہیں رکھا۔ اسی وقت اپنا ضروری سامان لے کر حویلی سے نکل گیا تھا۔

”آسیہ!“ اُس نے تشکیل بھائی کی بیکار میں کرسپ بچوں کو آرام سے کھینے کی تاکید کی پھر کمرے سے نکل کر اونچ میں آئی تو وہ اسے دیکھتے ہی کہنے لگے۔

”بھائی! وہ عدیل کا فون آیا تھا۔ کہہ رہا تھا! اماں جی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“  
 ”کیا ہوا اماں جی کو؟“ ادھر سے سیما بھائی سنتی ہوئی آ رہی تھیں۔ فوراً پوچھنے لگیں۔  
 ”بتانا نہیں، زیادہ کچھ نہیں بتایا عدیل نے۔“ میرا خیال ہے اکیلے میں گھبرا گئی ہوں گی۔ تشکیل بھائی بیوی کو جواب دے کر آئے دیکھنے لگے۔  
 ”تو ہم چلے جاتے ہیں۔“ اُس نے کہا تو تشکیل بھائی برسوج انداز میں ذرا سار ہلا کر بولے۔

”جوں۔“ عدیل بھی کہہ رہا تھا کہ ابانی سب کو واپس بلارہے ہیں۔  
 ”عدیل نے یہاں فون کیوں نہیں کیا۔ تم انکم ہم اماں جی کے بارے میں تفصیل سے تو معلوم کر لیتے۔“

”اسی لیے اُس نے یہاں فون نہیں کیا۔ کیونکہ وہاں گھر کا فون خراب تھا اور آفس میں بیٹھ کر وہ تم خواتین سے لمبی چوڑی بات نہیں کر سکتا تھا۔“ تشکیل بھائی نے زور دے کر بیوی کو بتایا پھر اس سے کہنے لگے۔

”بھائی! تم تھری کرو۔ کل صبح کی ٹیون ہے۔“  
 ”یعنی آپ لگٹ بھی لے آئے؟“ سیما بھائی نے تعجب کا اظہار کیا۔  
 ”ٹھیک تو ہے بھائی! ہمیں فوراً جانا چاہیے۔“ پتا نہیں اماں جی!  
 ”اُس کا دھیان اماں جی کی طرف تھا۔ اس بحث سے الٹا کر بولی۔“ تشکیل بھائی نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر تسلی دیتے ہوئے بولے۔

”زیادہ پریشانی کی بات نہیں ہے۔ بس وہی اکیلے میں گھبرا گئی ہیں۔ تم جاؤ تیاری کرو۔“  
 ”اُسے غصہ ہوا۔“ جیسے تشکیل بھائی کچھ چھار رہے ہیں۔ تب اندر ہی اندر اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اور کیونکہ بات اماں جی کی تھی۔ اس لیے کسی اور طرف اُس کا دھیان ہی نہیں گیا۔ فوراً جا کر بیٹے میمونہ بھائی کو بتایا پھر آکر اپنا سوٹ کیس بیک کرنے لگی جیسے اسی وقت روانہ ہو رہی۔ اور اس کا دل تو ابھی چاہ رہا تھا کہ اسی وقت اماں جی کے پاس پہنچ جائے بڑی مشکل سے رات کو بھی اور پھر آگے طویل سفر تھا۔ گو کہ تشکیل بھائی اور پھر سیما بھائی بھی وقت رخصت یہی کہتی رہی تھیں کہ یہ صرف تم لوگوں کو بلانے کا ہانا ہے۔ لیکن اُس کا دل ماننے کو تیار نہیں تھا۔

”ابا جی ایسے نہ بلائے تب بھی جانا تھا۔ ضرور کوئی بات ہے۔“  
 ”تھانکس! وہ یہی سوچتی آئی تھی۔“ اُس نے کراچی اسٹیشن پر عدیل موجود تھے۔ اور وہ تشکیل بھائی کے سامنے کس بے قراری یا تشویش کا اظہار نہیں کر سکتی تھی عدیل بھائی سے اپنی کیفیت چھپانے کی۔  
 ”کچھ بتائیں عدیل بھائی! کیا بات ہے؟“  
 ”کیا بات ہے؟“ وہ اُلٹا اُس سے پوچھنے لگے۔

”اماں جی تو ٹھیک ہیں ناں؟“  
 ”باب ٹھیک ہیں اور بڑی بے قراری سے تم لوگوں کا انتظار کر رہی ہیں۔ پھر فوراً میمونہ بھائی کی طرف گھوم کر کہنے لگے۔

”آپ نے بھی تھوڑا کر دی بھائی! سب بچوں کو لے کر چل پڑیں۔ ایک دو کو اماں جی کے پاس چھوڑنا چاہیے۔“  
 ”ایک تو جھوٹ تو گئی تھی۔“ میمونہ بھائی کا اشارہ اپنے میاں کی طرف تھا۔ عدیل بھکر زور سے ہنسنے لگی۔  
 ”بھئی نیل پر نظر پڑی تو اُسے اپنے ساتھ لگا کر بولنے۔“  
 ”اور بار بار سنا کیسے ہو، یہ بیک اٹھا لو گے؟“

”میں اٹھا لوں گا!“ اصرار سے فوراً اپنی خدمات پیش کیں۔ تو میمونہ جہابی ٹوکتے ہوئے بولیں۔  
 ”کتوں آدھی، ٹکلی بلالو۔ پیسے ہیں دسے دوں گی۔“  
 ”خواہ رہنا آسیہ! یہ بعد میں نگر جانی ہیں۔“

وہ بھانج کو مشارت سے دیکھتے ہوئے بولے۔ تو اس جھپٹ چھاڑ میں آسیہ بہت حد تک دوسروں سے نکل آئی۔ ظاہر ہے اگر کوئی سر نہیں بات ہوتی تو عدیل جہابی اتنے آرام سے نہیں ہو سکتے تھے تمام راستہ وہ میمونہ جہابی کے ساتھ اسی طرح مذاق کرتے رہے اور میمونہ جہابی بھی گو کہ برابر سے جواب دے رہی تھیں۔ لیکن سفر کی تھکان کے باعث ان کے لہجے میں شگفتگی نہیں تھی۔

اپنے گھر آنے کی خوشی ہی الگ ہوتی ہے۔ بیچوں نے دروازے سے داخل ہوتے ہی اماں کی اور آبی کی بیکارنا شروع کر دیا۔ اصرار سونپا بھاگ کر اماں کی کے تخت — پر چڑھ کر ان سے لیٹ گئے۔ نیل بھی ان کی تقلید کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس سے پہلے ہی آبی نے اُسے اپنے بازوؤں میں بے کرستہ میں بٹھ لیایا۔

”اٹ اماں جی! میں تو پریشان ہو گئی تھی!“ جب اُس کی باری آئی تو اماں جی کے گلے لگتی ہوئی بولی۔ عدیل جہابی نے آپ کی ہماری کا کیوں کہا؟“  
 ”میں نے منع بھی کیا تھا اُسے۔ خیر تم سناؤ۔ وہاں شکیل کے ہاں سب خیریت ہے ناں: بچوں کی چھٹیاں تھیں۔ سیا بھی آجانی تم لوگوں کے ساتھ!“ اماں جی موضوع بدل گئیں۔  
 ”ہاں سیا جہابی کا دل بھی چاہ رہا تھا۔ لیکن شکیل جہابی کو کھانے وغیرہ کی پرہیز ہو جاتی۔ اس لیے نہ آئیں۔ آپ آپ جائیے گا۔“  
 اُس نے کہا تو اماں جی قصداً ان سنی کر کے عدیل سے کہنے لگیں۔

”عدیل! یہ تو ٹھکی ہوئی آئی ہیں۔ اس وقت چائے تم بنا لو۔“  
 ”نہیں! اماں جی!“ وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔ ”عدیل بھائی کیوں بنائیں گے!“  
 ”بناتے دو۔ بنانے دو۔ میمونہ جہابی کو موقع مل گیا۔“ چلو عدیل شاباش کام کیا کرو۔“

”نہیں بھائی! یہ کام میرا ہے۔“  
 وہ تکرر جانے لگی کہ نیل کو ریڑھیاں اُترتے دیکھ کر وہیں رک گئی۔ پتا نہیں کس وقت وہاں جاگ اُٹھا تھا۔ حالانکہ اُسے ابھی طرح پتا تھا کہ اس وقت اوپر کوئی نہیں ہوتا۔ پھر بھی آخری سیڑھی تک اُتر کھینچے لگا۔

”بھئی! اور کوئی نہیں ہے۔“  
 ”بابا! تو شام آئیں آتے ہیں بیٹا اور میں بھی آجائیں گی۔ آپ جاؤ اماں جی کے پاس بیٹھو، چائے پیو گے ناں!“  
 وہ اُسے نرمی سے سمجھا کر کہیں میں آگئی۔ اور ابھی چوہا جلا کر کتلیں میں پانی رکھ رہی تھی کہ عدیل بھا اُس کے پیچھے آگئے۔

”میں بناؤں گی جہابی!“ وہ یہی سمجھی اُس کا ہاتھ پٹانے آئے ہیں۔  
 ”نیل! کیا کہہ رہا تھا؟“ انہوں نے اُس کی بات نظر انداز کر کے پوچھا۔ تو وہ معروف سے انداز میں بولی۔

”بچہ ہے ناں، اتنے دن ماں باپ سے دور رہا۔ اپنی کاپو پھر رہا تھا۔“  
 ”سوفی! عدیل جہابی اُسے معروفیت سے نکال کر کہنے لگے۔ اس بچے کو نہیں کسی طرح بھلا نا۔“  
 ”کیا مطلب؟“ وہ ان کے لہجے پر ہلک گئی۔ اور انہوں نے پہلے اپنے پیچھے دیکھ کر گویا کسی نہ ہونے کا یقین کیا پھر دروازہ دبا کر بولے۔  
 ”بڑے بھائی نے بیلہ جہابی کو طلاق دے دی ہے۔“

”کیا؟“ اُسے شدید دھچکا لگا تھا۔ انتہائی دکھ سے بولی: ”کیوں عدیل بھائی؟ بڑے بھائی نے ایسا کیوں کیا؟“  
 ”میرے حساب سے تو بڑے بھائی کو یہ قدم بہت پہلے اٹھانا چاہیے تھا۔ پتا نہیں اتنی دیر کیوں کی۔“  
 عدیل بھائی بڑے آرام سے کہہ کر کہیں سے نکل گئے۔ اور اُس کے آئسو ہلک پر پڑے۔ حالانکہ بیلہ جہابی اس گھر میں اجنبیوں کی طرح رہتی تھیں۔ پھر بھی اُسے دکھ ہورہا تھا۔

اُس کے خیال میں نیل کو بھلا نا مشکل نہیں تھا۔ کیونکہ پہلے بھی وہ سارا وقت اُس کے اور اماں جی کے پاس رہتا تھا۔ بس رات میں سونے کے لیے ہی اوپر جاتا۔ تب بھی بیلہ جہابی کو اُس کی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔ اور ابھی بھائی کی طرف سے نیل کو ملنے یا لینے کا کوئی مطالبہ نہیں ہوا تھا۔ جس سے ظاہر تھا کہ وہ اُسے اپنے پاؤں کی زنجیر نہیں بنانا چاہتیں۔ اور حیرت انگیز طور پر نیل کے دل میں اُس عورت کے لیے اتنا گلاز تھا کہ اس کی کمی کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے بیمار پڑ گیا۔ رات رات بھر جاگ کر انتظار کرتا پھر اُس سے پوچھتا۔

”بھئی! تم کیوں نہیں آئیں؟“  
 ”میں کہاں جا رہی تھی؟“  
 ”بابا! کہہ رہے تھے۔ تم اب کبھی نہیں آئیں گی۔ میں جو بھو جو؟“

وہ اُس کے سوالوں سے کبھی پریشان ہو جاتی، کبھی حیران۔ اور حیرت اُسے اسی بات پر رہتی کہ وہ کیسے اُس عورت سے اتنی محبت رکھتا ہے، جو اسے صرف جنم دینے کی سزاوار تھی۔ بہر حال وہ جو سوچ رہی تھی کہ اسے بھلا نا مشکل نہیں ہے۔ تو یہ آسان بھی نہیں تھا۔ اُس کا سارا وقت اس کا دھیان ادھر ادھر رکھنے میں گزر جاتا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ وہ تعلیم سے فارغ ہو چکی تھی، ورنہ اماں جی کسی طرح نیل کو نہیں بھلا سکتی تھیں۔

بڑے بھائی نے پتا نہیں کونسی معروفیت ڈھونڈ لی تھی۔ رات میں اتنی دیر سے آتے تو اُس کے کمرے میں بس دروازے میں کھڑے کھڑے پوچھتے۔

”نیل سو گیا۔“  
 ”نہیں زیادہ تنگ تو نہیں کرتا؟“  
 ”اور وہ جی اور جی نہیں سے زیادہ کچھ نہیں کہتی تھی۔ لیکن اندر ہی اندر کڑھتی ضرور تھی کہ ماں نے تو چھوڑا ہی باپ بھی اتنا لا پرواہ ہو گیا ہے۔“

”مگر اُنک بڑے بھائی کو تو خاص ہونا چاہیے۔“ اُس وقت وہ میمونہ جہابی کے سامنے کڑھ رہی تھی۔ اسی لیے نیل زیادہ حساس ہو رہا ہے کہ ماں باپ دونوں میں سے کوئی اُسے نظر نہیں آتا۔ ہم اس سے کتنی محبت کریں۔ اس کے ماں باپ تو جن ہیں سکتے۔“

”ہوں!“ میمونہ جہابی گو کہ دیکھ اُسے ہی رہی تھیں لیکن جلنے دھیان کہاں تھا۔  
 ”ایمان سے جہابی! مجھے بڑا ترس آتا ہے۔ رات میں کتنی بار چونک کر اٹھتا ہے پھر ہم کمرے سے سینے میں منہ چھپا لیتا ہے۔“

”ہوں!“ میمونہ جہابی کا انداز ابھی بھی سوچتا ہوا تھا جس پر اُس نے ڈک کر نہیں دیکھا پھر ان کا ہاتھ ہلکا کر پوچھنے لگی۔  
 ”آپ کیا سوچ رہی ہیں؟“

”میں نیل کا سوچ رہی ہوں اور ساتھ ساتھ ہمارا بھی“ میمونہ جہابی نے بغیر جھجکے کہا تو وہ متعجب ہوئی۔  
 ”میرا؟“

”ہاں تم جو نیل کو اپنا اتنا عادی بنا رہی ہو تو یہ اچھی بات نہیں ہے۔ کل کو جب ہتھاری شادی ہو جائے گی تو وہ کیا کرنے گا؟“  
 میمونہ بھائی اُسے جھٹکتے ہوئے بولیں: ”میں یہ نہیں کہتی کہ اس کا خیال نہیں رکھو البتہ اُسے بالکل اپنا محتاج نہیں بنادو ورنہ وہ ایک بار پھر لوٹ جائے گا۔ اس سے ہتھاری دُوری برداشت نہیں ہو گی۔ میری بات سمجھ رہی ہوں نا؟“  
 ”ہوں۔“ اُس نے پُرسوج انداز میں سر ہلایا پھر کہنے لگی: ”میں کیا کروں۔ وہ سارا وقت میرے

ساتھ لگا رہتا ہے۔“  
 ”تھوڑا نظر انداز کرو گ، تب وہ ادھر ادھر کھینے میں لگے گا، اور میں اماں جی سے کہوں گی، اُسے اپنے پاس سلا یا کروں۔“

”نہیں بھائی! ابھی نہیں۔“ اس کا اپنا دل بھی تو ایسا ہی نرم تھا۔  
 ”بالکل مت بند ہو۔ ہتھارے جانے کے بعد ہم سب کو مشکل ہوگی۔ میمونہ بھائی نے لولا پھر اُسے متوجہ کر کے پوچھنے لگیں: ”سو ابھی تک وہ آیا نہیں۔ کب آئے گا؟“  
 ”کوئی وقت تو مقرر نہیں کیا تھا۔ بس یہ پوچھا تھا کہ میں کب جاؤں گی؟ وہ اپنے ناخون کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”کراچی آئے ہوئے بھی ہیں پندرہ بیس دن ہو گئے ہیں۔ اُسے کم از کم فون تو کرنا چاہیے تھا۔ کچھ حالات کا پتہ چلا کہ وہ اپنے ماں باپ کو راضی کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوا، میں غلط تو نہیں کہہ رہی ناں!“  
 اُس کے دیکھنے پر میمونہ بھائی نے پوچھا تو ذرا سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔  
 ”اچھا سنو، میں اپنے طور پر اماں جی سے ذکر کروں، میرا مطلب ہے یونہی پہلے ہتھاری شاد

کی بات چھوڑ دوں گے پھر اس کا نام لوں گی۔“  
 میمونہ بھائی نے اچانک کس خیال کے تحت کہا۔

وہ کچھ نہیں بولی، بس سر جھکا لیا گویا ان کی بات سے اتفاق کر لیا تھا۔  
 اور اُس رات نیل کو کہانی سناتے ہوئے، وہ اپنی ہی کہانی میں کھو گئی۔ میمونہ بھائی ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ شاہ سکندر کو فون فرود کرنا چاہیے تھا۔ پتا نہیں کن کاموں میں الجھ گیا ہے۔ اور جانے؟  
 نے اپنے گھر میں میرا ذکر کیا بھی ہے یا نہیں۔ یا شاید! ”  
 ”بھئی!“ نیل اُس کی ادھوری کہانی میں الجھ رہا تھا۔ ”نہزادہ نہیں آئے گا تو نہزادی کی شاد

کس سے ہوگی؟“  
 ”نہزادہ، کیوں نہیں آئے گا۔ فرود آئے گا؟“  
 وہ اپنے خیال میں بولی پھر چونکی تو ہنس پڑی اور نیل کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بولی تھی

”نہزادہ فرود آئے گا۔ بٹا۔“  
 ”اور اگر وہ راستہ بھول گیا؟“  
 ”جیت کرے والے راستہ نہیں بھولتے البتہ ان کے راستے میں رکاوٹیں کڑی کر دی جاتی ہیں۔  
 جنہیں دور کرنے میں کچھ وقت لگتا ہے۔“  
 اُس نے سوچتے ہوئے پلکیں موند لیں۔

شاہ سکندر سیدھا احمد حسن کے پاس آتا تھا۔ کیونکہ اُس کے اکاونٹ میں جو رقم تھی، اُسے وہ ادھر رہائش اور دوسرے اخراجات میں خرچ نہیں کر سکتا تھا۔ یعنی بہت احتیاط سے چلنے کی ضرورت تھی۔ اور اُس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جو کسی بھی خرچ سے پہلے اُسے سوچنا پڑا تھا۔ ورنہ وہ

شانے کا عادی تھا۔ اور کبھی حساب بھی نہیں رکھا۔ جیسی اب اُسے مشکل پیش آرہی تھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اتنی رقم میں وہ کوئی چھوٹا موٹا گھر خریدے یا کا دو بار شروع کرے اور کاروبار کا بھی اُسے کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

بالآخر اُسے اپنا مسئلہ احمد حسن کے سامنے رکھنا پڑا۔ گو کہ اُس نے آتے ہی اُسے بتا دیا تھا کہ اپنے والدین کے ناراضی ہو کر سب کو فچوڑ آیا ہے اور سب بھی بتایا البتہ اپنی شادی چھپا گیا تھا۔ لیکن صرف اس کا احساس برتری تھا۔ جسے وہ قائم رکھنا چاہتا تھا۔ اُسے یہ ہرگز گوارا نہیں تھا کہ وہ کسی ایک پہلے سے کم وزن نظر آئے۔  
 ”میں اپنی زندگی خود بناؤں گا۔ اسیہ کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ گو کہ میرے اور بھی بہت دوست ہیں لیکن مجھے سب سے زیادہ تم پر بھروسہ ہے۔ اسی لیے میں تمہارے پاس آیا ہوں احمد حسن تم کو پورے

لہجے سے میرا ساتھ دو گے۔“  
 اُس نے احمد حسن سے کہا تو جواب میں وہ لولا تھا۔

”تم نے میرا مان بڑھا دیا ہے شاہ سکندر! میں ہر مل تمہارے ساتھ ہوں۔“  
 ”میں تمہیں زیادہ تنگ نہیں کروں گا۔“ اُس نے کہا۔

اور پھر دس تین روز وہ خود ہی سوچتا رہا کہ پہلے اُسے کیا کرنا چاہیے۔ جب سمجھ میں نہیں آیا تب احمد حسن کو بلا لیا۔ اور اپنی چیک بک اُس کے سامنے رکھتا ہوا بولا۔

”میرے پاس کل اتنی رقم ہے۔ جبکہ فوری حل طلب مسئلے دو ہیں گھر اور کاروبار۔ بتاؤ اتنی رقم میں یہ دونوں مسئلے حل ہو سکتے ہیں۔“  
 احمد حسن اُس کی چیک بک کا جائزہ لے کر سوچ میں پڑ گیا اور غالباً فوری طور پر اُس کی جھ میں بھی

ہیں آیا۔ جب کہنے لگا۔

”اتنی جلد ہی کیا ہے بار! اطمینان سے سوچیں گے۔“  
 ”نہیں احمد! میرے پاس اطمینان سے سوچنے کا وقت نہیں ہے۔ ادھر اسیہ انتظار میں ہوگی اور میں

اُس کے پاس آئی وقت جاؤں گا تب میری اپنی کوئی حیثیت ہوگی!“  
 اُس نے اتنی سنجیدگی سے کہا کہ احمد حسن کو پھر سے سوچنا پڑا اور کتنی دیر بعد اُسے دیکھ کر مسکرایا کہ وہ فوراً بولنے لگا۔

”کچھ سمجھ میں آیا؟“

”ہاں ایک صورت ہے۔ اور وہ یہ کہ فی الحال گھر خریدنے کے بجائے کوئی اپارٹمنٹ کرائے پر

لے لو، اُس میں کچھ زیادہ خرچ نہیں ہوگا۔ باقی رقم سے کوئی بزنس شروع کر دو۔“

احمد حسن دونوں مسئلوں کا۔ فوری حل بنا کر بولنے لگا۔

”کوئی بزنس ہے تمہارے ذہن میں یا وہ بھی مجھے سوچنا پڑے گا۔“

”مل کر سوچیں گے۔“ وہ ہنسا۔ اُس کی ہنسی اس بات کی غماز تھی کہ اُسے احمد حسن کا مشورہ پسند

آتا تھا۔

پھر اگلے کئی دن اُسے گھر دیکھنے میں لگ گئے۔ اب تک اُس کا جو معیار زندگی رہا تھا ظاہر ہے وہ اکیلم سے اُس سے بہت نیچے نہیں آ سکتا تھا۔ اور اُس معیار کو برقرار رکھنا بھی مشکل تھا۔ اس لیے اُس نے ایک اچھے صاف ستھرے علاقے میں تین کمروں کا اپارٹمنٹ کرائے پر لے لیا۔ پھر اُسے یکسر میٹ کرنے میں لگا۔ کہ اپنے حساب سے اُس نے بہت بل سے کام لیا تھا۔ پھر بھی بہت خوبصورت

نہیں لگتا۔

اُس کے بعد یوں اطمینان سے ہو گیا جسے سارے مسئلے حل ہو گئے ہوں۔ یا شاید اُس کے نزدیک مل مسئلہ ہی تھا۔ اور روزگار کی کیونکہ پہلے کبھی اُسے فکر نہیں کرنی پڑی تھی اُس لیے لا شعوری طور پر وہ



کچھ مطمئن سا تھا، جیسے یہ مسئلہ اپنے آپ حل ہو جائے گا۔ یا ہو سکتا ہے اتنی بڑی جائیداد میں اُسے اپنے حقے کا خیال ہو۔

بہر حال گھر کی سنگت کرتے ہی وہ آسمیہ سے ملنے کو بے چین ہو گیا۔ لیکن وہ اس طرح نہیں جا سکتا تھا۔ بلکہ جیسا کہ اُس کے کہہ آیا تھا کہ اپنے گھر والوں کو لے کر آئے گا اور اب گھر والے اپنے حقے کو اُس نے احمد حسن اُس کی والدہ اور بہن نانکہ کو اپنے ساتھ چلنے پر آمادہ کر لیا۔ نانکہ کو بھی اس نے اپنے بڑے شوق سے تیار ہو گئی اور تیار تو اُس کی اتنی بھی ہو گئی تھیں لیکن انہیں دھڑکا لگا ہوا تھا۔

”بٹا! متارے ماں باپ ہم سے ناراض نہیں ہوں گے کہ ان کی اجازت کے بغیر ہم نے تمہا

شادی کرادی یا“  
”آپ سے کیوں ناراض ہوں گے آنٹی! آپ اپنی مرضی سے تو نہیں جا رہی ہیں۔ میں آپ کو لے جا رہا ہوں۔ اور البتہ بھی نہیں ہے کہ میرے والدین کو ضرر ہی نہیں انہیں سب پتا ہے۔ بس یہ ہے وہ یہاں میری شادی کے حق میں نہیں ہیں۔ اسی لیے تو میں گھر چھوڑ آیا ہوں۔ اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ میرے گھر والے زیادہ عرصہ میری دوری نہیں سہہ سکیں گے، میرے پاس آنے کے لیے انہیں ہر چاہیے ہوگا۔ اور وہ یہاں ظاہر ہے کہ ان کی بہو ہوئی“

”اُس نے بڑے اعتماد سے انہیں یقین اور اطمینان دلایا۔ حالانکہ اُسے ایک فی صد بھی یقین نہ تھا۔

”ہاں، ماں باپ کو اولاد کی خوشی کے سامنے جھکتا ہی پڑتا ہے“ آنٹی نے کہا تو وہ اندر ہوا اطمینان سے ہر کر بولا۔

”جی، اور ان لوگوں سے بھی آپ نے یہی کہنا ہے۔“  
”نہیں نہیں کر سں سکندر بھائی، ان کے سامنے میں آپ کی وہ تقریفیں کروں گی وہ تقریفیں کے جوش کے سامنے اس نے بند باندھ دیا۔

”بس۔ تم براہ مہربانی خاموش ہی رہنا“  
”کیوں؟“

”اس لیے کہ تم خاموش اچھی لگتی ہو“ اُس نے مذاق میں ڈالا پھر احمد حسن کو چلنے کا اشارہ کیا تو گھاڑی کی چابی اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔

شام اتر رہی تھی جب اُس نے آسمیہ کے گھر میں قدم رکھا۔ حسب سابق آبا جی بڑی خندہ پہ سے اُس سے ملے پھر اُس کے ساتھ اور لوگوں کو دیکھ کر کچھ ٹھٹھکے تو وہ فوراً تعارف کروانا ہوا بولا۔

”یہ میرے عزیز ہیں احمد حسن یہ ان کی والدہ اور سسر۔“  
”اچھا، اچھا۔ بہت خوش ہوں، بھئی، بھئی آپ لوگ۔“

آبا جی پر قدرے لوکلہاٹ سوار ہو گئی تھی، انہیں بٹھا کر فوراً کمرے سے نکل گئے۔ کچھ دیر بعد وہ آئے تو عدیل کے ساتھ تھے اور پیچھے اتان بھی۔ ایک بار پھر تعارف ہوا اور جب اتان جی پیچھے تو بولے

”اچھا۔“ اُسے کچھ تو کہنا تھا۔

”آپ شاہ پور سے آئے ہیں؟“ پہلا سوال ہی غیر متوقع تھا۔ آنٹی نے بے اختیار شاہ سکندر کو دیکھا لیکن اس سے پہلے نانکہ بول پڑی۔

”نہیں! ہم لوگ یہیں رہتے ہیں اور اب تو سکندر بھائی بھی یہیں آگئے ہیں“

شاہ سکندر نے واقعی حیران ہو کر اس طرحی کو دیکھا جس نے پہلے مرحلے پر ہی اصل موضوع پر پیش رفت کر دی تھی۔ پھر بات کو مزاح کا رنگ دے کر بولا۔

”جی ہاں۔ ایک بھائی پر رعب جاکر اس طرحی کا دل نہیں بھرتا تھا اس لیے مجھے بھی یہیں

”سنوں! کجا بیٹیوں پر ہی تو بس چلتا ہے۔ اور محبت بھی بہت کرتی ہیں! اماں جی نے پیار سے نانکہ کو دیکھتے ہوئے کہا پھر پوچھنے لگیں۔

”جی، اب میڈیکل کے دوسرے سال میں گئی ہوں“

”ماشاء اللہ۔“

”آپ کی بیٹی بھی تو غالباً“ آنٹی آسمیہ کے بارے میں پوچھتے ہوئے قدرے جھجک گئیں۔

”جی، میری کابلیں آخری امتحان تھا، اماں جی سادہ غورث تھیں، اپنے انداز میں جواب دیا۔

”نانکہ شوق سے پوچھنے لگی۔

”کیاں ہیں وہ۔ میں مل سکتی ہوں اُن سے؟“

”ہاں ہاں کیوں نہیں، اندر چل جاؤ یا میں بلاتی ہوں اُسے“

”نہیں! میں جا رہی ہوں“ اور کچھ شوخ نظروں سے شاہ سکندر کو دیکھا۔ لیکن وہ عدیل سے کوئی بات نہ کرتا تھا۔ تب وہ احمد حسن کو کچھ اشارہ کر کے ڈرائنگ روم سے نکل کر برآمدے تک آگئی۔ اس کے بعد کچھ نہیں آیا کہاں جاتے۔ سامنے کوئی نظر بھی نہیں آ رہا تھا۔ کچھ شش و پنج میں پڑ گئی۔ تبھی

”آپ یہاں کیوں کھڑی ہیں؟“

”وہ۔ مجھے آسمیہ اجی کے پاس جانا ہے!“ اُس نے کہا تو عدیل آئے کہہ کر آگے چل پڑے۔ وہ ڈرائنگ کے پیچھے چل پڑی۔ اور آسمیہ کے کمرے میں داخل ہوئی تو عدیل بہن کو غافل کرتے ہوئے

”آسمیہ! یہ شاہ سکندر کی سسر ہیں“

آسمیہ کا دل تیار کی بڑے زور سے دھڑکا اور چہرے پر ایسے رنگ اترے جنہیں عدیل نے

دیکھ کر دیکھا پھر قصداً نظریں جڑا کر کمرے سے نکل گئے۔

”اٹ! مجھے آپ سے ملنے کا آنا شوق تھا“

عدیل کے جاستے ہی نانکہ نے اپنے جذبات کا برملا اظہار کیا۔ اور بڑھ کر آسمیہ کے گلے لگ کر پھر پیٹتی ہوئی گئی۔

”آپ واقعی بہت اچھی ہیں“

”شکریہ۔“ آسمیہ اُس کے انداز پر بے ساختہ مسکرائی۔ ”نام تو بتایا نہیں تم نے اپنا۔“

”نانکہ۔ میڈیکل میں پڑھتی ہوں۔“ اُس نے نام کے ساتھ تقدیم بھی بتائی تو آسمیہ نہ صرف خوش ہو کر اچھی لگی کہ شاہ سکندر نے تو نہیں بتایا تھا کہ اُس کی کوئی بہن میڈیکل میں پڑھتی ہے۔

”آپ کو بھی یقین نہیں آیا؟“ اُس کے چونکنے اور اُٹھنے پر نانکہ جو بھیجی، اسی حساب سے کہنے لگی۔

سکندر بھائی بھی یقین نہیں کرتے حالانکہ انہوں نے خود میرا میڈیشن کر دیا تھا۔

مہر النساء حیران رہی کہ شاہ سکندر کس بات پر ناراض ہو کر گیا ہے۔ کون اُسے ستانا بھی نہیں؟  
 بس اُسی روز جب وہ بین دن کے رہ کر آئی تھی تو بابا جان نے اُسے اپنے کمرے میں بلا کر کہا تھا،  
 ”اب یہی بتا کر اٹھ رہے۔ یہاں کی ہر شے پر تمہارا حق ہے تو عزت و ناموس کی پاسداری نہ  
 فرض ہے۔ اور مجھے یقین ہے تم اپنے فرض کے کوٹھا ہی نہیں کرو گی۔  
 اور اب جو میں تم سے کہہ رہا ہوں اسے غور سے سنا، شاہ سکندر مجھ سے ناراض ہو کر یہاں سے  
 چلا گیا ہے۔ اس کی ناراضگی مجھ سے ہے تم سے نہیں۔ اس لیے تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں  
 ہے۔ وہ جہاں بھی گیا ہے۔ تمہیں اپنے پاس بلانے کا۔ اس کے لیے تمہیں صبر سے انتظار کرنا  
 ہے کیونکہ جب اس کا غصہ ٹھنڈا ہوگا۔ تب ہی تمہارے بارے میں سوچے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے  
 غصہ اترنے پر وہ خود ہی یہاں آجائے۔ بہر حال تم کسی سے فکر نہیں کرنا۔ تمہارے ماں باپ تک  
 یہ معلوم نہیں پڑنا چاہیے کہ شاہ سکندر یہاں سے چلا گیا ہے۔ وہ یہیں موجود ہے سمجھ رہی ہو نا  
 اور وہ نہ سمجھتی تب بھی اُسے سمجھنا تھا کہ وہ کہیں باہر سے نہیں آئی تھی۔ اسی خاندان کی لڑکی تھی  
 ایسی ہی حویلی کی پروردہ جہاں پیدا ہوئے ہی لوگوں کے ہنر و فن پر قفل لگا دیے جاتے ہیں۔  
 حقوق و فرائض نبھانے والے بابا جان یہ بھول گئے کہ اُس کے سینے میں ایک دل بھی ہے جس پر  
 بد قسمتی کے بہت پہلے محبت کی لے پر دھڑکنا سیکھ لیا تھا۔

کاش بابا جان شاہ سکندر کی ناراضگی کا سبب بھی بتاتے۔ وہ اپنے طور پر قیاس کرتے کرتے تو  
 گئی تھی۔ پھر انتظار کے دن بھی طویل ہوئے جا رہے تھے جس سے اُس کی سوچیں نیارخ اختیار  
 لگیں۔ یقیناً اُس نے جو بابا جان کی بات پر یقین کر لیا تھا کہ شاہ سکندر کی ناراضگی اُس سے نہیں ہے۔  
 اور یہ کہ وہ اُسے اپنے پاس بلانے کا۔ تو اب اُسے لگ رہا تھا جیسے بابا جان نے اُس سے  
 کئی جتنی اُسے سہلا یا تھا۔ ورنہ اگر نہ ہی سمجھتا تو شاہ سکندر کم از کم اُسے فرود پتا کر جاتا۔  
 ایک رات کی دہن کو چھوڑ کر جانے والا۔ اُس کے ذہن میں اچانک جھماکا ہوا تھا۔  
 ”بہر حال۔!“



”ہاں ہر جائی ہی ہو سکتا ہے۔“ مہر النساء اس خیال پر گرفت مضبوط کر کے اپنی شب عروس کے ان  
 سوچنے لگی، جب شاہ سکندر اس کے پاس آیا تھا۔ اور اسے یاد آیا اس کے اندر پانے کا احساس نہیں کھوہ  
 تھا۔ پشیمالی اور وحشت تھی۔  
 ”یہ اچھا نہیں ہوا مہر النساء! تم نے مجھے روکا کیوں نہیں۔؟“  
 ”کیا مجھ سے ہو تم اس طرح میرا دل جیت لو گی۔“  
 شاہ سکندر کے لہجے کی کئی اسے اب محسوس ہوئی تھی تو سارے ارادوں پر سے پردے سرکنے لگے۔  
 اگر وہ اپنی روایات سے بغاوت کا حوصلہ رکھتی تو اسی وقت بیچ بچ کر حویلی میں سر اٹھاتی لیکن اس کے برعکس  
 سے سوچ رہی تھی۔

”تم نے میرے جذبوں کو پامال کر کے اچھا نہیں کیا شاہ سکندر حیات! اس کے باوجود میں تمہارا انتظار  
 کہ یہ میری مجبوری نہیں ضد ہے۔“  
 اور جب ایک کمزور عورت کسی بات کو اپنی ضد بنالے تو پھر وہ اتنی کمزور نہیں رہتی۔ فوراً تو نہیں لیکر  
 دھیرے مہر النساء کو احساس ہو گیا کہ وہ اتنی کمزور نہیں ہے بلکہ اگر چاہے تو اس حویلی کے در و دیوار ہلا  
 بدلے میں شہر مانو کی خوشیاں چھین کر اور اس سچ پر اس نے بس کچھ دیر کو سوچ کر سر جھٹک دیا۔ اس کے  
 اس طرح وہ شاہ سکندر سے اپنی توہین کا بدلہ نہیں لے سکتی تھی۔ وہ تو اسے وہ ذمہ لگائے گی جو اس کے

سے سونیا بھاگتی ہوئی آئی۔ اس کے پیچھے احمر بھی تھا۔

”پھوپھو! احمر کو دیکھیں، میرے بال بونج رہا ہے۔“ سونیا نے اس کی ناگوں سے لپٹ کر احمر سے بچنے کی لیکن احمر کا ہاتھ اس کے بالوں تک پہنچ چکا تھا۔

”پھوپھو!“ سونیا زور سے چیختی تو وہ جو اس اچانک افتاد سے پریشان ہو گئی تھی۔ احمر کی بدتمیزی پر اسے کر پیچھے ہٹنا پھر دونوں کو ڈانٹنے لگی۔

”ہر وقت لڑتے رہتے ہو۔ کوئی اور کام نہیں ہے تمہیں؟“

”اس نے میری لٹو کیوں پھاڑی ہے۔“ احمر کا لہجہ بھی بس نہیں چل رہا تھا اسے کھینچ کر مارے۔

”یہ بے ایمانی کر رہا تھا۔ میری گوشت۔“

”بس خاموش۔“ وہ سختی سے ٹوکتے ہوئے بولی۔ ”چلو جاؤ۔ اپنے اپنے بیک ٹھیک کرو، صبح سے اُٹے۔“

”میں نہیں جاؤں گا۔“ احمر کے روٹھے لہجے پر وہ قدرے نرم پڑ گئی۔

”کیوں۔ تم کیوں نہیں جاؤ گے۔“

”اس نے میری لٹو کیوں پھاڑی۔“

”لٹو اور آجائے گی۔ اتنی سی بات پر لڑتے نہیں ہیں۔ چلو جاؤ شاباش۔ اسی وقت اپنے میکس وغیرہ ٹھیک اس نے احمر کو پکارتے ہوئے کہا پھر آدھے میں آئی تو نیل اس سے کہنے لگا۔

”پھوپھو! میں نے اپنا بیک ٹھیک کر لیا ہے لیکن میرا یونیفارم نہیں مل رہا۔ پتا نہیں می نے کہاں رکھا۔“

”وہیں الماری میں ہو گا۔ اچھا میں خود نکال دوں گی۔“

”پھوپھو! نیل بھائی کی می کہاں چلی گئیں؟“ ایسے موقعوں پر سونیا یہ سوال ضرور کرتی تھی۔

”پتا نہیں۔“ وہ قصداً لاروائی سے کہہ کر عمر کی طرف متوجہ ہو گئی اور اس کی زبان میں اس سے بولے۔

”عمر بھی انکھول جائے گا لیکن ابھی تو یہ بہت ٹوٹا (چھوٹا) ہے۔“

معصوم بچہ بیمار کی زبان پر کھلکھلائے لگا تو نیل ”احمر اور سونیا کے چروں پر بھی مسکراہٹیں دوڑ گئیں

شوق سے اسے دیکھنے لگے۔

پھر سب سے پہلے بڑے بھیا۔ اماں جی کے کمرے سے نکل کر آئے اور ان سب پر ایک سرسری

سیدھے اوپر چلے گئے۔ ان کے بعد خلیل بھائی آئے تو اسے سب بچوں میں گھرے دیکھ کر کہنے لگے۔

”میمونہ تو فاریغ ہو چکی ہیں۔ کوئی کام نہیں کرتیں، بچوں کو بھی تمہارے سر پر چھوڑ دیتی ہیں۔“

”یہ کس کی تعریف ہو رہی ہے۔“ میمونہ بھابھی پیچھے سے سنتی ہوئی آگئیں۔

”آپ کی۔“ وہ بے ساختہ مسکرا کر بولی تو میمونہ بھابھی نے ناک سکیڑ کر شوہر کو دیکھا پھر اس سے کہ

”یہ میری ایسی ہی تعریف کر سکتے ہیں۔“

”ایسی یا ویسی۔ تعریف ہی کی سے ناں۔“ خلیل بھائی مسکراہٹ ہونٹوں میں چھپا کر بولے۔

”ارے آپ کیا تعریف کریں گے میری۔ میں تو۔۔۔“ شابانہ انداز میں کہتے ہوئے میمونہ بھابھی کو پیچھے سے عدل بھائی ان کی بات پوری کرتے ہوئے بولے۔

”سر! تعریف ہیں، چلیے اسی بات پر کھانا لگا دیں اگر تیار ہے تو۔۔۔“

”جی بھائی! کھانا تیار ہے۔ میں لگاتی ہوں۔“ وہ فوراً ”کھڑی ہو گئی۔ اور کچن کی طرف جاتے جاتے

خلیل بھائی کہہ رہے تھے۔

”جب آسید چلی جائے گی تب کیا روگی۔“

پتا نہیں میمونہ بھابھی نے کیا جواب دیا۔ وہ سن نہیں سنی۔ کوشش بھی نہیں کی۔ اور کچن میں آکر گئی۔

پھر کھانے کے بعد نیل نے اسے اپنا یونیفارم یاد دلایا تو وہ اسی وقت اوپر چلی آئی۔ بڑے بھیا کھلی ہمت پر اکیلے تھے۔ انہیں دیکھ کر اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔ جانے انہوں نے خود کو اتنا تنہا کیوں کر لیا تھا۔ اس نے سوچا وہیں واپس لپٹ جائے لیکن جس کام سے آئی تھی، وہ بھی ضروری تھا۔ کچھ شش و پنج میں کھڑی تھی کہ بڑے نے اسے دیکھ لیا اور پکار کر بولے۔

”آسید! کیا بات ہے بیٹا۔؟“

”دست۔“ وہ قدم بڑھا کر روشنی میں آکر بولی ”میں نیل کا یونیفارم لینے آئی تھی۔ صبح اسے اسکول جانا ہے۔“

”مکمل کھل گئے؟“ انہوں نے قدرے عجیب سے پوچھا۔

”جی مکمل سے کھل رہے ہیں۔“ اس نے بتایا اور ان کے خاموش رہنے پر پوچھا۔

”میں اس کا یونیفارم لے لوں۔۔۔؟“

”ہاں ہاں۔“ وہ اپنے خیال سے نکل کر بولے۔ ”دیکھو وارڈ روپ ہی میں ہو گا۔ اور اس کے شوز وغیرہ۔“

”جی میں لے لیتی ہوں۔“ وہ کھتی ہوئی اندر چلی گئی اور کچھ دیر بعد نیل کی ساری چیزیں لے کر نکلی تو بڑے بھیا موجود نہیں تھے۔ پتا نہیں کہاں چلے گئے تھے۔ وہ یونی دیوار کے پاس رک کر باہر دیکھنے لگی ابھی عقب سے

آواز سنائی دی۔

”مل گئے کپڑے۔۔۔“

”جی!“ وہ نہ صرف چونکی بلکہ اس کا دل بہت زور زور سے دھڑکنے لگا۔ عجیب سا خوف محسوس ہوا جیسے بھیا انسان نہیں جن ہوں اور غائب ہوئے اور پھر حاضر۔ وہ ان کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے پونہی

رکتے دل کے ساتھ نیچے آئی تو میمونہ بھابھی چائے لیے اس کے کمرے میں موجود تھیں۔ دیکھتے ہی پوچھنے لگیں۔

”کہاں چلی گئی تھیں۔؟“

وہ فوراً ”جواب نہیں دے سکی۔ نیل کا بیک ریک پر رکھا پھر الماری کھول کر کپڑے ڈنگر میں اڑکا ہے۔ اس کے ران کے پاس بیٹھے ہوئے بولی۔

”میں اوپر گئی تھی۔ نیل کی چیزیں لینے۔“ پھر ایک دم ان کے ہاتھ تھام کر کہنے لگی۔ ”مجھے بڑے بھیا سے بہت لگا۔ اتنے پر سراسر لگ رہے تھے۔“

”اس کا مطلب ہے، جلدی ان کی شادی کرانی پڑے گی۔“ میمونہ بھابھی ہنستے ہوئے بولیں تو وہ ان کے ہاتھ

ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔

”آپ کو تو ہر وقت مذاق سوچتا ہے۔“

”یہی تو مشکل ہے کہ تم لوگوں کو میری ہر بات مذاق لگتی ہے۔ حالانکہ میں بہت کم مذاق کرتی ہوں۔“ میمونہ

بھابھی ایک دم سنجیدہ ہو کر بولیں اور اس بار اسے ہنسی آگئی۔

”واقعی؟“

”جناں! ذرا بتاؤ بڑے بھیا کی شادی میں مذاق کی کیا بات ہے، ساری زندگی انہیں ایسے تو نہیں رہتا۔ ماشاء اللہ ان جہان ہیں۔ دوسری بیوی آئے گی تو پہلی کا زخم بھرے گا۔ اور وہ یوں پر سراسر نظر نہیں آئیں گے۔“

میمونہ بھابھی باقاعدہ اسے ٹیکہ دینے بیٹھ گئیں اور کچھ غلط بھی نہیں کہہ رہی تھیں۔ ”جی! یہ حیرت سے انہیں

بے ضرور ہے کہ میری بات میں مزاح کا رنگ شامل ہوتا ہے لیکن وہ مذاق نہیں ہوتا۔ سمجھیں تم یا مزید

نہیں اس۔ آج کے لیے اتنا کافی ہے۔“ وہ فوراً ”بول پڑی۔“

”ٹھیک ہے میں جا رہی ہوں۔ صبح جلدی اٹھنا ہے۔“ میمونہ بھابھی اٹھتے ہوئے بولیں تو اس نے پہلے بے

”اصل بات تو بتائیں کیا فیصلہ ہوا۔؟“

”اتنی جلدی فیصلے نہیں ہوتے ابھی تو سب اپنی اپنی رائے دے رہے تھے بس وہی بار والدین کو اتنا چاہیے یا اگر وہ بعد میں بھی نہیں مانے تو وغیرہ وغیرہ۔“ میمونہ بھائی نے کہا بولی۔

”یہ خدشہ تو مجھے بھی ہے۔“

”سب کو بے سوائے عدیل کے نہ صرف شاہ سکندر کی پر زور حمایت بلکہ مسلسل سبہ کو شش کرنا رہا۔“

”عدیل بھائی کیا کہہ رہے تھے۔؟“ اس نے چونک کر پوچھا تو میمونہ بھائی مسکرا کر بولیں ”وہی سب جو میں کہنا چاہتی تھی۔ یعنی اول تو شاہ سکندر کے والدین کی ناراضگی زیادہ دوسری صورت میں کوئی خاص فرق تو نہیں پڑے گا کیونکہ شاہ سکندر ریمیاں سیٹ ہو رہا ہے لکھی ہے دونوں اپنی زندگی گزار سکتے ہیں۔“

میمونہ بھائی نے رک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا پھر کہنے لگیں۔

”اس کے علاوہ جو ایک بات عدیل نے کہی اور جسے سن کر سب خاموش ہو گئے۔ وہ اس ط میں نہیں کہہ سکتی تھی۔“

”کون سی بات۔؟“ اس کی آنکھوں میں حیرت آئی۔ اور میمونہ بھائی جیسے خود بھی حیرا اسی حیرت سے بولیں۔

”کہہ رہا تھا۔ ان ساری باتوں سے زیادہ ہمیں آسیہ کی پسند اور خوشی کا خیال کرنا چاہیے۔ ار چلا کہ تمہاری پسند اور خوشی شاہ سکندر حیات ہے۔“

”میرے خدا! اس کا دل رکنے لگا۔ اس نے تو صرف میمونہ بھائی اور سہیا بھائی کو شرع عدیل بھائی نے کیسے جان لیا اور سب کے سامنے کہہ بھی دیا۔ وہ کیسے سامنا کرے گی ماں جی اورا

\*\*\*

وہ احمد حسن کا انتظار کرتے کرتے اب بالکلونی میں آکر باقاعدہ اس کی راہ دیکھنے لگا تھا۔ دوپہر یہ یہی کہا تھا کہ آفس کے بعد وہ سیدھا اس کے پاس آئے گا اور اب چھن کر رہے تھے۔ اسے تشویش احمد حسن نہ تو لاپرواہ اور غیر ذمہ دار تھا اور نہ بھولنے والا۔ اگر کسی کام میں الجھ گیا ہوتا تب بھی اپنے بتاتا۔ اس نے سوچا اسے خود ہی اس کے گھر فون کر کے معلوم کرنا چاہیے شاید وہ بھولنے کی غلطی اس سوچ کے ساتھ ہی وہ اندر آیا تو پہلے تمام کمروں کی لائٹیں ان میں پھر احمد حسن کے نمبر کال نیل بجنے لگی۔ اس نے فوراً ”فون“ دیکھ دیا اور اگر دروازہ کھولا تو سامنے عدیل کو دیکھ کر وہ پتا ہوا یا خوش۔ کچھ لمبی جلیبی کیفیت تھیں جو غالباً ظاہر بھی ہو رہی تھیں جب ہی عدیل پوچھنے لگے ”کیا میری آمد غیر متوقع ہے۔؟“

”نہیں آئیے پلیز۔“ اس نے فوراً ”سنبھل کر خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں راستہ انہوں نے ایک طائرانہ نظر سے سارے گھر کا جائزہ لیا پھر قصداً بے نیاز سے ہو کر کہنے لگے۔

”دوسرے گزر رہا تھا۔ سوچا آپ سے ملتا چلوں۔؟ سب تو نہیں کیا آپ کو؟“

”بالکل نہیں۔ آپ اطمینان سے بیٹھیں کیا نہیں گے چائے یا۔“ شاہ سکندر کو حقیقتاً ”عذب“ ایک گونہ اطمینان دے گئی تھی۔

”چائے کون بنائے گا۔؟“ عدیل نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ فوراً ”بولا۔

”میں خود۔“

”چلیں پھر کسی وقت خاص طور سے آپ کے ہاتھ کی چائے پینے آجاؤں گا۔“ عدیل نے ایک

منع کر دیا تو وہ پوچھنے لگا۔

”اس وقت کیوں نہیں۔؟“

”اصل میں میں ابھی چائے کی کر آ رہا ہوں۔ البتہ سگریٹ۔“

عدیل نے کہتے ہوئے اپنی جیب سے سگریٹ نکالنی چاہی، لیکن اس سے پہلے ہی اس نے پیکٹ ان کی طرف

عاید کیا۔

”تھیں یو۔“ عدیل ایک سگریٹ نکال کر سلگانے لگے تب ہی نیل کی آواز پر وہ ابھکسیو زی کہہ کر دروازہ

بولنے چلا گیا۔ واپس آیا تو احمد حسن ساتھ تھا۔ وہیں سے اپنے دیر سے آنے کا سبب بتاتا ہوا آ رہا تھا جب عدیل پر

برزی تو ایک دم خاموش ہو گیا۔ پھر بڑھ کر ان سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔

”بڑی خوش ہوئی آپ سے دوبارہ مل کر۔ اور اب تو اکثر ملاقات رہے گی۔“

”انشاء اللہ۔“ عدیل اپنی بے ساختگی پر خود ہی جزبہ ہو کر رہ گئے جبکہ احمد حسن نے مسکرا کر اسے دیکھا تو وہ جلدی

ہو بولا۔

”تم عدیل صاحب کے پاس بیٹھو۔ میں چائے لاتا ہوں۔“

”خدا کے لیے میرے لیے مت لانا۔“ احمد حسن اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”تمہاری میں زہر گھول کر دے

میں شوق سے پی لوں گا لیکن تمہاری چائے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا۔“ اس نے بری طرح احمد حسن کو گھور کر عدیل کی موجودگی کا احساس دلایا۔ تو وہ اپنی

ت سنبھالتا ہوا بولا۔

”میرا مطلب ہے تمہاری چائے اتنی عمدہ ہوتی ہے کہ ایک کپ سے دل نہیں بھرتا۔ اور تین چار کپ پینے

لے لیے میرے پاس ناٹم نہیں ہے۔“

عدیل بمشکل اپنی ہنسی روک پائے۔

”چلو پھر کسی وقت فرصت سے آنا۔ تب تمہیں۔“

”ہاں ہاں پھر کسی وقت۔“ احمد حسن جلدی سے بول پڑا پھر اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ”اس

نہ تو تم اپنے کام کی بات سن لو۔ میں تمہارے لیے شوروم دیکھ آیا ہوں۔ تم کل گیارہ بجے میرے آفس آ جانا تو

بڈھرتے تمہاری ملاقات کراؤں گا۔ باقی معاملات اس کے ساتھ تم خود طے کر لیتا۔“

”اچھی بات ہے۔ ویسے شوروم میں کتنی گاڑیاں تھیں۔؟“

اس نے ہائی بھرتے ہوئے پوچھا تو احمد حسن ذہن پر زور ڈالتے ہوئے بولا۔

”میرا خیال ہے میں چار یا ہو سکتا ہے۔“

”خیر کل دیکھ لیں گے۔“ اس نے عدیل کا خیال کر کے اس موضوع کو یس روک دیا۔ تو احمد حسن بھی سمجھ کر

ہٹ کر ہوا۔

”مجھے اجازت دو۔ کل ملاقات ہوگی۔“ پھر عدیل کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولا۔ ”اوکے عدیل بھائی! آپ سے تو

شاء اللہ ملاقات رہے گی۔“

”گنہ۔“ اس بار عدیل بس اس قدر کہہ سکے۔

پھر جب وہ احمد حسن کو رخصت کر کے دوبارہ آکر بیٹھا تو عدیل اس سے کہنے لگے۔

”جیسے اچھے برائے کا انتخاب کیا ہے۔ ابتدا میں تھوڑی مشکل تو ہوگی، لیکن جلدی سیٹ ہو جائیں گے۔“

”میں بھی جلدی سیٹ ہونا چاہتا ہوں۔“ اس نے بے اختیار کہا تو جواباً ”عدیل کا جملہ بھی بے ساختہ تھا۔

تاکہ چائے بنانے سے جان چھوٹے۔“

وہ قدرے نجل سا ہو کر بس پڑا۔ تو عدیل نے بغور اسے دیکھا پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر اصل موضوع چھیڑتے

سے کہنے لگے۔

”آپ جانتے ہیں شاہ سکندر! ہماری ایک بی بی بہن ہے۔ اچھی تربیت کے ساتھ ہم نے اسے بہترین اور آئندہ بھی اس کے لیے بہتری کی خواہش رکھتے ہیں۔ اس کے لیے آپ ہمیں کیا ضمانت دیں گے؟“

شاہ سکندر کو غالباً ”امید نہیں تھی کہ اس سے براہ راست بھی بات ہو سکتی ہے۔ جب ہی اندر ہی پریشان ہو گیا لیکن بظاہر سکون سے ان کی بات سنی پھر پوچھنے لگا۔

”آپ کیسی ضمانت چاہتے ہیں۔ اتنی میں شخص ہائی یا۔۔۔“ عدیل کو نفی میں سر ہلاتے دیکھ کر اسے ادھوری چھوڑ دی اور ان کے بولنے کا انتظار کرنے لگا تو کچھ دیر سوچنے کے بعد عدیل کہنے لگے۔

”مجھے صرف اپنی بہن کی خوشیوں کی ضمانت چاہیے۔ اور خوشیاں ان ضمانتوں کی مرہون منت نہیں جن کا ذکر آپ نے کیا ہے۔ زندگی میں نشیب و فراز تو آتے ہیں۔ ساری عمر بندہ صرف چھاؤں میں نہیں صرف دھوپ میں۔ دھوپ چھاؤں کے شگم سے ہی زندگی کا حسن نکھرتا ہے۔

جہاں تک شخصی ضمانت کی بات ہے تو اپنی ضمانت آپ خود ہیں۔ دوسرے یہاں کوئی کاروبار نہیں ہو آپ سے مالی ضمانت طلب کروں۔ شادی ایک مقدس بندھن ہے اور مجھے اس بندھن کی مضبوطی و پائیداری یقین چاہیے۔ کیونکہ میرے نزدیک آپ کا گھر بار، دھن دولت چھوڑ آنا کوئی معنی نہیں رکھتا اکثر انسان میں ایسے فیصلے کر گزرتا ہے لیکن بعد میں پچھتاوے صرف عورت کے حصے میں آتے ہیں۔“

عدیل زرا دیر کو خاموش ہوئے تھے کہ وہ بول پڑا۔

”میرا فیصلہ جذباتی نہیں ہے نہ ہی میں اپنے گھر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ آیا ہوں لیکن یہ طے ہے کہ اسی وقت جاؤں گا جب میری بیوی کو اس گھر میں وہی مقام دینے کا اعلان ہو گا جو اس گھر کی دوسری بیویوں کا رہی۔ بندھن کی مضبوطی و پائیداری کی بات تو اس کے لیے میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں۔ لکھ کر دو زبان پر بھروسہ کر لیں گے آپ۔“

آخر میں وہ بڑی بے تاب نظروں سے انہیں دیکھنے لگا جیسے فوراً ”جواب سننا چاہتا ہو۔ اور اس بل عدیل کے جذبول کی سچائیوں کا نہ صرف اندازہ ہوا بلکہ ایمان بھی لانا پڑا تو قدرے توقف سے مسکرا کر بولے تھے

”مجھے یقین مل گیا ہے۔“

\*~\*~\*

وہ کتنی دیر سے نالکہ کی خوشامد کر رہا تھا کہ فون پر آئیہ کو بلا دے۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتا ہے لیکن نا کے نہیں دے رہی تھی۔ مقصد محض اسے تنگ کرنا تھا۔ اور احمد حسن نے پہلے تو نالکہ کا ساتھ دیا پھر کھاتے ہوئے بولا۔

”بے چارے کو اس کی آواز سنو! وہ نالکہ! اور نہ رات بھر جاگتا رہے گا۔“

”اچھا ہے جاگتے رہیں۔“ نالکہ نے لاپرواہی سے کہا تو وہ احمد حسن کو دیکھ کر بولا۔

”یہ تمہیں ہائے لگی۔“

”تو یا ر! تم خود بڑی کر لوں۔ کیا پتا قسمت باوری کر جائے اور ادھر سے وہی رہیو کریں۔“

احمد حسن نے کچھ جھنجھلا کر مشورہ دیا تو وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

”او کے میں چلتا ہوں۔“

”کیا مطلب؟“ احمد حسن سمجھا۔ وہ ناراض ہو گیا ہے۔ ”کیا میں نے کوئی غلط بات کی ہے۔“

”نہیں بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ میں خواہ مخواہ اتنی دیر سے اس لڑکی کی خوشامد کر رہا ہوں۔“ اس نے

کر کہا۔

”تو جا کہاں رہے ہو۔؟“

”تمہارے مشورے پر عمل کرنے یعنی گھر بیٹھ کر اطمینان سے بڑائی کروں گا۔“

”وہ ملیں گی نہیں۔“ اس کی مسکراہٹ پر نالکہ نے جل کر کہا تو وہ اسے مزید چڑا کر بولا۔

”گردانہ ہوتی تو آتی کیوں۔“

وہ گمہ کریشے سے باہر دیکھنے لگی تو اسے متوجہ کرنے کی خاطر وہ پوری اسپینڈ سے گاڑی دوڑانے لگا۔ لیکن اسے یہ ترکیب کامیاب نہیں ہوئی کیونکہ وہ بڑے سکون سے بیٹھی رہی تھی۔

”مان لیا تمہیں خود پر بڑا اختیار ہے۔“ ریٹورنٹ کے خوبصورت ماحول میں بیٹھتے ہی وہ اس کے کمال پر سراہ کر کہنے لگا۔ ”اچھی بات ہے لیکن پلیز تھوڑی دیر کے لیے خود کو ان دیکھی بندشوں سے آزاد کر دو۔ میں تمہیں بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں نے آپ کو منع تو نہیں کیا۔“ وہ قصداً ”مسکرائی تو کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھنے کے بعد وہ پوچھنے لگا۔ ”تمہیں پتا ہے ابھی دو تین روز پہلے عدیل بھائی میرے پاس آئے تھے۔“

”اچھا! اسے جیسے حیرت ہوئی۔

”ہوں۔“ وہ پرسوج انداز میں سر ہلا کر کہنے لگا۔ ”تمہارے گھ والوں کے خدشات اپنی جگہ درست ہیں بھی شخص ایسے حالات میں بہت سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کرے گا۔ گوکہ عدیل بھائی میرے پاس سے بہت متاثر کر گئے تھے پھر بھی میں خاصا پریشان سا ہوں۔“

”کیوں۔“ وہ اسے الجھتے دیکھ رہی تھی۔

”پتا نہیں۔“ اس نے ذرا سے کندھے اچکا کر گویا اپنی بے بسی کا اظہار کیا تو وہ فوراً ”کچھ نہیں بولی۔ نہ طرف مچھنچ کر چائے پیالیوں میں ڈالنے لگی، پھر ایک کپ اس کے سامنے رکھا اور اپنے کپ میں چٹچ چلاتے بولی۔

”کہا مجھے ہمیشہ آپ ہی کی بات دہرائی پڑے گی۔ کہ میرے دل میں آپ اس مقام پر فائز ہو چکے ہیں جا سے پہلے کوئی تھانہ آئندہ کوئی ہو گا۔“

اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ ٹھہر گئی۔ اور وہ یونہی سر جھکائے دھیرے دھیرے بول رہی تھی۔

”جس یقین سے آپ نے کہا تھا۔ اسے ٹوٹا نہیں چاہئے شاہ سکندر اگر اسی یقین پر میں نے اپنے دل کا آپ کے نام کا پہلا بیج بویا تھا اور پھر ہر روز ایک بیج اس یادگار کے نام کرتی گی۔ اب تو آپ شمار بھی نہیں کہ میرے دل کی زمین پر یہاں سے وہاں تک کتنے پھول کھلے ہیں۔ جن کی ہر پتی پر آپ کا نام ہے اور اس پھر بستی کو اجاڑنے کی سعی وہی کر سکتا ہے جسے مجھ سے میری زندگی سے چارہ ہو۔“

شاہ سکندر کو اپنے دل سے بوجھ سرکنا محسوس ہوا اور ہونٹوں پر ٹھیکائی مسکراہٹ لمحہ بہ لمحہ گہری ہوتی تھی۔

\*~\*~\*

اس نے اماں جی سے تو کالج میں کسی کام کا بہانہ کیا تھا لیکن میمونہ بھابی کو بتا کر گئی تھی کہ وہ شاہ سکندر بلانے پر جاری ہے۔ اس لیے دیر ہو جانے پر بھی اطمینان سے تھی کہ میمونہ بھابی نے اماں جی کا دھیان لگا دیا ہو گا اور وہی ہوا۔ اماں جی نے اس سے پوچھا ہی نہیں کہ اتنی دیر کیوں ہوئی۔ انہا کہنے لگیں۔

”پتا نہیں کب تمہاری کالج سے جان چھوٹے گی۔ اتنا بلکان ہوئی ہو۔ جاؤ منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھاؤ۔“

”آپ نے کھا لیا۔“ اس نے میمونہ بھابی کی معنی خیز مسکراہٹ سے نظریں چرا کر پوچھا۔

”ہاں میں نے تو کھا لیا البتہ دلن بچوں کا انتظار کر رہی ہے۔“

”کیا مطلب۔“ بچے ابھی تک اسکول سے نہیں لوٹے؟“ اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے تعجب سے کہا۔ ”وہ کیوں بھابی ابھی تک آئے کیوں نہیں۔“

”پتا نہیں۔ مجھے لگتا ہے۔ راستے میں کہیں دین خراب ہو گئی ہوگی۔“ میمونہ بھابی نے پہلے لا علمی کا قیاس کیا، جس پر وہ پوچھنے لگی۔

”پہلے بھی کبھی ایسا ہوا ہے؟“

”مگر ماں جی سے پوچھو، ہفتے میں ایک بار تو ضرور ان کی دین خراب ہوتی ہے۔“

”تو آپ ان کے اسکول جا کر بات کریں۔ یہ تو کوئی طریقہ نہیں ہے، بچے بیچارے پریشان ہو جاتے ہوں گے میں سونیا کی آواز پر اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ وہ وہیں سے چلاتی ہوئی آ رہی تھی۔

”ای۔“ چھو پھو۔“ پھر کمرے میں آکر پھولی سانسوں کے ساتھ بولی۔ ”وہ ناں نیل بھائی، وہ ہمارے ساتھ ہیں آئے۔“

”کیا؟“ وہ چیخ ماری۔ ”کہاں ہے نیل؟“

”پتا نہیں۔“ اس کی چیخ پر سونیا سسم کی اور میمونہ بھابی کی ٹانگوں میں چھپنے کی کوشش کرنے لگی، تو اچانک کسی نیل کے تحت اس نے گیسٹ کی طرف دوڑ لگا دی۔ باہر ڈرائیور احمر سے پتا نہیں کیا کہ رہا تھا وہ اس کے سر پر جا کھڑی ہوئی۔

”نیل کہاں ہے۔۔۔؟“

”چہ نہیں بی بی! اسکول میں تو نہیں ہے۔ میں نے سارا اسکول چھان مارا۔“ ڈرائیور نے حد درجہ عاجزی دکھائی لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ہنوز تیکھے لہجے میں بولی۔

”اسکول میں نہیں ہے تو پھر کہاں ہے۔“ فتح تم نے اسے کہاں چھوڑا تھا۔“

”صبح تو ہی اسکول میں ہی چھوڑا تھا۔ آپ ان بچوں سے پوچھ لیں۔“

”تم نے پہلے سے معلوم کیا۔۔۔؟“ اس کے جارحانہ انداز میں اندرونی اضطراب بھی شامل ہو گیا تھا۔

”جی بی بی۔“ نیل کی مس کمرے رہی تھیں کہ ٹھیک ہی وہ ان کے سامنے نکلا ہے۔ لیکن بی بی! وہ دین میں آکر میں بیٹھا پتا نہیں کس طرف۔“

ڈرائیور اپنی غفلت پر سخت پشیمان اور گھبرایا ہوا تھا لیکن وہ اس سے کوئی رعایت برتنے کو تیار نہیں تھی تبھی گیسٹ کے اندر سے اماں جی نے اسے پکار لیا۔

”اماں جی! پوچھیں اس سے نیل کو کہاں چھوڑا ہے۔“

اندر آتے ہی وہ بے قابو ہو گئی تو میمونہ بھابی اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے آئیں اور زبردستی بٹھاتے ہوئے بولیں۔

”آجائے گا نیل۔ تم پہلے اپنے حواسوں پر قابو پاؤ پھر سوچو کہ وہ کہاں جا سکتا ہے۔“ میمونہ بھابی نے اس کے کندھے پر دباؤ ڈال کر کہا تو وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی پھر فوراً ”نفی میں سر ہلا کر بولی۔

”وہ ابھی اتنا بڑا نہیں ہوا کہ خود کہیں جا سکے؟“

”لے جاتا تو جا سکتا ہے اور ایک ہی ہستی لے جا سکتی ہے۔“ میمونہ بھابی کا انداز سوچنا ہوا تھا۔

”نیل بھابی۔“ اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی اور بے حد خاموش نظروں سے وہ دیکھنا میمونہ بھابی کو بے یقینی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی لیکن دروازے سے داخل ہوتی اماں جی سامنے آ گئیں۔ بے حد مضطرب جیسے ابھی ڈھکے جاس گئی۔

”اماں جی۔“ وہ سارے حوصلے بجا کر کے ابھی اور بڑھ کر اماں جی کو قہام لیا پھر انہیں بٹھا کر کہنے لگی۔ ”پریشانی نہایت نہیں ہے اماں جی! میں ابھی عدیل بھائی کو فون کرتی ہوں۔ وہ آتے ہوئے نیل کو لیتے آئیں گے۔“

”کہاں سے لے آئے گا۔۔۔؟“

”میں اس نے پتا نہ کر میمونہ بھابی کو دیکھا تو وہ اماں جی کے پاس بیٹھتے ہوئے اس سے بولیں۔

”تم جاؤ کھانا کھاؤ! احمر اور سونیا کو بھی کھلاؤ۔“

پھر انہوں نے اسے ”میں سنبھال لوں گی۔“ کا اشارہ کیا تب کچن میں آکر اس نے کھانا نکالا لیکن اس کا بنانا نکل سامنے چاہا کھانے کو۔ احمر اور سونیا کو آرام سے کھانے کی تاکید کرتی ہوئی لابی میں آکر سوچنے لگی کہ کسے فون کر کے عدیل بھائی یا بڑے بھیا کو۔

”جیت بھوک لگی ہے۔“ میمونہ بھابھی آتے ہی شروع ہو گئیں۔  
 ”ہاتھ تو دھو لیں اور چلیں ادھر برآمدے میں بیٹھتے ہیں۔“ اس نے ٹرے اٹھانی چاہی لیکن میمونہ بھابھی روکتے ہوئے بولیں۔

”بس ہمیں ٹھیک ہے تم بیٹھنا چاہو تو اسٹول کھینچ لو۔“  
 ”اے! نہیں کب سے بھوک لگی۔“ اس نے اسٹول کھینچ کر انہیں بٹھادیا اور خود کھڑے کھڑے کھانے لگی۔  
 ”نبیل! کھلا دیا۔؟“ میمونہ بھابھی کو اچانک خیال آیا تو ہاتھ روک کر پوچھا۔  
 ”نہیں۔ میں ابھی اس کے پاس نہیں گئی۔ اور کھانا تو اسے نبیلہ بھابھی نے کھلادیا ہو گا۔“

”وہ تمہاری بھابیوں کی لسٹ سے خارج ہو چکی ہیں۔“ میمونہ بھابھی نے احساس دلایا تو وہ دکھ سے بولی۔  
 ”برسوں کی عادت چند دن میں کیسے چھوٹ جائے گی پھر میں انہیں صرف نبیلہ بھی نہیں کہہ سکتی۔ ویسے میرا خیال ہے بھابھی کتنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔“  
 آخر میں اس نے جیسے بات ختم کرنے کی غرض سے کہا پھر ہاتھ دھو کے کیتلی اٹھاتے ہوئے پوچھنے لگی۔ ”چائے پیس لگی آپ۔؟“

”بارہی ہو تو پی لوں گی۔“ میمونہ بھابھی لقیہ روٹی دسترخوان میں لپیٹتی ہوئی بولیں پھر ٹرے ایک طرف رکھ کر دوبارہ بیٹھیں تو اپنے مخصوص انداز میں شروع ہو گئیں۔  
 ”جان میں جان آگئی۔ دماغ بھی فریش ہو گیا ہے۔ اب مزہ آئے گا تم سے بات کرنے میں۔ بھوک میں تو کچھ سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا۔ خیر اب تم جلدی سے بتاؤ کیا باتیں ہوئیں شاہ سکندر سے۔۔۔؟“  
 ”جی نہیں۔ میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔“ وہ ان کے انداز پر ہنستے ہوئے بولی۔

”ٹھیک ہے۔ وہ جو آج اماں جی اور بابا جی اپنی منظوری دینے کے لیے شاہ سکندر کے عزیزوں کو بلوانے کی باتیں کر رہے تھے تو میں منع کر دیتی ہوں اماں جی کو کہ اتنی جلدی نہ کریں۔ تم ہم پر بھاری تھوڑی ہو۔“  
 میمونہ بھابھی نے بڑی بے نیازی سے اسے اس کی خوشیوں کی نوید دی اور وہ اپنی جگہ اچھل پڑی۔  
 ”کیا کہا بھابھی آپ نے کیا باتیں کر رہے تھے بابا جی اور اماں جی۔؟“  
 ”جی نہیں۔ میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔“

میمونہ بھابھی نے فوراً ”بدل لیا“ بھی اندر سے عمر کے رونے کی آواز آئی تو ”میرا لال اٹھ گیا۔“ کہتی ہوئی کھڑی ہو گئیں پھر جاتے جاتے اسے دیکھ کر شرارت سے بولیں۔  
 ”تمہو کا دن طے ہوا ہے۔ تمہاری بات پکی کرنے کے لئے۔“

”نئی کھانے تولیتی جاؤں۔“ ان کی غلٹ پر اس نے جلدی سے مگ اٹھا کر ان کی طرف بڑھادیا۔ جسے لے کر وہ اندر چلی گئیں اپنے پیچھے اس کے لئے سوچنے کو زندگی کا خوبصورت موڑ چھوڑ گئی تھیں۔ ان ہی سوچوں کے دھارے پر بہتی رہنے اپنے کمرے میں آئی تو نبیل کو دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ وہ اپنی جگہ بیٹھا دونوں ہاتھ دعا کے انداز میں اپنی آنکھوں کے سامنے پھیلائے جانے کس سوچ میں تھا۔ اس کے ہونٹ ساکت تھے اور نظریں ہتھیلیوں پر جمی ہوئیں۔ وہ کچھ سمجھ نہیں سکی تو اس کے پاس اگر بیٹھی اور آہستہ سے اس کی کلاںیاں تھام کر پوچھنے لگی۔  
 ”نبیل! کچھ رہے ہو بیٹا۔“

”نبیل نے اپنی ہتھیلیاں اس کے سامنے پھیلا دیں تو ان پر نظر ڈالنے کے بعد وہ قدرے الجھ کر بولی۔  
 ”کیا ہوا ہے۔ مجھے تو کچھ نظر نہیں آ رہا۔“

پھر لٹوئی اپنے ہونٹوں سے اس کی ہتھیلیوں کو چوما تو وہ بے چین سا ہو کر اٹھ بیٹھا پھر ایک دم اس کی گردن میں انڈال کر اس سے پلٹ گیا تو اس محبت اور المانہ انداز پر اس کی آنکھوں میں پانی اتر آیا اور جواباً اسے بازوؤں میں بٹھال لیا۔

نبیل اسے چھوڑنے پر آمادہ ہی نہیں تھا۔ کتنی دیر بعد اس نے بہت آہستہ سے اسے خود سے الگ کیا اور

اور ابھی فیصلہ نہیں کر پائی تھی کہ اپنے پیچھے بہت ہلکی سی آہٹ محسوس ہوئی تو یونہی اسے خیال میں رہ کر نے پیچھے گردن موڑی اور نبیل کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں سے بچ نما آواز بلند ہونا چاہتی تھی لیکن اس سے بڑا اس نے اپنی آواز کا گلا گھونٹ دیا البتہ بے اختیار چھٹک آنے والے آنسوؤں کو نہیں روک سکی۔ اور بڑھ کر اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے کر اس کے سر پر بھی اپنی پیشانی ٹکاتی کبھی ہونٹ۔ گو کہ وہ اس کی ماں نہیں لیکن اس وقت اس کے احساسات ایسے ہی ہو رہے تھے۔ جیسے کسی ماں کو اس کا کھویا ہوا بچہ مل گیا ہو۔ بڑپتے ہوئے دل کو کسی حد تک قرار آیا تب فرش پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھی اور اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر پلو لگی۔

”کہاں چلے گئے تھے۔“  
 نبیل جب چپ چاپ اس کے پیچھے ہوئے چہرے کو دیکھتا رہا۔  
 ”کس کے ساتھ آئے ہو؟ کون چھوڑ گیا ہے تمہیں۔؟“  
 نبیل کی خاموشی نہیں ٹوٹی تو وہ کچھ دیر تک اسے دیکھتی رہی پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اماں جی کے کمرے میں لے اور اسے سامنے کرتے ہوئے بولی۔

”نبیل! آیا ہے اماں جی۔؟“  
 اماں جی اور میمونہ بھابھی نے ایک ساتھ چونک کر دیکھا پھر اماں جی نے لپک کر نبیل کا ہاتھ پکڑ کر اپنی ہاتھ کھینچ لیا۔ اور اس سے پہلے کہ اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کریں۔ وہ اس کا دفاع کرتے ہوئے بولی۔  
 ”اماں جی! ابھی بچہ ہے کتا سمجھئے۔ کہیں ادھر ادھر چھپ گیا ہو گا۔“  
 ”اے ہمارے تو جان نکال کے رکھ دی۔“ اماں جی کہتے ہوئے نبیل کو تجھوڑنے لگیں۔ ”کہاں رہ گیا ارے تیرا باپ آجاتا تو میں کیا جواب دیتی اسے۔“

”چھوڑیں اماں جی! میں سمجھاتی ہوں اسے۔ آئندہ ایسا نہیں کرے گا۔ نبیل! تم کمرے میں جاؤ۔“  
 اس نے نبیل کو الگ کر کے جانے کو کہا پھر اماں جی کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔  
 ”اس طرح نہیں کریں اس جی وہ پہلے ہی سہا ہوا ہے اور ڈر جائے گا۔ میں آرام سے اس سے معلوم گی۔ میرا خیال ہے نبیلہ بھابھی اسے اپنے ساتھ لے گئی تھیں اور شاید وہی چھوڑ گئی ہیں۔“

اماں جی یوں پریشان ہو گئیں جیسے قیامت آئی نہیں تو آنے والی ہو۔  
 ”پریشانی کی بات نہیں ہے اماں جی۔“ وہ انہیں سمجھاتے ہوئے کہنے لگی۔ ”وہ نبیل کی ماں ہیں اور ہم ٹھ کوئی بھی انہیں نبیل سے ملنے سے نہیں روک سکتا۔“

”تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن انہیں اس طرح بغیر بتائے نبیل کو نہیں لے جانا چاہئے تھا۔ کتنے پریشان ہم لوگ۔“ میمونہ بھابھی نے کہا۔ تو وہ ان کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔  
 ”ہاں۔ یہ بات ان سے کھلوائی جاسکتی ہے۔ کوئی دن یا وقت جو بھی ہو طے کر لیں اور یہ معاملات تو بڑے طے کر سکتے ہیں۔“

وہ کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور جانے لگی کہ اچانک خیال آنے پر رک کر پوچھا۔ ”بابا جی کہاں ہیں۔؟“  
 ”تمہارے پچانے بلوا بھیجا تھا وہیں گئے ہیں۔“

”خیریت۔۔۔؟“  
 ”آہیں گے تو خیریت معلوم ہوگی۔“

اماں جی کے جواب پر وہ یونہی سر ملاتی ہوئی ان کے کمرے سے نکل آئی اور گو کہ اس کا ہا دل یہ چاہہ فوراً ”نبیل سے ساری بات معلوم کرے۔ کہ وہ کس کے ساتھ گیا آیا اور نبیلہ بھابھی نے اس سے کیا باتیں وغیرہ وغیرہ ظاہر ہے یہ ایک فطری تجسس تھا لیکن وہ فوراً خود کو باز کرتے ہوئے کچن میں آکر کھانا گرم کر۔ کیونکہ ابھی میمونہ بھابھی نے بھی نہیں کھایا تھا۔ پھر اس نے وہیں سے انہیں پکار لیا۔

ہتھیلیوں سے آنکھیں صاف کر رہی تھی کہ وہ کہنے لگا۔  
”پھوپھو! میں مٹی کے ساتھ چلا گیا تھا۔ اسکول آئی تھیں مجھے لینے۔“

وہ فوراً ہاتھ نیچے کر اکر اسے دیکھنے لگی۔

”مٹی کہہ رہی تھیں۔ وہ یہاں نہیں آسکتیں۔ بھری رو رہی تھیں آپ کی طرح۔ انہوں نے میرے ہاتھ چوما اور آنکھوں سے لگایا تھا۔ ہاتھیں وہ کیوں رو رہی تھیں۔ آپ کیوں رو رہی ہیں پھوپھو۔“

وہ جس سادگی سے بول رہا تھا۔ اسی سادہ معصوم انداز میں پوچھا تو وہ بس ذرا سانس لی میں سر ہلا کر رہ گئی تھی۔  
\*\*\*

شام میں اماں جی نے سب کے سامنے فیملے کا اسکول سے فیمل کو لے جانے کا بیانا تو ایک ہنگامہ اٹھ کر بڑے بھیا کے ساتھ عدل بھائی بھی غصے میں آگئے تھے اور فیملے کے اس اقدام میں کوئی انتہائی پہلو تلاش کرتے تھے غالباً ”ان کے خیال میں وہ عورت محبت کے ہاتھوں تو مجبور ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ یقیناً“ اس کے اخطرناک ہونے کے۔

”فیمل بے کماں؟ میں اس سے پوچھتا ہوں کہ وہ کسی کی اجازت سے اس کے ساتھ گیا تھا۔“

بڑے بھیا کا بقیہ غصہ اب فیمل کی طرف منتقل ہونے والا تھا کہ اباجی فوراً ٹوک کر بولے۔

”نہیں بیٹا! اس میں بچے کا کوئی قصور نہیں۔ اس نے ماں کو دیکھا اور اس کے ساتھ چلا گیا۔ تم اگر روک تو اس کی ماں کو روکو۔“

”اس طرح تو وہ اور ضد میں آجائے گی۔“ بڑے بھیا۔ اباجی کی بات سمجھتے ہی اپنی بے بسی پر تملائے۔  
”اسی لیے غصے کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ آرام سے ٹھنڈے دماغ سے بیٹھ کر سوچو۔ اس طرح غصے میں نقصان کرو گے۔“

اباجی نے نرمی سے ان کا کندھا سہلاتے ہوئے سمجھایا تو وہ جیسے ٹوٹ گئے۔

”میں کیا کروں اباجی! میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ بتائیے وہ جب تک یہاں تھی۔ اسے فیمل نہیں بھی۔ اب کیسے وہ۔“

”حوصلے سے بیٹا! حوصلے سے۔“ ان کی آواز بھرانے پر اباجی نے پھر انہیں سہارا دیا۔ ”اپنے آپ پر قابو اور اس بات کو زیادہ اہمیت مت دو۔“

”کیسے نہ دوں۔“

”مصلحت کا تقاضا یہی ہے۔ ابھی تم نے خود کہا کہ منع کرنے سے وہ اور ضد میں آجائے گی۔ اسے ضد دلاؤ۔ ضدی عورت بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ کسی کو نقصان پہنچانے کی ٹھان لے تو پھر اپنا نفع نقصان سوچتی۔“

وہ باتیں جو کتابیں نہیں سکھاتیں اباجی اپنے بڑھے لکھے بیٹوں کو سمجھا رہے تھے۔

”پھر وہ کوئی جاہل کنوار عورت نہیں ہے جسے تم ذرا دم کا سکھو۔ بڑھی لکھی ہے۔ اگر اس نے ماں کا حق کر لیا تو پھر فیمل کو یہاں سے لے جانے سے اسے کوئی نہیں روک سکے گا اس لئے بہتر یہی ہے کہ خاموشی کر لو بلکہ ڈھیل دے دو اسے کہ وہ جب چاہے۔ فیمل سے مل لے۔ البتہ یہ ضرور طے ہونا چاہئے کہ وہ کب وقت اسے لے جائے گی تاکہ یہاں کسی کو پریشانی نہ ہو۔ سمجھ رہے ہو ناں۔“

بڑے بھیا جو ایک ٹک انہیں دیکھے جا رہے تھے پہلے اثبات میں سر ہلایا پھر کہنے لگے۔

”لیکن اباجی! میں نہیں چاہتا۔ فیمل اس سے ملے۔“

”نہ سلسلہ زیادہ عرصہ نہیں چلے گا بیٹا! اس کا مقصد صرف تمہیں پریشان کرنا ہے۔ جب وہ دیکھے گی کہ کوئی ٹوکس نہیں لیا تب خود ہی پیچھے ہٹ جائے گی۔“

اباجی نے کہا تو عدل بھائی فوراً ”ان کی تائید کرتے ہوئے بولے۔

”اباجی ٹھیک کہہ رہے ہیں بڑے بھیا۔ ان کا مقصد صرف آپ کو پریشان کرنا ہے۔ فیمل سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ بس آپ ایک بار ان سے رابطہ کر کے فیمل سے ملنے کے اوقات طے کر لیں۔ اس کے بعد فیمل کو ان کے پاس لے جانے کا نئے کی ذمہ داری میری ہوگی۔“

”ہوں۔“ ذمہ داری تو تمہیں قبول کرنی ہوگی کیونکہ میں۔۔۔“

بڑے بھیا جانے کیوں خاموش ہو گئے۔ پھر کن آنکھوں سے خاموش بیٹھی اماں جی کو دیکھ کر اپنے تئیں آواز دبا کر بولے۔

”میں باہر جا رہا ہوں اباجی۔۔۔“

”ہائیں۔“ اماں جی نے پھر بھی سن لیا۔ ”باہر کا ہے کو جا رہے ہو۔“

”ظاہر ہے روز گائے۔“

”یہاں بے روز گار تو نہیں ہو۔“ اماں جی نے ان کی بات پوری نہیں ہونے دی۔ اور وہ اس وقت مزید کسی بحث میں الجھنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے اٹھتے ہوئے بولے۔

”اباجی! میں پھر بات کروں گا۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے کہیں جانے کی۔ ماشاء اللہ! میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔“ اماں جی اپنی کسے جاری تھیں۔ وہ خاموشی سے باہر نکل گئے۔ تب اباجی ٹوکتے ہوئے بولے۔

”بس کرو۔ وہ کون سا ابجی جا رہا ہے۔“

”ابجی نہ کبھی سمجھا دیاں اسے۔“

”سمجھاؤں گا تم نہ جی بلکان کرو بلکہ اس کا گھر بسانے کی سوچو۔ کیوں عدیل میاں؟“ اباجی نے اچانک عدیل کو مخاطب کیا تو وہ چونک کر بولے۔

”جی۔۔۔ اباجی۔ ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔۔۔؟“

”کیا ٹھیک کہہ رہا ہوں؟“ اباجی سمجھے عدیل نے ان کی بات سنی ہی نہیں اور یوں ہی تائید کر رہے ہیں۔

”وہی بڑے بھیا کی شادی، میرا خیال ہے آئیہ کے ساتھ ساتھ ان کا گھر بھی بس جائے تو اچھا ہے۔“

عدیل نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مشورہ بھی دے ڈالا پھر اماں جی سے کہنے لگے۔

”آپ کا انتخاب لا جواب ہوتا ہے اماں جی! ایسا بھابھی اور میمونہ بھابھی جیسی ان کے لئے بھی لے آئیں۔ پھر باہر نہیں جائیں گے۔“

اماں جی کے چہرے پر مسکراہٹیں دوڑنے لگیں۔

”سوچ تو میں کئی دنوں سے رہی ہوں اور میری نظر میں ایک لڑکی ہے بھی۔“

”کون کس؟“ اباجی فوراً متوجہ ہوئے۔

”سانہہ آپ کی بیٹی۔“ اماں جی نے بتایا تو اباجی یوں مطمئن ہو گئے جیسے ان کے دل کی بات کہہ دی گئی ہو۔  
نیک عدیل بر ملا خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

”میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ آپ کا انتخاب لا جواب ہوتا ہے۔ بڑے بھیا کے لئے سانہہ جی بہت مناسب ہیں۔“

”آپ پہلی فرصت میں جا کر بات کریں۔“

”میں تو آن جانے کو تیار ہوں لیکن تمہارے بھائی کا تو پتا چلے۔ وہ کیا چاہتا ہے اور ادھر ساڑھ کے لئے پتا نہیں مارے پچانے کیا سوچ رکھا ہے۔ ایک جگہ بات چل تو رہی تھی اس کی۔“

اماں جی نے سوتے ہوئے انداز میں کہا پھر اباجی سے پوچھنے لگیں۔

”آپ آج گئے تھے کچھ بتایا۔ ضیاء نے سانہہ کے رستے کے بارے میں طے ہوا یا نہیں۔“

”نہ بتا رہا تھا۔ وہاں بات نہیں تھی۔“

”میں تو پھر آپ عقل سے بات کر لیں پھر ہم چلیں گے۔“



اباجی اثبات میں سرہلانے لگے، پھر معا "خیال آنے پر عدیل کو مخاطب کر کے پوچھنے لگے۔  
 "عدیل! وہ تم احمد حسن کی طرف گئے تھے۔"  
 "نہیں اباجی! میرا جانا نہیں ہو سکا لیکن میں نے انہیں فون کر دیا تھا۔ جمعہ کو رات کے کھانے کی دعوت دی ہے۔"  
 عدیل بتا کر اٹھ کھڑے ہوئے کیونکہ ادھر میونہ بھابھی پکار رہی تھیں۔ وہ غلت میں باہر نکل گئے۔

"مجھے نہیں معلوم مہر! جو چاہے قسم لے لوں۔" شہرناو جیچ پریشان ہو گئی۔  
 "کھاؤ شاہ بارون کی قسم کہ تمہیں کچھ معلوم نہیں۔" اس نے شہرناو کی شررگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ جس سے وہ اور بان ہو گئی اور قدرے روہاسی ہو کر پوچھنے لگی۔  
 "کب گئے ہیں سکندر بھائی اور تم سے کیا کہہ کر گئے ہیں؟"

"مجھے سے" ارے مجھے تو اس نے اس قابل ہی نہیں سمجھا کہ میرے آنے کا انتظار ہی کر لیتا۔ منہ میرے نام کوئی مچھوڑا جو بابا جان کی بات کو بیچ ثابت کرنا کہ وہ مجھ سے نہیں ان سے ناراض ہو کر گیا ہے۔ اس کی ناراضگی سے نہیں تھی۔ اسے ناراض کیا گیا ہے۔ سبب تم جانتی ہو شہرناو۔ اور جان تو میں بھی گئی ہوں پھر بھی رے منہ سے سنتا جا رہی ہوں۔"

تفر سے بولتی ہوئی مہرنا نے سناٹے میں بیٹھی شہرناو کا ہاتھ زور سے ہلایا پھر کہنے لگی۔  
 "شاہی کی رات شاہ اس کمرے میں آیا تھا۔ وہ بھی اس وقت جب میں اس کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی۔ اس کے بعد میں نے اسے نہیں دیکھا۔ خیر میرا اور شاہ کا معاملہ ہے۔ مجھے تو تم اس حرافہ کا نام ہتاؤ جو شاہ کو سے چھین کر جرات کر بیٹھی ہے۔"

"میرا تین کو مہر! میں کچھ نہیں جانتی۔ میں تو سکندر بھائی کے جانے کا بھی ابھی تمہارے منہ سے سن رہی ہوں بی جان نے بھی نہیں بتایا۔"  
 "وہ نہیں بتا سکی گی اور سنو۔ تم بھی ان پر ظاہر مت کرنا کہ تم جان چکی ہو کیونکہ یہ اس گھر کا مسئلہ ہے اور تم اس گھر کی فردوس ہیں ہو۔"

مہرنا نے ہلکی سی طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ جانے اسے کیا اور کرانے کی کوشش کی کہ وہ اگر نہیں سمجھی، بھی یوں سر جھکا لیا جیسے اب مہرنا کی ہر جائز ناجائز پر اسے اسی طرح سر جھکانا ہے ورنہ دوسری صورت میں بھاری قیمت ادا کر لی پڑے گی۔

\*...\*

سکندر بھائی! آپ کے لئے گڈ نیوز۔"  
 نالکہ نے اسے دیکھتے ہی نگوں لگایا۔ لیکن وہ ایک تو تھکا ہوا تھا دوسرے شوروم کا سودا نہ ہونے کے باعث کچھ سا ساجھی تھا۔ جب ہی نالکہ کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی اور تھکے تھکے انداز میں بیٹھا تو احمد حسن نالکہ کو ٹوکے لے بولا۔  
 "تھک نہیں کرو۔ جاؤ پہلے چائے لے کر آؤ۔"

میں چائے سے زیادہ اچھی خبر سنانے والی ہوں۔ جو سکندر بھائی کی ساری تھکن پل میں دور کر دے گی اور ان یوں چہرے پر مسکراہٹیں دوڑنے لگیں گی۔ اب بتائیے پہلے چائے یا گڈ نیوز۔"  
 نالکہ نے شاہ سکندر کے سامنے اگر خوشی سے پوچھا تو اس نے پہلے احمد حسن کو دیکھا اور اس کا اشارہ سمجھ کر آرام سے بولا۔  
 "چائے۔"

"برنر نیوز۔" نالکہ چیخ پڑی۔ کیونکہ وہ خود اچھی خبر سنانے کو بے چین تھی اور جانے کب سے ان دونوں کا ار کر رہی تھی۔  
 "اچھی خبر دیتی ہے۔ اچھا خیر سناؤ۔ جلدی سناؤ۔" شاہ سکندر نے جیسے اس پر احسان کیا۔ تو وہ منہ پھلا کر بولی۔  
 "آئیہ اباجی کے گھر سے فون آیا تھا۔ انہوں نے ہم سب کو کھانے پر بلایا ہے۔"

"کسے آئے۔" شاہ سکندر کی ساری بے نیازی رخصت ہو گئی۔  
 "جی نہیں جمعہ کو۔" نالکہ کا انداز ہنوز تھا۔ جس پر احمد حسن ٹوکے ہوئے بولا۔  
 "تو اس میں روئے کی کیا بات ہے۔ کیا تمہیں نہیں بلایا۔"

مہرنا نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے شہرناو اور شاہ بارون کو آنے دیکھا تھا۔ دونوں کتنے خوش تھے۔ پورا ہاتھ جیسے قسمت کی دیوہی نے مہرنا کو کساری رعنائیاں ان کی جھولی میں ڈال دی ہوں۔ شہرناو کے ہونٹ ہنسی کھلی پر ہنسی تھی اور شاہ بارون کی سنگت کا غور اس کے انگ سے عیاں تھا۔ جس نے مہرنا سے ایک لگاؤ کی تھی۔ جو اگر وہ اس وقت نیچے اتر کر آتی تو اس آگ کی تپش سے شہرناو ہرگز محفوظ نہیں رہ سکتی۔ اسی خیال کے تحت وہ اپنے کمرے سے نہیں نکلی اور ادھر سے ادھر نکل کر اپنے اندر دیکھنے والا کو کمرے کی کوشش کرنے لگی لیکن اسے کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ خود اپنے لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے ساتھ ساتھ والے کی بڑی مشکل سے وہ خود کر نیچے جانے سے باز رہے ہوئی تھی۔ پھر اپنا دھیان بنانے کی خاطر اس۔ ریکارڈ میں کیسٹ لگا کر آن کیا اور مسہری پر آ بیٹھی۔ چند لمحوں بعد سو گوارسی دھن نے کمرے کی خاموشی اداسی کا رنگ شامل کر دیا تھا۔ وہ کچھ دیر گھنٹوں کے گرد بازو پیٹے ٹیپ ریکارڈ پر نظریں جمائے بیٹھی رہی پھر نیم دراز ہو کر مسہری کی بیک پر سر رکھ کر ٹیکس موند لیں۔

اک آگ غم تنہائی کی سارے بدن میں پھیل گئی  
 جب جسم ہی سارا جلتا ہو تو دامن دل کو بچا میں کیا  
 اچانک ٹیپ بند ہونے کی آواز کے ساتھ شہرناو کی کھلکھلاتی ہنسی نے جیسے بجھتے انگاروں کو پھرتے دی اور وہ ہمیشگی طرح اس کی پذیرائی کو اٹھنے کے بجائے ذرا سی آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے لگی۔  
 "خیر تو ہے کون روٹھ گیا۔؟" شہرناو اپنی دھن میں تھی۔

کہاں ہیں سکندر بھائی؟ میں پوچھتی ہوں ان سے۔"  
 "بیٹھ جاؤ شہرناو! اس کے گھرے ہوئے سرد لہجے پر شہرناو نے چونک کر اسے دیکھا پھر اس کے پاس تکلف سے بیٹھتی ہوئی اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر پوچھنے لگی۔  
 "کیا ہوا مہو؟ تمہاری طبیعت ٹھیک ہے۔"

"ہوں۔ بہت ہلکی سی ہوں کی آواز اس کے بند ہونوں کے اندوم توڑ گئی۔  
 شہرناو اس کی پراسرایت سے کچھ خائف سی ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ تو اسے سارا ماحول ہی پر جیسے بچپن میں کمانیاں بڑھا کرتی تھی کہ ظالم دیو نے شہزادی کو قید کر کے پتھر کا بنا دیا۔ اسے مہرنا سے اپنی گمان ہو رہا تھا۔ جس گھرے وجود میں کوئی حرکت نہیں تھی۔ بے حد گھبرا کر شہرناو اسے غور سے دیکھنے لگا کہ ہونٹ پہلے ذرا سے نیم ہوا ہوئے پھر جیسے وہ خود کو بولنے پر آمادہ کر کے کہنے لگی۔  
 "ایک بات پوچھوں شہرناو! جیچ بتاؤ گی۔"

"ہاں۔ کیا بات ہے؟" شہرناو فوراً بولی۔  
 "کیا وہ مجھ سے زیادہ حسین ہے؟" اس نے اتنے یقین سے پوچھا کہ شہرناو سٹپٹ گئی۔  
 "کون۔؟"

"وہی جس نے شاہ کو میرا نہیں ہونے دیا۔ چند لمحے بس چند لمحے شاہ نے میری جھولی میں خیرات ڈالے تھے شاید اپنی محبت کا صدقہ اتارا تھا۔ کیوں کیا یہی میری حیثیت ہے۔" مہرنا اچانک پھٹ پڑ  
 شہرناو! تم اس کی بہن ہو سب جانتی ہو گی۔ مجھے بتاؤ وہ کہاں گیا ہے؟"

”جی نہیں۔ مجھے سب سے پہلے بلایا ہے لیکن میں جاؤں گی نہیں۔“  
وہ کہتی ہوئی باہر نکل گئی تو کچھ دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ پھر احمد حسن اسے دیکھ کر مسکرایا۔  
مسکراہٹ تھی۔

”مجھ کے دل۔ ضرور چلیں گے۔ اور اب جلدی سے بتاؤ۔ کیا طے کرتا ہے۔“  
”کیا مطلب۔؟“ وہ سمجھا نہیں۔

”مائی ڈیر ان کی طرف سے بلاوے کا مطلب یہ ہے کہ انہیں یہ رشتہ منظور ہے اور ہم جا کر باقی ما کریں یعنی شادی کی تاریخ وغیرہ۔“ احمد حسن نے مطلب سمجھایا تو وہ کچھ الجھ کر بولا۔  
”لیکن یار؟ تیار تو کچھ بھی نہیں ہے۔“

”کیا تیار کر لیا ہے۔ کپڑے، زیورات یہ سب امی اور نالکہ پر چھوڑ دو۔ وہ سب خریداری کر لیں۔  
سیٹ کر چکے ہو۔ بانی رہا بزنس تو۔“ میاں احمد حسن خود انک گایا تو اسے کھنکھار۔

”بزنس نہیں ہو سکتا۔ آئی میں شادی کے اخراجات کے بعد بزنس کے لئے پیسہ نہیں بچے گا۔“  
احمد حسن یہی بات کہنے سے رک گیا تھا اور جب شاہ سکندر اس حقیقت کا اعتراف کر کے مایوس  
تب اس کا کندھا ٹھپک کر بولا۔

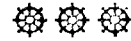
”کم آن یار! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پہلے ان لوگوں کا ارادہ معلوم ہو جائے اس کے بعد ہم طے کر  
آیا شادی پہلے ہوئی چاہئے یا بزنس۔“

”ہوں۔“ شاہ سکندر نے پر سوچ انداز میں سر ہلایا پھر رست و اوج پر نظر ڈالی تو چونک کر بولا۔ ”او۔  
بجے ایک دوست سے ملنا تھا۔“

”تو کسے چاہئے کی کر جانا۔ یہ نالکہ کہاں رہ گئی؟“ احمد حسن اٹھتے ہوئے بولا تو وہ بھی اس کے ساتھ کھڑا  
”رہنے دو احمد! دیر ہو جائے گی۔“ وہ احمد حسن سے اجازت لے کر باہر نکل آیا۔

پانچ بجتے ہیں دس منٹ تھے۔ وہ اسپنڈ سے گاڑی بھگانے لگا، لیکن جگہ جگہ ٹریفک جام ہونے کے باوجود  
گھنٹہ لیٹ ہو گیا۔ پھر بھی بہم سی امید کے سہارے اس نے مطلوبہ جیمیر کے سامنے گاڑی روک دی،  
لاک لگا رہا تھا کہ اسے اپنے کندھے پر ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ کچھ بے دھیانی میں اس نے گردن موڑ کر دیکھ  
پل کو اسے اپنا وجود نہ ہو ناگا۔

جن پر اعتبار کیا تھا۔ وہی شاہ جہانگیر اس کے بے حد قریب کھڑے مسکرا رہے تھے۔



”تم بڑے جلد باز ہو سکندر! میرا انتظار بھی نہیں کیا۔“  
شاہ جہانگیر اس کے گرم انداز کو قصداً نظر انداز کر کے ہلکے ہلکے انداز میں کہنے لگا۔  
”میں کہیں بہت دودھ تو نہیں کیا تھا۔ بابا جان کے ساتھ رہتے ہو اور اسی شام لوٹ بھی آ  
وہ یوں خاموش کھڑا رہا تو شاہ جہانگیر نے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا۔

”یہاں کس کا انتظار کر رہے ہو؟“  
”اس کا میرا آپ ہی آپ نفی میں بل گیا۔“

”چلو میر کہیں بیچہ کر بات کرتے ہیں بلکہ میرے ساتھ آؤ۔ میں ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں!۔“  
شاہ جہانگیر نے اس کے کندھے پر یوں ہاتھ رکھا جیسے وہ چلنے کو تیار کھڑا ہو رہا تھا تب اس نے  
لب کشائی کی۔

”سوری بھائی۔ میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔“

میرا تیس اعزا کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔ چلو خیر، جہاں تم کہو وہیں چلتے ہیں۔ یا مجھ سے بات ہی نہیں  
کرنا چاہتے؟“  
شاہ جہانگیر نے محبت بھرے انداز میں اس کی ناراضگی کو جتا کر پوچھا تو وہ گہری سانس کھینچ کر بولا۔  
”یہ بات نہیں ہے بھائی! اصل میں میں یہاں ایک دوست سے ملنے آیا تھا۔ اگر آپ کو کوئی کام  
ہو تو کچھ دیر انتظار کریں۔ میں اس سے مل کر آتا ہوں۔ پھر گھر چلیں گے۔“

”میرے گھر؟“  
”اچھا ہاں! تم جاؤ مل آؤ دوست سے۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔“  
شاہ جہانگیر نے خوشدلی اور فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔ پھر اطمینان سے گاڑی کے ساتھ ٹیک لگا کر اُسے  
تے ہوئے دیکھنے لگے اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تب ان کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں  
نے ملنی لگیں۔

وہ جب شاہ جہانگیر کے ساتھ اپنے اپارٹمنٹ میں آیا، اس وقت تاریکی پر پھیلا چکی تھی۔ وہ ایک  
بعد ایک تینوں کمروں میں ٹوب لائیں ان کرتا ہوا دوبارہ لاؤنج میں آیا تو شاہ جہانگیر شوق  
اس کے گھر کا جائزہ لے رہے تھے۔ پھر اسے دیکھ کر پوچھنے لگے۔

”گھر والی کہاں ہے؟“  
”کونسی والی ہے؟“ اس نے بڑے اعتماد سے مسکراتے جواب دیا۔  
”کیا مطلب۔ کہیں کئی ہوئی ہے یا ابھی شادی ہی نہیں ہوئی؟“  
شاہ جہانگیر نے ہنسنے ہنسنے اسفندار کیا تو وہ الٹا ان سے پوچھنے لگا۔

”آپ کو کیا لگ رہا ہے؟“  
شاہ جہانگیر نے یوں کندھے پر ہاتھ رکھا جیسے کہہ رہے ہوں۔ ”میں کچھ نہیں کہہ سکتا! تب وہ اُن کے سامنے  
ٹپے ہوئے کھٹے لگا۔

”آئی جلدی شادی کیسے ہو سکتی ہے۔ جب تک اسی کے گھر والوں کو میری طرف سے اطمینان نہیں ہو  
وہ اپنی بیٹی۔“

”کیسا اطمینان چاہتے ہیں وہ؟“ شاہ جہانگیر فوراً بول پڑے۔ ”تم کوئی معمولی آدمی نہیں ہو۔ شاہ پور کے  
رانا کے بیٹے ہو۔ ساری زندگی صرف خود ہلکانے والی نسل کو بھی بٹھا کر کھلاکتے ہو۔ کیا تم نے ان پر اپنی  
ت و اوج نہیں کی؟“

”اب جانتے ہیں وہ۔ یہ بھی کہ جس جاگیر کے بل میں اپنی نسل تک کو بٹھا کر کھلا سکتا تھا وہ میں چھوڑ  
دن۔ اور آپ غلط سمجھ رہے ہیں بھائی۔“ ان کے پیش نظر میری مالی حیثیت کبھی نہیں رہی۔ اب بھی  
ہے۔ بس وہ بات سے خائف ہیں کہ کہیں یہ میرا جذباتی فیصلہ نہ ہو۔“

اس نے بڑے اور نکل سے کہا تو شاہ جہانگیر کچھ دیر پر سوچ انداز میں سر ہلاتے کے بعد

”سب تمہاری جلد بازی کا نتیجہ ہے، ورنہ اس وقت اسیے اس گھر میں موجود ہوتی۔“  
”بات کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے بھائی! اس نے کہا تو شاہ جہانگیر ذرا سا مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔  
”بات تم نے پہلے کیوں نہ سوچی۔“ انہیں مجھ پر اعتبار نہیں تھا یا اسی پر، بلکہ میرا خیال ہے کہ جس خود  
آپ پر اعتماد نہیں تھا۔ بہر حال تم نے مجھ چھوڑ کر سخت غلطی کی ہے۔ وہاں سے تعلق توڑنے  
میں اس سے دوسری شادی کر سکتے تھے۔ میں تمہارے ساتھ تھا کیونکہ مجھے اپنا وعدہ ہر حال میں نبھانا  
پڑا۔ بابا جان کی ناراضگی مول لے کر تم نے اپنے لیے ہی نہیں میرے لیے بھی مشکل کمزری کر دی ہے۔“

نہ ہوتی ان کے پاس آکر بیٹھ گئی۔  
 ہم نے نہیں اس لیے بلایا ہے کہ ہم تمہیں سکندر کے بارے میں بتانا چاہتے ہیں۔  
 مہر النساء جو کئی دن اس کے اندر کوئی اچھل مچھل نہیں کی تھی اس کے برعکس جیسے اسے یقین تھا کہ بابا جان اس  
 غلط بیانی کریں گے۔

غلط بیانی میں سے اور میں نے جہانگیر کو اس کے پاس بھیجا ہے۔ اسے یہ بتا دیا ہے کہ وہ اسے سمجھا جگا کر  
 سکندر کراچی میں سے اور میں نے جہانگیر کو اس کے پاس بھیجا ہے۔ اسے یہ بتا دیا ہے کہ وہ اسے سمجھا جگا کر  
 اسے دکھائیں بھی آتا کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ کہ اگر تمہارے لیے۔ جہانگیر اس کا ٹھکانا دیکھ گئے  
 قریب جی چاہے اس کے پاس چلی جانا۔ تم سے تو اس کی کوئی ناراضگی نہیں ہے اور ہمارا خیال ہے تم ہی  
 اسے مار کر لاسکتی ہو۔  
 مہر النساء کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ ایک لحظے کو چھب دکھلا کر غائب ہو گئی تھی۔ پھر اس  
 دھڑکے سے سو جا۔

کاش وہ مجھ سے ناراض ہوتا۔ میں اسے منانے کے سوجھن کرتی۔ اس کے سامنے اپنی ہستی مٹا ڈالتی۔  
 "تھاری بی بی جان تھاری تھیں تم کھانے پینے میں لا پرواہی کرتی ہو۔ ایسا خیال رکھا کرو۔"  
 بابا جان نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر شفقت کا اظہار کیا تو اس کی بے چینی توڑنے لگی اور اس  
 سے کہنے لگی کہ آج نہیں چھٹکتیں، اچھے کھڑی ہوئی۔

"میں جاؤں بابا جان؟"  
 ہوں۔ اور دیکھو شاہ جہانگیر جیسے ہی اسے اسے ہمارے پاس بھیج دینا۔ بابا جان نے اجازت  
 دینے کے ساتھ کہا۔  
 "جی، وہ ان کے کمرے سے نکل آئی اور راہداری میں رگ کر نکھوں میں اتری غمی دوپٹے  
 ماحذب کی پھراپنے کمرے میں آتے ہوئے حیران پر نظر پڑی تو اسے اسکوٹش لانے کا کہا۔ اس کے  
 اندر کے کارن کیا۔

اپنے اندر کے جھل بن سے وہ خود کسی کسی وقت بہت پریشان ہو جاتی تھی۔ ایسی حالت میں  
 رت یوں بھی اتنی اتنی رہتی ہے۔ پھر اچھا نہیں لگتا۔ اور اس کے توابنے ساتھ اچھا نہیں ہوا  
 ماؤں روزے جو وہ اچھا تھا تو اب تک مختلف سوجھن کے تانبے میں اچھا ہی رہتا تھا۔  
 ادنی سے پہلے سجانے جو صورت ہینوں کی کر جیاں سمیٹے سمیٹے اس کی انگلیاں دنگا رہ گئی تھیں۔ اور  
 بابا جان ابھی بھی کہہ رہے تھے کہ وہ اس سے ناراض نہیں ہے۔  
 اسکوٹش گھونٹ گھونٹ طق سے اتار کر وہ اپنے اندر کی تپش کو کم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن  
 فرق نہیں پڑا۔ پورا گلاس خالی ہو گیا۔  
 "اور ڈالوں بی بی جی؟"

حیران جگ لیے انتظار میں کھڑی تھی۔ اس نے گلاس سامنے کر دیا۔ اور جیسے ہی حیران نے اسکوٹش  
 ہاتھ لاس بارہ ایک ہی سانس میں خالی کر گئی۔ تو قدرے ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ بچہ دیر کے لیے  
 بڑی بیک پر سر رکھ کر اس نے ہلکی موندلیں۔ خالی گلاس ابھی اس کے ہاتھ میں تھا جب ہی حیران  
 کی کمری وہ تھی۔ جب اس نے انھیں کھولیں تو قدرے ناگوار سی ہوئی۔  
 "تم بھی نہیں ہو؟"

"نہ شربت۔ حیران نے جگ سامنے کر کے اپنے کمرے رہنے کا سبب بتایا تو وہ کارن بیل کو دیکھ کر

"یہاں رکھ دو۔"  
 حیران نے جگ رکھ دیا۔ پھر جانے کے بجائے اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر بولی۔  
 "بی بی جی ایک بات کہوں۔ آپ بڑا تو نہیں مایوس کی؟"

بابا جان کا حکم ہے کہ تمہارے ساتھ کوئی واسطہ کوئی تعلق نہ رکھا جائے۔ اور حکم عدولی کی نرا  
 ہو۔ اس کے باوجود ان میں ہینوں میں میں کئی بار تمہاری تلاش میں اس شہر کے پچھلے لگا چکا  
 "کیوں؟" شاہ جہانگیر ایک لحظے کو اس کے ہاتھ کو وہ صرف کیوں کہہ کر ہونٹ بھینچ گیا۔  
 "کیونکہ میں نہیں جانتا تھا کہ اس کے گھر والے تمہیں گھر سے نکلا ہوا اکیلا شخص سمجھ کر شادی  
 پس و پیش کریں۔ بابا جان کا حکم اپنی جگہ تمہیں اکیلا چھوڑنا بھی میرے اختیار میں نہیں ہے۔ بتا  
 چاہتے ہیں اس کے گھر والے؟ ہم ان کی ساری دیکھا بند پوری کریں گے۔"  
 شاہ جہانگیر کے ہاتھ میں اپنی حیثیت کا تقاضا تھا جسے وہ چھوڑا تھا۔ لیکن بھولا ہرگز نہیں  
 بلکہ اس کے اندر شاید یہ خواہش موجود تھی کہ وہ اسے کو اس شان سے بیاہ لائے۔ جو اس کی  
 کا خاصا رہی تھی۔ جب ہی شاہ جہانگیر کی آخری بات اور ان کے ہاتھ پر اس کی گردن آپ  
 تن گئی اور تسخیر کرنے کا احساس جلنے لگا تھا۔

"ابھی تک تو انہوں نے کوئی ڈیمانڈ نہیں کی۔ اس جمعہ کو رات کے کھانے پر بلا لیے۔ ا  
 آپ چلیں گے ناں ہمارے ساتھ؟" اس نے قدرے بے تابی سے پوچھا۔  
 "نہ صرف چلوں گا بلکہ شادی طے کر کے آؤں گا۔ شاہ جہانگیر نے منہ سے بازو پر مکا۔

بھینے کہا۔  
 "لیکن بھائی، ابھی میرا کوئی کاروبار تو سیٹ ہوا نہیں اور پیسہ میرے پاس اتنا ہے کہ  
 اس کی باقی بات شاہ جہانگیر کے ہتھتے میں دے گئی۔  
 "بابا۔ یہ تمہیں پیسے کا حساب کب سے رکھنے لگے۔ یہ کام تمہارے بس کا نہیں ہے۔ تم تو میرا  
 شادی کر کے عیش کرو۔  
 "عیش پیسے کے بل پر کیا جاتا ہے اور پیسہ مجھے کما نہیں۔ اس نے سنجیدگی سے کہا لیکن  
 اسی محفوظ انداز میں بولے۔  
 "کہانے کا شوق بھی پورا کر لینا۔ پہلے شادی تو کرو۔ گھر میں عورت ہوگی تو مجھے چاہئے پا  
 پوچھنے کی؟"

"سوری، وہ شرمندہ ہو کر فوراً کھڑا ہو گیا۔ میں بس ابھی  
 "بس رہنے دو چائے دلے، چلو کہیں باہر چل کر کھانا کھاتے ہیں۔" شاہ جہانگیر ٹوٹے  
 کھڑے ہوئے۔ پھر پوچھنے لگے۔

"تمہارے کہانے کیا انتظام ہے؟"  
 "ہے۔ اس نے اپنا روٹنڈ کی چابیوں کی تلاش میں نظریں دوڑاتے  
 "باہر ہی کھ  
 "کوئی خاصا مان نہ دیکھو نہ نئی دلہن کو کرتے ہی کام سے لگا دینا اچھی بات نہیں ہے  
 ان کے فراخ دلانہ مشورے پر وہ ذرا تندرست لگا کر بولا۔

"فی الحال افروز نہیں کر سکتا۔  
 "تمہیں یہ باتیں زیب نہیں دیتیں سکندر ابھی ہمیشہ والی آن بان اور شان سے رہو۔  
 نہیں کرنا۔ میں کہیں تمہارا اکاؤنٹ خالی نہیں ہونے دوں گا۔"  
 شاہ جہانگیر نے اتنے مضبوط ہاتھ میں کہا کہ اس نے خاموش رہنا مناسب سمجھا تھا۔

بابا جان کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے مہر النساء نے دوپٹے کو اچھی طرح سر  
 اندر داخل ہو کر سلام کر کے یوں کھڑی ہو گئی جیسے اب اسے صرف بابا جان کی بات سن  
 کچھ بھی نہیں۔ جبکہ کہنے کو اس کے پاس بہت کچھ تھا۔  
 "یہاں مگر بیٹھ مہر النساء، بابا جان نے اپنے برابر اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ دھیر  
 دھیر

”کیا بات ہے؟“ اس کی پشانی پر ہلکی سی ٹمکنیں نمودار ہوئیں تو جیراں کچھ ڈرتے ڈرتے کہنے لگا۔  
 ”وہ جی۔ جہاں میری نانی کا قہر ہے وہاں ایک سائیں جی رہتے ہیں۔ بڑے پہونچے (پہنچے) ہیں۔  
 ”پہنچے؟“ ساری عورتیں اُن کے پاس جاتی ہیں۔  
 ”بھیر؟“ اس کی پیشانی کی لکیریں گہری ہوئیں لیکن اُن میں غصہ یا ناگواری نہیں تھی جب ہی آرام سے کہہ گئی۔  
 ”اگر آپ کہیں تو میں چھوٹے شاہ جی کے لیے تعویذ لا دوں۔“  
 ”شاہ کے لیے؟“ وہ ایک جھٹلے سے مسہری کی بیگ چھوڑ کر سیدھی بیٹھی۔ ”کیا ہوا شاہ کو؟“  
 ”اللہ کرے بی بی، جو اپنے چھوٹے شاہ جی کو کچھ ہو۔ جیراں اس کے تیوروں سے ہم کر کھڑی ہوئی۔“

”بھیر تم نے اُن کا نام کیوں لیا؟“  
 ”غفلت ہو گئی بی بی جی، معاف کر دیں۔“  
 ”کانچی آواز میں کہہ کر جیراں نے پیچھے یوں دیکھا جیسے اُس کا اشارہ ملے، ہی بھاگ کھڑی ہوگی۔  
 مہرالنساء کچھ دیر تک اسے کھڑی رہی پھر دھیرے دھیرے اُس کی پیشانی کی لکیریں صاف ہونے لگی تھیں۔ اس کے بعد جب اُس نے جیراں کو پیٹنے کے لیے کہا تو اس کے بچے میں مالا دھیر نہیں تھا۔  
 ”کیا کہوکی سائیں جی سے؟“ وہ اب دھیمی آواز میں پوچھ رہی تھی۔

”میں انہیں بتاؤں گی بی بی جی کہ چھوٹے شاہ جی گھر نہیں آتے۔ بھیر وہ ایسا تعویذ دیں گے کہ چھو شاہ جی بھاگے آئیں گے۔ ساری زندگی غلامی کریں گے آپ کی۔“  
 جیراں قدرے جوش سے کہہ رہی تھی اور اس تصور سے ہی اُس کی گردن اکڑی جا رہی تھی۔

”جمعے کی نماز سے فارغ ہوتے ہی وہ اور میمونہ بھائی بچن میں مصروف ہو گئیں۔ دوپہر کا کھانا،  
 نے نماز سے پہلے ہی کھایا تھا اور اب رات کے کھانے کی تیاری تھی۔ وہ بھی مہانوں کے لیے۔ اور  
 خاصا اہتمام کرنا تھا۔ کتاب، کوفتے، بریانی، قورمہ اور سویت ڈش میں بھی دو انیم شامل تھے  
 پر بھی عدیل بھائی نے بچن میں جتنا تک کر ایک آدھ ڈش کا مزید اضافہ کرنے کو کہا تو میمونہ بھائی  
 چسپاں۔“

”ہرگز نہیں۔ مجھے تو آج کی تاریخ میں یہ سب بھی پکتا نظر نہیں آ رہا۔“  
 ”مجھ سے کیا کر رہی تھیں آپ؟“ عدیل نے قہر سے آسید پر نظر ڈال کر کہا تو میمونہ بھائی با  
 لڑنے کے لیے تیار ہو گئیں۔  
 ”کیوں دوپہر کا کھانا تم نے پکا یا تھا۔ گھر کی صفائی بھی تم نے کی اور پتوں کو بھی تم نے ہنڈیا  
 ہم تو ابھی ستر سے نکل کر بچن میں آئے ہیں۔ ویسے تم اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہو تمہارے  
 والے تو نہیں آ رہے۔“

”میرے سسرال والوں کو آپ بے شک جانتے بھی نہیں پلو ایسے گا۔“  
 عدیل نے کہا تو قہر سے ہونے اُس کے ہاتھ ایک لحظے کوڑکے تھے۔  
 ”اچھا بس، جاؤ یہاں سے، ہمیں کام کرنے دو۔“  
 میمونہ بھائی نے انہیں دھکیل کر باہر لگا لایا۔ ”بھیر اُس سے کہنے لگیں۔  
 ”سنو۔ تم کوفتے بناؤ کیونکہ مجھے کوفتے بنانے میں کوفت ہوتی ہے۔“  
 ”مجھے آپ سے زیادہ کوفت ہوتی ہے۔ اس لیے میرا خیال ہے یہ آئم گول کر جائیں۔“  
 ”ڈونگا انہیں تمہاتے ہوئے بولی۔“

”اور عدیل؟“ کیا ضرورت ہے اور مہانوں کے سلسلے تو وہ کچھ کہنے سے رہے۔ بعد میں آپ  
 پٹ بیٹھے گا۔ ابھی تو کتاب بنا کر فریق میں رکھیے۔ میں جب تک قورمے کا مسالا تیار کرتی ہوں،  
 وہ خامی علت میں اور مصروف رہ کر بول رہی تھی۔ جب میمونہ بھائی بھی باتوں میں وقت ضائع  
 کرنے کے بجائے کام میں مصروف ہو گئیں۔  
 ”شام تک سب کھانا تیار ہو گیا۔ صرف کتاب تلنے باقی تھے۔ جیراں اُس نے کھانے کے وقت ہی  
 لے کر مشرفہ دیا۔ اس کے بعد میمونہ بھائی کے کہنے پر نہانے اور کچھ دیر آرام کرنے کی عرض سے اپنے  
 رے میں آگئی۔ ”کوکر اس کا مہانوں کے سلسلے جانا متوقع نہیں تھا۔ البتہ ناگہ اور اس کی اتنی اُس  
 نے کہے میں آسکتی تھیں۔ اسی خیال کے تحت پہلے اُس نے اپنا کمر اٹھک بھاگ کیا پھر نہانے  
 لگئی۔“

”بھیر جب شام گہری ہو کر تاریکی میں ڈوب رہی تھی تب مہانوں کی آمد نے خوشگوار سی پہلی مچا  
 ی تھی۔ شاہ سکندر سے مصافحہ کرتے ہوئے عدیل کی نظر شاہ جہاں گھر کو دیکھ رہی تھیں۔ جن کے  
 ملازمین وہی تافخا اور زعم تھا جو اوّل روز شاہ سکندر میں نظر آیا تھا۔“

”یہ بڑے بھائی ہیں۔ بڑے بھائی، شاہ جہاں گھر حیات۔“  
 ”شاہ سکندر نے اُن کا تعارف کرایا تو سب کی نظریں بے اختیار اُن کی طرف اٹھی تھیں۔ یقیناً چونکا  
 نے والا سر ہلانا تھا۔ جس نے خدمتوں کے درمیان اطمینان کی لہر دوڑادی تھی۔  
 ”بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ عدیل کے بعد اب جی بھیر خلیں بھائی نے شاہ جہاں گھر کے ساتھ  
 صاف کر کے ہوتے انہیں بھائی۔“

”مجھے بہت پہلے آنا چاہیے تھا۔ اس وقت جب شاہ سکندر نے آپ کے بارے میں بتایا تھا۔“  
 ”شاہ جہاں گھر بیٹھے ہی اب جی کو دیکھ کر کہنے لگے۔“ لیکن ایک تو مصروفیات نے پیچھا نہیں چھوڑا۔  
 دوسرے میں پہلے اپنے والدین کو کونسل کرنا چاہتا تھا۔ میری والدہ اور ہمیں تو بہت خوش ہیں۔  
 بیٹے والد صاحب۔“

”نورالام، وہ بھی زیادہ دیر نا لاض نہیں رہیں گے۔ سکندر نے یہاں آکر انہیں سوچنے پر تو مجبور  
 رہی دیا ہے لیکن ظاہر ہے وہ بڑے ہیں اور انہیں اپنی بات تو رکھنی ہی ہے۔ اس لیے انہوں نے  
 لدہ اور بہنوں پر باندی لگا دی ہے ورنہ والدہ صاحبہ آئے کو تیار تھیں۔“  
 ”اب جی کیا کہتے۔ بس اُن کی باتوں پر سر ہلانے جا رہے تھے۔“  
 ”البتہ والدہ صاحبہ نے۔“

”شاہ جہاں گھر نے کچھ کہتے ہوئے شاہ سکندر اور احمد حسن کو دیکھ کر جلنے کیا اشارہ کیا کہ وہ دونوں اٹھ کر  
 برہنہ گئے۔“  
 ”میں آسید باجی سے مل لوں؟“  
 ”ناگہ کو اتنی دیر سے بولنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ ذرا دیر کی خاموشی سے فائدہ اٹھا کر فوراً کھڑی  
 کی۔“

”غور۔ چلی جاؤ گی یا میں۔“ میمونہ بھائی اٹھنے لگیں کہ وہ بول پڑی۔  
 ”میں چلی جاؤں گی۔“

”آپ کلنے سے پہلے کچھ لیں گے۔ سیون آپ وغیرہ۔“ خلیں بھائی نے شاہ جہاں گھر کو متوجہ کر کے  
 ”فرنگس۔“ شاہ جہاں گھر نے منع کرتے ہوئے دروازے کی سمت دیکھا جہاں سے شاہ سکندر اور  
 ”نہ سارمان کے ساتھ داخل ہو رہے تھے۔ میمونہ ناٹ سوٹ کیس اور چھوٹے بڑے کی بیٹ

جنہیں اماں جی کے سامنے رکھ کر وہ دوبارہ اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ تب شاہ جہاں گھر پہنچا۔ یہ ہماری والدہ صاحبہ نے کچھ جانتے سمجھتے ہیں۔ ہمارے لیے سب سے بڑا تحفہ ان کی خوشی ہے۔ یہ سب تو یہ عدیل کی سمجھ میں نہیں آیا کہیں۔

”اپنی خوشی کا اظہار انہوں نے کسی طرح تو کرنا ہی تھا بلکہ انہوں نے تائید کی تھی کہ شادی طے کر کے پہلے ہم یہ آپ کی نذر کریں کیونکہ یہ ہمارے ہاں کا دستور ہے۔“

شاہ جہاں گھر بہت اعتماد سے پوری محفل پر اپنی گرفت مضبوط کیے ہوئے تھے۔ یوں کہ اپنی با میں کہیں بھی کوئی اختلاف کا پہلو نہیں چھوڑ رہے تھے۔

”میرا خیال ہے۔ اب کھانا ہو جائے۔ باقی باتیں۔“

خلیل بھائی کے اشارے پر میز پر بھائی آ گئے ہوئے بولیں تو شاہ جہاں گھر نے فوراً ہاتھ اُٹھ کر سرسید کو روک دیا۔ اس کا سر سہلانے لگی، تو سیمیا بھابی جو اس کی طرف سے سمیہ کو ڈانٹتے تھیں اس کے برعکس دیکھ کر یہ کام انہوں نے کر ڈالا۔

”ایک منٹ خاتون! تشریف۔“

”میتھو بھابی جس طرح کھڑی ہوئی تھیں۔ انسی طرح بیٹھ گئیں۔“

”کھانے سے پہلے تم میٹھا پسند کریں گے؟ شاہ جہاں گھر نے نسبت میں آرام دہ انداز کرتے ہوئے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو میٹھو بھابی تو سمجھیں نہیں لیکن ابابھی فوراً کچھ پوچھنے لگے۔

”آپ کا معمول ہے پہلے میٹھا کھانا یا۔“

”معمول سے ہٹ کر صرف اس وقت، وہ بھی آپ کی اجازت سے، ہم پہلے منہ میٹھا کریں شاہ جہاں گھر نے جواب دینے کے ساتھ اپنی بات کی وضاحت بھی کر دی۔

”ابابھی نے پہلے اماں جی پھر باری باری بیٹوں کو دیکھا اور ان کی آنکھوں میں رضامندی دیکھ بولے تھے۔

”عدیل! جاؤ پہلے مٹھائی لے آؤ۔“

”آپ نے کہاں کر دیا بھابی؟“ رات سے شاہ سکندر کی ہر بات کا اختتام اسی جملے پر ہوتا تھا۔

”مجھے بالکل یقین نہیں تھا کہ وہ اتنی قریبی تاریخ پر آمادہ ہو جائیں گے۔“

”مجھے اگر اسلام آباد نہ جانا ہوتا تو میں اس سے بھی قریبی تاریخ طے کرتا۔ خیر چند دن بھی نہیں ہیں۔ اتنا وقت تو نہیں بھی تیار کیے لیے چاہیے۔“ وہیں کے زیورات اور کپڑوں کی دکان کے لیے احمد حسن کی والدہ سے کہو۔ میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا کہ شادی سے دو پہلے آسکوں۔ پس دعا کرو بابا جان کہ کوئی کام نہ نکل آئے۔“

شاہ جہاں گھر اسے ہدایت دینے کے ساتھ اپنی طرف سے اطمینان بھی دلا رہے تھے۔ پھر کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگے۔

”پیسوں کی بالکل فکر نہیں کرنا۔ اور ہاں کوئی چھوٹا موٹا کام کرنے کا بھی نہیں سوچو۔ شادی کر کے ہوجاؤ پھر اپنے لیے کوئی بڑا بزنس سوچنا۔ اپنے شاہان شان۔“

”اُن بات میں سر ہلاتے ہوئے شاہ سکندر کے بزنسوں پر چلتی ہوئی مسکراہٹ تھی۔

”اب میں چلتا ہوں۔ دو پہر کے کھانے تک گھر پہنچ جاؤں تو اچھا ہے۔“

شاہ جہاں گھر دیکھتے ہوئے گھر سے ہو گئے تو اس نے بھی ان کی تھلید کی۔ اور ان سے

ہوادرازے تک آیا۔

”بھئی کے لیے کوئی پیغام ہو تو؟“ شاہ جہاں گھر نے دروازے میں دنگ کر اُسے خوش نظرد سے دیکھا لیکن وہ ایک دم سنبھرا ہو کر بولا۔

”نہیں بھائی! کسی کے لیے کوئی پیغام نہیں۔“

”اُدھے۔ خدا حافظ! شاہ جہاں گھر اس کا گندھا جھٹک کر باہر نکل گئے۔ تو کچھ دیر وہ اُن کے پیچھے نظروں جماتے ہوئے دروازہ بند کر کے اندر گئے یہاں تک کہ گھر کا خیر ظاہر کرنے لگا۔ رات سے اُس کا دل اُس سے بات کرنے کو چل رہا تھا۔ دوسری بل پر میسے ہی اس کی آواز سنائی دی۔ وہ گہری سانس لیچتے ہوئے بولا۔

”تھنکس گاڈ! میں ڈر رہا تھا کہ میں سا لداں تمہارے ممبر ڈائل کرنے میں ناکام رہتا۔“

”اس کے لیے آپ کو میرا شکریہ ادا کرنا چاہیے؟ وہ تھکنکی ہوئی آواز میں بولی۔

”کیوں، کیا نہیں یقین تھا کہ میں فون ضرور کروں گا؟“

”جی۔ اور اسی لیے میں صبح سے فون کے آس پاس موجود ہوں؟ اُس نے کہا تو وہ جلدی سے بولا۔

”بہت بہت شکریہ لیکن ایک شکایت ہے تم سے۔“

”کہنا؟“

”رات سب کے بلاتے پر بھی تم کھانے میں ہمارے ساتھ شریک کیوں نہیں ہو پڑیں؟“

”کیا مجھے آنا چاہیے تھا؟ وہ الٹا اُس سے پوچھنے لگی۔

”کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ خیر تم نے جو کیا ٹھیک کہا۔ یہ بتاؤ ان بندرہ دونوں کے دوران کسی دن ملاقات ہو سکتی ہے؟ وہ بڑی اُس سے پوچھ کر اُس کا جواب سننے کو بے تاب ہو گیا۔

”نہیں شاہ سکندر! یہ ممکن نہیں ہے اور پھر آپ مجھے مجبور نہیں سمجھیں گے۔“

”اُس نے عاجزی سے کہا تو وہ خاموش ہو گیا اور قدرے توقف سے بیکار کر کہنے لگا۔

”سنو آسید! میں بہت خوش ہوں۔ حالانکہ اپنی اب تک کی زندگی میں میں نے جو چاہا، پایا۔ پھر بھی یوں لگ رہا ہے جیسے میری زندگی کی اولین تمنا پوری ہوئی ہو۔ اور اپنے کے احساس نے میری روح تک کو سرشار کر دیا ہے۔ اتنا خوش شاید میں کبھی نہیں ہوا۔“

”اپنی خوشی میں یہ نہیں بھولنے کا شاہ سکندر! کہ میں کوئی بہت عام سی لڑکی نہیں ہوں۔ میرے قریب، میری سوچیں صرف ایک خوبصورت گھر تک محدود نہیں ہیں۔“

”اسیہ نے بڑی خوبصورتی سے اپنی بات دہرا کر اُسے اُس کا وعدہ یاد دلانے کی کوشش کی۔

”امروہ بھولا نہیں تھا۔“

”مجھے یاد ہے آسید! میں تمہارے مقصد کی راہ میں حائل نہیں ہوں گا! لیکن تمہیں کچھ انتظار کرنا پڑے گا۔“

”اس کے بعد ہم قدم مجھے اپنے ساتھ پاؤں کی۔“

”شکریہ شاہ سکندر! مجھے یقین ہے مرا انتظار زیادہ طویل نہیں ہوگا۔“

”اسیہ نے ممنونیت سے کہہ کر تسلسلہ منقطع کر دیا تو اُس نے ہونٹ ہنسیں کر کے بوسہ دیا پھر گردن پر ہونٹ دے ہوئے اُس کی آنکھوں میں جانے کس سوچ کی پر چھایاں اترنے لگی تھیں۔

گوکہ بچی کے پیدا ہونے ہی اُسی وقت سے اُس کی رخصتی کی تیاریاں بھی شروع ہوجاتی ہیں۔ اماں دینی نے اُس کے لیے بہت کچھ غور کیا تھا۔ اس کے باوجود بہت کچھ باقی تھا۔ اور اتنے کم معقول میں سب کچھ کرنا تھا کہ وہ اس گھر کی اکیلی لڑکی تھی۔ بھائیوں کی لاڈلی، بھابیوں کی چینی اور صحیح اماں جی سے پیچ بولھا لگی تھیں۔ اسلام آباد فون کر کے شکیل بھابی اور سیمیا بھابی کو فوراً آئے کہ کیا

اُس نے باری باری سب بچوں کو دیکھا۔ سب کے ہنٹوں میں شریز مسکراہٹ دہی تھی اور ایک دوسرے کی زبان بھی مامور رہے تھے۔ اُسے مہربانی اُٹھی۔ اُسے آرام سے بیٹھنے والے ہیں۔ سہا جہانی نے کہا اور سر جھٹک کر اپنے میں مصروف ہو گئیں۔ جو اُس نے اشارے سے سمجھ کر اپنے اس بلایا اور دو گئیں جھگڑا ہستہ آواز اُس سے جس نے کیا باتیں کہنے لگی تھی کہ دوسرے بچوں میں بے جہت پھیل گئی کہ بھو بھو اُن سے باتیں نہیں کریں۔ اُس نے رہا نہیں کیا تو پھر دکر بول چھپنے لگا۔

وہ بیوقوف بھائی کو گھوڑے لے گئی تھی کہ ادھر سویا نے اپنی قابلیت ختمانی شروع کر دی۔  
 "اسان بی نے لال غرارہ بنایا ہے۔ وہ بیٹیں گی بھوجو، اتنی بیاری لیکیں گی۔"  
 "اور دوہا کون بنے گا؟" اشعر نے یوں پوچھا جیسے کوئی ڈراما کھیلنا جارہا ہو جس پر میرا وجود کے  
 ماتھے وہ بھی لے ساتھ پرس پڑی۔  
 "میں بنوں گا، سب کے درمیان خاموش بیٹھنے والا نیل جانے کسے بول پڑا۔  
 "افوہ۔ نہیں نیل بھائی! بھوتھوئی شادی آپ کے ساتھ متورہی ہو رہی ہے۔ وہ تو۔ وہ اچھے والے  
 نکل میں ناں۔ ان کے ساتھ ہوں گی۔  
 سویا کی بات پر ردہ تینوں ادھر متوجہ ہو گئی تھیں۔

”اس جالاکو ماسی کو سب بتا ہے۔ بڑی تیز ہو گئی ہے“  
 ”کس پر تھی ہے؟“ سیمّا جہانی متوجع تھیں۔  
 ”مجھ پر نہیں لگی۔ میں بہت سیدھی سادی ہوں اور اس کی عمر میں تو مجھے یہ بھی پتا نہیں تھا کہ شادی  
 کس پر اٹکانا نام ہے۔“  
 ”میسورہ جہانی نے نہیں پوچھے کہ۔ تبھی بنیل آسید کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہہ لو چھپے لگا۔“

”بتائیں ناں بھوجیو، آپ کہاں جائیں گی؟“ بیل نے پھر اس کا بازو دلا کر پوچھا۔  
 ”بھوجیو اپنے گھر جائیں گی، بیٹا، ان کی شادی ہو رہی ہے۔ ناں اور یہ تو خوشی کی بات ہے۔“  
 ”سیاٹھانی نے فقہاء خوشی کا اظہار کر کے بیل کو پہلانے کی کوشش کی۔  
 ”ہاں دیکھو، سب خوش ہو رہے ہیں۔“ میمونہ جھانی بھی اپنے انداز میں شروع ہو گئیں۔ ”یہ اتنے  
 اچھے اچھے کپڑے دیکھ رہے ہو، یہ سب ممتاز سی بھوجیو کے ہیں، جب تم سے ملنے آئیں گی تو یہی  
 اچھے کپڑے پہن کر آئیں گی، بہت اترا میں گی۔ ہاتھوں میں چوڑیاں کھنکھار کر کھکھکا کر سنیں گی، اسے  
 ناں اسمہ“

اور شکیل بھائی ظاہر ہے نوکری والے تھے۔ البتہ سیما بھائی کو انہوں نے اچھلے دن ہی بیچ دیا۔  
 سے میمونہ بھائی کو بڑا سہاوا ہو گیا۔ فرید خیر و غزہ کے لیے شاہ سکندر نے منہ کر دیا تھا۔ پھر  
 اس کے اپارٹمنٹ میں گنجائش نہیں تھی۔ اور اس نے تو اور بھی بہت چیزوں کو منہ کیا۔ لیکن  
 جی نہیں مانی۔

کے ساتھ گئے گا۔ جماعتوں اور عجمیوں نے ان کی تائید کی۔ میموزہ جہانی کا کہنا تھا کہ لوگ شادی میں اس پر زیادہ اس کا جہیز دیکھنے آئیں گے۔ کہ چار لاکھ فائق جماعتیوں کی نہیں کیا کچھ لے کر جا رہی ہے۔ پھر تو آپ کو جہیز پر ٹکٹ لگا دینا چاہیے۔ سارے پیسے وصول ہو جائیں گے۔ اُس نے میموزہ جہانی کی بات سن کر شرارت سے کہا۔

بہر حال پہلا ہفتہ تو سہما جہانی اور میموزہ جہانی کا بازاریوں کے چکر کاٹنے میں نکل گیا۔ اس کے پیکنگ کا مرحلہ آیا تو وہ بھی اُن کے ساتھ شامل ہو جاتی کیونکہ گھر کے کام کاج امان جی اُسے چنبھ دے رہی تھیں۔ اور فارغ بیٹھنا اُس کے لیے مشکل ترین کام تھا۔ اُس وقت وہ جہانی ہاتھ پٹانے کی عرض سے اُن کے پاس آکر بیٹھی تھی کہ میموزہ جہانی اُسے دیکھ کر کہنے لگیں کہ ”مجبب چلی جاؤ گی تو سب سے زیادہ تمہاری کمی مجھے محسوس ہوگی۔ سچ مجھے تو سوچ کر دہو رہی ہے۔“ پتا نہیں میرے دن کیسے کیوں گے۔ آف میں تو بولے بغیر رہ بھی نہیں سکتی۔“ جی سے میں کیا باتیں کر رہی تھی۔ اُس نے بڑے آرام سے کہا تو میموزہ جہانی بے مازہ دہی باتیں جو سمجھ سے کرتی ہیں۔ اُس نے بڑے آرام سے کہا تو میموزہ جہانی بے مازہ

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ وہ اس نے پوچھا۔  
 ”سیاحیابی بیٹے ہی شاہ مسکنہ کا نام نیلے جانے پر پنس رہی تھی۔ اس کے اپنے  
 مہاجری بھی اُن کے ساتھ شامل ہو گئیں تو وہ جرنل سی ہو کر سوٹ کیس کھولنے لگی۔  
 ”اُسے مت پھوٹو، بڑی مشکل ہے پیک کیا ہے“  
 ”معمو نے مہاجری بیٹی روک کر چلائی تو اُس نے سوٹ نکلیں پھوٹ دیا اور گنٹن کے گرد بازو  
 بدھ گئی۔ کچھ روٹھا روٹھا سا انداز تھا۔ بھی بچے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے آئے

”اُف۔ یہ بحیثہ کامسر بڑی روڑ ہے اس کے سرے پر۔“ اسی کی افواہ بڑی تھی کہ بھانگے  
 ”ایک جگہ چین سے نہیں بیٹھا جاتا تم لوگوں سے۔ ایسی کیا افواہ بڑی تھی کہ بھانگے  
 ”نہیں ڈانٹیں بھابی! بچتے ہیں!“ اس نے ڈرے ہوئے موصوم چہروں کو دیکھ کر ان کو  
 ”بچوں کو آرام کے بیٹھا منع ہے کیا۔ چلو سب ادھر آ کر بیٹھو۔“  
 ”سیا بھابی نے لائن سے اشارہ کر کے سب کو ایک جگہ بٹھایا پھر انہیں ہونٹوں پر انگلی  
 ”اُس نے فوراً احتیاج کیا۔“

و اس کے گورنر اس وقت یہاں پہنچے۔  
 ”یہ زیادتی ہے یہاں تو گے،“ سیاہ بال رعایت برتنے کو تیار نہیں ہوئیں۔  
 ”نہیں بس، یہ خاموش بیٹھیں گے،“ سیاہ بال رعایت برتنے کو تیار نہیں ہوئیں۔  
 ”ٹھیک ہے میں انہیں اپنے کمرے میں لے جاتی ہوں“ وہ کہتے ہوئے اٹھنے لگی۔  
 ”اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔  
 ”کوئی ضرورت نہیں ہے کہیں جانے کی، یہیں بیٹھو، بچوں نے کون سا ہمدردی بات  
 ہے۔ ابھی دیکھنا کیسے بولیں گے“

”ارے، میں سننے کی بات کر رہی ہوں، تم زور ہی ہو یہ میوہ جہانی نے سرنش کے اندر کہا تو وہ دھڑکے سے بولی تھی۔“  
”بیل کا خیال رکھیے گا جہانی!“

جب تک وہ آبائی، املائی، بھائیوں اور بھائیوں کے حصار میں کھڑی تھی اُس کی آنکھیں دوری کے خیال سے سادون برساتی رہی تھیں۔ باری باری سب نے اُسے گلے لگا کر دھروں دس۔ ساری زندگی وہ ان مہنتوں کی عین مہنتی آتی تھی۔ کہیں کوئی تنگی کوئی غم نہ ہوئی تھی۔ اور ان کرنے والی مہنتوں نے اُسے شاہ سکندر کے شک رخصت کرتے ہوئے اُس کے سارے اپنے پاس رکھ لیے تھے۔ اس کا ادراک اُسے بابل کی دہلیز پار کرتے ہی ہو گیا تھا کہ جو اگلے برسات رہی تھیں۔ ان میں یقیناً نئے سفر کی رعنائیاں سمٹ آئی تھیں۔ اور پھر وہ جانے والا پرت پرت بننے کی بجائے اس کا دل اس شخص کی محبت پر ہونے ہوئے دھڑکنے لگا تھا جو اُسے بازو کے حلقے میں لے کر امارت کی طرح چل رہا تھا۔  
شاہ جہانگیر نے پہلے جاکر دروازہ کھول دیا تھا اور نالہ بھاگ کر دروازے کے پتے کھڑی ہو گئی۔

”میرا ننگ“  
”میں دوں گا تو کیا کرو گی؟ شاہ سکندر کا انداز چڑانے والا تھا۔ جیسے اب وہ کچھ نہیں“  
”میں آپ سے ہمیشہ کے لیے روٹھ جاؤں گی۔“  
”اور میں تمہیں روٹھتے نہیں دوں گا“ شاہ سکندر نے جیب میں ہاتھ ڈال کر لال لال نوٹ پھرا اُس کے سامنے لہرا کر بولا۔  
”پہلے راستہ چھوڑو۔“  
”نالہ نے راستہ چھوڑنے سے پہلے اُس کے ہاتھ سے نوٹ جھپٹ لیا۔ ادبھاگ کر کھاٹن آن کر دیا۔“

”ہمارے بھائی برساؤ، میرا محبوب آیا ہے۔“  
شاہ جہانگیر بے حد خاموش نظروں سے جہانی کو دیکھتے لگے۔ جس کا چہرہ حقیقی سرتوں سے رہا تھا۔  
”سکندر!“  
”ملا ارادہ انہوں نے اُسے آواز دے ڈالی۔ جو شاید شاہ سکندر نے سنی نہ ہو۔ ایک تو بیٹ کی آواز تیز تھی۔ دوسرے اُس کا سارا دھیان پہلو میں مٹی آسید کی طرف تھا۔ جس سے گھٹکتے کے باعث جھلنے میں دشواری ہو رہی تھی۔“

”دیکھو تمہیں شاید بھائی ملا رہے ہیں۔“  
”امد حسن کی امتی نے آگے آکر آسید کو کھاتے ہوئے اُس سے کہا تو اُس نے فوراً گھر کو بھیج دیا۔ شاہ جہانگیر امد حسن کے ساتھ ڈرائنگ روم میں جا رہے تھے۔ وہ آسید کے کپکپے سے دبا کر ان کے پیچھے چلا گیا۔“

”اب تو میں دہن دیکھ سکتی ہوں ناں؟ وہ مہری پر بیٹھی تھی کہ نالہ نے بڑھ کر بڑے اُس کا گھونٹ گھٹ لٹ دیا۔ اور بے اختیار واہ کہتے ہوئے بولی۔  
”اسی لیے آپ کی تمباکیاں دیکھنے نہیں دے رہی تھیں کہ ہمیں نظر نہ لگ جائے۔“  
”لگ رہی ہیں آپ۔“

”ماشاء اللہ کہو!“ نالہ کی امتی نے عقب سے بولا۔  
”ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ۔“ نالہ ایک ہی سانس میں کہے گئی پھر کھٹکھا آسید کے ہونٹ ذرا سی مسکراہٹ کی گرفت میں آ گئے۔

”جلو اب جہاں تو ننگ نہیں کرو، جا کر امد حسن سے پوچھو۔ گھر کب چلنا ہے؟“  
”انہا ٹیک کر اُسے اٹھا دیا۔ پھر اس کی جگہ خود بیٹھیں تو آسید کی غمزدگی چھو کر بوجھنے لگیں۔“  
”تم نے کہا نا بھی کھایا ہے کہ نہیں؟“  
”اُس نے پہلے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔“

”ٹھیک ہے تو نہیں کھایا ہوگا۔ خود دھوا اور پھل یہاں رکھے ہیں۔ اور کپن میں کھانا بھی موجود ہے۔ جوت لگے تو کھا لینا۔ اپنے گھر میں ہو، اب تو سب تمہیں ہی سنبھالنا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ میں کوئی برا عمل نہیں ہوں گی۔“  
”آئی امین ذمہ داری جہاں کہ اُس اُس کی ذمہ داری کا احساس دلا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔“  
”مجھے ذمہ داری اُسے سلی علی آواز میں سنائی دیتی رہی۔ جن میں نالہ کی آواز نہ تھی۔ اس کے بعد خاموشی جھانپنے پر وہ یہی سمجھی کہ سب چلے گئے ہیں۔ جہاں امد حسن نے اپنے خیمے کی سیڑھی چھوڑ کر اُس کے ساتھ اپنی اگلی ہونٹ کر لگا ناچا ہوتی تھی کہ قدموں کی آواز پر دوبارہ آشی پوزیشن میں بیٹھ گئی۔ یہی دروازہ کھلنے کے ساتھ شاہ سکندر کی آواز سنائی دی۔

”آسید!“  
”جہاں بھائی آ رہے ہیں۔“  
”اُس کا بھائی تھا سرتو زید جیک گیا۔ چند لمحوں بعد شاہ جہانگیر نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے سلام لیا۔ پھر مہری کے قریب رُک کر کہنے لگے۔“  
”املا!“  
”اُس نے اس وقت یہاں آنا تو نہیں چاہیے تھا۔ لیکن مجبوری ہے کہ مجھے ابھی والپس شاہ پور جانا ہے۔ اور اب کو شادی کا تحفہ دینا بھی ضروری تھا۔ جس کے لیے سکندر کا اصرار ہے۔“  
”میں اپنے ہاتھوں سے آپ کو دوں۔“  
”یہی قبول فرمائیے۔“  
”آسید بے شکل ذرا سا سر اونچا کر سکی پھر دونوں ہاتھ بڑھا کر پیٹتے تھا۔

”خوش۔ ہو۔“  
”شاہ جہانگیر نے آسید کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا پھر فوراً کمرے سے نکل گئے تو ان کے پیچھے شاہ سکندر کو اُس نے پکارتے دیکھا پھر ہاتھوں میں تمام پیٹتے ایک طرف رکھ کر آرام دہ انداز میں بیٹھ گئی۔ کہنے لگے جیب چاپ سرگ گئے۔ خود میں رکھے اپنے خانی ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے وہ کسی خوبصورت خیال میں غرق ہوئی کہ اچانک شاہ سکندر نے اُس کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔  
”خبر۔ میں نے شہت کی نگہوں سے پڑا رہا ہے۔“

”آسید نے ذرا سی پلٹیں اٹھائیں لیکن اُس کے چہرے کو نہیں دیکھ سکی۔ تب وہ اُس کی جھکی ہوئی نظروں کے سامنے لیٹ گیا۔ اور دونوں بازو دائیں بائیں پھیلا کر نکھیں بند کر کے بٹے رہے۔“  
”مجھے یقین دلاؤ اُس کو تم میری ہونچل ہو۔ اور اگر یہ خواب ہے تو مجھے ہمیشہ کی نیند سلا دو۔“  
”ات۔“ اُس کا دل بڑی زور سے دھڑکنے لگا۔ اور بہت دھڑکنے سے ہاتھ بڑھا کر اُس کی پیشانی پر اُسے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر پھر اچانک زور سے جھڑک کر بولی۔  
”یقین کر لیں۔“  
”بڑی نالہ ہو۔“ شاہ سکندر نے اُس کی کمان تمام کر جھٹکے سے اُسے اپنے سینے پر گر لیا تھا۔

”میں سادق کی نرم، لطف اور قدر سے خنک ہوانے برا و راست اُس کے جبرے کو چھو ا تھا۔“  
”جہاں اس کی آنکھ کھل گئی۔ نظروں کے عین سامنے کھڑی کھلی ہونے کے باعث پروہ لہرا ہوا تھا۔ اس نے شاہ سکندر کی مندر کے خیال سے اُس کے بازو کے حلقے سے نکلنے میں بہت احتیاط سے کام لیا پھر اسی طرح مہری سے اُس کی کھڑکی کے پاس آکھڑی ہوئی۔ اور پردہ کھینچ کر دھیرے دھیرے اُس کے اگلے میں پیٹ کر اپنی زندگی میں اچانک پھیرنے والے کو دیکھنے لگی۔ کہی اور رُسکون مند میں وہ ہمیشہ سے زیادہ اچھا لگ رہا تھا۔ کچھ دیر وہ اُس پر نظروں جمائے کھڑی رہی پھر لماری





”جی باباجان! شاہ جہانگیر بڑے مخلوط انداز میں مسکرائے۔  
 ”کوئی مسئلہ تو نہیں سوا؟“  
 ”نہیں، سب ٹھیک ہوگا۔ بہت خوش تھا سکندر، میں نے اُسے پیسے بھی دے دیے اور ساتھ آج کی تاریخ کے ٹکٹ بھی، میرا خیال ہے ایک مہینہ ضرور گھومتے پھرنے میں گزارا۔  
 شاہ جہانگیر کا انداز روبروٹ پیش کرنے والا تھا۔  
 ”ہوں، باباجان نے پُر موع انداز میں سر ملایا پھر انہیں دیکھ کر کہنے لگے: ”ٹھیک ہے فریض ہونے دو۔ گھومتے پھرنے دو، کر کے اپنے شوق پورے۔ مہینہ دو مہینہ چھ مہینے، پیسے کی تنگی نہیں ہونے دینا اُسے، سمجھ رہے ہوں؟“  
 ”جی باباجان! لیکن کیا مہر النساء، اتنا عرصہ خاموش رہ سکے گی؟ شاہ جہانگیر نے خدشہ ظاہر کیا۔  
 ”اُسے خاموش کرنا مشکل نہیں ہے۔ البتہ اُسے سکندر کی شادی کا معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ تم یہی ظاہر کرنا کہ تمہاری ابھی اس سے ملاقات نہیں ہوئی، ایک دو مہینے کی بات ہے۔“  
 ”میکے چلے جائے گی اور بچے کی پیدائش تک وہیں رہے گی، اس کے بعد میں ہم سنبھال لیں گے۔“  
 ”کوئی آئسا مسئلہ نہیں ہے۔“

باباجان سر سے مہر النساء کو اہمیت دینے کو تیار ہی نہیں ہوئے۔  
 ”اصل مسئلہ وہ شہری بڑی ہے۔ کیا بتاتا تھا تم نے کتنا بڑھی ہوئی ہے؟“  
 ”ڈاکٹر نے شاہ جہانگیر کی نظروں میں آئس کا چہرہ گھوم لیا۔ جس کی آنکھوں میں ہلاک دہانہ ڈاکٹر شہر میں ڈاکٹر جبرے بڑے ہیں۔ ایک تم ہو جائے گی تو شہر والوں کو فرق تو نہیں لگے گا۔“  
 سوچتے ہوئے انداز میں باباجان جیسے اپنے آپ سے بولے تھے۔  
 شاہ جہانگیر چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔ تو کچھ دیر کی خاموشی کے بعد باباجان موضوع پر

گئے۔  
 ”تمہیں اس بار الیکشن میں کھڑا ہونا ہے۔ میں نے راؤ صاحب سے بات کر لی ہے۔“  
 مضبوط ہاتھ اور مقبول بھی، گزشتہ بار انہوں نے یونس پر بہت زور دیا تھا کہ کم از کم اب سے تو بڑے لیکن یونس کو ساست سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے۔ تمہیں تو بے ناں! شاہ جہانگیر بے ساست مسکرتے جانے اُن کی مسکراہٹ میں کس بات کا اظہار تھا۔ جیسے ہی سمجھ گئے اور فہمیدہ لگا کر بولے تھے۔

”تم کامیاب سیاست دان ہو سکتے ہو۔“  
 ”میں چلوں۔ لی جی جان صبح سے پوچھ رہی تھیں، اُن سے مل لوں؟“  
 شاہ جہانگیر اُنھ کے کھڑے ہوئے اور باباجان کی اجازت ملنے پر اُن کے کمرے سے لی جی جان اُس وقت بڑے کمرے میں ہوتی تھیں۔ شاہ جہانگیر اُسی سمت جا رہے تھے سے نکل کر مہر النساء سامنے آکھڑی ہوئی۔ اور بے حد خاموش نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔  
 قصداً انہیں بن کر بولے۔

”کیا بات ہے مہر؟“  
 ”شاہ کا کوئی آئسا مسئلہ؟“ مہر النساء نے بغیر جھجکے براہ راست اُن کی آنکھوں میں دیکھا۔  
 ”کیا تو ایک لمبہ کو وہ ٹھیک گئے کیونکہ ایسی بے باک جرأت کا مظاہرہ اس گھر کی عورت نے نہیں تھی۔“  
 ”بٹیکس سنبھل کر بولے تھے۔“  
 ”مل جائے گا تمہارے شاہ کا آتا پتا۔“  
 ”کب؟“ مہر النساء کا استفسار جارحانہ تھا۔ جیسے صبر اور ضبط کی حد ختم ہو رہی ہو۔

جب زندگی مہربان ہو جائے تو جانے وقت جہانگیر کیوں لگتا ہے۔ خوبصورت دلفریب لمحے ملتے چلے جاتے ہیں۔ ان دنوں لاہور کا موسم بھی غضب کا تھا اور ادھر دل کی بستی میں بھی جہادیں سے قبوین پر تھیں۔ سارا دن اُن کا گھومنے پھرنے میں گزار جانا۔ تاریخی مقامات میں وہ سب سے وہ شاہی قلعے سے شائر ہوئی تھی۔ اور وہاں سے آنے کے بعد بھی اُس کا ذہن وہیں جھٹک رہا تھا۔  
 ”سچ مجھے ایسا لگا جیسے جنت کا کوئی گوشہ زمین پر اُتر آیا ہو۔ سبزے اور پھولوں پر کیسا نکھار کیا اُس زمانے میں بھی یہ اتنا خوبصورت تھا۔ وہ جن خوبصورتیوں کو شدت سے غموش کر رہی تھی۔ اس وقت انہی کا تصور تک رہی تھی۔“  
 ”کس زمانے میں؟“ شاہ سکندر بڑے اشتیاق سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

”بادشاہوں کے زمانے میں۔“  
 ”نہیں! شاہ سکندر نے اُسے یقین سے کہا کہ وہ حیران ہو کر دیکھنے لگی۔  
 ”جس پر وہ مسکرا کر بولا۔ اُس وقت تم نہیں تھیں اور ساری خوبصورتیوں کا تصور تمہارے ساتھ رہتا ہے۔“  
 ”اچھا۔“ وہ ذرا سانس لی۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔ اس سے پہلے تو مجھے یہ جگہیں بلکہ دنیا میں کہیں اتنی خوبصورتی نظر نہیں تھی۔ اور آج مجھے ہر شے حیران لگ رہی ہے۔ اس لیے کہ کسی۔۔۔ بھی سمت اُنھ سے پہلے نظر آئے چہرے پر بڑھتی ہے۔“  
 ”تمہاری آنکھوں کی گہرائیوں میں اُسے کر میں نے جانا تھا کہ سکندر کے اندر کتنے سیپ چھپے۔“

”تمہاری ہلکوں کی جھالروں نے اول روز تیری دھوپ میں مجھے پُر کیف چھاؤں کا احساس بخشتا تھا۔ اور میں نے کیا لیاں چٹکتی ہوئی بار بار دیکھی تھیں لیکن اُن کی خوبصورتی کا ادراک تمہاری مسکراہٹ جتنے کے بعد ہی ہوا تھا۔“  
 ”اُس کے لیے میں جہلوں کی شدتیں تھیں اور لوری طرح اُس کی محبت میں ڈوب کر بول رہا تھا۔ وہ ہم اُسے دیکھ گئی۔ جبکہ دل انہی قبت پر رکھنے لگا تھا۔ اور پھر بے اختیار اُس کا ہاتھ آنکھوں پر رکھ کر دیکھتی۔“

”لیکن کب سکندر! میں مرجاؤں گی؟“  
 ”اُسے شاہ سکندر نے حیران ہوتے ہوئے اُسے کھینچ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔“ تم رونے لگا لگیں؟ کیا میری کسی بات سے تمہیں دکھ ہوا ہے؟“  
 ”اُس کے آئس اور شدت سے بہہ کر اُس کی قمیص میں جذب ہونے لگے تو اپنے سینے پر غمی غموش سے ہی شاہ سکندر اُس کے گرد بازوؤں کا حلقہ تنگ کرنا ہوا بولا۔“

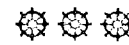
”بتاؤ اُس میں بریشان ہو رہا ہوں؟“  
 ”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ اُس کی آواز آنسوؤں میں جھجک رہی تھی۔“  
 ”اُس سے؟“ جھجکے؟“ شاہ سکندر نے ایک بل میں اُسے خود سے الگ کر کے اُس کا چہرہ اپنے منہ کیاتو وہ ذرا سانس میں سر ہلا سکی۔

”بھڑ“ وہ اچانک کسی خیال سے خائف ہو کر بولا۔  
 ”وقت سے، جس نے میری جھولی میں اتنی غبت، اتنی خوشیاں ڈال دی ہیں اور وقت کا اعتبار۔“  
 وہ جھولیوں سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے بول رہی تھی۔ شاہ سکندر اس کا مطلب سمجھ کر ادا شانت ہو گیا۔ اور پھر اسے اسے بازوؤں کے حلقے میں لے کر بولا تھا۔  
 ”وقت خواہ کتنے پہلو پر لے میری غبت میں کتنی نہیں ہوں، تمہیں مجھ پر اعتبار رہے کہ نہہ“  
 ”آپ پر تو اسے آپ سے بڑھ کر اعتبار ہے۔“  
 ”پھر وقت کے کیا ڈرنا۔ چلو منہ دھو کر فریض ہو جاؤ۔ میں چائے منگواتا ہوں۔ اور اس بعد ہمیں کیا کرنا ہے؟“  
 شاہ سکندر نے خوشگوار موڈ میں آکر فضا کو کبیر بدل دیا۔

”یکٹنگ۔“ وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔  
 ”جناب اور پہلے ہم مری جائیں گے۔ شاہ سکندر نے اپنا اگلا اسٹیشن بتایا تو وہ واٹ کی طرف جاتے جاتے ٹوک کر بولی۔  
 ”اسلام آباد کیوں نہیں؟“  
 ”اسلام آباد۔ ہم صرف ہتھارے جہانی بھائی سے ملنے جائیں گے، وہاں قیام کرنے کا پروگرام نہیں ہے۔“  
 شاہ سکندر اپنا پروگرام بتا کر لوں دیکھنے لگا جیسے وہ اس کے پروگرام میں کوئی رد و بدل کی لیکن وہ جانتے کیوں سوچ کر خاموش ہو رہی تھی۔

مری میں ان کا استقبال سرد ہواؤں نے کیا تھا۔ اس کے بعد بارش کا جو سلسلہ شروع دو دن وہ ہوٹل کے کمرے سے نکل نہیں سکے۔ سردی میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ سارا دن سامنے بیٹھ کر جانے کب کب کے واقعات دہرائے گئے۔ اور جب وہ اپنے لندا کے واقعات سن رہا تھا۔ تب وہ درمیان میں بول پڑی۔  
 ”پہلے مجھے اپنے گھر کے بارے میں بتائیں۔“  
 ”گھر کے بارے میں کیا بتاؤں؟“ وہ کہہ کر سرکٹ مل گئے لگا۔  
 ”میرا مطلب ہے گھر والوں کے بارے میں، باباجان، بی بی جان اور کون کون ہے اس نے جتنے اشتیاق سے پوچھا۔ وہ اس قدر سبزی انداز میں بتانے لگا۔  
 ”سب سے بڑے یونس جہانی اور ان کی سیم اور ان کے چار بیٹے جن میں سے تین: کالونیٹ میں ہوتے ہیں۔ پھر آیا نور بالوہیں جو اپنے گھر ہوئی ہیں۔ ان کے بعد جہانگیر، تامل جی جی۔ ان کے تینوں بچے بھی یہیں ہیں۔ پھر میں ہتھارے سامنے بیٹھا ہوں اور میرا ابھی آٹے نہیں۔“

وہ بری طرح بھیپ گئی۔ لیکن وہ اسی روانی سے بول رہا تھا۔  
 ”آخر میں تہہ بالوہیں ہے وہ بھی اپنے گھر کی سبکی۔ یعنی اس وقت حویلی میں زیادہ افراد یونس جہانی، جہانی اور ان کی بیوی جی جہانگیر جہانی، جہانی، باباجان، بی بی جان اور مہر النساء مہر النساء کون؟“ وہ اس اشتیاق سے پوچھ رہی تھی۔  
 ”مہر النساء کون؟“ وہ اس اشتیاق سے پوچھ رہی تھی۔  
 بے حد بوکھلا کر شاہ سکندر نے سکریٹ کا جھٹکا ہوا سرا ہوٹلوں سے لگا لیا تھا۔



”اب“ آسید نے جھپٹنے کے انداز میں اس کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر ایش برے میں پھینکا پھر اس کے ہونٹ پر خفا سا بدمذکر خفگی سے بولی۔ ”یہ کیا کیا آپ نے۔ سارا ہونٹ جلا دیا۔“  
 ”بس وہ۔“ بے دھیانی میں سگریٹ الٹا وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے نظریں خرا کر بولا۔  
 ”بس آج سے سگریٹ بند“ وہ قطعیت سے کہہ کر غالباً ڈسٹ بن میں ڈالنے کی عرض سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھانے کی بجائے شاہ سکندر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔  
 ”اوں بول“ یہ نہیں چھوڑ سکا۔ اب خدا را یہ مت کہہ دینا کہ اسے نہیں چھوڑ سکتے تو مجھے چھوڑ دیں؟  
 وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔  
 ”یہ تو کہہ سکتی ہوں کہ سگریٹ دھواں سے پیسا کریں۔“  
 ”سارا دھواں تو تم خرچ کر لیتی ہو۔“ شاہ سکندر بڑی خوبصورتی سے اس کا دھیان بنا کر خود بھی اطمینان سے ہو گیا تھا۔

انکی تمام باتیں ترقی پزیر تھیں لیکن بادل اسی طرح موجود تھے۔ ناشتے کے بعد وہ کچھ دیر گلاس ونڈوسے باہر کا نظارہ کرتی رہی۔ پھر آکر اخبار لے کر بیٹھ گئی۔ اس وقت ذوالفقار علی بھٹو کا دور ختم ہو رہا تھا اور نئے الیکشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ سارا اخبار انہی خبروں سے بھرا پڑا تھا اور اسے سیاست سے دلچسپی نہیں تھی لیکن ہر شہری کی طرح یہ ضرور جاننا چاہتی تھی کہ آئندہ حکومت کس کی ہوگی۔  
 ”کوئی خاص خبر ہے؟“ شاہ سکندر واٹس روم سے وریں آپ ہو کر نکلا تھا۔ اسے اخبار میں معروف دیکھ کر روہی پوچھ لیا۔  
 ”تمام سیاسی جماعتوں نے اتحاد کر لیا۔ ادھر بھٹو صاحب کا کہنا ہے کہ سب مل کر بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ کوئی عوام ان کے ساتھ ہیں۔“ وہ اور بھی آواز میں سرخیاں بڑھنے لگی۔  
 شاہ سکندر اس کے ہاتھ سے اخبار لے کر بیٹھتے ہوئے بولا۔  
 ”باقی تیار ہو جاؤ۔ اس سے پہلے کہ دوبارہ بارش شروع ہو مومن گیلانی کے گھر پہنچ جائیں۔“  
 ”یہ کون ذات شریف ہیں؟“ اس نے پوچھا تو وہ جو اخبار پر نظر میں دوٹوٹ لگا تھا، سرسری انداز میں بولا۔

”میرا دوست ہے محسن۔“ سکسورڈ میں ہم ساتھ بڑھتے تھے۔  
 آسید نے مزید کوئی سوال نہیں کیا اور جونی کے بل کھولتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر اس نے تیار ہونے میں دیر نہیں لگائی اور جب وہ دونوں ہوٹل سے نکلے اس وقت بھی بادل کچھ گھر کر رہے تھے۔ کچھ فاصلہ پیدل طے کرنے کے بعد شاہ سکندر نے نیکی کو اشارہ کیا تھا۔  
 پھر پچھلے مرحلے پر محسن گیلانی بہت پر خوش انداز میں شاہ سکندر سے بغل گیر ہوا لیکن جب اس کا تعارف ہوا تو فوراً نا اراغ بھی ہو گیا۔  
 ”یارا تم نے شادی کر لی ادھر کبہ خبر تک نہیں کی۔ ایمان سے اگر بھائی کا خیال نہ ہوتا تو میں نہیں کہنے کے لئے نکال دیتا۔“

”پچھلے یہ بات سن لو مجھے بے شک نکال دینا شاہ سکندر دھیرے سے اسے رام کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میری شادی اس طرح نہیں ہوئی جیسے تم سمجھ رہے ہو۔ میرے اپنے گھر سے کوئی شریک نہیں ہوا۔“  
 ”لو میں تو میری ناخوشی نے قدرے حیرت سے پوچھا۔  
 شاہ سکندر نے دلکش مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا اور آسید تقدیر انجان بن کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

”میرا تو مجھے نہیں موسٹ ویکم کہنا چاہیے۔“ بھٹو میں املاں کو ہلاتا ہوں۔ ”محسن ساری ناراضگی ہوں کہ خوشدلی سے بولا۔ پھر کر کے سے نکل گیا تو وہ اس سے کہنے لگی۔

کہا ضرورت تھی انہیں یہ سب بتانے کی تو نہ جانتا تو یہ میرا بہت برا حشر کرتا۔ ویسے کوئی غلط بات تو نہیں کہی میں نے۔  
شاہ سکندر نے اُسے غور نظروں سے دیکھا تو وہ جھپٹ کر اُس سے دودھ ہٹ کر کھڑی ہو گئی  
محسن اپنی والدہ کے ساتھ اندھا یا۔ اور اس نے کھڑے دیکھ کر تعجب سے بولا۔

”تم ابھی تک کھڑے ہو۔ ارے کم از کم بھائی کو تو گھٹا کر دو۔“  
”السلام علیکم“ شاہ سکندر نے محسن کی بات اُن سنی کر کے اس کی اماں کو سلام کیا تو امیر زادہ  
فوراً اُس کی تقلید کی اور اُس کے بڑے کران کے گلے لگ گئی۔

”جیتی رہو، خوش رہو، اللہ عمر دراز کرے۔“ اماں نے دھیروں دعا میں دیں۔ پھر اُسے اپنے  
بھٹاکر پوچھنے لگیں: ”شاہ پور سے آ رہی ہو۔ کیسی ہیں تمہاری بی بی جان اور وہ ان کی بچی شہر  
ہی؟“ کچھ گھبرا کر وہ ہنس بکی کہہ سکی۔

”میں ایک بار بھی تھی تمہارے سسرال۔ کوئی چار سال پہلے کو کئے ہیں؟“ بڑی بی بی ذہن پر  
ہوئے تبتانے لگیں: ”ماشاء اللہ بڑے مستند بڑے مہمان نواز لوگ ہیں۔ بڑی خاطر مدارت کی تم  
نے ہماری۔ پھر میرے محسن کی شادی پر تمہاری ساس آئی تھیں۔ بہت اچھی خاتون ہیں۔“

”جی۔“ وہ ابھی بھی گھبرا رہی تھی کہ کہیں بڑی بی بی اُن کے بارے میں اُس سے کوئی سوال نہ  
”تم ان کی سب سے چھوٹی بہنوئی ہو، بوناں؟“  
”جی اور آپ کی بہو کہاں ہے؟“ اُس نے فوراً روٹے محسن اُن کی طرف موڑ دیا۔

”وہ ہیں اپنی بہن کے گھر گئی ہے۔ میں نے بلوایا ہے اُسے ابھی آتی ہوگی۔“ ابھی بات اُن  
ہونٹوں میں تھی کہ محسن کی بیوی نے کونسل میں دباوے دروازے سے پوچھتے ہوئے آگئی۔  
”کون آیا ہے۔ ارے سکندر بھائی۔“ السلام علیکم۔“

”آپ اتنی سہری میں کہاں گھوم رہی ہیں؟“ شاہ سکندر نے سلام کا جواب دینے کے ساتھ  
”میں نہیں گھوم رہی۔ یہ بچہ کھانا ملے مجھے۔“ وہ بچے کو محسن کی گود میں دلتے ہوئے بولا  
نے فوراً اُس کی طرف اشارہ کیا۔

”بھلے بھائی سے ملو، وہ اماں کی باتوں سے بور ہو رہی ہیں؟“  
”گھٹائی؟“ وہ فوراً اُس کی طرف متوجہ ہوئی لیکن اُس کی طرف بڑھنے سے پہلے سوالیہ نظروں  
کو دیکھا تو وہ مسکرا کر بولا۔

”نیکم سکندر حیات۔“  
اُس نے اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی اور اُس سے مل کر خوشی کا اظہار کیا۔  
”بڑے بے مروت ہیں سکندر بھائی۔ یعنی اپنی شادی میں نہیں بلایا۔ خیر اُن سے توبہ  
منٹوں کی۔ پہلے یہ بتاؤ جائے وغیرہ بھی پی یا نہیں؟“ وہ اُس کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھ رہا  
نہیں بی بی ابروین کو تو میں نے نہیں بلانے بھیج دیا تھا۔ چائے کون بنانا؟ اماں نے چائے  
کا سبب بھی بتایا۔

”یہ تو زیادتی ہے مہمانوں کے ساتھ؟“ وہ کہتے ہوئے جلتے لگی پھر غالباً اُس کے بور ہونے کا  
کے اُسے دیکھ کر بولی۔ ”مہرو! تم بھی آ جاؤ۔“  
اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیسے مخاطب کر رہی ہے، جبکہ دیکھ اُسے رہی تھی۔ کچھ شش  
اپنی طرف اشارہ کیا تو وہ کہنے لگی۔

”اماں کی باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی، میرے ساتھ آؤ۔“  
اُس نے شاہ سکندر کو دیکھا وہ محسن کے ساتھ سیاست پر بات کر رہا تھا تب وہ اماں نے  
کرتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

”ابھی آپ نے مجھے مہر کہہ کر پکا رکھا۔ میرا نام مہر تو نہیں ہے۔“

”کچن میں آتے ہی اُس نے اُس سے کہا تو وہ چونک کر دیکھنے لگی پھر فوراً سنبھل کر ہنسنے ہوئے بولی۔  
”سہری، مجھ سے غلطی ہوئی۔ اب جلدی سے اپنا نام بتاؤ تا کہ دوبارہ غلطی نہ ہو۔“

”آسیہ۔“  
”اچھا نام ہے۔“ وہ پلٹ کر چو لہا جلاسنے لگی تو آسیہ کو لگا جیسے وہ اس کے اگلے سوال سے بچنے کی  
فاطمہ کو ٹوٹی ہے اور اگر یہ پہلی ملاقات نہ ہوتی تو وہ سوال ضرور کرتی۔

شاہ سکندر نے کہا تھا کہ اُس کا اسلام آباد میں قیام کا کوئی پروگرام نہیں اور اُس وقت وہ بھی  
ناموش ہو رہی تھی۔ ابھی بھی اُس نے سکندر سے کچھ نہیں کہا۔ خود ہی سوچ رہی تھی کہ اس طرح خوشیل  
بھائی اور خصوصاً سیما بھائی ناراض ہوں گی کیونکہ انہوں نے بہت اصرار سے بلایا تھا اور جلتے شاہ سکندر  
تو اسلام آباد پھرنے پر اعتراض کیوں تھا۔

”بیوہ کس سوچ میں ہو؟“ شاہ سکندر نے اُس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا تو وہ اُسے دیکھ  
کر ذرا سا مسکرائی۔

”وقت کے بھاگنے پر حیران ہو رہی ہوں۔ آخر یہ اُسی وقت کیوں بھاگتا ہے جب ہم اسے روکنے  
کی خواہش رکھتے ہیں۔“

”یہ تو وقت سے پوچھنا بڑے گا۔ ویسے تم اسے روکنا کیوں چاہتی ہو؟“ شاہ سکندر نے غور سے  
نوں میں دبا کر پوچھا۔

”روکنا نہیں چاہتی، بس یہ بے فکری کے لحاظ کچھ طویل ہو جائیں۔“ وہ برف ممی میں دبا کر اوپر  
چلتے ہوئے بولی تو شاہ سکندر قد سے رک کر کہنے لگا۔

”یہ تو ہمارے اپنے اختیار میں ہے۔ ہم کچھ دن اور یہاں رک سکے ہیں بلکہ جب تک تم چاہو۔“  
”بے فکری کا تعلق یہاں کہاں سے نہیں ہے شاہ سکندر؟“ وہ اُس کی بات پر غور سے ہو کر بولی تو وہ  
کھانے لگا۔

”کبھی کبھی تم بہت گہری باتیں کرنے لگتی ہو۔ میں تمہارا سیدھا سا دادا بندہ۔ پریشان ہو جاتا ہوں؟“  
”پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ ہنسی۔

”پریشانی کی بات یہ ہے کہ تم بہت دُور نکل آئے ہیں اور یہاں سے کوئی ٹیکسی وغیرہ بھی نہیں  
لی؟“ شاہ سکندر تجھے مرکز دیکھنا چاہتے تھے۔ بولا۔

”یہاں سے ٹیکسی لینے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ سامنے کا فوٹیف نظر آ رہا ہے۔ چلیں پہلے بیچوں  
میل لیں۔“

اُس نے سامنے اسکول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو شاہ سکندر اندر ہی اندر حیران ہو کر بولا۔  
”بیچوں سے مل کر کیا کرو گی۔ بہت شرارتی ہیں جیسے تمہارے بچتے بچتیاں بلکہ اُن سے بھی زیادہ۔“

”یہ سب سوالوں سے نہیں پریشان کر کے رکھ دیں گے؟“  
”میں پریشان نہیں ہوں گی۔ بس آپ چلیں؟“ اُس کا اشتیاق فطری تھا۔ مجبوراً شاہ سکندر نے  
بارڈل چلے۔

غالباً شدید سہری کے باعث ہی اسکول کے لان اور برآمدہ میں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ البتہ  
پلکے کے برآمدہ میں چوکیدار مل گیا۔ جس نے شاہ سکندر کو دیکھتے ہی سلام کرنے کے ساتھ  
ٹیک روٹ کا دروازہ کھول دیا تھا۔

”یہاں آئے ہی تجھے اپنا بچپن یاد آ جاتا ہے؟“ شاہ سکندر نے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہنے  
”جب بابا مہمان مجھ سے ملنے آئے تھے تو میں کتنی دُور اُن سے غدار ہتا تھا کہ انہوں نے مجھے  
ساکین چھوڑ دیا ہے۔ پھر میں اُن کے ساتھ جلتے کو چلتا تھا تو وہ مجھے ہلاتے ہلاتے پریشان  
آئے تھے، لیکن اُس وقت تک نہیں جلتے تھے جب تک میں بہل نہیں جاتا تھا اور خوشی سے

”میں نے غلط تو نہیں سوچا ناں؟“ شاہ سکندر کی سرگوشی قریب سے سنائی دی تو وہ بڑی طرح  
خجکی تھی۔

”اماں جی پھو پھو کیوں چلی گئیں۔ پھو پھو کو بلائیں۔ نیل غنودگی میں لول رہا تھا۔  
اماں جی مانا کے بعد دھکے لیے ہاتھ پیسوں سے بھی نہیں۔ نیل کی بڑ بڑاٹ سن کر انہوں  
نے جلدی سے ہاتھ منہ پر پھیرے اور آٹھ کر نیل کے چہرے اور سینے پر دم کرنے کے بعد اس کی  
پیشانی چھو کر کہنے لگیں۔  
”نیل! کیا بات ہے بیٹا۔ مجھ سے کہو۔“

”پھو پھو!“  
”اماں جی! بیٹا! تمہاری پھو پھو بھی آجائیں گی۔ تم اچھے تو ہو نا اماں جی اس کا سر گود میں رکھ کر اسے  
بھلانے لگیں۔ پھو پھو نے بھائی سوپ لے کر آگئیں۔  
”اماں جی! کسی طرح یہ نیل کو بلائیں۔ صبح بھی اس نے دوسرے لے کر چھوڑ دیا تھا۔“  
”کیا کروں۔ میرے ہاتھ سے تو بولے ہی نہیں رہا۔ کہتا ہے میں نے اس کی پھو پھو کو بھیج دیا۔  
پہلے اسے بلاؤں پھر میرا کہنا ملنے کا۔“ اماں جی بے بسی سے گویا ہوئیں۔  
”منہ کرتی تھی اسے کہ نہ بچے کو ہر وقت اپنے ساتھ لگائے رکھو۔ شادی ہو کر چلی جاؤ گی تو  
سب سے زیادہ۔ یہی محسوس کرے گا۔ دیکھ لیں گے دونوں سے، بخار میں پڑا ہے۔“  
”میمونہ بھائی تاحف سے کہتے ہوئے نیل کے پاس جگہ بنا کر بیٹھیں اور سوپ کا پیالہ نیل پر رکھا  
پھر بیکے سے اس کا چہرہ اٹھیک کر بولیں۔

”نیل! اٹھو بیٹا! یہ مٹو سا سوپ پی لو۔“  
”پھو پھو!“ نیل نے قسط سی آنکھیں کھول کر کہا۔ تو میمونہ بھائی اس پر جھک کر بولیں۔  
”ابھی پھو پھو کا فون آیا تھا۔ بہت ناراض ہو رہی تھیں۔ کہہ رہی تھیں اگر نیل نے کچھ کھایا پیسا  
نہیں اور دوا نہیں لی تو میں نہیں لوں گی۔“

”کیا آئیں گی پھو پھو؟“  
”معلمی سے اچھے ہو جاؤ پھر دیکھنا وہ آجائیں گی۔ میمونہ بھائی اس کے سر کے نیچے ہاتھ ڈال کر  
آنکھ کے گوشے شش کرتے ہوئے بولیں تو نیل نے فوراً اماں جی سے تصدیق چاہی۔

”ہاں اماں جی؟“  
”ہاں بیٹا! تمہاری چچی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ چلو آٹھ کر بیٹھو۔ شاباش لاؤ دھن! یہ پیالہ مجھے  
دو میں اسے بٹائی ہوں۔“

نیل کے ہوشیار ہونے پر اماں جی کے ہاتھوں میں بھی تیزی آگئی۔ فوراً میمونہ بھائی سے پیالہ  
لے کر پیچھے سے نیل کو سوپ بلانے کے ساتھ ساتھ بولتی بھی جا رہی تھیں۔  
”تمہیں پتا ہے، پھو پھو کو ہمارے بچے اچھے نہیں لگتے۔ اس کے کان سے پہلے ٹھیک ہو جاؤ ورنہ وہ  
بہت ناراض ہوگی۔“

”اوند مجھ سے تو بولے گی کہ میں نے تمہارا خیال نہیں رکھا۔ ہیں ناں اماں جی۔ میمونہ بھائی بھی اس  
کا دھیان بنانے میں لگ گئیں۔ لیکن میں تو صاف کہہ دوں گی اس سے کہ نیل نے میرا کہنا نہیں مانا۔  
مذوقت نہ کرنا ناگنا یا دوا دانی۔ پھر وہ مے ناراض ہوگی۔“

”میں آپ کا کہنا مانوں گا۔ چچی! نیل فوراً بول پڑا۔ آپ پھو پھو کو نہیں بتائے گا۔“  
”دیکھتی ہوں کہ کیا کہنا ملنے ہو۔“ میمونہ بھائی کہتے ہوئے آٹھ کر چلی گئیں۔ کچھ دیر بعد بانی کا گلاس  
اور اس کی دوا میں سے کراٹیں لوٹانے کے بجائے سے پہلے ہی نیل بول پڑا۔

”میں دوا پیوں گا۔“

انہیں خدا حافظ کہتا۔ تب وہ میری طرف سے مطمئن ہو کر جاتے تھے۔ کیا دن تھے وہ بھی۔ سوچ  
تو حیرت ہوتی ہے کہ میری سرخوشی کا خیال رکھنے والے بابا جان اسے  
”وہ اپنا کب خاموش ہو گیا اور اس کی خاموشی کا بھرم رکھنے اس کے ہمتیہ بھتیجیوں کے  
”سکندر چاچا!“ خفشی سے جلاتے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں  
اس کے اوپر آن کرے۔

آسیہ کے ہونٹ بے ساختہ مسکراہٹ کی گرفت میں آگئے۔ اور وہ بہت شوق اور دلچ  
دیکھ رہی تھی۔

”لاٹن سے معلوم لائن سے کھڑے ہو جاؤ۔“ شاہ سکندر نے ہلکی سی ڈانٹ کے ساتھ  
لائن سے کھڑا کیا پھر آسیہ کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ”بچہ! نہیں سلام کرو۔“  
”السلام علیکم! یہ کون ہیں؟ سلام کے ساتھ ہی بچوں کی طرف سے سوال آگیا تو شاہ سکندر  
بچلے وہ بول پڑی۔

”میں تمہاری چچی ہوں۔“  
”دھن چچی! ایک بچے نے شوق سے کہا تھا کہ دوسرا فوراً بول پڑا۔  
”یہ دھن چچی! وہ تو۔“

”ہاں! شاہ سکندر بہت سخیل کر بچے کو ٹوکتے ہوئے بولا۔ ”یہ دھن چچی ہیں اور دیکھو  
شوق سے تم سب سے ملنے آتی ہیں۔ تم اس طرح بدتمیزی کر دے کہ تو یہ کیا سوچیں گی۔“  
”افو! کہاں بدتمیزی کر رہے ہیں! وہ بول پڑی۔ اسنے پیارے بچے ہیں۔ آؤ بیٹا میرا  
آؤ۔“

سب بچے ایک دوسرے کو دیکھ کر آسیہ کے پاس جانے کا اشارہ کرنے لگے۔ جبکہ چھوٹی  
ہاتھ ہونٹوں پر رکھ کر ہنسنے کی تھی تا سیر نے بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کر اسے گود میں لے  
وہ اس کے پیچھے پیچھے کال پر تیار کرتے ہوئے بولی۔

”یہ تو بالکل گڑباز سی ہے۔ کس کی بیٹی ہے؟“  
”جہانگیر بھائی کی۔ اور یہ بھی اہلی کا بیٹا ہے۔“ شاہ سکندر نے ایک چھ سات سالہ بچے کا

پکڑ کر اپنی طرف کھینچے ہوئے کہا تو آسیہ اسے دیکھ کر بولی۔  
”ماشاء اللہ۔ بہت پیارا بچہ ہے، کیا نام ہے اس کا؟“

”اسی سے پوچھو۔“ شاہ سکندر بچے کا ہاتھ چھو کر آرام سے پھٹ گیا تو آسیہ نے پہلے گود  
بچی کو مومنے پر مٹھایا پھر اس بچے کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھی اور ایک ہاتھ اس کے کندھے  
پر رکھنے لگی۔

”کیا نام ہے بیٹا آپ کا؟“  
”شاہ علی جہانگیر۔ دن میں پڑھتا ہوں۔“ بچے کے فخر سے جلتے پر وہ بے ساختہ مسکرائی۔  
”ویری گڈ۔“

”یہ بہت اسمارٹ ہے اور مجھ سے بہت مانوس۔“ شاہ سکندر بچے کو پیار سے دیکھتے  
بولا۔ ”میں بھی سب بچوں کی نسبت اس سے زیادہ پیار کرتا ہوں۔ اور پتا ہے میں نے کیا  
رکھا ہے۔“

وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی تو شاہ سکندر قدرے اس کی طرف جھک کر بولا۔  
”ہماری پہلی بیٹی اس کے ساتھ منسوب ہوگی۔“

آسیہ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور مجھ بولنے کا اس کی طرف سے رخ موڑا تھا کہ نظریں بچے  
پر مٹھ گئیں۔ چلتی ہوئی روشن آنکھیں، خوبصورت پیشانی، سرخی مائل گندمی رنگت۔ اس کا  
کے سامنے جیسے وہ بڑا ہونے لگا۔

”شاہنشاہ بننا اچھے پہلے تم بہت اچھے تھے، میوز بھائی نے خوش ہو کر کہا اور اسے  
 کر اماں جی کو نون دیکھا جسے بہت مشکل مرعزہ سر کر لیا ہو۔  
 خوش رہو دلہن! اللہ تعالیٰ عمر دراز کرے۔“  
 اماں جی کے دل سے دعائیں نکل رہی تھیں۔ میوز بھائی کی آنکھوں کی ہر گھبراہٹیں، جلدی  
 لگا کر کمرے سے نکل گئیں اور دوپٹے کے پورے آنکھیں صاف کرنے لگیں۔  
 ”کیا بات ہے میوز؟“ اور صر سے گزرتے ہوئے بچا ہنسنے لگا۔  
 ”جی!“ میوز بھائی نے چونک کر ہاتھ نیچے کر لیے، ”کچھ نہیں بڑے بھینا۔“

”نبیل کی طبیعت اب کیسی ہے؟“  
 ”قدرے بہتر ہے۔ اب بھی دوا پانی ہے اُسے۔ آپ دیکھ لیں۔ میرا مطلب ہے وہ جاگ  
 وہ بڑے بھینا کے سامنے پونہی کر رہا جاتی تھیں۔  
 ”ہوں۔“ بڑے بھینا جانے کیا سوچتے ہوئے اماں جی کے کمرے کی طرف دیکھنے لگے تو مورتی  
 جان کر وہ وہاں سے ہٹنے لگی تھیں کہ بڑے بھینا اچانک مڑ کر بیٹھے۔  
 ”سنو۔ وہ۔ اگر رحمت نہ ہو تو ایک کپ چائے۔ میں آدھ ڈرائنگ روم میں ہوا  
 بھینا بیٹھ گئی تھی کام کے لیے کہتے ہوئے تھیں۔“  
 ”کوئی اور بھی ہے۔ میرا مطلب ہے کوئی جہان؟“ میوز بھائی نے رگ کر پوچھا۔

”نہیں۔“ بڑے بھینا اختصار سے کام لیتے آگے بڑھ گئے تو انہوں نے کچن میں جلتے سے پہلے اپنے  
 میں جھانک کر دیکھا۔ آخر اور سونیا اپنا بوم ورک کر رہے تھے اور عرجو لے میں آرام سے تھا۔  
 طرف سے ملٹن ہو کر انہوں نے چائے بنائی اور کپ بڑے میں رکھ کر بڑے بھینا کے پاس لے کر آ  
 انہیں دیکھتے ہی وہ سیدھے ہو بیٹھے۔

”بہت تکلیف دیتا ہوں میں نہیں۔“  
 ”واقعی؟“ میوز بھائی نے بے ساختہ کہہ کر بچلا ہوٹ دانتوں میں دھالیا اور جلدی سے بڑے  
 جانا بلکہ بھاننا چاہتی تھیں کہ بڑے بھینا سامنے اشارہ کر کے بولے۔

”بھئی۔“ بچے کچھ بات کر رہی ہے۔  
 ”انہی رحم؟“ وہ جتنی زندہ دل تھیں اتنا ہی ان کا دل مڑو رہی تھا۔ یوں سہم کر بیٹھیں جیسے  
 ان کی کلاس بیٹھے والے ہوں۔

”میں نبیل کی طرف سے پریشان ہوں۔“ بڑے بھینا چائے کے دو تین سپینے کے بعد  
 ”اُس کی ماں کا کئی بار فون آچکا ہے۔ وہ چاہتی ہیں۔ نبیل کو کچھ دنوں کے لیے ان کے پاس  
 جائے۔“

”آپ نے انہیں بتایا نہیں کہ نبیل بیمار ہے؟“ اس سنجیدہ موضوع نے میوز بھائی کو ایک  
 کر دیا تھا۔

”بیماری کا سن کر ہی تو کہہ رہی ہیں بلکہ دوا کر رہی ہیں کہ ماں سے بہتر اُس کی کوئی دیکھا  
 کر سکتا۔ ان کا دوا سمجھ ہے لیکن خود ان پر صادق نہیں آتا۔“ بڑے بھینا نے تاسف سے کہہ کر  
 بیچنے والے کو قدر سے توقف سے میوز بھائی پوچھنے لگیں۔

”بچہ کپ نے کیا سوچا ہے؟“  
 ”بیماری ہے۔ بچہ بچا بڑے کا نبیل کو۔ اور میرا خیال ہے نبیل جانے کے لیے تیار بھی ہو جا  
 البتہ اماں جی۔ انہیں سمجھانا بہت مشکل ہے۔ وہ دوتے تھی ہیں اس لیے میں ان سے ا  
 کر سکتا۔ تم کو مان سے۔“  
 بڑے بھینا نے یہ فتنہ داری انہیں سوپ کر چمچ انہیں مشکل میں ڈال دیا تھا۔ کتنی  
 کے بعد پوچھنے لگیں۔

”میں کیا کہوں اماں جی سے؟“  
 ”بڑے بھینا اپنی سوچ میں تھے۔ ان کی بات سنی ہی نہیں۔ البتہ آواز پر چونک کر دیکھنے لگے تو وہ  
 ت دھڑکنے کے بجائے آنکھ کھڑی ہوئیں اور خالی کپ بڑے میں رکھ کر اٹھاتے ہوئے بولیں۔

”میں کونکھش کرتی ہوں۔“  
 ”ہاں دیکھو کل شاید بیل خود بچے کو لینے آجائیں۔ اس سے پہلے اماں جی کو ذہنی طور پر تیار کر لینا۔“  
 بڑے بھینا نے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلا کر کمرے سے نکل آئیں۔

اماں جی مسلسل دوری تھیں اور دنا اس بات کا نہیں تھا کہ نبیل ماں کے ساتھ جلا گیا تھا بلکہ اُس  
 ان کی بے پرواہیاں زلزلہ رہی تھیں۔ آٹھ سال وہ عورت اس گھر میں جس طرح نبیل کو نظر انداز کرتی  
 تھی۔ وہ سب کے سامنے تھا پھر بھی سب خاموش مٹا شامی بنے ہوئے تھے۔  
 اماں جی آپ خواہواہ دور رہی ہیں۔ ہم نے نبیل کو زبردستی تو نہیں بھیجا۔ آپ کے سامنے اس  
 ذوقانے پر اماں کی غماہ کی تھی۔

اماں جی کی مسلسل گرہ و زاری سے بڑے بھینا زچ ہو کر بولے تھے۔  
 ”ارے وہ تو بچہ ہے۔ تم تو بچے نہیں ہو۔ اچھی طرح جانئے ہو کہ وہ عورت اس کی دیکھ بھال نہیں کر  
 سکتی۔“ اماں جی کو بھی سننے کو تیار نہیں تھیں۔ ”اُس نے تو بھی ہنسنے لپٹنے پنے کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔“  
 بچے کا کیا خیال کر رہے گی؟

”آپ کی بات ٹھیک ہے مگر میری ہم کچھ نہیں کر سکتے۔“ بڑے بھینا نے بات ختم کرنے کی عرض سے  
 دیا تھا۔ برا اماں جی تاسف سے بولیں۔  
 ”تم کچھ کہتے تو یہ نوبت ہی کیوں آتی؟“

بڑے بھینا کا چہرہ لکھت سرخ ہو گیا۔  
 ”بس کتنی اماں جی! دو چار دن کی تو بات ہے۔“ عدیل سے بڑے بھائی کی لا جارہی دیکھی نہیں گئی۔  
 ”ابول بڑے۔“ نبیل کو کچھ بھی سمجھ نہیں آتی تھی۔ ہر حال نبیل کی ماں ہیں۔ ایسے دھوپ میں نہیں ڈال دیں  
 اسے۔“

اماں جی کو غالباً احساس ہو گیا تھا جب ہی خاموش ہو رہیں۔ اور اتنا جی جو اس ٹکرا کے دوران  
 میں تھے انہوں نے پہلے ہنسا ہنسا کر اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے بعد گویا خود کو بولنے پر تیار  
 ہو کر بڑے بھینا کو دیکھ کر پوچھنے لگے۔

”عقل میاں! تم نے باس جانے کی بات کی تھی۔ پھر کیا ارادہ بدل گیا تھا؟“  
 ”نہیں۔“ بس اپنی باری کا انتظار کر رہا ہوں۔“ بڑے بھینا نے کن انہیوں سے اماں جی کو دیکھا جو پوری  
 خاموش ہو گئی تھیں۔

”کیا مطلب؟“ اتنا جی نے پوچھا تو وہ تفصیل بتاتے ہوئے کہنے لگے۔

”ہماری فرم کی ایک شاخ جدہ میں قائم ہوئی ہے۔ اور اسے ایک بڑا پروڈیکٹ بھی مل گیا ہے  
 اس سے کچھ لوگ تیار کیے ہیں۔ ہم یہاں سے ہی کیمرہ بھرتی کر کے بھیج رہے ہیں۔ جب یہ مسئلہ  
 ہو گا تو کم از کم ہمارے باری آئے گی۔ تین چار سال کا ایکریٹ منٹ ہے۔ اس کے بعد کوئی نیا۔  
 جملہ مل گیا تو اس کے لیے ہماری اپنی جو اس ہوگ کہ ہم اس پر کام کریں یا یہاں آجائیں۔ بہر حال  
 بعد کی بات ہے۔ ابھی میں چار سال کا ایکریٹ منٹ کر چکا ہوں۔“

”ہوں۔“ اتنا جی کچھ دیر سوچ انداز میں سر ہلانے کے بعد کہنے لگے۔  
 ”اچھی بات ہے۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم کچھ عرصے کے لیے باہر چلے جاؤ۔“

”اچھا۔“ اماں جی کچھ بولنے لگی تھیں کہ اتنا جی نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا۔ اور اپنی بات  
 ختم کرتے ہوئے بولے۔

مبارے لیے یہی بہتر ہے۔ بہت عرصہ تم نے ٹینشن میں گھرا ہے۔ اور ابھی نہیں ہو۔ اس لیے تمہارا بیان سے چلنے جانا ہی بہتر ہے۔ لیکن تم اکیلے نہیں جاؤ گے۔ ”بیل ابھی چھٹا ہے۔ آج ہی چھ بجے زیادہ ہے۔“

”میں صرف بیل کی بات نہیں کر رہا ہے۔ آج ہی نے درمیان میں لوگ کر نہ صرف ہر کو خاموش کر دیا۔ بلکہ حیران بھی۔ پھر ایک نظر آستان جی پر ڈال کر لو لے تھے۔“

”میں تمہاری شادی کر رہا ہوں۔ تمہاری چچا زاد سارہ کے ساتھ اور یہاں سے تم شروع کرو گے۔“

”بڑے بھتیجے! اپنی پسند منوا چکے تھے اور اس کے بعد دس سال جھگڑ بھی چکے۔ اب اگر کوئی اختلاف یا اعتراض تھا بھی تو ان کے پاس احتجاج کا حوصلہ نہیں تھا۔ بس ذہین بچہ سر جھکا لیا۔“

”میں یہ نہیں کہوں گا کہ پہلے تمہارا انتخاب غلط تھا۔“ قدر سے توقف سے آجی ہو۔ ”بس نہیں زندگی گزارنے کا ڈھنگ نہیں آیا۔ اپنی اپنی آنکھیں تم لوگوں نے ایک دوسرے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اس لیے اپنے گھر کو نہیں بچا سکے۔ بہر حال جو غلطیاں پہلے کی انہیں دوبارہ مت دہرانا۔“

”تھے یقینی ہے سارہ کے ساتھ تم خوشگوار زندگی گزارو۔ ایک ٹینٹ میں اپنی فیملی کو بھی شامل کر لو۔“

”بڑے بھتیجے! اسی طرح سر جھکائے بیٹھے رہے تو اگلے کئی بل خاموشی کی نذر ہو گئے۔ انا کیوں خاموش تھیں۔ تب عدیل انہیں مخاطب کرتے ہوئے بولے۔“

”کیوں آستان جی! ابھی بھی آپ بڑے بھتیجے باہر جانے پر اعتراض کریں گے؟“

”میں کیوں اعتراض کروں گی؟ آستان جی چونکہ کر بولیں تو عدیل آجی کو دیکھ کر ہنسنے لگے۔“

اسلام آباد میں شکیل بھائی اور سیما بھائی نے ان کا پُر جوش استقبال کیا تھا۔ اشعرا بھو بھوک دیکھ کر خوشی سے دیوانے ہو رہے تھے۔ اور مسلسل اس کا طواف کر رہے۔ سیما بھائی رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف ہوئیں تب وہ دونوں بچوں کو آواز کرنے کی تاکید کرتے ہوئے سیما بھائی کے پاس پہنچیں۔

”اب سناؤ بھائی، آپ کراچی سے کب آئیں گے؟“ اس نے بیٹھنے کے لیے اسٹوا

لو جی تو سیما بھائی کیران سی کر کے اُسے مسکراتے ہوئے دیکھنے لگیں۔ پھر جیسے ہی وہ ٹھوڑی جھوڑ کر بولیں۔

”بہت پیاری ہو گئی ہو۔ ماشاء اللہ۔“

”اچھا! وہ جینٹل کردار سا سنیں۔“

”میں اس وقت سے دل ہی دل میں تمہاری نظر اتار رہی ہوں۔ محبت نے تمہارا بنا دیا ہے۔ یقین کرو جب تم شاہ سکندر کے ساتھ گیٹ سے داخل ہو رہی تھیں تو نے تمہیں پہچانا ہی نہیں تھا۔“

”جی نہیں! وہ سچ نزوس ہوئی جا رہی تھی۔“

”سچ کہہ رہی ہوں، تمہارے تو انداز ہی بدل گئے ہیں۔ لگتا ہے شاہ سکندر کروا رہے! سیما بھائی کو وہ نزوس ہوئی اور انہیں لگی۔“

”وقت سے بڑا جادو اور کیا ہوگا۔“ وہ لگائی میں بڑی سرخ سبز کالج کی جوتیوں دھرنے سے بولی۔

”یہ تو میں کہہ رہی ہوں۔ خیر یہ بتاؤ کہاں کہاں گئیں؟“ سیما بھائی نے کسی چیز کی تلاش میں بیٹ میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”لاہور اور مری۔ اب یہاں سے سوات جانے کا پروگرام ہے۔ سکندر کہہ رہے تھے صبح ہی کل جیں گے! اس نے بتایا تو سیما بھائی کام چھوڑ کر کھڑی ہو گئیں۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ یقیناً لاہور اور مری میں اس دن اور ہمارے پاس نہیں، خیر دار جو صبح اٹھنے کا نام لیا تو۔“

”بھتیجے! بھائی جان بھی ناراض ہوں گے۔“

”اچھا آپ تو ناراض نہ ہوں۔ لائیے یہ پیاز میں کاٹ دوں! اس نے اس موضوع سے ہٹنے کا خطرہ بھائی کو ڈکری اٹھائی۔ جیسے سیما بھائی فوراً بھینٹے ہوئے بولیں۔“

”کوئی ضرورت نہیں کسی کام کو ہاتھ لگانے کی آرام سے بیٹھ رہو۔ تمہارے میاں نے دیکھ لیا۔ پھر وہ بیچ بھی نہیں ہونے دے گا۔ ابھی کہے گا چلو۔“

”وہ ہنس بڑی پھر اچانک خیال آنے پر کہنے لگی۔“

”بھائی! میں مری میں سکندر کے بھتیجے بھتیجیوں سے بھی ملی ہوں۔ مری کالونیٹ میں پڑھتے ہیں۔“

”اچھا۔“ ویسے یہ زیندار لوگ اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دلاتے ہیں البتہ! سیما بھائی نے قصداً تادھوری چھوڑ کر اسے دیکھا تو وہ مسکرا کر بولی۔“

”کہہ دیں جو کہنا ہے۔ میں برا نہیں مانوں گی۔“

”نہیں۔ بھئی! اب تم بھی انہی ڈیڑوں میں شامل ہو گئی ہو اور تمہاری سوچ بدلتے دیر نہیں لگے۔“

”جی نہیں۔ مری سوچ نہیں بدلے گی، آپ دیکھیے گا۔ میں جب بھی شاہ پور گئی سب سے پہلے ان کے بچوں کو تعلیم دلانے پر زور دوں گی۔ اور شاہ سکندر نے میرا ساتھ دینے کا وعدہ بھی اٹھا! اس نے غمزہ سے کہا۔“

”اچھی بات ہے، ویسے تمہارا شاہ پور جانا کب تک متوقع ہے۔ میرا مطلب ہے سکندر مبارکے میں کیا کہتا ہے۔“ سیما بھائی نے اپنے کام میں مصروف رہ کر پوچھا۔

”میں نے ابھی اس موضوع کو نہیں چھڑا بھائی اور نہ ہی اسے مسئلہ بناؤں گی۔ کیونکہ سکندر نے بہتر پہلے ہی بتا دیا تھا اور اس وقت تو انہیں جانا کہ بھائی کے آنے کی امید بھی نہیں تھی۔ البتہ زور کہنے ہیں کہ ان کے گھر والے زیادہ عرصہ ناراض نہیں رہ سکیں گے اور میرا خیال ہے ٹھیک

”کہا تھا کہ اب صرف بابا جان ہی رہ گئے ہیں۔ باقی سب گھر والے تو اس شادی پر خوش ہیں۔“

”لف بھی بیٹھیں اور جانا کہ بھائی شریک بھی ہونے۔“

”وہ بہت فطین انداز میں بولی رہی تھی۔ تب شکیل بھائی نے لاؤنج سے ہی اُسے پکار لیا۔“

”اسیہ! تم وہاں کیا کر رہی ہو؟“

”جی ہاں! تم وہاں کیا کر رہی ہو؟“

”جی ہاں! تم وہاں کیا کر رہی ہو؟“

”جی ہاں! تم وہاں کیا کر رہی ہو؟“

”جی ہاں! تم وہاں کیا کر رہی ہو؟“

”جی ہاں! تم وہاں کیا کر رہی ہو؟“

”جی ہاں! تم وہاں کیا کر رہی ہو؟“

”جی ہاں! تم وہاں کیا کر رہی ہو؟“

”جی ہاں! تم وہاں کیا کر رہی ہو؟“

”جی ہاں! تم وہاں کیا کر رہی ہو؟“

”جی ہاں! تم وہاں کیا کر رہی ہو؟“

کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے: میں ابھی سکندر سے کہہ رہا تھا کہ تمہیں ہاؤس جاب کرنا  
تیار کیا پروگرام ہے؟  
”جی، یہی پروگرام ہے، اُس نے شاہ سکندر کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ اگر دیکھتی تو شاید  
میں خاموشی اختیار کر لیتی۔“  
”ہاں، وقت ضائع نہیں کرنا، جب تک شاہ سکندر کسی بزنس میں سیٹ ہوں گے تو  
تم کوئی بیل سے تشکیل جہان کی بات ادھوری رہ گئی۔ اور وہ ایکسیکوزی کہتے ہوئے اٹھ  
اٹھنے کے چلے گئے تو شاہ سکندر فوراً بولی پڑا۔“  
”سنو، صبح یہاں سے نکل چلیں گے؟“  
”کیوں؟“ وہ انجان بیٹھے بیٹھے بھی ہنس پڑی۔  
”متاثر کیوں کا جواب ابھی بھی دے سکتا ہوں؟ شاہ سکندر اپنی جگہ سے اٹھنے لگاؤ  
نے گھبرا کر ہاتھ جوڑ دیے۔“  
”پلیز، وہیں بیٹھے رہیں؟“  
”صبح چلنا ہے؟ شاہ سکندر اسی وقت اپنی بات منوا سکتا تھا۔“  
”کہو ہاں۔ ورنہ؟“  
”ہاں۔ ہاں۔ ہاں۔“

”ہائیں، یہ دوبارہ تین بار ہاں کہہ انے کی فزیت کیوں آئی؟“ سیرما بھابی سنتی ہوئی آگئی  
اس کے بجائے انہوں نے براہ راست شاہ سکندر کو ٹوکا تو وہ جلی سا ہو کر سر کھینٹے  
”ہاں بھی، کھانا تیار ہو گیا؟“ عقب سے تشکیل بھابی آواز پر سیرما بھابی ان کی طرف  
پوچھنے لگیں۔  
”آپ کہاں چلے گئے تھے؟“

”وہ اتانی کا فون تھا:“ انہوں نے ابھی اس قدر کہا تھا کہ آسیہ نے سوالوں کی بو  
”اتانی کا کیا کہہ رہے تھے۔ ٹھیک تو ہیں ناں اور اتانی جی۔“  
”سب ٹھیک ہیں۔ سب ٹھیک ہیں، تشکیل بھابی نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے  
لگے۔ ”ابھی خبر ہے، لیکن کھانے کے بعد سناؤں گا؟“  
”نہیں بھابی، پہلے سناؤں ورنہ کھانا نہیں کھا جاوے گا؟“ اُس نے اپنی بے تابی  
سے کہا تو تشکیل بھابی دوبارہ اسی جگہ پر بیٹھ گئے اور سیرما بھابی کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کر  
بولے۔

”بڑے عینا کی شادی ہے اسی جمعہ کو۔“  
”نہج۔۔ آسیہ کی آوازیں خوشی کی ٹھٹھکی تھیں۔ اور سیرما بھابی خوشی کے ساتھ تعجب  
”اسی جمعہ کو؟“  
”ہاں۔ بس سادہ سی تقریب ہے۔ اور جلدی میڈیوں طے پائی ہے کہ اگلے ایک  
میں بڑے بھنا باہر جانے والے ہیں اور میرا خیال ہے ساڑھے چھ بجے ان کے ساتھ  
آخر میں تشکیل بھابی نے اپنا خیال ظاہر کیا تو آسیہ فوراً پوچھنے لگی۔  
”اور نیل؟“  
”ظاہر ہے وہ بھی جائے گا۔“

آسیہ نے چند لمحے توقف کیا پھر شاہ سکندر کو دیکھ کر بولیں تھیں۔  
”بس تو کل ہم پہلی فلائیٹ سے کراچی جائیں گے۔“

شاہ سکندر نے اُس کے پروگرام سے کوئی اختلاف نہیں کیا تھا۔ شاید اس کی خوشی کی خاطر ورنہ  
اسے افسوس تھا کہ زندگی کے یہ خوبصورت دن دوبارہ ٹوٹ کر نہیں آئے تھے۔ بہر حال اُس  
آسیہ پر ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ اپنا ہی مون پرینڈ فنکر ہونے پر ناخوش ہے اُس کے  
س اس کی خوشی میں شریک رہا کہ کوکر بڑے عینا نے ساڈی پر اصرار کیا تھا پھر بھی ابھی خاموشی  
ی تھی تین چار دن آسیہ اتانی کے گھر میں بے حد معروف رہی۔ اس کے باوجود شاہ سکندر کی  
سے غافل نہیں ہوتی تھی۔ وہ جہاں گھر میں داخل ہوتا اُس کی طرف لبک کر جاتی، چائے کھانا  
ش روم میں بیٹھتے تیار یعنی ہر بات کا خیال۔ اپنی طرف سے اُس نے شکایت کا کوئی موقع نہیں  
پھرا۔ یہ بھی احساس تھا کہ وہ اُس کی خاطر سب چھوڑ آیا ہے۔ جبھی دلہن کے گھر آئے  
وہ اپنے گھر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ شاہ سکندر جارہے کہاں تھا۔ وہ اسے چلنے کا پتہ کے  
بجائے سے نکل کر آئی تو برا آمد ہے میں میمونہ بھابی مل گئیں۔  
”شاہ سکندر کو دیکھا ہے؟“ اُس نے میمونہ بھابی کو روک کر پوچھا۔ تو وہ اپنے مخصوص انداز  
بولیں۔

”ہاں بہت بار۔“  
”میں ابھی کی بات کر رہی ہوں۔ کہاں ہیں وہ؟“  
”اُدھر ڈرائنگ روم میں، سب وہیں بیٹھے ہیں؟ میمونہ بھابی غصت میں بتا کر جانے لگیں  
س نے راستہ روک لیا۔  
”آپ کہاں جا رہی ہیں؟“  
”چلنے بنانے۔“

”ہمارے لیے مت بنائے گا کیونکہ ہم اب گھر جا رہے ہیں؟“ اُس نے ”ہم“ اپنے اوشاہ سکندر  
لئے استعمال کیا تھا اور میمونہ بھابی کو کبھی گھبراہٹ کی نقل آتے ہوئے بولیں۔  
”ہم اس وقت شوق میں چائے بنانے نہیں جا رہے۔ آپ کے شاہ سکندر نے فزائش  
ہے۔ ورنہ ہم تو بہت تھکے ہوئے ہیں؟“  
”آپ بھی لیں؟“ اُس نے ذرا سا سر جھٹکا پھر کہنے لگی۔ ”رہنے دیں چائے واٹے میں منع کرتی  
سکندر کو؟“  
”ارے رے، دومنٹ کا کام ہے۔ اور اب تو سب پئیں گے؟ میمونہ بھابی کہتے ہوئے  
کی طرف بڑھیں تو وہ بھی ان کے ساتھ چل پڑی۔  
”تم ابھی جانے کی بات کیوں کر رہی ہو۔ صبح جانا؟“ میمونہ بھابی نے کیتلی میں پانی ڈالتے ہوئے  
کہا۔

”ابھی کیا اور صبح کیا۔ بس جانے دیں۔ صبح سے میں اپنے گھر کے معمولات سیٹ کر رہی گی۔  
نہیں سکندر نے بزنس کے بارے میں کیا سوچا ہے۔ اب اپنے گھر میں اطمینان سے بیٹھیں  
تو میمونہ بھابی سے سوچیں گے؟“  
وہ اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے بول رہی تھی۔ میمونہ بھابی نے مسکرا کر اسے دیکھا تو  
پچھلے غامض ہونی پھر ایک دم موضوع بدل گئی۔  
”نیل سے نہیں مل بوں تو عجیب سا لگ رہا ہے کب سے گیا ہوا ہے صبح عدیل بھابی سے  
یہ گلے لے کر میری طرف آئیں گے؟“  
”میں میمونہ بھابی نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ ٹرے اتاری پھر اس میں کپ دھکتے ہوئے  
نیل لگیں۔“

”نیل کا تمہیں نہیں بتا رہا تھا کہ بعد بہت بیمار ہو گیا تھا۔ ابھی بھی پتا نہیں  
ہا ہے کہ کیونکہ اسی بیماری کی حالت میں قبیلہ سے لے گئی تھیں۔ اس دعوے کے ساتھ کہ

ماں سے بہت اُس کی جھگڑا کوفی نہیں کر سکتا۔  
 ”کیا کہہ رہی ہیں بھائی! یہ سب تو مجھے کسی نے نہیں بتایا۔“ وہ اکیدم پریشان ہو گئی۔  
 ”تو سمجھ رہی تھی بڑے بیٹیا کی شادی کی وجہ سے۔“  
 ”نہیں بلکہ اُس کی وجہ سے بڑے بیٹا شادی پر رضامند ہوئے ہیں۔ کیونکہ صرف نیل کو وہ  
 ساتھ باہر نہیں لے جاسکتے تھے۔ دلیتے آبا جی نے بڑے موقع پر بڑے بیٹا کو گھبراہٹ  
 کے پاس باجی تھرنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔“  
 ”میونہ بھائی کی بات اُس نے بے دھیانی میں سنی، سارا دھیان نیل کی طرف تھا۔ فوراً

لگی۔ نیل کی طبیعت اب کیسی ہے۔ کوئی اُس کے پاس گیا بھی؟“  
 ”ایک بار عدیل گیا تھا۔ لیکن بیلہ نے اُس سے ملنے نہیں دیا۔ کہنے لگیں، جب ٹھیک  
 گناہیج دونوں، یہاں آئے کی ضرورت نہیں ہے۔“  
 ”میونہ بھائی نے بیٹا میں جانے دم کرتے ہوئے بتایا چھر بڑے اٹھا کر اُس کی  
 رُخ موڑا تو اُسے پریشان دیکھ کر کہنے لگیں۔

”زیادہ پریشان کی بات نہیں ہے۔ اور تم ابھی اماں جی کے سامنے نیل کا ذکر نہیں چھڑا۔  
 رونے لگتی ہیں۔ اور اس خوشی کے موقع پر رونو دعونا ابھی بات نہیں ہے۔ سمجھ رہی ہوں نا؟“  
 اُس نے پوہنی ذرا سائبات میں سر ہلا دیا اور ان کے جانے کے بعد پہلے خود پر قابو لیا  
 ڈرائنگ روم کا رخ کیا تھا۔

پھر جانے کے دوران اُس نے آبا جی اور اماں جی کو اس وقت اپنے گھر جانے کا بتایا تو  
 شاہ سکندر کاما یوس چہرہ یکھت دیکھنے لگا۔ اتفاق تھا کہ میونہ بھائی اُسے ہی دیکھ رہی تھیں  
 ہی بے ساختہ زور سے ہنس پڑیں۔ سب ان کی طرف متوجہ ہو گئے تو فوراً بولی تھیں۔  
 ”اب کوئی یہ نہ پوچھے کہ میں کیوں ہنسی۔“

عدیل نے شاہ سکندر کو یوں دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں، جواب نہیں۔ جو اُشاہ سکندر نے  
 انداز میں سر ہلایا پھر لہجہ چانے ایک ہی ٹھونٹ میں ختم کر کے کپ تیل پر رکھتے ہوئے آبا جی کو دبا  
 لولا۔

”اجازت دیجیے آبا جی، کیا رہ نچ چکے۔ چلیں آسیہ۔“  
 ”جی۔“ وہ اماں جی کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ نیل کا سن کر کچھ معطل سی ہو  
 شاہ سکندر نے بغور اُسے دیکھا۔ پھر سب کو سلام کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔  
 اپنے اپارٹمنٹ میں اگر بھی وہ کچھ چپ چاپ سی تھی۔ دل چاہ رہا تھا اسی وقت فون  
 نیل کی تحریرت معلوم کرے۔ لیکن اس خیال سے خود کو روک رہی تھی کہ کہیں بیلہ بھائی آ  
 بھی یہ نہ کہہ دیں کہ یہاں فون کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

”کیا بات ہے، تھک گئی ہو؟“ شاہ سکندر مسلسل اُسے فون کر رہا تھا۔ بہت سے  
 جب اپنی جگہ پر اگر لیٹی تو اُس کے بالوں میں انگلیاں جھنسا کر پوچھنے لگا۔  
 ”نہیں۔“ وہ قصداً مسکراتی دکھیں وہ یہ نہ کہہ لے کہ اپنے گھر آکر وہ خوش نہیں۔  
 پھر اُس کا ہاتھ بالوں میں سے نکال کر اپنے ہونٹوں سے چھو کر بولی۔  
 ”اب کی فست میری ساری ممکن سمیٹ لیتی ہے۔ پتا ہے ابھی یہاں آتے ہوئے  
 سوچ رہی تھی۔“

”کیا؟“ شاہ سکندر خاموش ہو کر اُس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔  
 ”کہ میں تو بہت عام سی لڑکی تھی پھر آپ۔“  
 ”اوں ہوں؟“ شاہ سکندر نے اُس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ ”خود کو عام سی لڑکی

بن مت کرو۔“ شاہ سکندر حیات نے کسی عام سی شے کو کہتی درخود اعتنا نہیں کیا۔  
 ”وہ اُس کے کہنے کے زعم پر سن سی ہو گئی تھی۔  
 ”ایک عام سی لڑکی کا میری زندگی میں کیا دخل، نہیں آسیہ ایسا کبھی نہیں سوچنا، تمہارے لیے  
 ایک طرح سے سخت و تاج چھوڑ آیا ہوں۔“  
 ”اب بھی کمال ہیں۔“ وہ بہت سنبھل کر اُسے ٹوکتے ہوئے بولی۔ ”میں کیا کہنے جا رہی تھی آپ  
 مجھے۔“ پھر چوڑیں۔ یہ بتائیں صبح ناٹنے میں کیا لیں گے؟“  
 ”صبح کی بات صبح اور رات کی بات۔“ وہ شروع نظروں سے دیکھتا اُس پر جھک گیا۔

کوئی دو گھنٹے پہلے مہر النساء نے جیراں کو اپنے کمرے میں آئے کو کہا تھا۔ اُس وقت وہ بڑی  
 کا کوئی کام کر رہی تھی۔ اُس کے بعد بتا نہیں وہ بھول گئی تھی یا ان جان نے اُسے کسی کام سے  
 دیا تھا۔ جو اب تک نہیں آئی تھی۔ مہر النساء کا انتظار کے بعد اب بارہ لائی ہو گیا تھا۔ اتنا ہی  
 ہیں وہ اپنے کمرے سے نکل کر اُس کی تلاش میں پچھائی تھی کہ شاہ سکندر کا نام سن کر ٹھٹھک  
 شاہ جہانگیر فون پر غالباً اُس سے بات کر رہے تھے۔ وہ دبے پاؤں ان کی پشت کی طرف  
 گئے۔

”میں نے تمہارے اکاؤنٹ میں ایک اور چیک جمع کر دیا ہے۔ فی الحال تم آرام سے رہو  
 نہیں سکندر۔ ابھی کوئی زبردستی نہیں ہو سکتا۔ اگلے مہینے الیکشن میں جیتا نہیں ہی حکومت کیا پالیسی  
 راکھ ہے۔ اس لیے اس وقت کسی بھی زبردستی میں پیسہ نکالنا ٹھیک نہیں ہے۔“  
 ”ہاں ایک مہینے کی تو بات ہے۔ اس کے بعد دیکھیں گے۔“

”نہیں، میں ابھی تمہارے پاس نہیں آ سکتا۔“  
 ”اور۔ اور ب ٹھیک ہے۔“  
 ”پھر بات کروں گا۔ خدا حافظ۔“

شاہ جہانگیر نے فون بند کر دیا۔ اور پلٹے ہی مہر النساء کی طنز آمیز تائت بھری نظروں کا سامنا  
 پس ایک ہی اس کے بعد مہر النساء فوراً بلیٹ کر جانے لگی۔  
 ”روکو مہر النساء۔“ انہوں نے بھی فوراً لیکاراً لیکن روکنے کے بجائے مہر النساء کے قدروں میں  
 ی آئی، اور ان کی نظروں کے سامنے وہ ٹیڑھیاں جھلانگتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ کچھ دیر  
 لے اُسے جیراں پر رقعہ تھا اب اُس کی نوعیت بدل گئی تھی وہ باکل ہون جا رہی تھی۔ ایک ایک  
 اٹھا کر پھینک لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے کمرے کا نقشہ بدل گیا، اُس کے بعد صبح صبح کر  
 سا چاٹی تھی کہ اسی وقت شاہ جہانگیر اُس کے دروازے پر دستک دینے کے ساتھ ہی  
 آ گئے اور ایک اچھٹی نظر کرنے پر کوال کر قدرے سخت لہجے میں بولے۔  
 ”یہ کیا پکارا مہر چارکھا ہے تم نے۔ اس گھر کی دوسری عورتوں کو بھی دیکھا ہے کہیں ایسی حرکتیں  
 سے ہوئے۔“

”میں، میں اب یہاں نہیں رہوں گی۔“ وہ ان کی بات کیسے نظر انداز کر کے چینی۔  
 ”کہاں جاؤ گی؟“ شاہ جہانگیر کی پشانی پر بے شمار شکنیں پڑ گئیں۔  
 ”اپنے بابا سائیں کے گھر، انہیں بتاؤں گی میں کہ شاہ اقل روز مجھے چھوڑ گیا تھا۔ اور آپ  
 ب لگ بھی اُس کے ساتھ ہیں۔“

وہ کس طرح شاہ جہانگیر سے مرعوب نہیں ہوئی۔ بلکہ ایک طرح سے انہیں دھکی دی جس سے  
 اندر ہی اندر ٹھٹھکا کر بولے۔  
 ”پھر کیا کر لیں گے تمہارے بابا سائیں۔ زیادہ سے زیادہ شہر بالو کو بیان بھجوا دیں گے۔  
 شہر جگہ ہے یہاں شہر بالو کے لیے۔ اور یہ تو تمہارے لیے جس جگہ بنا نا چاہتے ہیں لیکن



”کیوں نہیں جی، اپنے سائیں جی ایسا جلد کاٹیں گے کہ چھوٹے شاہ جی اُسے ٹھوکر مار کر آپ کے پاس آئیں گے۔ سائیں جی کہہ رہے تھے کہ لیں آپ اجازت دے دیں پھر دیکھیں اُن کا کمال۔ ادھر چالیس دن پورے ہوئے نہیں کہ“

”ہر انسائے کیا سوچنے لگی تھی۔“

”ہاں جی، چالیس دن زیادہ تو نہیں ہوتے، یوں گزر جائیں گے۔ بس آپ دو کالے بکروں کے پیسے دے دیں۔ سائیں جی کہہ رہے تھے آپ ک کو دھرنے والی ہے۔ پہلے اس کا صدقہ اتاریں گے چاند سا بیٹا ہو گا“

جیسوں کی آخری بات پر وہ چونک کر دیکھنے لگی تھی۔

قدرے نرم و بیکر سمجھاتے ہوئے بولے۔  
 ”اس طرح وادیا بھاگے ہمارے لیے مشکلات کھڑی مت کرو مگر النساء جتنا عرصہ تم  
 اس گھر میں گزارا ہے اتنا عرصہ اس بھروسہ و یقینا شاہ خود بجل کر ہمارے پاس آئے گا۔ یہاں  
 وعدہ ہے تم سے یہ پھر بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔  
 ”خوش رہا کرو تمہاری خوشی ہم سب کی خوشی ہے۔“

وہ اس مکتبہ کا ہر ایک بین چار کے بین میں بیٹھ گیا۔

”بی بی بی: جیسراں نے کچھ ڈرتے ڈرتے پکارا تو وہ چونک کر دیکھنے لگی۔

”آپ کے بالوں میں کنکھی کروں؟“ جیراں نے کنکھی والا ہاتھ اس کے سامنے کیا تو اس نے

پہلے سارے کرنے پر غلط ڈال، پھر آرام سے بیٹھ بیٹھ گئی۔ اور سر پر سے تولیہ اتار کر اپنے

ڈال دیا۔ سنہری بالوں سے اس کی پوری کمر چھب چھب گئی تھی۔ جیراں نے بہت احتیاط سے

تھام کر کھانا شروع کیا۔ ساتھ ساتھ اس کے تیز رہی دیکھتے جا رہی تھی۔ اور وہ پتا نہیں کس

تھی۔ کتنی دیر بعد جیراں اسے غلط کر کے کئی بہت کر پائی تھی۔

مجلس سمر

”ہاں، آپ نے کس کام سے بلایا تھا مجھے؟“  
 ”میں نے،“ مہر النساء نے چند لمحوں کے بعد پوچھنے لگی، ”تم سائیں جی کے پاس گئی تھیں۔“  
 ”ہاں جی،“ جبران اکیدم اس کے بال چھو کر سامنے آکھڑی ہوئی، ”اور رازداری ہے۔“  
 ”سائیں جی کو سب پتا ہوتا ہے بی بی جی،“ انہوں نے چھوٹے شاہ جی کے بارے میں سب بتا دیا ہے۔“

”یہ تو میں جانتی ہوں، مگر انساؤ نے بڑے آرام سے بیڈ کی بیک سے ٹیک لیا تو حیران کو سہت مایوسی ہوئی کیونکہ اپنے تئیں اُس نے دھماکہ کیا تھا۔“

”ہاں اور تاؤ اور کیا رہے تھے سائیں جی۔ شاہ اُس عورت کے چنگل سے نکلے اُس نے یو جھا تو حیران پھر بڑے جوش ہو گئی تھی۔“

”کیوں نہیں جی، اپنے سائیں جی ایسا چلہ کاٹیں گے کہ چھوٹے شاہ جی اُسے ٹھوکر مار کر آپ کے پاس آئیں گے۔ سائیں جی کہہ رہے تھے کہ لیں آپ اجازت دے دیں پھر دیکھیں اُن کا کمال اور چالیس دن پورے ہوئے نہیں کرے“

”مہرانا جہانے کیا سوچنے لگی تھی۔“

”ہاں جی، چالیس دن زیادہ تو نہیں ہوتے، یوں گزر جائیں گے۔ بس آپ دو کالے بکروں کے پیسے دے دیں۔ سائیں جی کہہ رہے تھے آپ کی گود بھرنے والی ہے۔ پہلے اس کا صدقہ اتاریں گے چاند سا بیٹا ہو گا“

”جیراں کی آخری بات پر وہ چونک کر دیکھنے لگی تھی۔“

”کون آسیر؟“ دوسری طرف اتفاق سے وہی تھیں۔

”جی ہاں! سید کی نگاہیں تھیں اب اگر وہ اس کی شادی مبارکباد دے رہی ہیں یا بڑے بیٹیا کی۔  
 ”اچھا، تک کیسے دیکھی ہو تمہارے اب تو شادی ہو چکی ہے تمہاری یا بندوں سے نکل  
 ”اُپو، پھر کیا جی بی نکار کھی ہے، کھل کر بات کرو، انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں لوگا تو وہ  
 ”میں نے اندر بہت بڑبڑا کر کہی۔“

پیش کی حکمت یہیں بیصل رہی، دو دن ٹھیک ہوتا ہے پھر بڑھتا ہے۔ حالانکہ بہت اچھے پیشسٹ کو دکھ رہی ہوں۔ اور یہاں کسی چیز کی کمی بھی نہیں ہے پھر بتائیں یہ ان کے لیے ہیں لسٹولین سے زیادہ اکتا ہٹ تھی، جیسے بچے کی بیماری سے عاجز آگئی ہوں۔ باب ہی وہ کہنے لگے۔

”میں اس لیے، جب تک تم تھیں مجھے اطمینان تھا، اب میں اپنے بچے کو وہاں نہیں بھیجوں گی۔“ انہوں نے نہ صرف ابھی بلکہ آئندہ کے لیے بھی صاف منع کر کے اسیہ کو کھڑا دیا تھا۔ ”وہ، وہ، اچھا، اچھا،“ وہ نے ہنسنے سے انکار کیا۔ ”اور اصرار نہیں سکتی۔“ اور اصرار سے وہ نہ پر گواہی دے۔

آؤی کر لی ہے یہ سنا ہے اور ہاں سنا ہے ہمارے بھائی صاحب نے بھی دوسری

نہ۔ وہ تو پہلے ہی غافل تھے۔

وہ سارے کھانے کی شادی ہے، وہ اب جیسے مجبور آیا مرنے کا جواب دے رہی تھی۔

”آئی کہاں ہیں؟“ اُسے اچانک احساس ہوا کہ وہ انہیں وہیں جھوڑ کر آگئی ہے۔ انہیں

سارہ۔ اچھا ہاں۔ اُس کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی تھی؟ پھر وہ تھکے لگا کر بولیں: تمہارا بھائی کے لیے وہی ٹھیک ہے۔ ایک بیرونی۔  
 آسیہ کا دل چاہا فون پیج دے لیکن بیل کے وجہ سے ضبط کر گئی۔  
 ”خیر تم ساؤرب پڑھا لکھا جو کچھ میں چھوٹ رہی ہو یا۔“  
 میری بیل سے بات کرادیں۔ وہ فوراً بول پڑی۔  
 ”وہ سو رہا ہے۔“ اُدھر سے غڈ تیار تھا۔

”اچھا میں پھر فون کروں گی؟“ اُس نے فون رکھ کر دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔  
 کس احساس کے تحت اُس کا چہرہ ہمتا رہا تھا۔ آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ دیکھ کر قدر سے براؤ  
 اُس کی ہوا پر شاہ سکندر کے سے نکلا تھا اُسے اس طرح بیٹھے دیکھ کر قدر سے براؤ  
 ہو گیا۔ تو اُس نے آہستہ سے دونوں ہاتھ نیچے کر کر کے دیکھا اور یوں سر ہلایا جیسے کوئی بار  
 نہیں۔

”وہ کیا نام ہے اُس کا۔ تمہارا بھتیجا ٹھیک ہے۔ بات ہوگئی تمہاری اُس سے؟“ شاہ سکندر  
 جانتا تھا کہ وہ ابھی بیل کو فون کر رہی تھی۔  
 ”ہاں نہیں۔ میرا مطلب ہے بیل سے بات نہیں ہوئی؟“ وہ کچھ کنفیوز ہوگئی۔ شاید اُس  
 بتانا نہیں چاہتی تھی۔  
 ”اچھا چلو۔ فٹاٹ تیار ہو جاؤ؟“ شاہ سکندر اُس کا ہاتھ پکڑ کر کھاتے ہوئے بولا تو اُس  
 بے دھیانی میں لو چھ لیا۔  
 ”کہاں جاتا ہے؟“

”کیا مطلب، تمہیں یاد نہیں احمد حسن نے کھانے پر بلایا ہے اور دوپہر میں نائلہ کا فون ہو  
 تھا۔“  
 ”اچھے یاد ہے۔“ وہ تعداد مسکرائی۔ ”آپ کی یادداشت کا امتحان مطلوب تھا۔ پاس ہوگیا۔“  
 ”صرف اس امتحان میں؟“ وہ اُس کے ہاتھ کو زور سے دبتے ہوئے شوخ مسکرائی۔  
 ”نہیں۔ اب تک جتنے بھی امتحان آئے۔ البتہ آئندہ کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔“  
 ”کی گرفت سے اپنا ہاتھ نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی پھر چیخ پڑی۔“ آف میرا ہاتھ  
 توڑنے کا ارادہ ہے کیا؟“  
 ”ارے۔“ شاہ سکندر نے فوراً اُس کا ہاتھ جھوڑ دیا۔ پھر قدرے نادم ہو کر بولا۔“

”کچھ زور سے دب گیا۔ لاؤ دکھاؤ؟“  
 ”بس رہنے دیں۔“ وہ ہاتھ جھٹکتی ہوئی تیار ہونے چلی گئی۔  
 ”احمد حسن نے اگر حضور کھانے پر نہ بلایا ہوتا تو وہ اس وقت آبا جی کے گھر جانے کی  
 کرتی۔ کیونکہ اُسے بیل کی فکر تیار ہی تھی۔ اور وہ بھائیوں کو نبیلہ کے حالات سے آگاہ کر  
 تھی۔ بے شک وہ مان تھیں اس کے باوجود نبیلہ ان کے پاس جا کر ٹھیک نہیں ہوا  
 وہ بیل کو کسی سے ملنے بھی نہیں دے رہی تھیں۔ آج اُسے جی نال دیا تھا۔ وہ اگر فون پر  
 کی آواز سن لیتی تو اتنی پریشان نہ ہوتی۔ احمد حسن کے گھر نائلہ اور اُس کی امی سے  
 دوران بھی وقفے وقفے سے اُس کا ذہن ہلکتا رہا جس پر خود اُسے کتنی بار شرمندگی ہوئی کہ  
 سوال کیا کیا اور اس نے جواب کیا دیا تھا۔

پھر کھانے کے بعد شاہ سکندر اور احمد حسن کے درمیان سیاست کا موضوع چھوٹے  
 سمجھ گئی کہ اب یہ نشست خاصی طویل ہو جانے لگی۔ اس لیے نائلہ کے ساتھ اُس کے کمرے  
 ”بیت لورڈ ٹاپک ہے۔ نیچے بھی سخت وحشت ہوتی ہے۔“ نائلہ اُس کے لیے۔  
 رکھتے ہوئے بولی؟ آپ آرام سے بیٹھ جائیں۔ میں جانتے نہیں لے آتی ہوں۔“

”ابن اب نماز پڑھیں گی۔ اگر آپ کو کوئی بات کرنی ہے تو؟“  
 ”نہیں، میں ان کے اکیلے ہونے کے خیال سے کہہ رہی تھی۔ بس ٹھیک ہے انہیں نماز  
 پڑھنے دو۔“ وہ جلدی سے بولی تھی۔  
 ”اوکے میں چائے لاتی ہوں۔“ نائلہ مسکرائی پھر جاتے جاتے کارنر پر سے اپنا البم اٹھا کر  
 اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی، ”آپ جب تک یہ دیکھیں۔ پور نہیں ہوں گی۔“  
 اُس نے البم تمام لیا۔ پھر آرام سے میڈ پر بیٹھ کر دیکھنے لگی۔ شروع میں نائلہ کی تصویریں تھیں۔  
 اس کی اسکول اور کالج کے دوستوں کے ساتھ۔ پھر کچھ بلیو تقریبات کی۔ وہ عدم دلچسپی سے پلٹی  
 جلی گئی۔ پھر کچھ اکثر البم بند کر دیا۔ جب نائلہ چائے لے کر آئی۔ وہ گھٹنوں کے گرد بازو پیٹے  
 بیٹھی تھی۔

”اسی جلدی آپ نے تصویریں دیکھ لیں؟“ نائلہ نے بقیہ کا اظہار کیا تو وہ مسکرا کر بولی۔  
 ”نہیں اکیلے دیکھنے میں مزہ نہیں آ رہا تھا۔ تمہارے ساتھ دیکھوں گی؟“  
 نائلہ نے چھوٹی سی طرے سے اُس کے قریب رکھی پھر میڈ پر چڑھ کر بیٹھی اور درمیان میں البم  
 کھولتے ہوئے بولی۔

”جلیں میں آپ کو بتاتی ہوں، میرے ساتھ کون کون ہے؟ پھر وہ اپنی ایک ایک ہسیل کا نام  
 بتاتے لگی۔ اُس کے بعد کچھ بلیو تقریبات کی تعداد میں اپنے خاندان کے ہر فرد سے متعارف  
 فرمایا۔ پھر ایک تصویر پر انگلی رکھ کر بولی۔  
 ”اور جناب یہ ہیں آپ کے سسرال والے۔“  
 وہ بے اختیار تصویر پر جھک گئی۔ شاہ سکندر کے ہتھے جھپٹتے ہیں سے وہ مل چکی تھی۔ اس  
 لیے تصویر میں جتنے نیچے نظر آ رہے تھے۔ انہیں وہ پہچان گئی۔ پھر روکیوں کے بارے میں  
 نائلہ سے پوچھا تو وہ ایک چہرے پر انگلی سے اشارہ کر کے کہنے لگی۔  
 ”یہ شہر بالو ہیں۔ ایک بار سکندر بھائی انہیں لے کر آئے تھے۔ یہ تصویر میں نے انہی سے  
 لی تھی۔ سچ بھائی بہت مشکل سے دی تھی انہوں نے۔ کہہ رہی تھیں۔ سکندر بھائی کو بتا نہ چکے آپ  
 بھی نہیں بتائے گا بھائی۔“

”اچھا۔“ وہ ذرا سا ہنسی۔ اور شہر بالو کو اچھی طرح دیکھنے کے بعد اس کے ساتھ کھڑی دوسری  
 روکی کے غیر معمولی حسین چہرے پر اس کی نظر میں جہم کر رہ گئی تھیں۔

”کتنی باری ہے ناں بھائی یہ روکی؟“ نائلہ اُس کی نظروں کے نیچے دیکھ کر کہنے لگی۔ میں بھی  
 جب کبھی اس تصویر کو دیکھتی ہوں تو میری نظر اس چہرے سے ہٹتی نہیں ہیں۔“  
 ”کون ہے یہ؟“ اُس نے اسی مبہوت عالم میں پوچھا۔  
 ”بتا نہیں۔ شاہ سکندر بھائی کی چچا زاد بہن ہیں شہر بالو نے ان کے بارے میں بتایا تو تھا۔  
 ”کیا خیر؟“ وہ بولی۔  
 ”نائلہ نے سچے سچے لکھی تھی کہ اچانک جانے ذہن کے کس گوشے سے نکل کر ایک نام آسیہ کے  
 فون پر آ گیا تھا۔“  
 ”مہر النساء۔“



”ہاں مہر النساء۔“ نائلہ خوش ہو کر بولی پھر پوچھنے لگی: ”آپ جانتی ہیں انہیں؟“  
 ”ایسا میرے کوئی جواب نہیں دیا۔ کیونکہ وہ خود حیران ہو کر سوچ رہی تھی کہ یہ نام اُس کی زبان پر

”کہاں گھر گئیں آپ؟“ نامک نے اُس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا تو چونکنے کے ساتھ ہی اُمّ ذہن میں جھانکا ہوا تھا۔

”جوتی میں زیادہ افراد نہیں رہتے۔ بابا جان، بی بی جان اور مہر النساء“

”اُسی وقت احمد حسن نے وہیں سے نامک کو بلایا تو وہ سر جھٹکتے ہوئے بولی۔  
”میرا خیال ہے سکندر چلنے کا کہیں گے۔ تم آؤ ناں کسی دن۔ صبح سے آؤ۔ سارا دن میرے ساتھ آؤ۔ سارا دن آپ برداشت کر لیں گی مجھے،“ نامک اُس کے ساتھ بیڈ سے اُترتے ہوئے بولا۔  
”تم آؤ تو؟“ اُس نے ہلکے سے نامک کا رخسار دیکھا۔

”بھڑک کر سے نکل کر آئی کر۔“ توشاہ سکندر چلنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ وہ اُسے رکنے کا کہہ کر اُسی سے ملنے اُن کے کمرے میں چلی گئی۔ وہاں سے ہی توشاہ سکندر احمد حسن کے ساتھ باہر نکلے۔ اُس نے نامک کو گھلے لگا کر کھانچا نظر کیا اور اپنے ہاں اُسے کی تائید کرتے ہوئے باہر نکل آئی۔  
”ابھی نہیں ہے۔ بہت پر خلوص اور مہربان! رستے میں وہ ایمانداری سے احمد حسن کے گھر کی طرف کرتے ہوئے بولی۔

”ایسے مخلص لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ ذرا بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا اور نامک تو اتنی بے کر ہے کہ“ وہ اچانک کسی خیال کے تحت ایک لمحے کو چپ ہوئی پھر ایک دم شاہ سکندر کا بازو گھڑ بولی۔

”سکندر مجھے ابھی ابھی خیال آیا ہے، نامک، عدیل بھائی کے لیے کسی رہنے کی۔ وہ کہیں گنج بے نال ہے؟“

شاہ سکندر نے مسکرا کر اُسے دیکھا پھر دوہری ذرا سا سر ہلا کر بولا۔  
”ساری بہنوں کے جذبات اپنے بھائیوں کے لیے یکساں ہوتے ہیں۔ جہاں کسی اچھی لڑکی فوراً بھائی کا خیال آ گیا۔ بے چارے کے طور پر دُنیا کا خیال کسی کو نہیں آتا“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ وہ جو اُس کا بازو تھامے بیٹھی تھی اس میں ناخن چبھو کر بولی۔  
”اُف، ظالم، بوی۔ مجھے جوابی کارروائی پر مجبور کر دو۔ ایکسٹنٹ ہو جانے کا؟“ وہ اس کا

سے بازو چھڑا کر پھر اس کی گردن میں ڈالنا چاہتا تھا کہ وہ فوراً پیچھے ہٹ گئی۔  
”راتے میں ایسی حرکتیں میں پسند نہیں کرتی“ وہ اُس کی گردن میں بازو نہیں ڈال سکا تو بالوں کو ہاتھ جھٹکا دے کر بولا۔

”میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ گھورنے لگی۔  
”بہت کچھ۔ تفصیل کہہ جا کر بتاؤ گا۔ اس وقت تم اپنی بات کرو کیا کہہ رہی تھیں۔ عدیل اور نامک؟“ وہ اس کی کھلی آنکھوں میں ایک نظر ڈال کر کہنے لگا: اچھا خیال ہے لیکن“

”لیکن کیا؟“ وہ فوراً بول پڑی۔  
”ایک منٹ“ شاہ سکندر نے پہلے گاڑی پارک کی۔ پھر اُس کے ساتھ اپارٹمنٹ کی سیڑیاں چڑھتے ہوئے کہنے لگا۔

”نامک ابھی پڑھ رہی ہے اور میرا خیال ہے مزید دو سال تک احمد حسن اور انٹی اُس کی شاہ نہیں سوچیں گے“

”نامک کو پڑھنے سے کوئی نہیں روکے گا۔ میں کل اُمّاں جی سے بات کروں گی“ وہ لاکھ اندر داخل ہوتے ہوئے کہنے لگی: بات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے“

شاہ سکندر نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ یوں جیسے سنا ہی نہیں اور سیدھا چلتا چلا گیا۔ وہ بند کر کے اُس کے پیچھے آئی تو ڈیڑھ گھنٹہ پہلے کے سامنے رک کر اُمتوں کا نواں اُدھلنے سے باز ہوئے کہنے لگی۔

”میں سکندر! ہم نے بہت گھوم پھیر لیا۔ بہت دعوتیں اُڑائیں۔ اب ہم اپنی زندگی میں سیٹ ہونا چاہیے“

شاہ سکندر نے کوٹ ہٹ کر کرتے ہوئے رک کر اُسے دیکھا پھر قصداً خاموش رہ کر اُس کی طرف سے وضاحت کا انتظار کرنے لگا لیکن وہ بڑے آرام سے زیورات دراز میں ڈال کر دوش روم میں چلی گئی۔

”نہ ہاتھ دھو کر دایں آئی تب بھی اس سلسلے میں مزید کچھ نہیں کہا۔ جس سے وہ یہی سمجھا کہ اُس کا دھیان نہیں ادھر اکوہ ہو گیا ہے جبکہ وہ جانتا چاہتا تھا کہ اپنی زندگی میں سیٹ ہونے سے اس کا کیا مطلب ہے۔

”بھی بیٹے دو! میں چنچ کر کے آیا پھر آرام سے بیٹھ کر پوچھنے لگا۔  
”ہاں کیا کہہ رہی تھیں تم کسی یونٹنگ ہوئی چاہیے؟“  
”میرا مطلب اپنے اپنے کام سے لگنے کا ہے۔ یوں وقت ضائع کرنے کا کیا فائدہ۔ آپ کو عمومی وارڈا کرتا ہے اُس کا شو چیں اور میں اُس جاب؟“ بات ابھی اس کے ہونٹوں میں تھی کہ وہ فوراً بول پڑا۔

”نہیں“ وہ کچھ بھی نہیں اور کچھ حیران ہو کر دیکھنے لگی تھی۔  
”کیا نہیں؟“ وہ کچھ بھی نہیں اور کچھ حیران ہو کر دیکھنے لگی تھی۔  
”تم ابھی نہیں کرو گی۔ ہاؤس جاب بھی نہیں! وہ قطعیت سے کہہ کر سگریٹ سلگانے لگا۔

”کیوں؟“ اُس کی حیرت میں تدریس اُنھیں بھی شامل ہو گئی۔  
”بس میں نہیں چاہتا کہ تم بھی سے لکھے علاوہ دوسری مصروفیات میں آجھ جاؤ بلکہ جب تک میں پوری طرح اسٹیبلش نہیں ہو جاتا تم سوچنا بھی نہیں۔ اسے تم میری خواہش سمجھ لو اور مجھے یقین ہے

کہ تم میری خواہش کا احترام ضرور کرو گی۔“ حتمی انداز میں کہتے ہوئے آخر میں شاہ سکندر اُسے دیکھ کر مسکرایا۔  
”اور وہ مسکانے کی کوشش میں ناکام ہو کر سر جھٹکا لگی تھی۔

شاہ سکندر نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اُسے کام کے سلسلے میں کچھ دوستوں سے ملنا ہے۔ اس لیے وہ اس وقت اُسے آج ہی کے گھر اُترنے پر اصرار کر رہے بلکہ اُس کی طرف سے معذرت بھی کرے اور یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جس پر وہ احتجاج کرتی اس لیے جب اُس نے آج ہی کے گھر کے سامنے گاڑی

رکھی تو وہ اُتر کر اُس کی دایہی کا پوچھنے لگی۔  
”دو پہرے کھانے تک آجائیں گے؟“

”کچھ نہیں سکتا۔ تم بہر حال کھانے پر انتظار نہیں کرنا۔ اوکے! وہ دلکش مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ ہلاتا گاڑی بڑھانے لگا تو کچھ دیر اُس کے پیچھے دیکھنے کے بعد وہ اندر آ گئی۔ آج ابھی اور عدیل بھائی

حسب معمول راندے میں بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ اُس نے قریب آ کر سلام کیا تو دونوں چونکے اور عدیل بھائی فوراً اُٹھ کر اُس کی طرف دیکھنے لگے۔

”سکندر بہت عجلت میں تھے اس لیے نہیں اس کے معذرت کر رہے تھے۔ آپ بیٹھیں ناشتا کریں!“  
”میں نے عدیل بھائی کے انداز سے کچھ کر کہا۔  
”تم نے ناشتا کیا؟“ آج ابھی اُس سے پوچھا۔

”جی آج ابھی۔ ناشتا کر کے آ رہی ہوں۔ آج ابھی کمرے میں ہوں گی؟“ وہ جواب دینے کے ساتھ آٹاں جی کا پوچھتے ہوئے ان کے کمرے میں آ گئی۔  
”السلام علیکم اُمّاں جی!“

”جی جی، ہو خوش رہو۔ بڑی عمر ہے تمہاری۔ ابھی میں تمہیں یاد کر رہی تھی! آٹاں جی اُسے دیکھ کر کس آنکھیں۔  
”خیر بہت۔ صبح ہی صبح کس سلسلے میں یاد کر رہی تھیں! وہ اُن کے گلے تک کر پوچھنے لگی۔



یہاں تھا تو میں اُس کو یہ کہہ کر دوانی پلائی تھی کہ اگر تم نے دوانی نہیں لی تو پھر پھوندا ہوں وہ خورانی لیتا تھا۔ تم اسی طرح وقتاً فوقتاً اسے ہلاؤ۔ حوصلہ دو اسے۔ مجھے لگتا ہے وہ گھبراہٹ میں کر رہی ہے۔ اُس نے کہا۔ بہت پیار کرتا ہے تم سے۔ میں ناں! میمونہ بھائی نے اسے کم عمر حالت نکالنے کے لیے آخر میں زور سے اکاٹھا وہ گہری سانس کھینچ کر بولی۔

”میں جانتی ہوں۔ سب مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔“  
”جی نہیں، سب میں میں شامل نہیں ہوں! میمونہ بھائی کی شوخی خدا لوٹ آئی۔ بتا نہیں ام سنجیدہ گفتگو کیسے کر لی تھی انہوں نے۔“  
”اب بھی شامل ہیں! وہ زور دے کر بولی تو میمونہ بھائی کھلکھلا کر نہیں۔ تبھی برا کمرے سے بھائی کے پکارنے پر وہ ہنسی روک کر کچھ تعجب سے بولیں۔

”یہ عدیل اس وقت کیسے آگیا۔“  
”آہ۔ دوسری آواز کے ساتھ ہی عدیل بھائی کمرے میں آگئے۔“  
”جی بھائی! وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔“  
”وہ۔ دیکھو تمہیں بابا جی بلارہے ہیں۔“  
عدیل بھائی جس طرح ٹپک کر بولے اُس سے وہ سمجھ گئی کہ اُسے وہاں سے ہٹانا مقصود اور اگر وہ صاف لفظوں میں کہتے تو وہ محتسب نہ ہوتی بلکہ چپ چاپ چلی جاتی جیکہ اب وہ تک جا کر فوراً پلٹی تھی۔  
”میں آئیہ کمرے کے ہاپٹل جا رہا ہوں۔ شاہ سکندر کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ عدیل بھائی بہت میں میمونہ بھائی کو بتا رہے تھے۔“  
”آہ۔ یہ متوقع پہنچ کر وہ گھٹنے کے لیے ایک ہاتھ ہونٹوں پر اور دوسرے ہاتھ سے جوکہ سہارا لیا تھا۔

”بی بی جان کا معمول تھا کہ وہ فجر کی نماز کے بعد تسبیح لے کر جوڑے کمرے میں بیٹھتی تو پھر ڈھلے تک اُن کی بیٹھک وہیں رہتی تھی۔ اس دوران مزارعوں کی عودیں انہیں سلام کرتے، اسی پہلے اپنے دکھ تکہ انہیں سنا جاتی تھیں۔ کسی وقت کوئی ہنسوا بیٹھی۔ یہی اُن کی روایکمن اُس روز وہ اپنے کمرے سے نکلی ہی تھیں۔ بڑی ہونا سننے کا کہنے آئیں تو خلاف معمول بڑے کمرے کے بجائے ادھر دیکھ کر تشویش سے پوچھنے لگیں۔

”بی بی جان! خیر تو ہے؟“  
”خیر ہے بی بی۔ تم جانتی ہو کیوں دل گھبرا رہا ہے؟“ بی بی جان نے انہیں تسلی دینے کے۔  
”کیونیت بھی بتا ڈالی۔ میں ناشتا نہیں لے آتی ہوں۔ بڑی ہو جانے لگیں کہ وہ بولیں۔

”میں میرے لیے کچھ مدت لاؤ، میرا دل نہیں چاہ رہا۔ تم سب آرام سے ناشتا کرو پھر میرا پاس بیچ دینا۔“  
”جی اجازت بڑی ہو چلی گئیں اور بی بی جان مہر النساء کی شادی سے دن اور مہینے انگلیا کرنے میں تک گئیں۔ غالباً حساب لگا رہی تھیں کہ مہر النساء کی ڈیلیوری میں کتنے دن باقی اس خاندان کے رواج کے مطابق دو مہینے پہلے ہی مہر النساء کو اپنے سینک چلے جانا تھا اور پھر تک وہیں رہنا تھا لیکن اُس نے خود ہی منع کر دیا تھا۔ بس جس روز سے اُس نے شاہ جہاں پر شاہ سکندر سے باتیں کرتے سنا تھا کہ وہ کچھ اپنی منوانے کی تھی۔ آخر میں تو اسے

جانی تھی۔ شاہ جہانگیر پر تو بس نہیں جلا تھا نہ وہ اُس کی دھمکی سے مرعوب ہوئے تھے۔ بہر حال جب اُس نے سینکے جانے سے منع کر دیا تو ظاہر ہے کوئی زبردستی نہیں تھی۔ البتہ بی بی جان اُس کی طرف سے نکر مند رہنے کی تھیں کہ ایک تو پہلا بچہ تھا دوسرے وہ اپنا خیال نہیں رکھتی تھی۔ کھانے پینے سے حد درجہ لا پرواہی کی بنا پر بہت کم روز بھی ہو گئی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر جب بھی جگہ اب گئے لے جاتی اُس کی کمزوری کا سبب خود لاک کی کمی بتاتی تھی۔ پھر بی بی جان سے کہتی کہ اُسے زبردستی کھائیں دلائیں۔ ورنہ کیس میں مشکل ہوگی۔ اور بی بی جان اس پر ہرگز برا آزمایا جی نہیں۔ آرام سے پیاتے اور کسی وقت بڑی طرح دانستی بھی نہیں لیکن اُس کا ایک ہی جواب ہوتا۔

”بس میرا دل نہیں چاہتا۔“  
”آخر کیا چاہتا ہے تمہارا دل؟“ ایک بار بی بی جان نے اسی طرح غصے میں پوچھ لیا تھا اور جواب میں اُس نے ایسی نظروں سے دیکھا کہ بی بی جان اپنے آپ مجرم سی بن گئی تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے اسے لگنا چھوڑ دیا لیکن اُس کی نکر ہر وقت رہتی تھی۔  
”موتہ سننے جب لیڈی ڈاکٹر کی تھی تو اُس نے مہر النساء کی ڈیلیوری میں بس بائیس دن تلنے تھے۔ اور اُن کے دل اُسے ڈرب لگنے کا کہا تھا۔ کچھ دیر میں اُس کی آمد متوقع تھی کہ وہ ہیں اُن کے پاس لیٹ جاتے گی۔ اصل میں وہ اُس کے ساتھ ساتھ اپنا دھیان بھی بنا نا چاہتی تھیں۔ جلنے کیوں صبح سے دل گھبرا رہا تھا۔ بابا جان بھی کل سے شاہ جہانگیر کے ساتھ زینوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور اپنی دایہ کے بارے میں بھی انہوں نے کچھ نہیں بتایا تھا۔

”میں بی بی جان پر دودھ پی لیں سکو کوڑ ملا کر لاتی ہوں۔ بی بی جان نے ناشتے کو منہ کیا تھا تو بڑی بہرہ دودھ کا گلاس لے کر آگئی تھیں۔“  
”خوش رہو! بی بی جان محض اُن کا دل کھنے کی خاطر گلاس تھا منا جاتی تھیں کہ مہر النساء کی دلہنوز جنسے دودھ کا گلاس دے اور سینے والے ہاتھوں کے درمیان سے پیئے جا رہا۔

”الہی خیر! بی بی جان نے دل کر سینے پر ہاتھ رکھا۔ بھی حیران بھانکتی ہوئی آئی۔“  
”وہ بی بی، وہ چھوٹی بی بی بیڑھیوں سے گرتی ہیں۔“  
”کون بہو؟ بڑی بہو بھائی کیس اُن کے پیچھے تھیں۔“  
”مہر النساء کا جائے کون سی بیڑھی پر یاؤں؟“ اُس نے توڑن بکرا تھا کہ وہ فرش پر بے ہوش بڑی تھی۔ بی بی جان کے چاچا ہاتھ پاؤں پھول گئے کہ ایک تو وہ پورے وزن سے تھی دوسرے لڑکی اپنل بھی فریب نہیں تھا۔

”بڑی بہو نے حیران کی مرد سے مہر کو اکٹھا کر وہیں صوفے پر لٹایا پھر پریشان کھڑی بی بی جان سے کہنے لگیں۔

”بی بی جان۔ آپ دیکھیں اسے۔“  
”ارے میں کیا دیکھوں۔ وہ ڈاکٹر آئے ہی والی تھی۔ بتا کر اُس کا۔ شاہ سکندر کہاں ہے بیجو سے۔“  
”گھبراہٹ میں بی بی جان کے ہونٹوں پر شاہ سکندر کا نام آیا تھا۔“  
”مہر النساء بے ہوشی کے عالم میں ہی کرا رہی تھی۔ شاید وہ خود میں درد کی لہر سے اٹھنے لگی تھیں۔ بڑی بہو نے حیران کو اپنے کمرے کی طرف دوڑایا کہ شاہ یونس حیات کو بلا لائے اور اتفاق سے ہی وقت ڈاکٹر آگئی۔ بڑی بہو نے فوراً اسے مہر النساء کے بیڑھیوں سے گرنے کا بتایا تو وہ اسی تیزی سے مہر النساء پر بیٹھ گئی۔ جبکہ آپ کے دوران ہی اُس نے سمجھ لیا کہ آپ کیس اُس کے پیادے باہر ہو چکے۔ جس ایک انگلیش لگایا پھر بی بی جان سے کہنے لگی۔

”بڑی بہو نے دونوں کی حالت مشورہ لٹا کہ ہے آپ انہیں کسی ہاپٹل لے جائیں۔ ہو سکتا ہے آپ پریش

”عدیل کرو بی بی۔ میں اور بھی کام ہیں۔“ سسر نے کہا تو وہ اپنا دوپٹہ کھینچے ہوئے عدیل بھائی کے پیچھے چل پڑی۔  
 فاطمہ سسر پر اپنی ایک پریشانی عین قیصر میں تھا۔ اور اسے کہاں کہاں اور کتنی چوئیں آئی تھیں اس بارے میں احمد حسن بھی کچھ نہیں جانتا تھا۔ ”وہ بے اختیار ریش پڑی۔“

”کے آپ سکندر کے ساتھ نہیں بیٹھے؟“  
 ”آرام سے آہستہ اس طرح کروئی تو میں نہیں گھر چھوڑاؤں گا۔“ عدیل بھائی نے دھیرے سے اُسے دہرایا تو اُس نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چسپا لیا۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی لیکن اُسواپ ہی آپ جھلکے رہے تھے۔

”میرے خدا! مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنی کم ہمت ہو۔ چلو یہاں بیٹھو۔“  
 عدیل بھائی نے اُسے کندھوں سے تمام کر بیچ پر بٹھایا پھر اُس کے ساتھ بیٹھے ہوئے احمد حسن سے پوچھنے لگے۔

”آپ بتائیں احمد حسن، آپ کو شاہ سکندر کہاں اور کس حالت میں ملے؟“  
 ”آہستہ آہستہ احمد حسن کا جواب سننے کے لیے فوراً ہتھیلیوں سے انہیں رگڑ کر ہاتھ پیچھے کر لیا۔“  
 ”مجھے سکندر کہیں نہیں ملا۔ میں تو اپنے افس میں تھا۔ وہاں ڈاکٹر احسن کا فون آیا اور انہوں نے بتایا کہ سکندر یہاں ہے۔ پھر میں آپ کو فون کرتے ہوئے یہاں آیا تھا۔ اور آہستہ بھائی کو ساتھ لے کر آیا ہوں کہہ کر خود ڈاکٹر ہیں، ہم سے زیادہ کچھ سکتی ہیں لیکن“ احمد حسن نے یکدم بچھا ہونٹ انہوں میں دبایا۔

”سناقم نے، تم سے زیادہ سمجھ سکتی ہو۔ جاؤ معلوم کرو سکندر کے ساتھ کیا معاملہ ہے۔“ عدیل بھائی نے اہل کا کدھا لپٹیکر کہا تو اُس نے کاؤنٹر پر گھڑی زس کو دیکھا پھر مایوسی سے سر ہلا کر دلی۔

”وہ سسر کچھ نہیں بتا سکے گی۔ ڈاکٹر باہر آجائیں۔“ اُن سے معلوم کر س گئے۔ پھر کسی خیال کے تحت کدھڑکاؤنٹر پر چلی گئی اور سسر کو متوجہ کر کے پوچھنے لگی۔

”میں سسر ڈاکٹر پریشانی عین قیصر میں جو پیشکش ہے اُسے سختی دیر ہوئی ہے۔ آئی مین یہاں آئے ہوئے؟“  
 ”اوجا۔ یوں کھنڈ ہوئے۔“ سسر نے گھڑی دیکھتے ہوئے بتایا۔  
 ”کوئی سیریس؟“ پریشانی عین قیصر کا دروازہ کھلنے پر اُس کی بات ادھوری رہ گئی اور ڈاکٹر کے باہر آنے کا انتظار کرنے کے بجائے وہ بھاگ کر اندر چلی تو کئی لیکن پھر اُسے اپنے پیروں پر گھڑے رہنا شکل ہو گیا تھا۔

”شاہ سکندر کا سر اور دھچا چہرہ سینڈ میٹوں میں جکڑا ہوا تھا۔ پھر ایک کندھے سے ہیٹ تک اور میں نامک پل سڑی قید میں تھی۔“

”آہستہ“ وہ کرنے کو کہی کہ ایک ہاتھ اُس کے کندھے پر اُن ہتھ اُٹھائے۔ ”تم آہستہ ہونا؟“  
 ”بی بی! اس نے کم عمر انداز میں دیکھا۔ وہ ڈاکٹر عبدالوہاب تھے۔ جن سے پریشانی کے دوران مول احمد حسن نے اس کی بی بی بارگاہ اوقات ہوئی تھی۔ بہت مہربان اور شفقت، جن کے بارے میں وہ کہا کرتی تھی کہ اگر کبھی میں اپنی زندگی سے مایوس ہو گئی تو میری آخری امید ڈاکٹر عبدالوہاب ہوں گے۔“  
 ”مولا احمد حسن کم عمر انداز میں اُس نے شاہ سکندر کی طرف اشارہ کیا تو وہ پوچھنے لگے۔“  
 ”وہ اس کے ساتھ ہو گیا۔“

”فونٹ وری۔ ای اراؤٹ آف ڈیجر۔“ (یہ خطبے سے باہر سے) کم اُن گول بی بی بڑی ڈاکٹر وہاب نے کدھڑکاؤنٹر پر چڑھ کر بولے پھر اسی طرح اُسے اپنے ساتھ لگنے ہوئے پریشانی عین قیصر سے باہر لے گئے۔

”جو صدمہ رکھیں بی بی جان! بڑی بھونے کہا اور شاہ یونس کو آتے دیکھ کر اُن کے پاس چل گیا۔ کچھ دیر بعد بی بی جان اور بڑی بھونے مہر النساء کو لے کر شہر روانہ ہو رہی تھیں۔ لیڈی ڈاکٹر کے ساتھ تھی۔ سفر طویل تھا۔ عام حالات میں ڈھائی تین گھنٹے بھاری گتے ہیں اور اب پورے پچھترے تمام راستے بی بی جان قرآنی آیات کا ورد کرتی رہی تھیں۔ انہیں اور بڑی بھونے چٹا نہیں تھا کہ کہاں جانا ہے۔ ڈاکٹر نے ڈرائیور کی رہنمائی کی تھی۔“  
 ”اور ایک پرائیویٹ کلینک میں دو دن موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد نے ایک خوبصورت بیٹے کو جنم دیا تھا۔“  
 ”پوتا مبارک ہو بی بی جان! ماشاء اللہ بہت خوبصورت ہے۔ بالکل اپنے باپ پر گلیا۔“  
 بھونے پچھترے بی بی جان کی کود میں دلالتے ہوئے کہا تو وہ ریل آئیں۔

”خیر مبارک۔“ نہیں بھی مبارک ہو۔ مہر و کبھی ہے؟“  
 ”مہر و ابھی ٹھیک نہیں ہے۔ بڑی بھونے بی بی جان کے پاس بیٹھے ہوئے کہنے لگیں ڈاکٹر! جو ہو گئی تھی۔ بالکل سفید بڑی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر! جو چھوڑ دی تھی اُسے کھانے کو نہیں دیتے! بتاؤ کھانے کی کمی ہے کیا۔ وہ خود نہیں کھاتی۔“ بی بی جان نے ناکواری سے سر جھٹکا پھر بولا۔  
 ”گھر کب چلنا ہے؟“  
 ”مہر و اُن کے قابل ہو گئی تب تو۔ ڈاکٹر کہہ رہی تھی کم سے کم ایک ہفتہ لگے گا۔ بڑا“  
 ”نے بتایا تو بی بی جان اچھنبے سے بولیں۔“

”لتنے دن“  
 ”گھر کریں مجھوڑی ہے۔ البتہ آپ جانا چاہیں تو شاہ یونس آئیں گے۔ اُن کے ساتھ آجائیں گے۔“  
 ”ہاں۔ میں کہاں اتنے دن گھر چھوڑ کر بیٹھ سکتی ہوں۔“ بی بی جان نے تائیدی انداز میں بھونے کہا تھا۔

”آہستہ کو خود کو سنبھالنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ تمام راستے وہ کسی سہمی ہوئی جگہ کی طرح کا بازو مضبوطی سے تھامے رہی تھی۔ اور عدیل خود بھی پریشان تھے پھر بھی اُسے مسلسل رہے۔ پھر اُسے بازو کے حلقے میں لے کر کلینک میں داخل ہوئے تو احمد حسن انہیں دیکھتے آیا تھا۔“

”ارے بھائی، آپ کو کیا ہوا۔ بہت کمزور۔“ آپ تو خود۔“  
 ”سکندر کیسے ہیں؟“ اُس نے ساری باتیں پکی کر کے ٹوک دیا۔  
 ”ٹھیک ہو جائیں گے۔ چلیں آپ خود دیکھ لیں! احمد حسن نے کہتے ہوئے لفٹ کی طرف کیا تو عدیل پوچھنے لگے۔“

”کہاں۔“ اذ پر ہیں؟“  
 ”ہاں۔ یہاں میٹرنی ڈیپارٹمنٹ میں تو نہیں ہو سکتے! احمد حسن نے قصداً ہلکا ہلکا اختیار کیا۔ جسے نظر انداز کر کے وہ فوراً لفٹ کی طرف بڑھی تھی کہ گروں میں ہلکا سا جھٹکا اُس کے قدم آپ ہی آپ ٹک گئے۔ ہلٹ کر دیکھا تو ایک زس اسٹریچر وکیلٹی ہوئی تھی جس کے کونے میں اُس کا دوپٹہ اچھ گیا تھا۔“

”سسر! پھر۔“ وہ اُسے روک کر اپنا دوپٹہ نکالتے گی اور اس دوران بس ایک سرسبز! اسٹریچر پر بڑے سادہ بڑی لڑکی پر ڈالی۔ اگر اس وقت اس کا وہن اس بڑی طرح متاثر ہو ایک بیل کر فٹنگ ضرور اور میر کہاں دیکھا ہے۔“ میں اچھی ہوئی آگے بڑھتی لیکن اُسے اپنا نہیں تھا۔

آسیہ نے ذرا سا سر ہلا کر انہیں اطمینان دلایا تھا۔  
پھر شاہ سکندر کو کمرے میں منتقل کرنے تک وہ ایک طرف چپ چاپ بیٹھ رہی تھی۔ اُس کا

ابھی تک کام نہیں کر رہا تھا اور اندر گہری خاموشی چھائی تھی۔ عدیل بھائی شاہ ذاکر عبدالوہاب کے  
اُن کے کمرے میں چلے گئے تھے اور اچانک حسن میں نرمی کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے پلکے  
کو کچھ کی طرف لٹے جایا گیا تب بھی وہ اسی طرح بے حس و حرکت بیٹھ رہی تھی، پھر عدیل بھائی نے  
اُسے اٹھایا تھا۔

رات میں میمونہ بھائی اور خلیل بھائی اُس کے اور آسیہ کے حالات کے پیش نظر انہوں نے بہت  
اُسے اپنے ساتھ گھر لے جائیں۔ عدیل بھائی نے بھی بہت زور دیا لیکن وہ نہیں مانی اور وہ لڑی  
اُس نے ایک کرسی پر بیٹھ کر گزاری تھی۔ صبح سویرے کچھ دیر پہلے شاہ سکندر کو ذرا سا ہوش آیا  
اسی انتظار میں بیٹھ تھی۔ فوراً اُس کے پاس پر جھک گئی۔

سکندر! آپ صلیک ہیں ناں؟  
شاہ سکندر ایک آنکھ ذرا سی کھول کر کچھ دیر اُسے دیکھتا رہا پھر آنکھ بند کر لی تو اُس نے آہستہ

کہ: ”مقام کر لیا۔“  
سکندر! پھر اُس کی بغض چمک کی اور قدرے مطمئن سی ہو کر اُس کے پاس سے ہٹ آئی  
بعد ہی اندر صبر سے چھٹنے لگے اور کھڑکی کے شیشوں پر اچالے کی دستک کے ساتھ ہی اُس کی آنکھوں  
اُترنے لگی تو اُس نے واش روم میں جا کر منہ پر پانی کے پھینٹے مارے۔ ابھی بھی وہ سونا نہیں  
لیکن نیند غالب آ رہی تھی جسے کچھ گانے کے لیے وہ ادھر سے ادھر پھرتے لگی۔ بہت مشکل گھڑی  
سے کچھ کھانا پیا بھی نہیں تھا۔ سرانگ دروسے پٹھا جا رہا تھا۔ دروازے کے باہر قدموں کی آواز  
تو وہ دنگ کر دیکھنے لگی۔

عدیل بھائی کے ساتھ ذاکر عبدالوہاب اندر آئے تھے۔ اُس پر نظر پڑتے ہی مسکرا کر بولے۔  
گڈ مارننگ۔ کیسا بے تھرا پینٹنٹ؟  
سر! ایک گھنٹہ پہلے انہیں ہوش آیا تھا۔ بس تھوڑی دیر کے لیے اُس نے قریب آکر بتایا

صاحب کوئی جھوٹے بغیر شاہ سکندر کو چمک کرنے میں لگ گئے۔ پھر سسر کو ہدایات دیں  
کے بعد عدیل بھائی کی طرف متوجہ ہو کر کہتے لگی۔  
فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ گو کہ جو میں کافی آئی ہیں لیکن شکر کریں کوئی گہری جوت نہیں  
پھر آسیہ کی طرف اشارہ کر کے پوچھنے لگے۔ آپ اس کے کون ہیں؟

بھائی! عدیل اس غیر متوقع سوال پر اُسے دیکھ کر بولے تھے۔  
بڑے یا چھوٹے؟ ذاکر صاحب انتہائی سنجیدگی سے پوچھ رہے تھے جس پر عدیل کو بھی  
ذرا اب دینا پڑا۔

نہ بڑا!  
کیسے بڑے بھائی ہیں جو انہیں ڈانٹ نہیں سکتے۔ ان کی حالت دیکھ رہے ہیں آپ۔ ف  
پہنچائیں درندہ اس مہین کی جگہ یہ لٹی نظر آئی گی!  
ذاکر وہاب عدیل کو تنبیہ کرنے کے بعد اُس سے قدرے زعجب سے بولے۔

جلو! یہ کچھ جاؤ۔ آرام کرو اور پھر فریش ہو کر یہاں آنا!  
بس ٹھیک ہوں سر! وہ کمزور سی آواز میں بولی۔

”کوئی ٹھیک نہیں ہو۔ ذاکر صاحب سے پہلے عدیل بھائی بول پڑے۔“ ذاکر صاحب جھٹ  
رہے ہیں۔ چلو میں نہیں کچھ چھوڑ کر آتا ہوں۔“  
وہ بے بسی سے شاہ سکندر کو دیکھنے لگی۔ دل کسی طرح بھی اُس کے پاس سے جانے کو چاہا

پھر ملتی نظروں سے عدیل بھائی کو دیکھا تو وہ اُس کی کیفیت سمجھنے کے باوجود چلنے کا اشارہ کرنے لگے۔  
دو میمونہ بھائی سے کہہ کر سوئی تھی کہ اُسے دو گھنٹے بعد اٹھادیں۔ غالباً اُس کے خیال میں دو گھنٹے  
کی بندش کو پیش کر دے گی اور میمونہ بھائی نے ہامی تو بھرتی تھی لیکن اٹھایا نہیں کیونکہ عدیل بھائی  
سے متعلق کچھ نہ تھے۔ پھر وہ خود بھی اُس کی حالت دیکھ رہی تھیں۔ بیوی کی سیاسی رات بھر کی جاگی ہوئی۔  
انہوں نے نہ برکتی اسے ناشتہ کرایا تھا اور پھر جو وہ دو گھنٹے کا کہہ کر سوئی تو وہ پھر چلنے پر ہی  
اُٹھتی تھی اور زندگی میں پہلی بار میمونہ بھائی سے اچھڑ پڑی۔

”اب کو بتا ہے میں سکندر کو کس حال میں چھوڑ کر آئی تھی۔ پھر آپ نے مجھے اٹھایا کیوں نہیں۔  
بہت فکر ہے میری۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔“  
میمونہ بھائی اُس کے غصے بولنے پر بالکل خاموش رہیں۔ ایک لفظ نہیں کہا۔ یہاں تک کہ اُسے  
خود احساس ہو گیا۔ خاموش ہوئی تو اُسے پھینے لگے۔

”دیکھو! رومٹ۔ ہے شک کا لیا ہاں دے لو مجھے۔“ میمونہ بھائی نے فوراً ٹوکا۔  
”ہات نہیں کریں مجھ سے! وہ رومٹے پہلے میں کہتے ہوئے اُن کے پاس سے اُٹھ گئی۔ آنا ہی بھی  
اپنے لگے ہوئے تھے۔ اس لیے اُسے انتظار کرنا پڑا کہ عدیل بھائی انہیں چھوڑنے آئیں گے تب وہ  
ان کے ساتھ چلے گی۔ اس دوران میمونہ بھائی نے اُسے کھلانے کے بعد چائے اور ساتھ میں اپنی باتوں  
سے بہت حد تک اُسے ذہنی انتشار سے نجات دلادی تھی کہ پھر وہ سکندر کے پاس بہت ناراض  
حالت میں گئی تھی۔

شاہ سکندر کو محض ہوش میں آنے میں تین دن لگے تھے۔ اور اسی روز اُس کے سر اور پھرے کی  
مینڈیکھول دی گئی۔ پھرے پر معمولی رقم تھے البتہ سر میں کافی ٹانگے آئے تھے۔ آسیہ نے ذاکر وہاب  
کے لیے پرفورم کیا پچھڑے مطمئن سی ہو کر بولی تھی۔

”میرا خیال ہے سر! یہ رقم جلد ہی بھر جائیں گے۔“  
”ہوں! جب میں یہ بات کہہ رہا تھا تو تم یقین کیوں نہیں کر رہی تھیں؟ ذاکر وہاب نے مسکرا کر کہا  
نزدہ قدرے پٹھا گئی۔

”میں ان کی بے ہوشی سے خائف تھی؟“  
”اب تو مطمئن ہونا!“  
”بس سر! وہ شاہ سکندر کو دیکھ کر مسکرائی تھی۔

”لڈ! ذاکر وہاب نے اپنے شفیق انداز میں ہلکے سے اُس کا سر تھپکا پھر شاہ سکندر کو دیکھ کر کچھ محفوظ  
انداز میں اس سے کہنے لگے۔ ہمارے ہاں جب لڑکیوں کی شادی ہوتی ہے تو پھر وہ صرف بیوی بن کر  
رہ جاتی ہیں۔ گذشتہ تین دنوں سے میں اس لڑکی کو دیکھ کر حیران ہو رہا ہوں جیسی ایک لڑکی بھی یہ وہ  
نظر نہیں آتی جیسا میں اسے پرکھنے کے دوران دیکھتا تھا۔ بہت اکیٹو، بہت اسارٹ۔ اور ابھی اگر  
اس سے ایک انجکشن بھی تیار کرتے تو کہتا تو یہ نہیں کر سکتی تھی۔ یہ بھول گئی کہ یہ ایک ڈاکٹر بھی  
ہے۔“

”میں مسکرا ہٹ سے شاہ سکندر کے ہونٹ ذرا سے پھیلے تھے۔ جبکہ آسیہ نے قدرے جھینپ کر سر جھکا  
تو ذاکر وہاب جاتے جاتے بولے تھے۔

”نہ ابھی بات ہے لیکن اس سے اچھی بات یہ ہوگی کہ تم بیوی کے ساتھ اپنا ڈاکٹر ہونا بھی یاد رکھو۔“  
”اُس نے ہلکی آنکھ مار ڈاکٹر صاحب کو جلتے ہوئے دیکھا پھر احتیاط سے شاہ سکندر کے پاس بیٹھی اور  
”آپ کیساتھ میں لے کر آئیں گی۔“  
”تم کیا محسوس کر رہے ہیں؟“

”آپ! ہر کوئی تم کوئی تکلیف نہیں! شاہ سکندر اُس کا ہاتھ دبا کر کہنے لگا۔ میں جانتا ہوں مجھے

اس حال میں دیکھ کر ہمیں ہنسنے لگا۔ لیکن میں نے جان بوجھ کر تمہیں دکھ نہیں دیا۔  
 میں آپ زیادہ باتیں نہیں کر سکتا۔ اس لیے اسے یوں سے دھوکا دیا کہ خیال آئے پرکھنے  
 "سکندر! اب میں جہانگیر بھائی کو اطلاع دینی چاہتا ہوں۔ میں تو بعد میں وہ ناراض ہوں گے۔"  
 شاہ سکندر نے کوئی جواب نہیں دیا اور یوں انھیں بند کر دیں جیسے آپ اس میں بولنے کی  
 نہ ہو۔ وہ کچھ دیر تک انتظار کرتی رہی پھر اسی احتیاط سے اس کے پاس سے اٹھ گئی اور اپنے آپ  
 لگی کر وہ شاہ جہانگیر کو فون ضرور کرے گی۔ آخر وہ سکندر کے بڑے بھائی ہیں اور ناراض بھی نہیں  
 ہو سکتا ہے اسی پہلے بی بی جان اور بابا جان بھی آجائیں۔ شاید قسمت میں ان سے ملنے اور  
 منوانے کا یہی بہانا نکلا ہو۔ اتنے سنگدل تو وہ نہیں ہو سکتے کہ شاہ سکندر کے ایکسڈنٹ کا سن کر  
 آئیں۔ ضرور آئیں گے۔

کدو کی جو کھٹ پر دونوں کہنیاں لگانے نیچے دیکھتے ہوئے وہ مسلسل اسی بیج پر سوچا۔  
 کہ سیاہ چمکتی ہوئی لمبی سی گاڑی میں بیٹھی لڑکی پر نظر پڑتے ہی اس کے ذہن کو ہلکا سا جھٹکا لگا۔  
 مزید آگے جھپک کر اس لڑکی کا پورا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرنے لگی لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی  
 کیونکہ لڑکی اپنی گود میں نوزائیدہ بچے کو دیکھنے میں اس قدر غرق تھی کہ اسے گرد و پیش کا بالکل پتہ نہ  
 یا وہ قصداً پروا نہیں کر رہی تھی۔

"کون ہے؟ کہیں دیکھا ضرور ہے۔" اس نے الجھنے لگی تھی۔ تبھی گاڑی چلنے سے لڑکی نے یونہی برا  
 تو بس ایک پل کو اس کا چہرہ سامنے آیا تھا۔ اس کے بعد گاڑی آگے بڑھ گئی تھی۔  
 کہاں دیکھا ہے۔" اس نے ابھی ابھی الجھ رہی تھی اور شاید مقصودی کوشش سے اسے یاد آ جاتا تھا  
 سے پہلے ہی عتب سے عدیل بھائی نے پکار لیا تھا۔

"آپ کب آئے؟" اس نے چونک کر پوچھا۔  
 "کمال ہے۔ تیار ہے سہنے ہی تو آیا ہوں۔ کیا تم نے نہیں دیکھا؟" عدیل بھائی نے مسکرا کر کہا  
 نے بے اختیار ریٹ کر کھڑکی سے باہر دیکھا پھر کمری سانس کھینچتے ہوئے بولی۔

"نہیں، میں کسی اور کو دیکھ رہی تھی۔"  
 "کہئے؟" عدیل بھائی نے لہجہ میں بل پر رکھتے ہوئے یونہی پوچھ لیا۔  
 وہ ایک لڑکی۔ شاید میرے ساتھ پڑھتی تھی یا پتا نہیں۔  
 اس کا دھیان عدیل بھائی کے آنے سے ہی بٹ گیا تھا۔ جیسی سرسری انداز میں کہتے ہوئے  
 کھینچنے لگی۔

"سکندر کی طبیعت اب کیسی ہے؟" عدیل کی نظر میں شاہ سکندر کے چہرے کو دیکھنے لگی تھی  
 کافی بہتر ہیں۔ ابھی بائیں بھی کر رہے تھے پھر سو گئے۔ آپ پکار کر دیکھیں شاید۔  
 نہیں، سوئے دو۔ عدیل بھائی نے فوراً ٹوک کر اسے ڈسٹرب کرنے سے منع کر دیا تھا۔

شاہ سکندر ابھی گھر آئے تو تیار نہیں تھا۔ گو کہ وہ دنوں میں اس کے تمام زخم بھر چکے تھے  
 ناگہم پر بلا سزا باقی تھا اور وہ اسی کی وجہ سے منع کر رہا تھا کہ اسے کو پریشانی ہوگی۔ اس کے ذہن  
 کام کرنے کے دور کرنے رہے گی۔ اپنے نہیں وہ اسے پریشانی سے بچانا چاہتا تھا لیکن اسے  
 پریشانی کا خیال تھا۔ صبح شام اسے کھانا پہنچانا، پھر عبادت کو انا۔ گو کہ بچوں نے ابھی بھی  
 نہیں ہونے دیا تھا کہ انہیں اینا دفرہ چھوڑ کر ناپرتاب ہے لیکن اسے خود احساس تھا اس لیے لڑکے  
 کی اجازت ملنے ہی وہ شاہ سکندر کو گھر لے آئی اور اتنے ہی بولی تھی۔

اب آپ صرف میرے پیشکش ہیں۔ اور جیسا میں کہوں گی ویسا کر س گے۔  
 میں پہلے بھی تمہارے حکم کا غلام رہا ہوں۔  
 شاہ سکندر کی شوق مسکراہٹ پر وہ انگلی اٹھا کر قلیبی انداز میں بولی۔

"مذاق نہیں، میں بالکل سنجیدہ ہوں۔"  
 "مذاق ہے۔ بتاؤ میں نے کب تمہاری بات نہیں مانی۔ میری جان تم دن کو رات کہو میں وہ  
 بھی مان لوں گا۔" شاہ سکندر نے اس کے ہاتھ کو جھٹکا دے کر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے بولا۔  
 "میری ساتھیوں کی دوسرا آپ کے ساتھ بندھی ہے سکندر اگر آپ اپنا خیال نہیں رکھیں گے تو۔"

اس کی آواز بھرا گئی۔  
 "بے وقوف رشا! سکندر نے اس کا سر اپنے سینے پر رکھ لیا۔" میں جانتا ہوں تمہارا دل پھر پور  
 کی جیتی ہے۔ جس کی گھبراہٹ مجھے سوئے کر تم نے مجھے آنا پنا بند کر دیا ہے کہ میں جاؤں بھی تو خود سے غانا  
 نہیں ہو سکتا۔"

عدیل بھائی نہیں حکمرانی بھی: وہ اس کے سینے پر سے سر اٹھا کر اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔  
 پہل میں گو کہ ساری سہولتیں موجود تھیں لیکن گھر پھر گھر جو تیار ہے اور اپنے گھر کی اضافی ضرورتیں  
 بھی کم از کم وہی گرفت میں مبتلا نہیں کرتی اور اس کے پاس تو یوں بھی اتنی کوئی زیادہ ضرورت  
 نہیں تھیں۔ صبح دو آدمی کا ناشتا منٹوں میں بن جاتا۔ پھر وہ شاہ سکندر کو اخبار پھا کر صاف ستھرت  
 گھر کے برائے نام صفائی کرتی، اس کے بعد اس سے دوپہر کے کھانے کا پوچھنے آتی تو وہ کی گھنٹے اسے  
 دہرا دھرا باتوں میں لگاتے کہتا اور آخر میں کتنا جو تیار دل چاہے پکا لوتے میں سب کھاؤں گا۔

پھر بچتی اٹھ جاتی۔  
 شام میں عدیل بھائی ضرور پکڑ لگاتے تھے جن سے وہ ضرورت کی اشیاء منگوا لیتی تھی۔ چھپنے کے  
 غیل بھائی، ایسوز بھائی اور بچوں کے ساتھ آئے تھے اور ایک شام بڑے بھینا سا بڑا بھائی کو لے  
 آئے تھے تو انہیں دیکھ کر اسے بیل کا خیال آیا تھا، جسے فون کرنے کا اسے موقع ہی نہیں ملا تھا۔ یا  
 شاید اپنی پریشانی میں گھر کر یا دی نہیں رہا تھا۔ اور ایک احمد حسن تھا جو شاہ سکندر کو کپہنی دیتا تھا۔  
 آج بھی روز آئے سے مجبور ہوتا تو فون پر اس سے بہت دیر باتیں کرتا تھا۔ اس شام وہ نامانوس  
 کر آیا تو وہ اسے دیکھ کر خوش ہونے کے ساتھ ناراض بھی ہوئی۔

احمد بھائی صبح سے آئے کو کہا تھا۔  
 احمد بھائی سے پوچھیں۔ روزانہ سے کہتی ہوں مجھے آپ کے ہاں بیچوڑیں۔ لیکن، نہیں، اس سے  
 نہ بدیں، یوں ہے۔ نامانوس صاف کوئی سے کام لے کر اپنا دامن بچا لیا۔  
 میرا قدر بھائی۔ کیا آپ ہمارے تحریک دن آئیں سے یہ نہیں ہو سکتے۔ اس نے احمد حسن سے  
 بارگاہ فوراً بولا تھا۔

"آپ کی خاطر ہی تو جلدی جاتا ہوں۔"  
 "کیا مطلب؟" وہ بھی نہیں۔  
 "مطلب یہ کہ اس نامانوس بچی کی عادتیں کچھ بگڑی ہوئی ہیں۔ جتنی اونچی آواز میں بولتی ہے اس سے زیادہ  
 دہش آواز میں نیپ جاتی ہے۔ اگر یہ صبح سے یہاں آگئی تو شام تک آپ دونوں پورے ہیں تو کدھے  
 گل ضرور ہو چکے ہوں گے۔ اس لیے میں صبح آٹھ بجی جاتا ہوں تاکہ اسے یہاں نہ چھوڑنا پڑے۔"

احمد حسن کی وضاحت پر نامانوس بچہ تیار کر بیٹھ گئی تو وہ جلدی سے اس کے گھر میں بارگاہ کر بولی۔  
 "مجھ سے نہیں روٹنا۔ میں نے احمد بھائی کی کسی بات پر یقین نہیں کیا۔"  
 "میں جو یقین کر رہا ہوں۔" شاہ سکندر نے احمد حسن کو اٹھ مارتے ہوئے شرارت سے کہا۔  
 "شاہ سکندر! میں نے سکندر آپ کو نامانوس نہیں کرنا چاہیے۔" اس نے ٹوکنے کے ساتھ شاہ سکندر  
 رشا سے سے بھی منہ کیا پھر نامانوس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھتے ہوئے بولی۔ "آؤ ہم ادھر چلتے ہیں۔"

"کہاں؟" شاہ سکندر نے فوراً پوچھا۔  
 "میں چلنے بیٹھنے جا رہی تھی۔ عدیل بھائی پتا نہیں کہاں رہ گئے۔ میں نے ان سے دو دھ منگوا لیا تھا۔"  
 یہ بڑے بڑے نامانوس کے ساتھ کمرے سے نکل آئی۔



”سکندر بھائی کی ٹانگ کا پلا سٹریک اترے گا۔ آپ تو خاصی پابند ہو گئی ہوں گی“ نائلہ نے کچن دروازے پر رک کر کہا۔  
 ”ہاں بس، ویسے اب ایک ڈیڑھ ہفتے کی بات ہے۔ پلاسٹر اتر جائے گا۔“ اُس نے چلنے کا پا جو لیے پر کھینچے ہوئے بتایا۔  
 ”دودھ تو پے نہیں۔ چلنے کیسے بنائیں گی؟“ نائلہ نے اُس کے چوہا جلاسنے پر ٹوکا۔  
 ”اُسے ولے ہوں گے عدیل بھائی“ اُس نے کہا تبھی اندر سے شاہ سکندر نے اُسے پکارا تو وہ نائلہ کو آتی ہوں کہہ کر اندر چلی آئی۔  
 ”فرمائیے“

”وہ میں یہ کہہ رہا تھا کہ کھانے میں وہی دوپہر والا سالن ہو گیا کچھ اور بھی“ شاہ سکندر نے غالباً بتانا چاہا کہ احمد حسن اور نائلہ یہیں کھانا کھا میں گئے۔  
 ”اور بھی بہت کچھ“ وہ اس کا مطلب سمجھ کر بولی تھی۔  
 ”نہیں۔ ہمارے لیے کوئی تکلف نہیں“ احمد حسن بھی سمجھ گیا اور فوراً منع کرتے ہوئے بولا، ”کھانا پکانے کی ضرورت نہیں ہے بھائی۔ بس چلنے ٹھیک ہے۔“  
 ”تم سے کسی نے پوچھا ہے“ شاہ سکندر، احمد حسن ٹوک کر اُس سے کہنے لگا، ”ہاں اسیہ! میرے بہ کسٹروڈ ضرور بنالینا“  
 وہ اثبات میں سر ہلاتے، دوبارہ کچن میں آتی تو عدیل بھائی کو نائلہ کے ساتھ کھڑے دیکھ کر اُہ ہونٹوں پر سے ساختر مسکراہٹ پھیل گئی اور کوئی بات نہ ہوتے ہوئے بھی عدیل بھائی تقدیر سے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو شاہ پر کی طرف اشارہ کر کے بولے۔  
 ”دیکھو، کوئی پتھر نہ تو نہیں لگی“

”اس وقت ضرورت صرف دودھ کی ہے اور وہ موجود ہے۔ وہ بڑے سے شاپرے دودھ کو نکالتے ہوئے بولی۔ پھر اُسے نائلہ کو تھا دیا۔  
 ”وہ دودھ کی پتیلی کھیں ہے بلکہ اسے کھولا دو“  
 ”تم مہاروں سے کام کروانی ہو؟“ عدیل بھائی نے جانتے جانتے رک کر اُسے ٹوکا۔  
 ”مہاروں کیسے کہہ رہے ہیں آپ، مجھے بابائے آپ کو؟“ اسیہ سے پہلے نائلہ نے بول کر انہیں لاو دیا تھا۔ کام تو وہ بھی ابھی کر کے اترے تھے وہ بھی باہر کا۔  
 ”کوئی مہمان نہیں ہے یہاں، سب میرے اپنے ہیں۔ بھائی ہیں اور تم۔“ اسیہ نے رک کر دیکھا پھر معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ دھیمی آواز میں پوچھنے لگی، ”تھیں کیا کہوں؟“  
 نائلہ نے اس کی معنی خیز مسکراہٹ سے بوکھلا کر بے اختیار اس کے پیچھے کھڑے عدیل کو دیکھا

غلاف رزم شاہ سکندر کے پیچھے کے حقیقی پر خاندان بھیر کو مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ یہاں تک نے اپنی بیٹیوں کو بھی نہیں بلا یا تھا۔ اتفاق سے شہر بانو خود ہی اُس روز خیمے کو دیکھنے اور یہ دیکھنے لگی تھی۔ یہاں آکر جب اُسے کچھ کے حقیقی کا معلوم ہوا تو جہاں وہ خزان ہوئی وہاں کر گیا شاہ سکندر کے یہاں نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ پھر بھی بی بی جان سے کہے بغیر نہیں رہے۔ بی بی جان، خوشیاں اپنی خاموشی سے نہیں منانی جاتیں، آپ کو کم از کم میرے تسمیرال کرنی چاہیے تھی۔ آخر وہ کچھ کے نانائانی ہیں۔  
 ”شاہ سکندر راجائے پھر بہت خوشیاں منائیں گے۔ بڑی دھوم کے ساتھ۔ آنے والا ہے۔ بی بی جان نے دھیر دھیر سے اور یقین سے کہا تھا۔  
 ”اگر واقعی سکندر بھائی اُسے ولے ہیں تو یہ خوشی اُن کی آمد پر ہوئی چاہیے تھی۔ ابھی کیوں؟“ کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

”مجھ پر ہے۔ آج پندرہ سال دن کا ہو گیا ہے۔ صدقہ دینا ہے اس کا۔ اور نام بھی رکھنا ہے۔ بی بی جان ہوری تیار فوراً بات بدل گئیں، ”تم جاذبہ کے پاس۔ دیکھو وہ بچے کا کیا نام بتاتی ہے؟“  
 ”وہ سمجھتی ہے وہاں سے اٹھانا مقصود ہے اور بی بی جان نے اُسے بھیجا بھی اُس کے پاس جس کے ماننے وہ خود کو جرم محسوس کرتی تھی۔  
 ”میں مبارک ہو مہر دے۔ شہر بانو کو خوشی کے انہار میں بھی کوشش کرنی پڑی تھی۔ لاؤ میری گود میں دو۔“  
 مہر الساند نے جب چاپ بچہ اپنی گود سے اٹھا کر اُس کی گود میں ڈال دیا۔  
 ”اے یہ تو بالکل۔ شہر بانو اپنی بے اختیاری پر فرور پڑا پڑا ہونٹ دانتوں میں دبائی گئی۔  
 ”تم تو یوں خاموش ہو گئیں جیسے شاہ سکندر کا نام لینا گناہ ہو۔“ مہر الساند نے سبک کر جتایا، پھر مہر کے انداز میں سر جھٹک کر بولی۔  
 ”گناہ صرف میرے لیے ہے۔ میں گناہ گار ہوتی ہوں اُس کا نام لے کر اُس کے بارے میں کوئی سوال کرے۔“  
 شہر بانو اُس سے نظر میں چلا کر بچے پر جھک گئی اور قدرے توقف سے اُس کا دھیان بدلنے کی خاطر پوچھنے لگی۔  
 ”کیا نام سوچا ہے اس کا؟“

”میں نے۔“ مہر الساند نے کسی خیال سے چونک کر شہر بانو کو دیکھا پھر تلخ آہستہ آہستہ ہنسی کے ساتھ کہنے لگی، ”بچہ۔“  
 ”میرا تو اس طرف دھیان ہی نہیں کیا۔ میں تو اس عرصے میں صرف اس کے باپ کو سوچتی رہی ہوں۔“  
 ”اُسے ولے ہیں سکندر بھائی“ شہر بانو کو غالباً کچھ اور نہیں سوجھا تو بی بی جان کی بات دہرا دی لیکن ان میں یقین اس کے صلے میں نہیں تھا۔  
 ”اتھار کیا انہیں اطلاع مل چکی ہے اس کے اُن کی؟“ مہر الساند نے بچے کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔  
 ”بتائیں شہر بانو نے اطلاع کا اظہار کیا پھر ایک دم اُس کا ہاتھ تھام کر کہنے لگی، ”مہر داتم مجھ سے بہت دودھ پوچھی ہو۔ ہمارے درمیان ایسی تلخ اور رسمی باتیں تو بھی نہیں ہوتی تھیں۔ سچ جفاؤ کیا ہم دونوں کی محبت اور دوستی سکندر بھائی کی وجہ سے تھی جو اُن کی بے مہری سے تم نے مجھ سے بھی وہ سارے ناتو توڑ لیے ہیں۔“

مہر الساند اچانک گم سم ہو کر اُسے دیکھنے لگی تھی۔  
 ”مہر داتم غمناک ہی نہیں، ہم راز بھی تھیں۔ کھنٹوں نہیں بارہ دری میں کبھی آم کے گھنے پھڑتے اور فریبوں کی آواز میں تاروں کی چھاؤں میں ہم کیسے راز چھپا کر رکھتی تھیں۔ ہمارے دل شفاف آئینے تھے جہاں ہر کرداروں کی وصولیوں جی۔ اگر سکندر بھائی کی وجہ سے تو آج میں کہا سے ملنے قسم خانی ہوں کہ میں زندگی بھر اس بھائی کی۔“ اُس کی آواز بھر لگتی۔  
 مہر الساند نے بھی اُس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”میں نے دو کچھ، انہی کی وجہ سے تم مجھ سے دور ہوئی ہو۔“ شہر بانو اپنے ہونٹوں سے اُس کا ہاتھ ہٹا کر دھڑک دیا۔  
 ”میں نے میرے ساتھ تو شاید تمہارا کوئی ناتا تھا ہی نہیں۔ نہ تختہ نہ دوستی کا دور۔ سب سے پہلے تو مجھے بتائیں کہ شاہ سکندر حویلی چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اس کے بعد بھی تم نے ایسی تمناؤں کے دکھ مجھے نہیں ملنے۔ کیونکہ تم نے مجھے صرف شاہ سکندر کی بہن سمجھا، اور اگر اُس کے جرم کی سزا مجھے دینا ہے تو میرے۔“  
 ”نہیں شہر بانو! مہر الساند نے فوراً ٹوک دیا۔ میں تمہارا گھر نہیں اجازت دے سکتی۔“  
 ”کیوں؟“ بھلے خوش ہونے کے شہر بانو نے تیز سچے میں پوچھا۔

”تم اگر چاہیں تو پھر میرا کھڑکھی نہیں بنے گا۔ اس کے ساتھ ہی مہر النساء اٹھوٹیں میں چہرا خضیا کر رہا شہر بانو نے اسے چپ ہنسی کر دیا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ دل کے آئینوں پر بھی کدورتوں کی دگر آسوں سے بنے گی اور اس نے اپنی ہیکلوں کے بند بھی توڑ دیے تھے۔  
اور جب آسوا آب ہی آپ تھم گئے آ نکھوں کی طرح دل کے آئینے بھی دھسل کر شغاف بہر تب مہر النساء بیچے کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔  
”اس شاہ کو دیکھو، کسے خبر سورا ہے، ماں اور بیٹو پیسوں کے آسوں کی پروا ہی نہیں۔  
”بہت پروا کرے گا۔ بڑا تو ہوئے دو، شہر بانو بھی کھل کر مسکرائی۔ اور چوہ ویر بعد ان دونوں ہنسی کا ترنم نمبر کے باہر تک سنائی دے رہا تھا۔

دو مہر کے کھانے کے بعد اس کا ارادہ کپڑوں کی دھلائی کا تھا، لیکن شاہ سکندر نے سختی سے مڑا اسے اپنے پاس بٹھالیا اور لوٹکے ہوئے بولا۔  
”جس شوق ہے کام کرنے کا۔ صبح سے آٹھ بجے ہو تو ایک کے بعد ایک کام نکالتی چلی جاؤ۔  
”اتھنی قبول اور نہ زور دی۔

اس نے پچھلے دنوں کے لیے منہ کھولا لیکن شاہ سکندر نے موقع نہیں دیا۔  
”سولے نائے کھانے کے سب غیر ضروری ہیں۔ تم خوا خواہ خود کو اٹھائے رکھتی ہو۔ مجھے تمہارا کی طرح کام کرنا اچھا نہیں لگتا۔ فوراً کسی ماسی کا انتظام کرو۔  
”نہیں، ابھی تپائی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کون سا ہمارے ہاں اتنا گند پھیلتا ہے جو ماسی کا کرے گی۔ اور کپڑے بھی زیادہ نہیں ہوتے۔ اس نے ماسی رکھنے کو صاف منع کر دیا۔  
”کام زیادہ ہو یا کم تم بہر حال سارا دن مصروف رہتی ہو کہ نہیں؟ شاہ سکندر کو غالباً اس کا اندازہ بنا کھل رہا تھا۔  
”میں قصداً خود کو مصروف رکھتی ہوں کیونکہ مجھے فارغ بیٹھنا اچھا نہیں لگتا اور معاف کیجیے گا، آپ اپنے گھر کی عورتوں پر بھول رہے ہیں جنہیں شروع سے ملازمین کی عادت ہوئی ہے۔ جب تعلق مڈل کلاس سے ہے، وہ ہلکے پھلکے انداز میں اپنے مصروف رہنے کا سبب بتاتے جا رہی ہیں ایک دم ٹوک کر بولا۔

”تمہارا تعلق مڈل کلاس سے تھا۔ اب تم شاہ سکندر حیات کی منکوحہ ہو۔“  
”شاہ سکندر حیات کی منکوحہ ہونے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ میں خود کو بیکار کر لوں۔ بس آپ نہیں تو کہیں گے۔ آپ کی بات مان کر میں اس وقت کپڑے نہیں دعوں گی لیکن ڈرائنگ روم پر چھ ضرور کروں گی۔“ وہ اپنی بات کبھی کہہ کر اٹھنے لگی تھی۔  
”مجھے تو ایک گنڈہ لگا یا ہے تم نے ڈرائنگ روم کی صفائی میں۔“ شاہ سکندر نے اس کا ہاتھ اٹھنے سے روک دیا تھا۔  
”کیا کروں۔ پتا نہیں کہاں سے آتی گرد آ جاتی ہے۔ حالانکہ کھڑکیاں بند رکھتی ہوں۔“ وہ گرد سے پریشان تھی۔  
”بہر حال اس وقت تمہارے ڈرائنگ روم کو دیکھئے کوئی نہیں آ رہا۔ شاہ سکندر نے قدم کر کے

”کیا پتا کوئی آ جائے۔ وہ اس کی جھنجھلاہٹ سے محفوظ ہو کر شرارت سے بولن۔  
”مٹھا کون،“ شاہ سکندر اس کے پر شوق انداز پر پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔  
”آج کچھ دیر تک رننا ہر اسے مسکرائی ہوئی نظروں سے دیکھتی رہی جبکہ وہیں مختلف سوچوں کو مرکز پر جمع کرنے میں لگا ہوا تھا۔ میری وہ آرام سے ٹامیں اوپر سمیٹ کر بیٹھ کر اسی افسانے کہنے لگی۔

”تاجہ سکندر! مجھے گمان ہوتا ہے جسے جہانگیر بھائی کسی وقت بی بی جان کر لے کر آ جائیں گے۔ یہ سوچتی ہوں شاید ان کے ساتھ بابا جان بھی ہوں اور مہر النساء بھی۔“  
شاہ سکندر جو غصے سے دیکھ رہا تھا آخر میں مہر النساء کے نام پر تعجب سے اس کی آنکھیں دھرا سی ہوئیں۔ غالباً اسے یاد نہیں تھا کہ کسی وقت وہ خود بھی اسی طرح مہر النساء کا نام لے چکا تھا۔ جب وہ اپنے اندر اٹھتے سوال کو زبان پر آئے تو نہیں روک سکا۔  
”تمہیں مہر النساء کا کس نے بتایا؟“ میرا مطلب ہے میں نے تو کبھی اس کا ذکر نہیں کیا۔“  
”کیوں نہیں کیا۔ آپ ہی نے تو بتایا تھا۔“ وہ جب میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ غریبی میں کوئی میں رہا ہے تو آپ نے مہر النساء کا نام بھی لیا تھا۔“ اسے سادہ سے انداز میں اسے یاد دلایا۔

”اچھا ہاں! شاہ سکندر یاد آتے ہی پوری طرح متبل گیا اور شاید دل میں چور تھا اس لیے اسے آپ وضاحت کرنے لگا۔ مہر النساء اب تو وہاں نہیں رہتی۔ وہ تو جب شہر بانو کی شادی نہیں ہوئی تھی تب وہ آ جاتی تھی اب تو شہر بانو ہی وہاں چلی گئی۔ میرا مطلب ہے اس کے گھر۔ بہت دوستی ہے ان دونوں کی۔“

آس کی نظروں میں وہ تصویر گھوم گئی جو اس نے نائیک کے پاس دیکھی تھی۔ شہر بانو اور وہ غیر معمولی حسن کی ٹانگ مہر النساء، اچانک اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ اور وہ بے اختیار شاہ سکندر کا بازو حاطم کر بولی۔  
”وہ۔ وہ مہر النساء تھی سکندر۔ وہاں ہاسٹل میں۔ میں نے اسے دیکھا تھا۔ پھلے اسٹرپچر پر پیر۔ گارڈی میں۔“

شاہ سکندر کی تمام حیات آنکھوں میں سمٹ آئی تھیں۔  
”اس وقت میں سوچتی رہ گئی کہ شاید وہ میری کلاس فلوری ہوگی۔ مہر النساء کی طرف دھیان نہیں گیا۔“ اس کے بلے میں اب افسوس تھا کہ اس نے اس وقت مہر النساء کو پہچان نہیں لیا تھا۔  
”آف۔ میری یادداشت اتنی کمزور تو نہیں ہے۔ پھر میں نے اسے پہچان کیا نہیں۔“  
”کم از کم۔ جس لڑکی کو تم نے پہلے بھی دیکھا ہی نہیں اسے تم پہچاننے کی بات کر رہی ہو۔ شاہ سکندر نے انداز پریشان ہوتے ہوئے ٹوکا۔

”میں نے اس کی تصویر دیکھی ہے۔“ وہ بے اختیار کہہ کر کچھ خائف نظر آنے لگی کیونکہ بھولی نہیں تھی کہ نائیک نے تصویر کی بات بتانے سے منع کیا تھا۔  
”کہاں کس کے پاس؟ شاہ سکندر کی پیشانی پر بے شمار شکنیں نمودار ہو گئیں۔  
”وہ۔ نائیک کے پاس۔“ اس نے جھوٹ نہیں بولا کہ ایک جھوٹ کی وضاحت میں کئی جھوٹ بولنے پڑتے۔  
اس بے صاف کوئی سے کام لے کر کہنے لگی۔  
”کہاں اس نے مجھے منع کیا تھا کہ میں تصویر کی بات آپ کو نہ بتاؤں کیونکہ اس کے بہت مجبور کرنے پر شہر بانو نے بڑی مشکل سے اور اسی وعدے پر اسے دلی تھی۔ بہر حال یہ کوئی ایسی بات تو نہیں ہے تو آپ پریشان ہو گئے۔“

”پریشان نہیں تو۔ شاہ سکندر اپنی پیشانی چھو کر بولا۔“ بس تمہاری باتوں نے اٹھا دیا۔ تم نے کسی اور کو دیکھا ہوگا۔“

”جس میں سکندر وہ مہر النساء ہی تھی۔ اس وقت آپ کی وجہ سے میں ذہنی طور پر بہت آپ سیٹ نہیں تھا۔“ وہ یاد نہیں لگتا۔ لیکن اب میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ مہر النساء ہی تھی۔“ اسے اب خائف شاہ سکندر کے اپنے مخصوص انداز میں بول رہی تھی۔  
”میرے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے خاموش کرادے۔“

ہی دیر کرے گی، تاہم سکندر آپ کو میری قسم اور وعدہ کریں مجھ سے کہ ہم اپنے دل میں کبھی کسی معمولی سی ریش کو بھی گھر نہیں کرنے دیں گے، کس قدر جذباتی ہو گئی تھی وہ کہ سبب بتانے کے بعد ہاتھ بھی اسے ہی جوڑنے پر تھے۔  
چلتے، آپ آسیہ کا وارنہ پر اس نے چونک کر آنکلیں کھولیں۔ وہ اس کے قریب کارنر ٹیبل پر بس

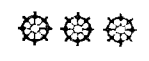
یک کپ رکھ رہی تھی۔  
آسیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسی خاموشی سے پلٹ گئی اور شام تک جانے کن کاموں میں مصروف رہی تھی۔  
شب معمول عدیل بھائی اپنے تو پہلے آسیہ نے جو سامان منگوانا تھا وہ لا کر دیا اس کے بعد شاہ سکندر کے پاس کشتی دیر بیٹھے رہے تھے اور ان کے جانے کے بعد بھی وہ لاڈلے میں کھڑی جانے لگا کر رہی تھی۔ شاہ سکندر کچھ دیر انتظار کرتا رہا پھر گہرا کر پکا لیا۔  
"اس! یہاں آؤ۔"  
وہ دروازے تک آکر رُک گئی۔

"میرے پاس آکر بیٹو۔ کیا مجھے وضاحت کا موقع نہیں دو گی؟ شاہ سکندر کا لمبہ بٹی تھا۔ وہ اگر بیٹھ گئی تو کتنے لگا۔  
"تم ناراض کی سبب بناؤ، میں وضاحت کروں گا۔"  
"میں ناراض نہیں ہوں۔ ناراضی تو آپ ہوئے، میری کس بات سے مشتعل ہو کر آپ چلائے تھے؟  
وہ نافذ سے کہتے ہوئے بولی پھر اسے دیکھنے لگی تھی۔  
شاہ سکندر جانتا تھا کہ وہ یہی بول چھوے گی، اور اس سارے وقت میں وہ اسی بات کی وضاحت سوچتا رہا تھا۔ جیسا اب بڑے آرام سے کہہ رہا تھا۔  
"تم نے میرا انداز کے بارے میں بات ہی ایسی کی کہ مجھے غصہ آگیا۔ یعنی اُس کی ڈیوری اوز پچہ، جبکہ ابھی اُس کی شادی بھی نہیں ہوئی۔"  
"کیا؟ وہ سچ بول کھلا گئی۔

"وہ لڑکی جسے تم نے دیکھا، ہو سکتا ہے میرا سہمے مشابہت رکھتی ہو۔ لیکن میرا سہمے نہ ہو سکتی۔ تپیں دھوکا ہوا ہے۔ اور آئندہ اس کے بلکہ میرے خاندان کے کسی بھی فرد کے بارے میں اس وقت تک یقین سے کچھ مدت کیلنا جب تک تم اس سے مل کر اسے جان نہ لو، شاہ سکندر کے چہرے پر اسے بے میں واضح تبصرہ تھی۔  
آسیہ کچھ حکم مری پوچھتی تھی کہ پتا نہیں وہ ٹھیک کہہ رہا تھا یا جو اُس نے دیکھا وہ سچ تھا۔

نامک کا بلاسٹا رتنے کے بعد شاہ سکندر اب کوئی بھی بزنس کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے متوجہ نہ تھا۔ کیونکہ اتنے دن گھر میں رہ کر وہ اکت گیا تھا زندگی مفلوج لگنے لگی تھی، جبکہ وہ شروع سے بندوں سے گھرا تھا۔ ادھر ڈیڑھ دو مہینے بالکل گھر کا ہو رہنے سے اس کی صحت بھی متاثر ہوئی تھی اور کچھ مزاج بھی۔ اگر آسیہ بھرداری سے کام نہ لیتی تو وہ روزانہ اس سے جھگڑتا، بہر حال اب صحت باب پر دو پہلے کی طرح اکیڈم نظر آنے لگا تھا۔ اور چاہتا تھا جلد سے جلد کوئی کام شروع کرے۔ لیکن باہر بھائی کا کچھ پتا نہیں تھا۔ بس اُس کی شادی پر ہی آئے تھے۔ اور کہا تھا کہ پھر اطمینان سے آئیں گے تو اس کے شایان شان بزنس سوچیں گے، چھوٹے موٹے بزنس کو انہوں نے منع کیا تھا۔ اور یہ کہ ٹنٹ سے بھی اطمینان دلایا تھا۔ پھر وہ الیکشن میں مصروف ہو گئے، اور اب تو الیکشن کا دور بھی ختم ہو چکا تھا۔ ان دو مہینوں میں اُس نے بی باران سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ ملے

"میرا سہمے کا چہرہ بھولنے والا نہیں ہے۔ بہت خوبصورت ہے ناں وہ؟ اُس کی کیفیت بے خبر آسیہ کا اشتیاقی ہنوز تھا وہ غالباً ڈیوری کے لیے آئی تھی۔ اُس کی گود میں کچھ بھی تھا۔  
"شب آپ آسیہ شاہ سکندر کا نامک پیش پڑا تھا۔



ہنسی آسیہ اُس کے چمکنے پر قدرے سہم گئی تھی اور ہونٹ بھیج کر سر جھکا لیا پھر سوچنے لگی کہ بات سے وہ مشتعل ہوا ہے۔ کچھ مجھ میں نہیں آیا تب اسی خاموشی سے اُس کے پاس سے اُڑا شاہ سکندر کو فوراً ہی احساس ہو گیا تھا کہ وہ کچھ غلط کر گیا ہے۔ اس کے باوجود اُس نے نہیں روکا۔ اور اس کے کمرے سے نکلنے ہی بدلتی ایک پر سر رکھ کر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہر نکالیں۔ حقیقتاً وہ بہت پریشان ہو گیا کہ کہیں اُس کی شخصیت کا یہ کمزور پہلو سامنے آکر اُس اور زعفران نور دے جو اُس کی شخصیت کا خاصا تھا۔ گو کہ میرا انداز کے ساتھ شادی کو نہ تو وہ تسلیم نہ اُس کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت تھی، اس کے برعکس وہ ایک ہی بار خود کو یاد کر چکا تھا کہ بابا جان کی سازش تھی جس میں انہوں نے شاہ جہانگیر کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا جو اُسے گھر کرے تھے۔ پھر شہر بالو کو دیکھ کر وہ واقعی مجبور ہو گیا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو پہلے ہی آسیہ کو وہ سارے مال کر اُسے اعتماد میں لے سکتا تھا۔ لیکن اُس وقت بھی اُسے یہی خیال تھا کہ وہ کسی پہلو سے کرا نہ آئے۔ اپنی برتری قائم رکھنا چاہتا تھا۔ اور احساس برتری کے زعم میں شاید یہ معمول لگا شاہ پور سے چند گھنٹوں کی مسافت پر ہے۔ پھر سال میں ایک دوبار ہی اس کے گھر کی آتی ضرورتیں۔ کبھی شاپنگ اور کبھی تفریح کے لیے۔ یا ہو سکتا ہے اُس نے یہ سب بھی سہم اپنے گھر سے وہ اعلان نہ نکالا تھا۔ اس لیے یہ خدشہ نہیں تھا کہ اُس کے گھر والوں میں سے کسی نے آسیہ کے ساتھ دیکھ لیا ہو کیا ہوگا۔ البتہ یہ گمان بھی نہیں تھا کہ آسیہ کسی کو پہچان لے گی۔ کم بات مٹی اور خود اُس کے لیے حیرت انگیز اور لٹو لٹاشاک کہ جو بات اُس کے گمان میں نہیں ہو گئی تھی۔

وہ دیر سے دیر سے بالوں میں انگلیاں پھیر کر خود کو ریلیکس کرنے میں مصروف تھا۔ کیونکہ ہونی لڑکی کو منانے کے لیے اسے بہت پرسکون رہنے کی ضرورت تھی۔ جانتا تھا ناں کہ وہ اچانک غصے میں آنے کا سبب ضرور پوچھے گی۔ اس عرصے میں وہ یہ جان گیا تھا کہ وہ اپنے درمیان ذرا سی غلط فہمی برداشت نہیں کر سکتی۔ اسے یاد تھا لاہور میں اُس کی کوئی بات نہ گزری تھی تو وہ اُس پر جتنے کے جاتے خاموش اور اپنے آپ کھنڈا راض ہو گیا تھا۔ کچھ اُس نے محسوس کیا تو اُس کے سامنے جم کر کھڑی ہو گئی تھی۔  
"سکندر! اگر آپ کو میری کوئی بات ناگوار گزری ہے تو بتائیں، میں وضاحت کر دو بعد بھی اگر ناراضگی کا بیجوں لگتا ہو تب آپ کو ناراض ہونے کا حق ہوگا۔ اور میں ہاتھ جوڑ کر "تو منادو ہاتھ جوڑ کر" وہ منکرٹھٹ پھا کر بولا تھا۔  
"نہیں! پہلے مجھے سبب معلوم ہونا چاہیے تاکہ دوبارہ وہ غلطی دہرائی نہ جائے، اور آپ میں جو ذرا سی رنجش پیدا ہوئی ہے وہ بھی دُور ہو جائے گی۔ وہ اصل بات جلنے پر بڑھا "وہ تہیاری معافی سے دور ہو جانے کی؟" اُس نے کہا۔  
"نہیں! سکندر! معافی سے رنجش دور نہیں ہوتی، میرے ہاتھ جوڑ لینے سے یقیناً آپ دور ہو جائے گی، لیکن ناراضگی کا سبب جو رنجش کی صورت آپ کے دل میں ہے اسے میری

ہی نہیں۔ بتا نہیں کہاں مصروف تھے۔ آخری بار اُس کے ایکسڈنٹ سے پہلے اُن کا فون آیا تو انہوں نے کہا تھا کہ فی الحال کسی برنس میں پسہ لگانا ٹھیک نہیں ہے۔ الیکشن کے بعد دیکھیں گے۔

اُس کے اکاؤنٹ میں ڈرافٹ جمع کرانے کا بھی بتایا تھا جو کہ بہت بڑی رقم کا نہیں تھا۔ اُس نے صراحت لگایا تو اتنا پسہ اُس کے علاج معالجے میں خرچ ہو چکا تھا اور بتا نہیں اس سے پہلے اس کے اکاؤنٹ میں کتنا پسہ تھا۔ اس وقت اس بیج پر سوچتے ہوئے وہ حقیقتاً برلین میں ہو گیا کہ اگر وہ ایکدم تھوہر ہو گیا تو کیا کرے گا۔

”مکرمیت کرو، میں تمہارا اکاؤنٹ کبھی خالی نہیں ہونے دوں گا“ شاہ جہانگیر نے کہا تھا اور اُن بات یاد آتے ہی اُس نے گاڑی بینک جانے والے راستے پر ڈال دی تھی۔ اور پھر ایسے اطمینان سے ہو گیا کہ شاہ جہانگیر اُس سے غافل نہیں تھے۔ انہوں نے ایک اور ڈرافٹ اُس کے اکاؤنٹ میں جمع کر دیا تھا۔ لیکن وہ خود کہاں تھے اُسے اُن کی ضرورت تھی، کیونکہ اگلے دن بھی نہیں کر سکتا تھا۔ پھر جو ڈرافٹ انہوں نے جمع کر لیا تھا۔ وہ بھی اتنی بڑی رقم کا نہیں تھا۔ جس پر وہ کوئی برنس سیٹ کر سکتا۔ بس اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ تہی دست نہیں ہوا۔ اور شاہ جہانگیر نے اپنا وعدہ نبھایا تھا۔

”کہاں خفیہ گئے تھے؟“ وہ گھر میں داخل ہوا تو آسیہ نے چھوٹے ہی سوال کیا۔  
 ”لیس یونیورسٹی آف آرٹس اور ہنر کی کولج چاہ رہا تھا“ وہ اسے چھپ کر بولا۔  
 ”آوارہ گرد لگتے تو نہیں؟“ آسیہ نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔  
 ”پھر کیا لگتا ہوں؟“ وہ اُس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔  
 ”بعد میں بتاؤں گی، ابھی وقت نہیں ہے۔ چلیں جلدی سے تیار ہو جائیں۔“ وہ اُس کے چلتی ہوئی ٹکٹ میں بول رہی تھی۔ ”پرے ہاتھ روم میں لٹکا دیے ہیں۔ نہالیں تو اچھا ہے اور“

”جانا کہاں ہے؟“ وہ لوگ کر پوچھنے لگا۔  
 ”لیجیے آپ کو یاد ہی نہیں۔ آج بڑے بھٹا اور بھائی جہ جہ جارہے ہیں۔ آسیہ نے رک کر بتایا ہی اُسے ہاتھ روم جانے کا اشارہ کیا تو وہ کندھے اچھٹا آگے بڑھ گیا۔  
 ”آپنی ہی گھر میں خاصی چہل پہل تھی۔ چچا جان کے سب گھر والے اُسے ہونٹے تھے۔ اماں اُسے بھی صبح سے اُنے کو کہا تھا لیکن شاہ سکندر کی وجہ سے دیر ہو گئی تھی۔  
 ”اپنی اہمیت جتانے کا یہ طریقہ کچھ پرانا نہیں ہو گیا۔ میونہ بھائی نے اُن کی دیر سے آمد کو مخصوص انداز میں جتنا۔  
 ”سوری بھائی! اصل میں سکندر کسی کام سے چلے گئے تھے۔ پھر انہیں یاد بھی نہیں تھا آسیہ کرتے ہوئے بتایا۔

”اچھا جاؤ۔ اماں جی کو اپنی شکل دکھاؤ۔ بار بار تمہارا پوچھ رہی ہیں۔ میونہ بھائی کہتے ہوئے کہ چلی گئیں۔  
 آسیہ نے پہلے اماں جی کے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ پھر ڈرائنگ روم میں آگئی۔ سب موجود تھے۔ اور صوفوں کے بجائے نیچے کارپٹ پر دائرے کی شکل میں بیٹھے تھے۔ اُس نے دیکھا بھی سب کے ساتھ بڑے آرام سے بیٹھا تھا۔ وہ سب کو سلام کرتے ہوئے اماں جی کے پاس اور وہیں آواز میں اُن کا حال احوال پوچھنے لگی۔ اُس کا خیال تھا اماں جی بڑے بھٹا کے باہ سے ناراض ہوں گی، لیکن اس کے برعکس وہ خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔ وہ سمجھ گئی یہ ماسٹا کی بھودی اپنی اولاد کو خوش دیکھنا چاہتی ہیں۔

پھر میونہ بھائی نے وہیں سب کے درمیان دسترخوان بچھا دیا تو وہ اُن کی مدد کے لیے آ

ہوئی۔ ساڑھ بھائی سے چھوٹی طاہرہ بھی ساتھ مل گئی تھی۔ کھانے میں اسے سارے آئیٹم دیکھ کر وہ تعجب سے میونہ بھائی سے پوچھنے لگی۔

”اتنا سارا کھانا آپ نے اکیلے پکایا ہے؟“  
 ”جواب: میونہ بھائی نے پہلے گردن اکڑائی پھر ہنستے ہوئے بولیں۔ ”نہیں طاہرہ نے میری مدد کی تھی۔“

”وہی میں کہوں؟“ اُس نے شرات سے بات ادا ہوئی چھوڑ دی۔  
 ”تم کچھ بھی کہو لیکن جانی اچھی طرح ہو کہ میں اکیلی بھی یہ سب کر سکتی ہوں“ میونہ بھائی اُس کے ہاتھ میں سالن کا ڈونگ بٹھاتے ہوئے بولیں۔  
 ”میں صرف جانتی ہی نہیں آپ کو مانتی بھی ہوں۔“ وہ بہت فحشت سے کہتے ہوئے کچن سے نکل آئی۔  
 پھر کھانا بہت خوشگوار ہوا جو ان میں کھا گیا۔ اس کے بعد ساڑھ بھائی اپنی پکینگ دیکھنے کے لیے تھیں تو ان کے پیچھے ساری خواتین باہر آگئیں۔ فلائیٹ چار بجے تھی اور گھر سے روانگی دو بجے گھڑی کی سوئیاں ایک سے کچھ آگے جا رہی تھیں۔

”بھائی جان! یہ تو ڈراما سا وقت آپ ہمارے پاس بیٹھ جائیں پھر تو سال دو سال بعد ہی ملاقات ہوگی۔“  
 ”میں نے ساڑھ بھائی کو غلطی کرتے ہوئے کہا۔“  
 ”تم اگر صبح سے آجاتیں تو یہ سٹوڈنٹ سے وقت کی شکایت نہ ہوتی۔“ ساڑھ بھائی نے جتا یا بھی اور اُس نے پاس بیٹھ بھی گئیں۔  
 ”بس غلطی ہو گئی۔ جب سکندر کام سے جا رہے تھے میں اس وقت انہیں یاد دلانا بھول گئی۔ لیکن پچھلے خط لکھنا نہیں چاہیے گا۔ میرا ایڈریس ہے آپ کے پاس یا سکندر کو دوں؟“ اُس نے اپنے بیگ تلاش میں نظروں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔  
 ”ہاں لکھ دو“ ساڑھ بھائی اُس سے کہہ کر اماں جی کے پیکارنے پر اُن کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔  
 کچھ دیر بعد عدیل بھائی نے آکر جلدی جلدی کا شور مچا دیا۔ اور شاہ سکندر کے اشارے پر وہ بھی باہر لوٹ بنے تو تیار ہو گئی۔ درختوں میں سے کوئی نہیں جا رہی تھی اُس کی وجہ سے طاہرہ کو بھی اجازت مل گئی۔  
 ”وہ جلدی سے اُس کا ہاتھ تمام کر لوں۔“

”تم ہمارے ساتھ چلو، ہم والیس میں تمہیں چھوڑ بھی دیں گے۔“  
 ”والیس کا کوئی مسئلہ نہیں، اب تو جی ہیں ناں۔“ طاہرہ نے مسکرا کر کہا۔  
 ”ارے ہاں، چچا جان بھی تو جا رہے ہیں۔“ وہ خوشدلی سے کہتی ایکدم خاموش ہو گئی، کیونکہ ادھر طے ملنے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ اماں جی اور جی جان کے رونے پر ساڑھ بھائی کی آنکھیں بھی جھلکانے لگیں۔ اور میونہ بھائی اماں جی کو تسلی دینے میں مصروف تھیں۔ پھر آبا جی کے ٹکٹ پر سب نے اپنے صوفوں پر بیٹھے اور ساڑھ بھائی، بڑے بھٹا کے اشارے پر جلدی سے باہر نکل گئیں۔

پہلے بے حس ہوتے ہیں مرد، ایر پورٹ سے والیبی پر وہ شاہ سکندر کو مخاطب کیے بغیر اپنے پاس بولنے لگی تھی۔ ”بھٹے تو بڑے بھٹا پر حیرت ہو رہی ہے۔ کتنی جلدی بدل گئے ہیں۔ ایک بار بھی ان کا نام نہیں لیا۔ اتنا ہی کہہ دیتے کہ وقتاً فوقتاً نیل کا تیا کرتے رہنا۔ یہ بھی نہیں کہا۔ اور جب اسے پوچھا کہ آپ نیل سے مل کر جا رہے ہیں تو بڑے آرام سے بولے تھے۔ وہ اپنی ماں کے نام نہیں کیے۔ بتا جب اُس سے ملے ہی نہیں۔“  
 ”تم کہیں غلط فہم ہو؟“ شاہ سکندر نے اُس سے کہتے ہوئے چہرے پر نظر ڈال کر کہا۔  
 ”بس بھٹے غصہ آ رہا ہے۔ یہ کوئی عرصہ ہے۔ چچا جی میں دہا ہے۔ وہیں ہیں۔ صبح جب تھا

کچھ بڑے پھیر پر بہت غصہ آ رہا تھا۔  
 ”اب سارے مردوں کو ایک ہی تعداد میں تو مت کھڑا کرو۔ پھر تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ ایک دور کے بعد تمہارے بھائی کو اب خوشیاں میسر آئی ہیں۔“  
 ”ان خوشیوں میں نسل کا حصہ بھی ہونا چاہیے،“ وہ فوراً بولی تھی۔

”وہ اپنی ماں کے ساتھ خوش ہے،“ شاہ سکندر نے جس انداز میں بڑے بھائی کی بات دہرائی سے وہ کچھ گئی کہ وہ اس سونوے کو پسند نہیں کر رہا اور میوہ بھائی نے اسے بھجایا بھی تھا کہ اسے منے وہ شاہ سکندر کے سامنے بیان نہ کرے۔ اسے کوئی وجہ بھی نہیں ہوگی۔ اور وہ کچھ تو اسی وقت بس اس وقت نسل کے لیے کڑھتے ہوئے وہ کچھ جذباتی ہو گئی تھی۔ اور شاہ سکندر کی اکتاہٹ دیکھ کر کپڑے بدلنے کے بہانے ہاتھ روم میں بند ہو گئی تھی۔  
 پھر اگلے دن وہ شاہ سکندر کے کہیں جانے کے انتظار میں تھی۔ اور وہ گیارہ بجے کے قریب تھا۔ تب جلدی سے دروازہ بند کر کے اس نے ہمید بھائی کے گھر فون کر ڈالا۔ دوسری طرف ملازمہ تھی اس کے انداز سے پتہ چل کر وہ پوچھنے لگی۔

”نیلے بیگم ہیں؟“  
 ”نہیں جی، آپ کون ہو؟“ جواب کے ساتھ ہی سوال ہوا۔  
 ”میری بیوی سے بات کر دو،“ اس نے اپنے بارے میں قصداً نہیں بتایا۔  
 ”نیل تو جی اپنے کمرے میں ہے۔“ ادھر سے بڑے آرام سے کہا گیا۔  
 ”تو بلاؤ اسے؟“ اس نے غصے سے کہا۔

”وہ نہیں آسکتا، اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے جی۔“ ادھر سے معذوری ظاہر کی گئی۔  
 ”اچھا دیکھو،“ وہ فوراً غصے پر قابو پا کر رسان سے بولی، ”میں نیل کی بھوپھو ہوں۔ وہ مجھے کر کے بہت خوش ہوگا۔ تم ایسا کرو۔ یہی فون سیٹ اس کے کمرے میں لے جاؤ جلدی کرنا اچھا جی!“

آسیہ بڑی بے تابی سے انتظار کرنے لگی اور پھر اتنے دنوں بلکہ مہینوں بعد نیل کی آواز اس کے آئینے پر اختیار چھلک گئی تھی۔  
 ”نیل، میری جان!“

”بھوپھو! آپ کہاں ہیں۔ مئی کہتی ہیں آپ بہت دور چلی گئیں۔ اب میرے پاس کبھی نہیں آئیں۔ نیل کمزور آواز میں بول رہا تھا۔  
 ”اڈل گی بیٹا آؤں گی۔“ وہ تڑپ گئی تھی، آپ ٹھیک تو ہو جاؤ کب سے یار بڑے ہو گیا؟“

آپ کو؟  
 ”شانہیں بھوپھو! میں چل نہیں سکتا۔ میڈ سے اترتا ہوں تو میری ٹانگیں کانپتی ہیں پھر میں گرجا نیل کے لیے گئی تھی۔ لے لی کسی اسے رلا رہی تھی۔  
 ”تم دو! انہیں لے رہے؟“

”لے رہا ہوں اور آ میری ٹانگوں کی مالش بھی کرتی ہے۔“ نیل نے بتایا پھر اسے پکار کر پوچھو، میں اس کی پاس جاؤں گا۔ آپ مئی سے کہیں مجھے اس کی پاس چھوڑ دیں۔ میں نہیں کروں گا۔“  
 ”یاں ہاں بیٹا! میں کہوں گی آپ کی مئی سے۔“ وہ اس کا دل رکھنے کی خاطر فوراً بول پڑی۔  
 ”مجھے اس کی بہت یاد آتی ہیں۔ اور سونیا، امرا اور بھوپھو وہ چھوٹا سا عمر، میرا بھی بھائی وہ بہت معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔“

”یاں بیٹا! آسہ نے بے اختیار ماڈھ پیس کو چوم لیا۔  
 ”مئی کہتی ہیں، میرا کوئی بھائی، کوئی بہن نہیں ہے اور باپ بھی۔“ وہ جانے کیا کہتے جارہا تھا یا شاید نے اپنی بات پوری کی تھی۔ لیکن آسیہ نہیں سن سکی کیونکہ اسے اچانک بڑی زور کا جھکرایا تھا اور نسل نے بھی ریسپر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔  
 ”مجھے بھینٹنے بھی ریسپر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔“

شاہ جہانگیر نے پہلی سیر میں برآمدہ رکھا تھا کہ فون کی بل پر واپس پلٹ آئے، اور ریسپر اٹھا کر کان سے لے لیا۔ لیکن کوئی کچھ نہیں۔ دوسری طرف بھی خاموشی چھا رہی، جس سے وہ کچھ گئے کہ فون کرنے والا کوئی اور نہیں ان کا بھائی شاہ سکندر ہے۔ گزشتہ دو مہینوں سے یہی ہو رہا تھا۔ کوئی اور اگر ریسپر اٹھا پلٹتا تو ادھر شاہ سکندر فون بند کر دیتا۔ اور شاہ جہانگیر جانے کیوں اس سے کترا رہے تھے۔ بات یہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے فون ریسپر کرنے میں بہت احتیاط برت رہے تھے۔ کتنے بل خاموشی سے کرتے تھے۔ ادھر سے مہر انسہ کو آتے دیکھ کر شاہ جہانگیر نے اشارے سے اسے پاس بلایا اور ریسپر سے تمنا کر گئی میں بولے۔

”سکندر ہے۔ بات کر لو اس سے۔“  
 ”شاہ۔ شاہ کیسے ہیں آپ؟“ مہر انسہ بے اختیار ہو گئی تھی لیکن اگلے بل مایوسی سے شاہ جہانگیر کو دیکھنے

”کیا ہوا، بند کر دیا اس نے؟“ شاہ جہانگیر نے اس کے ہاتھ سے ریسپر لے کر کان سے لگایا۔  
 ”کر ڈیڈل پر رکھتے ہوئے بولے،“ لائن کٹ گئی؟“  
 ”نہیں بھائی جی، انہوں نے فون پٹھا تھا۔“ مہر انسہ نے فوراً بتایا کہ لائن کٹنے اور فون پٹھنے میں فرق ہے۔

”اچھا! شاہ جہانگیر اب نظریں چرا گئے۔ اپنی غلطی کا احساس بھی ہوا کہ ناحق مہر انسہ کو بلایا۔  
 ”آپ سے کیا بات کی شاہ نے؟“ مہر انسہ پوچھ رہی تھی۔  
 ”کچھ نہیں، میرا مطلب ہے مجھ سے بھی کوئی بات نہیں ہوئی۔ بس ابھی تو فون آیا تھا اس کا اور میں نے نہیں بلایا۔“ شاہ جہانگیر گول مول جواب دے کر باباجان کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔  
 ”السلام علیکم باباجان!“ کمرے میں داخل ہوتے ہی شاہ جہانگیر نے سلام کیا۔

”وسلام، کہاں سے آرہے ہو؟“ جواب دینے کے ساتھ ہی باباجان نے پوچھا۔  
 ”میں رحیم یار خان گیا ہوا تھا۔“ وہ باباجان کے سامنے موٹے بڑے بیٹھے ہوئے کہنے لگے، ”ابو ظہبی سے مشائخ آئے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ آپ جانتے ہی ہیں انہیں شکار کا شوق ہی یہاں لاتا ہے؟“  
 ”ہوں۔“ باباجان کتنی دیر تک اثبات میں سر ہلاتے رہے۔ اور ایسا اس وقت ہوتا ہے جب غائب کی بات پر ذہن میں اسی بات سے متعلق اور بھی بہت سے واقعات گردش کرنے لگتے ہیں۔  
 ”ابھی سکندر کا فون آیا تھا شاہ جہانگیر، باباجان کے منہ پر ہوتے ہی کہنے لگے، ”مجھے لگتا ہے باباجان کچھ پریشان ہے! اس لیے جلدی جلدی فون کر رہا ہے۔“

”کچھ کہا اس نے؟“ باباجان سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔  
 ”مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔“ باباجان نے فون کیا ہوگا اس نے، میں ملتا تب ناں۔ کیا کہتے ہیں آپ، اب مجھے اس سے لینا چاہیے؟“ شاہ جہانگیر نے پوچھا۔

”نہیں باباجان! نے سختی سے منع کر دیا۔“ اب تمہیں اس سے ملنے کی ضرورت نہیں ہے، اور نہ ہی اس کے کاؤنٹ میں میرے کوئی رقم جمع کرنا۔ اب ہم اس کے لیے واپسی گئے راستے کھول رہے ہیں۔ لیکن باباجان! وہ غالباً پریشان۔“

”پریشان ہوگا تو یہاں آنے پر تیار ہوگا“ باباجان فوراً بولے تھے: ”اور اس کی اصل پریشان وقت شروع ہوگی جب اُس کا اکاؤنٹ بالکل خالی ہو جائے گا۔ ہمارے اندازے کے مطابق تو لگیں گے اور اتنا عرصہ بالکل خاموش رہنا پھر رہے ہوں گے۔“

”جی۔“ شاہ جہانگیر نے یونہی سر ہلایا۔ پھر کچھ سوچ کر کہنے لگے: ”یوں تو باباجان آپ بہت پر کے لیے واپسی کے راستے کھول سکتے تھے۔ کیونکہ اُس کے پاس اتنا پیسہ نہیں تھا۔ شادی کرتا تو ہزار جاتا اور بزنس کرتا تو شادی میں دیر ہوتی۔ یعنی پریشان تو وہ اُسی وقت تھا۔ آپ نے تو مزید پر ایک طرح سے اُس کے لیے آساناں پیدا کر دی تھیں۔“

باباجان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ گہری ہوتی چلی گئی اور انکھوں میں فاتحانہ چمک تھی۔ کچھ دیر بعد اُس کو دیکھ کر کہنے لگے۔

”اُس وقت اگر سکندر پریشان تھا تو اُس کے ارادے بھی مضبوط تھے، وہ اُس لڑکی کے لیے جاگیر چھوڑ گیا تھا۔ وہاں اُس کی خاطر پتھر توڑنے کا حوصلہ بھی رکھتا تھا۔ اور یہ حوصلے تب تک جواں ہیں جب تک بندہ اپنے مقصد میں کلیاں حاصل نہیں کر لیتا۔ اور حصول کے بعد تو مطمئن رہتا ہے۔“

”اُس وقت اگر ہم سکندر کو اُس کے حال پر چھوڑ دیتے تو وہ معمولی کام کرنے میں بھی عار محسوس ہوا اور پھر اُس کی والدین و اہل خانہ کی نا مکتبہ ہو جاتی، اس لیے ہم نے اُسے اتنی ذلیل دی۔ ہمارے ذریعے چھوڑ کر اُس کے اس احساس کو زندہ رکھا کہ چھوٹا موٹا کام اُس کے شان شان نہیں ہو سکتا۔ اگر پتھر توڑنا تو دور کی بات کسی کی ساتھی میں اچھا عہدہ بھی قبول نہیں کر سکتا۔ سمجھیں آئی ہماری حکمت یا نہیں؟“

شاہ جہانگیر جو غور سے سن رہے تھے مسکرا کر سر ہلنے کے انداز میں سر ہلایا پھر کہنے لگے۔

”اس طرح مجبور ہو کر وہ یہاں آنے پر تیار ہو کر جاسکے گا لیکن۔“

”اوں ہوں؟“ باباجان لوگ کر بولے: ”ہم لیکن کی گنجائش نہیں چھوڑتے اُسے آنے دو دیکھ لینا۔“

”جی۔ اب میرے لیے کیا حکم ہے؟“ شاہ جہانگیر نے اپنے اندر اٹھتے سوال کو روک کر اپنا اقدام پوچھا۔

”چند دن بعد سکندر کی بات سن لینا۔ اور پھر کوئی بھی سبب مانا کر کے پیسے سے معذوری ظاہر اور ماں ذرا اپنی بی بی جان کو مضبوط کر دو، وہ آجکل بہت سکندر سکندر کرتی ہیں۔ کہیں ایسا اُن سے رابطہ کرے اور یہ ہمدردی میں اُس کی مدد کر بیٹھیں۔ ان عورتوں کے پاس عقل نام کی نہیں ہوتی، سارے کئے کر اُسے پر پانی پھیر دیتی ہیں؟“ باباجان بولتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے

شاہ جہانگیر نے فوراً اُن کی تقلید کی۔

”میں سمجھا دوں گا بی بی جان کو۔“

”ٹھیک ہے اب تم آرام کرو باباجان نے انہیں جانے کی اجازت دی۔ شاہ جہانگیر اُن سے نکل آئے۔

میر النساء اپنے گول مٹول پیچے کو بازوؤں کا جھولا جھلاتے ہوئے اُس سے باتیں بھی کر رہے تھے۔ باپ نے میری آواز سن کر فون بند کر دیا۔ اب تو جلدی سے بڑا ہو جا آغا۔

آواز سن آؤں گی۔ پھر دیکھوں گی کیسے فون بند کرتا ہے۔“

شاہ جہانگیر نے رک کر ماں بیٹے کو دیکھا پھر آگے بڑھتے ہوئے اُن کے ہونٹوں پر مسکرا

”میری بیوی چھوڑ دوں نہیں گئیں، آج اُنہوں نے مجھے فون کیا تھا۔ میں نے اُن سے بہت ساری باتیں کی ہیں۔ چھوڑ دینا نہیں کیا سوا۔ چھوڑنا خوش ہو گئی تھیں؟“ بیل خوش ہو کر بتا رہا تھا۔

”بیل کی پریشان آواز نہ ہو گئی۔ انکھوں سے ناگواری کا اظہار نہ ہو رہا تھا۔ البتہ بیلے پر تالو پا کر لوچنے بند کی تھیں خود اُن کے فون ریسو کیا تھا؟“

”میں نے اُن کی فون میں لایا تھا۔ مٹی آپ ٹیلی فون میرے پاس رکھ دیں۔ میں روزانہ چھوڑ دے گا۔ اُن کی بات کا جواب دینے کے ساتھ التجا بھی کی۔“

”تکروں کا اور امانت کی سے بھی؟“ بیل نے اُن کی بات کا جواب دینے کے ساتھ التجا بھی کی۔

”نہیں، یہاں فون نہیں ڈسٹرب کرے گا۔“ بیل نے اُس کی بات کو رد کرتے ہوئے بولیں۔ ”جب ہمارے چھوڑ فون کریں گی تب آیا تمہیں فون میں لادے گی۔“

”اور مٹی؟“ چھوڑ کر بیل نے اُن کی بات کو رد کرتے ہوئے بولیں۔ ”مٹی نے اُن کی بات کو رد کرتے ہوئے بولیں۔“

”بیل بہت سادگی اور معصومیت سے بول رہا تھا۔“

”مٹی؟“ بیل نے اُن کی بات کو رد کرتے ہوئے بولیں۔ ”کیا بتایا ہے تم نے چھوڑ کو؟“

”بیل گھر کر چیک ہو گیا۔“

”دیکھو بیل!“ بیل نے اُن کی بات کو رد کرتے ہوئے بولیں۔ ”اس طرح تو ہمارے چھوڑ پریشان ہوں گی تمہیں لہنا چاہیے تھا کہ تم اب ٹھیک ہو۔“

”سوری مٹی! اب میں چھوڑ کو پریشان نہیں کروں گا۔“ بیل نے فوراً سوری کہا کہ کہیں مٹی اُسے چھوڑے بات کرنے سے منع نہ کر دیں۔

”ہاں شاہاش!“ بیل نے جب کہ اُس کا گال تھپکا پھر پلٹیں تو آیا کو کھڑے دیکھ کر اُس سے بولی تھیں۔

”بیل سوچا ہے تو میرے کمرے میں آنا۔“

”مٹی چھوڑ آئیں گی ناں؟“ بیل نے عقب سے پکار کر پوچھا۔

”نہیں! قطعاً اُن کی کمرے کے کمرے سے نکل آئیں۔ اصل میں وہ جس دعوے سے بیل کو لے کر آئی تھیں گراؤں سے بہتر اُس کی دیکھ بھال کوئی نہیں کر سکتا تو اپنے دعوے کو وہ سچ ثابت نہیں کر سکتی تھیں بلکہ اُنہوں نے کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اور شاید یہ اُن کے بس میں بھی نہیں تھا۔ کیونکہ اُنہوں نے شروع ہی سے بیل کو خود سے الگ رکھا تھا۔ کبھی اُس کی خاطر اپنی ایکوئیز نہیں چھوڑی تھیں۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اُس کے ساتھ ننگ کر بیٹھ جائیں، بلکہ طلاق کے بعد تو وہ اور بھی آزاد ہو گئی تھیں۔ یہاں کوئی روک ٹوک نہیں تھی اُن کے ماں باپ اس عمر میں بھی کلب اور پارٹیز کے دلدادہ تھے، اور کھتے تھے کہ اُن کی بیٹی اتنا غریبہ تیرا داشت کاٹ کر آئی ہے۔ اس لیے اس سے ہمدردی کرنے کے ساتھ اُسے مزید سر چڑھایا تھا۔ اور چاہتے تھے کہ اب وہ اپنے ہی جیسے لوگوں میں کہیں ایڈجسٹ ہو جائے۔ خود بیل بھی یہی چاہتی تھیں۔

اس لیے اُن کا زیادہ وقت کلب اور فائوٹاڈز میں ہونے والے فنکشنز میں گزارتا تھا۔ بیل کا طوق تو اُنہوں نے خواہ مخواہ گلے میں ڈال لیا تھا۔ جس پر اب پچھتا رہی تھیں۔

اصل میں اُس وقت بھی انہیں بیل کا خیال نہیں تھا۔ بلکہ چھوڑے ہوئے شوہر کو پریشان کرنا مقصود تھا۔ جیسے پہلے بیل کو بغیر تباہی اسکول سے ہی اپنے ساتھ لے جا کر پریشان کرتی رہی تھیں، لیکن اس بار وہ خود پریشان ہو گئی تھیں، کیونکہ جس وقت وہ بیل کو لے کر آئی تھیں اُس وقت وہ صرف بخار کی حالت میں تھا۔ اور یہاں اُن کی لاپرواہی سے معوم پچھلے لپو لپو کا شکار ہو کر چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا تھا۔ لپو لپو کو دیکھ کر اُن کے دل میں اُن کے ساتھ پھر پورے رنج و غصہ کے ساتھ دیکھ کر اُن کی بیٹی چاہتی تھیں۔ لیکن تو تب ہمدرد اُس کے لیے آیا کہ چھوڑی تھی، اور یہ بھی چاہتی تھیں کہ وہ ہمدرد سے جلد ٹھیک ہو جائے۔ تاکہ اُس کے دادا دادی کے پاس بھیج دیں۔ اس حالت

میں یوں نہیں بھیج رہی تھیں کہ بڑے دعوے سے لائیں۔ گو باہر لحاظ سے انہیں اپنا مفاد دیکھ کر اور ابھی نبیل سے آسیہ کے فون کرنے کا سن کر وہ سخت غصے میں آئی ہوئی تھیں کہ چٹا نہیں بھرا آسیہ کو اپنے بارے میں اور کیا کیا بتایا ہے۔ چاہتی تو نبیل سے معلوم کر سکتی تھیں۔ لیکن قصداً اس سے نہیں کر دیا کیونکہ ان کا غصہ ظاہر ہو کر اور نبیل کے سامنے اس کے دو خیال کا ذکر وہ اچھے طریقے سے کرتی تھیں تاکہ اسے واپس آن لگی پاس سمجھنے میں انہیں کوئی پرہیز نہ ہو۔ بہر حال جیت آیا ان کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ چھوٹے پوچھنے لگیں۔

”نبیلی فون نبیل کے کمرے میں کیوں لے کر گئی تھیں؟“  
 ”وہ اس کی بھوپھی نے کہا تھا“ آیا ان کے غصے سے کچھ ڈر گئی تھی۔  
 ”بھوپھی ہو یا دادی، کسی نے ناگواری کی ضرورت نہیں ہے۔ آئندہ ایسی حرکت نہ کر۔  
 نبیل سخت لہجے میں تنبیہ کرتے ہوئے بولیں۔  
 ”ایک بات ابھی طرح سمجھ لو، کوئی بھی نبیل کا پوچھے کہہ دینا، وہ میرے ساتھ باہر گیا ہوا ہے۔“

”آپ کے ساتھ باہر گیا ہوا ہے؟“ آیا منمنائی۔  
 ”ہاں اور خیر دار نبیل کو نہیں بتانا کہ اس کی کسی بھوپھی، چاچھی، دادی کا فون آیا تھا۔ وہ پوچھ بھی نہیں سمجھیں،“ وہ سارا غصہ اس پر نکال رہی تھیں۔  
 ”جی“  
 ”جدا، اپنا کام کرو۔“ وہ آیا کو بھیج کر بھی کتنی دیر تک بڑبڑاتی رہی تھیں۔

بیل کی آواز پر اس کی سسکھ کھٹی تھی۔ اور پھر مجبوراً اٹھنا بھی پڑا کیونکہ دروازہ تو کھولا تھا۔ بہت سستی سے آکر دروازہ کھولا۔ تو سامنے شاہ سکندر بے حد خستہ لایا ہوا کھڑا تھا۔  
 ”سورہی تھیں کیا؟“ اس کی آواز میں بھی جھلکا ہوا تھا۔  
 ”آسیہ کبھی اسے آنکھ میں دیر ہو گئی ہے۔ جلتے کب سے وہ بیل بجا رہا تھا۔  
 ”ہاں بس نیند آگئی تھی۔“ وہ دروازہ بند کرتے ہوئے بولی تو اس کی آواز بدلی ہوئی تھی۔  
 شاہ سکندر نے رک کر دیکھا اور پھر اس کا بازو تھام کر اپنے سانس لے کر لیا آنکھیں مٹائی مٹائی۔  
 چہرہ سستا ہوا۔ نیند کے باعث پس لگ رہا تھا جب ہی وہ تشویش سے بول چھنے لگا۔  
 ”طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔“  
 ”ہوں، ٹھیک ہوں۔“ اس نے فوراً اپنے چکر اگر کرنے کا جتنا مناسب نہیں سمجھا۔ اور بات گئی۔

”کیا بہت دیر سے بیل بجا رہے تھے؟“  
 ”پورے دس منٹ۔“ شاہ سکندر نے گھڑی اس کے سامنے کی۔  
 ”منٹ اور گھنٹے میں فرق ہوتا ہے شاہ سکندر حیات، دس منٹ یوں کہہ رہے ہیں جیسے گھنٹے کھڑے رہے ہوں۔“ وہ اس کی ٹان کیوں لکھا سا جھٹکا دے کر بولی۔  
 ”جناب! جب بندہ کہیں سے تھکا ہارا آئے تب دروازے پر ایک بل رگنا بھی غلاب ہے۔ اور تمہیں ابھی بھی احساس نہیں۔ بھوکا پیاسا کھڑا ہوں۔“ شاہ سکندر نے پیٹ پر ہاتھ دھکا۔  
 ”اوہ!“ وہ ایک دم پریشان ہو گئی۔ ”آئی ایم سوری سکندر! کھانا تو میں نے پکایا نہیں۔“  
 ”کیوں، کچھ پکانے کو تھا نہیں یا۔“ شاہ سکندر نے تھکے تھکے انداز میں صوفے پر گر گئے۔

چاہتے پکانے کو تو موجود تھا۔ بس میری طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔ اسے بتانا پڑا۔“ پتا نہیں چاہتا تھا، میں جیگر کر رہی تھی پھر اندر جا کر لیٹی تو نیند آگئی، ابھی اٹھی ہوں۔“  
 ”یا ہوا تھا، پہلے کیوں نہیں شانی، جیلا بھی ڈاکٹر کے پاس۔“ وہ ابھی بٹھا تھا فوراً کھڑا ہو گیا۔  
 ”نہیں اب تو میں ٹھیک ہوں، بلکہ بہت بہتر ہوں۔“ ایک جب تک پہنچ کر میں اتنی دیر میں بیٹ پوچھنے لے کہ تیار کر دیتی ہوں۔ وہ غصت میں کہہ کر بچن میں جلتے لگی تھی کہ شاہ سکندر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔  
 ”کوئی ضرورت نہیں کچن میں جانے کی۔ جاؤ جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر آؤ۔ کھانا بھی باہر کھالیں گے۔“

شاہ سکندر نے اسے کہنے کی طرف دھکیل دیا۔  
 ”وہ اس کی بھوک کے خیال سے کہتی رہ گئی کہ پہلے کھانا پھر ڈاکٹر لیکن وہ اسے پہلے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ جہاں سے بے بہانہ کی آمد کی نوید لے کر وہ اسے فائیو اسٹار ہوٹل میں لے گیا جہاں وہ اس کے ساتھ پہلی بار آئی تھی۔“  
 ”یہ تو وہی جگہ ہے۔“ وہ بیٹھے ہی بے اختیار گنگنائی پھر جینپ کر بچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔

شاہ سکندر آنکھوں میں شرارت لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ ہونٹ دلکش مسکراہٹ کی گرفت میں تھے۔  
 ”اس طرح دیکھنا منع ہے،“ اس کا چہرہ رنگین ہو گیا تھا۔  
 ”شاہ سکندر نے آنکھ مار کر اسے مزید بول کھلا دیا تھا۔  
 ”لگتا ہے آپ ہوش میں نہیں رہے۔ ایسی حرکتیں کریں گے تو میں کھانا بھی نہیں کھاؤں گی،“ اس نے روٹھ کر کہا اور گلاس وال سے باہر دیکھنے لگی۔

”اوں ہوں۔ کھانے سے ناراضگی بانٹ نہیں چلے گی۔ سنا نہیں تھا، ڈاکٹر کیا کہہ رہی تھیں۔“ وہ اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتا ہوا بولا پھر ویٹ کے آنے پر سنبھل کر بیٹھ گیا تھا۔  
 ”ڈاکٹر نے اسے ریسٹ بھی بتایا تھا لیکن اس طرح نہیں کہ وہ بانٹل لیٹر پر لیٹ جائے، بلکہ ہلکے ہلکے کام کر سکتی تھی۔ اور وہ کرنا چاہی تھی۔ لیکن شاہ سکندر نے اسے یہ نہیں کروا دیا کہ وہ آرام سے بیٹھو، کہہ کر پریشان کر دیا تھا۔ آخر عجزاً اگر وہ اس سے اٹھ پڑی تھی۔

”میں خود ڈاکٹر ہوں، بہت اچھی طرح جانتی ہوں کہ کچھ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں، آپ براہ مہربانی خاموش رہا کریں۔ اور ہر وقت میرے سر پر سوار رہنے کی ضرورت نہیں ہے، میں پریشان ہو جاتی ہوں۔“  
 ”میرے ساتھ ساتھ رہنے سے؟“ شاہ سکندر نے جانے کس لہجے میں پوچھا۔  
 ”نہیں، آپ کے ٹوکنے سے سیدھا سادہ کام خراب ہو جاتا ہے۔ جسیں کمرے میں جائیں، میں یہ دہرین دھوکا بھی آتی ہوں۔“ وہ اسے کچن سے نکلے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

شاہ سکندر مصروفی نارا حلق کا اظہار کرتے ہوئے کمرے میں چلا گیا۔ اور جب وہ فارغ ہو کر اندر آئی تو وہ فون پر بھانے کس سے بات کر رہا تھا۔ اس نے کوئی دھیان نہیں دیا اور چپ چاپ اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

”تھک گئی ہوں!“ شاہ سکندر فوراً فون رکھ کر بول چھنے لگا۔  
 ”نہیں۔“ وہ قصداً مسکرائی پھر اچانک خیال آئے پر اس کی طرف کروٹ لے کر کہنے لگی، ”آج تھائی کانا بنا تھا۔ یونہی باتوں میں عدیل بھائی کی شادی کا ذکر نکلا تو میں نے ٹال دیا۔ کانا مے دیا۔ ایک بار میں نے شاید آپ سے بھی کہا تھا۔ ہے نا؟“  
 ”ہوں۔ کہا تو تھا۔“ پھر وہ شاہ سکندر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔  
 ”پھر یہ کہ وہ آٹا بنی کچن میں پسند ہے اور وہ کہہ رہی تھیں کہ میں عدیل بھائی سے بات کر کے دیکھوں۔“

اگر وہ نامی ہوں تو پھر ہم جلیں گے، آئی مین باقاعدہ پروپوزل لے کر۔ میں ناں "آخر میں اس خیال کا سر کرنے اُس کے پوچھتا ہے تو ادھر کی خبر ہے نہ ادھر کی، وہ اُس کی پیشانی پر آئی بالوں کی لہ میں کیا کر سکتا ہوں، تجھے تو ادھر کی خبر ہے نہ ادھر کی، وہ اُس کی پیشانی پر آئی بالوں کی لہ انگلی پر لپیٹتے بیٹھے بولا۔

"آپ کو تو شاید اپنی خبر بھی نہیں ہے، آسیہ نے اپنے بال اُس کی انگلی سے نکال لئے ہ

"اب رکھیں پڑے گی، کیونکہ اب میں باپ بننے والا ہوں، وہ اُس کی آنکھوں میں دیکھ کر پھر ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا، اور شوق سے پوچھنے لگا۔

"یہ بتاؤ، تمہاری کیا خواہش ہے بیٹا یا بیٹی؟

"بیٹی، آسیہ نے سوچنے کا توقف بھی نہیں کیا فوراً بولی تھی۔

"کیوں؟" شاہ سکندر کی حیرت اُس کے فوری جواب دینے پر بھی۔

"اُس نے پوچھا میں نے بتا دیا، اب کیوں کا کیا سوال۔؟" وہ اُس کی حیرت پر غلط فہم ہو کر "نہیں بتانا چاہتیں مت بتاؤ، ویسے میری خواہش بھی یہی ہے، شاہ سکندر نے کہا بولی۔

"کیوں؟"

"شاہ سکندر کا بھرپور تہ تیہ ہے ساختہ تھا۔ پھر اُس کا ہاتھ دبا کر بولا۔

"پہلے تم بتاؤ؟"

"پہلی وجہ تو یہ ہے کہ میری کوئی بہن نہیں ہے شاید اس لیے مجھے بیٹی کی خواہش ہے اور بیٹیاں ابھی لگتی ہیں، آسیہ نے تیلے میں یوں جلدی کی کہ اپنے "کیوں" کا جواب سننا ہاں، بیٹیاں ابھی لگتی ہیں، شاہ سکندر نے تائید کے ساتھ اُس کی بات دہرائی پھر "میری خواہش میں ایک غریب پوشیدہ ہے اور وہ یہ کہ باباجان میری شادی کے لئے جب بیٹی کا نہیں گے تو ہمارے آئیں گے، ہیں اپنے ساتھ لے جانے پر اصرار کر رہے گئے ہاں بیٹیاں خاندان سے باہر نہیں دی جاتیں۔"

"آسیہ جو بڑے اشتیاق سے سننے لگی تھی اندر ہی اندر جزبہ زور کر رہ گئی۔

"ہاں اگر شادی شادی ان حالات میں نہ ہوئی یعنی اس کے برعکس میں ہمیں بیاہ کر جاتا تب یقیناً میں پہلے بیٹے کی آرزو کرتا، شاہ سکندر نے اپنی بات پوری کی پھر آہستہ سے چھو کر بولا۔

"بیٹا ہو یا بیٹی، یہ بتاؤ نام کیا سوچا ہے؟"

"نام، وہ قدرے بے دھیانی میں اُسے دیکھنے لگی پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

"مجھے ایک نام بہت پسند ہے، اگر بیٹی ہوئی تو ہم اس کا نام مدیحہ رکھیں گے، نا۔"

"شاہ سکندر کی آنکھوں میں جانے کس خیال کا عکس تھا۔

"مدیحہ اچھا نام ہے، آسیہ کے چہرے پر کیسی مسکراہٹ پھیل گئی پھر معنی خیز لگی، کون جتنی مدیحہ؟"

"ہاں، شاہ سکندر نے چونک کر اُسے دیکھا پھر سمجھتے ہی اُس کے ہاتھ کو زور سے "کیا سمجھتی ہو تم مجھے؟"

"اُف میرا ہاتھ، وہ تکلیف سے پیچ بڑی۔

"پہلے میری بات کا جواب دو، شاہ سکندر نے اُس کے چہرے کا کوئی نوٹس نہیں لیا

"بہت نیک، شریف، پارسا، وہ جو منہ میں آیا کہتی گئی۔

"ہاں، وہ اُس کا ہاتھ چھو کر بولا، تم میری زندگی میں آنے والی پہلی اور 1

"یہ بات آپ ایسے بھی کہہ سکتے تھے، ہاتھ توڑنا ضروری تھا کیا،؟" اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

"سوری، سوری یاد، شاہ سکندر نے نادم ہو کر دوبارہ بہت نرمی سے اُس کا ہاتھ تھام کر ہونٹوں سے لپکا تھا۔

"اسیہ کو تنگی الٹیوں کا سلسلہ شروع ہوا تو رکھنے کا نام نہیں تھا۔ کوئی چیز اُس کے اندر نہیں چھٹی تھی، جس سے وہ بہت کمزور ہو گئی تھی، کوئی کام بھی نہیں کر پاری تھی، کھانا پکانے کی ہونٹوں اُس کی ملک ناگوار لگتی تو فوراً چین سے نکل آتی، ایسی حالت میں شاہ سکندر کو مجبوراً اُسے کچھ ان کے لیے اسات فنی کے پاس چھوڑنا پڑا، کیونکہ وہ خود ایک انڈیا بھی فنانس نہیں کر سکتا تھا۔ اور اسی ال سے آسیہ بھی جانے پر تیار نہیں تھی کہ اُسے کھانے کی برابری ہوگی لیکن پھر وہ بھی مجبور ہو گئی تھی۔

"کیا حالت بنائی ہے تم نے اپنی میموئے بھائی اُس پر خفا ہونے لگیں۔

"نہی بچہ پیدا کرنا آسان نہیں ہے، تم نے اسے ڈاکٹر ہونے کے زعم میں سوچا ہوگا کہ سارے ملے خود ہی ملے کر کے پھر ایک دم بچہ ہمارے سامنے لا کر ہمیں سر پر ہنر دو گی، آسیہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

"سر پر ہنر اپنے سسرال والوں کو دینا جنہیں کچھ خبر نہیں، اُس کے ہنسنے کے باوجود میموئے بھائی نکلے تھیں، تم تم سے کہیں بے خبر نہیں ہو سکتے، جزشتہ بار جب تم آئی تھیں تب میں نے تم سے یہاں لے کر مکتا اصرار کیا تھا۔ اسی لیے کہ میں جانتی تھی، تمہاری یہ حالت ہونے والی ہے، اگر تم میری تان لیتیں تو کم از کم یوں بولیوں کا دھماچہ تو نہ ہنیں؟

"جی نہیں میں کوئی دھماچہ نہیں ہوں، وہ اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے بولی، بس ذرا کمزوری ہے۔

"دو درپ لگیں گی ٹھیک ہو جاؤں گی؟"

"خالی ڈاکڑی تنہا سے کام نہیں چلے گا؟"

"جی ہاں اپنے کسے بھی آزمائے گا، تین بچے پیدا کر کے بہت ایکسپرٹ ہو گئی ہیں ناں، اُس نے کہا اور یں جانی توڑتے دیکھ کر میموئے بھائی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"کیا ہو رہا ہے؟" عدیل بھائی نے اُن کے قریب کرسی کھینچے ہوئے یونی بولچہ لیا۔

"تم تمہاری شادی کا پروگرام بنا رہے ہیں، میموئے بھائی فوراً بولیں، "نالہ کے لیے تو غالباً تم نے منع دیا تھا اُس لیے ہم ایک اور؟"

"کیا، کب، میں نے کب منع کیا تھا؟" عدیل بھائی قدرے بولہلا کر بولے تو میموئے بھائی بڑی زور سے ہنسنے اور ہنسنے چلی گئیں۔

"آسیہ پہلے کچھ کہی نہیں پھر جب عدیل بھائی کو جھینپ کر سر کھاتے دیکھا تو اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پائی۔

"دیکھا بھوکے کپڑا، بڑے چکر دے رہے تھے، میں نے اُسے اس انداز سے نہیں دیکھا، پتا نہیں سے سوچوں گا، میموئے بھائی ہنسی ہوئی اُن کے ایک ایک انداز کی نقل اُتار رہی تھیں۔

"آپ کو تو موقع ملے گا، عدیل بھائی انہیں اُن کے حال پر تھوڑا کر آسیہ کی طرف متوجہ ہو گئے، تم ماؤ آسیہ شاہ سکندر آئے تھے؟"

"جی، شام میں آئے تھے، آسیہ، میموئے بھائی سے نظریں ٹکا کر انہیں دیکھنے لگی۔

"روکا نہیں انہیں، کھانا وغیرہ کھایا یا یونی چلے گئے؟"

"ہاں کچھ جلدی میں تھے، غالباً کسی سے ملنا تھا۔"

"اب تک کوئی کام شروع نہیں کیا انہوں نے، مجھے اُن کا ارادہ کچھ ڈالوں ڈول سالگتا ہے، بتا نہیں کہ طرف ان کا رجحان نہیں ہے یا کوئی برابری؟" عدیل بھائی کا انداز کچھ سوچتا ہوا تھا، پھر بولنے لگے۔

"نہیں بتا نہیں انہوں نے کیا کرنا چاہتے ہیں؟"



”جہانگیر جہان کے انتظار میں ہیں۔ غالباً وہی کہہ گئے تھے کہ وہ خود اگر کوئی بزنس سیرٹا آسید نے سرسری انداز میں بتایا۔

”تو اب تک تو انہیں آجانا چاہیے تھا کہ ان دنوں بلکہ مہینے ہو گئے ہیں۔ ذون وغیرہ آتا ہے“ بھی نہیں، عدیل جہان اس نکتے کو بہت سنجیدگی سے لے رہے تھے۔

”اس عمر سے میں دو یا تین بار ذون آیا ہے ان کا مجھ سے تو بات نہیں ہوئی۔ سکندر بتا رہے ہیں الیکشن کی وجہ سے نہیں آئے پھر اپنی زمینوں کے کسی جھگڑے میں آگئے رہے۔ اب پتا ہے“ آسید کا انداز بتا رہا تھا جیسے شاہ سکندر نے اسے پورا اطمینان دلایا ہوا ہے کہ اس معاہدہ کو منسوخ کرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔

عدیل جہان کچھ دیر تک اسے دیکھتے رہے پھر جانے کیا سوچنے لگے تھے۔  
”بھئی شاہ لوگ ہیں انہیں کیا پروا؟“ میمونہ جہان اپنے مخصوص انداز میں ان کی جھنجھوٹا رہی ہیں۔ ”شاہ سکندر بزنس کریں نہ کریں میرا خیال ہے انہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا“ عدیل جہان نے اپنے خیال سے چونک کر میمونہ جہان کو دیکھا پھر اٹھتے ہوئے بولے تھے،  
”شاہوں کو بھی پانی شہی قائم نہ کرنے کے لیے کچھ نہ کرنا پڑتا ہے“  
آسید نے انہیں جانے ہوئے دیکھا پھر میمونہ جہان کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگی۔

”ٹھیک تو کہہ رہے ہیں عدیل جہان۔ تپا نہیں سکندر اتنے اطمینان سے کیوں ہیں، اور یہ کون کون کچھ پکڑی۔ جب طے کر کے گئے تھے کہ وہی اگر بزنس کا بتائیں گے تو سب سے پہلے کرنا چاہیے تھا۔“

”سنا؟“ میمونہ جہان اچانک کسی خیال کے تحت اس کا بازو ہلا کر پوچھنے لگیں: ”تم نے کہا فون کیا ہے؟“

”نہیں، ایک دوبار سکندر سے کہا تھا کہ میری بی بی جان سے بات کر ادیں۔ لیکن کر دیا۔ کہنے لگے جب سب معاملہ ٹھیک ہو جائے گا تب میں ساتھ لے کر جاؤں گا“

سادہ سے انداز میں بتایا۔  
”اس سے کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم خود بات کر لو“ میمونہ جہان بڑے آرام سے مشورہ بولیں، ”ہر بات شوہر سے کہنے کی ضرورت ہی ہوتی ہے خواہ اگر جانتے ہیں۔ سکندر کی بی بی۔“

پھر کتنے مخالف بھیجے تھے۔ بیچاری شوہر کی وجہ سے مجبور ہیں ورنہ ان کا دل تو جاتا ہوگا تیار۔ کو اور تیار ہی مجبوری بھی یہی ہے کہ جب شوہر سے جائے گا تب جاو گی۔ لیکن ان سے بار خوش ہو جائیں گی وہ“

”ہوں۔“ آسید کتنی دیر تک برسرِ سوغ انداز میں سر ملاتی رہی پھر قدم سے مایوسی سے بولی: ”پاس ان کا منہ نہیں ہے“

”میرا حائل کرنا کوئی مشکل بات ہے ڈائریکٹری دیکھ لو، میرا خیال ہے شاہ پور کے ہوں گے وہ سب ہتیارے سسرال میں ملیں گے“ آخر میں میمونہ جہان خود ہی غفلت ہو،  
”اور اگر سکندر کو پتا چل گیا تو“ اس نے خدشہ ظاہر کیا۔

”چلتے دو۔“ اس کی ماں کو فون کرو گی نا کہ کسی پرانے عاشق کو؟ میمونہ جہان کا جملہ ہے آسید نے پہلے گھورا پھر ہنس پڑی۔

شاہ سکندر نے گھر میں داخل ہوتے ہی ٹیپ ریکارڈر میں کیسٹ لگا کر ان کو دیا آسید نہیں تھی تو اسے بہت شام ٹھوس ہوتا تھا۔ اور حقیقتاً اس کے بغیر اس کا دل بھی نہ

”اُسے کئے ابھی صرف تین دن ہوئے تھے۔ پھر وہ صبح شام اس کے پاس حاضری بھی دے رہا تھا۔ بھی گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی کمی شدت سے محسوس ہوتی اور وہ سونے تک خود کو ٹیپ، اخبار، ذون وغیرہ میں مبتلا کرتا۔ ابھی وہ ٹیپ آن کر کے کپڑے بدلنے واش روم میں چلا گیا تھا۔ کیونکہ خود بھی ساتھ ساتھ گنگن نے لگاتار۔ جیسی فون کی میل سنانی نہیں دی۔ جب واش روم سے لایا جلدی سے پہلے ٹیپ بند کیا۔ پھر اگر ریسپورڈا تھا۔

”ہیلو۔“  
”گھر میں نہیں تھے کیا؟“ ادھر سے شاہ جہانگیر کی آواز سنا دی۔  
”جہانگیر جہان! السلام علیکم! کہاں ہیں آپ؟“ وہ ان کی آواز سنتے ہی بے اختیار ہو گیا تھا۔  
”وہ کیا کہتے ہو؟“ شاہ جہانگیر اس کا سوال بکسر نظر انداز کر گئے۔

”ٹھیک ہوں، کب سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ آپ آکیوں نہیں رہے؟“ اس کے لیے سے نشان پورا بھی اور جیسے ادھر ادھر کی باتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔  
”میرا نام مشکل ہے سکندر کیونکہ ادھر بابا جان نے مجھے بہت سے کاموں میں لگھا دیا ہے، بہت شش کرتا ہوں کچھ وقت نکال سکوں لیکن، یقیناً تم سناؤ کوئی کام وغیرہ شروع کیا یا نہیں؟“ شاہ جہانگیر اپنی درمیانی بات بدل گئے۔

”کیا کام کروں۔ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ کوئی چھوٹا موٹا بزنس نہیں کرنا اور بڑے بزنس کے لیے بے پاس پیسے نہیں ہیں۔ پہلے آپ نے جو رقم میرے اکاؤنٹ میں جمع کرانی تھی وہ میرے علاج الجے پر خرچ ہوئی اور اب“

”خیریت نہیں کیا ہوا؟“ شاہ جہانگیر اس کی بات کاٹ کر بولنے لگے۔  
”میرا ایکسپنٹ ہو گیا تھا۔ تقریباً دس دن ہاسٹل میں اس کے بعد ڈیڑھ دو مہینہ گھر میں میں بستر پر رہا ہوں اس نے بہت غفلت میں بتایا۔

”ادھر۔ اب کیسے ہو؟“ شاہ جہانگیر نے تشویش سے پوچھا۔  
”اب ٹھیک ہوں۔ بس بیماری نے پریشان کیا ہوا ہے۔ اس طرح تو کام نہیں چلے گا جہاں آپ دین میں بعد میرے اکاؤنٹ میں پیسے جمع کر ادیں سبھے کچھ کرنا چاہیے۔“ اس نے اپنے تئیں انہیں ماس دلائی۔

”ہاں میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم خود کچھ کرو لیکن مسئلہ پیسوں کا ہے، ادھر بابا جان نے سارا حساب اب اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے“ شاہ جہانگیر بابا جان کے کہنے کے مطابق اس کے سامنے مزید پیسوں کی معذوری ظاہر کرتے ہوئے بولے، ”میرے ساتھ ساتھ بزنس جہان کو بھی لگا بندھا خرچ دے رہے ہیں، لیکن ہاں ان کے محتاج ہو کر رہ گئے ہیں“

”پھر؟“ شاہ سکندر کچھ چلا سا گیا تھا۔  
”پھر میں کوشش میں لگا ہوا ہوں کہ کوئی بڑی رقم ہاتھ لگ جائے، تب پہلی فرصت میں ہتیارے ل آؤں گا تب تک تم کوئی جواب وغیرہ کر لو؟ انہوں نے قسلی کے ساتھ مشورہ بھی دیا۔ اور اس کی

شے سے کوئی جواب نہ پا کر قدرے وقت سے خود ہی کہنے لگے۔  
”نہیں، میرا خیال ہے تم جواب نہیں کر سکو گے۔ کیونکہ ایک تو تم شہر کے ہر بڑے آدمی سے متعارف“

”دوسرے سسرال میں جو اشج بنائیکے ہو اسے بھی قائم رکھنا چاہیے ہے نا؟“  
شاہ سکندر کوشش کے باوجود ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکا۔

”ایک اور راستہ ہے: شاہ جہانگیر اس کی خاموشی محسوس کرنے کے بعد کہنے لگے، ”تم یہاں چلے آؤ،“

”نہیں! وہ معنی ہے کہ اگر تم کوٹ بیچیں گے۔“

نہیں یا۔ آج تو نہیں اُٹھتے ہی تیار سے پاس جھاگا آیا ہوں، بہت دن ہو گئے ہیں، بس اب چلو۔ کیوں اُداس ہو گئے ہیں؟ میمونہ جہانی چائے لے کر آرہی تھیں اُس کی آخری بات سن کر کہتے ہیں۔

”ہاں آنکھوں سے بھی لگ رہا ہے رات بھر کروٹیں بدلتے رہے ہیں شاید، چہ چہ مجھے آپ سے ہی مدد ملی ہے۔“

”شکر یہ اور یہ صرف چائے؟ وہ اُن کے ہاتھ سے کپ لیتے ہوئے بولا۔

”جہانی! یہ ناشتا بھی کریں گے؟“ آسیہ نے کہا۔

”ابھی لاتی ہوں۔ میمونہ جہانی بیٹھنے کا ارادہ ترک کر کے والپس پلٹ گئیں۔

”اچھی خاتون ہیں، بس مکہ، زندہ دل اور اسماٹ،“ شاہ سکندر نے چائے کا سپ لے کر ایمانداری میونہ جہانی کی تعریف کی۔

”آپ واقعی رات میں نہیں سوئے؟“ آسیہ اُس کی آنکھوں کی سرفی دیکھ رہی تھی۔

”تیار سے بغیر نیند کہاں آتی ہے، پھر رات میں جہانگیر جہانی کا فون آگیا تو؟“

”کیسے ہیں جہانگیر جہانی؟“ وہ درمیان میں بول پڑی۔

”ہاں ٹھیک ہیں، تیار رہا بہت پوچھ رہے تھے؟ وہ چائے کا کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولا۔

”اور بی بی جان وغیرہ؟“ آسیہ نے اب سنبھل کر پوچھا۔ یعنی اور کسی کا نام نہیں لیا۔

”میں نے کسی کا نہیں پوچھا کیونکہ ایک تو جہانگیر جہانی بحالت میں تھے دوسرے اسلام آباد سے ان کر رہے تھے، ودرات میں سوچ کر سوچا تھا کہ اُن کی حالت اسی ہے کہ وہ اپنے شاہ پور جانے کا نہیں بتائے اس لیے اسلام آباد کا بتا کر کہنے لگا۔

”مجھے انہوں نے دیں بلایا ہے۔ کہہ رہے تھے وہ بالکل وقت نہیں نکال پارہے لہذا میں ایک دن کے لیے وہاں آجاؤں۔ اور میں یہی سوچتا رہا کہ تمہیں ایسی حالت میں جو کر کیسے جاؤں؟“

”یہی حالت کوئی ایسی تشویشناک تو نہیں ہے؟ وہ اُس کی پوری بات سن کر کہنے لگی۔ اور یہ بھی دیکھ کر کہاں مجھے کہنے آرام سے رکھا جا رہا ہے، پھر دو دن کی توبت ہے آپ اطمینان سے ہو جائیں؟“

شاہ سکندر نے فوراً ہاں نہیں بھری اور یوں دیکھنے لگا جیسے اُس کی بغیر میں نہ آ رہا ہو کیا کرے گی میونہ جہانی ناشتہ لے کر آگئیں، اور دونوں کو خاموش دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

”کیا مسئلہ ہے، اگر مجھے بتائے گا ہے تو بتاؤ، فوراً حل کر دوں گی۔“

”کوئی مسئلہ نہیں جہانی! آپ ہمیں ناشتا کریں؟“ آسیہ نے کہا۔

”ہاں۔ کتنی بار ناشتا کروا دی تھی، اب تو میں اتنا ہی سے کھا سنے کا پوچھنے جا رہی ہوں۔ اور اگر میں کوئی خاص چیز کھانی ہو تو بتاؤ،“ میمونہ جہانی رٹے شاہ سکندر کے سامنے رکھ کر آسیہ سے پوچھنے لگی۔

”نہیں جو کہنے کا کھانوں گی؟“ آسیہ قصداً مسکرا کر بولی۔

”اور سکندر آپ؟“ میمونہ جہانی نے اخلاقاً اُس سے بھی پوچھ لیا۔ ورنہ جہانی تھیں کہ وہ کھانے کے وقت موجود نہیں ہو سکتا۔

”نہیں، میں تو ابھی جا رہا ہوں۔ ناشتے کے لیے آپ کو زحمت دے کر شرمندہ ہوں۔“ شاہ سکندر دوپہر انہیں زحمت دینا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

”نہیں ناشتا کریں، ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“ میمونہ جہانی کہتے ہوئے چلی گئیں۔

”ہاں، کیا کہہ رہے تھے آپ، کب بلایا ہے جہانگیر جہانی نے؟“ آسیہ نے میمونہ جہانی کے جاتے ہی

”پہلے میری پوری بات سنو، اس کے بعد کوئی فیصلہ کرنا۔“ شاہ جہانگیر نے اُسے ٹوکا۔

”باباجان! تیار رہنے منتظر ہیں۔ گوکہ ہم برطانوی نہیں کرتے لیکن انہیں اپنی عقل کا احساس نے خود سنا ایک دن بی بی جان سے کہہ رہے تھے کہ انہیں تیار رہا بات مان لین چاہیے؟“

دوری شدت سے غصہ کرتے ہیں سکندر، بہت آزدہ رہتے ہیں۔ اگر اُن کا سوال نہ ہو، منانے ضرور آتے۔ بہت جیت کرتے ہیں وہ تم سے ہم سب سے زیادہ جانتے ہوں، میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ انہیں اپنے سامنے جھکانے کے بجائے خود اُن کے ان سے معافی مانگ مان رہے جانتے گا، خوش ہو جائیں گے وہ پھر تیار رہے لیے کون مسئلہ نہیں ہوگا۔“

”آپ بھول رہے ہیں جہانی! میں اکیلا نہیں ہوں۔ آسیہ میرے ساتھ ہے جیسے اگر مجھ کے ساتھ شادی کو علم ہو گیا تو وہ؟“

”ایک منٹ یا۔“ شاہ جہانگیر فوراً اُسے روک کر کہنے لگے: میں نے یہ کب کہا کہ اُسے لے کر آؤ، بلکہ اُسے یہاں لانے کی غلطی تو کہیں کرنا بھی نہیں، بس تم اگر باباجان کو خامی کر دو، اپنی ہر بات منوالینا۔“

”مثلاً؟“ اُس کے استفاد میں ہلکا سا استہزا تھا۔

”مثلاً یہ کہ تم شاہ پور کے بجائے آسیہ کے ساتھ کراچی میں رہو گے اور مہینے میں دو بار بھی اپنا فرم بھجائے آجاؤ گے؟“ شاہ جہانگیر مثنوی خیر انداز میں بولے تھے۔

”کیا مطلب؟“ وہ پٹٹا لگیا۔

”مرد ہو مار! دو کیا چار۔ یوں رکھ سکتے ہو؟ شاہ جہانگیر نے خود ہی قہقہہ لگایا پھر کہ مذاق نہیں کر رہا۔ تم بھی جذباتی ہو کر مت سوچنا۔ سنجیدگی سے غور کرنا۔ سب سے مناسب مہرہ لٹاؤ جاتا ہے کہ تم دوسری شادی کر چکے ہو اُس کے باوجود تمہاری راہ دیکھتی ہے۔ اور تم سے جیت کی انتہا ہے جس نے اُسے اسٹیڈ لینے سے باز رکھا ہوا ہے؟“

”میں نے اُسے کبھی پسند نہیں کیا؟“ وہ جیسے اکتا کر بولا۔

”نہی، لیکن اُس کی جیت کو زندہ رکھو، یہ تمہارے حق میں بہتر ہوگا اور آسیہ کے لیے ہر ان باتوں میں میں آسیہ کا پوچھنا تو بھول ہی گیا۔ کسی ہے وہ؟“ شاہ جہانگیر نے اچانک میونہ جہانی کی طبیعت کو ٹھیک نہیں ہے۔ اور یہاں ریسٹ نہیں مل رہا تھا اُسے اس لیے کہ وہ میں نے اُسے اُس کے والدین کے پاس چھوڑ دیا ہے، ایک دو دن میں لے آؤں گا۔“

”کیا کر رہے ہو مار! پہلے تمہارا ایکسڈنٹ ہوا اب وہ بیمار ہے، تم نے تو پریشان کر دیا اچھی خبر نہیں ہے تمہارے پاس؟“

”اچھی خبر بھی سن لیں گے، شاہ سکندر اپنے آپ مسکرا رہا تھا۔

”ہاں! فوراً جلدی سنانا اور یہاں آکر۔ اُسے خدا حافظ؟“ شاہ جہانگیر نے سلسلہ متعلقہ کرا ریسور رکھتے ہوئے شاہ سکندر نے یوں سر بلایا جیسے اُن کی ساری باتوں کو فغول قرار جب سوئے کے لیے لیا تو اپنے منے کا کون اور حل سوچتے ہوئے اُس کا ذہن بار بار بار بار باتوں میں الجھ رہا تھا۔ اور وہ پوری رات اُس کی یونہی سوچتے اُٹھتے گزری تھی۔ صبح کے قریب پہنچ کر وہ بس تھوڑی دیر کے لیے سویا تھا پھر اُٹھتے ہی آسیہ کے پاس جانے کے لیے تیار ہوا۔

”آسیہ کو کسی وقت ڈاکٹر درپ لگا کر گیا تھا جسے دیکھ کر وہ کہنے لگا۔

”مریض کو چند گھنٹے مکمل آرام کروانے کا یہ بہترین طریقہ ہے۔ خصوصاً تم جیسی خات

”فضول کام کرنے کا بہت شوق ہوتا ہے۔“

”جناب کوئی کام فضول نہیں ہوتا۔“ وہ تکیہ سیدھا کر کے سرو پنا کرتے ہوئے بولا۔

”کیا آپ نے یا نہیں؟“

پھر وہی بات چھیڑ دی۔  
”یہ پوچھنا تو نہیں بھول ہی گیا کہ وہ اسلام آباد میں کب تک رہیں گے، پھر اسی حساب سے طے کر لیتا۔“ شاہ سکندر نے سرسری انداز میں کہا۔

”آپ کو جہاں گھر جانی سے ملتا تو ہے اور ابھی میں یہاں ہوں تو آپ آرام سے جا سکتے ہیں۔“ جیسا نا سب سمجھیں۔ ”آسیہ پہلے فوراً بولی تھی پھر احساس ہونے پر اس کی مرنی“  
”جوں۔“ شاہ سکندر نے ناشتے میں مصروف رہ کر سر ہلایا۔  
”ٹھیک کہتی ہو تم، اسے گھر میں پھر تنہا رہے اکیلے ہونے کا خیال ہو گا پھر واقعی میرا ہوجائے گا۔“ پھر گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں آج ہی کی فلائیٹ سے چلا جاتا ہوں۔ پرسوں کا آجافن کاگا۔“

آسیہ نے یونہی سر ہلادیا۔  
”اور پھر اسی وقت تم میرے ساتھ گھر چلو گی، میرا وہاں تمہارے بغیر دل نہیں لگتا۔“  
”پہلے میں کتنا غصہ اٹھا رہا ہوں۔ لیکن اب تو ایک ایک پل بھاری لگتا ہے اور سن لو“  
”تین دن کے لیے بھی یہاں نہیں چھوڑوں گا۔“ وہ ناشتا چھوڑ کر بوسے لگا تھا۔ اس کے نتیجہ میں جیت بھری دھولیں تھیں۔  
آسیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی۔

شاہ سکندر اپنی جگہ سے اٹھا اور پہلے اس کی ڈرپ چیک کی پھر جبکہ اس کی پیشانی پر ”تم میری جیت میری زندگی ہو اس“ تم سے ایک پل کی دوری میری جان پر بنا دی ہے۔  
”دکھا کر دے سوچ کر کہ میری سالنوں کی دور بہتار سے ساتھ بندھی ہے۔“  
اس کی غمتوں کی شد میں یونہی آسیہ کی پکیں غم کر دیتی تھیں۔ چپ چاپ سر کے لمحوں میں لمحہ بہت چپکے سے ان ہنسی کیوں پر لبیرا کر گیا تھا۔

”دھوپ کنارہ، شام ڈھلے  
تلتے ہیں دونوں وقت جہاں  
جورات نہ دن، جو آج نہ کل  
پل بھر کو امر، پل بھر میں دھواں  
اس دھوپ کنارے پل دو پل  
ہونٹوں کی لپک  
بانہوں کی چٹک  
یہ میل بہارا، جھوٹ نہ سچ  
کیوں زار کرو، کیوں دوش دھرو  
کس کا دن جھوٹی بات کرو  
جب تیری سمندر آنکھوں میں  
اس شام کا سورج ڈوبے گا  
سکھ سوئیں گے گھر دروازے  
اور راہی اپنی راہ لے گا



تقدیر بادر نے برس بعد شاہ سکندر کی گاڑی ہائی دے پر فرسے پھر رہی تھی۔ آسیہ کے پاس آنے کے بعد اس نے ایک بار پھر تمام حالات کو سننے سے سوچا تو اس پر باباجان کی حکمت پوری طرح واضح ہونے لگی تھی کہ کس طرح انہوں نے بظاہر خاموشی اختیار کر کے اسے ایک طرح سے مجبور بننے کی کوشش کی تھی اور کافی حد تک اس میں کامیاب بھی ہو گئے تھے کیونکہ اس نے الغور واپس کے علاوہ کسی اور جگہ نہیں آ سکتا تھا۔ اور اس نے واپسی کی تیاری کر لی لیکن اس طرح نہیں بیٹھے باباجان چاہتے تھے۔  
”اس نے سوچ لیا تھا کہ اب اس کی باری ہے۔ باباجان سے اپنا حق وصول کرنے کے لیے“  
”بوری پلاننگ کے بعد اپنا سفری بیگ اٹھایا تھا۔“

”وہی دکھائی دینے لگی تھی۔ اس دوران وہ جہاں خود کو باباجان اور بی بی جان کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرتا رہا، وہاں یہ خیال بھی تھا کہ اسے کسی طرح خود کو مجبور ظاہر نہیں کرنا بلکہ ان کی محبت میں وہ جیتنے کا لمحہ۔ اس کے علاوہ اس کی کوئی غرض نہیں۔ اس کے بعد باباجان کا رد عمل سوچتے ہوئے نے کئی مرتبہ بگاڑی تاڈی دو دونوں اطراف پھیلے تھیں تو اس میں کام کرتے مزارعوں نے حیرت و خوشی کے ساتھ تاثرات سے اسے دیکھا جبکہ اس کی نظرس جو پل پر بھی تھیں جس کے برے سے گیٹ پر موجود لے جانے تاثرات سے اسے دیکھتے ہی، بیشک کی طرح پورا گیٹ کھول دیا تھا۔ اور وہ بھی رُکے بغیر گاڑی اندر لے گئے۔ اس کی گاڑی سے اترا تب سوچ میں پڑ گیا کہ پہلے اسے کس کے پاس جانا چاہیے۔ باباجان یا بی بی جان۔  
”اور پھر کچھ طے کیے بغیر اس نے قدم آگے بڑھا دیے۔“

دوہرا کا وقت تھا۔ نالکھا سب کھانے کے بعد اپنے اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔ وہ طویل راہداری بزرگ راؤنڈ میں آیا تو سامنے سے گزرتی جیپ اس نے اسے دیکھ کر انتہائی بے یقینی سے پوری آنکھیں کھلیں۔  
”بی بی جان کہاں ہیں،“ شاہ سکندر پوچھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا تو جیپ اس کے بھلے نے جیپ میں آکر بیٹھ گئی۔

”ناں سس“ جیپ اس کی بدحواسی سے ناگواری سے سر جھکا تو نظر نیچے پر پڑی جو ٹیس کا کوڑے پر گر ہوئے کی کوشش کر رہا تھا۔ بالکل غیر ارادی طور پر وہ پوری طرح اس کے کچے کی طرف متوجہ ہو گیا جو دوڑ میں کوشش کے بعد مایوس ہو کر بیٹھ گیا پھر ٹھنوں کے بل ٹھینتا ہوا اس کی طرف آگے لگا۔ اور ایک قدم کے پھر کا دو باغوں نے بہت شغری سے اسے اٹھالیا۔ اور وہ جو بہت اشتیاق سے بچے کو دیکھ رہا تھا۔  
”کونفرس“ اٹھائیں تو سامنے مہرا لٹا، مٹی۔ اس کے دیکھنے پر بچے کو سنے میں چھپاتی لہرا کر بیٹنی ادبے نیازی بیڑیاں پر تھیں۔ اس کے کلابی پاؤں سرخ کارپٹ پر نشان نہیں چھوڑ رہے تھے پھر بھی وہ اس نش پاد کو تنہا رہ گیا۔

”اسے سکندر بدمعاش ہے۔“ شاہ جہانگیر کی آواز نے اس کی محویت کو توڑا تھا۔  
”ابھی۔“ اس ابھی آ رہا تھا۔ ”وہ چونک کر بولا اور بڑھ کر شاہ جہانگیر کے سینے سے لٹکا ہوا پوچھنے لگا۔  
”بھیک ہے ناں۔“

”ان کے آگے ہو تو سب بھیک ہو گا بی بی جان سے ملے، پھر پہلے ان سے مل لو۔ بہت یاد کرتی ہیں۔“  
”شاہ جہانگیر اس کی تندی آمد پر اندر ہی اندر حیران ہو رہے تھے اور بظاہر بہت خوش دلی کا برکتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگائے بی بی جان کے کمرے تک آئے اور دروازہ کھول کر انہیں مخاطب ہوئے۔

”بی بی جان، دو لکھیں کون آیا ہے۔“  
”نہ بی بی جان نے تھکے سے سر اٹھایا تو ان کے ساتھ شاہ سکندر کو دیکھ کر پہلے تو انہیں یقین نہیں آیا۔  
”میں تو گھر سے نکلتی اور دونوں بازو پھیلائے تو وہ بھی بے اختیار ہو گیا تھا۔ ماں جب تک نظروں میں تھیں تو کبھی بھولے بھنگے یاد آ جاتی تھیں اور اب وہ اپنے آپ پر حیران ہو رہا تھا کہ اتنا غصہ وہ ان

مہر النساء کے پورے وجود میں جیگا گریاں مہر گئیں۔ ایک لمحے کو ہونٹ بیٹھے مہر اس کا ہاتھ کیچ کر بول۔  
 اُنھیں شاہ شہزادہ سمندر نے دُسی اُنھیں گھوڑیں لیکن جب مہر النساء کا چہرہ نظر آیا تو فوراً آؤٹ کر بیٹھ گیا اور  
 ہونٹ پھٹک کر پھٹا۔  
 ہوں باتوں کی انگلیاں باؤں میں پھنسا کر پوچھا۔  
 توں کہا تم نے؟

ابا جان ہمارے ہیں :-  
 ابا جان آگئے بارہ ہفتہ بیچ کر کرا کے دیکھنے لگا ۔  
 ابی اور اک کا انتظار کر رہے ہیں قمبر السدا کہتے ہوئے کمر سے نکل گئی ۔  
 چوہر بعد شاہ سکندر نے ابا جان کے کمرے میں داخل ہوکر انہیں سلام کیا تو جواب میں وہ اپنی جگہ سے  
 نہ کھڑکی باز نہیں ہوا ، بولے :-

شاہ سکنہ کے ان کی طرف بڑھتے قدم وہیں لڑک گئے۔ اور ان کے سینے سے لگنے کی خواہش و باکر مضبوط

ایک غلط کھمے باباجان! میں معمولاً نہیں ہوں۔  
 ہم نے تو یوں ہی ایک بات کہہ دی، برخود دار اور تمہارے ارادوں کی مضبوطی ہم سے زیادہ کون  
 جان سکتا ہے۔ خیر، رک کیوں گئے؟ آؤ گلے لگو، ہمارے باباجان خوش دلی، فرخاندگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے  
 ایک قدم اگے بڑھتے تو فوراً درمیانی فاصلہ سمیٹ کر ان کے سینے سے جا لگا۔  
 خوش تو ہوناں؟

ہجری۔ دعا میں ہم آپ کی یہ وکھل کر مسکرایا۔  
 ہستے رہو باباجان اُس کے کندھے پر دباؤ ڈال کر اپنے ساتھ بھلتے ہوئے پوچھنے لگے۔ کہاں ہوتے  
 ہوجائے گئے؟  
 ہار کر جی میں شاہ سکندر نے اُن کے انجان بننے پر بغور انہیں دیکھا پھر سر جھکا کر کہنے لگا۔ میں آپ کو  
 براہِ راست کر کے نہیں جانا چاہتا تھا باباجان! اگر آپ اُس وقت میری بات مان لیتے تو میری خوشیوں میں آپ  
 بھی شریک ہو سکتے تھے۔

”جسے فرشتی کہہ رہے ہو اُسے تم تسلیم نہیں کرتے اور بہتر ہوگا جو تم ہمارے سامنے اس کا ذکر نہیں کرو۔“ بابا جان نے واضح الفاظ میں ٹوک دیا۔

اپنے بچے سے ملے، اُس قدر سے توفیق سے بابا جان نے موضوع بدل کر بھی ایک طرح سے اُس پر جتا باکروہ مہر النساء کو تسلیم نہ کرنے کا دغا نہیں کر سکتا۔

”خوش نہیں ہوئے۔ وارث ہے تمہارا باباجان کو اس کا انداز پسند نہیں آیا۔“

دارت یہ وہ تبلیغی سے گویا ہوا "سیری کون سی جاہلادوں کھڑی ہیں جس کے لیے میں "۔  
 "میں نے تیس عاف و تینس کیا " باباجان فوراً بولے تھے۔  
 "تو تیرے ساتھ جانا تھا " وہ سوچ کر رہ گیا اور مزید تبلیغی سے بچنے کی خاطر وہاں سے اُٹھنے کا بہانا ڈھونڈ رہا تھا۔  
 "میں یہاں پر آگئے " ایک نظر اُسے دیکھ کر باباجان سے پوچھنے لگے۔

ہاں میں نے مسکند بھی جانے لگا ہمارے ساتھ : بابا جان نے کہا تو وہ چوک کر بولا۔

اس میں تیراں جوئے والی کیا بات ہے کیا پہلے تم بابا جان کے ساتھ نہیں جاتے رہے؟ شاہ جہانگیر نے

سے دھڑکیاں مارتا رہا۔ بہت سی باتیں سننے کے بعد کوئی اس طرح بھی ماں سے ناراض نہ ہو سکتا تھا۔ ”بی بی جان اُس کا پرانا  
میں تمام تر شکوہ کرنے لگیں۔ وہ چپ چاپ سنتا رہا پھر اُن کے حُسنِ اول پر ہنسنے لگا۔ اُس نے اُن کو دیکھ کر ہنس کر  
کہہ دیا۔

”بی بی جان! تم تک ہوا آیا ہے اس سے کھائے وغیرہ کا تو پرہیز نہیں“ اس کے ہونٹوں پر اسے کاٹا مٹھا پہلے شاہ جہاں تک بول پڑے۔

”نہیں بس۔ اس وقت جھوٹا ہے۔“ اس نے کھانے کا منع کر دیا۔  
”تو کوئی خاتمہ؟“ اس نے پوچھا۔  
”نہیں۔ اس وقت جھوٹا ہے۔“ اس نے کھانے کا منع کر دیا۔  
”تو کوئی خاتمہ؟“ اس نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے پہلے میں باباجان سے مل لوں۔“

”بابا جان نوربانو! میری باتیں سنیں۔ اُس نے سوائے نظروں سے بی بی جان کو دیکھا۔  
 ”خیریت۔ آپا نوربانیک تو میں ناں“ اُس نے سوائے نظروں سے بی بی جان کو دیکھا۔  
 ”ہاں ٹھیک ہے نوربانو اور شہر بانو بھی، ابھی تو م آئے ہو۔ دو چار روز میں جا کر بہنوں سے“

”جو تکوین میں ہیں سیکھ اُن سے تو ملنے دس بی بی جان اسے“۔ شاہ جہانگیر کا اشد امیر المفسر کا:

”جو کھڑکی میں بیٹھے ان سے کہنے لگیں بی بی جان! اور بی بی جان نے غالباً دھیان نہیں دیا۔“

وہ کن اکسیر سے شاہ جہانگیر کو دیکھتا کرے سے نکلی آیا اور لاؤنج میں رنگ کر انتظار کرنے لگا کہ شاہ جہانگیر اس کے دھمکے آئیں گے لیکن وہ جلنے قصداً بی بی جان کے پاس نہ گئے تھے بارگاہِ یلغار

جہاں لکھنؤ کے لیے آئے تھے وہاں کے لوگ ان کے لیے ایک بار بھیڑ کر گیا۔ وہ کچھ دیر تک ان کے بعد سیڑھیاں چڑھتا اور آگیا تو اپنے کمرے کا دروازہ کھلا دیکھ کر ایک بار بھیڑ کر گیا۔ مہر ابراہیم کو اس موقع پر کچھ شش و پنج میں ڈال دیا تھا۔ غالباً انہی پرانے گھر میں وہ اس لڑکی کو بھیڑ لیا۔

مہر النساء کی عمر خود ہی نے سس و سولہ سال لکھا تھا۔ عائشہؓ نے یہ سن کر کہیں نہ کہیں اس کی طرف اشارہ کیا۔

کر کے وہ کمرے کے دروازے تک آیا تو سب کے بیدار ہو گئے۔ سوچا کہ اس چور کی ہمت  
تک پہنچے گا کہ بارے میں اس کے ذہن میں کوئی سوال نہیں تھا اور اب اچانک ذہن میں جھماکا  
وہ دم الزامہ لگ رہا ہے اس نے اسے بائیل میں دیکھا تھا۔ غالباً ڈیویری کے لیے اس نے غصے

”وہ مہر النساء ملی سکندرائیں گے اسے ہاپس میں دیکھا جاتا ہے۔“

اُس وقت اس نے چار لڑکیوں کو جاکھیں اب اپنی اُنھوں کے دیکھ کر بے اختیار آگے آکر بولا۔

”یہ میرا بچہ ہے“  
عبدالغفار نے چونک کر اسے دیکھا اور فوراً ہی نظروں کا زادیہ بدل گئی تو وہ اپنی بے اعتیاری پر

”کیسی ہو تم؟“

مہر النساء نے سر جھکا لیا۔ جانے پنجاب تھا یا ناراضگی کا اظہار۔ وہ کچھ دیر رک کر وارڈ روم کی گلیاں گھبراہٹ سے گزرتی ہوئی گئی۔

”میں سونا چاہتا ہوں، تم بی بی جان کے پاس چلی جاؤ۔“

شام اتر رہی تھی جب بابا جان کے کہنے پر مہر النساء نے کمرے میں آکر پہلے کھڑکیوں سے پردہ  
محمود حمزے سے شاہ سکندر کا بازو ہلایا تو وہ غنیمت میں بڑبڑایا۔

158

اُسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

”ابھی بھی جلنے لگا۔ کیوں سکندر؟ بابا جان نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے مخاطب کیا تو وہ دیر سوچنے کے بعد بولا ہوتا۔

”جی چلوں گا پھر اُن سے اجازت لے کر کمرے سے نکل آیا۔

بی بی جان نے رات کے کھانے میں اُس کی پسندیدہ ڈشز بتوائی تھیں اور وہ کھانے کے لیے بیٹھ لیکن اُس کا ذہن تخیلت سوچوں کے تانے بانے میں الجھا ہوا تھا۔ مزید سب کے رویے حیران کر رہے۔ کیونکہ اُس کے خیال میں اُسے یہاں آتے ہی پہلے بابا جان اور بی بی جان کی ناراضگی کا سامنا کرنا تھا۔ معافی مانگ کر انہیں مناسک کا مرحلہ تک نہیں یہاں اُس کے برعکس اُس کے اقدام کو کوئی اہمیت ہی نہیں جاری تھی گویا اُس کا جانا اور آنا معمول کی بات ہو۔ اور ظاہر ہے جب معافی کی لڑائی کا مرحلہ ہی نہیں وہ کس بنیاد پر اپنی شرائط بیان کرتا۔

”کیا بات ہے۔ دوپہر میں بھی تم نے کھانے سے انکار کر دیا تھا اور ابھی بھی کچھ نہیں لے رہے بی بی جان نے اُسے سوچوں میں گم دیکھ کر کہا۔

”جی بس۔ میں کیا چکا، وہ کرسی دھکیل کر اُٹھ کھڑا ہوا اور جیراں سے چلنے کا کہہ کر باہر لان میں نکل حقیقتاً اُسے بہت گھٹن تھا احساس ہوئے لگا تھا۔ اپنوں کے درمیان ان کی محبتوں کے باوجود اُسے رہا تھا جیسے وہ مہر کسی پتھر میں چھس گیا ہے

تم کو میرے سوا اور میرے ساجنا  
اب نہ دیکھے کوئی دوسرا  
میں تیری دھوپ ہوں تو بے سایا میرا  
زندگی کے عوض پیار یا تیرا  
تو رہے ہمسفر تو یہ نہی ڈگر  
بنی جانے کی پھولوں بھرا راستہ  
تم کو میرے سوا اور میرے ساجنا  
اب نہ دیکھے کوئی دوسرا

آسیہ بڑی مگن سی گنگناتی تھی۔ آنکھوں میں جانے کس خیال کی چمک تھی۔ سبزی بناتی ہوئی میمونہ نے دو تین بار اُسے دیکھا لیکن ٹوکا نہیں۔ شاید اُس کے ہونٹوں پر چمکتا گیت انہیں اچھا لگ رہا تھا

رات دن کا جو یہ عجیب کھیل ہے  
ہے خدائی کہیں اور کہیں بیل ہے  
عمر فانی وہی، یہ کہانی وہی  
لوگ رکتے ہیں، رگڑنا نہیں قافلہ  
تم کو میرے سوا اور میرے ساجنا  
اب نہ دیکھے کوئی دوسرا

”واہ۔ کیا خوبصورت گیت ہے۔ میمونہ بھابی نے بے اختیار تعریف کی۔

”شکریہ اویسے میرا نہیں ہے۔ وہ مسکرا کر بولی۔

”ارے جراتیجا کا دے اسی کا۔ اور تم سے اچھا۔“

”بس بس۔ زیادہ تعریف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے چاہیے میری آواز کیسی ہے۔“ وہ خود اُڑ کر بولی اور ہاسکٹ میں سے گارجا خاگر کھانے لگی۔

”اور بھی لے لو۔ میں اب پکانے جا رہی ہوں۔ میمونہ بھابی پھیلاوا سیٹھے ہوئے بولیں۔

”بس بس، کافی ہے۔ اور سلا میں کٹ دیجیے گا۔ بلکہ لائے میں کٹ دوں۔ یوں بھی ناراض نہیں ہوں۔“ اُس نے ہاسکٹ اپنی طرف پھینچ لی اور میمونہ بھابی باقی چیزیں اُٹھا کر کچن میں چلی گئیں۔

”آسیہ۔“ اماں جی نے اپنے کمرے سے نکل کر اُسے پکارا۔

”بی اماں جی۔“ اُس نے جواب دیا تو اماں جی قریب آ کر بولیں۔

”وہ۔ وہ تم نے نالو کا کہا تھا۔ عدیل سے معلوم کیا، کیا کہتا ہے وہ؟“

”انہیں کوئی اعتراض نہیں۔ آپ آبا جی سے پوچھ لیں پھر چلیں گے۔ وہ ہاسکٹ ہٹا کر اماں جی کے پیچھے کھینچتا ہوا چلا۔

”تھارے آبا جی سے تو پوچھ لیا ہے اور وہ سکندر کب آئے گا۔ وہ بھی ساتھ چلتا۔“

”سکندر۔ دو دن میں آئے گا کہہ گئے تھے۔“ اُس کا انداز سوچتا ہوا تھا۔

”آج تیسرا دن ہے۔“ اماں جی نے کہا تو وہ جو بھنگ کر بولی۔

”جی۔ ہو سکتا ہے آج آجائیں۔“

”بس تو اس کے آئے پر چلیں گے۔ اب دیر نہیں ہونی چاہیے۔ بڑے کی طرف سے تو اللہ کا شکر ہے اطمینان ہو گیا ہے۔ ایک یہ عدیل رہ گیا ہے۔ اس کی شادی ہو جائے تو پھر میں اور تھارے آبا جی بڑے کے پاس قہر جائیں گے۔“

”ج کے لیے، وہ خوش ہو کر بولی۔

”ہاں بیٹا، ذرا عار و قسمت میں رچ کھلا ہو۔ بڑی آرزو ہے مکہ مدینے جاؤں۔“ فرط عقیدت سے اماں جی کی آنکھیں جھپک گئیں۔

”انشاء اللہ اماں جی آپ منور جائیں گی اور اب تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ بڑے بیٹا وہاں ہیں۔

”آرام سے آپ کرو اور آبا جی کوچ کرائیں گے۔“ اُس نے اماں جی کے ہاتھ تھام لیے۔

”آسیہ! اٹھا! فون ہے۔“ میمونہ بھابی پکار رہی تھیں۔ ”وہ“ سکندر کا ہو گا کہتے ہوئے بہت عجلت میں اُٹھ کر بھاگی تھی۔

”جیت کسی ہے تمہاری؟“ ادھر سے شاہ سکندر نے پھوٹے ہی پوچھا۔

”بہت بہتر۔ آپ سنائیں، میرا تو خیال تھا آج آپ خود آئیں گے۔ اور ابھی اماں جی سے میں یہی ہر رہی تھی۔“

”ہاں! نا تو تھا لیکن ادھر بابا جان! میرا مطلب ہے جہانگیر بھابی بابا جان کے کسی کام میں اُلجھے ہوئے بسا اُن کے ساتھ ہی آؤں گا۔“ شاہ سکندر بہت شہل کر بات بنا گیا۔

”کب آئے؟“ دونوں میں سے اُس نے خود پوچھا۔

”میں بھی بتا رہا ہوں، کچھ دن لگ جائیں گے۔ تم نکل نہیں کرنا۔ کوئی پراہم قرین نہیں ہے تمہیں؟“

”نہیں۔ آپ بتائیں، ٹھیک بھابی کے ہاں گئے تھے۔“ اُس نے ایک دم خیال آنے پر پوچھا تو وہ قدرے لکڑ بولا۔

”ابھی تو نہیں گیا۔ موقع ملا تو جاؤں گا۔“

”اچھا سنیں۔ ابھی اماں جی نالو کے ہاں جانے کی بات کر رہی تھیں۔ وہ عدیل بھابی کے سلسلے میں کہہ رہی تھیں آپ آجائیں تو پھر میرا مطلب ہے آپ کو بھی ساتھ چلنا ہے۔“ اُس نے ایک طرح سے اُسے جلدی سے لکڑ بولا۔

”یہ ضرورتوں کے معاملات ہیں یا راتم جلی جانا۔“ وہ گھریلو گفتگو سے پہلو تہی کرتے ہوئے بولا۔ ”سُنو کوئی ضرورت کی بات کہو تو میری سماعتوں میں ہمیشہ کے لیے امر ہو جائے۔“

”جیلے جی! ڈرگٹن کا کاروبار چلے۔“ وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔ اور فوراً خاموش ہو گئی۔ کیونکہ ادھر سے میمونہ بھابی کی آواز اُس کی سماعتوں سے نکلائی تھی۔ ایک لحڑک کر پوچھنے لگی۔ ”کون ہے سکندر؟“

”کہاں؟“ ادھر سے بے دھیانی میں کہا گیا۔

”آپ کے اس پاس“ وہ چہاٹگیر جانی کی۔ وہ اسی قدر کہہ کر خاموش ہو گیا۔ تو وہ فوراً بولی تھی۔

”بجائی ہیں، میری بات کرائیں ان سے“  
”نہیں، پھر کسی وقت، اچھا خدا حافظ“ شاہ سکندر نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ تو وہ اس کی اتنی احتیاط پر ہنسنے لگی تھی۔

پھر اس نے اماں جی کو شاہ سکندر کی مصروفیات بتا کر اسی روز ان سے نالند کے ہاں پہنچے ہمارے کیا تو میمونہ بجائی نے بھی اس کی تائید کی۔ ”ان کا کہنا بھی ٹھیک تھا کہ پہلے عورتوں کے درمیان بات اس لیے شاہ سکندر کا جانا کوئی ضروری نہیں ہے۔ یوں شام میں جلتے کاسٹک کے اس نے ابا کی کمر پر نالند کی امی کو فون کر دیا تھا۔

نالند کی امی کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ کسی خاص مقصد سے آرہی ہے اس لیے انہوں نے نالند کو کوئی ہمارے نہیں دی تھی۔ جب تک کسی کو دیکھتے ہی وہ اپنے لالہ ابالی انداز میں بھاگ کر اس کے گلے لگتے ہوئے کہتا تھا: ”کہاں ہوتی ہیں آپ؟“

”نہیں، اسی شہر میں، اسیہ سکندر کی۔“  
”لیکن اپنے گھر میں نہیں ہوتیں۔ پرسوں میں اور بجائی جان گئے تھے۔“  
”ہاں میں آج کل اماں جی کے پاس ہوں، اسیہ نے اماں جی کی طرف دیکھ کر کہا تب نالند کو اماں اور میمونہ بجائی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ فوراً اسیہ سے الگ ہو کر بولی۔

”السلام علیکم“  
”جیتے رہو، اماں جی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔“  
”میری طرف سے خوش رہو، میمونہ بجائی فوراً کھٹی مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔

”بیٹھیں پلیر، میں امی کو بلاتی ہوں،“ نالند کمرے سے نکل گئی۔  
”اچھی لڑکی ہے۔ اسے مزاج کی۔“ ہے ناں ماں جی، میمونہ بجائی بیٹھتے ہی اماں جی کو مخاطب کر کے بولے۔  
”ہاں۔ اس کی ماں بھی اچھی عورت ہے۔“ اماں جی نے کہا تب ہی نالند کی امی آگئیں۔ اسیہ کے ساتھ بجائی نے بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر انہیں سلام کیا تو جواب کے ساتھ وہ انہیں بیٹھنے کا اشارہ کرتی۔

”اٹا کے پاس جا بیٹھیں۔ اور ان کا حال احوال پوچھنے لگیں۔“  
”بس موسم بدلتا ہے تو جوڑوں کا درد شروع ہو جاتا ہے۔ رات اسیہ نے دوا لکھ کر دی تھی۔ اس کا فیائدہ ہوا ہے۔“ اماں جی اپنا احوال سنارہی تھیں۔  
”میں نالند کے پاس جا رہی ہوں، اسیہ نے سرگوشی میں میمونہ بجائی سے کہا اور اٹھ کر کمرے سے آئی۔ اس کے لیے یہ گھر اجینی نہیں تھا۔ لابی سے گزر کر کچن کی طرف جا رہی تھی کہ احمد حسن کو آتے دیکھ گئی۔

”ارے آپ یہاں ہیں۔ میں آپ کی طرف سے ہو کر آ رہا ہوں!“ احمد حسن نے قریب آ کر کہا۔  
”جی۔ نالند نے بتا لیا ہے پرسوں بھی آپ لوگ گئے تھے۔“  
”تو کہاں ہیں آپ لوگ؟“ احمد حسن نے برجستہ پوچھا۔  
”سکندر اسلام آباد گئے ہوئے ہیں اور میں اماں جی کے پاس ہوں، اس نے بتایا تو احمد حسن سے بولا۔

”کمال ہے، سکندر نے مجھے اسلام آباد جانے کا بتایا ہی نہیں اکب گئے ہیں،“  
”میں چار روز ہو گئے ہیں۔ اور غالباً اتنے ہی دنوں بعد آئیں گے۔“ اس نے خوب سے قیاس کر کے تبھی نالند ڈرائی دیکھتے ہوئے پچھلے نکلی اور ان دونوں کو رستے میں کھڑے دیکھ کر کہتے ہوئے بولا۔  
”آپ لوگ بیٹھ کر بھی بات کر سکتے ہیں۔ خیراب یہاں کہیں بیٹھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے میں چلیں۔“

”اور کون ہے آپ کے ساتھ، عدیل بجائی؟“ احمد حسن نے لوازمات سے سبھی ڈرائی پر نظر ڈال کر اس سے پوچھا۔  
”میں، اماں جی اور میمونہ بجائی ہیں۔ چلیں آپ بھی، اسیہ نے نالند کے پیچھے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

”آپ چلیں، میں پیچ کر کے آتا ہوں،“ احمد حسن اپنے کمرے کی طرف ڈھکیا گیا۔  
”وہ ڈرائیج روم میں آئی تو غالباً اماں جی اپنی آمد کا مقصد بیان کر چکی تھیں۔ جب ہی نالند کی امی نے اسے فوراً واپس جانے کا اشارہ کیا جسے دیکھ کر وہ عقب سے سرگوشی میں بولی تھی۔

”یہاں تمہاری شادی کی بات ہو رہی ہے۔“  
”ہیں،“ نالند نے بولنا کر اسے دیکھا اور اس کی معنی خیز مسکراہٹ سے گھر اگر بھاگ گئی۔  
”احمد حسن کی امی نے سوچنے کو وقت مانگ کر ایک طرح سے نیم رضا مندی کا اظہار کر دیا تھا۔ گھر آتے ہی میمونہ بجائی، عدیل بجائی کو جمعیت دے ہوئے بولیں۔

”اف، تمہاری جھوٹی تقریریں کر کر کے میں نے اپنا نامہ اعمال خراب کر لیا۔ اللہ تو بہ۔ اللہ معاف کرے مجھے۔“  
”کبھی معاف نہیں کرے گا اللہ آپ کو، عدیل بجائی چڑ کر بولے۔

”ہاں تمہارے عیب چھپانے کا گناہ قابلِ معافی تو نہیں ہے پھر بھی اللہ بڑا مہربان ہے،“ وہ عدیل کے چڑنے پر لکھنا کر بولی تھیں۔

بابا جان مسلسل شاہ سکندر کو اپنے ساتھ مصروف رکھے ہوئے تھے۔ تیسرے دن بمشکل اسیہ کو فون کرنے کا موقع ملا تھا اور اسے اپنے مزید چند دن اسلام آباد میں رہنے کا بتا کر وہ کسی حد تک اطمینان سے ہو گیا تھا۔ کیونکہ جس مقصد سے یہاں آیا تھا اس کے حصول تک وہ بابا جان کی کسی بات سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ ایک طرح سے ان کی خوشنودی ضروری تھی۔

اس وقت وہ بابا جان کے کہنے پر شہر بانو کے ہاں یعنی اپنے سے سہرا ل جانے کے لیے تیار ہو کر بیچے آیا تو بی بی جان کے پاس پوری سچ و صحت سے تیار کھڑی مہر النساء کو دیکھ کر دروازے میں ہی رک گیا تھا۔  
”جاؤ سکندر، گیا۔ بی بی جان اُسے دیکھ کر مہر النساء سے بولیں۔

”یہ میرے ساتھ۔“ وہ اس صورتِ حال کے لیے تیار نہیں تھا۔ پیشانی پر گہری لکیر نمودار ہو کر اس کی لب لباب جان کے نیکی نظر وں سے دیکھا تو وہ سر جھٹک کر پٹلا اور تیز قدموں سے باہر نکل گیا گاڑی کے پاس ڈرائیو موجود تھا اسے دیکھتے ہی دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔  
”تمہاری ضرورت نہیں ہے، تم جاؤ۔“ وہ ڈرائیو کو بیچ کر خود فوراً ٹیوٹک پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد مہر النساء چنے کو اٹھائے اس کے برابر آ کر بیٹھی تو اس نے جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھانی تھی۔

مہر النساء اس کے پیچھے بیٹھا گاڑی اور اب کرختگی دیکھ کر ہی خائف ہو گئی تھی۔ اندر ہی اندر ڈر رہی تھی کہ کہیں وہ اس کے گھر والوں کے سامنے بھی اس طرح پیش نہ آئے۔ شادی کے بعد پہلی بار اس کے ساتھ جارہا تھا اور وہ بھی اتنے عرصے بعد۔ اس تمام عرصے میں وہ کس طرح سب کو اپنی طرف سے اطمینان دلانی رہی تھی یہ تو وہ جانتی تھی اور اب یہ خدشہ بجا تھا کہ کہیں مہر نہ لوٹ جائے۔  
”جب اس کے بابا کی تحویل نظر آنے لگی تب وہ بہت جنت کر کے بولی تھی۔

”نہیں شاہ،“ ماں نے باؤ کے علاوہ اور کسی کو نہیں معلوم کہ آپ شاہ پور چھوڑ کر چلے گئے تھے؟  
شاہ سکندر کچھ نہیں بولا۔ لیکن اپنے اعصاب پر قابو پالیا اور غصا پر سکون نظر آنے لگا تھا۔  
”تو میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے شاہ ہارون سے سنا ہوا یوں بھی وہ اس کا عام زاد تھا

ہندومت والوں کو آتی ہے، وہ بڑبڑاتے ہوئے پھر دھیرے دھیرے چلتی اُس کے سامنے آکر کہنے لگی: ”ایک بات بتائیں شاہ! اُس نے آپ کو چھوڑ دیا۔ یا آپ خود اسے چھوڑ آئے ہیں؟“ وہ ہونٹوں میں دبا سگریٹ نکال کر اُسے دکھانے لگا۔

”اے، جس کی خاطر آپ مجھے بلکہ سب کو چھوڑ چکے گئے تھے؟“ مہر النساء براہِ راست اُس کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھ رہی تھی۔

”میں نے کہا کہ اُس نے مجھے یا میں نے اُسے چھوڑ دیا۔“

”میں نے نہیں، آپ کی والدہ سے میں نے خود کچھ لیا۔“ مہر النساء نے کہا۔

”اچھا! وہ اُس کی کچھ پر ذرا سنا۔ پھر لائبریریاں کرا کر اُس کے منھ سے شعلے کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”مہر النساء! تم اگر اُس کے بارے میں جان سکتی ہو تو یہ بھی جان لو کہ وہ میری بخت میری زندگی ہے۔“

”اور میں؟“ مہر النساء کی بے اختیاری نے اُسے مشکل میں ڈال دیا تھا۔ اور فوری جواب سے بچنے کی خاطر وہ سگریٹ آتشِ رطے میں سلنے لگا۔ اس کے بعد بھی سوچ کر بولا تھا۔

”میں بھاری حقیقت اور اہمیت سے انکار نہیں کروں گا مہر النساء! کیونکہ تم میرے بچنے کی ماں ہو۔ مجھے اگر تم سے نفرت نہیں تو نفرت بھی نہیں ہے۔ اور میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ تم دنیا دکھا دے کو حق میرے نام کے سہارے زندگی کو مارو اور اس امید پر کہ کبھی میں اسیہ کو چھوڑ کر تہذیبی طرف لوٹ آؤں گا۔“

”ہو سکتا ہے تمہیں بابا جان نے ایسا کوئی یقین دیا ہو کیونکہ وہ خود بھی یہی چاہتے ہیں بلکہ مسلسل اسی کو شش میں مصروف ہیں۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے مہر النساء! تم خود کو فریبِ مت دوڑ میں چند دنوں کے لیے تیار ہوں، واپس لوٹ جاؤں گا۔ میری طرف سے تمہیں پوری آزادی ہے اپنے بارے میں جو مناسب سمجھو سوچ لو۔“

مہر النساء کم کم ہوا کر رہ گئی تھی۔

شاہ سکندر نے خاموش ہو کر اُسے دیکھا اور مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر کے دوبارہ لیٹ گیا۔ لیکن اب بند اُس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

پھر صبح ناشتے سے فارغ ہوتے ہی شاہ سکندر والدین جانے کے لیے تیار ہو گیا اور حجاجان سے اجازت لینے اُن کے کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ شاہ جہانگیر آگئے، انہیں بابا جان نے بھیجا تھا۔ لیکن شاہ سکندر کے سامنے وہ بابا جان کا نام لیے بغیر کہنے لگے۔

”میں فارم پر جا رہا ہوں، تم بھی چلو، ذرا فراغت سے بیٹھیں گے۔ شاہ سکندر خود بھی اُن سے تنہا نہیں فرست سے بات کرنا چاہتا تھا۔ لیکن مہر النساء کا خیال آنے پر کہنے لگا۔

”مہر النساء بھی ساتھ ہے جہاں؟“

”لو گیا ہوا، وہ بھی چلے گی۔“ شاہ جہانگیر نے کوئی اہمیت نہیں دی۔

”لیکن اُس کی موجودگی میں؟“ مہر النساء کے آنے سے شاہ سکندر کی بات ادھوری رہ گئی۔

”اب کب آئے جہاں بی بی؟“ مہر النساء نے شاہ جہانگیر کو دیکھ کر پوچھا۔

”بس ابھی آ رہا ہوں۔ اصل میں فارم پر جا رہا تھا راستے میں خیال آیا کہ تم لوگوں کو بھی ساتھ لیتا چلوں۔ ذرا کب شب رہے گی۔ وہ آغا کہاں ہے؟“ شاہ جہانگیر نے آخر میں نیچے کا پلو چھو لو مہر النساء کے کمرے کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

”شہر بالو کے پاس ہے۔“

”اچھا! تم اُسے لے کر آؤ، ہم جب تک چچا جان سے مل لیں۔ شاہ جہانگیر نے شاہ سکندر کو چھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ اپنے کسی خیال سے چونکا پھر سر جھٹک کر اُن کے ساتھ چل پڑا۔

پھر چچا جان کے پاس کچھ دیر بیٹھنے کے بعد وہ دونوں باہر آئے تو مہر النساء شہر بالو سے تھکے ساتھ

اور اُس سے بہت دوستی بھی تھی۔ جب ہاس کے گلے لگتے ہی وہ سب بھول گیا۔ پرانے بلکہ خونِ رشتہ اور عہدِ جاوی ہو گئی تھیں۔

”تمہیں عید کا چاند بھی نہیں کہا جاسکتا سکندر کہ وہ بھی سال میں دو بار نظر آجاتا ہے۔ شاہ ہارون نے پُر خوش انداز میں اُسے بازوؤں کے حلقے میں بیٹھنے ہوئے کہا۔

”شاہ سکندر کے پاس جواب نہیں تھا تو زوردار قہقہہ لگا کر گویا اُس کی بات سے غلطوچار۔ مہر النساء نے ایک لحظہ کو رک کر دیکھا پھر مدھن کی آگے بڑھ گئی تھی۔

”کچھ دیر میں سارے گھر میں اُس کی آمد کی خبر ہوگئی تو سب اپنے اپنے کمروں سے نکلنے لگے۔ شہر بالو بے قراری سے جھانک رہی تھی۔

”کیسی بو شہر بالو! وہ شہر بالو کے سامنے کچھ چورسا بن گیا تھا۔

”اچھی بوں جہاں! آپ سنائیں، آپ تو! شہر بالو ایک دم خاموش ہو گئی۔

”ہاں، تمہیں پتا ہے میں اس وقت چائے پیوں گا۔“ اُس نے خوبصورتی سے شہر بالو کی بار مقل کی۔

”اور وہ بھی میرے ہاتھ کی۔“ شہر بالو بات سن جانے پر شکر کرتی کمرے سے نکل گئی تو وہ چوہا کی طرف متوجہ ہو گیا اور اُن کے پوچھنے پر اپنی مصروفیات بتانے لگا۔

”شاہ سکندر کا خیال تھا وہ شام سے پہلے گھر کی راہ لے گا لیکن رات کے کھانے تک تو اُسے وقت گزرنے کا پتا نہیں چلا اس کے بعد چچا جان نے زبردستی روک لیا کہ بغیر کسی حفاظتی انتظام رات میں سفر کرنا ٹھیک نہیں ہے۔

”بابا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اب کل کے حالات تم جانتے ہو۔ اور یہاں تمہیں پریشان کیا ہے۔ گھر میں بڑا شاہ ہارون اُس کے کندھے پر ہاتھ مار کر اٹھتے ہوئے بولا۔

”جیلاٹھ، سوئے کی بات کرو، غبارِ اولیٰ عید تو سوچا۔“

”بابا شاہ کہو۔“ وہ مہر کو گدیں ٹوٹے نیچے کو دیکھ کر مسکرایا پھر اٹھ کر شاہ ہارون کے راجیل پڑا۔ اُس کے پیچھے شہر بالو، مہر النساء سے سرگوشیوں میں جانے کیا کہی آرہی تھی۔ اُس نے کی کو شش نہیں کی پھر بھی ایک سوچ جلد اُس کی سماعتوں سے ٹکرایا تھا۔

”اب قابو کر کے رکھنا اپنے شاہ کو۔“

”مڈروم میں داخل ہوتے ہی اُس نے پہلے کوٹ اتار کر موف کی بیک پر رکھا پھر بیٹھ کر شہر لگا۔ اس کام سے فارغ ہو کر سیدھا ہوا تو دفتر مہر النساء پر بڑھی، وہ نیچے کو۔ میڈر پر لٹانے اُس کی فینڈر اور تھراس لے کر جا رہی تھی۔ اور اُس کے واپس آنے سے پہلے ہی وہ منہ ہاتھ دھو کر نیچے کے ایک طرف لیٹا اور کچھ دیر سوئے ہوئے نیچے کو دھینے کے بعد آنکھیں پر بازو رکھ اپنے گھر میں تو مہر النساء جہاں وہ کمرے میں داخل ہوتا وہ وہاں سے چلی جاتی تھی اور جہاں تھی پھر بھی وہ ایک سائے سے چلی گئی تھی تو لا شعوری طور پر وہ اُس کا انتظار کرنے لگا شہر بالو اس کی اس کا آنا یقین تھا۔ تسلی ویر گزر گئی اُس کے انتظار پر نیند غالب آگئی، اور وہ جھانک رہی تھی۔

رات کے کسی پہر کو ٹ بدلتے ہوئے شاہ سکندر کی آنکھ کھلی تھی تو کوئی کے پاس کھڑی ہو کو دیکھ کر وہ سیکلمت بیٹار ہو گیا۔ اور کہنیوں پر وزن ڈال کر اوچھا ہو کر میک سے ٹیک لگا بولا۔

”تم سوئیں نہیں۔“

”مہر النساء بڑی طرح چونکی اور پھر اُس پر بس ایک نظر ڈال کر رہ گئی۔

”کیا بات ہے۔ نیند نہیں آرہی۔“ اُس نے کارز سے سگریٹ کا بیگ اٹھاتے ہوئے بڑا سرسری انداز میں پوچھا۔

کھڑی تیز تیز جلنے کیا بول رہی تھی کہ انہیں دیکھ کر ایک دم خاموش ہو گئی جبکہ اُس کی آنکھیں ابھی بھی کچھ کھولے ہوئے تھیں۔  
 ”اچھی تو ہو شہر بانو؟“ شاہ جہانگیر نے آگے آکر شہر بانو کے سر پر ہاتھ رکھا۔  
 ”جی“ شہر بانو کا دھیان مہر لساؤ کی طرف تھا اس لیے بس جی کہہ کر رہ گئی۔  
 ”بارون نظر نہیں آ رہا؟“  
 ”انہیں حیدر آباد جانا تھا۔ سویرے ہی نکل گئے۔ اور آپ اتنی جلدی کیوں جارہے ہیں۔ شاہ رکتے۔“  
 ”بس، شاہ ایک کام ہے۔ پھر آؤں گا۔ چلو سکندر۔“ شاہ جہانگیر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔  
 ”اچھا شہر بانو، چلتا ہوں۔“ شاہ سکندر نے شہر بانو کو خود اٹھا لے کر اپنے لیے بہت جلدت کا مظاہرہ کیا تھا۔

مہر لساؤ، لطاف، خاموش تھی۔ لیکن اُس کے ہر انداز سے متغیر ظاہر ہو رہا تھا۔ اور یہ یقیناً اُس کے کام آسیرے کی گہری وابستگی کے اظہار کا نتیجہ تھا جسے وہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ کہ کل تک تو وہ ایسی نہیں تھی اُس سے لائق ظاہر کرنے کے باوجود اپنے جذبات کو چھپا نہیں یاد رہی تھی۔ شاید اس خوش فہمی بنا پر کہ وہ ہمیشہ کے لیے اُس کی طرف لوٹ آیا ہے۔ اور حقیقت بتووم ہوئے پر اُس کا تاملنا لفظی تھا۔ تمام راستہ بھی نیچے کی معصوم شہزادوں پر اسے بڑی طرح جھڑکتی رہی تھی اور اب ریشٹ ہاؤم کے ملازمین پر برس برس مہی تھی۔  
 ”اسے کیا ہوا ہے؟“ شاہ جہانگیر نے بہت آرام دہ انداز میں پوچھے ہوئے شاہ سکندر سے پوچھا تو اُس نے کندھے پر اٹکا کر لاعلمی کا اظہار کر دیا۔  
 ”کیا تم اسے خاموش نہیں کر سکتے؟“ شاہ جہانگیر کا انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہے ہوں کیسے مدد پر ”چلائے دیں بھائی، آخر وہ بھی انسان ہے۔ گھٹ گھٹ کر تو مر جائے گی تو وہ ابھی ناگوار ہی ہے کر بولا۔

”اس کے مرنے سے تمہارا ہی فائدہ ہوگا۔“ شاہ جہانگیر نے مذاق کہا اور سمجھنے کے باوجود بڑی طرح سلگ کر بولا۔  
 ”اب میں اتنا خود غرض بھی نہیں ہوں جہانگیر بھائی، کہ اپنے فائدے کے لیے کسی کی جان ہی لے لوں۔“

”بابا بابا۔“ شاہ جہانگیر کا استہزائیہ قہقہہ زور دار تھا۔ وہ بمشکل ضبط کرتا ان کے پاس سے اٹھ کر باہر نکل آیا تھا۔  
 چپے تھی وہ اکثر یہاں آیا کرتا تھا۔ کہیں باباجان کے کام سے اور کہیں یوہنی تفریح کی غرض سے۔ فیض آباد جب یہ دیوں کی آمد ہوتی اور بالٹوں سے یلوا بارش ملبہ رہا ہوتا۔ ابھی تو ہر طرف خشک تھے کچھ پڑے تھے۔ جنہیں وہ پیروں تلے روندتا بڑی دور نکل گیا۔ عجیب سی سبے بس تھی۔ وہ شان و شکرت جو اس کی ذات کا خاصہ تھی۔ جانے کہاں کون کئی بھی کر خود اسے اپنا آپ اجنبی سالک رہا تھا۔ بہت زیادہ وقت تو نہیں گزرا تھا۔ جب وہ باباجان سے اپنی ہر بات متوالی کرتا تھا۔ اور اُس وقت تک میں بھی نہیں تھا کہ کبھی زندگی میں یہ مقام بھی آئے گا کہ باباجان اُس کی بات سننے پر ہی آمادہ نہیں ہوں گے اور اُسے بھائی کا سہارا لینا پڑے گا، کتنا فزیب تھا اس سہارے میں۔ وہ پہلے جان ہی نہ پاتا تھا۔  
 ”کاش جہانگیر بھائی ہی میرے ساتھ فیئر ہوتے، کچھ نہ کرتے میرے لیے۔ مجھے تنہا چھوڑ دیتے تو اپنی زندگی گزارتا۔ ان کے ہاتھوں میں کچھ پتی ہیں۔ کہیں کس قدر بے مایا ہو گیا ہوں۔ وہ اپنی میں اس قدر محو تھا کہ گاڑی کا ہارن بھی سنائی نہیں دیا۔

”کہاں بنے جا رہے ہو یار۔“ شاہ جہانگیر نے تھوڑی اُس کے قریب لاکر کہا تو وہ رک کر کچھ نا سنجی کے عالم میں بھٹک گیا۔  
 ”میرے کسی بات سے ناراض ہوئے ہو؟“ شاہ جہانگیر گاڑی سے اتر کر اُس کے قریب چلائے۔  
 ”نہیں۔“ اُس نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔ ”وہ گہری سانس لینے کے بعد۔“ فقط مسکرایا۔  
 ”پھر یوں خفا خفا سے کہاں جا رہے تھے۔“  
 ”گپیں نہیں، بس کچھ پرانی یادیں تازہ کرنے نکل آیا۔ آپ کو یاد ہے ایک بار منہر کے اُس طرف خانہ بدوشوں کا قافلہ ان کے گھر آ گیا تھا۔ وہ ایک دم سے یوں ہو گیا تھا جیسے اُس وقت سے واقف ان ہی پرانی یادوں کو سوجھتا رہا ہو۔  
 ”ہاں۔“ درجے اپنی زندگی میں پہلا عشق اسی قافلے کی ایک لڑکی سے ہوا تھا جس کا مجھے اب نام بھی یاد نہیں، شاہ جہانگیر نے بڑے محفوظ انداز میں کہا۔  
 ”پہلا عشق۔“ اس کا مطلب ہے نہرت طول ہے؟ اُس نے فوراً گرفت کی۔  
 ”لیکن قریب ہی طرح اسیر لیس میں کسی کے ساتھ نہیں ہوا کہ گھر بار چھوڑنے کی نوبت آجائے۔“

شاہ جہانگیر بھی فوراً بولے تھے۔  
 ”تو انہیں آپ عشق تو نہ کہیں، دل لگی ہو سکتی ہے۔“  
 ”تو جی نہیں، یوہنی۔“ شاہ جہانگیر نے اس بات کو ختم کرنے کی غرض سے کہا اور اُس کے کندھے پر ہاتھ مار کر گاڑی میں بیٹھے گا اشار کیا تو وہ واپس کے راستے پر نظر لگتے ہوئے بولا۔  
 ”کہیں اپنی دور تک آیا ہوں۔“

”ہاں، کبھی کبھی خود کو بھی یاد نہیں چلتا۔“ شاہ جہانگیر کہتے ہوئے ڈرامائی سیٹھ کی طرف بڑھنے لگے کہ اُس نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر روک دیا۔  
 ”بھائی، سیرے میری بات سن لیں۔“  
 شاہ جہانگیر کو یاد پھر آئے دیکھنے لگے تھے۔

”میں آپ کے کہنے پر یہاں آیا ہوں۔“ وہ بغیر کسی تہد کے گویا ہوا۔ ”آپ نے تو کہا تھا کہ باباجان سے معافی مانگنے کے بعد سارا معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن یہاں تو وہی اول روز والی صورت حال ہے۔ باباجان کو اس کا ذکر تک سننا گوارا نہیں۔“

”تو تم نے کس نے کہا ہے کہ ان کے سامنے آسیر کا ذکر کرو۔ تم ہمیشہ حلد بازی میں حماقت کر جاتے ہو سکندر، پہلے تمہیں عملی طور پر ان پر یہ ثابت کرنا ہے کہ تمہیں مہر لساؤ کا بھی اتنا ہی خیال ہے جتنا آسیر کا۔ اس کے بعد تمہارا ہی کوئی بات سنی جائے گی۔“ شاہ جہانگیر نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔  
 ”اس میں بہت وقت لگے گا بھائی، اور میں اتنا عرصہ آسیر سے غافل نہیں رہ سکتا۔ مجھے ایک دو دن میں اس کے پاس جانا ہے۔“ اُس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے یوں کہا جیسے مزید رکنا تا ممکن ہو۔  
 ”کسی یوہنی میں بائیں کر رہے ہو، اس طرح تو تم بھی باباجان کو آسیر کے حق میں ہموار نہیں کر سکو گے۔“ وہ دن تو نہیں یہاں رہنا پڑے گا، شاہ جہانگیر رنج ہو کر بولے تھے۔

”میں آسیر سے صرف دو دن کا کچھ کر آیا تھا۔“  
 ”تو کیا ہوا؟“ وہ ماشاء اللہ بڑے سنجیدگی سے پوچھا۔  
 ”وہ دو کسے ہی آئے۔“ وہ جاہل خود کو کی طرح تھکے جرح تو نہیں کرے گی؟  
 ”وہ جرح نہیں کرے گی لیکن آپ نہیں سمجھیں گے کیونکہ آپ نے بھی عشق کیا ہی نہیں۔“ اُس کے بچے کی طرح نے شاہ جہانگیر کو خاموش کر دیا تھا۔

رات کا بھٹنے کو ن سہا پہر تھا۔ جب اچانک وہ نیند میں سے ہٹ بڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔ پتا نہیں کیا ہوا تھا



کہیں کوئی آواز نہ کوئی آہٹ نہیں تھی، اور اپنے زور زور سے دھڑکتے دل کی آواز اُسے صاف سنائی رہی تھی، کتنی دیر تک بیٹھے رہا پھر رکھ مدھمسی روشنی میں وہ چاروں طرف نظر میں کھانکھا کر دیکھ کر اپنے قریب سونیا کو دیکھا کہ شاید اس کو میند لوٹنے کا سبب سونیا ہو۔ لیکن وہ بے اثر نہ تھی پھر بھی اس کے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر اس نے دیر سے سے پکارا تو سونیا بس ذرا سا کر رہ گئی۔

تب کچھ حیران ہوتی وہ دوبارہ لیٹ گئی۔ لیکن میند یوں اُٹا ہوتی تھی جیسے وہ سر سے سر نہ ہو۔ کچھ دیر کر وہیں بدلتے کئے بعد اس نے زبردستی سونے کی کوشش ترک کر دی تو ذہن شاہ کو سوچنے لگا۔ آج سارا دن بھی دھیان اُسی کی طرف رہا تھا اور ابھی شاید حوالوں کی رائیڈز پر بھی وہ بہ حال وہ جو دودن کا کہہ کر گیا تھا تو پورے آٹھ دن ہو گئے تھے۔ اور بس وہی ایک بار فون کیا تھا کہ اُسے آنے میں کچھ دن لگیں گئے۔ گو کہ اس میں تشویش کی کوئی بات نہیں تھی۔ اور اب اس کی منظر میں تھی۔ لیکن اب چاہتا تھا کہ اس کے اطمینان میں دراز میں پڑنے لگی تھیں۔ شاہ سکندر کی طرف سے بدگمانی نہیں تھی۔ بلکہ اس کے بھائی شاہ جہانگیر کچھ پراسرار سے لگنے لگے تھے، جو شادی کے بعد اور ہوئے کہ پھر پلٹ کر جنر ہی نہیں لی۔ اور اب بھی شاہ سکندر ان کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ اسے وہ قصداً شاہ سکندر کے کام میں دیر کر رہے ہوں۔ پتا نہیں وہ چاہتے ہی نہیں یا کوئی اور مدد سوچتے سوچتے صبح کے قریب جا کر سوئی تھی اس لیے میندوں کے مطابق اُنھیں کا سوال ہی نہیں تھا۔ بھائی نے ناشتے کے لیے اُٹھایا تو اس وقت ذرا سی آنکھیں کھول کر اس نے نہ صرف ناشتے کو بلکہ بعد بھی اُٹھانے کو منع کر دیا تھا۔

پھر گیارہ بجے کے قریب شاہ سکندر کے فون پر میمونہ بھائی کو مجبوراً اُسے بھٹو ٹھانا پڑا۔  
”میتھارے سراج کا فون ہے، اس کو پھر سو جانا“ میمونہ بھائی نے اُس کے کان کے قریب اونچی آواز میں کہا کہ وہ فوراً اُٹھ لی، اور کان پر ہاتھ رکھتے ہوئے روٹھے لیجے میں بولی۔  
”یہ اُٹھانے کا لون سے طریقہ ہے؟“

”جیسے روٹھنے کی ضرورت نہیں ہے، اپنے سراج کی خبر لوجو ایک پل صبر نہیں کر رہے، سکندر آگئے کیا؟“ اُس کا اشتیاق بھانے نہ چھوڑا۔  
”جی نہیں، اُن کا فون ہے۔“ میمونہ بھائی نے کہا تو وہ اُٹھ کر لال میں آگئی۔ فون ابھی کے تھا اور وہ سکندر سے بات کر رہے تھے۔ اُسے دیکھ کر انہوں نے شاہ سکندر کو اس کی آمد کا بتا اُسے تھا دیا۔

”خیریت، کیا رات میں نہیں سوتی تھیں؟“ شاہ سکندر نے چھوٹے ہی پوچھا۔  
”بس رات کچھ سوئے جا گئے تھیں۔“ اُس کی آواز بوجھل ہو رہی تھی۔

”آپ سائیں ایک آرہے ہیں؟“ شاہ سکندر کی غیر یقینی اُس کے انداز سے ظاہر تھی۔  
”میں بس دو چار دن میں آ رہا ہوں۔“ شاہ سکندر نے غیر یقینی اُس کے انداز سے ظاہر تھی۔  
بات بھی بدل گیا۔

”سنو لے آجی خیال آیا تھا کہ آج تمہیں ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔ تم میمونہ بھائی کے ساتھ نہیں، آج میرا کہیں جانے کا موڈ نہیں ہے۔ کل چل جاؤں گی یا جب آپ آئیں گے؟“ اُس نے سستی سے کہا۔

”تم اپنا خیال نہیں رکھ رہی ہو اس، اس طرح کروں تو میں۔“  
”خندوں میں ڈوبی آواز کی گھبراہٹ انا جانک خاموش ہو گئی۔ شاید لائن کٹ گئی تھی۔ اُس نے کرپٹل پر ہاتھ رکھ دیکھا پھر مایوسی سے ریسپورڈر کو کہہ کر قدرے سست روی سے برآمد آ بیٹھی۔

”ناشتا کرو گی؟“ میمونہ بھائی نے کچن کی کھڑکی سے جھانک کر پوچھا۔  
”نہیں۔ صرف چائے پیوں گی اور وہ بھی نہانے کے بعد۔“ اُس نے اس خیال سے منع کر دیا کہ میمونہ بھائی اپنا کام چھوڑ کر اس کے لیے ناشتا نہانے نہ کھڑی ہو جائیں۔ اس کے باوجود جب وہ باگرننگی تو پورے میں چائے کے ساتھ ناشتے کے لوازمات بھی موجود تھے۔ اور ابھی وہ جائزہ لے رہی تھی کہ سونیا اور امراٹھوں سے آگئے۔

”جی بھی چھوڑیں گی ناشتا کروں گی؟“ سونیا نے اپنا بیگ اُتار کر تخت پوش پر بیٹھتے ہوئے کہا تو اصرار نے ذرا اُسے ٹوکا۔

”بھوک نہیدی! صبح ناشتا کیا نہیں تھا؟“  
”ہوں، بُری بات۔ تم بیٹھو سونیا، یہ میتھارے ہی لیے ہے۔“ اُس نے اصرار کو ٹوک کر سونیا کو ٹھایا پھر کھڑی دیکھ کر پوچھنے لگی۔  
”آج تم لوگ جلدی کیسے آگئے؟“

”آج ہمارا باپ ڈکے تھا۔ تھری فرسٹ ہے ناں؟“ سونیا نے حسبِ عادت قابلیت بتائی۔  
”اچھا ہاں۔ خیر تم دونوں ناشتا کرو، میں اسات جی کے پاس جا رہی ہوں اور دیکھو لڑنا نہیں؟“ وہ نرمی سے دونوں کو تنبیہ کرتی اسات جی کے پاس چلی آئی۔  
”کیا کہہ رہا تھا سکندر؟“ اسات جی نے اُس کے بیٹھے ہی پوچھا۔

”بات کہاں ہوئی اُن سے۔ لائن ہی کٹ گئی تھی۔“ وہ سرسری انداز میں جواب دے کر عمر کو گدگد لانے لگ گئی۔

”ابھی سونیا اور امراٹھ کی آواز آئی تھی۔ اسکول سے آگئے کیا؟“  
”جی اُدھر سے کمرے میں ہیں، خیر اب تو وہ میرا کمرہ نہیں ہے۔“ وہ کہہ کر خود ہی ہنسی۔  
”کیوں نہیں، ابھی بھی میتھارے، تم جب آؤ گی اسی میں رہو گی۔“ اسات جی کی فبت کے سامنے وہ غاموئی ہو رہی تھی۔

پھر دوپہر کے کھانے کے بعد جب میمونہ بھائی عمر کو لے کر اپنے کمرے میں سونے چلی گئیں تب دریت سے بچنے کی خاطر وہ سونیا اور امراٹھ کے ساتھ لٹو کھینچنے بیٹھ گئی۔ لیکن پہلے مرحلے پر ہی اُسے نیل آؤ گیا۔ اور اُس کی خالی جگہ کو دیکھتے ہوئے شدت سے اُس کی کمی محسوس ہونے لگی۔  
”تھیں ناں چھو پھو، آپ کی باری ہے۔“ اصرار نے اس کا ہاتھ ہلا کر متوجہ کیا تو وہ گہری سانس کھینچ کر بولی۔

”نہیں بس، میرا دل نہیں چاہ رہا۔“  
”خیر تم کو پورا کر س؟“ اصرار نے اصرار کیا۔  
”رات میں کھلیں گے، جب میتھارے عدیل چاہا بھی آجائیں گے۔“  
”عدیل چاہا میرے پارٹنر نہیں گے؟“ سونیا خوش ہو کر بولی۔  
”اور میں چھو پھو کا۔“

”ہاں ٹھیک ہے، جاؤ اب تم دونوں کچھ دیر آرام کرو۔ شام میں اُٹھ کر پہلے ہوم ورک کرنا، پھر کھلیں گے۔“ وہ اُٹھتے ہوئے بولی پھر دونوں کو سونے کے لیے اسات جی کے پاس بھیج کر لال میں نہر پھو بھائی کے بڑ بڑانے کرنے لگی۔

”خیر اب جب اُس نے فون کیا تھا تو نیل سے بات نہیں ہو سکی تھی۔ اُس کی ملازمنے بتایا تھا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ کہیں باہر گیا ہو ہے۔ اور ابھی بھی اُس کے پوچھنے پر ملازمہ نے وہی بات دہرائی اور اُسے دیکھا جیسے پہلے بھی اور ابھی بھی اُس سے جھوٹ بولا گیا ہے۔ اور ملازمہ خود سے تو جھوٹ بولی نہیں سکتی تھی۔ یقیناً بنیڈیکٹ کے کہا ہو گا۔ وہ کتنی دیر تک سوچتی اور کڑھتی رہی کہ آخر بنیڈیکٹ ایسا کیوں

کر رہی ہیں۔ حالانکہ اچھی طرح جانتی ہیں کہ نبیل اس سے کتنا مانوس ہے۔ اور جانے نبیل سے کیا گی، ہم سب سے متنفذ کرنے کی کوشش اور وہ ابھی نا کچھ بچتے ہی تو ہے۔

وہ یونہی سوچتے ہوئے لانی بی میں ادھر سے ادھر ٹپل رہی تھی۔ دو بہر کا وقت تھا۔ سب تھے۔ اور وہ کیونکہ دیر سے اٹھی تھی، اس لیے اب جھلکا بھر رہی تھی۔ کوئی کام بھی تو نہیں تھا۔ اور تو کون سا میونہ بھائی کرنے دیتیں۔ وہ سخت بور ہو کر شل فون کو گھومنے لگی۔ صبح شاہ سکندر سے سے بات نہیں ہو سکی تھی۔ اور اس کا کچھ بتا ہی نہیں تھا کہ کہاں چھڑا ہوا ہے۔ ورنہ وہ خود اسے فون اسے فون کرنے کے خیال کے ساتھ ہی اسے میونہ بھائی کی بات یاد آئی جو انہوں نے اسے شاہ پورہ بی بی جان سے بات کرنے کو کہا تھا۔

تب اس وقت اس نے ڈاکٹر کیڑی کھول کر شاہ پور کے منہ تلاش کیے اور شاہ حیات ٹھکانا کام کے منہ داخل کرنے لگی۔ کچھ ملی جلی سی کیفیت تھی اس کی۔ ڈر بھی لگ رہا تھا اور بی بی جان سے بات خوشی بھی تھی۔ دوسری طرف میل جا رہی تھی۔ پھر لیسور اٹھنے کے ساتھ ہنکارا بھرنے کے انداز کی آواز سنائی دی۔ تو وہ بہت سنبھل کر بولی۔

”وہ بی بی جان ہیں؟“  
”آپ کون؟“ خانی بارعب آواز تھی۔ وہ پہچانتی نہیں تھی، پھر بھی کچھ گئی باباجان ہوں گے نہیں تو کئی لینی کبھی تو ان سے بات ہوتی ہی تھی پھر انھی کیوں نہیں۔ اس نے سوچا اور پھر غصے جانتے کے لیے قدرے جتا کر بولی۔

”جی میں آسمیہ ہوں۔ آسمیہ سکندر حیات۔“  
”یعنی سکندر حیات کی۔“ سوچتے ہوئے انداز میں بس اسی قدر کہا گیا۔  
”بی بی۔“ وہ پوری جان سے متوجہ ہو کر بولی جیسے ان کی ایک انگ جنبش محسوس کر رہا ہے۔  
”کون سی بی بی، دوسری، تیسری، چوتھی۔“ اتنے آرام سے پوچھا گیا کہ وہ سٹپا گئی۔

”جی!“  
”ہم سکندر حیات کی صرف ایک بی بی کو جانتے اور مانتے ہیں۔ جیسے سکندر پوری شان و بیاہ کر لیا تھا۔ اور وہ ہے مہر النساء۔“ باباجان نے اس کے سر پر اٹیم ہم دے مارا تھا۔

”نہیں، آپ غلط کہہ رہے ہیں۔“  
”اپنی حیثیت جان کر بات کرو ورنہ! شاہ سکندر حیات نے اگر تمہیں اپنی رکھیل بنا کر رکھا معاوضہ بھی دیا تو یہ کتنا باباجان نے انتہائی شفا کی سے اس کی عزت و وقار کی دھجیاں اڑا دی ہیں اس کا پورا وجود جھٹکے کھانے لگا۔

”اور ایک رکھیل کی اتنی جرأت کہ وہ جاری بات کو غلط کہے۔ شاید تم جاری حیثیت و مز نہیں ہو یا پھر تمہیں بلیک میل کرنا چاہی ہو، کہہ کیا چاہیے تمہیں، لیکن ٹھہرو، مانگتے ہوئے نہیں جاری حیثیت رکھنا۔ ہم اپنے بیٹے کا ہدف دینے میں تاخیر نہیں کریں گے، باباجان کی سماعتوں سے گزرنی روح میں نشتر چھو رہی تھی۔  
اس کے ہاتھ سے ریسور چھوٹ گیا اور دوسرے پل اس کی دل در پیچ درو دیوار ہلا گئی تھی۔“  
”اماں جی!“



خاموشی کو چیتی ہوئی آسمیہ کی چیخ نے سوتے میں سب کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ سب سے پہلے میونہ بھائی نے۔ ”تال!“ اس کے کمرے میں کئی تھیں پھر ان ہی پیروں ڈرائنگ روم کی طرف بھاگ رہی تھیں کہ وہ فرش پر پڑنے لگی۔ دوہری ہوتی نظر آئی۔

”اسیوں نے لپک کر اسے کندھوں سے تھام کر سیدھا کیا تو وہ ان کے بازوؤں میں جھول گئی۔  
”جی، جلدی آئیں۔“ میونہ بھائی نے گھبرا کر اماں جی کو پکارا ”معا“ نظر ریسور پر پڑی جو اسٹینڈ سے نیچے اٹھا۔ انہوں نے فوراً ”تھام کر کان سے لگا کر سیلو کا تاوا دھر سے جیسے اعلان دی گئی۔

سکندر شاہ پور پہنچ چکا ہے۔“ اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔  
”ابا ہوا ہے۔“ ابائی اور ان کے پیچھے اماں جی بے حد گھرائی ہوئی تھیں۔ آسمیہ کی چیخ پر ہی ان کے ہاتھ پاؤں تھے تھے اور اب اسے فرش پر پڑے دیکھ کر تو رہے سے اوسان بھی خطا ہو گئے تھے۔

”ابا ہوا ہے میری بچی کو؟“  
”وصلہ وصلہ۔“ ابائی نے انہیں آسمیہ کے قریب نہیں جانے دیا اور پہلے بڑھ کر اس کے سر کے نیچے ہاتھ میونہ بھائی کو ادھر سے اٹھانے کا اشارہ کیا اور بے مشکل تمام اسے کمرے میں لا کر لٹاتے ہی بولے۔

”بی بی میونہ! خلیل یا عدیل کو فون کرو، جلدی ڈاکٹر کو لے کر آئیں۔“  
”ہون بھائی پوری بات سے بغیر فون کرنے دوڑ گئیں تو اماں جی، آسمیہ کے قریب بیٹھ کر اس کی ہتھیلیاں ملنے ان کے آنسو بڑی روانی سے بہہ رہے تھے۔

”ابائی! آپ بیٹھ جائیں۔“ میونہ بھائی واپس آئیں تو ابائی کو بے بسی سے ٹپکتے دیکھ کر کرسی ان کے سامنے لڑوئیں۔ پھر گلاس میں پیانی ڈال کر آسمیہ کے قریب آئیں اور اس کے منہ پر ہلکا سا چھینٹا مار کر گلاس اماں جی کو

”عدیل بھائی ڈاکٹر کے ساتھ آئے اس وقت تک سارے گھر یونٹے آزمائے جاتے تھے پھر بھی اس کی نئی ہونگی۔ اماں جی کی حالت کے پیش نظر عدیل بھائی کے اشارے پر میونہ بھائی انہیں وہاں سے اٹھا کر باہر لے گئیں۔ تب ڈاکٹر اسے چیک کرنے لگا۔

”ڈی پکنسٹ؟“ ”دھڑکنیں چیک کرتے ہوئے ڈاکٹر نے پوچھا۔  
”جی۔“ عدیل بھائی کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ بمشکل ڈاکٹر کو جواب دے سکے۔

”نڈی شاگ۔“ ڈاکٹر نے آسمیہ کو انجکشن لگانے کے بعد کاغذ قلم سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”میں میڈیسن لکھ کر باہر آؤں اگر آؤں گے۔“ انہیں ہوش آجائے تو یہ دوا میں ٹھیک رہیں گی۔ دوسری صورت میں ہاسپٹل لے

”جی۔ ابھی لے جاؤں؟“ ”عدیل بھائی نے فوراً ”پوچھا تو ڈاکٹر کندھے اچکا کر بولا۔  
”آپ کی مرضی اگر آپ آؤ گے۔“ انہیں انتظار نہیں کر سکتے تو ضرور لے جائیں۔“

”یہاں پلٹ کر ابائی کو دیکھا۔ ان کے ساتھ خلیل بھائی کھڑے تھے اور انہوں نے ذرا سانس فی میں سر ہلا کر گویا ”فورن ہسپٹل لے جانے سے منع کر دیا۔ تب عدیل ڈاکٹر کے ساتھ باہر نکل گئے۔

”میں نہیں دوا میں لے کر واپس آئے تو ابائی خلیل بھائی کو تار رہے تھے۔  
”میں نہیں معلوم، ہم سب سو رہے تھے۔ پتا نہیں آسمیہ کو کیا ہوا؟ بہت زور سے چیخی تھی اور ہمارے آنے پر ہوش ہو چکی تھی۔“

”اس سے پہلے، میرا مطلب ہے کھانا وغیرہ کھایا تھا اس نے۔“ عدیل نے پر سوچ انداز میں پوچھا۔  
”جی۔ ہمارے ساتھ کھانا کھایا اور اس وقت بالکل ٹھیک تھی بلکہ کھانے کے بعد سوئیا اور احمر کے ساتھ لٹو

بھی کھیل رہی تھی۔ ”اباجی نے بتایا تو دونوں بھائی ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ تب ہی میمونہ بھاگی۔“  
 ”اباجی! آپ اندر چلیں! ماں جی کو دیکھیں۔“ مسلسل روئے جاری ہیں۔  
 ”کہاں ہیں؟“  
 ”ادھر آئیہ کے پاس۔“

”وہاں کیوں جانے دیا ان کو۔“ اباجی کہتے ہوئے آئیہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ ان کے جانے لگے لیکن میمونہ بھابھی نے اشارے سے روک لیا اور جب اباجی آئیہ کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہاں دو بھائیوں کو دیکھ کر کہنے لگیں۔  
 ”آئیہ فون پر کوئی بری خبر سن کر بے ہوش ہوئی ہے۔“  
 ”آپ کو کیسے معلوم؟“ عدیل نے فوراً پوچھا۔

”تمہیں اباجی نے بتایا نہیں کہ وہ وہاں لائی میں بڑی تھی اور جب میں اس کے پاس پہنچی تو وہ رہا تھا۔ میں نے کان سے لگا لیا تو ادھر سے کوئی کہہ رہا تھا کہ سکندر شاہ پور پہنچ چکا ہے۔“ میمونہ بھاگی انداز میں بتا رہی تھیں۔  
 ”سکندر کا شاہ پور جانا تو کوئی ایسی بات نہیں ہے جیسے سن کر آئیہ شائد ہواؤ اور کیا بات ہوئی ہے تالی سے میمونہ بھابھی کو دیکھا تو وہ مایوسی سے سر ہلائی ہوئی بولیں۔  
 ”اور تو کوئی بات نہیں ہوئی کیونکہ ادھر سے فون بند ہو گیا تھا اور اس سے پہلے آئیہ نے کیا ناں کی۔“

”کیا ناں ہو گا آئیہ نے۔ کہیں خدا نخواستہ شاہ سکندر کے ساتھ کوئی حادثہ۔“ خلیل بھائی کا انداز سوچا۔  
 ”عدیل نے چونک کر انہیں پھر میمونہ بھابھی کو دیکھا تو وہ کہنے لگیں۔  
 ”خدا نخواستہ ایسی کوئی بات ہوئی تو ہم آئیہ کے سامنے تو ابھی ذکر نہیں کر سکتے ایسا کریں، آپ اپنے طور پر معلوم کریں کہ شاہ سکندر کہاں ہے اور خیریت سے ہے یا؟“  
 ”مم۔ میں جانا ہوں۔“ عدیل کہہ کر گھڑی دیکھنے لگے۔  
 ”کہاں جاؤ گے؟“ خلیل بھائی نے پوچھا تو وہ قدرے توقف سے بولے تھے۔

”شاہ پور۔“  
 ”میرا خیال ہے آئیہ کو ہوش میں آنے دو شاید اس سے معلوم ہو جائے۔“  
 ”نہیں تحلیل بھائی! آئیہ ہوش میں آجائے تب بھی اس سے کوئی سوال نہیں کچھ جیسے گا بلکہ بیانی کی کوشش کریں۔ میں شام تک لوٹ آؤں گا۔ کیوں بھابھی! ٹھیک ہے ناں؟“  
 ”عدیل نے آخر میں قصداً متفکر کھڑی میمونہ بھابھی کو مخاطب کیا تو وہ بس سر ہلا کر رہ گئیں۔  
 ”پریشان کیوں ہوئی ہیں! انشاء اللہ سب ٹھیک ہو گا۔ جائیے آپ بچوں کے پاس میں بھی چلتا۔“  
 ”خلیل بھائی؟“

عدیل نے خلیل بھائی کو دیکھا اور ان کی اجازت ملنے پر باہر نکل گئے۔  
 \* ☆ \* ☆ \*

عدیل کے پیش نظر صرف دو باتیں تھیں۔ شاہ سکندر کے ساتھ واقعی حادثہ یا پھر آئیہ کے ساتھ کیا ہے اور گوکہ مذاق اتنا سنگین تھا کہ ان کی بہن کی جان پر بتا گیا تھا پھر بھی تمام راستہ وہ یہی دعا کر رہی تھی کہ یہ مذاق ہی ہو اور شاہ سکندر خیریت سے ہو۔ اس کے علاوہ ان کے ذہن میں کوئی تیسرا تھا اس لیے جب وہ حویلی کے سامنے اترے تو فوری طور پر ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اندر کیسے

تعارف میں کیا کہیں۔ جبکہ چوکیدار منتظر کھڑا تھا۔  
 ”شاہ سکندر یا شاہ جہانگیر صاحب سے کہو۔ کراچی سے عدیل آئے ہیں۔“ عدیل نے قدرے تاخیر سے بار کو دیکھ کر کہا تو وہ فوراً پلٹ کر اندر چلا گیا، کچھ دیر بعد واپس آکر بولا۔  
 ”دو صاحب! اس طرف سے آجائو۔“

دو صاحب! اس کے ساتھ چل پڑے۔ دوسرے سمت سے چکر کاٹ کر گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی ان کو خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑی تو انہوں نے چوکیدار سے کچھ پوچھنا چاہا لیکن وہ ان سے کافی نظر بوجھ میں کھڑی شاہ سکندر کی گاڑی پر بڑی تو انہوں نے چوکیدار سے کچھ پوچھنا چاہا لیکن وہ ان سے کافی نے آگے اور تیز چل رہا تھا اور جب تک وہ اس کے قریب پہنچتے اس نے ایک دروازے کے سامنے رک کر اندر جانے کا اشارہ کیا اور فوراً ”یوں آگے بڑھ گیا جیسے اسے یہی حکم ملا ہو۔ عدیل نے حیران ہو کر اسے جاتے دیکھا پھر کمرے میں داخل ہو کر دروازے کے پاس ہی رک گئے۔  
 ”ساٹنے آرام دہ صوفے پر شاہانہ وقار کے ساتھ بابا جان بیٹھے تھے ان کے رکنے پر کہنے لگے۔  
 ”ک کیوں گئے یہاں آکر بیٹھو۔“

”شکریہ۔ آپ؟“ عدیل ان کے دائیں طرف صوفے پر بیٹھے اور سوالیہ نظروں سے دیکھا۔  
 ”ہم سکندر کے بابا جان ہیں اور تم غالباً“ اس کے دوست۔“ بابا جان نے اپنے تعارف کے ساتھ ان کا مرحلہ طے کر لیا۔  
 ”جی میں کراچی سے آ رہا ہوں، شاہ سکندر ملیں گے؟“ انہیں شاہ سکندر کے بارے میں جاننے کی جلدی

ہاں طے گا کیوں نہیں، لیکن تمہیں تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔“ بابا جان نے ایک نظر میں جان لیا تھا کہ شکار با کر آیا ہے۔  
 ”نہیں گئے ہوئے ہیں شاہ سکندر؟“  
 ”فارم ہو تا ہے آج کل آجائے گا ایک دو دن میں، تم آرام سے رہو، تمہارا اپنا گھر ہے۔“ بابا جان عموماً جیسے سکندر کے دوستوں سے بات کرتے تھے ان سے بھی اسی طرح بولے۔  
 ”جی شکریہ۔ میں زیادہ دیر رک نہیں سکتا۔“ انہوں نے فوراً معذوری ظاہر کی تو بابا جان ہلکے پھلکے انداز میں

”ایک دو دن زیادہ تو نہیں ہوتے اور سکندر کے دوست تو یہاں دو دو مہینے رہتے ہیں۔ پچھلے مہینے آصف جاہ آیا تھا ابھی کوئی ہفتہ دس دن ہوئے گیا ہے۔“  
 ”لیکن اس وقت تو شاہ سکندر کراچی میں تھے۔“ عدیل نے اختیار کر کے کہنے لگے۔  
 ”ناں! کئی دن سکندر کراچی میں رہ آیا ہے۔“ بابا جان بہت سرسری انداز میں ان کی تائید کرتے ہوئے کہنے لگے۔  
 ”سکندر کو کراچی شہر پسند ہے اور میں نے بھی سوچا تھا اسے وہیں سیٹ کر دوں گا لیکن وہاں وہ کسی برے چکر چس گیا تھا۔ اس لیے میں نے اسے واپس بلوا لیا ہے۔“

”بڑے پچھلے ہیں؟“ عدیل نے قدرے الجھ کر انہیں دیکھا۔  
 ”نہیں! کوئی طوائف زادی، سنا ہے سکندر کے ساتھ اس کے فلیٹ میں رہنے لگی تھی۔“ بابا جان نے گالی دے کر وہاں کی غیرت کو لٹا کر اٹھا۔  
 ”عدیل کا بیچ بیاغ گھوم گیا۔ آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے تھے اور ضبط کی کوشش میں ہونٹوں کے

تھوڑے بڑے ہاتھوں کی مٹھیاں بھی بھینچ گئی تھیں۔  
 ”بابا جان جانتے تھے کہ ان کے سامنے اس لڑکی کا بھائی ہے، جس کی چیخ ابھی بھی ان کے کانوں میں گونج رہی تھی

اور اس کی عزت کے بعد اب اس کے بھائی کی غیرت کی دھجیاں اڑا کر وہ اس قصے کو ہمیشہ کے لیے ہمیں  
ہیں اس لیے عدیل کی کیفیت دیکھتے ہوئے وہ خود کو مزید انجان ظاہر کرتے ہوئے گویا ہوئے۔

”تم تو دوست ہو سکندر کے اور دوستوں کے درمیان رازداری نہیں ہوتی۔ یقیناً اس لڑکی کو جانے  
گزشتہ ایک سال سے سکندر نے رکھ لیا ہوا ہے۔ اگر نہیں جانتے تو ہم تمہیں اس کا بار  
دیتے ہیں، کچھ دے دلا کر فارغ کرو اسے۔ اس کی وجہ سے سکندر کی گھریلو زندگی متاثر ہو رہی ہے۔  
بچے کو زیادہ وقت نہیں دیتا۔“

”میرے خدا! لوگ اسی لیے بیٹیوں کی پیدائش پر خوش نہیں ہوتے کہ اگر جوان کی قسمت میں  
لکھی ہو تو جوان بھائی بے موت مرجاتے ہیں۔“

کاش سامنے بیٹھا اونچے شعلے والا شخص عمر میں ان کے باپ کے برابر نہ ہوتا تو وہ اس کا خون کر دیتے  
خود کو بھائی پر لٹکانا ان کے لیے بہت آسان ہوتا۔

”لاحول ولا۔ اپنی باتوں میں ہم تم سے جانے پانی کا پوچھنا تو بھول ہی گئے۔ اوئے غلام علی! بابا مہار  
مدارت کرو۔ کراچی سے آئے ہیں اپنے سکندر کے دوست ہیں۔“ بابا جان نے اونچی آواز میں ملازم کو  
عدیل کا ذہن ناؤف ہو رہا تھا۔ ساری توانائیاں صرف کر کے بھی وہ اپنے حواس یکجا نہیں کر پا رہے  
لگ رہا تھا جیسے جسم میں جان ہی نہ رہی ہو۔ قالین پر جی نظریں تک ساکت تھیں البتہ ناؤف ذہن میں  
سے کوئی مبہم سا خیال لہرا تھا۔

کتنی دیر گزر گئی۔ ملازم اوزانات سے بھری ٹرائی ان کے سامنے رکھ کر جانے لگا تو بابا جان اسے روک  
ہوئے بولے۔

”تم مہمان کے پاس رہو غلام علی! ہم ابھی آتے ہیں۔“ بابا جان کمرے سے جانے لگے تب عدیل  
کے تعاقب میں دھیرے دھیرے ابھی تھیں اور ان کے جاتے ہی انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا  
لیا۔ وہ مردتے آسیر کی طرح جھجکتے تھے نہ رو سکتے تھے اور شدت ضبط سے پورا وجود انگارہ بن گیا تھا۔  
”سائیں! چائے بناؤں؟“ غلام علی پوچھ رہا تھا۔

انہوں نے ہاتھ نیچے کر کر لورنگ آنکھوں سے اسے دیکھا اور کچھ کہے بغیر اٹھ کھڑے ہوئے تھے  
کاش شاہ سکندر واقعی کسی حادثے میں مر گیا ہو تا تو وہ بہن کو بہن سے لگا کر اس کے ساتھ آنسو  
جانے اس کا سامنا کیسے کر پائیں گے۔ ایک لحظہ کو رک کر وسیع رتبے پر پھیلی پر شکوہ عمارت کو انہوں  
سے دیکھا پھر اسپڈ سے گاڑی پچی سڑک پر اتاری تو مٹی دھول کے غبار اٹھنے لگے تھے اور اس غبار  
مریضہ نظری نہیں آئی جسے بروقت شاہ سکندر حیات نے سڑک سے نیچے اتار کر انتہائی غصے سے  
گاڑی کو دیکھا تو کچھ ٹھٹھک گیا تھا۔

\* ☆ \* ☆ \*

آسیر کو ہوش تو آگیا تھا لیکن بالکل گم صم حالت میں تھی۔ کچھ دیر کو آنکھیں کھولتی اور اپنے اطراف  
چروں کو دیکھ کر پھر پلکیں موندتی۔ اماں جی مسلسل آیات قرآنی کا ورد کر کے اس پر دم کر رہی تھیں۔  
گھن چکر بنی ہوئی تھیں۔ ادھر بچہ دیکھتیں، ادھر بچوں کی پکار پر دوڑتیں پھر آسیر کے پاس۔ اور شدت  
کی واپسی کے منتظر خلیل بھائی برآمدے ہی میں ڈیرہ جمائے بیٹھے تھے۔

مغرب کی آذان ہو رہی تھی۔ اباجی مسجد چلے گئے، اماں جی نے وہیں آسیر کے کمرے میں جا نماز  
میں وہ بھی وضو کرنے جا رہی تھیں کہ فون کی بیل پر خلیل کو بھانے دیکھ کر وہ بھی ان کے پیچھے چلی آئی  
”کون؟“ شاہ سکندر ریا رکھاں ہو تم؟“ خلیل کی آواز میں نہیں جیسے سارے جسم میں زندگی دوڑا  
قریب کھڑی میمونہ نے بے اختیار ان کا بازو تھام لیا۔

”ہاں۔ یہاں سب ٹھیک ہے۔ آسیر غالباً نماز پڑھ رہی ہے۔“ انہوں نے مصلحانہ جھوٹ بولا۔

”اور عدیل بھائی کہاں ہیں؟“ شاہ سکندر نے ایک ہی بات جاننے کے لیے فون کیا تھا۔

”عدیل تپا نہیں۔ میں تو ابھی آفس سے آرہا ہوں، خیر تم بتاؤ کب آ رہے ہو؟“ انہوں نے ایک بار پھر مبالغے  
کا کام لے کر پوچھا اور اس کا جواب سننے کے بعد الوداعی کلمات کہہ کر فون بند کر دیا پھر میمونہ کو دیکھ کر بولے۔  
”دھڑکے کوئی خبر نہیں ہے۔ شاہ سکندر خیریت سے ہے۔“

”میں آسیر کو بتاؤں شاید اس کے ساتھ کسی نے۔“ میمونہ کتنی ہوئی بھاگیں پھر ایک دم رک کر پوچھنے لگیں۔  
”اور وہ عدیل اس کی شاہ سکندر سے ملاقات نہیں ہوئی۔“

”عدیل شاہ پور گیا ہے اور سکندر اسلام آباد میں ہے اور تم ابھی آسیر سے کچھ مت کہو جب تک وہ خود کوئی  
نہ کرے۔“ خلیل دھینج سے کہتے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

میمونہ بھاگیں نے نماز سے فارغ ہو کر رآمدے میں تخت پر دسترخوان بچھا دیا اور اباجی کے آتے ہی کھانا لگا کر  
اپنی اماں جی کو بھی لے آئیں۔ پھر کھانے کے دوران خلیل بھائی نے والدین کی پریشانی دور کرنے کی غرض سے  
بکے بے ہوشی کا سبب جو انہوں نے خود سے فرض کر لیا تھا بتا کر شاہ سکندر کی خیریت کی نوید بھی سنا دی۔  
”یہاں جان لیوا مذاق کون کر سکتا ہے؟“ اباجی ساری بات سن کر بولے تھے۔

”یہ تو آسیر ہی بتائے گی۔“ میمونہ بھاگیں نے کہا۔

”ہاں، لیکن اباجی اس سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پہلے اسے کھلاؤ پلاؤ اور عدیل جو دو اکیس لے کر آیا تھا  
ی ضرور دینا۔“ خلیل بھائی نے میمونہ کو تنبیہ ضروری سمجھی۔

”اب مجھے امحق اور غیر مذہ دار کیوں سمجھتے ہیں؟“ میمونہ براہمان لگیں۔

”ہو نہیں کیا؟“ خلیل کا انداز چھیڑنے والا نہیں تھا جب ہی میمونہ سے پہلے اباجی بول پڑے۔

”نہیں میمونہ میری بیٹی بہت سمجھ دار ہے۔ سارے گھر کو چلا رہی ہے اور بہت احسن طریقے سے۔“

”بس رہنے دیں اباجی۔“ خلیل دسترخوان سے ہاتھ صاف کرتے اٹھنے لگے کہ اباجی انہیں روک کر پوچھنے  
تھیں کیا شکایت ہے اس سے؟ کھانا وقت پر نہیں دیتی، تمہیں کپڑے دھلے ہوئے نہیں ملتے یا تمہارے  
پانی تربیت میں کوتاہی کر رہی ہے۔“

خلیل کا جواب ہو کر رہ گئے۔

”کی نہیں بلکہ یہ تمہارے ماں باپ کی خدمت بھی کر رہی ہے جس کے لیے تمہیں اس کا شکر گزار ہونا  
ہیے۔“ اماں جی نے بھی ہو کی طرف داری کی تو خلیل میمونہ کو کھورتے ہوئے اٹھ کر چلے گئے۔

گھر میں فارغ ہو کر میمونہ بھاگیں آسیر کے لیے دودھ کا گلاس لے کر اس کے کمرے میں آئیں تو اسے  
بہ نظر نہیں آسیر کو دیکھ کر دھیرے سے پکار کر بولیں۔

آسیر ایسی طبیعت ہے تمہاری؟“ اس کی آنکھیں یکبارگی پانیوں سے بھر گئیں۔

”میں تمہیں رونے سے منع نہیں کروں گی لیکن پہلے یہ دودھ پی لو کیونکہ رونے کے لیے بھی توانائی چاہیے جو  
بالکل نہیں ہے۔“

اس کے قریب بیٹھ کر بظاہر ہلکے پھلکے انداز میں بولیں تو ان کی طرف نظروں کا رخ موڑتے ہوئے اس کی  
ایک کانٹا کناروں سے چھلک گیا۔

”نہو شاہ! اس میں اوٹ نہیں سے زیادہ میری محبت شامل ہے اور تم جانتی ہو ناں میری محبت۔“

”کی۔“ گلاس ٹیبل پر رکھا پھر اس کے سر کے نیچے ہاتھ ڈال کر ذرا سا اونچا کر کے بٹھایا تو وہ معصومیت سے  
نہی۔

”کیا ہوا ہے مجھے؟“

”کمزوری۔ غالباً“ کمزوری کے باعث تمہیں چکر آگیا تھا۔ لودودھ پو۔ ”انہوں نے فوراً گلاس اٹھا ہونٹوں سے لگا دیا۔

”میرا سر بہت بھاری ہو رہا ہے۔“ اس نے ذرا سادودھ پی کر سر بیک پر نکا دیا۔ ”یوں لگ رہا ہے جیسے میں جکڑا ہوا ہوں۔ اماں جی کہاں ہیں؟“

”میں بلاتی ہوں انہیں۔ تم پہلے یہ دودھ ختم کرو۔“ میمونہ بھابھی نے زبردستی اسے دودھ پلایا پھر دوا جا کر اماں جی کو پکارا تو وہ فوراً آگئی تھیں۔

”آپ آسیہ کے پاس بیٹھیں اماں جی! میں بچوں کو دیکھ لوں۔“ میمونہ بھابھی کمرے سے نکل گئی جیسے ہی اس کے پاس آنکریٹھیں اس نے اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا اور ہاتھ تھام کر گال سے لگائی ہوئی۔ ”آپ مجھے جھوڑ کر تو نہیں جائیں اماں جی!“

”میں تمہارے پاس ہوں بیٹا!“ اماں جی کو وہ بالکل چھوٹی بچی کی طرح لگی۔ جبکہ کراس کی پیٹیا دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں اٹکیاں پھیرنے لگیں تو بہت پرسکون ہو کر اس نے پلکیں موند لیں۔

”میں آپ کو بہت تنگ کرتی ہوں۔ اللہ نے مجھے بہت نیک اور سعادت مند اولاد دی ہے۔ مجھے کبھی کسی نے کیا۔“ فرط محبت سے اماں جی کی آواز بھرائی تھی۔

”میں تو پریشان کرتی ہوں آپ کو۔“ وہ بچوں کی طرح بول رہی تھی۔

”جان بوجھ کر تو نہیں کرتیں اور اب تو کوئی پریشانی نہیں ہے۔ تم ذہن پر بوجھ مت ڈالو سوجاؤ۔“ آہستہ سے ہنسنے لگیں۔

جب میمونہ بھابھی بچوں کو ہوم ورک کروا کر سلمانے کے بعد دوبارہ آسیہ کے کمرے میں آئیں تو ان پر بہت رحم آیا جو بیٹھے بیٹھے اونگھ رہی تھیں جبکہ ان کی گود میں سر رکھے آسیہ بے خبر سو رہی تھی۔ میمونہ آرام سے اس کا سر تکیے پر رکھا پھر سارا دے کر اماں جی کو اٹھاتے ہوئے دھیمی آواز میں بولیں۔

”اب یہ آرام سے سوئے گی، چلیں آپ بھی سوجائیں۔“

”مجھے ابھی عشاء بردھنی ہے، پھر میں بیس سوؤں گی آسیہ کے پاس، یہاں ایک چارپائی ڈال دو۔“

پھر خیال آنے پر پوچھنے لگیں۔

”عدیل کچھ بتا کر نہیں گیا۔ کہاں گیا ہے؟“

”ابھی آتا ہو گا، پوچھ لیجیے گا۔“ میمونہ بھابھی دامن بچائی، نیبل اور کرسی ہٹا کر چارپائی بچھانے بنانے لگیں۔

اماں جی نماز پڑھنے کی غرض سے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

میمونہ نے شوہر کو بلا کر ان کی مدد سے چارپائی رکھوائی پھر اس پر بستہ لگا کر اماں جی کے آنے تک صوب کر رہی تھیں کہ عدیل کی گاڑی کی آواز سن کر ہلکا کر بھاگ کر باہر آئیں لیکن برآمدے میں خلیل کو کھڑا رک گئیں۔

”خیریت؟ کہاں رک گئے تھے؟“ عدیل کے قریب آتے ہی خلیل نے ان سے پوچھا۔

”بس وہ راستے میں گاڑی خراب ہو گئی تھی۔“ عدیل بے حد مضطرب دکھائی دے رہے تھے۔

”ہے؟“

”ہاں ابھی کچھ دیر پہلے سوئی ہے۔“ میمونہ بھابھی آگے آکر بولیں۔ ”تم ہو آئے شاہ پور سے،“

ہو؟۔“

”جی۔ راستہ خراب تھا۔“ عدیل بھائی بھادج کے چروں پر اطمینان دیکھ کر الجھ گئے۔

”تم نے جانے میں جلدی کی۔ میرا خیال ہے ابھی تم شاہ پور پہنچے بھی نہیں ہو گے کہ سکندر کا فون آگیا تھا۔ ہم سب کو اس کی طرف سے اطمینان ہو گیا البتہ آسیہ ابھی تک پوری طرح ہوش میں نہیں آئی ہے۔ شاید بھرپور نیند کے بعد صبح تک اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ خیر پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم آرام کرو۔“ خلیل بھائی نے ان کی تحن کے خیال سے بات مختصر کر دی۔

”کھانا کھاؤ گے یا چائے؟“ میمونہ بھابھی نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ عدیل منع کر کے فوراً ”پنے کمرے کی طرف بڑھ گئے تھے۔

\* ☆ \* ☆ \*

”آس! آس!“

ایک پکار بھی جو اونچے برتوں سے ٹکرا کر باز گشت کی صورت بننے پاتاں تک گونج رہی تھی۔ بہت خوفناک نظر تھا۔ گہری نیند میں اس کے دل کا یہ عالم تھا کہ جیسے سینہ چیر کر باہر نکل آئے گا اور پھر ایک دم اس کی آنکھ کھل گئی۔

”میرے خدا!“ بے تحاشا دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھ کر اس نے اماں جی کو دیکھا جن کے خراٹوں کی آواز خاموشی میں زبردست پیدا کر رہی تھی۔ پہلے اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے۔ ذہن خوفناک خواب کی گرفت میں تھا

درساتوں میں ابھی بھی اس کے نام کی پکار گونج رہی تھی۔ اور اتنی شدتوں سے پکارنے والا وہی ایک شخص تھا جو اس کے دل میں اس مقام پر قابض تھا جسماں اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد کوئی اور ہو سکتا تھا۔

”شاہ سکندر!“ زبان کی ذرا سی جنبش کے ساتھ ہی اس کی آنکھیں پانیوں سے لبریز ہو گئیں اور یکبارگی ذہن کے مارے درپے ایک ساتھ وا ہو گئے تھے۔

”ہم سکندر حیات کی صرف ایک بیوی کو جانتے اور مانتے ہیں جسے سکندر پوری شان و شوکت سے بیاہ کر لایا تھا وہ ہے مہر النساء۔“

”نہیں!“ اس نے سختی سے جھٹلانے کی کوشش کی تھی کہ ذہن کہیں پیچھے ہٹک گیا۔

”مہر النساء!“ اسے یاد آیا، پہلی بار یہ نام اس نے شاہ سکندر ہی سے سنا تھا اور پھر مری میں اس کے دوست، محسن لیوی نے اسے اسی نام سے پکارا تھا۔

”اوسو! تم میرے ساتھ آجاؤ۔“ گویا وہ جانتی تھی کہ سکندر کی بیوی کا نام مہر النساء ہے اس لیے اتنے یقین سے اس نام سے پکارا تھا اور وہ کس کس کو جھٹلانے کی کوشش کرتی۔ بہت مایوس ہو کر وہ مہر النساء کے ساتھ اپنا زندہ کرنے جاری تھی کہ بابا جان کی سفائی یاد آئی۔

”شاہ سکندر نے اگر تمہیں اپنی رکھیل بنا کر رکھا تو اس کا معاوضہ بھی دیا ہو گا۔“

”نہیں۔“ شاہ سکندر میرے ساتھ ایسا گھناؤنا کھیل نہیں کھیل سکتے۔ غلط کہتے ہیں اس کے بابا جان وہ انہیں ڈر کیا ہے بلکہ سب کو۔ اور جاگیر میں بھی ٹھکرا آیا ہے صرف میری خاطر۔ اور بابا جان کا اس پر بس نہیں چلا تو

نیاس سے متفرک کرنا چاہتے ہیں اور ایسا ہو نہیں سکتا، کبھی نہیں۔“

وہ بڑے یقین سے بابا جان کو جھٹلا رہی تھی، لیکن جانے کیوں دل اندر ہی اندر بیٹھا جا رہا تھا اور آنکھوں کے نازوں سے جھٹلتے آنسو جب چاپ تکیے میں جذب ہو رہے تھے۔

”بنا خیال رکھا کرو اس۔“ یہ سوچ کر کہ میری سانسوں کی دُور تمہارے ساتھ بندھی ہے۔“ محبتوں کی شدت میں سے بٹا نہیں۔

”سکندر!“ اس نے سر کے نیچے سے تکیے سمجھ کر منہ پر رکھ لیا اور سسک سسک کر رونے لگی تھی۔

اذان کی آواز پر اماں جی اٹھ کر بیٹھ گئیں اور حسب عادت مؤذن کے ساتھ ساتھ اذان کے الفاظ زیر لب

”مجھے کوئی کام نہیں ہے۔“ صورت حال سے بے خبر میمونہ بھابی محض عدیل کو چھیڑنے کی غرض سے چارپائی پر بیٹھ گئی۔  
 ”ہاں تم بتاؤ آسیہ!“ عدیل ان کے بیٹھنے کا نوٹس نہ لیتے ہوئے سابقہ انداز میں آسیہ سے مخاطب ہوئے۔ ”کیا تمہیں پہلے سے معلوم تھا کہ شاہ سکندر شادی شدہ اور بچے کا باپ ہے؟“

”نہیں!“ میمونہ بھابی اچھل پڑیں۔  
 ”نہیں۔ بخدا نہیں۔ مجھے یہ سب معلوم نہیں تھا اور یہ معلوم کرنا آپ کا کام تھا۔“ وہ ہاتھوں میں چرا چھپا کر پھوٹ کر رونے لگی۔ ”جی جی اس کا نام نوٹ کیا تھا۔“  
 عدیل بھابی کے ہاتھوں کی گرفت اس کے کندھوں پر کمزور پڑنے لگی اور پھر ایک دم انہوں نے اسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے کر سینے میں چھپایا۔

”رو!“ نہیں میری بہن! تمہاری قسم تمہارے ایک ایک آنسو کا حساب لوں گا۔“  
 میمونہ بھابی ششدر کھڑی تھیں۔  
 اماں کی مابائی، آسیہ کے رونے کی آواز سن کر خلیل کو پکارتے ہوئے آئے تھے۔  
 ”کیا ہوا ہے؟“ خلیل نیند میں سے اٹھ کر آئے تھے۔ ایک ایک کی شکل دیکھنے لگے پھر گرم صم کھڑی بیوی کا کندھا ہلاتا وہ چونکنے کے ساتھ ہی عدیل پر بگڑنے لگیں۔

”عدیل! تم نے صبح صبح کو پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔ چلو اٹھو یہاں سے۔“  
 ”ہاں!“ عدیل کے ہونٹوں سے کمری سانس خارج ہوئی پھر آسیہ کو چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”خلیل بھائی! کیا جی آپ بھی آئیے۔“  
 جانے کی بات تھی کہ اماں جی بھی روتی ہوئی بیٹی کو چھوڑ کر ان تینوں کے ساتھ کمرے سے نکل گئی تھیں۔

\* ☆ \* ☆ \*

شاہ سکندر کی تمام رات سوتے جاگتے گزری تھی گو کہ کل خلیل بھابی کی باتوں سے کہیں بھی ظاہر نہیں ہوا تھا کہ عدیل شاہ پور آئے ہیں اور تیز رفتاری کے باعث خود اس نے بھی انہیں نہیں دیکھا تھا۔ لیکن ان کی گاڑی وہ بچاتا تھا اور اس وقت سے اندیشوں میں گھرا ہوا تھا۔ کئی بار جھٹلانے کی کوشش کی کہ اسے دھوکا ہوا ہے۔ عدیل بال کیوں آئیں گے۔ وہ جانتے ہیں کہ میں شاہ پور چھوڑ چکا ہوں اور ابھی بھی میری یہاں موجودگی کا کسی کو پتا نہیں! یہاں تک کہ آسیہ بھی نہیں جانتی پھر ان کا یہاں آنا؟  
 ”نہیں۔ وہ عدیل بھابی نہیں ہو سکتے۔“ وہ بار بار جھٹلاتا اور ہر بار دھول اڑاتی گاڑی اس کی نظروں کے سامنے نہایت تھی۔

پھر صبح ناشتے کے بعد اس نے اچانک واپسی کا سوچ لیا۔ کہیں کوئی گڑبڑ ہوئی تھی یا ہونے والی تھی جو اس کی فحش الامور بجانے لگی تھی۔ وہ بہت عجلت میں تیار ہو کر سب سے پہلے بابا جان کو اپنے جانے کا بتانے کی نیت سے ان کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ شاہ جہانگیر سے کہہ رہے تھے۔  
 ”جس کام سے تمہیں کراچی جانا تھا وہ یہیں ہو گیا۔ اب تمہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“  
 ”اسلام علیکم بابا جان!“ اس نے سلام کیا تو شاہ جہانگیر کچھ بوکھلا کر اٹھ کھڑے ہوئے جبکہ بابا جان نے چونک کر ”اٹو!“ بھی بل مسکرا کر بولے۔

اس نے بیٹے کی ہم تمہارا بی ذکر کر رہے تھے۔ آؤ یہاں ہمارے پاس بیٹھو۔“  
 ”بھئی بیٹے ہوئے یونہی شاہ جہانگیر کو دیکھا تھا۔“  
 ”بھئی! اسے فارم سے؟“ بابا جان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

دہرانے لگیں۔ آخر میں قدرے اونچی آواز میں کلمہ پڑھ کر دونوں ہاتھ منہ پر پھیرے، پھر چارپائی سے اتر آسیہ کو دیکھا تو زیر پاؤں کی مدد میں وہ انہیں سوئی ہوئی نظر آئی۔ اس کی خرابی طبع کے باعث اسے نماز کے لیے نہیں اٹھایا بلکہ جلنے میں بھی احتیاط کی کہ کہیں اس کی آنکھ نہ کھل جائے۔ کمرے پر آمدے میں آئیں تو عدیل کو غصے دھجھ کر پوچھنے لگیں۔  
 ”تم اتنی جلدی اٹھ گئے؟“

عدیل چونک کر رے بھر بڑھ کر لاٹ آن کر دی۔  
 ”رات کہاں چلے گئے تھے؟“ اماں جی نے پوچھا۔  
 ”آسیہ کی طبیعت اب کیسی ہے؟“ وہ ان کا سوال نظر انداز کر گئے۔  
 ”بہتر ہے۔ رات بھر آرام سے سوئی رہی۔“

”چلیں۔ آپ نماز پڑھ لیں، میں ذرا آسیہ کو دیکھ لوں۔“ عدیل کہتے ہوئے آسیہ کے کمرے میں آئے۔  
 میں انہیں بھی وہ سوئی ہوئی لگی لیکن جب قریب گئے تو سسکنے کے باعث اس کا وجود جھٹکنے کا ہوا تھا۔  
 عدیل کے دل پر ایک اور قیامت بیت گئی۔ ان کی نازوں بلی بہن کی زندگی میں یہ کونسا مقام آگیا تھا۔  
 ”آسیہ!“ دھیرے سے پکارتے ہوئے انہوں نے اس کے منہ پر سے تکیہ کھینچ لیا تو بے حد پریشان ہوا ہاتھ چہرے پر رکھنا چاہتی تھی کہ وہ فوراً اس کی کلاٹیاں تھام کر بولے۔  
 ”رونا اور منہ چھپانا اس وقت جب ہم میں سے کوئی ایک بھی زندہ نہ رہے۔“

”عدیل بھائی!“ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ ”اللہ کرے میری زندگی بھی آپ کو لگ جائے۔“  
 ”سب کو اپنی زندگی آپ جینا ہے۔ سمجھ رہی ہوں؟“ عدیل کالجہ اچانک گہمیر ہو گیا تھا۔  
 وہ چونک کر دیکھنے لگی۔ ان کی بڑی بڑی ذہین آنکھیں سرخ انگارہ بنی ہوئی تھیں۔ گھنے بال بے زار پیشانی پر جھول رہے تھے اور چہرے پر کسی قیامت کے گزرنے کے واضح اثرات تھے۔  
 ”کیا ہوا ہے عدیل بھائی آپ کو؟“ وہ اپنا دکھ بھول گئی۔

عدیل بھائی نظریں چرا گئے۔  
 ”بتائیے ناں عدیل بھائی! آپ کو میری قسم۔“ اور وہ جن کی تمام شب خود کو سنبھالنے اور یہ یاد رکھنا پڑا تھا کہ انہیں جوش کے بجائے ہوش سے کام لینے کی ضرورت ہے کیونکہ یہ ان کی بہن کا حال اس وقت بھی وہ ضبط کرتے کرتے اچانک ٹوٹ گئے تھے۔  
 ”ہماری عزت وغیرت کوئی کھلو نا نہیں ہے آسیہ! جسے کوئی امیر زادہ اپنی دل بستی کے لیے خرید سکے یہاں سوالی بن کر آیا تھا۔ جانتی ہوں ناں پھر اس کے باپ نے تمہیں اور ہم سب کو گالی کیوں دی؟“

آسیہ کا پورا وجود سن ہو گیا تھا۔  
 ”میں اگر اسے زندہ چھوڑ کر واپس آیا ہوں تو صرف یہ جاننے کے لیے کہ کہیں تم نے قصداً توڑ کھایا۔ شاہ سکندر کی شان و شوکت سے مرعوب ہو کر۔ مجھے بتاؤ آسیہ! ورنہ میں خود کو کوئی مار لوں گا۔“  
 نے اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

”خدا کے لیے عدیل بھائی!“ وہ ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر سسک پڑی۔ ”مجھے گولی ماریں لیکن کوئی الزام نہ لگائیں۔“  
 ”کیا ہوا ہے؟“ سچن میں جاتے ہوئے آواز سن کر میمونہ بھابی اس طرف آئی تھیں۔ آسیہ کو پریشان ہو گئیں۔  
 ”کچھ نہیں! آپ جائیں اپنا کام کریں۔“ عدیل بھائی کو ان کی مداخلت سخت ناگوار گزری۔

”جی کوئی نئی بات نہیں تھی۔ بلکہ وہ پرانی بات بھی نہیں تھی۔ ایک دم اجاڑویران لگتا ہے آپ! اراضی سے دلچسپی نہیں رہی؟“ اس نے اپنے تئیں بابا جان کو احساس دلانا چاہا کہ عدم توجہی کے باعث زمین ناکارہ ہو رہی ہے۔

”وہ زمین تمہاری ہے سکندر! اور تم ہی اسے آباد کرو گے۔“ بابا جان نے کہا اور پھر فوراً ”موضوع بدرا اچانک یاد آنے کا اثر دیتے ہوئے بولے تھے“ اور ہاں کل تمہارا کوئی دوست آیا تھا۔“

”کون؟“ وہ پوری جان سے متوجہ ہو گیا۔

”وہ کیا بھلا سا نام بتایا تھا اس نے۔“ بابا جان ذہن پر زور ڈالنے لگے۔

”عدیل۔“ وہ اتنا صبر نہیں کر سکا۔

”ہاں شاید یہی نام تھا۔ ہم نے اسے رکنے پر بہت اصرار کیا کہ ایک دو روز میں تم آجاؤ گے لیکن جلدی تھی۔ پتا نہیں کس کام سے آیا تھا۔ وہ بھی نہیں بتایا۔“

بابا جان اپنی کسے جارہے تھے جبکہ وہ عدیل بھائی کی آمد کی تصدیق ہونے پر بے حد پریشان ہو کر شاہ دیکھنے لگتا تھا۔

”کیا کیا کہہ رہا تھا؟“ شاہ جہانگیر نے اس سے نظر سچا کر بابا جان سے پوچھا۔

”ہم سے تو کوئی خاص بات نہیں کی اس نے۔ بس سکندر کا پوچھ کر چلا گیا۔“ بابا جان اب بہت سر میں بول رہے تھے۔

”میرے بارے میں آپ نے کیا بتایا؟“

”یہی کہ تم فارم پر گئے ہوئے ہو۔ ایک دو روز میں آجاؤ گے۔ اگر ہمیں معلوم ہو تا کہ تم اسی وقت آ ہو تو ہم اسے ہرگز نہ جانے دیتے۔“ بابا جان بڑے آرام سے اس کے اندلیشوں کو ہوا دے رہے تھے۔

وہ سخت مضطرب سا اٹھ کھڑا ہوا اور شاہ جہانگیر کو چلنے کا اشارہ کرتا ہوا بابا جان کے کمرے سے نکل آیا۔ شاہ جہانگیر کافی دیر بعد اس کے پاس آئے تھے۔ اس وقت تک اس کے اعصاب شل ہو چکے تھے پھر دیکھ کر وہ چیخ مڑا۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے جہانگیر بھائی؟“

”دھیرج سے۔ دھیرج سے۔“ شاہ جہانگیر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بٹھاتے ہوئے بولے۔

”یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”یہی تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

”شاید انہیں تمہارے بارے میں انکوائری کرنے کا خیال اب آیا ہو۔“ شاہ جہانگیر نے پرسوج انداز میں کہا۔

”کیا مطلب؟ کیسی انکوائری؟“ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”کہ تم واقعی شاہ پور کے زمیندار ہو یا۔“

”نہیں۔“ اس نے شاہ جہانگیر کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی مسترد کر دی۔ ”انہوں نے اپنی ہر میری یہاں کی حیثیت کو سوچ کر نہیں کھی جو اب انکوائری کرنے آئیں گے۔“

”پھر اور کیا مقصد ہو سکتا ہے؟“

”میں آئیہ سے معلوم کرتا ہوں۔“ وہ ٹیلی فون کی طرف بڑھ گیا اور جلدی جلدی نمبر ڈائل کرنے لگا۔

شاہ جہانگیر خود کو کئی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرنے میں لگ گئے جبکہ اس کی

تھے۔

”کون میمونہ بھابی! السلام علیکم!“

”پلیز زرا آئیہ کو۔“

”سوری، رنگ نمبر“ کھٹناک سے فون بند ہو گیا تھا۔

شاہ سکندر کتنی دیر بے یقینی کی حالت میں کھڑا رہا پھر ریسیور رکھ کر شاہ جہانگیر کی طرف پلٹا تو انتہائی دکھ اور غم سے بولا۔

”آپ میرے بھائی نہیں ہو سکتے۔“ اس کے ساتھ ہی سیڑھیاں پھلا لگتا اپنے کمرے میں بند ہو گیا تھا۔

دن بھانجی کا فون بند کر دینا اسے بہت کچھ سمجھا رہا تھا کہ سبب صرف اس کا شاہ پور آنا نہیں ہو سکتا بلکہ یقیناً ”بابا“ نے عدیل بھائی سے اور بھی بہت کچھ کہا ہوگا، لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ عدیل بھائی یہاں کس سلسلے آئے تھے کیا انہیں اس پر کوئی شبہ ہوا تھا یا کوئی اور بات۔ اور بات کوئی بھی ہو، اس کے لیے اب صورت کو نبھانا مشکل ہو گیا تھا۔

یہ کے بارے میں سوچنے لگا کہ اس کے پہلے سے شادی شدہ ہونے کا سن کر اس پر کیا بیت رہی ہوگی۔ وہ جو اس نے آپ سے بڑھ کر اعتبار کرتی تھی، کس بری طرح ٹوٹی ہوگی۔ اور جانے اب وہ دوبارہ اس کا اعتبار حاصل کرے گا یا نہیں۔ معاہدے بابا جان کی بات یاد آئی، خود ابھی کچھ دیر پہلے شاہ جہانگیر سے کہہ رہے تھے۔

”نہیں جس کام سے کراچی جانا تھا وہ یہیں ہو گیا اب تمہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

اس کا مطلب ہے بابا جان اور جہانگیر بھائی نے پوری حکمت عملی سے میرے لیے جال بنا ہے اور میں ایک بار ”وہ بری طرح چلے آ گیا تھا۔“

بند کرے میں جانے کیا باتیں ہوئی تھیں کہ ناشتے کے بعد اب کھانے کی بھی کسی کو پروا نہیں تھی۔ میمونہ می ایک ایک کمرے میں جھانکتی پھر رہی تھیں۔

باندھ کر لپٹے بڑے تھے۔

بائی شمع کے دانے گن رہی تھیں۔

وہ سچے جو گھنٹوں کے گرد بازو لپیٹے بیٹھی تھی تو اب تک اسی حالت میں تھی ذہن میں شاہ سکندر کے سنگ ارا ایک ایک پل اپنی تمام تر جزئیات سمیت ایک تسلسل سے ابھر ابھر کر مٹ رہا تھا اور وہ کہیں گرفت نہیں رہی تھی۔ اس لیے کہ وہ خود سے نہیں سوچ رہی تھی، بس اپنے آپ فلم سی چلنے لگی تھی جس کا دورانیہ بہت لمبی نہیں تھا۔ اس کی زندگی کا ایک سال جو اس کی زندگی ہی بدل گیا تھا۔ اپنی محبتیں اتنی چائیں جن میں ہر کہیں کھوت نہیں تھی اور وہ گمان بھی نہیں کر سکتی تھی کہ جن محبتوں پر وہ صرف اور صرف اپنا حق سمجھتی ہے

شاہ سکندر پہلے ہی کسی کو دان کر آیا ہے۔ اس کے بعد بھی اتنا زعم۔

میں تمہارے دل میں اس مقام پر فائز ہو چکا ہوں، جہاں مجھ سے پہلے کوئی تھا نہ میرے بعد کوئی ہو سکتا ہے۔ یہ وقت اپنی جگہ مسلم تھی لیکن اس کے دل اور زندگی سے کھیلنے کا حق اسے کس نے دیا تھا۔ وہ اتنی نادان اتنی۔

نفس تو نہیں تھی پھر اتنی آسانی سے اس کے جال میں کسے پھنس گئی۔

”آئیہ!“ میمونہ بھابی دھیرے سے اس کا کندھا ہلکا کر بولیں ”سارے گھر میں ایسی خاموشی چھائی ہے کہ اب غدار لگے گا۔ خدا کے لیے تم ہی کچھ بولو۔“

مضمون پر سے ٹھوڑی اٹھا کر خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگی۔

”آئیہ نے دست دیکھو۔ مجھے وحشت ہو رہی ہے۔“ میمونہ بھابی اس کے سامنے ٹھٹھے ہوئے بولیں ”کچھ بولو اور

نہیں! شاہ سکندر کو گالیاں ہی دو۔ کم از کم تمہارا جود تو تو نے اور یہ بہت ضروری ہے ورنہ نقصان اٹھاؤ گی۔“

”کی آئیہ! میں ذرا سی سمٹی تھیں جیسے کہہ رہی ہو اور کیا نقصان۔“

”دیکھو۔ مجھے بالکل نہیں معلوم کہ صبح اماں جی کے کمرے میں ان سب کے درمیان کیا طے پایا ہے۔ خلیل

آفس جاتے جاتے مجھے صرف اتنا بتا گئے ہیں کہ شام کی فلائٹ سے ٹھیک بھائی اسلام آباد سے آ رہے ہیں۔ مطلب ہے، انہیں اباجی نے فوراً بلوایا ہو گا اور میں چاہتی ہوں ان کے آنے سے پہلے پہلے تم اپنے آپ کو لوٹا کر تمہارے اور شاہ سکندر کے بارے میں جو بھی باتیں ہوں۔ تم ان میں شریک ہو سکو۔ میری بات سمجھو۔ ”میمونہ بھابی نے بہت سنجیدگی سے اسے آنے والی صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ آہستہ آہستہ بولے۔ ”اب کیا باتیں ہوں گی۔“ اس کے لہجے میں دکھ اور تاسف تھا۔

”شاہ سکندر کے شادی شدہ ہونے کا سن کر اس سے تمہارا ناتا ٹوٹ تو نہیں گیا میری جان! ابھی تو تم امتحان اور بھی ہیں۔“

”میری عزت نفس داؤ پر لگی ہے بھابی! میں سر اٹھا کر بات نہیں کر سکتی۔“ وہ رو پڑی۔

”اور آپ چاہتی ہیں میں بھائیوں کے درمیان بیٹھ کر اس شخص کی حمایت کروں جس نے انہیں یہ گالیاں آگروہ سامنے ہوتا تو خون خرابا پینا تھا۔“

”کیا اس نے خود۔۔۔ میرا مطلب ہے کیا کہا ہے اس نے؟“ ”میمونہ بھابی نے پوری توجہ سے اسے دیکھا۔

”پہلے یہ بتائیں، عدیل بھائی کو سکندر کے شادی شدہ ہونے کا کیسے پتا چلا؟“ وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”عدیل کل شاہ پور گیا تھا۔ اصل میں تمہاری بے ہوشی سے ہم یہی سمجھے کہ خدا نخواستہ شاہ سکندر کو کوئی حادثہ وغیرہ ہو گیا ہے اس لیے عدیل فوراً اس کی خبر لینے روانہ ہو گیا تھا اور شاید وہیں سے معلوم ہوا یہ سب کچھ عجیب سا نہیں لگ رہا بلکہ مجھے تو یقین بھی نہیں آ رہا۔“ ”میمونہ بھابی نے اس کی بات کا جواب کے ساتھ کہا۔

”میں بھی خود کو فریب دینے کی کوشش کر رہی تھی کہ شاید سکندر کے بابا جان نے مجھے اس سے متفرک لیے ایسی باتیں کیں لیکن۔۔۔“

”تمہاری اس کے بابا جان سے کہاں بات ہوئی؟“ ”میمونہ بھابی درمیان میں بول پڑیں۔

”میں نے شاہ پور فون کیا تھا بی بی جان سے بات کرنے کے لیے۔“ اس نے اپنے فون کرنے کا بتا کر بابا جان ہونے والی گفتگو بھی کہ سنائی تو میمونہ بھابی بھی چکر اگئی تھیں۔

”یہ تو بہت برا ہوا۔ اور مجھے لگتا ہے عدیل سے بھی انہوں نے ایسی ہی باتیں کی ہوں گی جب ہی تو وہ اتنا ہو رہا ہے پتا ہے رات جب وہ آیا تھا تو میں اسے دیکھ کر رڑ گئی تھی۔“ ”عجب وحشی سا لگ رہا تھا۔“

”میمونہ بھابی تاسف کے اظہار کے ساتھ بولیں تو وہ سہم کر پھر رونے لگی۔

”مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے بھابی! میری وجہ سے میرے بھائی خدا نخواستہ اگر کسی کو کچھ ہو گیا تو میں کب معاف نہیں کروں گی بلکہ میں نہیں چاہتی کچھ کھا کر مر جاؤں گی۔“ ”وہ روتی ہوئی بے ربط بول رہی تھی۔

”میمونہ بھابی ایک دم پریشان ہو گئیں۔ ”بمشکل اسے چپ کرایا پھر بڑی سستی اٹھا کر واش روم میں لے گئیں۔ منہ ہاتھ دھو کر اپنی کٹی تو اس کے لیے کھانا لے آئیں اور خاصے رعب سے کھنے لگیں۔

”دیکھو، کھانے سے انکار مت کرنا۔ مجھے پتا ہے اس وقت تمہاری کیا حالت ہو رہی ہوگی۔ ان فونوں! بھوک زیادہ لگتی ہے۔ چلو کھاؤ شاباش۔ میں جب تک چائے لے کر آتی ہوں۔“ اس نے خاموشی سے جاتے ہوئے دیکھا پھر بڑے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

شام تک گھر میں ایسی ہی خاموشی اور کشیدگی تھی۔ جانے کیوں اماں جی اور اباجی بھی اس کے کمرے ٹہ آئے تھے اور وہ خود بھی ان کا سامنا کرنے سے گھبرا رہی تھی گو کہ اس سارے قصے میں اس کا کوئی قصور نہیں

وہ مجرم سی بنی ہوئی تھی۔ شاید اس کا جرم محبت تھا جس نے اسے رسوا کر کے اس کی ہستی کا غور جھین لیا تھا۔ وقت کی بات ہے، کبھی اسی محبت نے اسے اتنا اعتماد بخشا تھا کہ وہ خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھنے لگی جس کی اب تک کی زندگی میں کہیں کسی دکھ، کسی محرومی کی پرچھائیں تک نہیں بھی پھرا جائے کسی کی ٹہنی بھی کہ وہ اندر ہی اندر نوٹی جا رہی تھی اور کوئی سارا دینے والا نہیں تھا۔

قلیل بھائی کی آمد پر خاموشی میں قدرے پلچل مچ گئی۔ مغرب کی نماز سے فارغ ہوتے ہی میمونہ بھابی نے کھانا کھانے کا دعوت دی تھی کہ جہاں اس واقعے کو چھیڑا گیا، کھانا رہ جائے گا۔ اس لیے کھانے کے دوران بھی وہ ٹھیک اسے سہا بھی کی خیریت اور ان کی دیگر مصروفیات کے بارے میں پوچھ کر ایک طرح سے سب کا دھیان رہیں۔ آخر میں کہنے لگیں۔

”میں اور بچوں کو بھی لے آتے تو کچھ رونق ہو جاتی۔“

”باقاعدہ پروگرام کے تحت آتا تب اسے لے کر آتا“ ٹھیک بھائی کہنے لگے۔ ”وہ تو صبح اباجی نے فون کر کے بس آئے گا کہ تم کچھ پریشان کر دیا۔ اباجی ایسی کیا بات تھی۔ اس طرح کیوں بلایا مجھے؟“

”جس وہ تم سے کچھ مشورہ کرنا تھا۔ خیر پہلے تم کھانا کھاؤ۔ آرام سے پھر بات کریں گے۔“ اباجی اس وقت سے طحال رہے تھے۔

بھائی نے باری باری سب کو دیکھا۔ کسی کے چہرے پر وہ پہلے جیسا اطمینان نظر نہیں آتا۔ اور ٹھنک تو وہ اسی کے تھے جب اباجی نے فون پر انہیں فوراً ”آئے کو کھانا اور کچھ بتایا بھی نہیں تھا۔ وہ اگر کسی بھی وقت فارغ نہ ہو کچھ نہ کچھ ضرور قیاس کرتے لیکن سارا دن آفس میں اس قدر مصروفیت رہی کہ اس طرف دھیان ہی آیا تھا، ہر حال اب ان سے مزید صبر نہیں ہو سکا۔ دسترخوان سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولے۔

”کیا بات ہے کیا مشورہ کرنا ہے اباجی! اب پتا بھی رہے ہے۔“

”نے غلطی اور عدیل کے بعد اماں جی کو دیکھا تو وہ ایک دم رو پڑیں۔

”بیٹا! ہم نے آج ہی شادی میں بڑا دھوکا کھایا۔ وہ سکندر پہلے سے بال بچوں والا ہے۔“

”جی نے بہت واضح انکشاف کیا تھا پھر بھی ٹھیک بھائی یوں دیکھ رہے تھے جیسے کچھ نہ پائے ہوں۔ کتنی دیر بعد بولے۔

”پھر میرا مطلب ہے، کیسے معلوم ہوا آپ کو؟“

”لیکن باتیں چھپی نہیں رہتیں کبھی نہ کبھی ظاہر ہو جاتی ہیں۔“ اباجی بہت مضبوط سے گویا ہوئے۔

”وہ تو ٹھنک ہے لیکن شاہ سکندر کیا کہتا ہے؟ کیا جواز بتاتا ہے اپنی دوسری شادی کا؟ پہلی بیوی مر چکی ہے یا اس اتنے جلد کے قابل نہیں۔“

”خوار کوئی بھی ہو ٹھیک بھائی! ہمارے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔“ عدیل کے اندر پکتا لاوا پھٹنے لگا تھا کہ اباجی انہیں روک دیا۔

”تم خاموش رہو عدیل! جذباتیت کا مظاہرہ ہمارے اپنے حق میں بہتر نہیں ہو گا“ اس لیے کہ ہم بیٹی والے

میں ہماری عزت و ناموس گروی نہیں رکھی۔“ عدیل دبے لہجے میں چیخ پڑے۔

”ابا! تم فک کر رہا ہے۔“ ”ٹھیک بھائی ان کی تائید کرتے ہوئے بولے۔ ”بیٹی والے ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ انہیں عزت و محبت کو گہری نیند سلا کر کھ پکلی بن کر رہ جائیں۔ آپ ٹھیک بھائی کو صاف صاف بتائیں کہ

”میں نے پتا نہ چارہ ہوں۔ تم مجھے بات تو کرنے دو۔“

”سننا تو بہت ہو کر غلطی کو دیکھا پھر قدرے رک کر ساری بات کہ سنائی جس کے بعد طویل خاموشی تھی۔



اماں جی چپکے چپکے اپنے آنسو پونچھ رہی تھیں۔  
میسونہ بھابی بیٹوں بھائیوں کے چہرے دیکھ کر اندر ہی اندر رسمی جاری تھیں۔

اور اباجی کی بوڑھی آنکھوں میں التجا تھی۔ (کوئی ایسا صلہ سوچو کہ تمہاری غیرت کے ساتھ میری بیٹی کا سلامت رہے۔)

”آسیہ کہاں ہے؟“ کتنی دیر بعد ٹھیل بھائی کی سوچوں میں ڈوبی آواز نے خاموشی کا سینہ چاک کیا۔

”اپنے کمرے میں۔“ میسونہ بھابی کی آواز اتنی آہستہ تھی کہ بمشکل سنائی دی۔

”آئیے میرے ساتھ۔“ ٹھیل بھائی کسی ایک کو مخاطب کیے بغیر کہتے ہوئے اٹھ کر آسیہ کے کمرے کی چل پڑے تو ان کے پیچھے غلیل اور عدیل نے فوراً تقلید کی جب کہ اباجی، میسونہ بھابی اور اماں جی کو دیریں اشارہ کرتے ہوئے اٹھ آئے تھے۔

”آسیہ!“ ٹھیل بھائی نے دروازے میں رک کر گم صم بیٹھی آسیہ کو پکارا تو وہ کوشش کے باوجود اپنی جگہ اٹھ نہیں سکی۔

”یہ کیا حالت بنا رکھی ہے بیٹا! خدا انخواستہ کوئی۔“ ٹھیل بھائی نے آگے آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو آنکھوں کے پائے لبریز ہو گئے جس پر وہ فوراً ”نوتے ہوئے بولے۔

”خبردارو نا تمہیں؟ تم بہت ہمار لڑکی ہو اور مجھے صرف ایک بات کا جواب دے دو۔ کیا تم شاہ سکندر کے ساتھ گالی بن کر رہ سکتی ہو؟“ ان کی زبان رکھیں کہنے سے قاصر تھی۔

آسیہ کے لبریز نیانے پھلک گئے۔

”مگر از کم ہم بھابیوں کی غیرت یہ گوارا نہیں کرتی آسیہ! اثبات میں سر ہلانے سے پہلے ہم سب کوڑھ دیتا۔“ عدیل کسی طرح خود پر قابو نہیں رکھ پارے تھے۔

”نہیں۔“ وہ ٹھیل بھائی کے بازو سے پیشانی ٹکا کر سسک پڑی

”خدا کی قسم نہیں۔ میں زندہ رہوں گی تو اپنے ازل و قار کے ساتھ۔“

”یہی تمہارا حق ہے بیٹا۔“ ٹھیل بھائی نے بیٹھ کر اس کا سراپے سینے سے لگایا پھر اباجی کو بیٹھنے کا اشارہ ہوئے کہنے لگے۔

”اباجی! گو کہ شاہ سکندر نے ہمیں دھوکا دیا ہے پھر بھی اگر وہ آسیہ کے ساتھ فہو ہے تو اس کے کھوپڑیاں لٹکا جاسکتا ہے لیکن اس کے لیے ہماری شرط یہ ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کو لے کر آئے۔“

”ہاں جب تک شاہ حیات محمد خود آکر آسیہ کو اپنی ہوسلیم کر کے لے جانے کی بات نہیں کریں گے یہاں سے نہیں جائے گی۔“ غلیل بھائی نے بھی فوراً تاکید کر کے فیصلہ سنایا۔

اور عدیل کے اندر رجتے لاؤ پر جیسے ٹھنڈے پانی کے چھینے پڑنے لگے تھے۔ اباجی نے پر سوچ انداز میں ہارٹی تپوں بیٹوں کو دیکھا پھر اسی انداز میں اثبات میں سر ہلایا، تب ٹھیل بھائی آسیہ کو خود سے الگ کرتے ہوئے لگے۔

”بیٹا! تم بڑھی لکھی سمجھدار لڑکی ہو۔ تمہیں حوصلے سے کام لینا چاہیے۔ رونے دھونے سے مسئلہ حل ہوتے۔ شکر کرو ابھی حقیقت سامنے آگئی ہے، بہر حال مجھے یقین ہے شاہ سکندر آج کل میں ضرور تم سے ملے گا اور تمہیں اس کے سامنے کمزور نہیں پڑنا۔ میری بات سمجھ رہی ہو ناں؟“

اس نے دھیر سے سر جھکا لیا تھا۔



”بی بی جان! میں کچھ دنوں کے لیے کراچی جانا چاہتا ہوں۔“ شاہ سکندر نے بہت سوچ کر ”کچھ دنوں کے

نہاں ہو کہ اب حالات اسے سب کشتیاں چلانے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔  
”کیوں؟“ بی بی جان کے نروٹھے انداز پر وہ چیخ کر بولا۔

”بہن جانتی تو ہیں وہاں میرا گھر ہے بیوی ہے۔“

”بہن جانتی ہوں لیکن باقی نہیں ہوں۔ باقی میں صرف مہر النساء کو ہوں اور بار بار اسے چھوڑ کر جانا تمہارے حق ٹھیک نہیں ہے۔“

”مجھے تو اب کچھ بھی ٹھیک نہیں لگ رہا، یہاں وہاں دونوں طرف لگتا ہے زندگی میرے لیے تنگ ہو گئی۔ بہ اور نے کبھی اپنی ٹھن برداشت نہیں کی۔ آپ جانتی ہیں پھر آپ سب ایسے حالات پیدا کر کے میری موت کا کیا کر رہے ہیں؟ کیا واقعی میری زندگی سے کسی کو کوئی دلچسپی نہیں اگر ایسی بات ہے تو میں خود اپنے آپ کو لیتا ہوں۔“

”بکیرہ خاطر ہو کر اتنے ٹھوس لہجے میں بولا کہ بی بی جان ایک دم خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگی تھیں۔

”میں چاہتا تو آپ کو بتائے بغیر بھی جاسکتا تھا لیکن میں آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا۔ آپ بے شک آسیہ کو

بہن کریں لیکن مجھے اس کے پاس جانے سے روکیں بھی نہیں۔ مجھے اس کے وجود سے زندگی کا احساس ملتا ہے۔ اتنے دن اس کے بغیر میں بتا نہیں کیسے رہا ہوں۔ مجھے جانے دیں۔“ وہ روٹھے اور ضدی لہجے میں بول رہا تھا۔

”بی بی جان سے پوچھ لیا ہے؟“ بی بی جان کو اس پر رحم آیا بھی تو ظاہر نہیں ہونے دیا۔

”میں آپ بتا دیتے گا۔“

اور آگے کہہ کر؟“ بی بی جان نے اسے کھوجتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

”آہ ہوں گا۔“ اس نے ڈیڑھ سی اختیار کی۔ ”میں اسے چھوڑ سکتا ہوں نہ آپ کو، اور آپ کی خاطر میں

ماء کے حقوق بھی تسلیم کر رہا ہوں۔ اس کے باوجود کہ آپ نے میرے ساتھ کوئی تعاون نہیں کیا۔ ماں ہو کر میں۔ بہر حال مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں۔ میں آپ کی تجویزی سمجھتا ہوں، یہاں سیاہوسفید کی مالک ہو کر

باجان کے سامنے بالکل بے اختیار ہیں آپ؟“

”ہاں کچھ نہیں بولیں خاموشی سے دیکھتی رہیں۔“

”میں چلتا ہوں۔ میرے لیے دعا کیجئے گا۔“ وہ ان کی طرف جھک کر بولا اور جب تک بی بی جان نے اس کے سر پر

ہین رکھ دیا۔ وہ کھڑا نہیں ہوا تھا۔ پھر جلد آنے کا کہہ کر ان کے کمرے سے نکلا تو اس کے قدموں میں تیزی سے۔ راہدار کی اختتام پر اچانک مہر النساء نے سامنے آکر اس کا راستہ روک لیا تو وہ کسی طرح اپنی ناگواری

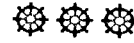
میں نکلا۔

”بی بی جان؟“

جب اس نے اپنے اپارٹمنٹ میں قدم رکھا، اس وقت شام گہری ہو رہی تھی۔ تمام لائٹیں آن کر کے لیے ساری کھڑکیاں کھول کر اس نے پردے سمیٹ دیے۔ اتنے دن بند رہنے کے باعث کمروں میں محض کچھ ناگوار سی محک میں سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ بالکونی میں نکل کر ٹہلنے لگا۔ ساتھ ساتھ گہری سوجن تھا جب اس کے خیال میں آسیر نماز سے فارغ ہو چکی ہوگی تب اندر آکر اس کے نمبر ڈائل کرتے ہوئے اندر بہت خائف ہو رہا تھا۔

دوسری طرف بیل جا رہی تھی اور اس سے پہلے کہ کوئی ریسپونڈ اٹھا تو اس نے فون رکھ دیا۔ شاید راگنہز حوصلہ نہیں تھا۔ کتنی دیر خود کو سمجھانے کے بعد دوبارہ نمبر ڈائل کیے تو دھڑلے سے جواب ملا۔

”اس نے مجھ کو انداز میں سلام کیا تھا۔“  
”وعلیکم۔“ جواب مختصر سی اس کے لیے یہی بہت تھا کہ فون بند نہیں ہوا تھا۔



”کیسی ہیں آپ؟“ شاہ سکندر نے بہت چاہا کہ اپنے اسی پرلے انداز میں بات کر سکے لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم سنو کہاں ہوتے ہو آج کل؟“ میمونہ بھابی کا مقصد اس وقت کچھ جانا تھا بلکہ وہ اپنے مخصوص انداز میں اور اپنی ذہن میں بول رہی تھیں۔  
”ہمیں ہوں۔ آپ کے ٹھہرے، فیملی مطلب ہے بس ابھی پہنچا ہوں۔ آسیر کہاں ہے؟“ میمونہ اچھے موڈ سے حوصلہ پا کر اس نے فوراً آسیر کا پوچھا۔

”آسیر۔“ اپنے کمرے میں ہے۔ بلاؤں؟“  
”جی، بڑی مہربانی ہوگی۔“ وہ بے تابی سے بولا اور پھر اسی بے تابی سے انتظار کرنے لگا۔ گھڑی کی گھم کے ساتھ اس کی دھڑکنیں بھی صاف سنائی دے رہی تھیں۔ جانے کتنے بیل۔ بیت گئے۔ وہ اس کا اڑا چاہتا تھا لیکن اس کے برعکس دوبارہ میمونہ بھابی کی آواز سنائی دی۔

”ہیلو۔ شاہ سکندر!“  
”جی!“ وہ کھڑا ہو گیا۔  
”وہ آسیر نہیں آ رہی۔ میمونہ بھابی نے کچھ پتلی کر کہا۔“  
”کیوں؟“ کیوں نہیں آ رہی۔ کیا کر رہی ہے؟“

”کچھ نہیں اور بہتر ہے کہ ابھی آپ اسے نہ جھجھیں۔“ میمونہ بھابی نے کہہ کر فون بند کر دیا۔  
”وہ کچھ دیر ریسپونڈ کر دیکھتا ہوں پھر کڈل پڑج کر ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا تو دھیرے دھیرے اندر کا زخم بھرا ہو کر تمام خدشات پر حاوی ہونے لگا تھا۔“

”کوئی گناہ کیا ہے میں نے جو منہ چھپا کر پھروں۔ اگر اسے میری پہلی شادی کا معلوم ہو گیا ہے تو ہونا چاہیے کہ کن حالات میں ہوئی۔ اور اسے میری ہر بات کا یقین کرنا پڑے گا۔ میں نے اس کے ساتھ نہیں کی، نہ دھوکا دیا ہے۔ اس کی ناراضگی بھائی میں اسے منانے کا حق رکھتا ہوں۔“  
اس نے ٹک کر ریسٹ واپس پر نظر ڈالی۔ پھر ایک پل میں فیصلہ کر کے گاڑی کی چابی اٹھالی۔  
میں شاہراہ پر گاڑی دوڑاتے ہوئے وہ صرف یہ سوچ رہا تھا کہ واپسی میں آسیر بھی اس کے ساتھ پھر اسی احساس میں گھر کر اس نے گھر کے سامنے گاڑی روکی اور بیل کا بین دیا تھا۔  
گیٹ کھولنے آجاتی آئے تھے اور اسے دیکھ کر فوری طور پر ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ خوش آمدید

روسی۔ علیکم۔“ اس نے اپنے بیٹہ والے انداز میں سلام کیا اور جواب کا انتظار کیے بغیر اندر چلا آیا تو تاجی جوش میں آکر بولے تھے۔

”آؤ! ادھر آ جاؤ!“  
”جی!“ اس نے ٹک کر دیکھا پھر ان کی تقلید میں ڈرائنگ روم میں آتے ہی پوچھا۔

”آسیر کیا کام ہے؟“ تاجی کے بھنبے ہوئے چاٹ بچے پر وہ نظریں پڑا گیا۔  
”میں بیٹے آیا ہوں اسے۔ بہت دن رہ گیا اس نے آپ کے گھر طبیعت کیسی ہے اس کی؟“

”اب تو اللہ کا شکر ہے۔ بہت بہتر ہے۔ تم بیٹھو۔ کیا پیو گے۔ چائے یا؟“  
”جی شکریہ۔ بس آپ جلدی سے آسیر کو بلا دیں بلکہ میں خود آؤں اس کے پاس جانے کے لیے آگے بڑھا۔“

”تاجی ایک دم سامنے آکر بولے۔“  
”آسیر ہیں آ رہی ہے۔“  
”جی۔“ وہ جیل سے باہر فوراً آکر صوفے پر بیٹھ گیا اور تاجی کے کمرے سے نکلنے کے بعد دروازے کی دھجک لگا جہاں سے کچھ دیر بعد جیسے ہی آسیر اندر داخل ہوئی وہ اٹھتے ہوئے بے تابی سے بولا۔

”آسیر۔ کیسی ہو؟“  
”آپ کیسے ہیں؟“ وہ اس کی بے تابی کیسے نظر انداز کر گئی۔  
”یہ گھر چل کر تباہی ہو گیا۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ بلکہ تیاری کیا کرنی ہے بس کہہ آؤ اماں جی اور تاجی

”آؤ! اپنے گھر جا رہی ہو۔“ وہ یوں بولا جیسے وہ سچ سچ اسی انتظار میں گھڑی ہو۔  
”وہ بہت خاموش نظروں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔“

”کچھ، جو بھی بات ہے، ہم گھر چل کر کریں گے۔ میں تم سے کوئی جھوٹ نہیں بولوں گا۔ سب کچھ سچ بتاؤں گا۔ اس کے بعد تم خود فیصلہ کرنا۔“ وہ ایک طرح سے ہتھیار ڈال گیا۔  
”فیصلہ ہو چکا۔“ آسیر کے بے تاثر بچے پر وہ ٹھٹھک گیا۔

”کیا مطلب؟“  
”مجھے آپ کی کوئی بات نہیں سنئی۔ جھوٹ نہ سچ۔ اس کے باوجود میں آپ کے گھر جانے کو تیار ہوں لیکن

”میں نہیں چھوڑے گا۔“ آسیر نے باجوان اور بی بی جان سے نہ صرف اجازت لی ہے بلکہ وہی اگر کچھ یہاں سے ہاتھ نہیں لے گا تو اس کا جتنی لہجہ اس قدر مضبوط تھا کہ کچھ دیر تک وہ اسے دیکھتا رہ گیا پھر قدرے جھجکا کر بولا۔  
”ابھی اگر ناہوتا تو بیٹے آئے اور میں نے تمہیں اسی وقت بتا دیا تھا کہ وہ میری تم سے شادی پر قطعی رضی

”میں۔“ اسی لیے میں سب کر چھوڑا تھا۔“  
”اور ساتھ میں یہ عہد بھی کیا تھا کہ جب تک وہ مجھے تسلیم نہیں کرے گا آپ وہاں نہیں جائیں گے۔“ وہ

”تو تم میرے وہاں جانے سے خفا ہو؟“  
”نہیں۔ میں ایسی کسی بات پر خفا نہیں ہوں کیونکہ میں جانتی ہوں۔ آپ خوشی سے وہاں نہیں گئے ہوں گے

”دن بھر ہی آپ کو لے گئی ہوگی اور میری مجبوری یہ ہے کہ میں اپنے ماں باپ اور بھائیوں کے سر نہ جھکا سکتی اور نہ ہی اپنی عزت و وقار کھو سکتی ہوں۔ میری انا خود داری مجھے اس بات کی اجازت نہیں

”کیا یہ؟“ میں سب کچھ ڈاؤ پر لگا دوں۔“ وہ بہت مضبوط سے منہ پر ہنسنے لگی۔  
”کچھ نہیں ہے کہ میں حجت میں شکرت کو اکر رہی ہوں۔ مجھے مہر النساء کی سوکن بننا منظور ہے لیکن

”نہیں۔“ میں نے کہا کہ آپ کے بابا جان نے مجھے سزا خانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ میں اپنی نظروں میں گرئی





شادی کا ذکر بھی کیا اور وہیں سے احمد حسن سلسلے میں بیٹھا تھا۔ جب وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے کمر  
احمد حسن خود کو بولنے پر آمادہ کر سکا تھا۔

”تم نے بہت غلط کیا۔ کم از کم بھابی سے اتنی رازداری نہیں برتنی چاہیے تھی۔ جب جان ہمد  
اس طرف سے مسلسل تمہارے خلاف سازش ہو رہی ہے تب تو بھابی کو جانا اور بھی ضروری  
وہ ہر طرح کی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو جائیں۔ اور اب تو ظاہر ہے  
ان کا اعتماد محجوب ہوا ہے بلکہ عزت نفس پر بھی گہری جرح پڑی ہے۔ اس لیے ان کا مطالبہ بنا  
تبیں تسلیم کرنا پڑے گا۔ احمد حسن نے چند لمحے رک کر اسے دیکھا پھر کہنے لگا۔

”اسیہ بھابی کوئی جاہل گنوار عورت نہیں ہیں۔ پڑھی لکھی محمد ار خاتون ہیں جو آج اپنے پیسوں  
ہو جائیں تو ڈاکٹر اسیہ کے نام سے معاشرے میں ان کا مقام ہو گا۔ انہیں تمہارے بابا جان نے ج  
بکا اور وہ تو کوئی معمولی عورت بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ پھر تم ان سے کیسے توقع کر رہے ہو  
کی شرافت ہے اور تم سے محبت کی انتہا کہ وہ تمہاری ساری خطا میں معاف کر رہی ہیں۔ یعنی کو  
نہیں اٹھا رہیں۔ اس کے برعکس بن کیسے تمہارا یقین کر رہی ہیں کہ پہلی شادی کرنے میں بھی تمہارے  
محبوبی ہوگی اور شاہ پور جلسے پر بھی تم مجبور ہو گئے۔ درہ پہلے تو تمہارا محاسبہ ہونا چاہیے تھا۔ کیا  
کہہ رہا ہوں؟“

شاہ سکندر نے ذرا سانس میں سر ہلایا تھا۔

”اور ایک بات جو تم معمول رہے ہو وہ یہ ہے کہ جب عزت و وقار پر بات آتی ہے تو  
کوئی کھدروں میں جا چھٹی ہے۔ پھر اسیہ بھابی جیسی لڑکی تو اپنی اور خاندان کی ناموس پر جان سے  
محبت کیا چیز ہے۔ نہیں اگر واقعی ان سے محبت ہے تو ان کے حق کے لیے لڑنا ہو گا۔ جھلے ا  
اور ان کے خاندان سے تنقید ہونے کے بغیر جانبداری سے سوچو۔“  
”میں کیا سوچوں احمد حسن! جب مجھے معلوم ہے کہ بابا جان کسی قیمت پر اسیہ کو تسلیم نہیں کریں گے  
مابوی سے کہا تو احمد حسن زور دے کر بولے۔  
”تم کو شش تو کرو۔ اپنی بات منوانے کے لیے کئی حربے استعمال کر سکتے ہو۔ ہو سکتا ہے کہیں ا  
ہو جائیں۔“

”میں سارے حربے پہلے ہی آزما چکا ہوں۔ انہیں اگر ماننا ہوتا تو اس وقت مان لیتے۔ شاید  
غلطی ہوئی۔ مجھے پہلی شادی کے وقت یہ شرط رکھنی چاہیے تھی کہ اس کے بعد بابا جان خود میرے  
کے گھر والوں کے سامنے دست سوال دراز کریں گے۔“

”جو وقت انہوں سے نکل گیا اس پر مت بچھتاؤ۔ آگے کی سوچو۔ انشاء اللہ کوئی نہ کوئی صورت  
گی۔ احمد حسن نے اس کا کندھا تھپک کر تسلی دی۔ پھر گھڑی دیکھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ بہت دیر ہو  
چاہیے۔ تم بھی چلو۔ یہاں نہیں کھانے وغیرہ کی پرالیم ہوگی۔“  
”نہیں کوئی پرالیم نہیں۔ ایک دو دن کی بات ہے پھر میں شاہ پور چلا جاؤں گا۔ وہ بہت س  
کھڑا ہوا تھا۔

”میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ خدا کرے تم بابا جان کو لسنے میں کامیاب ہو جاؤ۔ اور ہاں جا  
پہلے مجھے فون ضرور کر دینا۔“

”اوکے۔ وہ احمد حسن کو رخصت کر کے دوبارہ اندر آیا تو شاہ پور جلسے سے پہلے اسیہ سے ملنے کا  
سوچنے لگا تھا۔

شاہ سکندر سوچی ہوئی ترکیب کے مطابق اسیہ کے چچا کے گھر جا پہنچا جن سے اس کی پہلے دا

ملاقات ہو چکی تھی۔ آخری بار اس۔ رز تب بڑے بھتیجا اور ساڑھ بھابی تہہ جارہے تھے۔ تب ان کی بیٹی طاہر  
سے یہ بات ہوئی تھی۔ اس وقت طاہرہ ہی نے گیت کھولا اور اُسے دیکھ کر خوشی کے ساتھ حیرت کا اظہار  
کرتے ہوئے بولی۔  
”آپ کیسے راستہ بھول گئے اور یہاں کہاں ہیں؟“  
”آپ کیسے راستہ جانچنے لگا؟ میں کا سوال نظر انداز کر گیا۔  
”کیا جان ہیں یا آفس جا چکے؟“ اس کا سوال نظر انداز کر گیا۔  
”کیا مطلب؟“ ان کے پرہیزگار ہونے کو اب اندہ نہیں آئیں گے۔“  
”میں نے قریب پڑی پوچھ لیا تھا۔ وہ اندر آتے ہوئے لولا اور سامنے چچی جان کو دیکھ کر  
”اے نہیں۔“  
”میں کیا تو انہیں بھی اس کی آمد پر بہت ہوئی لیکن انہوں نے ظاہر نہیں ہونے دی۔  
”پھر رجو۔“  
”نہیں میں آپ اور چچا جان۔ میں اور میرے گزر رہا تھا سوچا آپ سے ملتا چلوں۔“ وہ اپنی آمد کے بہت  
سے عجز سے گرا آیا تھا لیکن وہی نام سا جگہ سکا۔  
”اچھا کیا، بہت خوشی ہوئی۔“ انڈر جیل کر بیٹھو۔“ چچی جان نے کہا۔  
”جی نہیں، یہیں ٹھیک ہے۔“ اس نے تلفظ کیا لیکن طاہرہ اسے ڈرانگ روم میں لے آئی اور بیٹھنے کا  
اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

”ابرا بھی کچھ دیر پہلے آفس کے بے نکلے ہیں۔ آپ کو ان سے کوئی کام تھا؟“  
”جی نہیں۔ اصل میں میں ابھی شاہ پور سے آ رہا ہوں۔ ایک دوست بھی ساتھ تھا۔ اُسے ہمیں قریب  
ڈرا کیا۔ پھر آپ کے گھر پر نظر پڑی تو مجھے چپ چاپ نکل جانا چاہا نہیں لگا۔ سوچا کھڑے کھڑے تحریر  
ہی معلوم کروں۔“ اس نے بہت سہج کر بات بنائی جس پر یقین کرتے ہوئے طاہرہ بولی۔  
”اے اسیہ باقی آپ کے ساتھ نہیں ہیں۔ خیر یہ جتنے ناشتا کریں گے۔“  
”جی ٹھیک رہے۔ ناشتا ہم نے راستے ہی میں کر لیا تھا۔ البتہ ایک کپ چائے پینے میں کچھ مضائقہ نہیں اور اس  
سے پہلے اگر آپ اجازت دیں تو میں اسیہ کو فون کروں۔“ وہ خوبصورتی سے اصل مقصد کی طرف آیا تھا۔  
”بہت تلفظ کر رہے ہیں آپ سکندر بھابی۔ مہلا اس میں اجازت کی کیا بات ہے۔“ طاہرہ نے فون  
پٹ اٹھا کر اس کے قریب کارڈز رکھ دیا پھر جانے لگی کہ وہ ٹوک کر لولا۔  
”ایسا کریں۔ آپ بلا میں اسیہ گھر پہنچیں تب تکے گا۔“  
”اچھا۔“ طاہرہ اپنے طور پر جانے لگا تو اسی پھر نیچے گھٹنے ٹیک کر بوجھنے لگی۔ کہاں کے نمبر  
لاؤں؟“

”ادھر آبادی کے گھر ہیں اسیہ۔ اس نے بتا کر اشارہ اٹھایا اور بظاہر اُسے دیکھنے میں معروف لیکن سارا  
دعائیں طاہرہ کی طرف تھا۔  
”اسلام علیکم بھابی۔ میں طاہرہ ہوں۔“  
”جی ٹھیک ہوں۔ آپ کیسی ہیں؟“  
”ادھر اسیہ باجی سے کام تھا۔ پلیر انہیں بلادیں۔“  
”ٹھیک رہی میں آؤں گی کسی دن۔“  
”پھر پچھ دیر کی خاموشی کے بعد بیسے ہی طاہرہ کی آواز سنائی دی وہ ایک دم اُسے دیکھنے لگا تھا۔  
”میں اسیہ باجی؟ کیا کر رہی تھیں؟“  
”یہیں میں آپ کی بوریت دور کر رہی ہوں۔“ طاہرہ نے ہنستے ہوئے ریسور اُسے تھما دیا اور اٹھ کر چلی گئی تب  
”کیا تم کو ظن ہے کہ اپنی بیوی سے بات کرنے کے لیے مجھے دوسروں کا سہارا لینا پڑ رہا ہے۔“



دیکھنے لگی۔

”پھوپھو! اشعار و رسمیت آئے ہیں!“

”سیما بھائی! عدیل بھائی کی گاڑی سے سیما بھائی کو اترتے دیکھ کر وہ بے خیالی میں عمر کا ہاتھ کے استقبال کو بڑھ گئی تھی۔“

سونیا کی آواز پر سیما بھائی اٹھ اٹھیں۔ اور پھر سارے گھر میں ایک قورق مچ گئی۔

”میں نے اسلام آباد سے پلٹتے ہوئے عدیل کو فون کر دیا تھا کہ یہاں ہمیں ریسٹو کرسے اور وہ یاد رہا ورنہ مجھے خاصی پریشانی ہوتی۔“ سیما بھائی نے اٹاٹا جی کے ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا۔

”خیر عدیل بھائی کی یادداشت اتنی کمزور تو نہیں ہے جو انہیں آپ کو ریسٹو کرنا یاد دہارنے بھائی کی طرف سے کہا تو سیما بھائی فوراً بولیں۔“

”کیوں ایک بلڈ میں بازار میں نہیں معمول آیا تھا۔“

”جناب معمولاً نہیں تھا بلکہ جان بوجھ کر چھوڑ آیا تھا۔ کیونکہ آپ لوگوں کی شاپنگ ختم ہوئے رہی تھی۔“ عدیل بھائی اس واقعے کو یاد کرتے ہوئے غلط ہو کر بولے تھے۔

”یو جی بکلی پھلکی باتوں میں چلنے کا دور چلا۔ پھر کھانا۔ اس کے بعد وہ سو گیا اور میرے کمرے میں آگئی۔ کیونکہ سیما بھائی، اٹاٹا جی کے ساتھ اسی کے مسئلے پر بات کرنے لگی تھیں اور وہ ہرٹ ہوئی تھی حالانکہ کسی نے اس پر جتا یا نہیں تھا کہ شاہ سکندر اس کی پسند تھا۔ بس اپنے آپ ہرٹا تھا کہ اس نے اگر غلطی نہیں کی تب بھی سب کو مشکل میں ڈالنے کی سزا وار ضرور ہے۔“

”آسیہ! میمون بھائی نے اس کے کمرے میں جھانک کر پوچھا۔“ چائے پیو گی؟“

”جتنی بھائی۔ ایسے ہی بہت کھیرا بیٹ ہوئی ہے۔“

”چلو جی بھائی! میمون بھائی اندر آگئیں اور کرسی کی پیچھے کرا رام دہ انداز میں بیٹھتے ہوئے بولیں۔“

”چڑھیں تمہارا سر کھارہی ہیں۔“

”ہائے بھائی! یہ تو میری شہزادیاں ہیں! اس نے دائیں بائیں سونیا اور سمیتہ کو اپنے بازوؤں اور باری باری دونوں کے گال چومنے لگی تو میمون بھائی چھیر کر کہنے لگیں۔“

”بس کچھ وقت ہے۔ جب تمہارا اپنا آجائے گا تو انہیں پوچھو گی بھی نہیں۔“

”جی نہیں۔ یہ تو میری جان ہیں۔“

”کون کس کی جان ہے۔“ سیما بھائی سنتی ہوئی آگئیں۔

”آئیے بھائی! آپ ہمیں بھی اپنا حال احوال سنائیں۔“ وہ اپنے قریب آن کے لیے گھبرناٹے ہوئے۔

”میں تمہارا احوال سننے آئی ہوں۔ کہاں ہیں آج کل شاہ سکندر؟ سیما بھائی نے بیٹھتے ہوئے بہت سنبل کر بولی۔

”صبح اُن کا فون آیا تھا۔ کہہ رہے تھے شاہ پور جا رہا ہوں۔“

”اپنے اٹاٹا کو لینے؟“

”جی۔ مجھے تو یہ بھی کہاہے۔“ وہ اپنے ناخنوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”چلو اپنے آئے تو اچھا ہے۔ ویسے تمہارے بھائی جان بہت مایوس تھے۔ کہہ رہے تھے اگر شاہ والدین اب بھی گئے تب بھی آسیہ کا سوکن کے ساتھ گزرا مشکل ہوگا۔“ سیما بھائی نے کہا۔

”یہ سب تو بعد کی باتیں ہیں۔“ وہ ہاری ہوئی سی لگ رہی تھی۔

”نہیں آسیہ! یہ ساری باتیں بھی ابھی سوچ لو تو اچھا ہے۔ ورنہ بعد میں تو تمہارے پاس سونے کے اور کوئی راستہ نہیں ہوگا۔“ میمون بھائی نے ناصحانہ انداز میں کہا تو سیما بھائی ان کی تائید کرتے کہنے لگیں۔

”میونہ شک کہہ رہی ہیں۔ تمہارے بھائی جان نے مجھے اسی مقصد سے بھیجا ہے کہ آسیہ کو سمجھا دینا تمام لوگوں پر غور کرنے کے بعد شاہ سکندر کے ساتھ جانے کی بات کرے۔ اور یہ کہ آیا آئندہ زندگی میں تم اس کے ساتھ خوش رہ سکتی ہو کہ نہیں۔ انہوں نے سمجھوتہ کرنے سے منع کیا ہے۔ کیونکہ یہ چند دنوں کا نہیں ساری زندگی کا معاملہ ہے۔“ میونہ بھی نکلی اور سمجھدار لڑکی ہو۔ میرا خیال ہے یہ ساری باتیں خود بھی سمجھ سکتی ہو شاہ

”نہی کی پہلی بیوی جتنی نہیں بھی عورت ہے۔ جتنی کھنے دے گی یا نہیں۔“

”ہاں۔ میں نے گاؤں کی عورتوں کے بارے میں بڑی باتیں سنی ہیں۔ جادو لوگوں کے ذریعے سونکوں کو دوا

”فیہی۔ اللہ تو بہ! میمونہ بھائی جبر جبری لے کر گاؤں کو ہاتھ لگانے لگیں۔“

”وہ سر جھکانے سن رہی تھی۔ ذرا سی پھلکیں اٹھا کر میمونہ بھائی کو دیکھنے لگی۔“

”یہ ان باتوں میں اگر صداقت ہو جب بھی ہم یقین نہیں کرتے۔ میں سکندر کی بیوی کے مزاج کی بات

”یہی تھی اور یہ کہ وہ سکندر کو آسیہ کے خلاف بہکا بھی سکتی ہے۔ پھر اس کے ساتھ سارا خاندان ہوگا اور یہ

”میں نے سیما بھائی سے اپنا رشتہ میمونہ بھائی کی طرف موڑا تو دونوں جھاد جیں آپس میں بات کرتے ہوئے

”دیر گزرا اس کی موجودگی فراموش کر گئیں۔“

”پھر تازہ شکل ہوگی۔“ اُن جاہل عورتوں کے ساتھ یہ کہاں مقابلہ کر سکتی ہے۔“

”اسی لیے ٹھیک نے کہا ہے کہ ہر پہلو سے غور کرنے کے بعد سکندر کے ساتھ جانے کا سوچے۔“

”وہ بھائی اکتا دھوکا دیا ہے سکندر نے۔ دیکھنے میں کیسا لگتا ہے۔ ایمان سے میرا تو دل چاہتا ہے وہ

”انے نے اور میں شوٹ کر دوں اسے۔“ میمونہ بھائی ایک دم جذباتی ہو گئیں پھر چانک آں پر غور پڑی تو

”نہ ہو کر بولیں۔“ سوری۔ سوری آسیہ۔ تم مائد نہیں کرنا۔ ویسے میں یہ سب تمہاری محبت میں کہہ رہی ہوں۔“

”اور کیا۔ میں نے تو جس دن سے سنا ہے انہیں کہہ رہی ہوں۔ بھلا کیا کیا تھی آسیہ میں ایک سے ایک

”بارشتہ موجود تھا۔“ سیما بھائی نے کہا تو وہ اندر ہی اندر جبر جبر ہو کر بولی۔

”خوبی قسمت میں تھا وہی ملا۔ اور جانے آگے قسمت میں کیا لکھا ہے۔“

”بس جہاں آدمی مات کیسا تا ہے اسے قسمت کا لکھا کہہ کر خود کو بہلانے پر مجبور کر تا ہے۔“ سیما بھائی نے

”منے سے کہا تو وہ اچانک۔“ سر اٹھا کر بولی تھی۔

”میں مجبور نہیں ہوں بھائی۔ اور ابھی تو تبدیل ہے۔ کچھ انتظار کرو اس کے بعد فیصلہ ہوگا کہ مات کیسے

”ہی۔“

”وہ بڑی دیر سے انتظار کر رہا تھا کہ بابا جان کے مہمان رخصت ہوں تو وہ اُن کے پاس جا کر بیٹھے اور انہیں

”پرکھتی میں ہوا کرنے کی کوشش کرے لیکن مہمان جانے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ وہ ٹھہلتا ہوا کبھی

”ہمیں ماں کبھی ٹیس پر اُٹھتا ہوتا۔ اور ابھی تک اس کے ذہن میں باقاعدہ کوئی پلان نہیں تھا کہ بابا جان

”انڈہ کرنے کے لیے اسے کیا طریقہ اختیار کرنا ہے۔ یہ نہیں تھا کہ اس نے سوچنے کی کوشش نہیں کی۔

”بت موچنے کے بعد بھی اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔“

”بھلا اپنے باب کے پاس۔“ وہ یونہی ٹھہلتا ہوا کمرے میں آیا تھا کہ مہالسا نے ایک دم بچہ اس کے بازوؤں

”باندھ دیا اور فوراً پلٹ کر وارڈ روم میں چلنے لگا تلاش کرنے لگی تھی۔“

”مہالسا سکندر کا ذہن پہلے ہی اُلجھا ہوا تھا۔ مہالسا کی بدتمیزی پر اس سے اُلجھ کر وہ مزید اپنا دماغ خراب

”میں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے۔“ ناموشی سے بچنے کو لیے ہوئے۔ بدتمیز سے نمر داز ہوگا اور غامی ہے دھیانی

”بچنے کو دیکھنے لگا جس کی حرکتیں اور شرارتیں بڑی معصوم سی تھیں۔ اس کے پسینے پر چڑچڑے کر بیٹھ جاتا اور وہیں

”بیٹھ کر بعد غور و فکر، غاف کرانے لگتا تو بے دھیانی میں بھی اس کا ہاتھ اسے اختیار اُسے تمام لیتا جس

”اندھ لکھا کر ہنستا۔“ اس کا کھنگھہ ہٹ میں زندگی تھی۔ قوس و قزح کے رنگوں سے بھی کھنگھہ کی مانند

جسے دیکھ کر اپنے آپ ہونٹوں پر مسکراہٹ درآئے۔  
 "چلو غافلہ! ہر انسان اپنے کام سے خارج ہو کر اپنے کو اس کے سینے پر سے اٹھانے لگتا ہے  
 میں اس نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھام لیا۔  
 "کس کے دھوکے میں میرا ہاتھ پکڑا ہے شاہ! میں مہر النساء کے چھتے پہنچے  
 کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر ایک دم اس کے ہاتھ کو یوں جھٹکا دیا کہ وہ جھٹکتے جھٹکتے بھی اس کے قریب  
 "ایک بات پوچھوں مہر النساء! ایمان داری سے جواب دینا! وہ اس کی محفوظ انگلیوں کو دھونے  
 "آپ بے ایمانی کرتے ہو شاہ اور مجھ سے ایمان داری کی توقع رکھتے ہو۔ خیر! جو کچھ چاہو کیا بلو  
 کی مسکراہٹ بڑی دلفریب تھی۔

"کتنی جھنجھٹ کرتی ہو مجھ سے؟" شاہ سکندر نے نظریں اس کے چہرے پر جمادیں۔  
 "یہ سوال اگر آپ اولین شب کرتے تو میں محبت میں جان دینے کی بات کرتی! مہر النساء  
 سے جواب دے کر اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا تو وہ بے صبری بولا۔  
 "اور اب۔ میرا مطلب ہے میں ابھی کی بات کر رہا ہوں۔ اب کتنی محبت کرتی ہو؟  
 "اب تو محبت میں دکانداری شامل ہو گئی ہے۔ دو اور لوگوں کو کہہ کر زور سے ہنسی پھرنے  
 میں بھرتے ہوئے ہوئی۔  
 "کیوں آغا خشک ہے ناں۔ کوئی ہم سے محبت کرے گا تو ہم بھی کریں گے ورنہ ہمارے ہا  
 مقدری ہیں کہ یونہی لٹاتے پھریں! شاہ سکندر کو اس کے سینے کھلوانے اور اٹھلانے پر غصہ آ رہا تھا لیکن بڑے ضبط سے چھٹاؤ  
 بچنے کو فوراً ہلکا کر اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"بس یا اور کچھ؟"  
 "ایک بات اور۔ اگر میں اسیر کو یہاں لے آؤں تو تم۔"  
 "نہیں! وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔ وہ یہاں نہیں آ سکتی کسی قیمت  
 کہیں غلطی سے بھی اسے یہاں لے کر آئے تو میں آپ کے سامنے اس کا گلا دبا دوں گی!"  
 "اس سے پہلے میں تمہیں شوٹ کر دوں گا! وہ خفے سے کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور قصداً اس  
 بجاری جو ستلے دبا کر آگے بڑھا تھا۔  
 "ہائے ظالم! مہر النساء تکلیف سے بلبلا کر اپنے پاؤں پر جھکی تھی۔ وہ یکسر نظر انداز کرتا کر سے  
 لاؤنگ میں بی بی جان بڑی بہو کے ساتھ جانے کہاں جانے کو تیار کھڑی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی بولنے  
 "تم چلو گے سکندر؟"  
 "کہاں؟" وہ رک کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔  
 "شہر بانو کو لینے جا رہے ہیں۔ خیر سے اس کی گود بھرنے والی ہے۔" بی بی جان نے خوش  
 اسے ایک دم اسیر کا خیال آیا۔ فوراً آگے آ کر بی بی جان کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگا  
 "اسے کی بھی ایسی ہی حالت ہے بی بی جان! اسے بھی لے آئیں!"

"تم اپنے حواس میں نہیں ہو سکندر۔ جس لڑکی کا ذکر بھی اس گھر میں منوع ہے۔ تم اسے لے  
 رہے ہو۔ چلو لوہین دیر ہو رہی ہے۔ بی بی جان ناگواری سے اس کے ہاتھ ہٹا کر چل پڑیں۔  
 وہیں کھڑا اس کے بعد بابا جان کے کمرے کا رخ کیا۔ غالباً اس پر جنون سوار تھا۔ جو کوئی کوئی  
 تھا اور چاہتا تھا ہر کام اس کی حسب منشا آنا غافلہ ہو جائے۔ بھی بی بی جان کا جواب سن کر بھی  
 جان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔  
 "مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے بابا جان!"

ہاں کہو! آبا جان نے ستر پا اسے دیکھا۔  
 "اب جانتا ہوں آپ اسیر کو اپنی بہو تسلیم کر کے یہاں لے آئیں! اس نے بغیر کسی تہید کے کہا تو بابا جان  
 میں جا رہا ہوں میں خود ار ہو گئیں۔  
 "نانی جیسے شہر لکھنے میں خود ار ہو گئیں۔  
 "نہ نے شاید پہلے بھی نہیں منع کیا تھا کہ ہمارے سامنے اس کا ذکر نہیں کرنا!  
 جس طرح اس نے ذکر کے بغیر میری کوئی بات ممکن نہیں ہو سکتی اسی طرح اس کے بغیر میں خود  
 رہوں۔ بات کیوں نہیں سمجھتے آپ! کیوں اسے میری زندگی سے نکلنے کے درپے ہیں۔ لہجہ جھوٹی  
 "اب اس کو زب نہیں دیتیں بابا جان! کہہ کر اپنی حیثیت و فرتے کا خیال کیا ہوتا ہے وہ ان کی ناگواری  
 اٹھانے کے باوجود جتنا کیا کہ وہ سب جان چکے۔

"اب کتنا چاہتے ہو تم؟"  
 "اب میری بات اچھی طرح سمجھ رہے ہیں۔ اور مزید سن لیں۔ اسے کو آپ کسی بھی نام سے پکاریں وہ کہلانے  
 کی ہے۔ جو غصہ میرا ایک اور وارث پیدا کرنے والی ہے۔ کیا آپ اس سے رشتہ توڑ سکیں گے۔  
 "نہیں! آپ اپنے خون کو۔ ہرگز نہیں! اس لیے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ آپ ابھی اسے یہاں لے آئیں۔ یا اگر  
 "ناہی وجہ سے یہاں نہیں ہے تو میں اسے فارم یا دیوں کہ اپنی میں کھلے دل کا اور اس سے پہلے آپ  
 سے تسلیم کرنا ہے!"  
 "اگر نام نہیں اس کے سامنے جھکا نا چاہتے ہو! بابا جان جیسے ساری بات سمجھ کر مطمئن سے ہو گئے۔ جہی  
 "اگر اسے بولے تھے۔  
 "نہیں۔ میں ابھی بوری کو اس کا جائز مقام دلانا چاہتا ہوں تاکہ اس کے بطن سے پیدا ہونے والی میری اولاد  
 احساس کمتری کا شکار نہ ہو! اس نے اپنے طور پر نہیں احساس دلانے کی سعی کی۔

"بہت دور کی سوچنے لگے ہو سکندر! اچھی بات ہے۔ بابا جان جلنے کیوں مغلوظ ہو رہے تھے جبکہ وہ  
 رہی اندر تھکاتے ہوئے مشکل بھیے کو داخل رکھ کر بات کر رہا تھا۔  
 "پھر کب چل رہے ہیں! کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے پوچھا تو بابا جان نے چونک کر اسے دیکھا۔  
 "کہاں؟"  
 "اگر اسے پاس! اسے لینے! اس نے فوراً کہا تو بابا جان اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب چلے گئے  
 "اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔  
 "بچو! اس گھر کی بہو کہلوانا اگر اس لڑکی کا خواب ہے تو کہہ دو اس سے کہ اس کا خواب بھی شرمندہ تعبیر  
 میں ہو گا۔ تم پر اس کا جادو چل سکتا ہے تم پر نہیں۔ اور تم کیسے ہو سکندر جو اس کے کہنے پر چلے آئے۔  
 "اب تو سوچا ہوتا کہ جسے تم نے پہلے تسلیم نہیں کیا اسے اب کیونکر مانیں گے!"

"میں اس کے کہنے پر نہیں آیا بابا جان! اب غلط سمجھ رہے ہیں۔ اور اس لڑکی نے کہیں اس گھر کا خواب نہیں  
 بھلا۔ وہیں چوہے سے گھر میں میرے ساتھ خوش تھی۔ اسے یہ پروا بھی نہیں تھی کہ آپ اسے تسلیم کرتے ہیں  
 نہیں اور اب کوشا ہے یہی بات ناگوار گزری جو میرے ہنسنے سے گھر کو  
 "افسوس کو اس نہیں کرو سکندر! بابا جان نے دھاڑ کر اسے خاموش کرا دیا ایک معمولی لڑکی کی خاطر تم ہم سے  
 ستا کر رہے ہو!  
 "وہ معمولی لڑکی نہیں میری بیوی ہے! جس کی عزت و آبرو کی حفاظت میرا فرض ہے۔ وہ بھی دبے لیجے۔  
 "نہیں! اس نے روکا ہے تمہیں تمہارے فرض سے۔ جاؤ کرو اس کی چوکیداری!"  
 "اب تو یہاں موجود ہے اس کی چوکیداری کون کرے گا؟ اس نے بہت طنز سے مہر النساء کی طرف اشارہ





”کیا کہہ رہا تھا وہ؟“ اباجی نے جواب دینے سے پہلے سوال اٹھایا۔  
 ”کہہ رہے تھے اُن کے بابا جان کل آئیں گے اور اس وقت اُن کا مجھ سے ملنا ضروری ہے۔“  
 شاہ سکندر کی بات دہرائی۔  
 ”کوئی مضائقہ نہیں چلی جاؤ۔“

اباجی نے اجازت دے دی تو وہ جلدی سے اپنے کمرے میں آکر کھڑے نکالنے لگی۔  
 دونوں بھانجروں کو پہرے کے کھانے سے فارغ ہوتے ہی شاپنگ کے لیے جلدی چلی گئی۔  
 بڑے بیٹوں نے بھی ابھی کے ساتھ تھے صرف چھوٹا عمر آماں جی کے پاس سو رہا تھا، اس لیے  
 سے تیار ہو گئی اور پھر جیسے ہی شاہ سکندر کی گاڑی کا بارن سنا دیا وہ کھڑے کھڑے آماں جی سے  
 باہر نکل آئی۔

”السلام علیکم“ اُس کی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے شاہ سکندر مبہم سا مسکرایا تھا۔  
 ”وعلیکم السلام“ بوجو ابامیہ کی مسکراہٹ کھلی ہوئی تھی۔  
 ”تھیں کس گاڑی، تہاے ہونٹوں پر مسکراہٹ تو آئی۔“  
 اُس نے تشکر کا اظہار کیا پھر اسپید سے گاڑی رہائشی ایریا سے نکال کر مین شاہراہ پر آیا  
 کہنے لگا۔

”میرا خیال تھا تم نے میرا اعتبار نہیں کیا ہو گا اُس لیے میرے ساتھ چلنے پر آمادہ نہیں ہوگا  
 زبردستی کرنا پڑے گی۔“

”کس بات کا اعتبار؟“ اُس نے پوچھا تو وہ ہر میں اُسے دیکھ کر بولا۔  
 ”وہی جو میں نے کہا کہ میں کل بابا جان کو لے کر آؤں گا۔“

”یہ جھوٹ ہے یا سچ اس کی بابت میں بعد میں پوچھوں گی پہلے یہ بتائیں آپ کو یہ خیال کیوں  
 میں آپ کا اعتبار نہیں کروں گی۔“

”کیا میں تمہارا اعتبار کھو نہیں چکا؟“ وہ اُنٹا اُس سے پوچھنے لگا۔  
 ”جیتا نہیں ابھی تک تو میں نے کچھ بھی نہیں سوچا میں نے کیا کھویا، کیا پایا ساکے سود و زیاں  
 میں اپنے گھر کی چھت تلے آپ کے ساتھ بیٹھ کر کروں گی اور اس وقت میں آپ سے بہت لڑو  
 لڑوں گی سکندر۔“ وہ اچانک ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔

”آس۔۔۔ آس۔۔۔ آس۔۔۔“ وہ پریشان ہو گیا۔  
 ”رووگی تو میں گاڑی کسی ٹرک سے جسے ماروں گا۔“

”اُس نے بھیلیوں سے اُنھیں روک کر ہاتھ نیچے کر لیے۔  
 ”اب گڑے کل اور آنے والے کل کی کوئی بات نہیں ہوگی۔ بس آج کے دن کو ہم یاد گار بنا  
 اس کے لیے ضروری ہے کہ تم کھکھلا کر ہنسو۔ ایسی ہنسی جس کی جلتیرنگ زندگی کی آخری سانسوں تک  
 سماعتوں میں گونجتی رہے۔“

شاہ سکندر نے نظام ہر یکے چھلکے انداز میں کہا تھا۔  
 ”سکندر۔۔۔ وہ ٹرپ کر بولی۔

”ایسی باتیں کریں گے تو میں چلتی گاڑی سے کود جاؤں گی۔“  
 ”اور میں تمہیں کودنے دوں گا۔“ شاہ سکندر نے دھیرے سے اُس کا ہاتھ تھام لیا پھر پوچھنے

”اُس کریم کھاؤ گی؟“  
 ”نہیں۔۔۔ وہ بے ساختہ مسکرائی تھی۔

”چلو تو پھر یہ کھانا سنو اُس نے ٹیپ کا بٹن آن کر دیا۔

”جب کوئی پیار سے بلائے گا  
 تم کو ایک شخص یاد آئے گا۔“

”اسی نے فوراً اُٹھ کر ٹیپ بند کر دیا۔  
 ”اے بند کیوں کر دیا؟“ وہ وہلہ اسکرین سے آگے کہیں بہت دور دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”مجھے نہیں سننا۔۔۔ وہ دھڑکتے ہوئے بولی۔  
 ”سننا نہیں، کہنا نہیں کچھ نہیں پھر کیا کرنا ہے؟“

”آپ وہ باتیں نہیں جن کے لیے آپ مجھے لے کر آئے ہیں۔“ وہ اصل موضوع کی طرف آگئی۔  
 ”آپ وہ باتیں نہیں جن کے لیے آپ مجھے لے کر آئے ہیں۔“ وہ اس کے حال پر چھوڑ کر شیشے

لیکن وہ اُن کی کر کے ٹکٹا لے گا۔ پتا نہیں کس موڈ میں تھا۔ وہ اُسے اُس کے حال پر چھوڑ کر شیشے  
 سے باہر دیکھنے لگی۔ ساحل سے اتنی تم ہوا سرگوشیوں میں جانے کیا کہہ رہی تھی۔ پھر لہروں کا شور سنانا  
 دینے لگا تو وہ سے دیکھ کر بولی۔

”میں پانی میں نہیں جاؤں گی۔“  
 ”کیوں؟“ وہ ایک سوالیہ نظر دیکھ کر گاڑی پارک کرنے لگا۔

”بس نہیں دل چاہ رہا نہیں جاؤں گی۔“  
 ”گاڑی سے اُترو گی یا یہ بھی نہیں؟“ شاہ سکندر نے اُس کی ہر بات میں نہیں کو جتایا تو وہ جلدی سے اپنی

طرف کا دروازہ کھول کر اُتر گئی۔  
 ”آؤ۔۔۔ وہ گاڑی لاک کر کے اُس کے قریب آیا تو اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بے خیالی میں بولا تھا۔

”یہ لہریں ہمیں ساتھ دیکھ کر خوشی سے چلتی ہوئی ہماری طرف آتی ہیں۔ آج آخری بار ادا نہیں چلنے دو  
 پھر تو یہ بھی تم سے میرا احوال دھندلے گا۔“

”آسیہ نے چونک کر دیکھا تھا۔  
 ”چلو اُدھر ریسٹورنٹ میں چلتے ہیں۔“ جب شام اُترنے لگی تب لہروں کا تعاقب کریں گے۔“ وہ اُس کی پوری

کھلی آنکھوں میں دیکھ کر ذرا سا مسکرایا پھر اس کا کندھا دبا کر چمکنے کا اشارہ کیا تو وہ کسی معمول کی طرح چلنے لگی تھی۔  
 ”آپ۔۔۔ آپ نیچے پریشان کر رہے ہیں۔“ وہ اُس بات میں الجھی تھی۔ بیٹھے ہی کہنے لگی۔ ”جو بھی بات ہے

صاف صاف کہہ دیں۔“ میں ہر بات سننے کے لیے تیار ہوں۔ یہ بھی کہ بابا جان نے اُسے انکار  
 کر دیا ہے۔“

”فرق کر لیا ہو تو تم کیا کر دو گی؟“ شاہ سکندر نے اُس کے چہرے پر نظر میں جما کر پوچھا تو وہ ایک دم خاموش  
 ہو گئی جبکہ دل انجانے اندیشوں سے کانپنے لگا تھا۔

”ارے۔۔۔“ شاہ سکندر ذرا سا ہنسا۔ ”ابھی تو کہہ رہی تھیں ہر بات کے لیے تیار ہو۔ چلو جانے دو اب کوئی  
 مذاق نہیں ہوگا۔“ موڈ ٹھیک کر دیا۔ میں ڈرنکس لے کر آتا ہوں۔“

وہ اسی خاموشی سے اُسے جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔  
 شاہ سکندر اپنی مدد آپ کے تحت ٹرے اٹھا کر اُس میں ڈرنکس کے ساتھ لوازمات بھرے لگا۔ پھر کچیر

کاؤنٹر پر رک کر اُس کے پاس آ کر بیٹھنے ہی کہنے لگا۔  
 ”بتاے، پچھلے دو دن میں بہت مصروف رہا ہوں۔ اتنا کھانے کا وقت بھی نہیں نکال پایا۔“

”اُس کی کیا مصروفیت تھی؟“ وہ پھیلی پر غور کر لیا کہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔  
 ”میں نہیں گفت دینا چاہتا تھا۔“ وہ کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک بھاری لفافہ نکال کر اُس کے سامنے

رکھ دینے لگا۔ ”یہ تمہارے لیے ہے۔“ جس پارکٹ میں ہم رہ رہے ہیں وہ میں نے تمہارے نام سے  
 خریدا ہے۔ اس میں اس کے کاغذات ہیں۔ اور تمہارے کلینک کے لیے ایک پلاٹ کے کاغذات بھی ہیں۔“

”آپ نے یہ سب۔۔۔“ وہ قدرے الجھی تھی۔  
 ”کیا میں نے تم سے وعدہ نہیں کیا تھا کہ جب سب ٹھیک ہو جانے کا جب میں تمہارے کام میں رکاوٹ

نہیں بنوں گا بلکہ تمہارا ساتھ دوں گا۔ چلو یہ لغاف بیگ میں ڈالو اور کھانے میں میرا ساتھ دو۔ میں بہتر ہوں نہ وہ ہلکے پھلکے انداز میں آخر میں بیٹ پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”اس کا مطلب ہے کل بابا جان آ رہے ہیں نہ وہ اچانک اندیشوں سے نکل کر مسکرائی پھر لغاف ہاتھ بندھ گئی۔“ میں اسے کہاں رکھوں۔ آپ اپنے پاس رہتے دیتے جب میں گھراؤں کی جب ”

”اوں ہوں نہ وہ ٹوک کر بولا۔“ اچھی بابا جان کو لینے جانامے۔ کہیں ادھر ادھر رکھ کر معمول جانوں بھی یہ اب تمہاری چیز ہے صرف تمہاری ”

”تھینک یو“ اس نے لغاف پیرس میں ڈال لیا پھر چلو چلتے لگی۔ ”صرف بابا جان آئیں گے؟“

”کیا چاہتی ہو تم؟ پوری بات لے کر آؤں“ وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ بڑی خوبصورت ہنسی تھی۔ آنکھوں میں ننھے ننھے دیپ جھلنے لگتے تھے۔

گھونٹ گھونٹ پیسی حلق سے آتارے ہوئے بہت احتیاط سے اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر یہاں سے نکل کر سیدھا گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا کہ وہ اس کا بازو حلق کر بولی۔

”سکندر! ہمیں یہاں رہنا ہی ہے۔“ وہ کہہ کر گاڑی کا لاک کھولنے لگا پھر بیٹھ کر اس کی بازو سے کھڑکے والوں کو نہیں پکارا کرتے۔“ وہ کہہ کر گاڑی کا لاک کھولنے لگا پھر بیٹھ کر اس کی بازو سے کھڑکے والوں کو نہیں پکارا کرتے۔“

دروازہ کھول دیا۔ آسیر خوش اور ممکن سی تھی۔ اس کے لہجے پر غور ہی نہیں کیا اور نہ یہ محسوس کیا کہ وہ ایسی کا تمام راز بولتی آئی ہے۔ ادھر سے بس ہوں ہاں میں جواب تھا۔ جب گھر کے سامنے گاڑی رکی تب وہ اسے دیکھا۔

”اینا خیال رکھنا“ ”کتنی؟“ وہ غمراہ سے ہنسی۔ ”اتنا کہ ہمارے درمیان جو ایک رات کا فاصلہ ہے تو اگر اس رات کی سحر ہونے میں صدیاں بیت

تب بھی تم ” سکندر! ” وہ بے اختیار اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ گئی۔ ”وقت بڑھا ختم ہے اس۔ محبت کرنے والوں کی آزمائش مطلوب ہو تو پھر جاتاہے۔ جاؤ خدا حافظ! کا ہاتھ جو کمر کر بولا۔

”خدا حافظ! وہ دھیرے سے اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ نکال کر گاڑی سے اتری تھی کہ شاہ سکندر سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ حیران ہو کر دیکھتی رہی پھر سر جھٹک کر اندر آگئی۔

”تو پاس مل کر آئی ہے۔“ میوز بھائی اسے دیکھتے ہی گنگنائے لگیں۔ ”آپ کو بس موقع چاہیے۔“ وہ قدرے چھینپ گئی۔

”کیا ہوا سکندر اندر نہیں آیا؟“ میا بھائی نے گیت کی طرف دیکھتے ہوئے تعجب سے کہا۔ ”کل آئیں گے اپنے بابا جان کے ساتھ۔“ وہ بنا کر محض میوز بھائی کے شروع جملوں سے بچنے کی فادہ اپنے کمرے میں آگئی۔ پرس اور دوپٹا اتار کر بیٹھ رہا تھا پھر الماری میں سے کمرے سے نکال کر واش کیا۔

”میں کھانا دھوئے اور بیچ کر کمرے سے بعد دوبارہ کمرے میں آئی تو پیرس اٹھا کر الماری میں رکھتے ہوئے خیال آئے پر اس نے شاہ سکندر کا دیا ہوا لغاف اس میں سے نکال لیا اور بیٹھ کر کھانا کھا لیا۔

”کدو بھائی دروازے میں آکر کہنے لگے۔“ ”آسیر! ہمیں اب با رہے ہیں۔“

”جی! وہ کچھ کا غذات جو ہاتھ میں آگئے تھے۔ وہ اور لغاف وہیں رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔“ ”یہ کا غذات کیسے ہیں؟“ عدیل بھائی نے دو قدم آگے آکر پوچھا۔

”آپ دیکھیں میں اباجان کی بات سن کر آئی ہوں نہ وہ عجلت میں کہتی کمرے سے نکل آئی

اتان اور اماں جی دونوں یہ بہنے کے لیے بے چین تھے کہ شاہ سکندر سے اپنے بابا جان کے ساتھ آئے کیا ملے گی۔ آیا ان کی طرف سے کوئی شرائط تو نہیں ہیں اور یہ کہ وہ آسیر کو نہیں کراچی میں رکھنے کا اپنے ساتھ شاہ پور لے جانے کا۔ وزیر دوزخو۔ ظاہر ہے وہ ماں باپ تھے۔ جہاں بیٹی کا گھر آباد رکھنا چاہیے

تھے وہاں سکون کا خوف بھی تھا۔ نہیں اباجی! ان کی طرف سے کسی قسم کی شرط نہیں ہے۔ وہ آرام سے بیٹھ کر ماں باپ کو اطمینان دلانے لگی۔ نہ ہی شاہ سکندر نے مجھ سے شاہ پور چلنے کی بات کی ہے۔ بلکہ انہوں نے تو یہاں جوا پارٹمنٹ ہے۔ وہ میرے نام سے خرید لیا ہے اس کا مطلب ہے کہ ہم یہیں رہیں گے۔ باقی کل وہ انہیں گے تو آپ خود بات کر لیجئے گا۔“

”کون؟“ اس سے بات کرنے کو کہہ دی ہو؟“ عدیل بھائی جہلنے کب کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ ”شاہ سکندر سے؟“ وہ اسی روان میں بولی تھی۔

”شاہ سکندر اپنے باپ کا بیٹا ہے۔ تنہا بیچ اور کھینا کر اپنے باپ کی دی ہوئی گالی کو بھانٹے غلط ثابت کرنے کے اس پر ہم ثابت کر کے تیار ہے اور ہم سب کے منہ پر مار گیا ہے۔“

”تو کیا سٹ اور غصے کی انتہائی کیفیت میں عدیل بھائی نے وہ سارے کا غذات اس کی طرف اچھال دیئے تھے۔“ وہ بھی بیٹھ آنکھوں سے اپنے اظرف اڑتے کا غذات کو دیکھنے لگی جبکہ ذہن پر اچانک بابا جان کے الفاظ بھڑکے ہوئے برسرے لگے تھے۔

”شاہ سکندر نے اگر تمہیں اپنی رکھل بنا کر رکھا تو اس کا معاوضہ بھی دیا ہو گا۔“



”تو کیا یہ سب۔“ آسیر نے اپنی ساری ہمتیں یکجا کر کے ادھر ادھر بکھرے کا غذات سیٹنا شروع کیے تو اسے اچھے اس کی عزت وقار نا خودداری بھرے بازار میں بیٹھ گیا ہو۔ بہت ضبط کرتے کرتے بھی اس کے آنسو رخسار پر چھٹک گئے جنہیں فوراً ہی اس نے دوپٹے کے پلوں میں جذب کر لیا اور ایک آخری کاغذ جو اباجی کے

ہونٹوں سے پھڑپھڑا رہا تھا اسے اٹھا کر کھن ہوئی تو کہنے لگی۔ ”بابائی! میں نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا جس پر شرمندہ ہوں۔ اور اپنی زندگی میں میں نے کسی کے ساتھ برائی کی

نہ کی برائی سوچی جو میں سمجھوں کہ مجھے اسی کی سزا ملی ہے۔ اس کے برعکس آزمائش ہو سکتی ہے۔ اور آپ ہی دیکھا کرتے ہیں کہ آزمائشوں سے گھر کر قیمت کو کتنا التزام بنا صرف بڑی ہی نہیں ایمان کی کمزوری کی علامت

میں ہے اور مجھے اپنے قسمت سے کوئی لگ نہیں میں اگر آنسو بہاؤں گی تو اس خیال سے کہ میں آپ سب کے لیے کھانا بنا دیتی۔“ آخر میں اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

المنی جو پہلے عدیل بھائی کے غصے کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگی تھیں۔ وہ اب اس کی باتوں سے الجھ رہی تھیں۔

”نہ کی مجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے تو وہ انہیں شاہ سکندر کی طرف سے اطمینان دلا رہی تھی پھر اب کیا ہوا ہے؟“

”ننھے مجھی تو بتاؤ کیا ہوا ہے؟ کیوں تم میں بیٹی کے پیچھے بڑے ہو عدیل؟“

المنی نے اپنی سمجھ کے مطابق عدیل بھائی کو ٹوکا تو اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے وہ کمرے سے نکل آئی اور کمرے میں آئے ہی اس نے تمام کا غذات لغاف میں ڈال کر الماری میں رکھے پھر واش روم میں بند ہو گئی۔

ننھے پہلے کی طرح غم و اندوہ کی تصویر بن رہا تھا۔ وہ سب کو اپنے لیے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن یہ کہاں ممکن

تھا۔ وہ تو خود پر بے حسی کا خول چڑھانے میں بھی ناکام ہو گئی تھی۔ اپنی چیخوں کا گلا گھونٹ لیا مگر آنسو سارے ٹوٹ کر رہ گئے تھے۔

کتنی دیر تک وہ دروازے کے ساتھ بیٹھانی نکا کر روتی رہی۔ اسے دکھ صرف اس بات کا تھا کہ وہ بچہ بچہ قیمت لگا گیا تھا۔ گویا سب کچھ پہلے سے طے تھا اور وہ اس کی جھوٹی محبت کے فریب میں آکر اپنا سب کچھ ہار چکی تھی۔

”آسیہ!“ میونہ بھابھی شاید کمرے میں آکر پکار رہی تھیں۔ اس نے جلدی سے واٹس مین کا ٹل کھول کر پانی کے چھینے مارے پھر پوچھے سے چہرہ چھپتپاتی ہوئی نکلی تو میونہ بھابھی اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر افسوس بولیں۔

”تم اس شخص کے لیے رو رہی ہو جو باقاعدہ پلان کے تحت تمہاری زندگی سے کھیل گیا اور صرف تمہارا نہیں اور بھی جانے کتنی اس کے فریب میں آئی ہوں گی۔“

”دروں کامیں کچھ نہیں کہہ سکتی مگر اپنے بارے میں مجھے یقین تھا کہ میں انمول ہوں۔“ اس کے لیے کلام میونہ بھابھی کو ترپا گیا۔

”تم ابھی بھی انمول ہو۔ اور تمہیں اپنے ہر عمل سے ثابت کرنا ہے کہ شاہ سکندر جیسا لیر اپنے مقدر کا میاں ہو کر بھی تمہارا کچھ نہیں لگاؤ سکا۔“

اس کے ہونٹوں پر دکھ بھری مسکراہٹ نے ذرا دیر کو چھب دکھائی تھی جس سے میونہ بھابھی نظر پر ہلکی ہوئیں۔

”خیر دفع کرو میں یہ کہنے آئی تھی کہ تم سیماء کے ساتھ اسلام آباد جا رہی ہو۔ صبح آٹھ بجے کی فلائیٹ ہے یا کر رہ گئی۔“

”یہ اچانک میرے جانے کا۔“ وہ کچھ الجھ کر دیکھنے لگی۔

”ابا جی نے کہا ہے اور میرا خیال ہے، یہی ٹھیک ہے۔ ایک تو تمہاری آب و ہوا تبدیل ہو جائے گی۔ یہاں کے حالات پر قابو پانے میں بھی کچھ آسانی ہوگی۔“ میونہ بھابھی نے کماؤ وہ قدرے تشویش سے پوچھے

”یہاں کے حالات سے کیا مطلب ہے آپ کا؟“

”عدیل اور خلیل۔ تم جانتی ہو خصوصاً عدیل کو، جنہیں روتے ہوئے دیکھے گا تو جانے جوش جذبات ڈالے۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم ابھی سیماء کے ساتھ چلی جاؤ کیونکہ اپنے اس دکھ کے ساتھ سمجھو اگر تمہیں بھی کچھ وقت لگے گا۔ تم اپنے آنسو چھاسکتی ہو لیکن تمہاری آنکھوں میں جو وحشت اتر آئی ہے کہ

کر عدیل کسی طرح بھی شاہ سکندر سے بدلے لینے سے خود کو نہیں روک سکے گا۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو میونہ بھابھی نے اسے کم صدمہ دیکھ کر پوچھا۔

وہ سب سن رہی تھی لیکن حرکت کرنے سے قاصر تھی۔ کوشش کے باوجود ذرا سا اثبات میں سر نہیں میونہ بھابھی اس کا سر ہاتھ ہاتھوں میں لے کر کہنے لگیں۔

”سنو۔ اپنے آپ کو سنبھالو، ہم سب تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔ اور اتنے پیار کرنے والوں کے ذرا کبھی تنہا نہیں ہوگی۔ یہ میں تمہیں یقین دلائی ہوں۔“

اس کی آنکھوں میں پانی جمع ہو کر قطرہ قطرہ میونہ بھابھی کے ہاتھوں پر گرنے لگا تھا۔

شاہ سکندر جب خوشی میں داخل ہوا تو تقریباً ”نصف شب بیت چکی تھی۔ سب لوگ اپنے اپنے کمرے میں سو رہے تھے یا جاگ رہے تھے۔ وہ کچھ دیر لاؤنج میں کھڑا رہا اور دیوار کو خود پر ہنساتا دیکھتا رہا پھر پوچھ بھول

اپو اپنے کمرے میں آیا تو مہرا النساء کو بچے کے ساتھ بے خبری کی نیند سوتے دیکھ کر اچانک بھڑک چھا۔

”مہرا النساء!“

ہند میں بڑا کرانٹھ بیٹھی اور اپنے زور زور سے دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھ کر اسے دیکھنے لگی۔

”نہیں تو تم بھی نہیں نکل جاؤ یہاں سے اسی وقت۔“ شاہ سکندر کا اب شاید اسی پر بس چل سکتا تھا۔

”کہاں جاؤں؟“ وہ سوئے ہوئے بچے پر نظر ڈال کر پوچھنے لگی۔

”جنم میں۔“ وہ دھڑا پھر واٹس روم کا رخ کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ منٹ میں میرا کمرہ خالی کر دو اور خبردار آئندہ

نی اجازت کے بغیر یہاں آنے کی جرأت نہ کرنا۔“

”جلی بھی آتا! تیرا باپ تو لگتا ہے پاگل ہو گیا ہے۔“ مہرا النساء اس کے واٹس روم میں بند ہوتے ہی فوراً اٹھی جلدی بچے کی فیڈر، تھراپس اور دوسری چیزیں سمیٹ کر باسکٹ میں ڈالیں پھر ایک بازو میں بچے کو اٹھا کر

رے سے نکل گئی۔ حالانکہ وہ اس سے خائف ہونے والی نہیں تھی کیونکہ اسے سب کی حمایت حاصل تھی۔

اس وقت شاہ سکندر کی آنکھوں میں جانے کیسی وحشت تھی جس نے حقیقتاً اسے سہا دیا تھا اور اسے لگا کہ

اس کی بات سے ذرا بھی اختلاف کیا تو وہ پیچھے اس کا خون کر دے گا۔

کچھ دیر بعد شاہ سکندر واٹس روم سے نکلا تو پہلے ادھر ادھر دیکھ کر مہرا النساء کے چلے جانے کا یقین کیا۔ پھر رومہ کر

رے کا دروازہ بند کر دیا۔ اس کے پاس سوچنے کو کچھ نہیں تھا کیونکہ وہ اپنی ساری تدبیروں میں ناکام ہو گیا تھا۔

جہاں سے چلا تھا واپس اسی مقام پر آکر اس کے اندر غم، غصہ اور نفرت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ یوں لگ رہا تھا

جیسے اب زندگی اسے گزارے گی کیونکہ ساری امانتیں، آرزوئیں اور زندہ رہنے کی خواہش تو وہ آسیہ کے ساتھ

پیچھے چھوڑ آیا تھا اور اب آگے کی زندگی اس کی نہیں ہوگی۔

وہ سڑتے سڑتے لگا لگائی میں نکل آیا۔ تاریک رات میں دو در در تک کہیں کوئی روشنی نہیں تھی نہ کوئی آواز،

ہوا بھی ساکت تھی اور اس کے اندر ہولناک سناٹا۔ اسے لگا جیسے اس کا دل بھی ٹھہر گیا ہو۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر اس

نے دھڑکنوں کو محسوس کرنا چاہا تھا کہ اچانک اندر شور مچ گیا۔ جس سے گھبرا کر وہ کمرے میں آیا اور ٹکیوں میں منہ

مکھ کر گرتا لیکن مختلف آوازیں تمام رات اسے مسلسل جھجھوٹتی رہی تھیں۔

جب سارے گھر میں زندگی بیدار ہو گئی تب وہ بہت بڑھال ہو کر سویا تھا اور بس دھنسنے اس کے بعد بابا جان

نے خواہش کے کمرے میں آکر اسے اٹھا دیا تھا۔ اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بہت ناراض ہوتا اور ناراض تو ابھی

بھی تھا لیکن اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے خاموشی سے دیکھنے لگا۔

”رات تم کس وقت آئے؟“ بابا جان نے بیڈ پر بیٹھے ہوئے پوچھا تو اس نے فوراً اپنی ٹانگیں سمیٹ لیں

لیکن جواب قدرے تاخیر سے دیا۔

”مثلاً! بارہ بجے کے بعد۔“

”پھر تو تم نے نہیں ناحق اٹھا دیا۔ تمہاری نیند بھی پوری نہیں ہوئی ہوگی۔ سو ناچا ہوتا۔“

”جی نہیں اب تو اٹھ گیا ہوں۔ آپ کہہ دیے کوئی کام ہے؟“ وہ قصداً سادگی سے پوچھا کہ ان کا چہرہ دیکھنے لگا جس پر

کئی عزم کر دھونے کا کوئی طالع نہیں تھا۔

”کام تو کوئی نہیں ہے۔ بس ابھی مہرا النساء نے بتایا۔ رات تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو ہم تمہیں دیکھنے

چلے آئے۔“ بابا جان نے کہا تو اسے ایک دم یاد آیا کہ رات اس نے مہرا النساء کو کمرے سے نکال دیا تھا۔

”مہرا النساء نے غلط کہا آپ سے۔ میں رات ٹھیک ٹھاک آیا تھا۔ بس کچھ سفر کی تھکان تھی۔“

”وہ تو ابھی بھی نظر آ رہی ہے، کتنے دنوں میں اترے گی؟“ بابا جان نے اس کی سرخی مائل آنکھوں میں دیکھ کر

دکھ بڑا کرانٹھ بیٹھی اور اپنے زور زور سے دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھ کر اسے دیکھنے لگی۔

”ہوں۔“ بابا جان بنکارا بھر کر ادھر ادھر دیکھنے لگے جیسے اس بات کو طول نہ دینا چاہتے ہوں۔ تر کر کھڑکی کے قریب گیا اور پردے سمیٹتے ہوئے کہنے لگا۔

”سب کچھ آپ کی مرضی کے مطابق ہو گیا۔ میں آئیہ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ آیا ہوں اور میرا اب کبھی آپ اس کے بارے میں نہیں سوچیں گے۔ میرا مطلب ہے اسے اور اس کے گھر والوں پہنچانے کا خیال تک نہیں آتا چاہیے۔“

”ہمارے پاس ایسی فضول باتیں سوچنے کا وقت نہیں ہے سکندر حیات۔“ بابا جان ناگواری کھڑے ہوئے پھر جاتے جاتے بولے تھے۔

”تم ناشتے وغیرہ سے فابغ ہو کر ہمارے پاس آنا۔ چوہدری کرم الہی کے ڈرے پر جانا ہے تم سارے اس نے پردہ چھوڑ کر انہیں جاتے ہوئے دیکھا پھر سر ہٹک کر واش روم کا رخ کیا۔ شاور لے کر قہدا اپنے کمرے میں رہا اس کے بعد نیچے آیا تو پہلے بی بی جان کے پاس حاضری دی پھر ان ہی کے کمرے پر آکر بیٹھا اور ابھی ناشتے کے لوازمات پر نظر ڈال رہا تھا کہ مہر النساء بچے کو لے کر آگئی اور آؤ کر سی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”شاہ! بابا جان کا حکم ہے کہ میرا ناشتا کھانا سب آپ کے ساتھ ہو گا۔“ وہ جو اس کی آمد سے بیٹھے اسے دیکھنے لگا تھا اس کی بات سن کر یوں بن گیا۔ جیسے کچھ سناہی نہیں اور اپنے سامنے پلیٹ میں سلا کر کھانے لگا۔

”آپ روزانہ اسی وقت اٹھو گے تو میرا کیا ہو گا۔ میں تو اتنی دیر تک بھوکی نہیں رہ سکتی۔“ مہر النساء نہ دینے کے باوجود بولے جاری تھی۔

”مجھے تو صبح اٹھنے کے ساتھ ہی کچھ کھانے کو ملنا چاہیے ورنہ مجھے چکر آنے لگتے ہیں۔ اور ہاں آپ میں میری کچھ چیزیں رہ گئی ہیں اگر اجازت ہو تو لے لوں؟“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو قدرے توقف سے پھر گیا ہوئی۔

”مجھے آپ کی سمجھ نہیں آتی شاہ! کبھی اتنا چیختے ہو، کبھی ایک دم خاموش ہو جاتے ہو۔ اس شہر والے بھی ایسے ہی گرتے ہو یا اس کے ساتھ۔“ مہر النساء نے فوراً ”نچلا ہونٹ دانتوں میں ڈال دیا۔ کیونکہ کر سی دھکیل کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”اس شہر والی کے ساتھ اپنا موازنہ کبھی مت کرنا مہر النساء! کیونکہ تم میں اور اس میں زمین آسمان! تم نے اپنی جگہ اس گھر میں بنائی اور اس نے میرے دل میں گھر کیا۔ اور جو دل میں گھر کر جائیں وہ فوراً نکل جائیں ان کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ یہ باتیں تمہاری سمجھ میں شاید ہی آئیں۔“ وہ تنفر سے اگیا۔ اور مہر النساء اس کے پیچھے دیکھتی رہ گئی تھی۔

\*~\*~\*

سیما بھابی کے ساتھ اسلام آباد آجانے سے اسے تو کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ کیونکہ وہ تو دیہی گھرانوں میں اتر کر اس کی دنیا ویران کر گیا تھا۔ پھر یہ ظاہری تبدیلیاں کیا معنی رکھتی تھیں۔ اس پر وہ کہیں بھی کھڑی ہو جائے اس کے اندر کا موسم نہیں بدل سکتا تھا۔ اور نہ سوچوں کے دھارے کا کھینچ سکتے تھے۔ پھر یہاں تو اس کی سوچیں اور بے لگام ہو گئی تھیں۔ کیونکہ وہ ”وقتاً“ اپنی شوخ باتوں دھیان بنانے والی میونہ بھابی یہاں نہیں تھیں اور سیما بھابی ان کی طرح نہیں تھیں۔ مگر کہ انہاں اس کے حال پر نہیں چھوڑ دیا تھا مگر ہر وقت اس کے ساتھ لگ کر بھی نہیں بیٹھتی تھیں بلکہ جب کہ ہوتیں تو کچھ دیر اس کے پاس بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں اور آخر میں چند جملے اسے سمجھانے اور حوصلہ ہوتے۔

قلیل بھائی ان دنوں بے حد مصروف تھے۔ صبح کے گئے رات کو لوٹنے اور انہوں نے ابھی تک اس کے ہتہ قلیل بھائی کوئی تبصرو نہیں کیا تھا۔ جس سے اسے گمان ہوتا کہ جیسے ان کے علم میں ہی نہیں ہے۔ اس کے سامنے ٹھیک لگ رہا تھا کہ ہر وقت اس کے سامنے اس ذکر کو چھین کر یہ احساس نہیں دلایا جاتا کہ اس کے لیے اسے سنا ہے۔ اور جیسا کہ اس کا دل چاہتا تھا کہ کچھ وقت کے لیے اسے تنہا چھوڑ دیا جائے تو یہاں اپنے خالی میسر آتی تھی۔

قلیل بھائی آفس جاتے ہوئے دونوں بچوں اشعر اور سمیہ کو ساتھ لے کر نکلتے اس کے بعد سیما بھابی بھی جاتے۔ منٹ اس کے پاس بیٹھتی پھر چوہ ملازمہ کے ساتھ گھر کے کاموں میں لگتی تھیں تو ذہن پر تک انہیں اس کے لیے میں جھانکنے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ کیونکہ اس دوران کبھی ان کی کوئی ملنے والی آجاتی یا اگر انہیں ہاں جانا ہوتا تو آتی تھیں۔

ہر دوپہر میں اشعر اور سمیہ کے آنے سے کچھ دیر کو باپ چل چلا جاتی۔ لیکن کھانے کے بعد پھر وہی خاموشی کہ سیما کے ساتھ بچے بھی سو جاتے تھے۔ اور اس کا سونا جانا بلکہ شاید ہونا نہ ہونا بھی برابر تھا۔ کیونکہ وہ بہت کم صم رہتی تھی۔ اس کے پورے وجود میں بس ایک ذہن تھا جہاں مسلسل درپچوں کے کھلنے اور بند ہونے کی آواز گونجتی رہتی تھی۔ سارا دن اور کبھی ساری رات ان کھلتے بند ہوتے درپچوں پر نظریں جمائے جمائے اس کے ہاتھوں تک جائیں پھر بھی وہ ان میں دیکھتے رہنے سے باز نہیں رہتی تھی۔ کیسی دلچسپ حقیقتیں تھیں جن پر کائنات ہونے لگا تھا۔

”نچھے یقین دلاؤ آس! کہ تم میری ہو چکی ہو اور اگر یہ خواب ہے تو مجھے ہمیشہ کی نیند سلا دو۔“ وہ اسے پا کر بچ چلا۔

”یہاں میں کبیں اپنی خوبصورتی نہیں تھی اور آج مجھے ہر شے حسین لگ رہی ہے۔ اس لیے کہ کبھی بھی سمت نے پہلے نظر تمہارے چہرے پر پڑی ہے۔“ اس کے لہجے کی شدتوں نے اس وقت بھی پلکیں نم کی تھیں۔

”تمہاری آنکھوں کی گہرائیوں میں اتر کر میں نے جانا کہ سمندر میں کتنے سیپ چھپے ہیں۔“

”سکندر حیات۔“ اس نے اپنی جلتی ہوئی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر سوچا۔

”میں جانا ہی تھا تو اتنی سختی جتانے کی کیا ضرورت تھی۔ کچھ ایسا کرتے کہ میں تمہارے محرمے آزاد ہوں۔ اب دل کو کیسے سمجھاؤں کہ وہ سب فریب تھا۔ تم نے کبھی محبت کی ہی نہیں تھی۔ جب ہی تو میرے دل کی باجاؤ کر۔“

”آئیہ! قلیل بھائی کی آواز پر اس نے چونک کر آنکھوں سے ہاتھ ہٹائے اور اٹھنے لگی تھی کہ وہ کمرے کے راتے ہوئے بلکے پھٹکے انداز میں بولے۔

”کیا ہو رہا ہے؟“

”کچھ نہیں۔“ وہ دزدیدہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگی جو جانے کسی چیز کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے کے لیے پھر بیڈ پر اس کے سامنے آرام سے بیٹھتے ہوئے بولے۔

”تمہارے ساتھ چائے پینے کا موڈ ہو رہا تھا۔“

”میں ابھی لاتی ہوں۔“ وہ اٹھنے لگی کہ روک کر بولے۔

”میں نہیں۔ تم آرام سے بیٹھو۔ میں سیما سے کہہ کر آیا ہوں۔ وہ لا رہی ہیں۔“ وہ سر جھکا کر اپنے ناخن دیکھنے لگی۔

”جی۔“

”بیٹا! خوش رہا کرو۔ زندگی میں کرانسیس آتے ہیں۔ ان پر رونے کڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ سمجھتا کہ تمہیں کچھ سمجھانے کی ضرورت ہے کیونکہ تم خود بہت ذہین ہو۔ تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا، بھول جانا ممکن نہیں ہے، لیکن یہ تو کر سکتی ہو کہ اسے خود پر طاری مت کرو اور یہ سوچ لو کہ اس میں تمہارے ہونے کی کیا وجہ تھی۔“

”کھلیں بھائی نے بہت نرمی سے بات شروع کی تھی کہ سیما بھی چائے لے کر آئیں۔“

”بھٹو سیما! تم بھی بیٹھو، میں آئیہ سے بات کر رہا ہوں۔“ انہوں نے رُے میں سے چائے کا کپ اٹھا کر کھائے۔

”جو کچھ ہو گیا، میں اس پر بات نہیں کروں گا کیونکہ مجھے پلٹ کر دیکھنے کی عادت نہیں ہے۔ اتنا تو تمہیں آئیہ! آخر میری بہن ہو۔“

اس نے چائے کی پیالی میں سے اٹھتی بھاپ سے نظریں ہٹا کر انہیں دیکھا اور بس ذرا سا مسکرائی تھی۔

”اور میں تمہارے گزرے کل کے بارے میں بھی سوچنا نہیں چاہتا۔ البتہ آنے والے کل کو ضرور اور تمہیں بھی اسی کی فکر کرنی ہے۔ کیا عمر ہے تمہاری۔ بائیس تیس سال، اور آگے پہاڑی زندگی ہے۔“

”ایک سال بھی میں تمہیں شاہ سکندر کے نام پر گنواؤں کی اجازت نہیں دوں گا۔ یہ اتنے سارے دن قصداً تمہیں نہیں چھیڑا کہ اپنے لیے یہ تم جتنا رو سکتی ہو رو لو۔ آج کے بعد تمہاری آنکھوں میں ایک اس شخص کے نام کا نہیں ہونا چاہیے کیونکہ وہ مرا نہیں ہے۔“ شلیل بھائی کے کھمرے ہوئے لہجے میں

”تنبیہ تھی۔“

اس کے ساتھ سیما بھی کھلی گئی تھیں۔

”تمہیں میں نے اسی لیے اپنے پاس بلا لیا ہے کہ وہاں اماں جی ہر وقت رونا دھونا مچا کر یہ احساس ہوتا ہے کہ تمہارے ساتھ اچھا نہیں ہوا، قسمت خراب ہے وغیرہ وغیرہ۔ مجھے یہ سب باتیں پسند نہیں ہیں۔ اس پر اس سے جانے کا سوچنا بھی نہیں۔ چاہو تو ہمیں کسی ہاسپتال میں جاب کر لو بلکہ ابھی کچھ عرصہ آرام کرو۔ اچانک خیال آیا تھا جو آرام کا کہہ کر غالباً اس کی ڈیوری تک ٹال دیا۔ تو سیما بھی اسے دیکھ کر بولی۔“

”ہاں ابھی تو یہ خود مریض لگ رہی ہے۔“

”پھر بھی تم اس کا خیال نہیں کر رہیں۔ کتنے دن ہو گئے اسے یہاں آئے ہوئے، ایک بار بھی ڈاکٹر نہیں لے گئیں۔ صبح پہلا کام یہی کرنا۔ ڈاکٹر جہاں آرا کا کلینک قریب ہی ہے۔“ انہوں نے بیوی کو ٹوک کر کہا۔

”جناب میں کئی بار اس سے کہہ چکی ہوں۔ یہ صاف منع کر دیتی ہے۔“

”اب منع نہیں کرے گی۔“ شلیل بھائی کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے پھر گھڑی دیکھ کر بولے۔

”صبح میں چھٹی کروں گا۔ مجھے جلدی مت اٹھانا۔“

”خیریت؟“ سیما بھی نے خالی کپ رُے میں رکھتے ہوئے پوچھا لیکن وہ ان سنی کرتے کرتے

”آپ بھی سوئے جا رہی ہیں؟“ اس نے سیما بھی سے یونہی پوچھ لیا۔

”کو تو نہیں سوتی۔“

”نہیں نہیں، آپ سوئیں۔ مجھے بھی نیند آرہی ہے۔“ وہ کہتی ہوئی اٹھ کر بیڈ کی چادر ٹھیک کر کے بھا بھی جاتے جاتے رک کر بولی۔

”مسو، تمہارے بھائی جان نے جو کہا۔ ٹھیک کہا تمہیں ان کی باتوں پر عمل کرنا ہے۔ اور ہاں ایک بار سیما بھی کو جانے کیا یاد آیا، ہاتھوں میں پکڑی رُے دوبارہ نیل پر رکھ کر اس کے قریب چلی آئیں اور

بڑا اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے کہنے لگیں۔

”نہیں، جیوات کہنے جا رہی ہوں، وہ ہو سکتا ہے تمہیں ناگوار گزرے، لیکن میرے خلوص پہ شبہ نہیں کرنا۔“

”نہیں، جیوات کہنے جا رہی ہوں، وہ ہو سکتا ہے تمہیں ناگوار گزرے، لیکن میرے خلوص پہ شبہ نہیں کرنا۔“

”نہیں، جیوات کہنے جا رہی ہوں، وہ ہو سکتا ہے تمہیں ناگوار گزرے، لیکن میرے خلوص پہ شبہ نہیں کرنا۔“

”نہیں، جیوات کہنے جا رہی ہوں، وہ ہو سکتا ہے تمہیں ناگوار گزرے، لیکن میرے خلوص پہ شبہ نہیں کرنا۔“

”نہیں، جیوات کہنے جا رہی ہوں، وہ ہو سکتا ہے تمہیں ناگوار گزرے، لیکن میرے خلوص پہ شبہ نہیں کرنا۔“

”نہیں، جیوات کہنے جا رہی ہوں، وہ ہو سکتا ہے تمہیں ناگوار گزرے، لیکن میرے خلوص پہ شبہ نہیں کرنا۔“

”نہیں، جیوات کہنے جا رہی ہوں، وہ ہو سکتا ہے تمہیں ناگوار گزرے، لیکن میرے خلوص پہ شبہ نہیں کرنا۔“

”نہیں، جیوات کہنے جا رہی ہوں، وہ ہو سکتا ہے تمہیں ناگوار گزرے، لیکن میرے خلوص پہ شبہ نہیں کرنا۔“

”نہیں، جیوات کہنے جا رہی ہوں، وہ ہو سکتا ہے تمہیں ناگوار گزرے، لیکن میرے خلوص پہ شبہ نہیں کرنا۔“

”نہیں، جیوات کہنے جا رہی ہوں، وہ ہو سکتا ہے تمہیں ناگوار گزرے، لیکن میرے خلوص پہ شبہ نہیں کرنا۔“

”نہیں، جیوات کہنے جا رہی ہوں، وہ ہو سکتا ہے تمہیں ناگوار گزرے، لیکن میرے خلوص پہ شبہ نہیں کرنا۔“

”نہیں، جیوات کہنے جا رہی ہوں، وہ ہو سکتا ہے تمہیں ناگوار گزرے، لیکن میرے خلوص پہ شبہ نہیں کرنا۔“

”نہیں، جیوات کہنے جا رہی ہوں، وہ ہو سکتا ہے تمہیں ناگوار گزرے، لیکن میرے خلوص پہ شبہ نہیں کرنا۔“

”نہیں، جیوات کہنے جا رہی ہوں، وہ ہو سکتا ہے تمہیں ناگوار گزرے، لیکن میرے خلوص پہ شبہ نہیں کرنا۔“

دیکھنے سے گھبراتی تھی کہ کہیں پتھر کی نہ ہو جائے۔

بہر حال اسے اسلام آباد آئے دو مہینے ہو گئے تھے۔ اس دوران کراچی سے جب بھی فون آیا۔ ٹھیکر بھائی سہما بھائی نے اس کے کہنے پر بھی اسے کسی سے بات نہیں کرنے دی تھی۔ خود ہی اس کی خبر پتہ بتانے کے لیے اس کی طرف سے پورا اطمینان دلا دیتے تھے۔ یہ احتیاط انہوں نے صرف اس لیے کی تھی کہ کہیں اماں جی انڈیا میں اس کے زخموں کو نہ چھین چکے۔ جنہیں بھرنے میں وقت سے زیادہ ان کی کوششوں کا دخل تھا۔ اسی کی بنا پر دونوں میاں بیوی نے اپنی وہ تمام سرگرمیاں ترک کر دی تھیں جن میں وہ شامل نہیں ہو سکتی تھی اور زیادہ تر اس کے ساتھ یوں گزارتے کہ اسے یہ احساس تک نہیں ہوتا تھا کہ کوئی اپنا کام چھوڑ کر اس کے پاس آ بیٹھا۔ اس کے باوجود اب اسے اماں جی اور بابائی کی یاد آنے لگی تھی۔ جن سے وہ بھی اتنے دن دور نہیں رہی تھی۔ شام وہ ٹھیکر بھائی کے پاس بیٹھ کر بہت عاجزی سے بولی تھی۔

”بھائی! میں اماں جی کے پاس جانا چاہتی ہوں۔ وہ مجھے بہت سی یاد آ رہی ہیں اور بابائی بھی۔“

”یاد آ رہے ہیں بیٹا تو فون کر لو جانا ضروری ہے کیا؟“ انہوں نے بڑے آرام سے مشورہ دے کر پوچھا۔ ”مگر آپ ضروری نہیں سمجھتے تو ٹھیک ہے، فون کر لیتی ہوں۔“ اس نے کچھ اتنی مایوسی سے کہا کہ ٹھیکر بھائی اس پر رحم آ گیا۔

”فون منع نہیں کر رہا بیٹا! اصل میں میرا ارادہ اماں جی اور بابائی کو کچھ دنوں کے لیے یہاں بلانے کا ہے۔ فوراً جاؤ گی تو پھر وہ آنے کے لیے مشکل ہی سے تیار ہوں گے۔“

”ٹھیک ہے پھر میں ان کے ساتھ چلی جاؤں گی۔“ اس نے فوراً کہا تو ٹھیکر بھائی اسے دیکھ کر سنجیدگی پوچھنے لگے۔

”میں اپنے جانے کی بات کیوں کرتی ہو۔ یہاں تمہیں کوئی تکلیف ہے؟“ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”پھر پھر کیوں جانا چاہتی ہو؟“ وہ جانے کیا جانا چاہتے تھے۔

”آپ کیوں چاہتے ہیں کہ میں آپ کے پاس رہوں؟“ اس نے بہت ہمت کر کے ان سے سبب پوچھا تو وہ در خاموشی سے اسے دیکھتے رہے۔ انداز ایسا تھا جیسے اس کے ذہن تک رسائی حاصل کر رہے ہوں پھر مدد مطمئن ہو کر بولے۔

”اس کی کئی وجوہات ہیں۔ جو میں ابھی بتانا نہیں چاہتا۔ بس اتنا سن لو کہ تمہاری بہتری اسی میں ہے۔ اماں اور بابائی آجائیں تو میں ان سے بھی یہی کہوں گا کہ تمہیں یہیں رہنے دیں۔ اور بیٹا یہ بھی تمہارا اپنا گھر ہے۔ خلیل بھائی اور عدیل ہیں تو یہاں میں ہوں یا تمہیں ان بھائیوں سے زیادہ محبت ہے؟“ آخر میں ان کے بچلے انداز پر وہ بے ساختہ مسکرائی تھی۔

پھر تیسرے دن ہی اماں جی اور بابائی آگئے تو ایک تو وہ پہلے ہی کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔ ان کے سامنے خود کو مطمئن اور پرسکون ظاہر کیا۔ اس کے باوجود اماں جی اسے دیکھتے ہی رونے لگی تھیں۔ جس پر ٹھیکر بھائی نے خالص انجان بن کر اس سے پوچھنے لگے۔

”آسیہ! یہ اماں جی کو کیا ہوا ہے، کیوں رو رہی ہیں؟“

”پتا نہیں بھائی۔“ وہ سٹپٹا گئی۔ ”میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں کہی۔“

”اماں جی! آسیہ بہت خوش ہے۔ آپ اس طرح نہیں کریں ورنہ میں اسے یہاں سے بھی دور بڑے بھائی پاس بھیج دوں گا۔“ ٹھیکر بھائی نے قدرے خشکی سے کہا تو اماں جی اپنے آنسو دھپے میں جذب کرتے ہو بولیں۔

”میں نہیں جائے گی یہ، میں اسے اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی۔“

ٹھیکر بھائی نے اس وقت کوئی ٹکڑا نہیں کی اور اٹھ کر چلے گئے۔ تب وہ اماں جی کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے

بولی۔ ”آپ روئیں نہیں اماں جی! میں آپ کے ساتھ چلوں گی لیکن ابھی آپ ٹھیکر بھائی کے سامنے ایسی کوئی بات نہیں کریں، وہ ناراض ہوتے ہیں اور ٹھیک ہی ناراض ہوتے ہیں، جب اللہ نے آپ کو ان جیسے لائق و فرمانبردار بیٹوں سے نوازا ہے تو پھر آپ کو رونے اور فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ انہیں یہی بات تکلیف دیتی ہو گی کہ ان کے ہوتے ہوئے آپ پریشان ہوتی ہیں۔“

”آسیہ ٹھیک کہہ رہی ہے اماں جی۔“ سہما بھائی اس کی تائید کرتے ہوئے بولیں۔

”روئے وہ ہیں جنہیں آگے اندھیرا نظر آتا ہے۔ آپ کو اللہ نے ماشاء اللہ بہت نوازا ہوا ہے۔ آپ کو آسیہ کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے بھائی کبھی اس سے غافل نہیں ہوں گے۔“

”میں جانتی ہوں، بھائی! اس کا بہت خیال رکھنے والے ہیں لیکن۔“ اماں جی جانے کیا کہنے جاری تھیں کہ اسے کچھ کر ایک دم خاموش ہو گئیں اور اس نے اپنے آپ سوچ لیا تھا۔

”لیکن وہ مان نہیں دے سکتے جو ایک عورت کو اپنے گھر پر شوہر ہوتا ہے۔“

یوں کہتے بہت سارے دن گزر گئے۔ اب جی کچھ دن بعد ہی واپس چلے گئے تھے اور اماں جی اس کے لیے وہیں رک گئیں کیونکہ ٹھیکر بھائی کسی طرح اسے کراچی بھیجنے پر تیار نہیں ہوئے تھے۔ پتا نہیں انہوں نے اس کے لیے کیا سوچ لیا تھا اور جانے اماں جی سے کیا کہا کہ اب وہ بھی یہی کہتی تھیں کہ اسے یہیں رہنا چاہیے۔ اور اس نے ابھی تک کسی سے کوئی اختلاف نہیں کیا تھا۔ سب سن کر خاموش رہتی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اس نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔

وہ اپنے بارے میں بہت کچھ سوچتی رہتی تھی اور خاموش یوں تھی کہ ابھی اپنی کسی سوچ پر عمل کرنے کا وقت نہیں آیا تھا۔ کیونکہ اس کی ڈیوڑھی قریب تھی۔ اور ان دنوں وہ اپنے آپ کو چھپائے پھرتی تھی۔ خصوصاً ٹھیکر بھائی کے سامنے جانے سے بہت کتراتے تھے۔ اس لیے ان کے ساتھ بیٹھ کر بات کرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ ورنہ اس کے اندر خاصی بے چینی تھی۔ یعنی جانا چاہتی تھی کہ وہ اس کے بارے میں کیا سوچتے ہیں جو اس کے کراچی جانے کا تہی تیابی سے منع کر دیتے ہیں۔ کئی بار اس نے اماں جی سے پوچھا لیکن ان کے جواب اسے مطمئن نہیں کر سکتے تھے۔ جس سے وہ سمجھ گئی کہ انہیں بھی اصل بات معلوم نہیں ہے۔ بہر حال اب زیادہ دن نہیں تھے اس نے سوچ لیا ڈیوڑھی کے بعد وہ خود ٹھیکر بھائی سے بات کرے گی۔

\*~\*~\*

شاہ سکندر نے جس زندگی سے فرار کی خاطر گھر بار چھوڑا تھا۔ شاید وہی اس کا مقدر تھی۔ اور اس بات سے سمجھتا کرتے ہوئے اگر اسے کچھ تھا تو صرف اس بات کا کہ وہ اس لڑکی کو اجاڑ آیا تھا۔ جس نے اپنے دل کی ہستی کی عمرانی اور تمناؤں سے سوچنی تھی۔ اس کے لیے وہ خواب و خیال نہیں تھی اور نہ ہو سکتی تھی کیونکہ اس کی سنگت میں لڑکا ایک لمحہ اس کے دل پر روم تھا۔ اور اس نے اپنے جینے کے لیے یہی سزا تجویز کی تھی کہ باقی ماندہ حیات انہی لمحات کے سارے تمام کرے گا، لیکن یہاں مر النساء تھی۔ جس روز اسے معلوم ہوا کہ وہ دوسری عورت شاہ کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکال دی گئی ہے تو نہ صرف وہ مطمئن ہو گئی بلکہ اس خیال سے کہ اب شاہ صرف اس کا ہے۔ اس کا رویہ بھی بدل گیا تھا۔

لیکن پہلے وہ اس کی ہر بات پر تامل کر جھٹک دیتی اور کسی طرح اپنے تنفر کو چھپا نہیں سکتی تھی۔ لیکن اب وہ بہت محتاط ہو گئی تھی۔ شروع کے دو مہینے اس نے شاہ سکندر کو بظاہر اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا لیکن اس کے روز و شب سے غافل نہیں رہی تھی۔ کیونکہ جانتی تھی کہ وہ ٹھیکست خورہ ہے اور کسی بھی وقت نوٹ کر

اس کی بانہوں میں اُگرے گا۔ اس وقت اسے سہارا دے کر وہ اگر اسے اپنا نہتا سکی تب بھی اس کی توہین نہ کی گئی۔ یعنی اس کی وہی سوچ تھی۔ جیتوں تو تجھ پاؤں ہاروں تو پتا تیری۔

پھر بڑی بھابھی نے اسے سمجھایا تھا کہ موز زیادہ عرصہ عورت کے بغیر نہیں رہ سکتا، اس لیے بھی وہ زیادہ ہو گئی تھی کہ کہیں وہ کسی اور راستے پر نہ چل نکلے۔ کہ ایک عورت کے چنگل سے نکلنا تو بابا جان کے لیے ہو سکتا تھا لیکن غلط راستے پر نکلے ہوئے قدموں میں وہ بھی زخمی نہیں ڈال سکتے تھے۔ جب ہی شاہ سکندر کے حال پر چھوڑنے کے باوجود وہ اس کے روز و شب پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھی۔

گو کہ شاہ سکندر نے آتے ہی اسے اپنے کمرے سے بے دخل کر دیا تھا پھر بھی رات میں جب تک وہ سو رہی کسی نہ کسی بہانے اس کے کمرے کے چکر لگاتی رہتی تھی۔ کبھی اس کے پریش کیے ہوئے ٹکڑے المار پر رکھنے کے بہانے، کبھی بیڈ کی چادر تبدیل کرنا۔ کسی وقت بچے کو اس کے دروازے پر چھوڑ کر پھر اسے اٹھا کر بہانے آجاتا اور آخر میں دودھ کا گلاس رکھنا تو بہت ضروری تھا۔

اس وقت وہ بچے کو اس کے پاس بھیج کر خود شہر بانو کے پاس آ بیٹھی تھی۔ جس کی دواہ کی پچی جانے کس تا کے باعث درود کر بیان ہو رہی تھی۔

”اٹاؤ مجھے دو۔“ اس نے شہر بانو کی گود سے پچی اپنی گود میں لے لی اور ادھر ادھر سے چیک کرنے کے بعد گئی۔

”اسے ٹھنڈ لگ گئی ہے۔ جیراں سے کھو، جلدی سے تیل گرم کر کے لائے۔“

شہر بانو فوراً ”اٹھ کر چلی گئی اور جیراں سے کہہ کر فوراً واپس بھی آئی تو وہ اسے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”میشٹر کہاں گیا اس کمرے کا؟ اتنی سردی میں تم نے پچی کو بغیر ہٹ کر سلایا ہوا ہے۔“

”خراب ہو گیا تھا۔ میں نے غلام علی سے کہا بھی کہ آج ہی آج ٹھیک کرالے آتا لیکن۔“ شہر بانو دہلا جگہ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”غلام علی تو بس۔“ مہر النساء نے سر جھٹکا پھر جیراں کے آنے پر پچی اس کی گود میں دے کر بولی۔ ”اس کے پر اچھی طرح مالش کر کے لیٹ دو۔ ٹھنڈ لگ گئی ہے اسے۔“

شہر بانو کچھ دیر جیراں کو بچی کی مالش کرتے ہوئے دیکھتی رہی پھر اس کی طرف متوجہ ہو کر پوچھنے لگی۔

”تمہارا آغا کہاں ہے؟“

”اپنے باپ کے پاس۔“ مہر النساء اپنے اوپر لحاف کھینچتے ہوئے بولی۔ ”اب تو شاہ خود بھی اسے بلانے ہیں۔“

”اور تمہیں؟“ شہر بانو نے شوق و معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا تو وہ آہ بھر کر بولی۔

”میری ایسی قسمت کہاں، مجھے تو دیکھتے ہی منہ موڑ لیتے ہیں۔“

”ارے ایسے ہی تمہیں ستانے کو کرتے ہوں گے ورنہ تم سے منہ موڑا جاسکتا ہے بھلا۔ تمہاری صورت ہی تو انہیں کھینچ لاتی ہے۔“ شہر بانو نے اس کی ٹھوڑی چھو کر کہا۔

”اچھا۔“ وہ ذرا سانس ہی پھرنے کی گود کھ کر کہنے لگی۔

”تمہاری بیٹی اب سکون سے سو گئی ہے۔ اسے کبیل کے اوپر لحاف بھی اوڑھا دیتا۔ میں صبح غلام علی کی خدمت میں گئی۔ کوئی کام کر کے نہیں دیتا۔“

”حالات میں نے اسے بہت تاکید کی تھی لیکن شاید وہ بابا جان کے کسی کام سے چلا گیا تھا۔“

”یہ کام زیادہ ضروری تھا۔ خود غلام علی جاسکتا تھا تو کسی اور سے کہہ دیتا۔“ مہر النساء کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”چھائیں چلتی ہوں، آغا کو دیکھوں سو یا کہ نہیں۔ بہت شرارتی ہو گیا ہے۔“

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔



دیکھنے کے بجائے پلکیں موند لیں۔ مبادا وہ اس کی آنکھوں میں گئے دنوں کا کوئی عکس دیکھ لیں۔  
 ”آسیہ!“ سیمابھابی نے اس کا چرواخی طرف موڑا۔  
 ”تم ٹھیک تو ہونا؟“ وہ کوشش سے مسکراتی تھی۔

”مگر تم سب نارمل ہو گیا۔ بہت مبارک ہو۔ ماشاء اللہ گڑیا جیسی بیٹیاں ہیں۔ میں اماں جی کو بتاتی ہوں۔  
 پریشان بیٹھی ہیں۔“ سیمابھابی اس کا گال تھپکتے لیبر روم سے نکل گئیں تو وہ پھر بچیوں کو دیکھنے لگی جنہیں  
 نسلانے کے ساتھ جانے کون سی زبان میں کیا کیا بولے جا رہی تھی۔ وہ سمجھ نہیں رہی تھی پھر بھی اس کے  
 پر مسکراہٹ پھیلنے چلی گئی۔

”آج کا زمانہ میں بلی اچھا ہے۔“ سسڑا سے اپنی طرف دیکھتے پکارتے پکارتے گئی۔  
 ”بہت سکھ دیتا ہے اور بابا لوگ خالی پریشان کرتا ہے۔ ساری زندگی مدراس کے لیے دکھ جھیلتا رہا اس  
 نہیں ہوتا۔ بے بی لوگ بہت احساس کرتا اور پھر بھی بہت کرتا۔ تو تمہارا بیڑ تیار ہو گیا۔ ان کا  
 ہے؟“ آخر میں سوال غیر متوقع تو نہیں تھا لیکن اچانک تھا۔ جب ہی اسے جواب دینے میں کچھ وقت لگا۔  
 ”وہاں ہر ہوتے ہیں۔“

”پھر تو ہمارا انعام کیا۔ اتنا بار انون بے بیڑ کا خوشخبری سنا کہ ہم تمہارے پسینہ سے بہت انعام لیتا۔“  
 ”وہ تم مجھ سے لے لیتا، سہلے مجھے کمرے میں تو پھنچاؤ۔“ اس نے کہا تب ہی سیمابھابی آگئیں ان کے  
 جہاں آرائشیں اور ان کے کمرے پر سسڑا سے اسٹریچر پر ڈال کر کمرے میں لے آئی۔  
 وہ بیڈ پر لیٹی تب اماں جی کو دیکھنے لگی جو کونے میں جا کر نماز پڑھتی تھیں اور جب فارغ ہو گئیں تب  
 کہیں آئیں اور دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر پہلے پھونک ماری پھر کہنے لگیں۔

”تمہاری پیدائش پر میں بہت خوش ہوئی تھی اور ہمیشہ یہ دعا کرتی تھی کہ اللہ میری بیٹی کو بہت  
 سعادت مند بناتا۔ تم واقعی نیک اور سعادت مند ہو۔ مجھے کبھی تم سے کوئی شکایت نہیں ہوئی نہ تمہارے  
 سے کبھی میرا دل دکھا بلکہ تمہاری ذات سے میں نے بہت سکھ پائے ہیں اس کے باوجود میں تمہاری  
 لیے ایسی دعا نہیں مانگوں گی کیونکہ نیکی اور سعادت مندی میں صرف تمہارے لیے سکھ ہے۔ انہیں کیا۔  
 اسے اپنے وجود پر بھی نصیبی چوینیاں رہتی محسوس ہونے لگی تھیں۔ جانے اماں جی کیا کہنے جا رہی  
 ”دعا میں بھی رائیگاں نہیں جائیں۔ ضرور قبول ہوئی ہیں۔“ قدرے توقف سے اماں جی پھر گویا ہو۔  
 ”کل تک میں اپنی دعاؤں کی قبولیت پر بہت خوش ہوئی تھی کہ تمہارے لیے میں نے جو مانگا وہ  
 اب احساس ہو رہا ہے کہ پورا تو بے شک ہوا لیکن اس میں تمہارے لیے کیا تھا۔ سارے سکھ تو میرے  
 آگئے۔ تم تو۔“ اماں جی کی آواز حلق میں کہیں انک گئی۔

”اماں جی۔“ سیمابھابی جانے کب ان کے پیچھے آکھڑی ہوئی تھیں۔ دھیرے سے ان کے کندھوں  
 کر بولیں۔  
 ”آسیہ کو آرام کرنے دیں۔“  
 ”تمہاری بیٹیوں کے لیے پتا ہے میں نے کیا مانگا ہے؟“ اماں جی سیمابھابی کو رکنے کا اشارہ  
 لگیں۔

”اللہ ان کے نیک نصیب کرے۔ ساری زندگی خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولیں۔“  
 ”آمین۔“ اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی تھی۔  
 ”بے بیڑ آگئیں۔“ سسڑوں بانڈوں میں بچیاں دبائے اندر آتے ہوئے بولی۔  
 ”ان کا دادی کہاں ہے؟ ہم بے بیڑ اس کو دے گا اور اپنا انعام لے گا۔“

”یہ ان کی ثانی اماں ہیں۔“ سیمابھابی فوراً ”اماں جی کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولیں۔  
 ”بے بیڑ ان کی گود میں دو اور انعام مجھ سے لو۔“

”ہم اللہ۔“ اماں جی فوراً دوسرے بیڈ پر جا بیٹھیں اور دونوں بیٹیوں کو گود میں بھر کر بہت شوق سے باری باری  
 دیکھنے لگی تھیں۔

”کوئی فرق نہیں ہے اماں جی! بالکل ایک شکل ہے۔ سیمابھابی! سسڑ کو فارغ کرنے کے بعد اماں جی کے پاس  
 بیٹے ہوئے کئے لگیں۔

”در اس رنگ میں ہی فرق ہوتا وہ بھی نہیں ہے۔ آسیہ تک پہنچانے میں غلطی کرے گی۔ ہے ناں۔“  
 ”ہاں ابھی تو ایک جیسی لگ رہی ہیں بڑی ہوں گی تو شاید ایک ایک پر اور دوسری۔“ اماں جی ایک دم خاموش  
 رہیں تو سیمابھابی بات بدلتے ہوئے کئے لگیں۔

”آسیہ کو کھوکھو بھی لگ رہی ہوگی۔ میں نے ٹھیک کو فون کر دیا ہے، وہ اشعر اور سمیدہ کو اسکول سے لیتے ہوئے  
 دھری آ رہے ہیں۔ ان سے میں نے سوپ اور بسکٹ وغیرہ لانے کو کہا ہے باقی پھر میں ابھی ان کے ساتھ کھرجاؤں  
 اپنا نظام کروں گی۔“

”کتنے دن رہے گی آسیہ یہاں؟“ اماں جی نے پوچھا۔  
 ”اکڑ چھ دن کہہ رہی ہیں، خیر کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ گھر قریب ہے، میں پیدل آ جا سکتی ہوں۔ میرا  
 رہنے بچے آگئے۔“ سیمابھابی کو ریڈور میں اشعر کی جھلک دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں پھر دروازے تک جا کر اشعر  
 کا رونا سنا۔ ”ہی اشعر اور سمیدہ بھاگتے ہوئے آگئے۔“

”آرام سے آرام سے، شور بالکل نہیں۔“ سیمابھابی نے پلٹ کر انہیں تنبیہ کی پھر شوہر کے ساتھ اندر آئی  
 ٹھیک بھائی نے بیٹھے ہی پہلے اس کا حال احوال پوچھا پھر بچیوں کو دیکھتے ہوئے ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ  
 پائی گی۔ خاصے محفوظ انداز میں گویا ہوئے۔  
 ”مجھے تو کل کی بات لگتی ہے۔ آسیہ اتنی سی تھی۔“

”اب تو ایسے کہہ رہے ہیں بھائی! جیسے مجھ سے بہت بڑے ہوں۔“ کتنی دیر بعد اس کی خاموشی ٹوٹی تھی۔  
 ”بڑا تو ہوں ناں اور مجھے یاد ہے، میں تمہیں ایسے ہی دیکھ رہا تھا جیسے اب میرا بیٹا دیکھ رہا ہے۔“ انہوں نے نصی  
 دہانہ پٹھلے اشعر کا سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”ابا! اسے ہم گھر لے جائیں گے۔“ سمیدہ کی خوشی دیدنی تھی۔  
 ”ہاں بیٹا، دونوں کو لے جائیں گے ایک آپ کے لیے۔“  
 ایک مری۔ ”اشعر بول پڑا تو سیمابھابی ہنسنے ہوئے کئے لگیں۔

”ہلو! کھلا فائدہ تو ابھی سامنے آگیا، ورنہ اشعر اور سمیدہ میں ابھی لڑائی شروع ہو جاتی۔“  
 لاہر خاموشی سی ہو کر ایک ایک کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔ سب خوش تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ اپنے بچتے  
 بچوں کی پیدائش پر خوش ہوتی تھی۔ پھر بھی اسے اپنے اندر گہری خاموشیوں کا احساس ہو رہا تھا۔ دل چاہا ہر  
 نسلے آنکھیں اور کان بند کر لے۔ نہ شوق کھکھلاتی ہنسی کی آواز سنائی دے، نہ کھلتے چہرے نظر کے سامنے

”آسیہ! سیمابھابی اچانک اسے پکار کر بولیں۔  
 ”نہی بی بی کا نام تم نے تجویز کیا تھا، تمہاری ایک بی بی کا نام میں تجویز کروں؟“  
 اس نے اثبات میں سر ہلایا تو سیمابھابی نے پہلے اپنے پالوں سے پن نکال کر سمیدہ کی آنکھوں سے ذرا سا

کا جل چرایا اور اس سے ایک بچی کے گال پر ہونٹوں کے قریب مل رہی تھی۔

”اس کا نام صاحت ہے۔“  
”صاحت“، ٹھیک بھائی نے دہرایا پھر آسہ کو دیکھ کر بولے۔  
”دوسرا نام تم بتاؤ۔“  
”مدحیہ۔“ وہ بے اختیار بولی تھی اور یکنخت ہی اندر کی خاموشیوں میں محسوس ہوا تھا کہ اس نے غم پر بازو رکھ لیا۔  
”چلو بھئی۔ آسہ کو سونے دو، اماں جی! میں بچوں کو کھانا کھلا کر پھر آپ کے لیے لے آؤں گی جب بسکٹ وغیرہ لیں۔ چلیں ٹھیک۔“ سیما بھائی کی یہ سمجھیں وہ سونا چاہتی ہے جب ہی فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور ان سب کے جاتے ہی ایک دم خاموشی چھا گئی تھی، لیکن اب اس کے اندر ہلکا سا شور تھا۔ اماں جی! اسے بسکٹ کھلا کر سوپ پلایا اس کے بعد سونے کا کہہ کر اس نے کبل سر تک کھینچ لیا۔ اور پگھلا سارے بندھنا دیئے تھے۔

”میری کوئی بہن نہیں ہے، شاید اس لیے مجھے بیٹی کی خواہش ہے اور پھر مجھے بیٹیاں اچھی بہت لگتی تھیں۔“  
”کما تھا اور حقیقتاً اس کی دلی آرزو پوری ہوئی تھی، لیکن اس پر جیسے خوشی کے اظہار کے رائے تھے۔“  
”ابنی بچیوں کو دیکھ کر وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ اس کی زندگی میں اجالوں کی نوید لے کر آئی، کون کیا سمجھے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی دماغی حالت پر شبہ کیا جائے۔ وہ خود ترسی کا شکار ہو رہی تھی اور جتنے دن وہ کلینک میں رہی اس کی یہی کیفیت تھی البتہ جس روز کلینک سے ڈسچارج ہو کر گھر آئی پہلی بار اس نے دونوں بچیوں کو بازوؤں میں بھر کر سینے سے لگایا تو اسے لگا جیسے وہ ابھی ماں بنی ہے احساس تھا، سرشاری تھی اور جیسے وہ دنیا کی مضبوط ترین عورت بن گئی تھی کہ اب شاہ سکندر اور اس ہزاروں لاکھوں مل کر بھی اسے اس کے مقام سے ہلا نہیں سکتے تھے۔ ساری دنیا کی دولت کے غور مرتبے کو خرید اجا سکتا تھا۔

”آسہ!“ سیما بھائی نے کمرے میں آکر اسے پکارا لیکن وہ بچیوں کو سینے میں چسپائے اپنی سوز تھی کہ آواز پر چونکی بھی نہیں، اس کے برعکس سیما بھائی چونک گئیں اور بغور اس کا چہرہ دیکھنے لگیں عرصے میں پہلی بار اس کے ہونٹوں پر بڑی نرم مسکراہٹ چھیلی تھی اور آنکھوں میں کسی عزم کی جگہ اب ہر طوفان کا مقابلہ وہ تنہا کر رہی تھی۔  
”کیا سوچ رہی ہو؟“ سیما بھائی نے آگے آکر اس کا کندھا چھوا تب وہ ذرا سا چونک کر انہیں دیکھ کر کوئی خوبصورت سوچ تھی، اگر نہ بتانا چاہو تو کوئی بات نہیں۔ میں اصرار نہیں کروں گی۔“ سیما ہوئے بولیں۔

”اس لیے کہ آپ جانتی ہیں، میری سوچوں کو کنارہ مل گیا ہے۔ جب ہی اصرار نہیں کریں گی۔“  
”اس لیے کہ آپ جانتی ہیں اور ہاں ٹھیک یہ کہہ رہے ہیں کہ تم دونوں بچیوں کو کیسے دیکھو گی۔“  
”ٹھیک کے پاس بیٹھی ہیں اور ہاں ٹھیک یہ کہہ رہے ہیں کہ تم دونوں بچیوں کو کیسے دیکھو گی۔“  
”اپنے پاس لے جاؤں؟“ سیما بھائی نے کہا۔ ”یہ بات کہنے آتی تھیں۔“  
”آپ کہاں پریشان ہوں گی بھائی! میں دیکھ لوں گی تو پراہم۔ بس آپ اماں جی کے سونے کا انتظام میں کریں۔“ اس نے کہا۔

”ابنی بچی بھی کہہ رہی ہیں۔ چلو میں یہاں پلنگ ڈال دیتی ہوں۔ اور کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟۔“  
”جی ہاں! آتے ہوئے پوچھا۔“  
”وہ نیل پر رکھی چیزوں کا جائزہ لے کر بولی تھی۔“  
”سب کچھ موجود ہے۔“ وہ نیل پر رکھی چیزوں کا جائزہ لے کر بولی تھی۔

\*\*\*

”ابنی بچی بھی کہہ رہی ہیں۔ چلو میں یہاں پلنگ ڈال دیتی ہوں۔ اور کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟۔“  
”جی ہاں! آتے ہوئے پوچھا۔“  
”وہ نیل پر رکھی چیزوں کا جائزہ لے کر بولی تھی۔“  
”سب کچھ موجود ہے۔“ وہ نیل پر رکھی چیزوں کا جائزہ لے کر بولی تھی۔

”ابنی بچی بھی کہہ رہی ہیں۔ چلو میں یہاں پلنگ ڈال دیتی ہوں۔ اور کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟۔“  
”جی ہاں! آتے ہوئے پوچھا۔“  
”وہ نیل پر رکھی چیزوں کا جائزہ لے کر بولی تھی۔“  
”سب کچھ موجود ہے۔“ وہ نیل پر رکھی چیزوں کا جائزہ لے کر بولی تھی۔

”ابنی بچی بھی کہہ رہی ہیں۔ چلو میں یہاں پلنگ ڈال دیتی ہوں۔ اور کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟۔“  
”جی ہاں! آتے ہوئے پوچھا۔“  
”وہ نیل پر رکھی چیزوں کا جائزہ لے کر بولی تھی۔“  
”سب کچھ موجود ہے۔“ وہ نیل پر رکھی چیزوں کا جائزہ لے کر بولی تھی۔

”ابنی بچی بھی کہہ رہی ہیں۔ چلو میں یہاں پلنگ ڈال دیتی ہوں۔ اور کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟۔“  
”جی ہاں! آتے ہوئے پوچھا۔“  
”وہ نیل پر رکھی چیزوں کا جائزہ لے کر بولی تھی۔“  
”سب کچھ موجود ہے۔“ وہ نیل پر رکھی چیزوں کا جائزہ لے کر بولی تھی۔

”ابنی بچی بھی کہہ رہی ہیں۔ چلو میں یہاں پلنگ ڈال دیتی ہوں۔ اور کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟۔“  
”جی ہاں! آتے ہوئے پوچھا۔“  
”وہ نیل پر رکھی چیزوں کا جائزہ لے کر بولی تھی۔“  
”سب کچھ موجود ہے۔“ وہ نیل پر رکھی چیزوں کا جائزہ لے کر بولی تھی۔

”ابنی بچی بھی کہہ رہی ہیں۔ چلو میں یہاں پلنگ ڈال دیتی ہوں۔ اور کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟۔“  
”جی ہاں! آتے ہوئے پوچھا۔“  
”وہ نیل پر رکھی چیزوں کا جائزہ لے کر بولی تھی۔“  
”سب کچھ موجود ہے۔“ وہ نیل پر رکھی چیزوں کا جائزہ لے کر بولی تھی۔

”ابنی بچی بھی کہہ رہی ہیں۔ چلو میں یہاں پلنگ ڈال دیتی ہوں۔ اور کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟۔“  
”جی ہاں! آتے ہوئے پوچھا۔“  
”وہ نیل پر رکھی چیزوں کا جائزہ لے کر بولی تھی۔“  
”سب کچھ موجود ہے۔“ وہ نیل پر رکھی چیزوں کا جائزہ لے کر بولی تھی۔

”ابنی بچی بھی کہہ رہی ہیں۔ چلو میں یہاں پلنگ ڈال دیتی ہوں۔ اور کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟۔“  
”جی ہاں! آتے ہوئے پوچھا۔“  
”وہ نیل پر رکھی چیزوں کا جائزہ لے کر بولی تھی۔“  
”سب کچھ موجود ہے۔“ وہ نیل پر رکھی چیزوں کا جائزہ لے کر بولی تھی۔

لگ رہا تھا۔ البتہ دن میں اماں جی سے وہ وقفے وقفے سے کہتی رہی کہ اسے بھی جانا ہے۔ اور ہاں جس "چچا" کر کے رہ جائیں۔

شام میں سردی کی شدت میں اضافے کے باعث لاؤنج میں بیٹھنا محال تھا۔ ٹھیک بھائی آئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ سیما بھابی نے اس کے کمرے میں بیٹھ کر کراشعر اور سمیٹھ کو لالہ میں شہادیا اور اسے بھی کمرے سے نکلنے سے سختی سے منع کیا۔ لیکن کچھ دیر بعد ہی وہ ان کے پیچھے اور ان کے ٹوکنے سے پہلے کہنے لگی۔

"مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا کہ ہم سب خانوں میں بیٹھیں اور آپ کھانا پکائیں۔ ہمیں ہوں۔"

"اب میں تم سے کیا کہوں۔" سیما بھابی سمجھ گئیں۔ وہ ایک نہیں سنے گی "اس لیے چلے گئیں۔"

"مجھ سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ ٹھیک بھائی سے کہیں کہ آپ کو خانہ سالہ کا اچھی پوسٹ پر ہیں۔" وہ روٹی پیلے ہوئے بولی۔

"جناں! وہ کہتے ہیں تم کرتی کیا ہو سارا دن" ایک صرف کھانا ہی تو پکاتی ہو۔ حالانکہ چھٹی کے کہ کس طرح کام کرنے والی کے ساتھ لگی رہتی ہوں۔ بس ان مردوں کو عادت ہوتی ہے۔ دیکھ رہے ہیں۔"

"یہ تو ہے" اور خلیل بھائی بھی ایسے ہی ہیں۔ حالانکہ میونہ بھابی سارا دن مصروف رہتی ہیں کچھ نہیں کرتیں۔" وہ بڑی فراخ دلی سے بھائیوں کے مقابلے میں بھادو جوں کی طرف داری کر پکانے سے فارغ ہو کر کسی اور کام کے لیے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی کہ سیما بھابی کہنے لگیں۔

"بس اب اور کچھ نہیں کرنا سب تیار ہے۔ تم ٹھیک سے پوچھ کر آؤ کھانا کہاں کھاؤ گے اماں جی اور بچوں کے لیے کھانا نکال دوں۔"

"نہیں بھی اماں جی کے ساتھ کھاؤں گی۔" وہ کہتے ہوئے کبھی سے نکل آئی اور ٹھیک بھائی کھولنے لگی تھی کہ اپنا نام سن کر رک گئی۔ ٹھیک بھائی کہہ رہے تھے۔

"آسیہ کے لیے میں نے سوچ لیا ہے۔ وہ یہیں رہے گی۔ آپ اس کی طرف سے بالکل بے ساری بات طے ہوتے ہی آپ کو اطلاع دوں گا۔ اور اس کی بیٹیوں کا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

چھوڑ دیں۔ ایک آپ اپنے ساتھ لے جائیں۔ وہاں خلیل بھائی کے بچوں میں مل جائے گی۔"

"میرے خدا۔" وہ اگرچہ ساری بات سمجھی نہیں تھی تب بھی چکر اگتی تھی۔



بڑی مشکل سے اس نے خود کو سارا دے کر اندر جانے سے روکا اور پورے دھیان سے خاموشی کے بعد اباجی کی آواز آئی تھی۔

"تمہارا مطلب ہے۔ تم نے اس کی بیٹیوں کا بتایا ہی نہیں۔"

"بتایا ہے اباجی، ہر بات بتائی ہے۔ کچھ نہیں چھپایا۔ آپ جانتے ہیں میں بہت کھرا بندہ ہوں نہ دھوکا دینے والے کو پسند کرنا ہوں۔ اور میں آپ کو بتاؤں اگر شاہ سکندر، آسیہ کو چھوڑ کے چنگل سے نکال لیتا۔ یہ میں نے اسی روز سوچ لیا تھا جس موز مجھے کراچی بلا کر اپنے

دانت مصل آپ کی خاطر میں نے ایک تیسرا راستہ نکال لیا تھا۔ ہر حال یہ اچھا ہوا کہ جلد ہی اس کی موت ہوئی اور وہ خود چلا گیا اور نہ مجھے اس کا لینا پڑتا۔"

بات کر رہا تھا آسیہ کی۔ اس کے لیے اصفان علی بے حد مناسب ہیں۔ میں کل رات کے کھانے پر آیا ہوں۔ آپ بھی مل لیں اس کے بعد میں چاہوں گا کہ دو مہینے کے اندر آسیہ اپنے گھر کی ہو جائے۔"

بات سموت سے بول رہے تھے۔

اماں بھابی کے سامنے دھند چھا گئی تھی۔

فیکہ نے ہٹا لیکن آسیہ سے بھی تو پوچھ لو۔" اباجی کا انداز سوچتا ہوا تھا۔

ہے پوچھنا نہیں سمجھتا ہے اسے اور میرا خیال ہے وہ خاصی حقیقت پسند لڑکی ہے جلد سمجھ جائے گی۔" نے نانا نے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔ ایک دم دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی اور بے حد سانسف سے کی کو مچھنے لگی تو وہ سمجھ گئے کہ وہ ان کی باتیں سن چکی ہے اس پر بھی بڑے آرام سے بولے۔

اسے میں تمہارے متعلق ہی بات کر رہا ہوں۔"

ٹھیک بھائی! جتنا کہ چکے اس سے آگے ایک لفظ نہیں کہے گا۔ کیونکہ آپ کے سامنے آپ کی بہن اور صحبت کی ماں کھڑی ہے۔" وہ ساری ہمتیں بجا کر کے شاید زندگی میں پہلی بار بڑے بھائی کے

نہیں ہو گئی تھی۔

آپ خود کہہ رہے تھے کہ میں بہت حقیقت پسند ہوں۔ ہاں یہی سچ ہے اور میری زندگی کی سب سے بڑی بڑی ٹیٹاں ہیں۔ میرے بارے میں کچھ بھی سوچنے سے پہلے آپ اور اماں جی آپ بھی سن لیں کہ میں اپنے

نورے غم سے نہیں ہونے دوں گی۔ ایسی کوئی بھی کوشش میری موت ہوگی۔"

تخم کرتے ہی وہ تیزی سے کمرے سے نکل آئی اور اماں جی کے پاس آکر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

یہ نہیں کیا ہوا؟" اماں جی پریشان ہو گئیں۔ "ارے ابھی تو اچھی بھی گئی تھی۔ بھائی نے کچھ کمایا نہ تھا تو؟"

بہن کچھ نہیں کمایا اگر کہیں گے بھی تو انہیں حق ہے۔" وہ اسی طرح جڑتے ہوئے بولی۔

بھائی نے اندر آتے ہوئے اس کی بات سنی تھی اور برہنہ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

نہیں رلائے کا تو ہمیں کوئی حق نہیں ہے۔"

لی ہے۔"

"ٹھیک بھائی ذرا سا مسکرائے پھر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہنے لگے۔ "آئی ایم ساری" میں نے شاید

افلا استعمال کر لیا یا شاید وقت سے پہلے تم پلیز آنسو پونچھ لو ورنہ اباجی مجھے بچوں کے سامنے بہت

بیویوں سے آنکھیں رگڑ کر سیدھی ہو بیٹھی تو ٹھیک بھائی اسے ایک بازو کے حلقے میں لے کر اماں جی کو

”میں جانتی ہوں اور وعدہ کرتی ہوں آپ سے کہ جب بھی میں نے اپنے لیے ایک گھر کی ضرورت سب سے پہلے آپ کو بتاؤں گی۔ ابھی تو مجھے ہر طرف فریب سی فریب نظر آتا ہے۔ اور مزید کسی فریب دل اور ذہن دونوں ہی تیار نہیں ہیں۔ مجھے اپنی زندگی جینے دیں۔ کوشش تو کرنے دیں۔ ہو سکتا ہے لیے بہتری کی صورت ہو۔“ وہ کچھ رک رک کر بول رہی تھی۔

”ہوں!“ ٹھیک بھائی نے پرسوج انداز میں سر ہلایا پھر اسے دیکھ کر کہنے لگے۔ ”تمہیں اپنی زندگی اور تم سے یہ حق کوئی نہیں چھین سکتا۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ تم کیس بھی اپنی ذات اور اس کے انداز مت کرو کیونکہ تمہارے لیے زندگی ختم نہیں ہو گئی۔“

”زندگی شروع ہی اب ہوئی ہے۔“ وہ بے ساختہ بولی تھی۔

”یہ تم دونوں کیا باتیں کر رہے ہو۔ مجھے بھی تو بتاؤ۔“ اماں جی بھی سمجھیں کوئی ایسا مسئلہ ہے نہیں ہو رہا۔

”کچھ نہیں اماں جی! یہ آسہ کراچی جانے کی بات کر رہی ہے۔“ ٹھیک بھائی اٹھتے ہوئے بولا پھر میں کل ٹکٹ لیتا آؤں گا۔ برسوں دن کی فلائٹ ٹھیک رہے گی۔ اسی حساب سے تم تیاری کر لیں۔“ شکر ہے بھائی! آپ میری کسی بات سے ناراض تو نہیں ہوئے؟۔“ اس نے اندر ہی اندر مطمئن ٹھیک بھائی نے شکر اکر نفی میں سر ہلایا پھر کمرے سے نکل گئے۔

وہ جانتی تھی۔ بھائی، بھابھیاں سب اس سے بہت محبت کرتے ہیں اور یہ بھی ان کی محبت ہے کہ کوئی خاص صورت موڑے کر چاہتے ہیں کہ وہ فوری طور پر اپنے ساتھ ہونے والے لیے کو فراموش زندگی گزارے اس میں ان کوئی غرض پوشیدہ نہیں ہے، لیکن وہ کیا کرتی اپنے لیے کو فراموش کر اس کے لیے یہ ساری باتیں سوچنا ہی الجھن، بہت مشکل تھا۔ جو ٹھیک بھائی چاہتے تھے اور جو تھوڑے بار بار سمجھاتی رہی تھیں اور وہ جانتی تھی آگے خلیل بھائی، میمونہ بھابھی اور عدیل بھائی بھی ایک گے اس کے لیے اس نے خود کو اسی وقت سے تیار کرنا شروع کر دیا تھا جب جواز نے فضا میں بلند کو دھندلایا تھا۔

پورے چھ مہینے بعد وہ گھر آئی تھی۔ میمونہ بھابھی کے ساتھ بچے بھی شدت سے منتظر تھے بیٹیوں کو دیکھنے کا اشتیاق زیادہ تھا۔

”مجھے سہما بھابھی نے فون پر ہی بتایا تھا کہ بہت ساری بیٹیاں ہیں اور بالکل ایک جیسی۔“ ہم کبل میں لیٹی بچی کو دیکھتے ہوئے بولیں۔ پھر اماں جی کی گود میں سوئی بچی کو دیکھ کر کہنے لگیں۔

”لیکن شکر ہے ایک کے گال پر تل سے برونہ بچا نا مشکل ہوا۔“

”نفل نچل نہیں ہے۔ سیما بھابھی روزانہ کاجل سے بنا دیتی تھیں اور مجھے بھی ابھی تو اس سے صباحت ہے۔“ اس نے قہر سے کمرے میں گود میں بٹھاتے ہوئے کہا۔

”چلو، ہمیں بھی پتا چل گیا کہ یہ صباحت ہے اور یہ۔“

”مدرجہ۔“

”ماشاء اللہ دونوں نام اچھے ہیں۔“ میمونہ بھابھی تعریف کے ساتھ ہی اپنے مخصوص انداز میں

”اب ایسا کرو۔ دونوں کے گلے میں ناموں کے تعویذ ڈال دو تاکہ کسی دن اگر ٹل لگنا بھول جاؤ تو جانے دیے آپس کی بات ہے۔ ایک سے ہی کام چل جاتا۔“

”تو یہ“ اماں جی کا تو خیال کریں۔ اس نے ان کے بازو میں چٹکی کاٹ گھورا پھر بھی وہ باز نہیں بازو سلاتے ہوئے بولیں۔

”دوا کتنے مانگتے تھے تو ایک بیٹا مانگ لیتیں۔ کیوں ہلائی؟۔“

”ماں جی ان کی طرف متوجہ نہیں تھیں بس بیٹے کا سن کر جواب دے دیا۔“

”اباں جی نے تو بات ہی ختم کر دی۔“

”اباں جی اب بھی اٹھ جائیں مدتیں ہو گئیں آپ کے ہاتھ کی چائے ہوئے۔“ اس نے کہا۔

”جیتا کہہ کر تو تم نے خلیل کی بہن ہونے کا کیا کاکا جوت دے دیا ہے۔“ میمونہ بھابھی برا مانے ہوئے اٹھ

”جیتا۔“ ہمارے بھائی صاحب ہر ایک گھنٹے کے بعد کی بات نہ کر چائے مانگتے ہیں۔“

”جیتا۔“ آپ تو ناراض ہو گئیں۔ چلیں میں مدتوں بعد آپ کو اپنے ہاتھ کی چائے پلائی ہوں۔“ وہ اٹھنے

ن میمونہ بھابھی نے روک دیا۔

”ن میمونہ کو دیکھو اور یہ عمو صاحب جو اتنے شریف بن کر بیٹھے ہیں، ذرا اس کا خیال رکھنا نظر بچاتے ہی

”ن میمونہ کو دیکھو اور یہ عمو صاحب جو اتنے شریف بن کر بیٹھے ہیں، ذرا اس کا خیال رکھنا نظر بچاتے ہی

”ن میمونہ کو دیکھو اور یہ عمو صاحب جو اتنے شریف بن کر بیٹھے ہیں، ذرا اس کا خیال رکھنا نظر بچاتے ہی

”ن میمونہ کو دیکھو اور یہ عمو صاحب جو اتنے شریف بن کر بیٹھے ہیں، ذرا اس کا خیال رکھنا نظر بچاتے ہی

”ن میمونہ کو دیکھو اور یہ عمو صاحب جو اتنے شریف بن کر بیٹھے ہیں، ذرا اس کا خیال رکھنا نظر بچاتے ہی

”ن میمونہ کو دیکھو اور یہ عمو صاحب جو اتنے شریف بن کر بیٹھے ہیں، ذرا اس کا خیال رکھنا نظر بچاتے ہی

”ن میمونہ کو دیکھو اور یہ عمو صاحب جو اتنے شریف بن کر بیٹھے ہیں، ذرا اس کا خیال رکھنا نظر بچاتے ہی

”ن میمونہ کو دیکھو اور یہ عمو صاحب جو اتنے شریف بن کر بیٹھے ہیں، ذرا اس کا خیال رکھنا نظر بچاتے ہی

”ن میمونہ کو دیکھو اور یہ عمو صاحب جو اتنے شریف بن کر بیٹھے ہیں، ذرا اس کا خیال رکھنا نظر بچاتے ہی

”ن میمونہ کو دیکھو اور یہ عمو صاحب جو اتنے شریف بن کر بیٹھے ہیں، ذرا اس کا خیال رکھنا نظر بچاتے ہی

”ن میمونہ کو دیکھو اور یہ عمو صاحب جو اتنے شریف بن کر بیٹھے ہیں، ذرا اس کا خیال رکھنا نظر بچاتے ہی

”ن میمونہ کو دیکھو اور یہ عمو صاحب جو اتنے شریف بن کر بیٹھے ہیں، ذرا اس کا خیال رکھنا نظر بچاتے ہی

”ن میمونہ کو دیکھو اور یہ عمو صاحب جو اتنے شریف بن کر بیٹھے ہیں، ذرا اس کا خیال رکھنا نظر بچاتے ہی

”ن میمونہ کو دیکھو اور یہ عمو صاحب جو اتنے شریف بن کر بیٹھے ہیں، ذرا اس کا خیال رکھنا نظر بچاتے ہی

”ن میمونہ کو دیکھو اور یہ عمو صاحب جو اتنے شریف بن کر بیٹھے ہیں، ذرا اس کا خیال رکھنا نظر بچاتے ہی

”ن میمونہ کو دیکھو اور یہ عمو صاحب جو اتنے شریف بن کر بیٹھے ہیں، ذرا اس کا خیال رکھنا نظر بچاتے ہی

”ن میمونہ کو دیکھو اور یہ عمو صاحب جو اتنے شریف بن کر بیٹھے ہیں، ذرا اس کا خیال رکھنا نظر بچاتے ہی

”ن میمونہ کو دیکھو اور یہ عمو صاحب جو اتنے شریف بن کر بیٹھے ہیں، ذرا اس کا خیال رکھنا نظر بچاتے ہی

”ن میمونہ کو دیکھو اور یہ عمو صاحب جو اتنے شریف بن کر بیٹھے ہیں، ذرا اس کا خیال رکھنا نظر بچاتے ہی

”ن میمونہ کو دیکھو اور یہ عمو صاحب جو اتنے شریف بن کر بیٹھے ہیں، ذرا اس کا خیال رکھنا نظر بچاتے ہی

”ن میمونہ کو دیکھو اور یہ عمو صاحب جو اتنے شریف بن کر بیٹھے ہیں، ذرا اس کا خیال رکھنا نظر بچاتے ہی

”ن میمونہ کو دیکھو اور یہ عمو صاحب جو اتنے شریف بن کر بیٹھے ہیں، ذرا اس کا خیال رکھنا نظر بچاتے ہی

”ن میمونہ کو دیکھو اور یہ عمو صاحب جو اتنے شریف بن کر بیٹھے ہیں، ذرا اس کا خیال رکھنا نظر بچاتے ہی

”ن میمونہ کو دیکھو اور یہ عمو صاحب جو اتنے شریف بن کر بیٹھے ہیں، ذرا اس کا خیال رکھنا نظر بچاتے ہی

انہوں نے گلے لیا تو وہ چونک کر بولی۔

”بس ٹھیک بھائی نے نہیں آنے دیا۔ ابھی بھی روک رہے تھے۔“

”کیوں؟“ میمونہ بھابی نے کھوجی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”بناؤں گی کسی وقت اطمینان سے۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”چلیں اماں جی کے پاس بچے تنگ کر رہے ہیں۔“

”تم چلو۔ میں سالن چڑھا کر آتی ہوں۔“ میمونہ بھابی نے کمرے سے نکلتے ہی کچن کا رخ کیا اور وہ

پاس چلی گئی۔

→ → → →

شاہ سکندر پہلے کی طرح اپنے کسی کام سے کراچی آیا تھا۔ اور گوکہ آسیہ کی زندگی سے نکلتے ہی اس

یہ عہد کیا تھا کہ وہ اب کبھی اس سے ملنے کی کوشش نہیں کرے گا نہ اس کے بارے میں جاننے کی سہ

کرتے ہوئے اس کے پیش نظر اپنے نہیں آسیہ کا مغاڑا تھا کہ وہ اسے خواب سمجھ کر بھول جائے اور

راہیں تلاش کر لے اور اس کے خیال میں یہ اسی وقت ممکن تھا کہ وہ اس کی فضاؤں تک سے ناٹا توڑا

ثابت کر دے۔ ورنہ اپنی ہر سانس کے ساتھ وہ اسے محسوس کرتی رہے گی۔ پتا نہیں اسے یہ یقین کہ

کبھی اس سے نفرت نہیں کر سکے گی اور اس یقین میں جانے اس کا وہی زعم تھا یا اس لڑکی کے دل کی

گہرائی سے چھو آیا تھا۔ کچھ بھی تھا یہاں بہر حال وہ خود غرض نہیں ہوا تھا کہ وہ ساری زندگی اس کی

سارے گزار دے۔ اس کے برعکس جیسے وہ خود مرنساء کے ساتھ کچھ دماڑ کر کے زندگی کی گاڑی

اس کے لیے بھی ایسا ہی چاہتا تھا۔

اس لیے اپنے آپ کو کبھی اس نے خاصا پابند کر لیا تھا۔ گو کہ اس تمام عرصے میں تڑپتے چلتے دل کو

قرار نہیں آیا تھا اور کسی کسی وقت تو دل چاہتا کہ ساری ہند میں توڑ کر بس اس کی ایک جھلک دیکھ لے۔

راستوں سے ہی اس کا احوال پوچھ آئے جن پر کبھی وہ اس کے ساتھ تھی لیکن خود پر جبر کر کے اب

عہد پر قائم تھا۔ اور شاہ پور سے چلتے ہوئے اس نے یہی سوچا تھا کہ وہ اپنا کام مٹا کر فوراً واپسی کی راہ

کراچی کی حدود میں داخل ہوتے ہی وہ سب بھول گیا۔ یہ بھی کہ کس کام سے آیا ہے۔ بس مختلف

دوڑا مارا ہے۔ یہ اس کے اندر کا اضطراب تھا جو اسے کیس رکنے نہیں دے رہا تھا۔

یہاں میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا اور پہلی نظر میں ہی وہ دل میں اتر گئی تھی۔

یہاں وہ میری گاڑی سے ٹکرا کر بے ہوش ہوئی تھی۔

یہاں میں اسے پہلی بار لے کر آیا تھا اور اسی وقت اسے دل کا احوال سنا کہ میں نے اسے یہ یقین

اس کے مقصد کی راہ میں جاہل ہونے کی بجائے ہمیشہ اس کے ساتھ چلوں گا۔

وہ ایک ایک راستے پر رک کر ان لمحات کو آواز دے رہا تھا جس کے بارے میں اس نے گمان بھی

وہ اتنی جلدی ایسی یادوں گرور جائیں گے جو ہمیشہ اسے تڑپاتی رہے گی۔ عجیب بے قراری کے ساتھ

اور ایسی حالت میں اس نے کلفٹن کا رخ کیا تھا کہ راستے میں احمد حسن کا آفس دیکھ کر گاڑی وہیں

تمام عرصے میں اس نے کسی سے کوئی رابطہ نہیں رکھا تھا جب ہی احمد حسن نے اسے دیکھتے ہی سخت

اظہار کیا۔

”خبردار مجھ سے کلام نہیں کرنا میں تمہاری دوستی پر فاتحہ پڑھ چکا ہوں۔“

شاہ سکندر یہی سمجھا کہ وہ اس کے انتہائی اقدام سے واقف ہو کر ایسا کہہ رہا ہے۔ جب ہی اس کے

سر جھکا کر بیٹھ گیا جیسے اپنے جرم کا اعتراف کرنے کے ساتھ ہر سزا کے لیے تیار ہو۔

”آخر کن چکروں میں الجھے ہو۔ کیس ملتے ہی نہیں۔ تمہارے گھون کر کے تھک چکا ہوں۔“

آسیہ بھابی کو لے کر نہیں آئے۔ ”احمد حسن کی آخری بات پر وہ سراوچا کر کے اسے دیکھنے لگا۔“

”کیا بات ہے؟“ احمد حسن ٹھٹھک گیا۔ ”آسیہ بھابی تو ٹھیک ہیں ناں اور تم تو غالباً بابا جان کو منانے گئے

تھا ابھی تک اسی کوشش میں لگے ہو۔؟“

”نہیں راجی تم نہیں جانتے۔؟“ اس نے غیر یقینی سے پوچھا۔

”کیا نہیں جانتا؟“ احمد حسن جلد جانے کو بے چین ہو گیا۔

”ہاں بار زندگی کا وہ سفر جو میں نے آسیہ کے ساتھ شروع کیا تھا وہ ختم ہو گیا۔ حالانکہ میں کمزور نہیں تھا۔ مڑ

تا تھا۔ لیکن اس لڑائی میں بابا جان نے آسیہ کو گھٹ کر سمجھو میرے دونوں ہاتھ کاٹ دیئے تھے اور اگر میں

بند نہ دیتا تو آسیہ کے ساتھ اس کے گھروالے بھی بابا جان کے ظلم سے محفوظ نہیں رہ سکتے تھے۔“ وہ بہت دل

رنگ رہا تھا۔

احمد حسن سانے میں آگیا تھا۔

”میرے لیے کچھ مشکل نہیں تھا کہ میں آسیہ کو لے کر کہیں بہت دور نکل جاتا۔ جہاں تک بابا جان کی رسائی

نہ ہوئی نہیں سکتی تھی۔ لیکن اس کے گھروالے بے موت مارے جاتے اور یہ مجھے گوارا نہیں تھا۔ آسیہ تو اس

دوسے ہی مرحلے پر پھتاؤ کیا رہ جاتا۔“

وہ اپنی نظروں کے سامنے پیروٹ کو گھماتا ہوا بول رہا تھا۔

”راؤ باب بھی کچھ نہیں، لیکن کچھ نہ ہونے میں کم از کم یہ اطمینان تو ہے کہ وہ اپنی زندگی میں آج نہیں توکل

میں ایڈجسٹ ہو جائے گی کیونکہ وہ جذباتی لڑکی نہیں ہے جو یادوں کے سارے عمر بتا دے بلکہ شاید وہ تو رونے

بے میں بھی وقت ضائع نہیں کرے گی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسے دکھ نہیں ہوگا۔ یہ دکھ وہ اسی طرح

عال کر رہے گی جیسے خوشیاں۔ اور اپنے لیے جس راستے کا انتخاب کرے گی وہ انہیں ساتھ لے کر چلے گی لیکن

بارہاں جاں نکل نہیں ہونے دے گی۔“

”انتا جانتے ہو اسے؟“ احمد حسن سانے میں ہی بولا تھا۔

”شاید اس سے بھی زیادہ۔“ اس کے ہونٹوں پر زخمی مسکراہٹ چلی تھی۔

”تو در خواستی چھانی رہی۔ جب احمد حسن سانے سے نکلتا بھی کچھ نہیں بولا۔ چاہنے کے باوجود اسے

تو بھی میں کر سکا کیونکہ وہ بہت فوٹا ہوا لگ رہا تھا۔

”تم۔“ شاہ سکندر ایک دم خیال آنے پر کچھ سوچتے ہوئے انداز میں اسے مخاطب کر کے پوچھنے لگا۔ ”تمہیں احمد

ناں ساری باتوں کی خبر کیوں نہیں ہے؟ کیا ان کی طرف سے کسی نے نہیں بتایا؟“

”ملاقات ہی نہیں ہوئی کسی سے۔“ احمد حسن نے سمجھ کر بھی سرسری انداز میں کہا۔

”کیا مطلب ہے جو ناکہ کا سلسلہ شروع ہوا تھا؟“

”جی اسی وجہ سے تو میں بھی فون وغیرہ کرنے سے رہ گیا۔ ورنہ تمہارے بارے میں معلوم کرنے کے لیے میں

پر بھابی یا عدل صاحب کو فون کر سکتا تھا۔ کئی بار سوچا پھر اس خیال سے رہا گا کہ کہیں وہ نہ سمجھیں کہ اس

نے میں ناکہ کے سلسلے کو آگے بڑھانا چاہتا ہوں اور ادھر سے بھی دوبارہ کوئی نہیں آیا جس کا مطلب صاف ظاہر

کے۔“ احمد حسن احساس ہونے پر کندھے اچکا کر رہ گیا۔

”میں کہہ جسے ناں۔ لیکن احمد حسن اس میں تم سب کا کیا دلش؟“

”تمہارا پرہیزگار لے کر تو ہم ہی گئے تھے۔“ احمد حسن نے بظاہر ہلکے پھلکے انداز میں کہا اور ہنسا بھی جس سے

پھر بڑھ کر خاص اور ڈھونڈی۔ جیسے ہمیشہ سے مٹھوک رہا ہو۔

”میں ان بار ناکہ کے لیے کوئی کی نہیں ہے۔ تم بھی جانتے ہو۔“ احمد حسن اسے جزیرہ تو دیکھ کر بولا تھا۔

”میں تو واقعی نہیں ہے لیکن۔“ خبر پر پتاؤ کیسی ہے ناں اور آئی؟“ وہ بات بدل گیا۔

”میں تو خود ہی دیکھ لو۔“ احمد حسن فوراً ”گھر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔“

”میں بار بار اس وقت میں ان کا سامنا نہیں کر سکتا بلکہ شاید کبھی جی نہ کر سکوں۔“

”دکس کس کا سامنا نہیں کرو گے؟“ احمد حسن بے اختیار کہہ گیا پھر فوراً اپنی بات سنبھالنے کی کوشش کی۔  
 ”تمہارا جرم واقعی بہت بڑا ہے سکندر! لیکن قابل معافی یوں ہے کہ اس میں تمہارا بھی اتنا ہی نقصان  
 آسیہ بھائی کا۔ میں نے اسی کو تمہارے حالات بتا دیئے تھے اور وہ تھا ہوائی جہاز میں تو اس بات پر کہ تمہارا  
 انہیں کیوں نہیں بتایا تھا۔ مجھے بھی تم سے یہی شک ہے۔ سخت غلطی کی تمہارے نے یہ ہو سکتا تھا کہ ہم اس  
 راستہ نکال لیتے لیکن تم نے غیرت برت کر خود پر ظلم کیا۔ بہر حال اب تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ تمہاری فکر  
 ”میں قسمت کو دوش نہیں دیتا۔“ اس نے ٹوک دیا۔  
 ”چاہو باقی باتیں گھر چل کر کریں گے۔“ احمد حسن اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود وہ  
 بھی اٹھالے گیا تھا۔

\* \* \*

احمد حسن کے گھر آکر اس تمام عرصے میں پہلی بار اسے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کا موقع ملا تھا۔ جس  
 احساس ہوا کہ اتنا عرصہ اس نے اتنے اچھے دوست سے کوئی تعلق نہ رکھ کر ایک اور غلطی کی ہے۔  
 کئی ایک فرد ایسا نہیں تھا جسے اس سے ہمدردی ہوتی۔ جب ہی وہ ایک دم سے تنہا ہو گیا تھا۔ اگرچہ  
 دکھاوے کو ہی اس سے لگاؤ کا مظاہرہ کرتے جیسے پہلے کرتے آ رہے تھے تو ان سے بھی کس نہ کہ  
 اس کے دل کا غبار نکل سکتا تھا لیکن وہ بھی اس مقام پر اسے اکیلا چھوڑ گئے تھے شاید اس لیے کہ ان  
 چور تھا۔ بہر حال احمد حسن کے گھر آکر اسے بہت سکون ملا تھا۔ بس کچھ دیر آگئی نے خفگی کا اظہار کیا اور  
 سنے سرے سے اسی کی زبانی اس کی رام کہانی سن کر کتنی دیر تک افسوس کا اظہار کرتی رہیں۔  
 ”تمہارے ماں باپ کو اتنی انتہا پسندی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ خود بیٹیوں والے ہیں اور وہ  
 کا ذرا احساس نہیں کیا۔ بے شک اسے شاہ پور نہ بلاتے۔ یہیں لے جاتے دیتے اور انہوں نے تو تمہارا بھی  
 کیا۔ بہر حال بہت افسوس ہوا۔ گھر نہیں اجڑنا چاہیے تھا۔ آسیہ اپنے ماں باپ کی ایک بیٹی ہی ہے  
 ہو گا انہیں۔“

”مجھے تو آسیہ باجی کا خیال آ رہا ہے۔ وہ تو بہت اچھی ہیں۔ اتنی محبت کرنے والی۔“ نائلہ مچ جی رونے  
 شاہ سکندر اسے ایک نظر دیکھ کر رہ گیا۔  
 ”نائلہ! یہ کیا حقاقت کر رہی ہو۔“ احمد حسن نے اسے ٹوک دیا۔ ”سکندر پہلے ہی پریشان ہے تم تو  
 ”یہ ہمیشہ پریشان رہیں گے۔ لکھ لیجئے آپ کہیں سکون نہیں ملے گا انہیں۔“ نائلہ کسی طرح خود  
 پاسکی۔ چچ کر کتنی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

”سوری یا رادھ!“ احمد حسن نام ہو کر کچھ کہنا چاہتا تھا کہ وہ روک کر بولا۔  
 ”نہیں۔ مجھے برا نہیں لگا۔ یہ باتیں سننے کے لیے تو مجھے بہت پہلے یہاں آنا چاہیے تھا۔“  
 ”میں چائے لاتی ہوں۔“ اتنی اٹھ کھڑی ہوئیں پھر اس سے پوچھنے لگیں۔ ”تم آج ہی شاہ پور جاؤ  
 ”جانا تو آج ہی تھا لیکن میرا کام رہ گیا ہے۔ اب کل جاؤں گا۔“ وہ بتا کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔  
 ”ٹھیک ہے پھر ہمیں رک جانا۔ ہو مل وغیرہ جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اتنی کہہ کر چلی گئیں  
 کو دیکھ کر بولا۔

”رہنے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے یا رادھ! اتنی نے خواہ مخواہ۔“  
 ”کوئی خواہ مخواہ نہیں۔ بس آرام سے بیٹھو اور ہاں وہ اپارٹمنٹ تو چھوڑ دیا ہو گا تم نے؟“ احمد حسن  
 خیال آنے پر پوچھا۔  
 ”ہاں۔ میں نے چھوڑنے سے پہلے آسیہ کے نام سے خرید کر اسے گفٹ کر دیا تھا۔“ جواب دینے  
 نظروں میں اس شام کا منظر تھا جب اس نے آسیہ کو لٹافہ تھمایا تھا۔  
 ”یہ تم نے اچھا کیا۔ لیکن میرا خیال ہے وہاں کوئی ہے نہیں کیونکہ اس تمام عرصے میں میں وہاں

یاد رکھی ہے ریسیو نہیں کیا۔ اس کا مطلب ہے کرائے پر بھی نہیں دیا گیا۔“  
 ”ہوں۔“ اس نے غائب غامبی سے سر ہلایا تھا۔

پھر اس رات کھانے کے بعد وہ کتنی دیر تک احمد حسن کے ساتھ آسیہ کی باتیں کرتا رہا۔ ماضی سے زیادہ اس کا  
 خشن موضوع تھا۔ جس پر احمد حسن نے اسے ٹوک دیا کہ اسے اب اس کی فکر نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اس کا  
 دل اپنا نہیں رہا۔

”نائلہ! ماں بے احمد حسن! وہ میرے بچے کی ماں ہے۔“ اس نے جتا کر کہا تو احمد حسن اپنی جگہ اچھل پڑا۔  
 ”واقعی۔ تم نے پہلے نہیں بتایا، عجیب آدمی ہو یا رادھ۔ سوچ سوچ کر انکشاف کر رہے ہو۔ ارے اس بچے کے  
 جے تو تم ان سے مل بھی سکتے ہو۔“

”ہاں لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ کیونکہ اس کی زندگی میں میری کسی بھی قسم کی مداخلت اسے دکھ دے گی اور  
 یہ وہ دے گا تو میں نے پہلے بھی کبھی نہیں سوچا تھا۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی مقام پر پچھ اس کے لیے براہم ہو  
 رہا ہو خوشی ہے اسے مجھے سونپ دے۔ میں خود سے کوئی مطالبہ نہیں کروں گا۔ اور نہ ہی یہ چاہتا ہوں کہ بچے کی  
 اور باقی زندگی تباہ دے۔ پتا نہیں احمد حسن میں اس کے بارے میں کیا کیا سوچتا رہتا ہوں۔“ وہ اپنے جذبول  
 واپ کوئی نام نہیں دے سکا ہوا تھا۔

”ابن کو یا رادھ! مجھے تو اب تمہاری فکر ہو رہی ہے کہ کسی دن کپڑے پھاڑتے ہوئے ویرانوں میں نہ نکل جاؤ۔“  
 ”حسن پکارا کراٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”جواب بخیر!“ اس نے بیک پر سر نہکا دیا اور یونہی بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔  
 ”جی احمد حسن کے ساتھ ہی گھر سے نکلا تھا۔ اسے ایک تو پورٹ جانا تھا۔ دوسرے کھاد کی ایجنسی میں مینجر سے  
 ہوا تھا اور کیونکہ مینجر کا لیکارہ بچے سے پہلے ملنا متوقع نہیں تھا اس لیے وہ پہلے پورٹ چلا گیا۔ جہاں سے اس کی  
 اپنی لیکارہ بچے کے قریب ہی ہوئی تھی۔ پھر مینجر سے وہ دس منٹ بات کر کے فارغ ہو گیا تو دوسرے کھانے تک  
 گھر پہنچے کا سوتے ہوئے گاڑی میں بیٹھا تھا۔ اس شہر کی رونقیں دیکھ ہی نہیں۔ مناسب اسپڈ سے گاڑی دوڑاتے  
 ہوئے پھر ایک ایک بات یاد آنے لگی تو نڈاسکرین پر بس اس کی نظریں جمی رہ گئی تھیں۔ ذہن کے پردوں پر  
 جتنی فلم نے شہر کی رونقوں کو دھندلا دیا تھا۔ اور وہ اپنے راستے سے بھی ہٹ گیا تھا۔ کبھی اس سڑک بھی اس  
 سڑک اور اسے احساس تک نہیں ہو رہا تھا۔ اتنی دیر میں تو شاید وہ شاہ پور پہنچ جاتا جبکہ ابھی شہر سے بھی نہیں نکلا  
 تھا اور جانے کب تک اسی طرح بھٹکتا رہتا اگر جو قریب سے گزرتے دو بیکل ٹرک کے زوردار ہارن سے اس کے  
 ذہن کو جھٹکانے لگتا۔ وہ بری طرح چونکا تھا اور عین وقت پر کہ سامنے روڈ کراس کرتی ٹرکی جس طرح ملن ہو کر چل  
 رہی تھی وہ اگر بروقت بریک نہ لگاتا تو ایکسپلنڈ ٹیٹنی تھا۔

”گاڑی!“ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں بالوں میں پھنسا کر اس نے سر کو زور سے جھٹکا پھر جھکے ہوئے اعصاب کو  
 سکون کرنے کی خاطر وہ گاڑی پہنچ سڑک سے نکال کر کنارے لے آیا اور سیٹ کی بیک سے سر نہکا تھا کہ نظروں  
 کے عین سامنے سڑکیوں کی چمکتی ہوئی دھوپ میں کھڑی آسیہ پر پہلے تو اسے وہم کا کمان ہوا لیکن دوسرے بل نعین  
 ہوتے ہی وہ بے اختیار گاڑی سے اتر کر اس کے پاس گیا اور اسی بے اختیار سے پکارنا چاہتا تھا کہ وہ بول پڑی۔

”تمہارا طریقہ ہے پہلے ٹرکیوں کو گاڑی سے ہراساں کر کے بے ہوش کرنا پھر اٹھا کر ہسپتال لے جانا۔ آپ تو  
 ہائے غلاڑی ہیں پھر وہ ٹرکی بچ کیسے گئی؟“ اس کا طنز آمیز لہجہ سیدھا دل میں تازہ ہو گیا تھا وہ اپنی جگہ یوں جم گیا  
 جیسے پھر ہو گیا ہو۔

”شاہ سکندر حیات! آپ کے گاؤں میں بھی تو ٹرکیاں ہوتی ہوں گی پھر کھیل کا انتخاب آپ شرعاً کریں کرتے  
 نہ ہو مگر محبت کا قریب دے کر۔ ہونہ بظاہر اعلیٰ شخصیت کے اندر کتنا گھناؤنا انسان چھپا ہے۔ کاش میں جج  
 یا رادھ دیا کو بتا سکتی۔“ اس کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں اور بچے میں حد درجہ نفرت  
 سر آ رہا تھا۔

”تم جتنی چاہو مجھ سے نفرت کرو لیکن میرے کردار سے“ وہ بمشکل بولنے پر آمادہ ہو کر ابھی اسی قدر کہ وہ غصہ سے بولی۔

”کیا کردار ہے تمہارا“ یہی کہ شکار کی تلاش میں بھٹکتے پھر رہے ہو۔ اور یہ تم نے غلط کہا کہ میں تر کرتی ہوں۔ سچ ہے کہ تم میری نفرت کے بھی قابل نہیں ہو۔ اور ایک بات اچھی طرح سن لو کہ اگر دیکھ کر رکنامت خواہ غلطی سے میں تمہاری گاڑی کے سامنے کیوں نہ آجاؤں بے شک روندتے ہوئے اگر یہ نہ کر سکو تو اس شہر میں آتا چھوڑ دو۔“

”تم کو تو میں جینا چھوڑ دوں؟“

”مثبت اپنی ایسے ٹھٹھا مکالے کسی اور کے سامنے بولنا۔“ وہ پیر بختی مخالف سمت تیز قدموں سے تھی۔

شاہ سکندر نے اس کا یہ روپ پہلی بار دیکھا تھا اور سوچنے کی حد تک تو یہ سب بہت اچھا تھا کہ وہ اس کے دیکھ کر مزہ موڑے اور اپنی زندگی بچنے وغیرہ وغیرہ لیکن اب حقیقت میں اس اظہار نے اس کا دل ہلاتا تھا۔ مزید اس کے طرز تخاطب پر وہ تامل رہا تھا۔ کتنی دیر وہیں کھڑا اس کے پیچھے دیکھتا رہا پھر گاڑی میں بیٹھنے سے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ اس کے بارے میں اپنی گزشتہ تمام سوچوں کی نفی کر رہا تھا۔



وہ گھر آتے ہی واش روم میں بند ہو گئی۔ کیونکہ خود پر قابو پانے کی وہ ساری کوششوں میں ناکام ہونا اسے لگا جیسے ہی اماں جی یا اباجی کا سامنا ہوا وہ پھوٹ پھوٹ کر رون شروع کر دے گی۔ گو کہ وہ ان سے نہیں چاہتی تھی۔ لیکن شاہ سکندر کے ذکر کے ساتھ رو کر وہ خود کو کمزور بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھو کر نکلی اور ہاتھوں سے چہرہ تھپتھپاتی ہوئی اماں جی کے کمرے میں آکر پہلے صابحت کو دیکھا پھر بیٹھتے ہوئے کہنے لگی۔

”دو بجیوں کی دیکھ بھال آپ کے لیے مسئلہ ہو گئی اماں جی! میں جلد ہی کسی آیا کا انتظام کروں گی۔“

ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر عبدالوہاب نے کل سے بلایا ہے۔“

”تم بے شک نوکری کرو۔ میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اس سے پہلے کیا میں نے دو دو بچار سنبھالا۔ جب سیماساں بھی تو سمیٹا اور سونیا دونوں میرے پاس ہوئی تھیں۔“ اماں جی کو ایک تو اس کی کوئی دلچسپی نہیں تھی دوسرے اس کی بات بھی ناگوار گزری تھی۔

”وہ تو ٹھیک ہے اماں جی! لیکن ان کے اوپر کے کام کرنے کے لیے تو کوئی ہونی چاہیے۔ آپ منہ میں اپنی روئین سیٹ کر لوں پھر پہلا کام ہی کروں گی۔“

”اچھا جاؤ۔ پہلے کھانا کھاؤ۔“ اماں جی انھیں کے موڈ میں نہیں تھیں۔

”آپ نے کھالیا؟“ اس نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں سب نے کھالیا۔“ وہ جواب سن کر ان کے کمرے سے نکلی اور کچن میں جاتے ہوئے میمونہ کمرے میں بھاٹک کر دیکھا۔ وہ عمر کو ٹھیک رہی تھیں اس پر نظر پڑتے ہی پوچھنے لگیں۔

”کیا رہا؟“

”وہی جو میں کہہ کر گئی تھی کہ ڈاکٹر وہاب کے کلینک میں اگر جگہ نہ بھی ہوئی تب بھی مجھے اپائنٹ کل سے میری ڈیوٹی شروع۔“ اس نے بہت نارمل انداز میں بتایا۔

”ایک بات کہوں۔ یہ مرحلہ یعنی تمہیں جاب ملنے کا اگر تمہاری زندگی میں پہلے آیا ہوتا تو تم دروازہ چلاتی ہوئی آئیں۔ اب تمہیں خوشی نہیں ہوتی یا اظہار کرنا بھول گئی ہو؟“ میمونہ بھابھی نے بڑے شاک میں کہا تو وہ دروازہ چھوڑ کر ان کے پاس آئی تھی اور ایک نظر سوئے ہوئے بچوں کو دیکھنے کے بعد کہنے لگی۔

”میں آج بھی چلاتی ہوئی آتی مگر جو راستے میں شاہ سکندر نہ ملا ہوتا اسے دیکھ کر میرا موزہ خراب ہو گیا“

”جس شاہ سکندر ملا تھا۔ کیا کہہ رہا تھا؟“ میمونہ بھابھی حیران اور کچھ پریشان بھی ہو گئی تھیں۔

”خاص طور پر مجھ سے۔ ملنے نہیں آیا تھا۔ بس اتفاق سے سامنا ہو گیا۔ اور وہ بات کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے ختم دیدہ اختیار کیا کہ وہ ایوس ہو گیا جس سے مجھے یقین ہے کہ آئندہ وہ ایسا اتفاق بھی نہیں ہونے لگا۔“

”اب کوئی بے جا کہنے لگی۔“ میں نے آپ کو بتایا ہے لیکن آپ ابھی کسی سے نہیں کہیں گے کیونکہ بھائی کا کچھ جانتا نہیں ہو سکتا ہے میرا گھر سے لگنا ہی بند کر دیں اور میں اس کے دُور سے چھپ کر کہیں بیٹھ سکتی۔“

”ہر حال میں کچھ کرنا ہے۔“

”لیکن اس نے اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچایا تو؟“ میمونہ بھابھی کا دل ایسے ہی بہت کمزور تھا۔

”وہ ٹھیک ہے لیکن اس نے اس کے لیے جس میں دکھ بولنے لگا تھا کہ وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔ ”بہر حال یہ کوئی آپ اور کیا نقصان پہنچائے گا۔“ اس کے لیے جس میں دکھ بولنے لگا تھا کہ وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔ ”بہر حال یہ کوئی نہیں ہے اور نہ پریشانی کی بات۔ اس شہر میں اس کا آنا جانا ہمیشہ سے ہے۔ اس لیے سامنا تو ہو گا اور میں اس کا ٹھیک نہیں ہوں۔“

”لیکن مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”میں ہمیشہ سے ڈر پوک ہیں۔“ وہ کہتی ہوئی ان کے کمرے سے نکل آئی۔

”ہرات میں کھانے کے دوران اس نے اباجی اور خصوصاً بھائیوں کے سامنے جاب ملنے پر قصداً خوشی کا اظہار کیا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس وقت ان کے نزدیک صرف اس کی خوشی اہم ہے اور واقعی اسے خوش دیکھ کر بے چہروں پر اطمینان آتا تھا۔“

”کمانا ٹھیک ہیں؟“ ”عدیل بھائی نے پوچھا۔“

”میں نے شامیچ بچے تک۔“ اس نے بتایا۔

”میں تو نہیں خود ہی جانا پڑے گا البتہ واپسی میں میں تمہیں پک کر سکتا ہوں۔“ عدیل بھائی نے کہا۔

”تو اب بھائی! میں آجاسکتی ہوں۔ بس آپ اماں جی کو سمجھا دیں۔ یہ ذرا سی دیر سویر پر پریشان ہو جاتی ہیں۔“

”ابھی ابھی اماں جی کو کن انھیں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔“ ”آپ کو ہوتا ہے ایمر جس سبب کی صورت میں کتنی ہو سکتی ہے اور میں اگر فون کر کے بتا بھی دوں گی تب بھی یہ ہوتی رہیں گی۔“

”ہستہ ہستہ خود ہی سمجھ جائیں گی بیٹا! ان کی تم فکر نہیں کرو۔ بس تم اپنا خیال رکھنا۔“ اباجی نے اس کا سر ہلکا ہاتھ مارا تھا۔

”میرا ہاتھ تھامنے سے پہلے سوچ لیجئے شاہ سکندر! کہ میں کوئی بہت عام سی لڑکی نہیں ہوں۔ میرے خواب، میری میں صرف ایک خوبصورت گھر تک محدود نہیں ہیں۔ جس مقصد کے تحت میں نے تعلیم حاصل کی ہے اسے بہرہ ور نہیں ڈال سکتی۔ میرے نزدیک یہ سراسر دہمائی ہوگی۔“

جب پہلی بار شاہ سکندر نے اپنا ہاتھ پھیلا کر اس کا ہاتھ مانگا تھا تب اس نے کہا تھا۔ اور اس وقت حقیقتاً اسے مستقبل بہت خوبصورت، بہت روشن نظر آتا تھا۔ گو کہ وہ بہت دور تک نہیں سوچتی تھی لیکن بہت ساری بات کو سننے کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ وہ بہت واضح تھیں اور اب اسے لگ رہا تھا جیسے اس کا مستقبل بس ایک ہاتھ جہاں تک اسے واضح نظر آتا تھا اس میں سے بھی کتنا کچھ دھندلا گیا تھا۔ اور وہ دھند میں دیکھنا نہیں سکتی کیونکہ اس کے سامنے مدیجہ اور صابحت تھیں۔ جن کے نام اپنی زندگی کے اس نئے باب کو انتساب دے ہوئے اپنی ذات کی نفی کر رہی تھی۔

”میں اب اس خیال سے میمونہ بھابھی سے پہلے کچن میں جا پہنچی کہ اس وقت کا سارا کام وہ نمٹا جائے گی، لیکن میمونہ جی فوراً اس کے پیچھے آ گئی تھیں۔“

”میں تو اب! آج ہسپتال جانا ہے پھر یہاں کیا کر رہی ہو۔ جاؤ اپنی تیاری کرو۔“

”میں تو اب! میں کوئی وقت نہیں لگتا پھر مجھے اتنی جلدی بھی نہیں جانا لہذا آپ مجھے کام کرنے دیں اور اپنے کمرے میں بیٹھ جائیں۔“ وہ بیٹنی چولے پر رکتے ہوئے سکون سے بولی۔

”اور مہارے سچے؟“ ”میمونہ بھابھی نے ”سچے“ کہتے ہوئے محظوظ ہوئیں۔“

”نہیں اماں جی اذان کے وقت ہی اٹھا کر لے جاتی ہیں۔ پتا نہیں رات میں ان کے بغیر سوتی کیسے ہو  
لگتا ہے اسی انتظار میں جاتی رہتی ہیں کہ جلدی صبح ہو اور بچیوں کو اپنے پاس لے جائیں۔“

”جناب ہم نے بھی صرف بچے پیدا کیے ہیں۔“  
”مجھے پتا ہے۔ میں کوئی باہر سے نہیں آئی۔“ وہ مڑے اتار کر اس میں کپ رکھتے ہوئے بولی۔

میمونہ بھاٹی نے دو سرا چولہا جلا کر اس پر توار رکھ دیا اور یونی باتوں میں ناشتیاں ہو گیا۔ اور جب  
بھابھی نے سب کو ناشتا پہنچایا اس نے اپنی ابا لے کر تھرا میں ڈالا اور فیروز دھو کر امال جی کے کمرے میں  
سو کر انہیں بچیوں کے بارے میں کچھ کہنے سمجھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ وہ بھی جانتی تھی اس  
جب گھر سے نکلنے لگی تو بدایات دینے سے باز نہیں آئی۔ ٹھنڈا دودھ نہیں پلانا۔ جب تک دھوپ نہ  
سے نہیں نکالنا فیروز گر مہائی سے دھوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

میمونہ بھابھی زور زور سے ہنسنے لگیں تب وہ جلدی سے خدا حافظ کہہ کر باہر نکل کر آئی تو اسے ہلا  
کہ بہت ساری اور بہت محبت کرنے والی ہستیوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ تنہا ہوئی ہے۔ جانے دو  
باقی تمام عمر بھاری کیسے ہو گیا تھا کہ اسے اپنا آپ نہ صرف خالی بلکہ غیر محفوظ بھی لگنے لگا تھا۔ پھر لڑیہ  
اس خیال کی نفی کرنے میں لگی رہی تھی۔

”ڈاکٹر آسیہ شاہ“ ڈاکٹر عبدالوہاب نے بقیہ اشاف سے اس کے تعارف میں ابھی اس قدر کہا تھا کہ  
پڑی۔

”اصلاح الدین۔ آسیہ اصلاح الدین۔“  
”ہوں۔“ ڈاکٹر وہاب نے کچھ چونک کر دیکھا پھر کہنے لگے۔ ”یہ میری اسٹوڈنٹ بھی رہی ہیں۔ اور  
اسٹوڈنٹ تھیں مجھے یقین ہے اس سے اچھی ڈاکٹر ہوں گی۔“

”تھنک یو سر! آپ کے یقین کو ج ثابت کرنے کے لیے میں پوری ایمانداری سے اپنی صلاحیتوں  
کروں گی۔“ اس نے کہا۔

”گڈ! اب آپ ڈاکٹر حارث سے چارج لے کر انہی کے ساتھ سکینڈ فلور پر چلی جائیں وہاں ڈاکٹر  
کے ساتھ ہوں گی۔“ ڈاکٹر وہاب نے ڈاکٹر حارث کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ ایک بار پھر  
کر کے ڈاکٹر حارث کے ساتھ چل پڑی۔

اور پھر دن بھر کی مصروفیت نے اسے تھکا نہیں تھا بلکہ کسی نامعلوم شے سے نکل کر کتنے عرصے  
نے ہاتھ پاؤں پھیلائے تھے تو بس کچھ دیر کی تکلیف تھی اس کے بعد آرام ہی آرام تھا۔ اور اس آ  
اسے اسی طرح مصروف رہنا تھا۔ ورنہ وہی تکلیف نہ شے اسے گرفت میں لینے کے لیے اس ہسپتال  
جگہ موجود تھا۔ جب شاہ سکندر کا ایکسپینڈنٹ ہوا تھا تو وہ اسی ہسپتال میں بھی رہا اور یہیں اس  
بھی دیکھا تھا یہ خیال اسے پہلے مرحلے پر ہی آیا تھا۔ اور بس وہی کچھ دیر کی تکلیف تھی اس کے بعد  
کچھ سوچنے کی مہلت ہی نہیں دی تھی۔

”سنو جیم کیسے جاو گی؟“ ڈوہلی آف ہوئے پڑا کڑیا سمین نے اس سے پوچھا تو وہ گھڑی دیکھتی ہوئی  
”میرا خیال ہے میرے بھائی آئیں گے۔“

”اگر ان کا آنا مفہوم نہیں ہے تو میرے ساتھ چلو میں تمہیں ڈراپ کروں گی۔ بلکہ ایسا کوئی  
منع کروں گا کیونکہ تمہارا گھر میرے راستے میں پڑتا ہے۔ صبح آتے ہوئے بھی میں تمہیں پک کر لیا کروں  
یا سمین کی پیشکش پر وہ سوچ میں پڑ گئی۔

”کیا تمہارے گھر والوں کو اعتراض ہو گا میرے ساتھ آنے جانے پر؟“ ڈاکٹر یا سمین نے اسے  
پوچھا۔

”نہیں انہیں تو اعتراض نہیں ہو گا البتہ تمہیں زحمت ہوگی۔“  
”زحمت کیسی۔ میرا راستہ ہی وہی ہے اور تمہارا وزن بھی کوئی منوں کے حساب سے نہیں ہے جو

”جتنے کا اندیشہ ہوا۔“ ڈاکٹر یا سمین نے کہا تو وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔  
”نہیں جتنے کا اندیشہ ہوا۔“ ڈاکٹر یا سمین نے کہا تو وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔

”جتنے کا اندیشہ ہوا۔“ ڈاکٹر یا سمین نے کہا تو وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔  
”جتنے کا اندیشہ ہوا۔“ ڈاکٹر یا سمین نے کہا تو وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔

”جتنے کا اندیشہ ہوا۔“ ڈاکٹر یا سمین نے کہا تو وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔  
”جتنے کا اندیشہ ہوا۔“ ڈاکٹر یا سمین نے کہا تو وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔

”جتنے کا اندیشہ ہوا۔“ ڈاکٹر یا سمین نے کہا تو وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔  
”جتنے کا اندیشہ ہوا۔“ ڈاکٹر یا سمین نے کہا تو وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔

”جتنے کا اندیشہ ہوا۔“ ڈاکٹر یا سمین نے کہا تو وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔  
”جتنے کا اندیشہ ہوا۔“ ڈاکٹر یا سمین نے کہا تو وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔

”جتنے کا اندیشہ ہوا۔“ ڈاکٹر یا سمین نے کہا تو وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔  
”جتنے کا اندیشہ ہوا۔“ ڈاکٹر یا سمین نے کہا تو وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔

”جتنے کا اندیشہ ہوا۔“ ڈاکٹر یا سمین نے کہا تو وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔  
”جتنے کا اندیشہ ہوا۔“ ڈاکٹر یا سمین نے کہا تو وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔

”جتنے کا اندیشہ ہوا۔“ ڈاکٹر یا سمین نے کہا تو وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔  
”جتنے کا اندیشہ ہوا۔“ ڈاکٹر یا سمین نے کہا تو وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔

”جتنے کا اندیشہ ہوا۔“ ڈاکٹر یا سمین نے کہا تو وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔  
”جتنے کا اندیشہ ہوا۔“ ڈاکٹر یا سمین نے کہا تو وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔

”جتنے کا اندیشہ ہوا۔“ ڈاکٹر یا سمین نے کہا تو وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔  
”جتنے کا اندیشہ ہوا۔“ ڈاکٹر یا سمین نے کہا تو وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔

”جتنے کا اندیشہ ہوا۔“ ڈاکٹر یا سمین نے کہا تو وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔  
”جتنے کا اندیشہ ہوا۔“ ڈاکٹر یا سمین نے کہا تو وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔

”جتنے کا اندیشہ ہوا۔“ ڈاکٹر یا سمین نے کہا تو وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔  
”جتنے کا اندیشہ ہوا۔“ ڈاکٹر یا سمین نے کہا تو وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔

”جتنے کا اندیشہ ہوا۔“ ڈاکٹر یا سمین نے کہا تو وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔  
”جتنے کا اندیشہ ہوا۔“ ڈاکٹر یا سمین نے کہا تو وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔



غالباً! ”ابھی وہی دو تین ماہ کا تھا۔

”بیٹا! عمر سے چھوٹی دو گڑیاں اور ہیں۔ آپ جلدی سے ٹھک ہو جاؤ پھر وہ دونوں ہم آپ کو دے دیں گے۔“

ہیں ہی آپ کی۔ ”عدیل بھائی نے اسے اشتیاق دلاتے ہوئے کہا۔

”جچ پھوپھو! وہ شروع سے ہر بات کی تصدیق اسی سے کرواتا تھا۔

”ہاں بیٹا اور اب آپ آرام کرو۔ گھبراننا بالکل نہیں، ہم روزانہ آپ کے پاس آئیں گے۔ اور میں تو

شام تک یہیں رہوں گی ٹھیک ہے اب ہم جاؤں؟“

بچوں کے ذکر پر وہ کچھ بے چین سی ہو گئی تھی جب سی نبیل کو تسلی دے کر عدیل بھائی کو اشارہ کرتی ہوئی

سے نکل آئی۔

راستے میں عدیل بھائی اور اس نے یہ طے کیا تھا کہ فی الحال گھر میں نبیل کا نہیں بتائیں گے کیونکہ

پوتا ہونے کے ناطے وہ اماں جی کو سب بچوں میں زیادہ باریک دیکھتا رہا تھا۔ اور یہ بتا کر وہ ہاسپتال میں ہے کہاں کی کو

پاس جانے سے روکا نہیں جاسکتا تھا۔ اور اسے دیکھ کر اماں جی کی جو حالت ہوئی تھی اس کے پیش نظریہ

یہ طے کیا تھا۔

”آج پہلے دن ہی ایمر جنسی لگ گئی تھی کیا؟“ ”میسوند بھابھی نے اس کی دیر سے آمد پر کہا تو اس سے

بھائی بول پڑے۔

”نہیں۔ ہم لوگ ذرا گھومنے پھرنے نکل گئے تھے۔ برا مزہ آیا۔ آپ نہیں تھیں ناں اس لیے۔“

آسیہ بے ساختہ مسکراہٹ ہونٹوں میں دباتی اماں جی کے کمرے میں آئی۔ ایک بچی ان کی گود

دوسری اس نے بازوؤں میں بھر کر سینے میں چھپالی۔ برا خوبصورت احساس تھا جو زندگی کی ساری تلخیوں

پچھیدے دھیل دیتا تھا۔



شاہ سکندر ایک بار پھر احمد حسن کے سامنے بیٹھا تھا اور اس بار اس کے لیے اور انداز میں وہ بے اعتبار

تھی۔ پہلے کے برعکس بہت سنبھل کر بول رہا تھا۔

”میں آسہ کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن بچے کے لیے اپنے جذبات پر قابو پانا اب میرے لیے

ہو گیا ہے۔ آخر وہ میرا خون ہے۔ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ سینے سے لگانا چاہتا ہوں۔ بتاؤ کیا کروں؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ احمد حسن اس کی اتنی جلدی بات سے پھر جانے پر حیران تھا۔ ”وہیے میرا

تمہیں اتنا جذباتی نہیں ہونا چاہیے کیونکہ وہ تمہارا پہلا بچہ تو نہیں ہے۔“

”پہلا اور دوسرا کیا۔ ہر بچے کی اپنی محبت ہوتی ہے۔“

”مجھے ابھی تجربہ نہیں ہے بہر حال تم اگر اتنی ہی اسے دیکھنے اور سینے سے لگانے کو بے چین ہو

سیدھا سادا راستہ اختیار کر دینی آسہ، بلکہ نہیں ان کے والد کو فون کر کے کہو کہ تمہاری پدرانہ شفقت

ہے اور تم بچے کو دیکھنا چاہتے ہو۔“ احمد حسن نے بظاہر بہت سنجیدگی سے کہا تھا۔

”اور اگر انہوں نے منع کر دیا تو؟“ ”وہ احمد حسن کا معقول مشورہ رد نہیں کر سکتا تو جرح پر اتر آیا۔

”یہ تم پہلے سے کیوں فرض کر رہے ہو۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی اعتراض نہ کریں۔“ احمد حسن نے رمان

وہ اندر ہی اندر جڑ بڑ ہو کر بولا۔

”تم نہیں جانتے“ انہوں نے مجھے آسہ سے بھی نہیں ملنے دیا تھا۔ اگر اس وقت وہ اپنے روئے میں

پیدا کر دیتے تو یہ سب نہ ہوتا۔ میرا کیا گناہ اپنی بیٹی کا کھرا اجازت انہوں نے۔ ”وہ اب سارا الزام

”بچائے اسے سمجھانے کے مزید داغ خراب کر دیا تھا اس کا۔ ورنہ وہ ایسی نہیں تھی۔ کبھی مجھ سے

ہو سکتی تھی۔ انہوں نے برکایا اسے“ ابھی بھی برکایا میں گئے۔ اور میں اس معاملے میں کوئی رعایت

گا۔“

”دھیرج سے سکندر! میں نہیں سمجھتا کہ وہ اس معاملے کو ابھائیں گے۔ تم خود پر قابو رکھو اور یہ

لو“

”احمد حسن نے ٹیلی فون سیٹ اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

ان کے کیا بات کروں گا میری تو آواز سنتے ہی ادھر سے فون بند ہو جائے گا۔“ وہ ناراضگی سے گویا ہوا۔

”میں کا مطلب ہے۔ پہلے کو شش کر چکے ہو۔“

”اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

”اس سے پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے تمام حالات بتا کر سمجھا سکتا۔“

”بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا کہ میں اسے تمام حالات بتا کر سمجھا سکتا۔“

”لیکن اس طرح غصے میں بات نہیں کرنا۔ بس

نفران ساری باتوں کو چھوڑ دو“ تمہیں فون ملا دیتا ہوں، لیکن اس طرح غصے میں بات نہیں کرنا۔ بس

”میں صاف لفظوں میں اپنا مقصد بیان کر کے ان کا جواب سن لو۔“ احمد حسن نے اسے تنبیہ کرتے ہوئے کہا

”وہ اکل کرنے لگا۔

”سکندر ہونٹ بچھ کر اسے دیکھ رہا تھا۔

”احمد حسن ادھر سے پہلو کے جواب میں بولا پھر

”کوئی خاتون تھیں اور غالباً بہت غلٹ میں تھیں جب ہی آپ

”اور کہاں سے بول رہے ہیں کا سوال نہیں اٹھایا، بہر حال اب بڑے صاحب سے تم خود بات کرو۔ میں اس

”طے میں انوال انہیں ہونا چاہتا۔“

”سکندر نے اس کے ہاتھ سے ریسیور لے کر کان سے لگا لیا اور ادھر سے جیسے ہی اباجی کی آواز سنائی دی کہنے

”جی میں شاہ سکندر حیات، مجھے کوئی لمبی چوڑی بات نہیں کرنی اور نہ غیر ضروری۔ بس ایک بات کہنی ہے کہ

”بچے سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”لیکن کا سوال آپ کو نہیں اٹھانا چاہیے کیونکہ میں آپ کی نہیں اپنی اولاد کی بات کر رہا ہوں اور منع کرنے کا

”اب کو بلکہ کسی کو کوئی حق نہیں ہے۔“

”میرا مقصد صرف اور صرف اپنے بچے کو دیکھنا ہے اور بس۔“

”ٹھیک ہے۔ کل اسی وقت میں دوبارہ فون کروں گا۔“ شاہ سکندر فون رکھ کر احمد حسن کو دیکھ کر مسکرایا تھا۔

”ابا کہا انہوں نے؟“ ”احمد حسن نے بظاہر سرسری انداز میں پوچھا۔

”کہہ رہے تھے بچی کی ماں سے بات کرنے کے بعد کوئی جواب دے سکیں گے۔“

”شاہ سکندر بچے کی پرسکون ندی میں ٹنکرا اچھال کر ملاحظہ ہو رہا تھا۔ اس وقت احمد حسن کو جانے کیوں وہ کچھ

”ساگ۔ کئی دیر اسے سمجھنے کی کوشش کرتا رہا پھر کہنے لگا۔

”ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی سکندر! کہ اس روز تو تم کہہ رہے تھے آسہ کی زندگی میں تمہاری کسی بھی قسم

”غلط انہیں دکھ دے گی اور یہ کہ انہیں دکھ دینے کا تم نے کبھی سوچا بھی نہیں اور اب یوں لگ رہا ہے جیسے تم

”انہیں پریشان کرنے کا سوچ کر آئے ہو۔ ہے ناں؟“

”نہیں! کوئی بات نہیں ہے۔“ ”شاہ سکندر نے سگریٹ سلگانے کے بعد کہا تھا۔ ”مجھے آسہ اور ان کے گھر

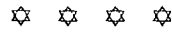
”اسے کوئی مطلب نہیں ہے لیکن میں اپنے بچے کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ایسا کر کے میں ایک اور جرم کا

”بہاؤں گا۔“

”احمد حسن نے مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر کے خاموشی اختیار کر لی جسے محسوس کر کے شاہ سکندر اٹھ کھڑا ہوا

”اوسکے میں چلوں پھر انشاء اللہ جلد ملاقات ہوگی۔“

”احمد حسن نے مصافحہ کرنے کے ساتھ بس مسکراتے پر اکتفا کیا تھا۔



”سننا زندگی کے نئے باب کو مدھیہ اور صباحت کے نام انتشار کیا تھا اور اس سے اگلے روز ہی اس نے

ان کے ساتھ نیل کا نام بھی لکھ دیا تھا کہ اس بچے کی اس حالت کا ذمہ دار وہ صرف اس کی ماں کو نہیں تھی۔ کچھ قصور ان سب کا بھی تھا اور خصوصاً اس کا کہ جب وہ شروع ہی سے اس سے اتنا مانوس تھا کہ خیال رکھنا چاہیے تھا۔ اپنی حد درجہ غفلت پر اب وہ اپنے آپ کو معاف نہیں کر پاری تھی۔ جب سے ہی اس نے ڈاکٹر وہاب سے کہہ کر اپنی ڈیوٹی تھوڑے طور پر گرا لی تھی۔ جہاں سب بچوں کے احساسات و جذبات ایک جیسے تھے۔ بس جب فارغ ہوئی تب نیل کے پاس جا بیٹھتی اور اس کی اپنے بہت پر اس کا دل بھر آتا۔

ایک ہفتہ ہو گیا تھا اسے ہسپتال جوائن کیے ہوئے اور اس دوران نیل سے ملنے اس کی ممی اور باپا کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ کئی بار اس نے نیل سے پوچھا تو جواب میں اس نے بس ”پتا نہیں“ کہا۔ اور سے پوچھتے ہوئے اب اسے خود عجیب سا لگ رہا تھا۔ کہ بات صرف نیل کی ماں کی غیر ذمہ داری پر ختم اس کے باپ کا نام بھی آئے گا“ اور وہ خود تسلیم کر رہی تھی لیکن وہی بات کوئی دوسرا کے تو جانے کی محسوس ہوتا ہے۔ بہر حال اس وقت وہ نیل کے پاس آکر بیٹھی تو بلی پھٹکی باتوں کے دوران پوچھنے لگی۔

”یہ بتاؤ بیٹا! آپ کو یہاں ہسپتال میں کون چھوڑ کر گیا ہے؟“

”ڈیڈی۔“ نیل نے کہا تو وہ سمجھ گئی وہ اپنے نانا کو ڈیڈی کہہ رہا ہے۔

”اور آپ کی ممی کہاں ہیں؟“

”ممی جلی گئیں ڈیڈی نے انہیں پایا کے پاس بھیج دیا ہے۔“

نیل کا جواب بظاہر سیدھا سا دکھائی دیا لیکن اسے سوچ میں مبتلا کر گیا۔ کچھ دیر بعد اس کی سمجھ میں آیا دوسری شادی کر چکی ہیں۔ اور اس سے اسے کوئی مطلب نہیں تھا اس لیے وہ موضوع بدل کر مئی پڑ۔ نیل کو ایک سرسبز کروانے آتی تہہ دہ کرے سے نکل کر نئی اور اسی وقت نیلہ بیگم کے گھر فون ڈیال۔

”گھر میں صاحب یا بیگم صاحبہ جو بھی موجود ہیں انہیں بلاؤ۔ کو ہسپتال سے فون ہے۔“ اور ہرے آواز سن کر اس نے کہا تھا۔

”ہیلو۔“ کچھ دیر بعد مروانہ آواز نیل کے نانا کی تھی۔

”جی السلام علیکم امیں ڈاکٹر آسیہ بول رہی ہوں اور اس وقت میں ڈاکٹر کی حیثیت سے نہیں بلکہ نیا کی حیثیت سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ پورے اعتماد سے بول رہی تھی۔

”جی فرمائیے۔“

”آپ لوگوں کے پاس اگر نیل کے لیے وقت نہیں تھا تو اسے شروع ہی میں ہمارے پاس کیوں نہ

یا جب ہسپتال میں لاوارثوں کی طرح ڈال گئے تھے تب ہمیں اطلاع کر دیتے تو کم از کم بچے کی یہ حالت

آپ کو پتا ہے بیمار سے زیادہ اس پر تنہا اثر انداز ہوئی ہے۔ بچہ ٹوٹ کر رہ گیا ہے۔“

”تو اب جوڑنے والے مل تو گئے ہیں اسے۔“ خاصے مسخرے کہا گیا جس پر وہ سگ کر بولی۔

”جی ہاں۔ یہی بتانے کے لیے فون کیا ہے میں نے کہ آپ کو تو اس کی فکر خیر پہلے بھی نہیں ہوئی

دوسری کسی ذمہ داری سے بھی میں آپ کو آواز کر رہی ہوں۔ اس کے ساتھ یہ اطمینان بھی دے رہی

سے میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے ریسپورنٹ دیا اور ان کی بے بسی پر کڑھ رہی تھی کہ معا” اسے اپنی بچیوں

اس کے ساتھ ہی سیمابھائی کی باتیں ذہن پر دستک دینے لگیں۔

”ڈرا سوچو۔ آئندہ زندگی میں اس آنے والے بچے کا کیا کردار ہوگا۔ نیل کا حال تم نے دیکھا ہے

دونوں میں سے کسی ایک کے نہ ہونے سے بھی بچہ بری طرح متاثر ہوتا ہے۔ خصوصاً ماں باپ کی طرف

”نہیں۔“ اس نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور اسی وقت سے خود کو باور کرانے لگی تھی کہ

صرف ماں ہی نہیں باپ بھی ہے۔ انہیں زندگی میں وہ بھی کسی محرومی کا احساس نہیں ہونے دے

ان کی قسمت میں لکھی گئی ہے اس کا بھی نہیں۔  
ان میں بچیوں کو سنانے اور ان کے تمام کاموں سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنے بستر میں گھٹنوں کے گرد بانو

ہی تھی جب ابائی نے اس کے دروازے میں آکر پوچھا۔

”سو تو میں رہیں بیٹا؟“

”وہ چونک کر بولی تھی۔

”ابائی! آئیے۔“ وہ چونک کر بولی تھی۔

”یہ دروازہ بند کر لیا کرو۔“ وہ آتی ہوئی۔

”نہیں کرو جی ہوں۔“

”ابائی اصل بات سے پہلے غالباً“ اسے ہلکا رہے

میں کوئی مشکل نہیں ہے۔ بس یہ ہے کہ سارا دن بچوں سے دور رہنا پڑتا ہے خیر ابھی تو انہیں احساس نہیں

اور جب تک انہیں سمجھ آئے گی تب تک میں انشاء اللہ اپنا کینک سیٹ کر کے دن کا زیادہ وقت ان کے

رہوں گی۔“ وہ شاید کچھ دیر پہلے کی سوچ رہی تھی۔

”ابائی یہ کچھ سوچتے ہوئے انداز میں سر ہلایا پھر کہنے لگے۔“ میں تم سے ایک بات کہنے آیا ہوں بیٹا!

”ابائی اس لیے کہ میں نہیں چاہتا۔ کوئی زیادہ شور شرابا ہو اور تم بھی محل سے سنا، محل سے سوچنا۔

رف تم سے اس لیے کہ میں نہیں چاہتا۔ کوئی زیادہ شور شرابا ہو اور تم بھی محل سے سنا، محل سے سوچنا۔

نہوئے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ پریشانی کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتی۔“

”ابائی یہ کچھ سوچتے ہوئے انداز میں سر ہلایا پھر کہنے لگے۔“ میں تم سے ایک بات کہنے آیا ہوں بیٹا!

”ابائی اس لیے کہ میں نہیں چاہتا۔ کوئی زیادہ شور شرابا ہو اور تم بھی محل سے سنا، محل سے سوچنا۔

نہوئے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ پریشانی کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتی۔“

”ابائی یہ کچھ سوچتے ہوئے انداز میں سر ہلایا پھر کہنے لگے۔“ میں تم سے ایک بات کہنے آیا ہوں بیٹا!

”ابائی اس لیے کہ میں نہیں چاہتا۔ کوئی زیادہ شور شرابا ہو اور تم بھی محل سے سنا، محل سے سوچنا۔

نہوئے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ پریشانی کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتی۔“

”ابائی یہ کچھ سوچتے ہوئے انداز میں سر ہلایا پھر کہنے لگے۔“ میں تم سے ایک بات کہنے آیا ہوں بیٹا!

”ابائی اس لیے کہ میں نہیں چاہتا۔ کوئی زیادہ شور شرابا ہو اور تم بھی محل سے سنا، محل سے سوچنا۔

نہوئے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ پریشانی کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتی۔“

”ابائی یہ کچھ سوچتے ہوئے انداز میں سر ہلایا پھر کہنے لگے۔“ میں تم سے ایک بات کہنے آیا ہوں بیٹا!

”ابائی اس لیے کہ میں نہیں چاہتا۔ کوئی زیادہ شور شرابا ہو اور تم بھی محل سے سنا، محل سے سوچنا۔

نہوئے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ پریشانی کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتی۔“

”ابائی یہ کچھ سوچتے ہوئے انداز میں سر ہلایا پھر کہنے لگے۔“ میں تم سے ایک بات کہنے آیا ہوں بیٹا!

”ابائی اس لیے کہ میں نہیں چاہتا۔ کوئی زیادہ شور شرابا ہو اور تم بھی محل سے سنا، محل سے سوچنا۔

نہوئے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ پریشانی کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتی۔“

”ابائی یہ کچھ سوچتے ہوئے انداز میں سر ہلایا پھر کہنے لگے۔“ میں تم سے ایک بات کہنے آیا ہوں بیٹا!

”ابائی اس لیے کہ میں نہیں چاہتا۔ کوئی زیادہ شور شرابا ہو اور تم بھی محل سے سنا، محل سے سوچنا۔

نہوئے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ پریشانی کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتی۔“

”ابائی یہ کچھ سوچتے ہوئے انداز میں سر ہلایا پھر کہنے لگے۔“ میں تم سے ایک بات کہنے آیا ہوں بیٹا!

”ابائی اس لیے کہ میں نہیں چاہتا۔ کوئی زیادہ شور شرابا ہو اور تم بھی محل سے سنا، محل سے سوچنا۔

نہوئے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ پریشانی کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتی۔“

”ابائی یہ کچھ سوچتے ہوئے انداز میں سر ہلایا پھر کہنے لگے۔“ میں تم سے ایک بات کہنے آیا ہوں بیٹا!

”ابائی اس لیے کہ میں نہیں چاہتا۔ کوئی زیادہ شور شرابا ہو اور تم بھی محل سے سنا، محل سے سوچنا۔

نہوئے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ پریشانی کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتی۔“

”ابائی یہ کچھ سوچتے ہوئے انداز میں سر ہلایا پھر کہنے لگے۔“ میں تم سے ایک بات کہنے آیا ہوں بیٹا!

”ابائی اس لیے کہ میں نہیں چاہتا۔ کوئی زیادہ شور شرابا ہو اور تم بھی محل سے سنا، محل سے سوچنا۔

نہوئے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ پریشانی کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتی۔“

”ابائی یہ کچھ سوچتے ہوئے انداز میں سر ہلایا پھر کہنے لگے۔“ میں تم سے ایک بات کہنے آیا ہوں بیٹا!

”ابائی اس لیے کہ میں نہیں چاہتا۔ کوئی زیادہ شور شرابا ہو اور تم بھی محل سے سنا، محل سے سوچنا۔

”ہاں بچہ اسے معلوم ہی نہیں کہ بیٹا نہیں دو بیٹیاں ہیں، آسیہ کی خود کھائی سن کر اباجی بھی اپنے آپ سے تھے اور اپنے پیچھے اس کے کمرے کا دروازہ بند کر گئے تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کلاٹ کے پاس کھڑی ہو گئی اور دو کھیل سرکار ایک ساتھ دو معصوم بچوں کو دیکھنے لگی، جبکہ اس کا ذہن پوری طرح بیدار ہو کر اس نے مسئلہ کو سوچنے لگا تھا۔

”ہمارے ہاں بیٹیاں خاندان سے باہر نہیں دی جاتیں۔“ شاہ سکندر کی اس بات سے وہ اب بھی خائف تھی کہ کو دیکھ کر وہ اپنی بات سچ ثابت کرنے کے لیے اس سے بیٹیاں چھین نہ لے جائے۔  
”نہیں!“ اس نے بے حد ریشٹان ہو کر بچوں پر دوبارہ کھیل بول ڈالا جیسے انہیں ساری دنیا سے چھاپا لینا چاہتا تھا۔ اسی عالم میں ادھر سے ادھر ٹپکنے لگی۔

سڑیوں کی خاموش رات کا سفر ست روی سے جاری تھا اور اس کی صبح بہت دور تھی جب وہ کسی نتیجے پر پہنچی۔  
”صبح وہ معمول کے مطابق اٹھ گئی۔ نماز کے بعد روزانہ کی طرح میسونہ بھابھی کے ساتھ مل کر ناشتا بنایا پھر اپنا پہلے اماں جی کے کمرے میں آکر کھنے لگی۔

”اماں جی! صباحت کو تیار کر دیں۔ میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ کیونکہ رات اس کی طبیعت ٹھیک ہا سہیل میں اس کا چیک اپ کروالوں گی۔“  
”پھر سارا دن کیا کرو گی؟“ اسے سنبھالو گی؟“  
”کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔ بس آپ تیار کر دیں۔“ اس نے بہت عجلت میں کہا اور اباجی کو اپنی طرف دیکھنے اشارہ کرتی ہوئی کمرے سے نکل آئی۔

اباجی فوراً ”ہی اس کے پیچھے آگئے تھے۔  
”کیا ملے کیا ہے تم نے؟“

”بس سکندر کا فون آئے تو اس سے کہہ دیجئے گا کہ ہا سہیل آکر بچے کو دیکھ لے اور آج ہی کیونکہ میں روز ساتھ نہیں لے جاسکتی۔“ وہ بہت نارمل انداز میں بول رہی تھی۔  
”اور مدیہ؟“ اباجی کچھ حیران تھے۔

”نہیں اباجی! اسے مدیہ کا معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ کبھی نہیں۔“ وہ ایک دم اباجی کے سینے سے لگ گئی۔  
کاپتے وجود کو دھیرے دھیرے تھکے ہوئے اباجی کچھ گھٹنے کے اندر سے کتنی خوفزدہ ہے اور اسی خوف کے باعث ہمیشہ کے لیے شاہ سکندر سے چھپا رہی ہے۔

”دروم! بیٹا! تم سے تمہارے بچے کوئی نہیں لے سکتا۔ چلو تیار کرو۔ وہ تمہاری ڈاکٹر یا سمین آنے والا جی نے اسے وقت کا احساس دلایا تو وہ ان سے الگ ہو کر الماری کی طرف بڑھ گئی۔

پھر صباحت کا فایز اور دودھ وغیرہ بیگ میں رکھنے تک یا سمین کی گاڑی کا ہارن بجنے لگا تھا۔ ادھر اماں جی ملنا رہی تھیں۔ انہیں شاید بھی کو ہا سہیل لے جانا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جب وہ خود آؤں گے اسے چیک کرکے لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ ان کی ساری باتوں پر بس ہوں ہوں کرتی رہی اور پھر صباحت کو ان کی گود سے نکل آئی۔

”ارے! بچہ کس کا ہے؟“ اس کے ہنسنے ہی یا سمین نے اشتیاق سے پوچھا۔  
”میری بیٹی ہے۔“ اس نے مسکرا کر کہا تو یا سمین اچھل پڑی۔

”ہائیں! اہم میڈیو! مکمل ہے۔ میں اب تک تمہیں۔“ موڑ کاٹنے کے لیے مخالف سمت دیکھتے ہوئے یا سمین ادھر رہ گئی۔

”وہ ہا سہیل میں میرا بیٹہ ہے ناں، نیل وہ بہت ضد کر رہا تھا کہ میں اسے لے کر آؤں، وہ کھیلے گا اس سے فوری جی کو ساتھ لے جانے کا جواز سوجھ گیا تھا۔

”تمہارے بیٹے کے ساتھ بڑی نرینڈی ہوئی ہے۔ مجھے اس کی ماں پر غصہ آتا ہے۔ کیسی ظالم عورت ہے۔“

”اے سنی قربانیاں دیجی ہیں۔“ یا سمین تاسف سے کہہ رہی تھی ”اس بات سے بے خبر کہ اس کی باتوں سے اس ماں کے دل پر کیا اثر رہا ہے۔“

پھر سارا وقت وہ بہت بے کل رہی تھی۔ ہر آہٹ پر اس کی دھڑکنیں کبھی بہت تیز ہو جاتیں اور کبھی رکنے لگتیں۔ وقفے وقفے سے نیل کے کمرے میں جا کر صباحت کو دیکھتی اور اس کی موجودگی کا اطمینان کرنے کے بعد بھی مطمئن نہیں ہو رہی۔ کاش وہ یہاں سے بہت دور جاسکتی۔ جہاں تک شاہ سکندر کی سوچ کی بھی رسائی ممکن نہ ہوتی۔ جانے وہ شخص اسے

زہرے پر کونستہ کیوں تھا۔ وہ تو سب سے بہت لوٹ چکی تھی۔  
”شاہ سکندر حیات! تم اگر مجھے اپنے سامنے گڑ گڑانا ہوا دیکھنا چاہتے ہو تو میں تمہارے سامنے صرف ہاتھ ہی نہیں دیں گی، تمہارے قدموں پر سر رکھ دوں گی، بس تم ہماری زندگی سے نکل جاؤ۔ میں اپنی انا خودداری اور اپنی ہستی کا غرور ہمارے سامنے مناد! الوں گی بس ایک وعدے پر کہ تم میری متا کوڑک نہیں پہنچاؤ گے۔

میں جانتی ہوں، تم احساس برتری کا شکار ہو اور اس روز میرے تلخ رویے نے شاید تمہارے اس احساس کو چیلنج کیا ہے تم مجھ سے جینے کا ہانا بھی چھین لینا چاہتے ہو۔ میں تمہیں اچھی طرح سمجھ گئی ہوں سکندر حیات! لیکن تم مجھے نہیں مجھ۔“

”اماں! فون کی نیل سے اس کی سوچیں منتشر ہو گئیں۔ گہری سانس کے ساتھ اس نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا تو دوسری

زبان اباجی تھی اس کی آواز سنتے ہی کہنے لگے۔  
”بیٹا! شاہ سکندر تمہارے پاس آ رہا ہے۔“

”جی! وہ اسی قدر کہہ سکی۔  
”تم پریشان تو نہیں ہو بیٹا؟“

”نہیں نہیں اباجی! میں پریشان نہیں ہوں۔ فیس کر سکتی ہوں اسے“ آپ فکر نہیں کریں۔“ وہ فوراً بولی تھی۔  
”اچھی بات ہے۔“ اباجی نے فون بند کر دیا تو وہ اٹھ کر نیل کے کمرے میں آ گئی۔

نیل سو رہا تھا۔ وہ کچھ دیر کھڑکی کے پاس رک کر سڑک پر آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھتی رہی پھر صباحت کو اٹھا کر دوبارہ اپنے رے میں آ گئی۔ پھر کچھ دیر پہلے ہی کہہ آئی تھی کہ کوئی اس کا پوچھے تو اس کے کمرے میں بھیج دے۔ زیادہ دیر نہیں

بڑی تھی کہ شاہ سکندر کا وجہہ سرا پر دروازے میں نمودار ہوا تھا۔  
”اے آئی کم ان! ڈاکٹر!“ شاہ سکندر نے انگلی موڑ کر دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا تو دھیرے سے سر اٹھا کر دیکھتے

کے دو چہرے غائب ہو گئی تھی۔  
”السلام علیکم!“ شاہ سکندر چند قدم آگے آگیا اور وہ بہت کچھ سوچ کر بیٹھی تھی۔ کوئی ایک بات نہیں کہہ سکی۔

”اے! انداز میں اٹھ کر نیل کے پاس گئی اور کھیل میں لپٹی صباحت کو اٹھا کر اس کے سامنے کر دیا۔  
”یہ واقعی میرا بچہ ہے؟“ شاہ سکندر نے اس کے ہاتھوں سے صباحت کو لیتے ہوئے کہا۔ اس کے کسی انداز میں بے

یاری محسوس نہ فرمائی جس سے ظاہر ہو نا کہ وہ واقعی پیرانہ شفقت سے مجبور ہو کر آیا ہے۔  
”میرا مطلب ہے میں نے بیٹی کی خواہش کی تھی اور اس معاملے میں میں بہت خوش نصیب ہوں کہ میری ہر

شے پوری ہوئی ہے، خدا اس کے لیے۔“  
”اے! ہم بھونٹ بیٹھے کرخ موڑ گئی۔ تب شاہ سکندر اس پر سے نظریں ہٹا کر بھی کو دیکھنے لگا۔ کتنی دیر کے لیے خاموشی

نی کی تھی کہ وہ اپنی پر جھکا تھا اور وہ بیٹھ موڑے کھڑی تھی، لیکن سر کٹے کٹے کوئے تھا سمجھ گئے کہ وہ دونوں طرف بظاہر ٹوٹنے جڑنے کا

اثر باری تھا۔  
”میرا خیال تھا۔ تم مجھے بچے سے نہیں ملے دوں۔“ خاموشی میں شاہ سکندر کی آواز نے بہت باک سار تعاشیر برآ کیا تھا۔

”تو ایسا کر سکتی تھی اگر جو مجھ میں بار بار آپ کا سامنا کرنے کا حوصلہ ہوتا حالانکہ اتنی کمزور تو میں کبھی نہیں تھی۔ لیکن یہ محبت انسان کو ایسا ہی بزدل بنا دیتی ہے۔ میں بہت ٹوٹ چکی ہوں شاہ سکندر حیات! مجھے اپنے سر پر آسان ملتا ہے نہ

رستہ نہیں۔ اگر کوئی سہارا ہے تو ان خوب صورت لمحوں کا جس میں رفاقتوں کا مان تھا۔ رفاقتیں ٹوٹ گئیں لیکن مان“

جانے کیوں سلامت ہے اور اسی کے بھروسے پر میں آپ سے التجا کر رہی ہوں۔“  
اس نے بہت دھیرے دھیرے شاہ سکندر کی طرف رخ موڑا تو اس کی آنکھوں میں تیرتی نمی اور بندھے بازو ساکت ہو گیا تھا۔

”مجھے بار بار اوروں سے پچالیں شاہ سکندر راہ پچی مجھے بخش کر ہمارے لیے اجنبی ہو جائیں۔ شاید اس طرح میرا  
ورنہ آپ کی بار بار آمد مجھے۔“ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

”مہم میں پچی لینے تو نہیں آیا۔ میں تو صرف۔“  
شاہ سکندر کے اندر دیکھنے والا پر جیسے قطرہ قطرہ شبنم ٹپکنے لگی تھی کہ اس روز سر راہ اس کے غور کو پیرول نہ  
جانے والی اس وقت ہاتھ جوڑے اپنی کمائی لگی، کم ہتی کا اعتراف کر رہی تھی۔

”میں تمہارا مان نہیں توڑوں گا آسیہ! وہ رفاقتیں جو خواب ہو گئیں ان کی ایک زندہ حقیقت یہ پچی تمہارا  
بہشت والی برکت چال سے اس کے قریب آیا اور پچی اس کے بازوؤں میں تھما کر کہنے لگا۔ ”اس کے لیے تم  
چاہو لے سکتی ہو۔ اسی وقت۔“

”بس ایک وعدہ۔“ وہ ہینگی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

”میں تمہارے کئے بنا وعدہ کرتا ہوں کہ آج کے بعد اگر تمہارے راستے میں رکنے اور تمہیں پکارنے کا سہرا  
کو تمہارے سامنے ٹوٹ کر نہ لگاؤں گا۔ ہاں اگر تمہیں کبھی اس پچی کے لیے میری ضرورت پڑے تو پکار لینا۔“  
لیے پلانا پھر ایک خیال کے تحت اچانک رک کر کہنے لگا۔ ”یہ وعدہ تو تمہارے لیے ہے اور پچی۔“

”پچی کی بہتری اسی میں ہے والدین کے درمیان کش مکش بچوں کو توڑ کر رکھ دیتی ہے اور میں نہیں چاہتا  
ہوں۔“ اس نے فوراً ”نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا پھر قدرے توقف سے کہنے لگی۔ ”آپ یقیناً ”میری بات“  
کے میں اسے مکمل دیکھنا چاہتی ہوں۔“

شاہ سکندر نے اثبات میں سر ملاتے ہوئے گہری نظروں سے اسے دیکھا پھر خدا حافظ کہہ کر ہار نکل گیا تو اپنی  
پر جہاں اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی وہاں اندر دھڑھڑاٹھیں اٹھ اٹھ رہی تھیں۔  
”میری بچی، میری گزیا!“ اس نے صباحت کو اپنے سینے میں پیچھنچ لیا تھا۔

\* ☆ \* ☆ \*

”بس میمونہ بھابھی! اب مجھے کوئی فکر نہیں۔ شاہ سکندر اب کبھی میرے راستے میں آئے گا نہ بچوں کے با  
کرنے کی کوشش کرے گا۔“ رات میں وہ میمونہ بھابھی کو اپنا کارنامہ بتا کر کہنے لگی۔ ”میں سمجھ گئی تھی کہ وہ  
تو جین کا بدلہ لینے کے لیے مجھے اپنے سامنے جھکا نا چاہتا ہے اور میں نے پہلے ہی مقام پر اس کے سامنے ہاتھ  
کو تسکین پہنچا دی۔“

”ہاتھ جوڑنے کی کیا ضرورت تھی؟“ ”میمونہ بھابھی کو بہت برا لگا۔  
”ضرورت تھی بھابھی! اور نہ وہ ساری زندگی ہمارے درمیان موجود رہتا۔ گو کہ وہ کبھی کر کے بھی ہار جاتا تھا  
ملنے رہنے کا حق حاصل کر سکتا تھا اور اور ظاہر ہے ہمیں کورٹ کا فیصلہ ماننا پڑتا پھر میرے لیے یہ مسلسل نیند  
ہفتے وہ بچوں سے ملنے آ رہا ہے اس لیے میں نے بہت سوچ کر اس کے سامنے خود کو بہت مجبور اور بے بس لگا  
چاہتا تھا جب ہی رہے آرام سے وعدہ کر گیا ہے کہ آئندہ کبھی میرے راستے میں نہیں آئے گا۔“

اس نے کہا تو میمونہ بھابھی نے یوں سر ہٹا کر جیسے انہیں شاہ سکندر کے ذکر سے کوئی لچھنی نہ ہو، پھر مضمون  
”اچھا سنو وہ عدیل کی شادی کا کیا پروگرام ہے؟ امان جی تاملہ کے لیے تو نہیں مان رہیں۔“  
”میں بھی نہیں مان رہی۔ میرا مطلب ہے میں بھی نہیں چاہتی کہ عدیل بھائی کی شادی وہاں ہو۔ ہم کو  
لیتے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”لو کیوں کی کمی نہیں ہے لیکن۔“  
”لیکن ویکن کچھ نہیں بھابھی! ہم بس کوئی اور لڑکی دیکھیں گے۔ یہ میں اس لیے نہیں کہہ رہی کہ مجھے

اپنے سے کوئی بغض ہے بلکہ صرف اس لیے کہ شاہ سکندر کا وہاں بہت آنا جانا ہے وہ ناکمل کی شادی میں بھی ضرور آئے  
رو سکتا ہے۔ اس کے بعد بھی میل جول رکھتی جو کہ عدیل بھائی بھی پسند نہیں کریں گے اور خواہ مخواہ کی بد مزگی ہوگی  
نہیں۔“

”خلاف توقع میمونہ بھابھی نے فوراً اتفاق کر دیا پھر پوچھنے لگیں۔ ”اور کوئی لڑکی؟“  
یہ تو ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ ”خلاف توقع میمونہ بھابھی نے فوراً اتفاق کر دیا پھر پوچھنے لگیں۔ ”اور کوئی لڑکی؟“  
نہیں میں تو کوئی سے نہیں اور آس بڑوس کا مجھے نہیں پتا۔ ایک تو میرے بھائی سارے بس ایسے ہی ہیں ساری  
کہاں بہن کی نظر سے دیکھتے ہیں۔“ اس کی بات پر میمونہ بھابھی اچھل پڑیں۔

”کہاں بہن کی خوش فہمی۔ اتنے شریف نہیں ہیں تمہارے بھائی سب کا پتا ہے مجھے۔“  
”اندر سے بہن کی خوش فہمی۔ اتنے شریف نہیں ہیں تمہارے بھائی سب کا پتا ہے مجھے۔“  
”اچھا! وہ میمونہ بھابھی کے اچھلنے پر بے ساختہ ہنسی بھی۔ ”کیا پتا ہے؟“  
”جی کہ بس میں سے ایک کوماں کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایک کو بہن کی اور باقی اٹھ کو۔“

”دیکھتی ہی نہیں۔“ اس نے فوراً ”ان کی بات ایک لی۔“  
”دیکھتی ہی نہیں۔“ میمونہ بھابھی نقل اتار کر بولیں۔ ”بھگتے ہو جاتے ہیں۔“  
”جی ہاں! وہ میمونہ بھابھی کے لیے کپڑے نکالنے لگی۔ پھر ایک سوٹ ہاتھ میں لے کر پلٹی تو اپنے آپ سے کہنے

”کپڑوں کی بہت پراہم ہو گئی ہے۔ سارے تو وہیں چھوڑ آئی تھی۔“  
”ہاں میں بھی بیک دیکھ رہی ہوں کہ کچھ مخصوص جوڑے ہیں تمہارے پاس وہی بہن کر باقی ہو اور بنانے سے بہتر ہے  
اپنا سوٹ کیس لے آؤ بلکہ اور چیزیں بھی۔“ میمونہ بھابھی نے اس کی بات سن کر کہا تو وہ بے دھیانی میں انہیں دیکھنے

”غلط تو نہیں کہہ رہی ہیں، تم اپنا ضروری سامان لے آؤ۔ چالی تو دو گئی تمہارے پاس۔“  
”ہی، لیکن میں وہاں جانا نہیں چاہتی۔“ اس نے چونک کر کہا۔  
”میں ہاں ٹھنٹ تمہاری ملکیت ہے اور وہاں کی ہر چیز بھی۔“ میمونہ بھابھی نے اس کی بات ٹھیک بھی۔ جب ہی اس نے اختلاف نہیں کیا۔

”وہ ہر مہینے کچھ پیسے ہی مل جایا کریں گے۔“ میمونہ بھابھی کی بات ٹھیک بھی۔ جب ہی اس نے اختلاف نہیں کیا۔  
”خوش ہو رہی تھی۔“  
”اب تم پرلے استری کرو گی؟“ میمونہ بھابھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”جی آپ کو کوئی کام ہے؟“ اس نے رک کر پوچھا۔  
”نہیں میں اب سوئے جا رہی ہوں۔ صبح عمو کا ڈیوٹیشن کروانے جانا ہے۔“  
”ماشاء اللہ! تین سال کا ہو گیا۔“ اس کا انداز ایسا تھا جیسے ابھی کل ہی کی بات لگتی ہے۔ عدیل بھائی نے نئے بھتیجے کی  
نچری سنا لی تھی۔

”ہاں ہونے والا ہے۔“  
”میمونہ بھابھی کہتی ہوئی اس کے کمرے سے نکل گئیں تو اس نے ہاتھ میں پکڑے کپڑوں کو دیکھا پھر کرسی پر ڈال کر لائٹ  
نہ کرتے ہوئے لیٹ گئی۔ شاید عمر کی پیدائش کے ساتھ ہی اسے وہ حادثہ یاد آیا تھا جس نے اس کی زندگی کو خوب صورت  
نہڑا تھا۔ اس وقت وہ خوب صورت موڑی لگتا تھا۔ سیدھی سیٹ زندگی میں رنگوں کی برسات اتر آئی تھی۔ کتنا اچھا  
مقام تھا۔ وہ کتنی دیر اپنے دل کی ہستی کو ٹوٹتی رہی جس میں ہر روز اس کے نام کے پھول کھلا کر اس نے یقین سے کہا تھا کہ  
”بہن کو امان ہے! سچی وہی کر سکتا ہے جسے اس سے اس کی زندگی سے پیار نہ ہو۔“

”تو شاہ سکندر حیات! تمہیں کبھی مجھ سے پیار تھا ہی نہیں۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو جمع ہو کر کناروں سے راست  
نہ تھکے میں جذب ہو رہے تھے۔ بہت مضطرب ہو گئی تھی وہ رات کے جانے کس پیرنڈہ مہمان ہوئی تھی۔  
رات کا اضطراب باقی تھا جو وہ اپنی ڈیوٹی سے انصاف نہیں کر پا رہی تھی۔ کافی ست سی تھی۔ ڈاکڑ وہاں راؤنڈ پر آئے تو  
نہیں نہ ایک بار اسے ٹوکا تھا اور ڈاکڑ یا سمین اب کوئی چو بھی بار ٹوک رہی تھی۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو گھر پر آرام کرتیں۔ کیوں چلی آئیں؟“

”میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ بس رات میں بچپوں کی وجہ سے نیند پوری نہیں ہوئی اس لیے کچھ ہوں۔“ اس نے اندر ہی اندر خود کو سرزنش کرتے ہوئے کہا۔

”چائے منگو آؤں یا ایسا کرو اپنے نتیجے کے کمرے میں جا کر ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لیے سو جاؤ۔“ یاسمین اس نے سہولت سے رد کر دیا۔

”نہیں۔ میرا خیال ہے چائے پینے سے میں فریش ہو سکتی ہوں۔“

یاسمین نے دروازے تک جا کر ماسی سے چائے کا کما پھرواپس اپنی جگہ آکر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”کتنے بچے ہیں تمہارے۔؟“

”دو بیٹیاں ہیں۔“

”جہاں تم رہتی ہو وہ غالباً تمہارا میکہ ہے اور تمہارے میاں کہاں ہوتے ہیں۔؟“

یاسمین کے انداز میں کوئی تجسس نہیں تھا۔ بلکہ وہی عام سی باتیں عام سا انداز۔

”مجھے طلاق ہو چکی ہے اس لیے اب میں اس شخص کے بارے میں کچھ نہیں جانتی کہ وہ کہاں ہوتا ہے کے بارے میں کوئی اور بات کرنا چاہتی ہوں پلیز۔“

اس نے سچ بول کر یاسمین کو مزید سوال جواب سے روک دیا تو وہ جو طلاق کا سن کر حیران ہو رہی تھی قدر لگی۔

”افسوس کا اظہار تو کرنے دو یا وہ بھی نہیں۔“

”نہیں۔“ اس نے کمری کی پشت پر سر رکھ کر پلکیں موند لیں تو کتنے لمحے چپ چاپ سرک گئے پھر باہی چا تب اس نے آنکھیں کھولی تھیں اور فوراً ”چائے کا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔“

”مجھے تم بہت ڈسٹرب لگ رہی ہو۔“ یاسمین سے رہا نہیں گیا۔ ”کیا اسی سلسلے میں کوئی بات ہوئی ہے شخص کی طرف سے۔؟“ اس نے نفی میں سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

”پھر کیا بات ہے۔؟“

”کوئی بات نہیں ہے یا راسب ٹھیک ہے۔“ وہ خالی کپ ٹرے میں رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”میں نیل۔“

ہوں ڈاکٹر وہاب پوچھیں تو بتا دیتا۔“

”اور ڈاکٹر احسان پوچھیں تو کیا کہوں۔“ یاسمین کے معنی خیز انداز پر وہ جاتے جاتے پلٹ آئی۔

”کیا مطلب۔؟“

”مطلب یہ کہ انہیں تمہاری بہت فکر رہتی ہے۔ ہر آدھے گھنٹے بعد آکر پوچھتے ہیں کہ تم کہاں ہو کیا کر وغیرہ۔“ یاسمین کا انداز ہنوز تھا جس سے اس کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں ابھر آئیں اور کچھ دیر سوچنے کے ”اگر تم سچ کہہ رہی ہو تو اب ان کے پوچھنے پر تیار رہنا کہ میں اپنے بچے کے پاس ہوں۔“

”یعنی!؟“ سوالیہ انداز میں یاسمین کی ابروؤں نے جنبش کی تھی۔

”نیل میرا بیٹا ہے۔“ وہ کہہ کر کمرے سے نکل آئی تھی۔

نیل کو سسرال میں رکھ کر آ رہی تھی۔ وہ ایک طرف کھڑی ہو کر توجہ سے دیکھنے لگی۔ وہ اب پہلے کی طرح نہیں رہا تھا۔ اس کی صحت اچھی ہو رہی تھی اور سسرال کے کھڑے بھی ہو جاتا تھا لیکن چل نہیں سکتا تھا۔ شاید گرنے کا خوف تھا۔ جو قدم اٹھانے سے ڈرتا تھا ابھی بھی وہ یہی دیکھ رہی تھی کہ سسرال میں اس کا پیرا اٹھا کر کانپنے لگتا۔

”بیٹا! بہت سے کام لو۔ آپ تو بہت بہادر ہو۔ آؤ میرے پاس آؤ۔“ وہ اس کے سامنے چند قدم کے فاصلے پر

ہوئی۔

”نہیں بھوپو! میں نہیں چل سکتا۔“ نیل نے بہت بے بسی سے کہا تو اس نے بروہہ کرا سے کندھوں سے

”بہت ساتھ چلو“ میں آپ کو گرنے نہیں دوں گی۔“

”نیل! اپنے دونوں بازو اس کی کمر میں ڈال کر اس سے چپک گیا۔“ میری ٹانگوں میں درد ہو رہا ہے مجھے بید پر لٹا۔“

”چند ہی کریں پھوپھو! میں گر رہا ہوں۔“

”ارے بیٹا! اوکے۔“ اس نے سسرال کی دد سے اسے بید پر لٹایا پھر سسرال کو جانے کا کہہ کر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

”میں تو آپ اماں جی کے پاس نہیں جا سکتا۔“

”پتا ہے وہ آپ کو کتنا یاد کرتی ہیں۔“

”میں جی میرے پاس کیوں نہیں آئیں؟“ نیل نے پوچھا۔

”میں جی۔“ اس نے مختصر جواب دے کر موضوع بدل دیا اور پھر ادھر ادھر کی باتوں میں اس کا اور شاید اپنا بھی دھیان لگاتی تھی۔

\* \* \* \* \*

بہی کے دن اس نے صبح ہی میمونہ بھابی سے کہا تھا کہ آج وہ اس کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ چلیں۔ وہ اپنا سوٹ پہنا چاہتی ہے اور انہوں نے منع تو نہیں کیا تھا لیکن گھر کے کاموں سے نکل ہی نہیں پاری تھیں۔ موگھر ہوں تو می بیٹھتے جاتے ہیں۔ دپہر کے کھانے کے بعد بھی خلیل بھائی ان کے سر پر سوار تھے۔ تب اباجی سے اجازت لے کر وہ بھابی سے ان کی گاڑی لے کر نکلی۔ احمد اور سونیا کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔

انہیں کتنے دنوں بلکہ مہینوں بعد وہ اس گھر میں داخل ہوئی تھی جسے کبھی وہ اس زمین پر اپنی جھوٹی سی جنت کہا کرتی تھی۔ اپنی جگہ اسی طرح موجود تھی جیسے وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ وہ ایک ایک قدم پر رک کر دیکھتی رہی یوں لگ رہا تھا جیسے خواب لڑ رہی ہو جبکہ اس کے اندر سناٹوں کا راج تھا۔

پوچھو! یہ دروازہ کھول دیں۔“ احمد کے پکارنے پر اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا پھر بیڈ روم میں آئی تو وہ نیرس پر کوہ چین کھڑا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازے کے کنڈی کرانے کے ساتھ تنیدہم کی۔

خواب گھر کے اوپر چڑھ کر بیٹھے نہیں جھانکنا اور شور بھی نہیں کرتا۔“

سونیا کو منع کریں۔ یہ بہت شور کرتی ہے۔“

میں دونوں سے کہہ رہی ہوں اور اگر تم دونوں آرام سے بیٹھو گے تو میں واپسی میں تمہیں بہت اچھی آکس کریم لگاؤں۔“ اس نے آکس کریم کا لالچ دے کر دونوں کو خوش کر دیا۔ پھر اندر آکر پہلے اپنا سوٹ کیس اتارا اور اس میں مارت بھر لیکے کپڑے نکال کر الماری میں ڈالے اور وہاں سے سادے سوٹ نکال نکال کر سوٹ کیس میں رکھنے لگی۔

میں اسے غصہ بھ لگ گیا اور اتنی دیر میں احمد اور سونیا میس سے اکتا کر کہیں میں اپنے مطلب کی چیزیں تلاش میں لگ گئے تھے اور اس نے انہیں ادھر ادھر بھاگتے ہوئے دیکھا ضرور لیکن ٹوکا نہیں نہ ہی کسی چیز کو پھینڈنے سے باز نہ آیا۔ ساری باتیں دہاں ہوتی ہیں جہاں کسی کے سامنے جواب دی کا خدشہ ہو اور وہ ایک تو ان خدشات سے بوجھ کر ہی دوسرے برہنہ اس کی نظروں میں اپنی پہلے والی اہمیت کھو چکی تھی پھر وہ کیوں منع کرتی۔ پورے دھیان سے کام میں مصروف رہی۔ کپڑوں کے بعد سینڈلز بھی نکال کر رکھیں پھر اور دوسری چیزیں سوچ رہی تھی کہ سونیا آکر

پوچھو! آپ مدیہ اور صاحت کو لے کر یہاں آجائیں گی۔؟“

نیل بیٹا! یہاں کیوں آؤں گی۔“ اس نے بے دھیانی میں جواب دیا۔

”بھابی تو آتی تھیں انکل کے ساتھ۔ وہ انکل کہاں چلے گئے؟“ سونیا کے اگلے سوال نے اسے چکر دیا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ اس کی کوہ طبعیت کرنے کے لیے کیا ہے۔

”میں پوچھو! انکل کہاں چلے گئے؟ میں نے بہت دنوں سے انہیں نہیں دیکھا۔“ سونیا نے دوبارہ اصرار سے پوچھا تو وہ

”بھابی! میں نے نیل کے پیارے آپ کے تالیاں ابو۔“

”میں نے انہیں صاف کر دیے تھے۔ انکل بھی بیٹھیں گے۔“

”میں انہیں میں دلاؤں گی۔ اب جلدی سے جا کر دیکھو احمد کیا کر رہا ہے۔“

اس نے اگلے سوال سے بچنے کی خاطر فوراً "اس کی توجہ احمد کی طرف مبذول کرائی پھر گرمی سانس کھینچ کر  
 "اس چالا کو اس کو ساری باتیں یاد دہاتی ہیں۔"  
 "پھوپھو! احمد بھائی ٹیپ کے مبن خراب کر رہے ہیں۔" سونیانے لاؤنج سے چلا کر اسے اطلاع دی تو احمد  
 آواز میں بولا۔  
 "خراب نہیں کر رہا پھوپھو! کیسٹ لگا رہا ہوں۔"  
 "افوہ!" وہ قدر سے جھنجھلا کر کمرے سے نکلنے لگی تھی کہ کیسٹ سے ابھرتی آواز نے دروازے میں ہی اس  
 دیے۔

جب کوئی پیار شخص سے بلائے گا  
 تم کو ایک شخص یاد بھی آئے گا  
 وہ بس ایک بل کو رکھتی تھی۔ دوسرے بل تیزی سے ٹیپ ریکارڈ کا پلگ ہی کھینچ لیا اور غصے سے بولی۔  
 "سخت غلطی کی ہے میں نے تم دونوں کو لا کر۔ چلو واپس۔"  
 "پھوپھو! میں نے تو کچھ نہیں کیا۔" سونیا بسور کر بولی۔  
 "بس اب رونے کی ضرورت نہیں ہے۔ چلو اپنے اپنے شوز پہنو۔ میں جاری ہوں۔"  
 اس کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ کمرے میں جا کر پہلے میسر کی طرف کھٹنے والا دروازہ بند کیا پھر سوٹ کیس  
 دونوں کو خاموشی سے شوز پہنتے دیکھ کر اسے ان پر پیار آگیا پھر بھی قدرے رعب سے بولی۔  
 "چلو ابھی تم دونوں کو آؤں کریم بھی کھلائی ہے اور میں سوچ رہی تھی تم دونوں کو ٹیبل کے پاس بھی لے  
 اب صرف آؤں کریم۔"  
 "آؤں کریم! ہم نہیں پھوپھو! ہم ٹیبل بھائی کے پاس جاؤں گے۔" سونیانے آؤں کریم پر ٹیبل کو ترجیح دے  
 کر دیا تھا۔ وہ آگے آکر اس کا گال تھپکتی ہوئی بولی۔  
 "اب دیر ہو گئی ہے۔ ٹیبل کے پاس اگلے اتوار کو لے چلوں گی۔ ٹھیک۔"  
 "ٹھیک ہے۔" دونوں خوش ہو گئے۔  
 "چلو یہ سوٹ کیس باہر نکالو۔ میں کمرے بند کر لوں۔" اس نے سوٹ کیس ان دونوں کے حوالے کر دیا  
 دروازے لاک کر کے چلی تو جانے کیا خیال آیا۔ ٹیپ ریکارڈ میں سے کیسٹ نکال کر برس میں رکھ لی تھی۔  
 "ہاں بھئی کون سی آؤں کریم کھاؤ گے؟" راتے میں اس نے ایک کولڈ کارنر دیکھ کر گاڑی روکے ہوئے  
 ہی کھنے لگی۔ جاؤ اپنی اپنی پسند سے لے آؤ۔"  
 احمد اور سونیا فوراً "اتر کر دوکان میں داخل ہو گئے تو اس نے شیشہ گرا کر دوکاندار کو انہیں آؤں کریم دینے  
 پرس کھول کر پیسے نکال رہی تھی کہ قریب گاڑی رکنے کے ساتھ اسے مخاطب کیا گیا۔  
 "ایکسکیوز می۔"  
 اس نے سراو نکا کر کے آواز کی سمت گردن موڑی اور احمد حسن کو دیکھ کر بغیر کسی تاثر کے بولی۔  
 "السلام علیکم۔"  
 "وعلیکم سلام۔" وہ ایسا ہے کہ میں آپ کو دیکھ کر نظر انداز نہیں کر سکا۔ کیسی ہیں آپ؟" احمد حسن نے  
 کے خیال سے تسکین دہانی کے لیے وہ بیکسر نظر انداز کر گئی۔  
 "میں ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں بلکہ یہ پوچھنا چاہیے کہ ابھی تک اکیلے کیوں نظر آ رہے ہیں؟"  
 "اکیلی تو آپ۔" وہ کہنے جا رہا تھا کہ اکیلی تو آپ ہو گئی ہیں لیکن فوراً "احساس ہونے پر خاموش ہو گیا اور  
 بولی۔  
 "میں اکیلی نہیں ہوں۔"  
 "اتنی ایم سوری۔ میرا مقصد کچھ جتنا نہیں تھا بلکہ میں سمجھ نہیں پا رہا کہ آپ سے افسوس کا اظہار کر  
 احمد حسن نے معذرت کے ساتھ کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے قصداً سرسری انداز اختیار کیا اور دونوں بچوں کو دیکھنے لگی۔  
 "پھر بھی کچھ اچھا نہیں ہوا۔ میں اور میری والدہ بھی آپ سے بہت شرمندہ ہیں۔ یقین کریں شاہ سکندر نے ہمیں بتایا  
 نی نہیں تھا کہ۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا اور قدرے رکھائی سے بولی۔  
 "میں کسی کو الزام نہیں دیتی۔"  
 "آپ کی برائی ہے ورنہ۔" احمد حسن پتا نہیں کیا کہ رہا تھا۔ وہ احمد اور سونیا کی طرف متوجہ ہو گئی تھی اور ان کے  
 بچنے کے بعد ہاتھ بدھا کر دروازہ لاک کیا پھر ایک نظر اسے دیکھ کر بولی۔  
 "وہ خدا حافظ۔" اس کے ساتھ ہی گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔

\* ☆ \* ☆ \*

شاہ سکندر کو اپنے بیٹے آغا کے ایڈمیشن کے سلسلے میں مری جانا تھا۔ جہاں اس کے دوسرے بھتیجے بھتیجیاں پڑھتے تھے  
 یکن مرثساء اسے جانے نہیں دے رہی تھی۔ کیونکہ ان ہی دنوں اس کی ڈیوری متوقع تھی۔ اور وہ چاہتی تھی شاہ اس  
 کے ساتھ رہے۔ جس پر وہ بے حد جھنجھلا رہا تھا۔  
 "ادھر ایڈمیشن کی ڈیٹ نکل گئی تو پھر ایک سال ضائع ہو جائے گا۔ تم سمجھتی کیوں نہیں۔ یہاں تم اکیلی تو نہیں ہو۔  
 بابا جان ابھی جان ہیں آخر پہلے بھی تو یہی خواتین تمہارے ساتھ تھیں۔"  
 "سلسلے کی بات نہیں کریں۔ اس وقت آپ میرے نہیں تھے پھر بھی مجھے آپ کا بہت انتظار رہا تھا" اتنا کہ میں بچنے کی  
 فکری تھی نہیں مناسکتی تھی۔ "وہ منہ پھلائے کمرہ رہی تھی۔"  
 "پھر ہاں میں کیا کروں۔ مجھے آغا کو اسی سال اسکول داخل کرنا ہے ورنہ وہ اپنی عمر کے بچوں سے پیچھے رہ جائے گا اور یہ میں  
 نہیں چاہتا۔ تم بھی سن لو پڑھائی کے معاملے میں میں کسی قسم کی رعایت نہیں دوں گا۔ تم اگر ٹھیک ہو تیں تو تمہیں بھی  
 ہاتھ لے چلا اب مجبوری ہے۔ میں بس دو دن میں واپس آ جاؤں گا۔" اس نے قدرے نرم پڑ کر کماتا تو مرثساء نے کچھ بے  
 فکری سے پوچھا۔  
 "جی ہاں ہے؟"  
 "ہاں مجھے اور کوئی کام نہیں ہے وہاں بس آغا کا ایڈمیشن کروا کے واپس آ جاؤں گا۔" اس نے یقین دلایا پھر اسے دیکھ کر  
 کہنے لگا۔ "تم بھی اس کی پیکنگ کر دو تو میں صبح ہی نکل جاؤں گا پھر برسوں شام میں میری واپسی بھی ہو جائے گی۔"  
 "رسوں شام ٹھیک ہے۔" وہ پیکنگ کے خیال سے کھڑی ہوئی پھر ایک دم رک کر بولی۔ "شاہ! میں آغا کے بغیر کیسے  
 رہوں گی؟"  
 "مجھے یوں بھائی اور جانیگر بھائی کی بیگمات رہتی ہیں۔ بچوں کی بہتری کے لیے یہ عارضی دوری سہی پڑتی ہے مرثساء  
 اور ابھی تو یہ بیس مری جا رہا ہے جبکہ مجھے اسے باہر بھی بھیجنا ہے جہاں سے اعلیٰ تعلیم کے بعد جب یہ لوٹے گا تو نظر لگ  
 جانے کے خیال سے تم اسے دیکھنے سے گریز کرو گی۔"  
 "میں اس آغا کو سن ہی دل رین فرام امریکہ ہی دل ذیل ایجوکیشنڈ ذیل مینڈو اینڈ ذیل پرسنالٹی لائیک می۔" اس نے  
 مرثساء کو روشن گل کی جھلک دکھا کر خوش کروایا تھا۔  
 "اسے لکنا ڈالو ادھر آؤ۔" اس نے آغا کو متوجہ کر کے اپنے پاس بلایا تو وہ لا پرواہی سے بولا۔  
 "میں کھیل رہا ہوں۔"  
 "سارے کھیل بند۔ اب صرف پڑھائی ہو گی۔" اس نے خود ہی اٹھ کر اسے گود میں اٹھالیا جس پر وہ احتجاج میں ہاتھ  
 پٹک پٹکانے لگا۔

◆◆◆◆◆ ♥ ◆◆◆◆◆

"بوتھ نہیں۔" اس نے ٹوکا تھا کہ مرثساء فوراً "بول پڑی۔  
 "نہیں۔ اسے کیا پتا بد تمیزی کیا ہوتی ہے۔"  
 "بوتھ کہتے کہتے رہ گیا اس خیال سے کہ بچے کو کون سا یہاں رہنا ہے۔ کل تو چلے جانا ہے پھر مرثساء سے الجھنے کا فائدہ۔

جو بالکل جاہل عورت تو نہیں تھی لیکن ضد میں اس کی ہر بات کا الٹ ضرور کرتی تھی۔ اور وہ کافی حد تک اس لیے شخص اپنا موڈ خراب ہونے کے خیال سے خاموشی اختیار کر لیتا تھا۔

پھر صبح ناشتا کرتے ہی وہ آٹا کو لے کر کراچی کے لیے روانہ ہو گیا۔ جہاں سے دس بجے اسے اسلام آباد کی تھی۔ اس سے پہلے وہ جمنا تیکر بھائی کی چھوٹی بیٹی کے ایڈمیشن کے سلسلے میں ان کے ساتھ گیا تھا۔ تو تمام راستے رہا تھا کہ اتنی سی بچی کو آپ ہاسٹل میں چھوڑ دیں گے۔ اور اب اپنے بچے کو چھوڑتے ہوئے بھی اس کی بیٹی مرانساء سے تو کہہ دیتا تھا کہ بچوں کی سہری کے لیے ان کی عارضی دوری سہری پڑتی ہے۔ لیکن خود کو یہ بات اسے کچھ وقت لگا تھا کہ وہ بوس بھائی اور جمنا تیکر بھائی کے بچے بھی وہیں تھے اور بڑے والے تو انھیں غاصے سمیتے پھر بھی واپسی کا تمام راستہ وہ بہت سے کل رہا تھا۔ جیسے چھوٹے سے بچے کو کہیں تنہا چھوڑ آیا ہو۔ یہ اس کی تھی جو اسے بے چین کرتی رہی تھی۔ اور اتفاق سے کوئی ساتھ بھی نہیں تھا جس کے ساتھ باتوں میں رہا ہوں بہر حال جب کراچی ایرپورٹ سے باہر نکلا تو ڈرائیور کو اپنا منتظر دیکھ کر کافی متعجب ہوا کیونکہ مرانساء سے اس دن واپسی کا طے ضرور کیا تھا لیکن خود اسے بھی یقین نہیں تھا کہ وہ طے شدہ پروگرام کے مطابق آسکے گا۔ اس نے اسے ڈرائیور کو بھی تاکید نہیں کی تھی کہ وہ اسے لینے پہنچ جائے۔ جب ہی یہ ان تھا اور بظاہر سرسرا پوچھنے لگا۔

”کس نے بھیجا ہے تمہیں؟“

”بڑی بیگم صیب نے۔ وہ ادھر اسپتال میں ہیں۔“ ڈرائیور نے بتایا تو وہ متوحش ہو گیا۔

”خیریت تو ہے ناں؟“

”جی صیب۔“ ڈرائیور نے اس کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے اس پر اس قدر کما تو اس نے بیٹھے ہے

”اور کون سے ان کے ساتھ؟“

”جی آپ کی بیگم صیب۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔ چلو ادھر ہی چلو۔“ وہ سارا معاملہ سمجھ کر اطمینان سے ہو گیا اور بیٹھے ہی اخبار اٹھا کر دیکھنے لگا اس وقت جب ڈرائیور نے ہاسپنل کے سامنے گاڑی روک کر اسے مطلع کیا تو اخبار رکھنے دیکھنے لگا جبکہ ذہنی رو ہٹک گئی تھی۔

”سکندر راہوہ مرانساء تھی میں نے اسے دیکھا تھا۔ شاید ڈیوری کے لیے آئی تھی اس کی گود میں بچہ بھی تھا۔“ شٹ اپ آئیہ۔ اس وقت اس نے چلا کر اسے خاموش کر دیا تھا اور اب اس کا سامنا ہونے کا خیال اسے گیا، حالانکہ اس کی بیوی اور بچے کے بارے میں وہ جان چکی تھی پھر بھی یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی ابھی اس نے ہوگا، کتنی دیر بعد وہ گاڑی سے اتر کر اندر آیا اور بہت محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد کاؤنٹر پر کھڑا مرانساء کا پوچھا تو وہ ہنس دیکھ کر بتانے لگی۔

”مرانساء۔ ابھی دو گھنٹے پہلے ایڈمٹ ہوئی ہیں۔ ان کا پہلا کس بھی نارمل نہیں تھا اور ابھی بچہ آپریشن آپریشن کے بارے میں آپ ڈاکٹر فرزانہ حسین سے معلوم کریں۔“

”ڈاکٹر فرزانہ حسین؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس کے عقب میں اشارہ کر کے بولی۔

”ادھر رائٹ ہینڈ روم نمبر فور میں ملیں گی۔“

”تھینک یو۔“ وہ جاتے جاتے پلٹا تھا۔ ”اور مرانساء کہاں ہیں اس وقت؟“

”روم نمبر ایون۔“

”تھینکس اگین۔“ وہ بے آواز مگر تیز قدموں سے پہلے روم نمبر ایون میں آیا تو وہاں صرف بی بی جان اسے دیکھتی ہی کھٹکی لگیں۔

”اچھا ہوا تم آگئے ڈاکٹروں کی زبان میری سمجھ میں نہیں آتی۔ بتائیں کیا کیا بولتی ہیں۔“

”آپ کو یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیس گھر پر بھی ہو سکتا تھا۔“ وہ خفا ہونے لگا۔

”منع کر دیا تھا ڈاکٹر نے کل اتنی تھی مرانساء کو دیکھنے۔ کہہ رہی تھی گھر پر نہیں ہو سکتا۔ آپریشن ہو گا۔“

”خیر، وہاں میں یہاں لے کر آئی تھی۔ آٹا نہیں ہوا ہے، اچھا اسپتال ہے میں نے سوچا۔“

”وہ ان کی تفصیل سے آٹا کر بول پڑا۔“

”ابھی نرس لے کر گئی ہے۔ بتائیں کیا کرنا ہے بی بی جان سوچنے میں لگ گئیں۔“

”جو ٹھیک ہے۔ میں ڈاکٹر سے معلوم کرتا ہوں۔“

”جی ہاں سے نکل کر ڈاکٹر فرزانہ حسین کے کمرے کا رخ کیا پھر ان سے مرانساء کی کنڈیشن اور آپریشن کا وقت معلوم کرنے کے لیے وہ کہیں ”دوبارہ بی بی جان“ کے پاس آ بیٹھا کیونکہ ڈاکٹر نے پندرہ منٹ بعد آپریشن بتایا تھا اور اتنی دیر کے لیے وہ کہیں بیٹھ سکتا تھا۔ عجیب شکل تھی۔ اسے لگا جیسے ہر موڑ پر اس کے لیے امتحان رقم کیا گیا ہے۔ وہ آئیہ سے وعدہ کر کے کہ اس کے راتے میں نہیں آئے گا۔ اور تقدیر کی ستم ظریفی کہ پھر وہیں لے آئی تھی۔ اس میں اس کا کوئی قصور نہ تھا۔ پھر بھی اسے ندامت محسوس ہونے لگی تھی۔

”بی بی جان اس کی خاموشی سے یہی سمجھیں کہ وہ مرانساء کے آپریشن کا سن کر پریشان ہے جب ہی اس کا دھیان بنانے کو ملے گی۔“

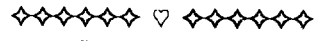
”اچھا کو چھوڑ آئے؟ تو نہیں رہا تھا؟“

”جی، جی نہیں۔“ اس نے جو تک کر دونوں باتوں کا جواب دیا۔

”تو بھول کی منطق میری سمجھ میں نہیں آتی۔ یہاں اسکول نہیں ہیں جو بچوں کو اتنی دور بھیج دیتے ہو۔ لڑکے تو لڑکے۔ بلی کبھی۔ یونس اور جمنا تیکر کی بیٹیاں ماشاء اللہ سمجھدار ہو رہی ہیں۔ اتنی عمر میں میں نے شہر مانو پوچھنے میں بٹھا دیا تھا۔“

”جی اتنی بڑھانے آئی تھی۔“

”اب وہ وقت نہیں ہے بی بی جان! لڑکا ہوا لڑکی تعلیم دونوں کے لیے ضروری ہے۔“ وہ کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا کیونکہ اس کا دیکھنے سے بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا اور بی بی جان کو نوک بھی نہیں سکتا تھا۔ اس لیے مرانساء کا پتا کرنے کے بہانے سے نکل کر راپارڈی میں شلنے لگا تھا۔



”بل کو اپنے ساتھ کھڑا کر کے کھڑکی سے باہر کچھ چمچ پھل دکھا رہی تھی۔ تاکہ اس کے اندر کچھ شوق پیدا ہو کہ وہ بھی بس گولوں کی طرح باہر آجائے اور وہیں سے اس نے شاہ سکندر کو ہاسپنل کے گیٹ سے داخل ہوتے دیکھا تھا جس کا اس کا سارا اطمینان بل میں رخصت ہو گیا۔“

”کتنی اچھی ہوں میں جو اس کے وعدے کا اعتبار کر لیا کہ اب کبھی مجھے تنگ کرنے نہیں آئے گا۔“ وہ نیل کو بید پر بٹھا بیٹھ ادھر سے ادھر منسلک لگی تھی۔

”وہ پھر آیا اس پر میرے ہاتھ جوڑنے، میری عاجزی کا کچھ اثر نہیں ہوا۔“ اس نے کہا کہ اس نے کہاں جاؤں۔“ اس پر بے وفائی ہونے لگی اور انجانے خدشات میں گھر کو کچھ خوفزدہ بھی ہو گئی۔ یوں لگا جیسے ابھی وہ سارے میں اسے پکار رہا ہوا۔ گاؤں پر چڑھ کر کا مطالبہ کرے گا، سب کے سامنے تماشا بننے کا خیال ہی روح فرساتھا۔ وہ اس صورت حال سے نمٹنے کا پتہ نہ لگتی۔

”پھر پھر!“ نیل کے پکارنے پر یہ وہ اچھل پڑی۔

”تھان!“

”تھینکس۔“ نیل نے بیاباسکٹ کا بیسکٹ اس کی طرف بڑھایا تو اس کے سینے سے گہری سانس خارج ہوئی۔

”آپ خفا ہوئے تھینکس یو۔“ وہ اس کا گال تھپک کر کمرے سے نکل کر آئی اور کاؤنٹر پر رک کر بظاہر سرسری انداز میں ”تھینکس“ کہہ کر گئی۔

”تھینکس؟“ اس نے منہ سے تو نہیں آیا تھا؟“

”تھان؟“ ”عقب سے ڈاکٹر یا سمین نے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا تو وہ ہنسنے لگا۔“

”وہ... نبیل کے گھر سے کوئی آنے والا تھا۔ اس کے نانائیاں یا شاید اس کی مہی۔“  
 ”تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟“ ڈاکٹر یا سمین نے کہا۔

”نہیں تو، میں پریشان کیوں ہوں گی البتہ نبیل پریشان ہو جاتا ہے انہیں دیکھ کر اوکے۔ میں ذرا وارڈ کا چکر لگاؤ  
 اسے یا سمین سے اپنی کیفیت چھپانا مشکل ہو رہا تھا جب ہی سامنے سے چلی آئی۔  
 احتیاج وارڈ میں کل بیٹھ گئے۔ اس نے ایک ایک بچے کے پاس رک کر چیک کرنے کے ساتھ اس کا حال  
 پوچھا اور وہی روزانہ والی باتیں دہرائیں جو وہ بچوں کے اندر حوصلہ پیدا کرنے کے لیے کرتی تھی۔ پھر نبیل کے کمر  
 آکر اسے اپنے جانے کا بتایا کیونکہ بائچ بننے والے تھے۔

”بچہ! اگلے پھر صباحت کو لے کر آئے گا۔“ نبیل نے شوق سے کہا تھا۔  
 ”بیٹا! ابھی وہ بہت چھوٹی ہے۔ بس اب کچھ دنوں کی بات ہے پھر میں آپ کو گھر لے جاؤں گی۔“ وہ کہتی ہوئی کو  
 قریب آئی اور ذرا سا پردہ ہٹا کر پیچھے دیکھنے لگی عیث کے سامنے تین چار گاڑیاں کھڑی تھیں اور کیونکہ اس نے شاہ  
 گاڑی سے اترتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اس لیے کچھ پتا نہیں چلا کہ وہ موجود ہے یا جا چکا ہے۔

”شاید چلا گیا اور اگر نہیں بھی گیا تو...“ اس نے قدرے الجھ کر سر جھٹکا پھر نبیل کو خدا حافظ کہہ کر اپنا پرس  
 اپنے کمرے میں آئی تو یا سمین موجود نہیں تھی۔  
 ”سسر! ڈاکٹر یا سمین کہاں ہیں؟“ اس نے کمرے سے نکلنے ہی نرس سے پوچھا۔  
 ”جی انہیں ڈاکٹر وہاب نے بلایا ہے، کمرہ دہی تھیں۔ آپ نیچے چلیں وہ ابھی آتی ہیں۔“ سسر کا جواب سن  
 کی طرف بڑھ گئی۔

”اس کے اندر غالباً ابھی بھی خوف موجود تھا، جب ہی یا سمین کے انتظار میں کہیں رکنے کے بجائے وہ فوراً  
 جانا چاہتی تھی تاکہ جانے پہچانے لوگوں کے سامنے کوئی بد مزگی نہ ہو۔ اس لیے لفٹ سے نکلنے ہی تیز قدموں  
 عبور کر رہی تھی کہ عقب سے بھگتے قدموں کی آواز کے ساتھ ایک پکار بھی۔  
 ”اس! اس!“

”میرے خدا!“ اس کے قدم اپنے آپ رک گئے۔ بے تحاشا دھڑکنے والے ہاتھ رکھ کر وہ لٹی تھی کہ اسی بل  
 ہی بچی اس کی ناگوں سے لپٹ گئی اور اس کے پیچھے آتا شخص رک کر بولا۔  
 ”سوری، یہ بچی بہت شرارتی ہے۔“  
 ”کوئی بات نہیں۔“ اس نے دھیرے سے بچی کا گال چھو کر کہا۔  
 ”اس! اچلو بیٹا! آپ بھی سوری کرو۔“ اس نے بچی کو بازوؤں میں اٹھا کر کہا تو وہ گہری سانس کے ساتھ ذرا سا  
 ”آپ کی بیٹی ماشاء اللہ بہت پیاری ہے۔ کیا نام ہے اس کا؟“  
 ”آصفہ!“

”گڈ، گڈ نیم۔ اوکے ناٹی گرل سی ہو۔“ اس نے بچی کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو تھام کر ذرا سا ہلایا پھر جانے  
 بڑھائے تھے کہ کچھ فاصلے پر شاہ سکندر کو ٹھٹھٹے دیکھ کر وہ پھر اسی حالت میں آگئی۔  
 شاہ سکندر ٹھٹھٹا ہوا اس طرف آ رہا تھا۔ اور اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کافی دیر سے اس شغل  
 ہے، بظاہر بہت بے نیاز سا اسے دیکھا بھی یوں جیسے پہلے کبھی دیکھا ہی نہ ہو، لیکن ہونٹوں میں دہی میم مسکراہ  
 کی غماز تھی کہ کچھ دیر پہلے کی صورت حال سے وہ اس کی کیفیات جان کر ایک انتہائی خوشی محسوس کر رہا ہے۔  
 آصفہ کا دل چاہا اسے روک کر پوچھے کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے۔ اتنی جلدی اپنا وعدہ کیوں بھول گیا۔ لیکن  
 سے وہ اس کے قریب سے گزر گیا۔ اس سے وہ بس اندر ہی اندر سلگ کر رہ گئی اور اس سے پہلے کہ وہ لپٹ  
 قدموں سے باہر نکل آئی اور یا سمین کی گاڑی سے ٹیک لگا کر سوچنے لگی کہ آخر اس کا مقصد کیا ہے۔  
 ”سوری۔ تمہیں کافی انتظار کرنا پڑا۔“ یا سمین کی آواز نے ہی اسے سوچوں کے بھنور سے نکالا تھا۔  
 ”کیا کہہ رہے تھے ڈاکٹر وہاب؟“ اس نے گاڑی میں بیٹھتی ہی پوچھا۔

”میں نے اسے بتایا تھا کہ آپ انہی رہتی ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو...“ یا سمین بھی کچھ سنبھلائی تو  
 بھی اٹھ اٹھی ہو۔  
 ”مگر اندر جمن سے کوئی چیز ٹوٹی تھی۔ حالانکہ وہ اکیلی نہیں تھی۔ بھرا ہوا گھر تھا لیکن جس انداز سے انہوں نے  
 اسے حساب سے اکیلے پن کے احساس نے اس کی آنکھیں دھندلا دی تھیں۔ فوراً کچھ بول بھی نہیں سکی۔ تب  
 ”نہی کیوں نہیں لے آئی تھی؟“ انہوں نے پوچھا تو وہ یا سمین کو دیکھنے لگی۔  
 ”یہاں سے اسے لے آتا تھا کہ آپ انہی رہتی ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو...“ یا سمین بھی کچھ سنبھلائی تو  
 بھی اٹھ اٹھی ہو۔

”میں نے اسے بتایا تھا کہ آپ انہی رہتی ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو...“ یا سمین بھی کچھ سنبھلائی تو  
 بھی اٹھ اٹھی ہو۔  
 ”مگر اندر جمن سے کوئی چیز ٹوٹی تھی۔ حالانکہ وہ اکیلی نہیں تھی۔ بھرا ہوا گھر تھا لیکن جس انداز سے انہوں نے  
 اسے حساب سے اکیلے پن کے احساس نے اس کی آنکھیں دھندلا دی تھیں۔ فوراً کچھ بول بھی نہیں سکی۔ تب  
 ”نہی کیوں نہیں لے آئی تھی؟“ انہوں نے پوچھا تو وہ یا سمین کو دیکھنے لگی۔  
 ”یہاں سے اسے لے آتا تھا کہ آپ انہی رہتی ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو...“ یا سمین بھی کچھ سنبھلائی تو  
 بھی اٹھ اٹھی ہو۔

”میں نے اسے بتایا تھا کہ آپ انہی رہتی ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو...“ یا سمین بھی کچھ سنبھلائی تو  
 بھی اٹھ اٹھی ہو۔  
 ”مگر اندر جمن سے کوئی چیز ٹوٹی تھی۔ حالانکہ وہ اکیلی نہیں تھی۔ بھرا ہوا گھر تھا لیکن جس انداز سے انہوں نے  
 اسے حساب سے اکیلے پن کے احساس نے اس کی آنکھیں دھندلا دی تھیں۔ فوراً کچھ بول بھی نہیں سکی۔ تب  
 ”نہی کیوں نہیں لے آئی تھی؟“ انہوں نے پوچھا تو وہ یا سمین کو دیکھنے لگی۔  
 ”یہاں سے اسے لے آتا تھا کہ آپ انہی رہتی ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو...“ یا سمین بھی کچھ سنبھلائی تو  
 بھی اٹھ اٹھی ہو۔

”میں نے اسے بتایا تھا کہ آپ انہی رہتی ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو...“ یا سمین بھی کچھ سنبھلائی تو  
 بھی اٹھ اٹھی ہو۔  
 ”مگر اندر جمن سے کوئی چیز ٹوٹی تھی۔ حالانکہ وہ اکیلی نہیں تھی۔ بھرا ہوا گھر تھا لیکن جس انداز سے انہوں نے  
 اسے حساب سے اکیلے پن کے احساس نے اس کی آنکھیں دھندلا دی تھیں۔ فوراً کچھ بول بھی نہیں سکی۔ تب  
 ”نہی کیوں نہیں لے آئی تھی؟“ انہوں نے پوچھا تو وہ یا سمین کو دیکھنے لگی۔  
 ”یہاں سے اسے لے آتا تھا کہ آپ انہی رہتی ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو...“ یا سمین بھی کچھ سنبھلائی تو  
 بھی اٹھ اٹھی ہو۔

”میں نے اسے بتایا تھا کہ آپ انہی رہتی ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو...“ یا سمین بھی کچھ سنبھلائی تو  
 بھی اٹھ اٹھی ہو۔  
 ”مگر اندر جمن سے کوئی چیز ٹوٹی تھی۔ حالانکہ وہ اکیلی نہیں تھی۔ بھرا ہوا گھر تھا لیکن جس انداز سے انہوں نے  
 اسے حساب سے اکیلے پن کے احساس نے اس کی آنکھیں دھندلا دی تھیں۔ فوراً کچھ بول بھی نہیں سکی۔ تب  
 ”نہی کیوں نہیں لے آئی تھی؟“ انہوں نے پوچھا تو وہ یا سمین کو دیکھنے لگی۔  
 ”یہاں سے اسے لے آتا تھا کہ آپ انہی رہتی ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو...“ یا سمین بھی کچھ سنبھلائی تو  
 بھی اٹھ اٹھی ہو۔

”میں نے اسے بتایا تھا کہ آپ انہی رہتی ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو...“ یا سمین بھی کچھ سنبھلائی تو  
 بھی اٹھ اٹھی ہو۔  
 ”مگر اندر جمن سے کوئی چیز ٹوٹی تھی۔ حالانکہ وہ اکیلی نہیں تھی۔ بھرا ہوا گھر تھا لیکن جس انداز سے انہوں نے  
 اسے حساب سے اکیلے پن کے احساس نے اس کی آنکھیں دھندلا دی تھیں۔ فوراً کچھ بول بھی نہیں سکی۔ تب  
 ”نہی کیوں نہیں لے آئی تھی؟“ انہوں نے پوچھا تو وہ یا سمین کو دیکھنے لگی۔  
 ”یہاں سے اسے لے آتا تھا کہ آپ انہی رہتی ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو...“ یا سمین بھی کچھ سنبھلائی تو  
 بھی اٹھ اٹھی ہو۔

”میں نے اسے بتایا تھا کہ آپ انہی رہتی ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو...“ یا سمین بھی کچھ سنبھلائی تو  
 بھی اٹھ اٹھی ہو۔  
 ”مگر اندر جمن سے کوئی چیز ٹوٹی تھی۔ حالانکہ وہ اکیلی نہیں تھی۔ بھرا ہوا گھر تھا لیکن جس انداز سے انہوں نے  
 اسے حساب سے اکیلے پن کے احساس نے اس کی آنکھیں دھندلا دی تھیں۔ فوراً کچھ بول بھی نہیں سکی۔ تب  
 ”نہی کیوں نہیں لے آئی تھی؟“ انہوں نے پوچھا تو وہ یا سمین کو دیکھنے لگی۔  
 ”یہاں سے اسے لے آتا تھا کہ آپ انہی رہتی ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو...“ یا سمین بھی کچھ سنبھلائی تو  
 بھی اٹھ اٹھی ہو۔

”میں نے اسے بتایا تھا کہ آپ انہی رہتی ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو...“ یا سمین بھی کچھ سنبھلائی تو  
 بھی اٹھ اٹھی ہو۔  
 ”مگر اندر جمن سے کوئی چیز ٹوٹی تھی۔ حالانکہ وہ اکیلی نہیں تھی۔ بھرا ہوا گھر تھا لیکن جس انداز سے انہوں نے  
 اسے حساب سے اکیلے پن کے احساس نے اس کی آنکھیں دھندلا دی تھیں۔ فوراً کچھ بول بھی نہیں سکی۔ تب  
 ”نہی کیوں نہیں لے آئی تھی؟“ انہوں نے پوچھا تو وہ یا سمین کو دیکھنے لگی۔  
 ”یہاں سے اسے لے آتا تھا کہ آپ انہی رہتی ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو...“ یا سمین بھی کچھ سنبھلائی تو  
 بھی اٹھ اٹھی ہو۔





”یہ روری ہے۔“ ڈاکٹر فرزانہ نے مہرا لہنسا کی آنکھوں سے بازو ہٹایا تو گھٹی سیاہ پلکوں کے درمیان سے جیسے سارا جادو ان ہی آنکھوں میں ہے۔

”رونے کی کیا بات ہے بیٹا! ایک دودن کی تکلیف ہے۔“ ڈاکٹر فرزانہ اسے تسلی دینے کے ساتھ اسے چپکے کرنے لگیں پھر اسے مخاطب کر کے بولیں۔ ”دیکھنا آئیے! ادھر بیٹوب ہوگی۔“

اس نے جلدی سے کارنر نیل سے بیٹوب اور کاٹن اٹھا کر ڈاکٹر فرزانہ کو کھمبادی لیکن فوراً ”احساس“ جیسے رخ طرف سے آکر ان کی مدد کرنے لگی۔

نہیں کہ وقت شاہ سکندر کمرے میں داخل ہوا تھا اور اسے دیکھ کر دروازے کے پاس ہی رک کر جو شاپازہ ”ہاں جان کی طرف دھبھاتا ہوا بولا۔

”کئی بی جان آئیے لے لیں۔“

آواز پر وہ چونکی ضرور لیکن سر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ اور جیسے ہی فارغ ہوئی، واش روم میں جا کر ہاتھ دھو دوبارہ کمرے میں آئی تو مہرا لہنسا کو دیکھ کر بولی۔

”اگر آپ پہلے اپنا خیال رکھتیں تو یہ تکلیف نہ سہنی بڑی آپ کو۔ اب کم از کم بیس دن مکمل آرام کرنا“

”ہاں اور اس دوران کوئی بد پریمیزی بھی نہیں کرنی۔“ ڈاکٹر فرزانہ نے اس کی تائید کے ساتھ کہا۔

”بچے کو دودھ تو پلایا سکتی ہوں یا نہیں؟“ مہرا لہنسا نے پہلی بار لب کشائی کی تو وہ بے اختیار اس کے ہر جنبش دیکھنے لگی تھی۔ اور چونکی اس وقت جب شاہ سکندر اسے مخاطب کر کے پوچھ رہا تھا۔

”ہیکسکسیوزی ڈاکٹر! کوئی پرابلم تو نہیں ہے آئی مین میری مسز کے ساتھ؟“

نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس نے دیکھا۔ ڈاکٹر فرزانہ موجود نہیں تھیں۔ وہ اپنے آپ میں غلج سی ہوا۔

”نو بیٹی! ایسب کھاؤ۔“ کئی بی جان نے پلیٹ اس کے سامنے کی۔

”شکریہ۔ میں سیب نہیں کھاتی۔“ وہ انکار کر کے آگے بڑھ گئی۔ پھر دروازے پر رک کر پورے اعتماد کر بولی تھی۔

”مسز سکندر! میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔“ ہی گئی۔ بیٹے کے ساتھ نئی زندگی کی بھی۔ ”نئی زندگی! اشارہ شاہ سکندر کی اس کی طرف واپسی تھی۔ جسے مہرا لہنسا سمجھی یا نہیں، وہ سمجھ گیا تھا۔ اور محض اسے دیکھنے کی خاطر پوچھنے لگا۔

”میں کب تک انہیں گھر لے جا سوں گا؟“

”موری۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اس بارے میں ڈاکٹر فرزانہ ہی بتائیں گی۔“ وہ براہ راست اس کی

میں دیکھ کر بولی تھی۔

اور یہ اس کی شاہ سکندر سے آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد کبھی سامنا ہوا بھی تو وہ اپنے وعدے کے اجنبیوں کی طرح نکل گیا۔ اور وہ اول تو پلیٹ کر دیکھنا ہی نہیں چاہتی تھی، اگر کبھی دل میں کوئی درد جاگڑنے مہلت نہیں دی تھی۔

”یہ روری ہے۔“ ڈاکٹر فرزانہ نے مہرا لہنسا کی آنکھوں سے بازو ہٹایا تو گھٹی سیاہ پلکوں کے درمیان سے جیسے سارا جادو ان ہی آنکھوں میں ہے۔

”رونے کی کیا بات ہے بیٹا! ایک دودن کی تکلیف ہے۔“ ڈاکٹر فرزانہ اسے تسلی دینے کے ساتھ اسے چپکے کرنے لگیں پھر اسے مخاطب کر کے بولیں۔ ”دیکھنا آئیے! ادھر بیٹوب ہوگی۔“

اس نے جلدی سے کارنر نیل سے بیٹوب اور کاٹن اٹھا کر ڈاکٹر فرزانہ کو کھمبادی لیکن فوراً ”احساس“ جیسے رخ طرف سے آکر ان کی مدد کرنے لگی۔

نہیں کہ وقت شاہ سکندر کمرے میں داخل ہوا تھا اور اسے دیکھ کر دروازے کے پاس ہی رک کر جو شاپازہ ”ہاں جان کی طرف دھبھاتا ہوا بولا۔

”کئی بی جان آئیے لے لیں۔“

آواز پر وہ چونکی ضرور لیکن سر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ اور جیسے ہی فارغ ہوئی، واش روم میں جا کر ہاتھ دھو دوبارہ کمرے میں آئی تو مہرا لہنسا کو دیکھ کر بولی۔

”اگر آپ پہلے اپنا خیال رکھتیں تو یہ تکلیف نہ سہنی بڑی آپ کو۔ اب کم از کم بیس دن مکمل آرام کرنا“

”ہاں اور اس دوران کوئی بد پریمیزی بھی نہیں کرنی۔“ ڈاکٹر فرزانہ نے اس کی تائید کے ساتھ کہا۔

”بچے کو دودھ تو پلایا سکتی ہوں یا نہیں؟“ مہرا لہنسا نے پہلی بار لب کشائی کی تو وہ بے اختیار اس کے ہر جنبش دیکھنے لگی تھی۔ اور چونکی اس وقت جب شاہ سکندر اسے مخاطب کر کے پوچھ رہا تھا۔

”ہیکسکسیوزی ڈاکٹر! کوئی پرابلم تو نہیں ہے آئی مین میری مسز کے ساتھ؟“

نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس نے دیکھا۔ ڈاکٹر فرزانہ موجود نہیں تھیں۔ وہ اپنے آپ میں غلج سی ہوا۔

”نو بیٹی! ایسب کھاؤ۔“ کئی بی جان نے پلیٹ اس کے سامنے کی۔

”شکریہ۔ میں سیب نہیں کھاتی۔“ وہ انکار کر کے آگے بڑھ گئی۔ پھر دروازے پر رک کر پورے اعتماد کر بولی تھی۔

”مسز سکندر! میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔“ ہی گئی۔ بیٹے کے ساتھ نئی زندگی کی بھی۔ ”نئی زندگی! اشارہ شاہ سکندر کی اس کی طرف واپسی تھی۔ جسے مہرا لہنسا سمجھی یا نہیں، وہ سمجھ گیا تھا۔ اور محض اسے دیکھنے کی خاطر پوچھنے لگا۔

”میں کب تک انہیں گھر لے جا سوں گا؟“

”موری۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اس بارے میں ڈاکٹر فرزانہ ہی بتائیں گی۔“ وہ براہ راست اس کی

میں دیکھ کر بولی تھی۔

نیل کو اس بر فوقیت دے جاتی تھی۔ اور ہمیشہ جائز بات پر ہی ایسا ہوتا تھا لیکن مدیحہ اپنی ناجائز کو بھی کھاتے میں ڈالتی تھی اور دوسرے کی جائز کو ناجائز کر کے۔

اگر عموں میں زیادہ فرق نہ ہوتا تو اس کی نیل کے ساتھ باقاعدہ ٹھنی رہتی۔ ابھی بھی ڈائریکٹر ڈائریکٹ کبھی کبھی ان کی تبدیلی اور دل آزاری کر جاتی تھی۔ جس پر سوائے ان کے باقی تمام کنزرویٹو تھے۔ لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ اور اسی کی جزواں ہنر صباحت تھی۔ رنگ روپ، ناک نونہ میں بالکل مدیحہ اگر ذرا سا فرق تھا تو اس تل کا جسے پہچان کے لیے سب سے پہلے سہا بھائی نے اس کی دائیں طرف لگا تھا۔ پھر ایک عرصہ تک میمونہ بھائی اور اماں جی اسی پر نشان لگاتی رہی تھیں اور جہر گئیں تو قدرت کی طرف سے اپنے آپ میں تل نکل آیا تھا۔ جو اس کے شفاف چہرے کی دلکشی میں باعث تھا۔ اور کیونکہ پہلی نظر اسی پر پڑتی تھی اس لیے دونوں کی پہچان میں مشکل نہیں ہوتی تھی۔ پھر عمر سے نکلنے ہی مدیحہ نے جانے اپنے چہرے کی دلکشی میں انسانی فی خاطر یا سب کو مشکل میں ڈالنے ہی مل بنانا شروع کر دیا تھا۔

جس سے صرف ایک شخص دھوکا نہیں کھاتا تھا اور وہ نیل تھے۔ انہوں نے کبھی اس تل کے دھوکے صباحت نہیں پکارا تھا۔ جبکہ باقی سب دھوکا کھاتا جاتے یہاں تک کہ آسیہ بھی۔ بہر حال شکل و صورت لیکن عادات میں صباحت اس کے برعکس تھی۔ حد درجہ نرم خو، جیسے مدیحہ کے رویوں کی طمانی بھی تھی۔ سب سے زیادہ اسے اپنے نیل بھائی کی فکر رہتی تھی۔ کہ باقی سب تو پھر بھی مدیحہ سے کہہ سکتے لیکن وہ بے چارے بالکل خاموش ہو جاتے، بھی ایسا بھی ہوتا کہ مدیحہ نیل کی دل آزاری کرتی تو پھر صباحت خود کو ان کے سامنے مدیحہ ظاہر کر کے معافی مانگتی اور اس وقت انہیں اس پر بے طرح ہار آتے نہیں کرتے تھے بلکہ اس کی بات رکھنے کی خاطر بعد میں اسے بتاتے کہ مدیحہ نے اپنے رویے کی معافی مانگ اور وہ اپنی تدبیر پر خوش ہو جاتی تھی۔

بہر حال آسیہ نے ان تینوں کو ایک سی محبت، ایک سی توجہ دی تھی اس کے باوجود ان کے مزاجوں میں انہیں ملنا سکتی تھی کیونکہ ہر بچہ اپنی فطرت کے لپیٹا ہوتا ہے جسے جب تک وہ خود نہ بدلنا چاہے کوئی سکادور نہ ہر بچہ اپنے ماں باپ کی خواہشوں کا پرتو ہوتا۔

→ → → →

آسیہ ابھی کلینک سے لوٹی تھی۔ روزانہ کی طرح کچھ دیر اماں جی اور اماں جی کے پاس بیٹھ کر ان کا حال پھر اوپر آئی تو وہ جیسے انتظار میں بیٹھی تھیں فوراً "کتنی ہوئی بولیں۔"

"جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر آ جاؤ۔ مدیحہ بہت دیر سے بھوک بھوک کر رہی ہے۔"

"تو آپ نے کھانا لگا کر دیا تھا ہاں! میرے انتظار میں کیوں بیٹھائے رکھا اسے۔" اس نے کہا۔

"نہیں میں نے تو کتنی بار کہا اس سے لیکن اس کی اپنی ضد تھی کہ تمہارے ساتھ کھائے گی۔"

"اچھا۔ چلیں آپ کھانا لگا لیں اور ان تینوں کو بھی بلا لیں۔ میں بس پانچ منٹ میں آتی ہوں۔"

اپنے کمرے میں چلی گئی۔

کچھ دیر بعد آسیہ ڈائننگ روم میں داخل ہوئی تینوں نے ایک ساتھ اسے سلام کیا۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام،" بیٹھو۔ کھڑے کیوں ہو۔" وہ اپنی کرسی کھینچتی ہوئی بولی۔

"آج آپ نے بہت دیر کر دی ماما! مدیحہ نے بیٹھنے ہی کہا تو اس نے کھڑی پر نظر ڈالنے کے بعد تعجب دیکھا۔

"ساڑھے آٹھ ہو رہے ہیں اور میں روزانہ اسی وقت آتی ہوں۔"

"آپ تو اپنے وقت پر آتی ہیں ماما۔ لیکن مدیحہ کو بھوک وقت سے پہلے لگ گئی تھی۔ اس لیے اسے

"صباحت نے سائن کا ڈونگا اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"صباحت نے بتایا ہے مجھے۔ اور تمہیں بھوک لگی تھی ماما! تو کھانا کھا لینا تھا۔ آئندہ اس طرح میرے انتظار میں بیٹھنا۔" وہ شروع کرو۔ "اس نے مدیحہ کی پلیٹ میں سائن ڈالا پھر ڈونگا نیل کو تھما کر پوچھنے لگی۔

"نیل بھوک رہے کے لیے ایسا کی کیا تھا۔ کوئی جواب آیا؟"

"نیل بھوک رہی تھی۔ تو نہیں آیا۔" نیل نے کہا تھا کہ مدیحہ فوراً "بولی۔

"نیل کا بھی نہیں۔"

"آسیہ نے کچھ نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹنا کر بولی۔

"یوں؟" آسیہ نے کچھ نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹنا کر بولی۔

"ہاں! ہر جگہ سفارش چلتی ہے ناں اور نیل بھائی کے لیے کوئی سفارش بھی۔"

"صباحت فوراً "بولی۔" نیل بھائی کو کسی سفارش کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔"

"آسیہ نے سر ہلا کر تاکید کی پھر کھانے میں مصروف ہو گئی۔

مانے کے بعد اس نے مدیحہ اور صباحت کو پڑھنے کی تاکید کی پھر اپنے کمرے میں آکر بیٹھی تھی کہ میمونہ بھائی

سونے کی تیاری کر رہی ہو؟"

"نہیں! مجھی تو کھانا کھایا ہے۔ آئیے بیٹھیں۔ چائے پیئیں گی؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ چائے ضرور پیوں گی کیونکہ آج میرا سونے کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔" میمونہ نے آرام سے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"نیل کی آرام سے بیٹھنے ہوئے کہا۔

"نیل کی آرام سے بیٹھنے ہوئے کہا۔

"نیل کی آرام سے بیٹھنے ہوئے کہا۔

"نیل کی آرام سے بیٹھنے ہوئے کہا۔

"نیل کی آرام سے بیٹھنے ہوئے کہا۔

"نیل کی آرام سے بیٹھنے ہوئے کہا۔

"نیل کی آرام سے بیٹھنے ہوئے کہا۔

"نیل کی آرام سے بیٹھنے ہوئے کہا۔

"نیل کی آرام سے بیٹھنے ہوئے کہا۔

"نیل کی آرام سے بیٹھنے ہوئے کہا۔

"نیل کی آرام سے بیٹھنے ہوئے کہا۔

"نیل کی آرام سے بیٹھنے ہوئے کہا۔

"نیل کی آرام سے بیٹھنے ہوئے کہا۔

"نیل کی آرام سے بیٹھنے ہوئے کہا۔

"نیل کی آرام سے بیٹھنے ہوئے کہا۔

"نیل کی آرام سے بیٹھنے ہوئے کہا۔

"نیل کی آرام سے بیٹھنے ہوئے کہا۔

"نیل کی آرام سے بیٹھنے ہوئے کہا۔

"نیل کی آرام سے بیٹھنے ہوئے کہا۔

"نیل کی آرام سے بیٹھنے ہوئے کہا۔

"نیل کی آرام سے بیٹھنے ہوئے کہا۔

"نیل کی آرام سے بیٹھنے ہوئے کہا۔

"نیل کی آرام سے بیٹھنے ہوئے کہا۔

"نیل کی آرام سے بیٹھنے ہوئے کہا۔

"نیل کی آرام سے بیٹھنے ہوئے کہا۔

"نیل کی آرام سے بیٹھنے ہوئے کہا۔

"نیل کی آرام سے بیٹھنے ہوئے کہا۔

"نیل کی آرام سے بیٹھنے ہوئے کہا۔

"نیل کی آرام سے بیٹھنے ہوئے کہا۔

"نیل کی آرام سے بیٹھنے ہوئے کہا۔



صبا نے خاصے ناصحانہ انداز میں کہا۔ تب ہی دستک کے بعد ذرا سا دروازہ کھول کر عمر اندر بھاگ نکلا۔  
 ”سنو، چھو سو رہی ہیں کیا؟“  
 ”ہاں۔ کیوں؟“ ”مدیحہ جواب کے ساتھ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی تو وہ اندر آتا ہوا بولا۔  
 ”اباجی بلا رہے ہیں انہیں لیکن انہوں نے نہ بھی کہا ہے کہ اگر سو رہی ہوں تو مت اٹھانا۔“  
 ”نہیں اٹھائے۔“ ”مدیحہ نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔  
 ”شاباش۔ اب ذرا ایک گلاس پانی پلا دو۔“ ”عمر کرسی کھینچ کر بیٹھنے لگا تو مدیحہ نے فوراً ”ٹوکا۔“  
 ”بیٹھنا مت۔“

”کیوں؟“ ”عمر کرسی ہلا کر دیکھنے لگا۔  
 ”کرسی مضبوط ہے۔ اسے چھو ڈاؤر یہاں سے نکل کر بائیں ہاتھ چند قدم چلو پھر دائیں ہاتھ مڑنا۔  
 بائیں ہاتھ پر پکڑیں۔ وہاں فریج رکھا ہو گا۔ اسے کھولو ایک ٹھنڈی بوتل نکالو پھر گلاس اٹھا کر خود بھی لے لیں گی تو۔“

مدیحہ نے بڑے آرام سے اسے پانی کا راستہ بتا کر تکیے کے ساتھ ٹیک لگا لیا۔ تو وہ بیٹھتے ہوئے ملامت  
 ”چہ چہ؟“ اتنی دیر میں تمہاری لے آئیں خیر چھو ڈو۔ مجھے کوئی ایسی پیاس نہیں لگی۔“  
 ”توبہ۔ کتنے کاہل ہو تم لوگ۔ پانی نہیں لی سکتے۔“ ”صباحات اٹھ کھڑی ہوئی۔  
 ”چار بج گئے ہیں۔ بوا اسے چائے کا بھی کہہ دینا۔“ ”مدیحہ نے جھٹ دوسرا کام بھی کہہ دیا۔  
 ”صبحات اس کی کاہلی پر تاسف سے سر جھٹکتی کمرے سے نکل گئی۔“

♥ ♥ ♥ ♥  
 عدیل بھائی کی آمد کی اطلاع نے سارے میں ہلچل مچادی تھی۔ اماں جی اور اباجی خوشی میں بوکھا  
 تھے۔ روزانہ ایک ایک کلو گرام اس کے سید کوئی نہ کوئی کام کرتے اس کے بعد خود بھی سر پر جا کھڑے ہو  
 ”اباجی! وہ کچھ جھنڈیاں وغیرہ بھی لے آؤں۔ لال پیکلی؟“  
 عمر بظاہر سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا لیکن اس کی بھونڑا آنکھوں میں چمکتی شرارت دیکھ کر صباحات  
 ساختہ نہیں۔ جبکہ مدیحہ اس کے ساتھ مل گئی۔  
 ”ہاں اباجی! پورے گھر کو جھنڈیوں سے سجائیں گے۔ شاندار استقبال ہونا چاہیے عدیل باہر  
 جیسے۔ کوئی برائم منٹر آ رہا ہو۔“ ”حضر نے ٹکڑا لگا لیا۔  
 ”کون آ رہا ہے۔“ ”اماں جی سمجھیں نہیں۔“

”وزیراعظم اماں جی! وزیراعظم۔“ ”عمر زور دے کر بولا۔  
 ”ہاں! وزیراعظم اپنے گھر آ رہے کیوں؟“ ”اماں جی ایک ایک شکل دیکھنے لگیں۔  
 ”کیا اصول بائیں لے کر کھڑے ہو گئے ہو تم لوگ۔ جاؤ فائنٹ کا نام معلوم کرو۔“ ”اباجی نے بوبہ۔  
 ”اباجی! میں بھی چلوں گی آپ کے ساتھ۔“ ”مدیحہ نے کہا تو احمرا لالی کی طرف جاتے جاتے پلٹ  
 ”جی نہیں۔ خواتین سب گھر پر رہیں گی۔ صرف مرد حضرات جائیں گے۔“  
 ”میں آپ سے تو بات نہیں کر رہی۔“ ”مدیحہ کو اس کی مداخلت سخت پر ہی لگی۔  
 ”میں بھی اباجی سے کہہ رہا ہوں۔ اباجی! خواتین کو لے کی جانے کی غلطی نہیں کیجئے گا کیونکہ  
 سے نکلنے میں دیر لگے گی اور اتنی دیر یہ لوگ وہاں کیا کریں گی۔“  
 ”آخر نے مدیحہ کے پیچے ہوئے چہرے سے نظریں ہٹا کر اباجی سے کہا۔  
 ”کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو لیکن بچیوں کو شوق ہے۔“ ”اباجی مدیحہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے  
 ”کرو سب چلیں گے۔“  
 ”تھینک یو اباجی! وہ احمرا کو جراتی۔“ ”اماں جی! یہ حیاں چڑھ گئی۔“

مقررہ وقت پر سب ایر پورٹ پہنچے تو آگے بڑے بھیا اپنے بال بچوں سمیت موجود تھے۔ جنہیں دیکھ کر اماں جی کو  
 نیل بھائی کی کئی محسوس ہونے لگی تھی کہ دو بیٹے پاس کھڑے تھے۔ تیسرا آنے والا تھا جب ہی ان کا دھیان ٹھیک  
 نیل کی طرف چلا گیا تھا۔  
 ”آپ کیا سوچنے لگیں اماں جی! ادھر دیکھیں عدیل بھائی آ رہے ہیں۔“ ”آسیہ نے ایک ہاتھ ان کے کندھے پر  
 ہر کر اشارے سے بتایا پھر ہاتھ ہلانے لگی۔  
 ”اے! اتمو اور روبی کتنی بڑی ہو گئی ہیں۔“ ”میمونہ بھابی عدیل کی بیٹیوں کو دیکھ رہی تھیں۔  
 پھر ایمین تو بیٹیوں کے ساتھ جلد ہی ان تک آن پہنچی جبکہ عدیل بھائی کو کچھ دیر لگی تھی۔ اور سب سے ملنے  
 آئے جب مدیحہ اور صباحات کے پاس رکے تو خاصے محفوظ انداز میں باری باری دونوں کو دیکھ کر پوچھنے لگے۔  
 ”آپ دونوں میں مدیحہ کون ہے اور صباحات کون۔“

”آپ بتائیں۔“ ”مدیحہ فوراً بولی۔  
 ”جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، ایک بچی کے چہرے پر قتل تھا لیکن یہاں تو دونوں کے چہروں پر نظر آ رہا ہے۔“  
 ”نیل بھائی نے سوچتے ہوئے انداز میں کہا۔ پھر پلٹ کر ایمین سے بولے۔ ”تم پہچان سکتی ہو؟“  
 ”نہیں۔“ ”ایمانین دیکھیں وہ دونوں کو دیکھ رہی تھی۔  
 ”کوئی نہیں پہچان سکتا چاچو، سوائے نیل بھائی کے۔“ ”عمر نے کہا تو عدیل بھائی کچھ حیران ہو کر نیل سے  
 الب ہوئے۔  
 ”واقعی۔ تم پہچان لو گے نیل؟“

نیل سب کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر گھبرا گئے تھے جب ہی نفی میں سر ہلا دیا۔  
 ”کوئی سوال کریں بھائی! مدیحہ پہلے جواب دے گی۔“ ”عقب سے آسیہ نے سرگوشی میں کہا جسے سن کر عدیل  
 آئی پوچھنے لگے۔  
 ”کون سی کلاس میں پڑھتی ہو؟“  
 ”انٹر! مدیحہ نے بتایا تو انہوں نے فوراً اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور مسکرا کر بولے۔  
 ”میں نے دیکھتے ہی آپ کو پہچان لیا تھا۔ آپ مدیحہ ہو۔“  
 ”آپ کو نیل بھائی نے بتایا ہے۔ گویا وہ بھی جانتی تھی کہ اسے نیل ہی پہچان سکتے ہیں۔  
 نیل نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔“

♥ ♥ ♥ ♥  
 جب تک عدیل بھائی بزنس اور گھر کی سٹیجنگ نہ کر لیتے انہیں یہیں سب کے ساتھ رہنا تھا۔ اور اب کیونکہ  
 پتہ بڑے ہو گئے تھے اس لیے جگہ کم لگ رہی تھی۔ لیکن کسی نے جگہ کی تنگی پر کوئی آواز نہیں اٹھائی تھی اس کے  
 دودھ آ کر پائے آپ احساس ہونے لگا کہ اس کی وجہ سے سب پریشان ہو رہے ہیں۔ وہ اگر یہاں نہ ہوئی تو عدیل  
 مائی آرام سے رہ سکتے تھے۔  
 ”میں کس حساب سے یہاں قبضہ جمائے بیٹھی ہوں۔ اماں جی اور اباجی کی خواہش ہو گی کہ عدیل طویل عرصہ  
 بزنس والا بنے اب ان کے پاس رہے۔ اور ہو سکتا ہے۔ عدیل بھائی بھی یہی چاہتے ہوں۔ میری وجہ سے وہ  
 فائوٹ ہوئے لیکن مجھے خیال کرنا چاہیے۔“  
 ”آسیہ کھانے کے بعد یونہی چمکتی ہوئی ٹیبل پر آکر بیٹھی تھی کہ ان سوجھوں میں گھر کا اٹھنا ہی بھول گئی تھی۔  
 ”چھو پھو! نیل نے پکارا تب وہ چونکی جبکہ اس سے پہلے ان کی اسٹک کی آواز بھی مست واضح تھی۔  
 ”آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں؟“  
 ”نیل! کوئی۔ تم کہاں چلے گئے تھے؟“ ”آسیہ نے گہری سانس کے ساتھ پوچھا۔  
 ”نیل نے بولایا تھا۔ شام میں ان کی طرف چلا گیا۔“ ”نیل نے آگے آکر اس کے سامنے کرسی سنبھال لی تو اس

نے بونہی پوچھ لیا۔

”کوئی کام تھا بڑے بھیا کو؟“

”جی کہہ رہے تھے۔ سمیر کو پرہادیا کروں اس کے انگیزام قریب ہیں۔“

نیل کے جواب پر اس نے کچھ بے دھیانی میں سر ہلایا پھر لابی میں نظر ڈال کر بولی۔

”ان دونوں کی آواز نہیں آرہی۔ سو گئیں کیا؟“

”نہیں نیچے ہیں۔ اتنے عرصے بعد چاچو آئے ہیں اس لیے کچھ دن تو ہلا گلا رہے گا۔“ نیل نے اس پر کہا کہ کہیں وہ مدیحہ اور صاحت کو بلا کر ان پر پابندی نہ لگا دے۔

”ہاں بہت عرصے بعد آئے ہیں عدیل بھائی اور میں سوچ رہی ہوں اب انہیں یہیں رہنا چاہیے۔“

انداز میں بولی۔

”تو کیا وہ تھوڑے دنوں کے لیے آئے ہیں؟“ نیل نے پوچھا۔

”نہیں۔ آئے تو مستقل ہیں۔ یہیں رہنے سے میرا مطلب ہے اس گھر میں امال جی اور اباجی کے پاس

ہماری وجہ سے شاید وہ یہاں نہ رہ سکیں۔ اور میں سوچ رہی ہوں ان کے بجائے ہمیں اپنے لیے الگ گھر

کرنا چاہیے۔ ہم انور ڈی بھی کر سکتے ہیں اور میرا خیال ہے مجھے اب کسی بات کی کوئی فکر نہیں ہوگی کیونکہ

ماشاء اللہ جوان ہو گیا ہے۔“

آخر میں نیل کو دیکھتے ہوئے آسیہ نے مسکرا کر سر اٹھایا تھا۔

”سوچ تو آپ ٹھیک رہی ہیں پھوپھو! لیکن پتا نہیں اباجی مائیں گے کہ نہیں اور شاید عدیل چاچو بھی نہ

نیل نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

”میں سمجھ ہی اباجی سے بات کروں گی اگر انہوں نے مجھ سے اتفاق کر لیا تو پھر عدیل بھائی کو وہ خود ہی دیا

کو کہہ دیں گے۔ دیے بھی بیٹا! ہمارے لیے گھر کو کوئی مسئلہ نہیں ہے اپنا پارٹمنٹ ہے اسے فوری دیا

ہم وہاں شفٹ ہو سکتے ہیں۔ میرا کلینک بھی وہاں سے قریب پڑے گا اور مدحو صبا کو بھی زیادہ پر اہم نہیں

دونوں ابھی تک نیچے ہیں؟“

آسیہ کو ان کا نام لیتے ہی خیال آگیا تھا۔ ”میں دیکھ رہی ہوں۔ پڑھائی سے دونوں بھاگنے لگی ہیں۔

ڈانٹتے کیوں نہیں ہو۔ بڑے بھائی ہو رعب میں رکھا کرو۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے پھوپھو! پڑھنے میں دونوں اچھی ہیں۔“ نیل نے ان کی طرف داری کی۔

”خاک اچھی ہیں۔ میٹرک میں کسی ایک نے پوزیشن نہیں لی۔“ آسیہ کو واقعی اس بات کا افسوس تھا

کے معاملے میں ایک بھی اس پر نہیں گئی تھی۔ اور ابھی وہ مزید انہیں نالائق اور لا پرواہ جیسے خطاب سے

زیادے ان کے ہنسنے اور بھاگنے کی آواز آنے لگی جس پر وہ قدرے غصے سے بولی۔

”دیکھو یہ حال ہے ان کا۔“

”پھوپھو! آجی عمر بننے کھنسنے کی ہے، پلیز ڈانٹنے گا نہیں۔“ نیل نے پہلے سے ان کی سفارش کر دی۔

”میں تمہیں ڈانٹوں گی اگر جو یہ امتحانوں میں میل ہو میں تو۔“ آسیہ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

”نہیں ہوں گی۔“ نیل نے یقین سے کہا اور جیسے ہی وہ دونوں سامنے آئیں۔ قدرے رعب

بولے۔

”کیوں فصول باتوں میں وقت گنوا رہی ہو، کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ اب اگر میں پڑھنے کے لیے کما

آنے لگے گی تمہیں۔“

”مجھے پہلے سے آ رہی ہے۔“ مدیحہ نے فوراً لمبی جمالی۔

”اور تمہیں؟“ نیل نے صاحت کو دیکھا تو وہ سنسنائی۔

”بارہن بچے ہیں نیل بھائی اور صبح کالج بھی جانا ہے پھر بھی اگر آپ کہتے ہیں تو ہم ایک دو گھنٹے

ہم نہیں صرف تم۔“ مدیحہ فوراً ٹوک کر بولی۔ ”میں تو دو منٹ کھڑی نہیں رہ سکتی۔ سخت نیند آ رہی ہے۔

بہن بھائی۔“

”پہلے سن لو کہ کل سے تم دونوں کو ٹھیک نو بجے میرے کمرے میں موجود ہونا ہے کتابوں سمیت۔

پڑانے۔“ ان کی سخت تنبیہ پر دونوں نے فوراً اثبات میں سر ہلایا تھا۔

♥ ♥ ♥ ♥

آسیہ نے اباجی کے سامنے اپنے پارٹمنٹ میں شفٹ ہونے کی تجویز رکھی تو نہ صرف انہوں نے بلکہ عدیل

نے بھی مسترد کر دی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ آسیہ کو ہم نے ایک بار اس گھر سے رخصت کیا تھا اگر دوبارہ گھر

نے پر تانا ہو تو ہم پھر اسی طرح رخصت کر سکتے تھے لیکن اس طرح اس گھر سے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں

ہوگا اور آسیہ میں یوں بھی من مانی کی عادت نہیں تھی۔ اس نے شروع سے اپنے حق میں والدین اور بھائیوں

نے لڑنے کو تسلیم کیا تھا۔ اگر خود سے کوئی فیصلہ کیا بھی تو اس میں والدین کی رضامندی شامل تھی۔ اس لیے بھی

نیل اس سے ناراض نہیں ہوا۔ سب خوش تھے۔ اور سب کی خوشی میں وہ پتا نہیں خوش تھی کہ نہیں لیکن یہ

مذہب تھا کہ اس کے دل پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ بہر حال جب یہ طے ہو گیا کہ اسے یہیں رہنا ہے تب اس نے اپنے

زیرک دم میں ایک بیزر کھوا کر وہ عدیل بھائی کی دونوں بیٹیوں نمرو اور روبی کے حوالے کر دیا تھا۔

واقعت مدیحہ ان دونوں کے پاس بیٹھی ادھر ادھر کی بات کر رہی تھی کہ نیل بھائی دروازے میں آکر پکار کر

مدیحہ کو بلا رہا تھا۔

”مدیحہ نے وال کاک کی تلاش میں سرگھا گھا کر چاروں اور نظر دوڑائی پھر اپنی خالی کلائی

نے کر کے بولی۔ ”سوری نیل بھائی میرے پاس گھڑی نہیں ہے ایسا کریں لابی میں سامنے کاک ہے وہاں

کر۔“

مدیحہ چکا ہوں۔ چلو اٹھو۔ کتابیں لے کر میرے کمرے میں جاؤ۔“ وہ اس کے انجان بننے کو یکسر نظر انداز کر

گئی۔ میں تو بھول ہی گئی تھی۔ آپ چلیں۔ میں ابھی آتی ہوں۔ بس دو منٹ ٹھہرے۔“

”تو کہیں نہیں جا رہی۔ تم اس سے دو منٹ نہیں دو گھنٹے باتیں کرنا لیکن پڑھنے کے بعد۔ چلو اٹھو۔“ وہ ذرہ

رعایت دینے کو تیار نہیں ہوئے تو وہ اٹھتی ہوئی ٹھہرے بولی۔

”بہت ظالم ہیں یہ۔ ان سے کبھی دوستی نہیں کرنا۔“

نیل خاموش کھڑے رہے اور جب وہ بڑبڑاتی ہوئی ان کے قریب سے نکل گئی تب وہ ٹھہر اور روبی کو دیکھ کر

راستے

تھیں آپ کو بھی پڑھاؤں گا لیکن جب آپ کا ایڈمیشن ہو جائے گا تب۔“

”بہن! یہاں تو نہیں ہوں گے نیل بھائی۔“ روبی نے کہا۔

”میں ابھی ہو۔ میں وہیں آ جاؤں گا۔ اوکے۔“

”کہہ کر جیسے ہی پتے ان کی اسٹک کارٹ میں الجھ کر یا تھ سے نکل گئی اور اس سے پہلے کہ وہ جھک کر اٹھاتے

اس نے تیزی سے آکر اسٹک اٹھا کر انہیں تھمائی تھی جس سے ان کا چہرہ پیکا پڑ گیا۔ شاید اس طرح کی

دہائیوں محرومی کا احساس دلاتی تھی بہت کوشش سے وہ شکر یہ کہہ کر اپنے کمرے میں آئے تو مدیحہ جانے

کی بات نہ صاحت سے الجھ رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر ایک دم خاموش ہو گئی اور جب وہ بیٹھ گئی تب کہنے لگی۔

”آج ایک سی وقت میں ہم دونوں کو نہیں پڑھا سکتے نیل بھائی۔ کیونکہ ہمارے سبجیکٹ الگ الگ ہیں۔“

انہوں نے ہاتھ بنا کر لاؤ۔“

انہوں نے بڑے آرام سے صبا کو بھیج کر مدیحہ کے سامنے کتاب کھول دی تھی۔ اور ان کا ارادہ پورے دو گھنٹے

عمر نے اچھے بھلے شعر کی آخر میں ریڑھ لگا دی۔ جس پر سب بے ساختہ ہنسے لیکن صبا کو بالکل اچھا نہیں لگا۔  
 ”عمر! یہ ایسے نہیں کرو۔ ٹھیک سے سنو۔“  
 ”ٹھیک ہے اچھا۔ ٹھیک سے سنو۔“  
 اچالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دے  
 نجانے کس کھلی میں کتوں سے پیلا پڑا جائے  
 ”بس کریں“ صبا حجت چڑی۔ جس سے اس کی شاعری سے وابستگی ظاہر ہو رہی تھی۔  
 نبیل نے کچھ حیران ہو کر اسے دیکھا پھر مسکرائے تھے۔

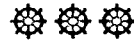


فکلی بھائی کی اسلام آباد سے آمد کا مقصد ایک تو عدل سے ملاقات دوسرے اپنے بیٹے اشعر کے لیے سونیا کو  
 لانا تھا۔ کہہ لو کہ ابھی اشعر اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہوا تھا لیکن ادھر سونیا گریجویشن کر چکی تھی اور کیونکہ فکلی بھائی  
 ریسا بھائی کا پہلے سے ارادہ تھا اسے ہونٹانے کا اس لیے انہوں نے ابھی بات کر لینی مناسب سمجھی تاکہ اور کوئی  
 بول نہ ہو تو اسے صاف منع کر دیا جائے۔ یوں بھی پہلا حق قریبی رشتوں کا ہی ہوتا ہے۔ جب فکلی بھائی نے اپنی  
 انہیں کا اظہار کیا تو خصوصاً اماں جی اور اباجی بہت خوش ہوئے۔ کیونکہ ماں باپ کی یہ دلی آرزو ہوتی ہے کہ ان  
 باولاد آپس میں ایک دوسرے کا خیال رکھنے اور محبت کرنے والی ہوں۔ بہر حال طے یہ پایا کہ ابھی منگنی کر دی جائے  
 رہاں دو سال بعد جب اشعر اپنے پیروں پر کھڑا ہو تب شادی ہوگی۔  
 منگنی کی باقاعدہ تقریب کی کوئی ایسی ضرورت نہیں تھی کیونکہ گھر کی بات تھی لیکن اتنے عرصے بعد اباجی کی  
 ادنیٰ اولاد آپس اکٹھی ہونی تھی تو انہوں نے باقاعدہ تقریب کا کہہ کر سب میں پھیل چادی تھی۔ کیونکہ وقت کم  
 اور روز بعد فکلی بھائی کو واپس جانا تھا۔ اور ایک دن میں سارا انتظام۔ لڑکے باہر کے کاموں میں اور لڑکیاں گھر  
 رہاں پھر رہی تھیں۔ شام سے پہلے سب کام ہو گئے اس کے بعد سب کو اپنی اپنی تیاری کی فکر۔  
 ”صبا! تمہارے پاس ایسا دپٹہ ہے۔“ ”تو یہ پریل کٹر کا سوٹ لیے صبا حجت کے پاس آکر پوچھنے لگی تو وہ جواب دے  
 ”ہاں! یہ پریل کر رہی تھی۔“ ”چھوڑ کر سوچنے کھڑی ہوئی۔“  
 ”ایسا دپٹہ ہاں مدحو کے پاس ہو گا۔ اس سے لے لو۔“  
 ”ماں! بعد خود؟“  
 ”ابھی تو نہیں تھی۔ اچھا ٹھہرو، میں دیتی ہوں۔“ اس نے جلدی جلدی اپنے کپڑوں پر استری پھیری پھر پلنگ  
 تل کر ڈپٹہ سے سوٹ لے کر الماری میں اس کا ہم رنگ دپٹہ تلاش کرنے لگی۔  
 ”صبا! میرے پڑے استری ہو گئے۔“ ”مدحہ غالباً“ بیڑھیاں پھلا لٹی ہوئی آئی تھی۔ سانس پھول رہی تھی۔  
 ”ہاں! اس نے الماری کے اندر سے جواب دیا۔“ ”وہاں رکھے ہیں لے لو۔“  
 ”کم کیا تلاش کر رہی ہو؟“ ”مدحہ نے پوچھا۔  
 ”تو یہ دپٹہ نکال کر پٹی پھر ڈپٹہ سے پوچھنے لگی۔“ ”استری کر دوں؟“  
 ”میں میں کر لوں گی“ ”شکریہ“ اس کے ہاتھ سے دپٹہ اور کپڑے لے کر چلی گئی۔ تو اس نے مدحہ کو دیکھا  
 ”اچھا! کس بات پر ہنسے لگی تھی۔“  
 ”کم کیل بس رہی ہو؟“ ”اس نے پوچھا۔  
 ”وہ! تم بھائی پتا ہے کیا کہہ رہے ہیں تمہارے؟ وہ بھی اشعر بھائی کے ہم عمر ہیں اس لیے ان کی منگنی بھی ہونی چاہیے۔  
 ”تو یہ سناں جی سے اچھ رہے ہیں۔“ ”مدحہ نے اسی طرح ہنسنے ہوئے بتایا۔  
 ”واضح رہے ویسے کہ تو ٹھیک رہے ہیں۔ جب اشعر بھائی کی ہو رہی ہے تو ان کی بھی ہونی چاہیے۔“ ”صبا حجت نے  
 ”تو تو خود غلو حیرت کے بعد سنجیدگی سے کہا۔  
 ”تو تو تمہاری کی کہہ رہی ہو۔“ ”مدحہ نے یوں سر جھکا جیسے واقعہ ہو۔

رہنا ہے کا تھا لیکن اس سے پہلے ہی احمر سونیا، عمر اور ثوبیہ نے آکر ان کے کمرے پر دھاوا بول دیا۔ وہ سب  
 کچھ دیر تم لوگ تمہارا روٹی تکیاں بٹھو لیکن عمر جا کر ان دونوں کو بھی ادھر ہی لے آیا تھا۔  
 ”آپ لوگ ذرا پہلے آجاتے۔“ ”مدحہ جلدی جلدی کتابیں سمیٹتی ہوئی بولی۔  
 ”ہمیں کیا پتا تھا کہ یہاں تم پر ظلم ہو رہا ہے پھر بھی دعا میں دو ہمیں کہ جلدی چھٹی ہو گئی۔“ ”احمر، ہم  
 برابر بیٹھتا ہوا ہوا۔  
 ”اصل میں نبیل بھائی! صبح چھٹی ہے ناں۔ اور ہاں فکلی بچا آ رہے ہیں کل فیملی کے ساتھ۔ اب  
 آیا تھا۔“ ”عمر نے بتایا تو مدحہ کچھ افسوس سے بولی۔  
 ”کل کیوں آ رہے ہیں۔ ہمارے امتحانوں کے بعد آتے تب میں فارغ ہوتی تو ان کے ساتھ اسلام  
 ایمان سے مجھے بہت شوق ہے۔ اسلام آباد، مری سوات وغیرہ جانے گا۔“  
 ”لاؤ ہاتھ دکھاؤ، اسلام آباد جانے کی لکیر ہے کہ نہیں۔“ ”عمر نے اس کی کلائی جھپٹتے ہوئے کہا تو سب  
 ہنسے۔  
 ”آپ کو ہاتھ دیکھنا آتا ہے عمر بھائی؟“ ”روٹی نے بہت شوق سے پوچھا۔  
 ”سارے کام آتے ہیں اسے۔“ ”عمر سے پہلے مدحہ اس کی تعریف میں شروع ہو گئی۔“ ”لیکن آج تک  
 ایک کام بھی نہیں کیونکہ ایک تو بے چارے کو بھولنے کی عادت ہے، دوسرے گھر سے نکلتے ہی اس کی  
 جاتی ہے۔ کبھی اس کے ساتھ کہیں جانے کی غلطی مت کرنا۔ تمہیں راستہ ہی میں کہیں چھوڑ آئے گا۔“  
 ”یہ۔ یہ۔ سراسر بے ایمانی ہے مدحو۔“ ”عمر نے احتجاج کیا۔“ ”روٹی! اس کا یقین نہیں کرنا یہ  
 ہے۔“  
 ”ہاں یہ بھی جھوٹ ہے کہ۔“ ”مدحہ کوئی واقعہ سنانے جاری تھی کہ وہ چیخ پڑا۔  
 ”بس چپ ہو جاؤ۔“  
 ”اوں ہوں!“ ”نبیل نے ٹوکا۔“ ”چلاؤ نہیں عمر! اور مدحہ یہ کیا حرکت ہے؟“  
 ”میں کوئی جھوٹ ٹھوڑی بول رہی ہوں اور آہستہ آہستہ تمہارا اور روٹی بھی جان جائیں گی مدحہ عمر کو  
 تو اس نے یوں منہ پر ہاتھ پھیرا جیسے جھوڑوں کا نہیں تمہیں۔  
 ”ایک بات بتاؤ۔“ ”عمر نے مدحہ کو اپنی طرف متوجہ کیا۔“ ”تمہیں اور صبا کو ایک جیسی شکل کی بد  
 پر ابلم بھی ہوتی ہے۔“  
 ”ہمیں کیوں ہوگی پر ابلم؟ دوسروں کو ہوتی ہے۔“ ”صبا حجت نے فوراً کہا تو مدحہ اسے دیکھ کر بولی۔  
 ”کیوں ہمیں نہیں ہوتی کیا۔“ ”پھر عمر سے کہنے لگی۔“ ”پہلے اسکول میں اور اب کالج میں بھی لڑکیاں  
 ہیں۔ روک روک کر پوچھتی ہیں۔ سنو تم مدحہ ہو کہ صبا حجت۔ خواہ مخواہ میں ہی نہ کوئی لڑکی اور بات کرنا  
 کوئی کام ہوتا ہے بس یہی پوچھیں گی۔“  
 ”تمہاری غلطی ہے ناں۔ تم اگر صبا حجت جیسا قتل بنانا چھوڑ دو تو کوئی بھی نہیں پوچھے گا۔“ ”سونیا۔  
 انگوٹھے سے اپنا نال منٹائی ہوئی بولی۔  
 ”میں ہمیشہ تو نہیں لگتی۔“  
 ”یہ کیا اصول باتیں لے بیٹھی ہو تم لوگ۔“ ”احمر ٹوکتے ہوئے بولا۔“ ”نبیل بھائی بھی پورے ہیں  
 ”میں ابھی یورپ دور کرتا ہوں۔“ ”نبیل بھائی ایک شعر منیے۔“ ”عمر فوراً ”موڈ میں آ گیا۔“ ”اجازت  
 ”ارشاد۔ ارشاد! لڑکیوں نے کورس میں کہا۔  
 ”وہ کیا ہے کہ ہاں۔“

انہی راستوں نے جن پر کبھی تم تھے ساتھ میرے  
 مجھے روک روک پوچھا ابے کدھر جا رہا ہے

”ٹھیک کہہ رہی ہوں۔“  
 ”مگر تم ٹھیک کہہ رہی ہو تو پھر نیل بھائی کیوں خاموش ہیں۔ احتجاج تو انہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ بڑے ہیں۔ پہلے ان کی ہونی چاہیے لیکن ان سے شادی کون کرے گا وہ تو لنگ۔“  
 صباحت نے فوراً ”مدیجہ کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ کیونکہ وہ آسیہ کے ساتھ نیل کو اندر آتے ہر تھک۔  
 نیل کا چہرہ یکبارگی سیاہ پڑ گیا تھا۔ اور آسیہ نے انتہائی غصے میں مدیجہ کی طرف قدم بڑھائے تھے۔  
 ”اوں اول۔“ مدیجہ نے جھٹک کر صباحت کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے ہٹایا اور جیسے ہی پٹی آسیہ کوڑ گئی۔  
 ”دیکھا کہہ رہی تھیں تم؟“ آسیہ کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے اور غالباً ”اسے مار دے اٹھایا تھا کہ عقب سے نیل نے اس کی کلائی تھام لی۔  
 ”نہیں پھوپھو!“



”چھوڑو نیل! میں اس کی زبان کاٹ دوں گی۔“ آسیہ اپنی کلائی چترانے کی سعی کرتے ہوئے بولا  
 ”پھوپھو پلیر! آپ کو میری قسم۔“ نیل نے فوراً ”اپنی قسم دی جس سے آسیہ کے کھولنے دوہرا تھی۔  
 ”آپے چلیں اپنے کمرے میں چلیں۔“  
 آسیہ مدیجہ کو گھورتی ہوئی فوراً ”کمرے سے نکل گئی تو صباحت کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ نیل کوڑ سے معذرت کرے یا پہلے مدیجہ کو دیکھے جو آسیہ کے جاتے ہی بیڈ پر اوندھی گر گئی تھی۔ خود کو انتہائی محسوس کرتے ہوئے اس نے بے بسی سے نیل کو دیکھا تو انہوں نے مسکرا کر مدیجہ کی طرف اشارہ کیا پھر تھام کر چلے گئے۔  
 ”مسنو حوا! اگر تم اپنی غلطی پر نادم ہو کر رو رہی ہو تب تو ٹھیک ہے؟“  
 اس نے مدیجہ کو مخاطب کر کے اسی قدر کہا تھا کہ وہ جھٹکتے سے سیدھی ہو کر بولی۔  
 ”کوئی غلطی کی ہے میں نے جس پر نادم ہو کر روں گی۔“  
 ”ایک تو تم اپنی غلطی بھی تسلیم نہیں کر سکتی، آخر چھوڑو۔ اس وقت ہم اس بحث میں نہیں پڑتے۔  
 سے تیار ہو جاؤ۔ پھر نیچے چلتے ہیں۔“ اس نے موقع کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے کہا۔  
 ”میں کوئی تار نہیں ہو رہی اور نہ نیچے جاؤں گی۔“ مدیجہ ضدی لمبے لمبے میں کستی دوبارہ اوندھی ہو گئی۔  
 ”دیکھو خوشی کا موقع ہے۔ اس طرح مت کرو۔ بہت بری بات ہے۔ چلو اٹھو۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑا  
 اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ کچھ لمبی جلی آوازوں نے اس کی توجہ مبغض کی۔  
 ”سب لوگ یہاں آ رہے ہیں کیا؟“ وہ مدیجہ کو چھوڑ کر کمرے سے نکل کر آئی تو دیکھا۔ میونہ کے کمرے میں داخل ہو رہی تھیں اور ان سے پہلے پتا نہیں کون کون اندر گیا تھا۔  
 ”ہاں جی!“ اس نے بے ساختہ پکارا۔ اور میونہ بھابھی کے پلٹ کر دیکھنے پر پوچھا۔ ”کون آیا ہے؟“  
 ”کوئی نہیں۔“ میونہ بھابھی نے کہا اور آسیہ کے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا تو اسے لگا۔ کچھ دیروں کھڑی اپنے آپ قیاس کرتی رہی پھر نیل سے پوچھنے کے ارادے سے ان کے کمرے کہ وہ اسے دیکھتے ہی کہنے لگے۔  
 ”نہیں معذرت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں مدیجہ کی نادانیوں کا برا نہیں مانتا۔“

”جی ہاں آپ نادانی کہہ رہے ہیں نیل بھائی! آخر اس وقت میں اس کی طرف سے معذرت کرنے نہیں آئی۔  
 جی ہاں آپ نے آئی ہوں کہ ماما کے کمرے میں کیا ہو رہا ہے۔“  
 ”جی ہاں آپ نے؟“ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں نیل نے الناس سے پوچھا۔  
 ”جی نہیں پتا۔“ میں نے ابھی ماما جی کو جاتے ہوئے دیکھا ہے اور بھی پتا نہیں کون کون ہے اور انہوں نے  
 ”جی ہاں نہ کر لیا ہے۔“  
 ”اس میں بریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ ہوگی کوئی ایسی بات جو بچوں کے سامنے کرنے کی نہیں ہوگی۔“  
 ”اس نے کچھ انداز میں کہہ کر گویا اسے تسلی دی۔  
 ”نیل بھائی! مجھے تو کوئی گنہگار مسئلہ لگتا ہے۔ آپ جا کر معلوم کریں ناں۔“ اس نے بے صبری کا مظاہرہ  
 ”جی ہاں اور دروازے تک آکر نیل سے بولیں۔“  
 ”ہاں! ماما کو آسیہ بی بی بلارہی ہیں۔“  
 ”کمال ہوا! اپنے کمرے میں؟“ اس نے فوراً ”بوا سے پوچھا تو نیل ٹوک کر بولے۔  
 ”جا! سنیں کیا ہو رہا ہے۔ جاؤ نیچے سو نیا وغیرہ کے پاس جاؤ۔“  
 پھر اسے ساتھ لیے ہوئے کمرے سے نکلے اور آسیہ کے دروازے پر رک کر اسے آگے جانے کا اشارہ کیا تو وہ  
 ”تم! اگر تم نے اسے ملتا ہوا! احمر رک کر غور سے اسے دیکھنے لگا تو عقب سے عمر شرارت سے بولا۔  
 ”بڑے بھائی! پہلے تصدیق کر لیجئے۔“  
 ”وہی کر رہا ہوں۔“ احمر پہلے بے دھیانی میں بولا۔ پھر ایک دم سٹپٹا گیا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟ میں کیا پچانتا  
 میں ہوں۔ یہ صابے صابیری بی بی ہیں۔“  
 ”بی بی! سن! تمہاری بی بی! سن! کہاں ہے؟“ عمر نے اس کے قریب آکر مدیجہ کے بارے میں پوچھا تو وہ جو  
 ”دونوں کی باتوں پر حیران ہو رہی تھی اسی عالم میں بولی۔  
 ”وہ دروہی ہے۔“  
 ”ہاں! یہ روئے کا کون سا وقت ہے، مطابعا موقع ہے۔ کچھ دیر پہلے تو یہاں ٹھیک ٹھاک کھڑی تھی۔ پھر کیا  
 ہوا۔“  
 عمر پوچھ اس سے رہا تھا اور دیکھ احمر کو رہا تھا جسے مدیجہ کے رونے کا سبب وہی ہو۔  
 ”کس وہ۔“ ماما نے ذرا سا ڈانٹ دیا تو وہ رونے لگی اور یہ آپ دونوں اتنے بوکھلائے ہوئے کیوں ہیں۔“ وہ باری  
 باری دونوں کو دیکھنے لگی۔  
 ”میں نیل صرف احمر بھائی۔ بے چارے بڑے صبر آزمائے حالت سے گزر رہے ہیں اس لیے کچھ بوکھلا گئے  
 ہیں۔“ عمر نے کہا تو اسے ایک دم مدیجہ کی بات یاد آئی۔ جتنے ہوئے بولی۔  
 ”ہاں! مدیجہ جی! آپ بھی متکلیف کرنا چاہتے ہیں۔“  
 ”کیا اس نے یہ نہیں بتایا ہو گا کہ یہ اسی سے کرنا چاہتے ہیں۔“ عمر نے فوراً ”کہا تو خوشگوار حیرت کے باعث  
 اس کا پورا منہ چل گیا۔  
 ”مسنو! کو! ماما جی! چل جائے گی! اور جلدی سے بتاؤ کیا طے پایا؟“ عمر نے ٹوک کر پوچھا۔  
 ”تو کیا ماما کے کمرے میں ہی طے پا رہا ہے۔ مجھے نہیں پتا۔ میں ابھی معلوم کرتی ہوں۔“  
 ”تو تیزی سے چلی اور دو دو سیڑھیاں پھلا عتی ہوئی اور آئی تو آسیہ کے کمرے کے بند دروازے پر بس ایک لحظہ کو  
 رک پڑا۔ کمرے میں آئی اور اوندھی بڑی مدیجہ کے برابر کرتے ہوئے بولی۔  
 ”مسنو! احمر بھائی! اپنی بات منوانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ یعنی اشعر بھائی کے ساتھ ان کی متکلیف کا پروگرام بھی  
 سب پا رہا ہے۔“



”میں کیا کروں؟“ مدیحہ کا غصہ اور ناراضگی ابھی تک کم نہیں ہوئی تھی۔  
 ”ہاں تمہیں کیا کرنا ہے۔ تم تو بڑے آرام سے دلمن بن کر بیٹھ جاؤ گی۔“ اس نے کہا تو مدیحہ اکیڑ کر کے اسے دیکھنے لگی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“  
 ”مطلب یہ کہ تمہارے کمرے میں سب جمع ہیں اور نیچے احمر بھائی بے چارے بڑی بے صبری سے انتظار میں کہ ماما کیا فیصلہ کرتی ہیں۔“  
 اس نے شرر مسکراہٹ کے ساتھ بتایا تو مدیحہ کے چہرے پر نہ صرف رنگ اترے بلکہ وہ گھبرا بھی کیونکہ ابھی وہ عمر کے اس حصے میں داخل ہوئی تھی جہاں پہلی دستک ہر حال میں اثر دکھائی ہے اور دستک بڑی زوردار تھی۔ پتا نہیں احمر کب سے اس کے بارے میں اس انداز سے سوچنے لگا تھا۔ اس پر تو نہیں کیا تھا یا ہو سکتا ہے وہ نہ سمجھی ہو۔

”سنو۔ کبھی احمر بھائی نے تم سے۔“ بات ابھی صباحت کے ہونٹوں میں تھی کہ وہ فوراً ”نفی مر بولی۔“

”نہیں۔ مجھ سے کبھی کچھ نہیں کہا انہوں نے۔“  
 ”پھر تو بڑے جیسے رسم ہیں۔ ممکن ہی ہو جائے پھر پوچھوں گی ان سے۔ ارے یہ تو ماما جی کی آواز ہے سب لوگ نیچے جا رہے ہیں۔ چلو تم جلدی سے اٹھ جاؤ کیونکہ ماما اب ادھر ہی آئیں گی۔“  
 صباحت آوازوں پر کان لگا کر جلدی جلدی بولتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تو مدیحہ بھی فوراً ”اٹھ کرواؤ بند ہو گئی۔“  
 کچھ دیر بعد آسیہ ان کے کمرے میں آئی اور ادھر ادھر دیکھنے کے بعد اس سے پوچھنے لگی۔

”مدحو کہاں ہے؟“  
 ”واش روم میں۔“ اس نے بتایا اور بے اختیار ہنسنے لگی۔ ”ماما! شادی کر رہی ہیں؟“

”شادی نہیں انجیجیجیجی احمر کے ساتھ۔ مدحو کو بتا دو اور اسے تیار کر کے نیچے سونیا کے پاس لے جا کرو۔ سمیہ کو بلا لو وہ اسے تیار کر دے گی، تم اپنا حلیہ ٹھیک کرو۔ اس وقت سے کیا کر رہی تھیں۔“ آؤ نے اسے ٹوکا تو وہ کچھ سٹپٹا گئی۔

”وہ ماما۔ میں مدحو کا موڈ ٹھیک کر رہی تھی۔ اس وقت آپ نے ڈانٹا تھا تو وہ رو رہی تھی۔“  
 ”اچھا ٹھیک ہے۔ میں سمیہ کو بھیجتی ہوں۔“ آسیہ چلی گئی تو اس نے پہلے واش روم کا دروازہ بجا جلدی نمائے گا ماما پھر الماری کھول کر اس کے لیے دوسرے کپڑوں کا انتخاب کرنے لگی۔

\*~\*~\*

رات بہت دیر تک خاصا بے لگام رہا تھا۔ تین بجے کے قریب سب اپنے اپنے کمروں میں گئے تھے۔ آگے کے آغاز پر بے حد خاموشی تھی۔ آسیہ نے خود ہی اپنے لیے چائے بنائی اور گلیے ہوئے بیٹیوں کے آگے۔

وہ دونوں بے خبر سو رہی تھیں اور آسیہ کا انہیں اٹھانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ بس دیکھنے چلی آئی رات مدیحہ کی منگنی کر کے جہاں وہ خوش تھی وہاں اس کے اندر عجیب سی بے چینی سما گئی تھی۔ شاید زندگی کی ناکامی نے اسے خائف کر دیا تھا۔ حالانکہ احمر اس کے سامنے پروان چڑھا تھا۔ بہت مختصر کا وار لڑکا جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ بہت ترقی کرے گا، پھر کوئی غیر بھی نہیں تھا۔ یعنی موزوں اس کے باوجود اگر وہ مکمل اطمینان سے نہیں ہو رہی تھی تو یہ یقیناً اس کے اپنے اندر کا خود برسا برس کی گرد بھی دھندلانے میں ناکام رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ بیٹیوں کی ماں تھی۔

میں چائے ختم ہونے تک وہ وہیں کھڑی چپ چاپ۔ دونوں کو دیکھتی رہی پھر اسی خاموشی سے ان کے کمرے میں آئی۔ نیل کو جاتے دیکھ کر آہستہ آواز میں پکار کر پوچھنے لگی۔

”ہاں! ماں جا رہے ہو؟“  
 ”آپ کو ہی دیکھنے جا رہا تھا۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔  
 ”ماں! میں پوچھ رہی تھی۔ سمجھائیے گی ہیں۔ ابھی تو نہیں۔“  
 ”نیل! وہاں دو اور صاحبہ بھی رہتی تھیں۔ ابھی تو نہیں۔“  
 ”نیل! وہاں دو اور صاحبہ بھی رہتی تھیں۔ ابھی تو نہیں۔“  
 ”نیل! وہاں دو اور صاحبہ بھی رہتی تھیں۔ ابھی تو نہیں۔“

”نیل! وہاں دو اور صاحبہ بھی رہتی تھیں۔ ابھی تو نہیں۔“  
 ”نیل! وہاں دو اور صاحبہ بھی رہتی تھیں۔ ابھی تو نہیں۔“  
 ”نیل! وہاں دو اور صاحبہ بھی رہتی تھیں۔ ابھی تو نہیں۔“

”نیل! وہاں دو اور صاحبہ بھی رہتی تھیں۔ ابھی تو نہیں۔“  
 ”نیل! وہاں دو اور صاحبہ بھی رہتی تھیں۔ ابھی تو نہیں۔“  
 ”نیل! وہاں دو اور صاحبہ بھی رہتی تھیں۔ ابھی تو نہیں۔“

”نیل! وہاں دو اور صاحبہ بھی رہتی تھیں۔ ابھی تو نہیں۔“  
 ”نیل! وہاں دو اور صاحبہ بھی رہتی تھیں۔ ابھی تو نہیں۔“  
 ”نیل! وہاں دو اور صاحبہ بھی رہتی تھیں۔ ابھی تو نہیں۔“

”نیل! وہاں دو اور صاحبہ بھی رہتی تھیں۔ ابھی تو نہیں۔“  
 ”نیل! وہاں دو اور صاحبہ بھی رہتی تھیں۔ ابھی تو نہیں۔“  
 ”نیل! وہاں دو اور صاحبہ بھی رہتی تھیں۔ ابھی تو نہیں۔“

”نیل! وہاں دو اور صاحبہ بھی رہتی تھیں۔ ابھی تو نہیں۔“  
 ”نیل! وہاں دو اور صاحبہ بھی رہتی تھیں۔ ابھی تو نہیں۔“  
 ”نیل! وہاں دو اور صاحبہ بھی رہتی تھیں۔ ابھی تو نہیں۔“

”نیل! وہاں دو اور صاحبہ بھی رہتی تھیں۔ ابھی تو نہیں۔“  
 ”نیل! وہاں دو اور صاحبہ بھی رہتی تھیں۔ ابھی تو نہیں۔“  
 ”نیل! وہاں دو اور صاحبہ بھی رہتی تھیں۔ ابھی تو نہیں۔“

”نیل! وہاں دو اور صاحبہ بھی رہتی تھیں۔ ابھی تو نہیں۔“  
 ”نیل! وہاں دو اور صاحبہ بھی رہتی تھیں۔ ابھی تو نہیں۔“  
 ”نیل! وہاں دو اور صاحبہ بھی رہتی تھیں۔ ابھی تو نہیں۔“

”نیل! وہاں دو اور صاحبہ بھی رہتی تھیں۔ ابھی تو نہیں۔“  
 ”نیل! وہاں دو اور صاحبہ بھی رہتی تھیں۔ ابھی تو نہیں۔“  
 ”نیل! وہاں دو اور صاحبہ بھی رہتی تھیں۔ ابھی تو نہیں۔“

”نیل! وہاں دو اور صاحبہ بھی رہتی تھیں۔ ابھی تو نہیں۔“  
 ”نیل! وہاں دو اور صاحبہ بھی رہتی تھیں۔ ابھی تو نہیں۔“  
 ”نیل! وہاں دو اور صاحبہ بھی رہتی تھیں۔ ابھی تو نہیں۔“

”نیل! وہاں دو اور صاحبہ بھی رہتی تھیں۔ ابھی تو نہیں۔“  
 ”نیل! وہاں دو اور صاحبہ بھی رہتی تھیں۔ ابھی تو نہیں۔“  
 ”نیل! وہاں دو اور صاحبہ بھی رہتی تھیں۔ ابھی تو نہیں۔“



”جی۔ آپ سب خوش رہتے رہیں۔ بہت رونق ہوگی۔“ عمر نے اپنے تئیں سمیٹا کر مشکل سے نکالا لیکن

لے آئیں گے۔ بچوں کی دلچسپیاں ہوں گی۔ ہم کیا کریں گے۔“  
 ”جناب صرف چھوٹے بچوں کے لیے نہیں اسی سال تک کے بچوں کے لیے تفریح ہی تفریح ہے۔  
 بھائی؟“ عمر نے تصدیق کے لیے نیل کو دکھا تو انہوں نے مسکرا کر یوں کندھے اچکائے جیسے  
 سکتے۔

”آپ بھی نیل بھائی! بس ایسے ہی ہیں۔ ہاں کہہ دینے میں کیا حرج تھا۔“ عمر ناراضگی سے کہہ  
 جا بیٹھا۔  
 ”ارے یہ تو بالکل بچوں کی طرح روٹھ کر بیٹھ گیا ہے۔“ سمیٹا سے دیکھ کر ہنسی۔

”مجھ ہی ہے۔“ نیل کے لیے ابھی بھی وہ چھوٹا سا عمر تھا۔  
 ”نا عمر تم نے نیل بھائی تمہیں بچہ کہہ رہے ہیں۔“ صباحت نے اسے متوجہ کر کے کہا تو وہ  
 ”انہیں اپنے سامنے سب بچے لگتے ہیں۔ کبھی اباجی کے ساتھ بیٹھے دیکھا ہے انہیں ان سے  
 شفقت سے پیش آرہے ہوتے ہیں۔“

سب کی بے ساختہ ہنسی میں نیل جھینپ کر رہ گئے تھے۔ یوں ہنسی مذاق میں وہیں بیٹھے اتنی دیر  
 اور جانے سے نیل نے منع کر دیا اور سیدھا گھر کی راہ لی۔  
 میمونہ بھابھی، سیما بھابھی اور یاسمین کھانا تیار کر چکی تھیں اور اماں جی، اباجی کے ساتھ۔  
 کو بھی کھلا چکی تھیں۔ البتہ خود ان سب کے انتظار میں تھیں۔ آسیہ کلینک سے لوٹی تو وہ بھی وہ  
 وہیں برآمدہ میں بیٹھ گئی تھی۔  
 ”آسیہ! مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میرا ایک اور بیٹا نہیں ہے۔“ سیما بھابھی نے اچانک آسیہ کو  
 تو اس نے کچھ تعجب سے دیکھا۔  
 ”کیوں؟“

”تم سے صباحت مانگتی۔“ سیما بھابھی کے لہجے میں صباحت کے لیے بڑا پیار تھا۔  
 ”اچھا! وہ ذرا سانس لی۔ پھر کہنے لگی۔“ آپ نے اور یاسمین نے بھی بس دو بچوں پر اکتفا کر  
 تمہیں بیٹے کی خواہش نہیں تھی جو تمہیں مزید بچے پیدا کرنے پر اکساتی۔“  
 ”مجھے تو بھی لیکن شاید عدل کو نہیں تھی۔ خیر البتہ کا شکر ہے۔ بیٹیاں بھی بڑی نعمت ہیں۔  
 ہیں۔“ یاسمین نے کہا تو سب تائید میں سر ہلانے لگی تھیں۔  
 تب ہی باہر گاڑی رکنے کے ساتھ سب کی آوازیں آنے لگیں اور کچھ دیر بعد ساری رونق اپنا  
 پورے آئین میں ہنسی قہقہے گونجنے لگی۔ میمونہ بھابھی نے بمشکل اٹھتے ہوئے سب کو خاموش  
 ”جلدی سب ہاتھ منہ دھو کر آؤ۔ میں کھانا لگا رہی ہوں۔ تم لوگوں کے انتظار میں ہم۔“  
 ”آسیہ! تم بھی نہیں رکتا۔“

”تمہیں بھابھی! اب کھانا بنا چکی ہوں گی۔“ آسیہ فوراً کھڑی ہو گئی۔ ”چلو نیل! مدعو! صبا اور  
 ”جی ماما! چلیں۔“ مدحیہ اور صباحت فوراً ”سیڑھیاں پھلانگ گئیں۔ آسیہ نیل کے ساتھ  
 ”کہاں کہاں گئے تم لوگ؟“ ”کھانے کی نیل بھی نہیں آئی۔ آسیہ نے باری باری متوں کو دیکھ کر پوچھا۔  
 ”بس ساحل پر۔ اس کے بعد سمیٹا کی خواہش بھی نہیں اور جانے کی، لیکن دیر ہو گئی تھی۔“  
 آگئے۔“ صباحت نے بتایا۔

”پریشان تو نہیں کیا تھا نیل! ان دونوں نے تمہیں؟“ آسیہ نے نیل سے پوچھا تو مدحیہ فو  
 ”غما! آپ کو ہمیشہ یہ خیال کیوں آتا ہے کہ ہم نیل بھائی کو پریشان کرتے ہوں گے۔“

لے کہ تم پریشان کرتی ہو اور نیل نے کبھی مجھے خود سے نہیں بتایا۔ میں پوچھوں گی جب بھی منع کر دے  
 ن کی تم دونوں کے ساتھ محبت ہے۔ جو تمہاری بد تمیزیوں میں نہ صرف خود انور کر رہا ہے بلکہ مجھ سے بھی

”میں مصروف رہ کر سرسری انداز میں بول رہی تھی۔ یعنی اس وقت کسی تنبیہ یا لیکچر دینے کا کوئی  
 کھانے میں سرسری انداز نے ہی مدحیہ کو مزید کچھ کہنے سے باز رکھا تھا۔

\*~\*~\*

بھائی اپنے اہل و عیال کے ساتھ اسلام آباد چلے گئے تو گھر کی رونق میں کچھ کمی ہوئی تھی اور زیادہ کی اس  
 جب عدل بھائی الگ گھر لے کر وہاں شفٹ ہو گئے۔ گو کہ ان کا گھر زیادہ دور نہیں تھا پھر بھی یہ گھر بہر حال  
 لگنے لگا تھا۔ حالانکہ وہ تین چار مہینے ہی یہاں رہے تھے۔ لیکن ان کا جانا سب کو ہی محسوس ہو رہا تھا۔  
 نیل حسب معمول مدحیہ اور صباحت کو پڑھانے بیٹھے تو دونوں کے چروں پر بے زاری دیکھ کر پوچھنے

بات ہے پوچھ بھونے کسی بات پر ڈانٹا ہے تم دونوں کو؟۔“

”ہاں تو۔“ دونوں ایک ساتھ بولی تھیں۔

”یہ روٹی خشک تین بنا کر یوں پیچھی ہو؟۔“

نیل بھائی، عمر اور روٹی چلی گئی ہیں ناں۔ ان کے بغیر سارا دن ہم بہت بور ہوئے۔ ایمان سے بالکل اچھا  
 رہا۔ پڑھنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا۔“ صباحت نے سب بتا کر اپنے سامنے کتاب بھی بند کر دی۔  
 یہ کچھ خاموشی محسوس ہو رہی ہے ان کے جانے سے۔ خیر کچھ دن کی بات ہے پھر پہلے کی طرح لگنے لگے  
 نہیں نے خاموشی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

بس جب پہلے کی طرح لگنے لگا تو تب پڑھیں گے۔“ صباحت نے صرف کتاب بند کی تھی مدحیہ فوراً کتابیں  
 کا رکھ کھڑی ہوئی۔ ”نیکھ ہے ناں نیل بھائی! ابھی کچھ سمجھ میں بھی نہیں آئے گا پھر آپ کیوں اپنی

پڑ جاؤ آرام سے۔“ نیل ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ ”پتا ہے امتحان کب سے ہیں۔ فیل ہو جاؤ گی تو تم سے  
 پوچھو میری کلاس لیس گی۔“

یہ بڑبڑاتی ہوئی دوبارہ بیٹھ گئی تو صباحت نے جلدی سے اپنی کتاب کھول لی۔

آج میں تمہیں شاہ عبداللطیف بھٹائی پر ایک مضمون لکھواؤں گا کتاب رکھو اور دونوں پین سنہالو۔“  
 ہوں نے باری باری دونوں کو دیکھ کر کہا پھر اپنی ڈائری کھول کر اس میں جانے کیا تلاش کرنے لگے تھے کہ مدحیہ  
 نہیں پکا رہا۔  
 ”نیل بھائی!“

”ہوں۔“ انہوں نے بہت مصروف انداز میں جواب دیا تھا۔

آپ نے شاہ سکندر کو دیکھا ہے۔“ مدحیہ کو غالباً ”شاہ“ کے ساتھ شاہ سکندر حیات کا خیال آیا تھا۔ بس  
 میں ایک شاہ ہی تو مشترک تھا اور نیل نے بھی اپنی مصروفیت میں بس شاہ ہی سنا اس لیے بڑے آرام سے

”میں ان کے مزار پر کبھی نہیں گیا۔“

”خیر مدحیہ اور صباحت کو جیسے شک آگیا تھا۔ ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دونوں تقریباً“ سکتے  
 ”خیر۔“ مدحیہ نے بعد نیل ڈائری بند کر کے ان کی طرف متوجہ ہوئے تو حیران ہو کر نیل پر ہاتھ مار کر بولے۔  
 ”دونوں کو کیا ہوا ہے۔ صبا! اوھر دیکھو! کیا بات ہے؟۔“ صباحت نے گم صم انداز میں انہیں دیکھا پھر نیل  
 ”خیر! کوئی تو انہوں نے پریشان ہو کر مدحیہ سے پوچھا۔“

”کیا ہوا ہے اسے؟“  
”نکتے ظالم ہیں آپ لوگ۔ سب جانتے ہیں اور ہم دونوں سے چھپاتے ہیں۔“ مدحیہ پھٹ پڑی۔

”کیوں چھپایا ہم سے؟“  
”کیا کہہ رہی تہ کیا چھپایا تم سے۔“ نیل کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

”یہی کہہ ہم دونوں سیکم ہو چکی ہیں۔ ہمارا باپ۔۔۔“  
”شٹ اپ مدحوایہ فضول کو اس کس نے تم سے؟“ وہ قدرے سختی سے ٹوک کر بولے۔  
”آپ۔۔۔ ابھی آپ ہی نے تو کہا ہے کہ آپ ان کے مزار پر کبھی نہیں گئے۔ دیکھیے نیل بھائی ہم نے نہیں چھپائے ورنہ میں ابھی جا کر ماما سے پوچھوں گی۔“ مدحیہ ان کے سخت لہجے سے خائف ہوئے بغیر بولنے لگی تھی۔ نیل نے کچھ دیر غور کیا پھر ساری بات سمجھ کر کہنے لگے۔

”بہت نکمی ہو تم دونوں۔ پتا نہیں دھیان کہاں رہتا ہے۔ میں شاہ بھائی کی بات کر رہا تھا اور یہ تمہاری حیات کو درمیان میں کہاں سے لے آئیں۔“

”تو کیا شاہ سکندر زندہ ہیں؟“ مدحیہ نے خوش ہو کر کہا تو صحبت بھی جلدی سے آنسو پونچھ کر بیٹھی۔

”میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“ انہوں نے کہہ کر فوراً ”موضوع بدل دیا۔“  
”چلو آج تم دونوں کا واقعی بڑھنے کا مژدہ نہیں ہے۔ اٹھاؤ کتابیں اور کل سے پوری تیاری کے ساتھ بنو“ بالکل نہیں۔ جب تک آپ میری بات کا جواب نہیں دیں گے میں کل تو کیا ابھی نہیں پڑھوں گی۔  
ضدی لہجے میں بولی۔

”کون سی بات کا جواب چاہتی ہو؟“ انہوں نے مدحیہ سے پوچھنے کے ساتھ ایک نظر صحبت کو اشارے سے اسے منع کر رہی تھی لیکن وہ باز نہیں آئی۔

”میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ آپ نے شاہ سکندر کو دیکھا ہے یعنی ہمارے پاپا کو؟“  
”ہاں۔ لیکن مجھے وہ ٹھیک طرح سے یاد نہیں ہیں یعنی اگر اب ابھی سامنا ہو جائے تو شاید میں انہیں سکوں گا یا ہو سکتا ہے پہچان بھی لوں۔“ نیل نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا پھر باری باری دونوں کو پوچھا۔ ”بس یا کچھ اور۔“

”اور اگر آپ کو ان کا اپنا معلوم ہو تو وہ بتا دیں۔“ مدحیہ نے کہا تو وہ کچھ ٹھنک سے گئے۔  
”نہیں۔ مجھے نہیں معلوم اور شاید یہاں کسی کو بھی معلوم نہیں ہو گا۔ کیونکہ جس اپارٹمنٹ میں ان تھے وہ انہوں نے پھوپھو کے نام کر دیا تھا۔ اس کے بعد جب تعلق ختم ہو گیا تو پھر ظاہر سے کسی کو ان کا کرنے سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔“ نیل نے بہت سنبھل کر دونوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔  
”انہیں تو معلوم ہے ناں کہ ہم یہاں رہتے ہیں پھر انہوں نے ہم سے ملنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ سوال مدحیہ اٹھا رہی تھی۔ جبکہ صحبت بالکل خاموش تھی لیکن چہرہ بتا رہا تھا کہ اندر سے وہ بھی اتنی ہے۔

”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ جب انہیں کبھی تمہارا خیال نہیں آیا تو تم بھی ان میں مت سوچو۔ اگر وہ فیئر ہوتے تو پھوپھو خود تمہیں ان کے بارے میں بتاتیں اور اب تمہیں پھوپھو چاہیے۔ تمہارے لیے سب کچھ وہی ہیں، خود میرے لیے بھی وہ میرے ماں باپ سے بڑھ کر ہیں۔ بہت محبت سے انہوں نے ہم تینوں کی تیاری کی ہے۔ ہمیں ایسی کوئی بات نہیں کرنی چاہیے جس سے انہو۔ سمجھ رہی ہوں ناں؟“

بہت نرمی سے سمجھاتے ہوئے انہوں نے دونوں کو تنبیہ بھی کی اور ان کے سر جھکانے پر اٹھے ہو ”چلو جاؤ اب سونے کی تیاری کرو۔ صبح کالج بھی جانا ہو گا اور سن لو، کل سے پڑھنے کے اوقات میں مدحیہ

”نیل۔۔۔ اپنی کتابیں سنبھالیں اور انہیں شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں آگئیں۔“  
”بے ہیں نیل بھائی! لاٹ آف کر کے بیڈ پر لیٹتے ہی مدحیہ نے نیل کو جھٹلانا شروع کر دیا۔“ انہیں پایا۔  
”نیل۔۔۔ لیکن صاف مکر گئے۔“

”شٹ اپ نیل بھائی جیسو نے نہیں ہیں، بلکہ تمہارا دماغ خراب ہے جو ان سے ہمیشہ شکاں رہتی ہو۔“  
”بہت برا کا تھا۔ انتہائی ناگواری سے بولی۔  
”بات بتاؤ صابا! تمہارا بھجہ سے زیادہ قریبی رشتہ ہے یا نیل بھائی سے؟“ مدحیہ سلگ کر اٹھ بیٹھی۔  
”نیل سے ایک سا ہے۔ تم بہن اور وہ بھائی۔“

”نیل سے ایک سا ہے۔ تم بہن اور وہ بھائی۔“  
”نیل سے ایک سا ہے۔ تم بہن اور وہ بھائی۔“

”نیل سے ایک سا ہے۔ تم بہن اور وہ بھائی۔“  
”نیل سے ایک سا ہے۔ تم بہن اور وہ بھائی۔“

”نیل سے ایک سا ہے۔ تم بہن اور وہ بھائی۔“  
”نیل سے ایک سا ہے۔ تم بہن اور وہ بھائی۔“

”نیل سے ایک سا ہے۔ تم بہن اور وہ بھائی۔“  
”نیل سے ایک سا ہے۔ تم بہن اور وہ بھائی۔“

”نیل سے ایک سا ہے۔ تم بہن اور وہ بھائی۔“  
”نیل سے ایک سا ہے۔ تم بہن اور وہ بھائی۔“

”نیل سے ایک سا ہے۔ تم بہن اور وہ بھائی۔“  
”نیل سے ایک سا ہے۔ تم بہن اور وہ بھائی۔“

ساہوکر صحبت کو پکارنے لگا تو وہ ہنسی روک کر بولی۔

”صبا نیچے ہی ہے۔ ابھی ماما کے ساتھ تو اتری تھی۔“

”اور نیل بھائی کہاں ہیں؟“ احمر نے گردن موڑ کر نیل کے طرف کی کھلی کھڑکی سے اندر کرتے ہوئے پوچھا۔

”وہ غالباً“ بڑے ماموں کی طرف گئے ہیں۔ آپ چائے پیئیں گے؟“ اس نے جواب کے ساتھ ”ضرور پیوں گا۔ تم بناؤ گی؟“

”نہیں بوا!“ اس کے ساتھ ہی اس نے بوا کو پکار کر چائے کا کما پھرا سے دیکھ کر بولی۔ ”وہ بتا رہی تھیں کہ آپ ایم اے کے لیے باہر جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔“

”ہاں۔ دعا کرو۔ اس کا رشپ مل جائے۔“ احمر نے سامنے نیل پر ٹانگیں سیدھی کرتے ہوئے بولی۔

”میری دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔“

”دل سے مانگو گی تو ضرور قبول ہوں گی۔ اب یہ مت کہہ دینا کہ تمہارے پاس دل ہی نہیں اچانک اسے ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ کچھ نروس سی ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔“

”میں چائے لاتی ہوں۔“

”بوائے آئیں گی، تم بیٹھو۔“ احمر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھایا تھا کہ اسی وقت بوا چائے نے فوراً نیل پر سے ٹانگیں ہٹالیں اور بوا کے ہاتھ سے ٹرے لے کر نیل پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

”کب کس کے لیے ہے۔ بوا! آپ بھی پیئیں گی؟“

”نہیں۔ میں تو صبا کے لیے لاتی تھی۔“ بوا نے صحبت کی تلاش میں اوہرا اوہر دیکھتے ہوئے کہ ”صبا نیچے ہے اماں جی کے پاس۔ چلیں آپ پی لیں۔ اس کے آنے تک تو ٹھنڈی ہو جائے ایک کپ اٹھا کر بوا کو تھما دیا اور ان کے جانے کے بعد پناکپ اٹھاتے ہوئے بولی۔

”ایک بات پوچھوں احمر! سچ بتائیں گے؟“

”ہوں۔“ احمر چائے کا سب لے کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”آپ نے صبا کا انتخاب کیوں نہیں کیا۔ میرا مطلب ہے سب لوگ اسے زیادہ پسند کرتے سونیا جی تبھی اسی کے گن گاتی ہیں۔ حالانکہ ہماری شکلیں ایک جیسی ہیں لیکن اسے زیادہ پیار

نے اس کے بجائے۔“ اس نے غالباً شروع سے یہ بات کھٹک رہی تھی اور اب پوچھتے ہوئے کچھ ”تمہاری بات ٹھیک ہے۔“ احمر اس کا مطلب سمجھ کر خاصے محفوظ انداز میں گویا ہوا۔

”سب صبا سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو اس کی عادات ہیں۔ صلح جو، فرمانبردار، لحاظ کرنے والی۔ دوسری بڑی وجہ اس کا ہر ایک پر جان چھوڑنا ہے۔ بالکل نیل بھائی کی طرح“

”کیوں؟“ اس کے چہرے پر قدرے الجھن کے آثار نمودار ہوئے۔

”اس لیے کہ اس کے اندر ہم سب کے لیے محبت کا ایک ہی رنگ ہے۔ کچھ شفیق سا، کچھ بچی لگتی ہے اور کبھی ہماری آپا جان بن جاتی ہے۔ تو بدلے میں ہمارے دلوں میں اس کے لیے ایہ اس سے ہٹ کر اس کے بارے میں کچھ اور نہیں سوچا جاسکتا۔ کم از کم میں اور عمر بھی نہیں لیے وہ بالکل ثوبیہ کی طرح ہے۔“

احمر نے پوری ایمان داری سے وضاحت کر کے اسے دیکھا تو اس نے گہری سانس کے ساتھ اکتفا کیا پھر اٹھ کر گرل کے پاس جا کھڑی ہوئی اور نیچے جھانکنے لگی۔

”سنو، نیل بھائی کب تنگ آئیں گے؟“ احمر نے اسے متوجہ کر کے پوچھا۔

”نہیں۔ صبا سے پوچھ لیں، شاید اسے بتا کر گئے ہوں۔“ اس نے کما پھر آگے آکر ٹرے اٹھاتے ہوئے بولی۔

”بوا! آرتی ہے۔ میرا خیال ہے، بچپن میں بوا سے بات کر رہی ہے۔ میں بھیجتی ہوں اسے۔“

”میں بھی چل رہا ہوں۔“ احمر اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑا۔

”بچپن کے دروازے میں کھڑی تھی۔ مدیہ کے ساتھ احمر کو دیکھ کر پہلے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔ پھر بے عصبے پوچھنے لگی۔“

”نیل بھائی کیا کر رہے ہیں؟“

”میرے یہاں آنے پر پابندی ہے یا مدحو سے بات کرنے پر۔“ احمر نے اس کی چوٹی کھینچتے ہوئے کہا۔

”نیل خبر پابندی تو کسی بات پر نہیں ہے۔ البتہ نیچے بتا کر آیا کریں کہ کہاں جارہے ہیں۔ ماما جی اس وقت سناں ایک ہی جملہ بول رہی ہیں کہ احمر کو ابھی تو میں نے یہیں دیکھا تھا کہاں گیا۔“ صحبت نے کہا تو وہ سر

ہزبے بولا۔

”ابھی بس۔ ان کے سامنے تو میں بیڑھیاں چڑھا تھا۔ خیر یہ بتاؤ نیل بھائی کب آئیں گے؟“

”وہ تو بچے آنے کا کہہ گئے تھے لیکن میں ابھی فون کر رہی ہوں انہیں کہ جلدی آئیں آپ کو بھی کوئی کام ہے۔“ صحبت کی بات سن کر مدیہ اس سے پوچھنے لگی۔

”نہیں کیا کام ہے؟“

”ہاں تو میں بس۔“ صحبت نے اسی قدر کہا تھا کہ احمر غلت میں بولا۔

”فک ہے ماما! میں فون کرو تو کہنا۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔“

”کچھ بات ہے۔“ صحبت جانے کس بات پر خوش ہو رہی تھی۔ احمر کو جاتے ہوئے دیکھا پھر لابی میں آکر پہلے کے کینک کے نمبر ڈائل کیے تو دوسری طرف سسٹر نے ریسور اٹھایا تھا۔

”سر! میں صبا ہوں۔ ماما سے کہیں۔ دو منٹ میری بات سن لیں۔“ چند لمحوں بعد آسیہ کی آواز آئی تھی۔

”ہاں صبا! کیا بات ہے بیٹا؟“

”لڈنڈو ماما! وہ خوشی سے کھٹکتی آواز میں بولی۔“ ابھی نیل بھائی کا اپنا منٹ لے لیا تھا۔ اتفاق سے میں نے

یو پیاتے اور ابھی کسی کو نہیں بتایا۔ میں نیل بھائی کو سر پر اتار دینا چاہتی ہوں۔ سب کے سامنے اور سلیویشن مانتے۔ لیکن ماما! بوا کہہ رہی ہیں ان کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ میں کیک وغیرہ کہاں سے منگواؤں۔“

”تو تمہیں پیسے چاہئیں؟“ آسیہ نے اس کی ساری بات سن کر پوچھا۔

”جی۔“

”کیا کرو، میری الماری سے لے لو۔ چابی کارنر کی دراز میں ہوگی اور سنو المٹی سیدھی چیزیں مت منگوا لینا۔“

”نیل کا انتظام کریں۔“

”میرے مصروفیت کی وجہ سے بہت عجلت میں بات ختم کر کے سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس نے

سامنے کے گھر فون کر کے نیل بھائی کو فوراً آنے کو کہا۔ وہ پوچھتے رہ گئے۔ ”خیریت۔“ ”خیریت۔“

”سب خیریت ہے۔ بس آپ آجائیں۔“ اس نے کہہ کر ریسور رکھ دیا اور وہیں سے مدیہ کو پکارا تو اس کی آواز

سے آئی تھی۔

”میں یہاں ہوں۔“

”سنو! جو! وہ کمرے میں آکر اس سے بولی۔“ ہم ایک پارٹی ارینج کر رہے ہیں۔“

”کیوں؟“ مدیہ نے وارڈ روب بند کر کے اسے دیکھا۔

”میں اور تم۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں بتاؤں گی کیونکہ تم اسی وقت سب میں ڈھنڈورا پیٹ دو گی جبکہ میں

پڑھ رہی ہوں۔“ اس نے کہا تو مدیہ تنگ کر بولی۔

”میں نے اپنے ساتھ کیوں شامل کر رہی ہو۔ اکیلی ارینجمنٹ کرو۔“

”افوہ! تم بہت جلدی برامان جاتی ہو۔ اچھا میں تمہیں بتا دوں گی پہلے نیچے جا کر سب سے کہہ دو کہ وہ اور آجائیں۔ میں جب تک پیسے نکال لوں۔“ اس نے فوراً ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا اور جانے لگی۔

”سنو! کیا کھانے کا انتظام کرو گی؟“

”نہیں تمہانا تو سب جلدی کھا لیتے ہیں نو بجے۔ ہم چائے کے ساتھ کچھ لوازمات رکھیں گے۔ کیلکے بس تم جلدی سے کہہ دو پھر ان چیزوں کی لسٹ بنا کر ہاؤس میں گواہ لیں گے۔“

وہ کہتی ہوئی مدیہ کے ساتھ کمرے سے نکلی تو اسے بھیج کر خود آسیہ کے کمرے میں آگئی اور بیڈ کے سے چالی نکال کر الماری کھول لی۔ آسیہ کی الماری کھولنے کا یہ پہلا موقع نہیں تھا البتہ اس کی سیفیم ہاتھ ڈال رہی تھی۔ ایک طرف زیورات کے مٹھلیں ڈبے ایک دوسرے کے اوپر بچے تھے۔ دوسری طرف ٹیک بیچے سی اس نے سیف کے اندر کھول کر ایک پانچ سو کا نوٹ نکالا تھا کہ اس کے ساتھ ایک تصویر ہاتھ میں آگئی۔ جس پر نظر پڑتے ہی اس کا دل بڑی زور زور سے دھڑکنے لگا۔ فوراً ”تصویر دوپٹے میں الماری بند کر کے کچھ بدحواسی کے عالم میں کمرے سے نکلی تو آگے نیل سے ٹکرائی۔

”خیال سے۔“ نیل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر غالباً ”خود کو سارا دیا تھا۔ پھر اسے دیکھ کر پوچھا۔

”کیا بات ہے۔ اس قدر گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟“

”کچھ نہیں۔ میں ماما کے کمرے میں پیسے لینے گئی تھی۔ خود انہوں نے کہا تھا۔ اصل میں۔ میں وہ بھلا لے گئی۔“

”ایک منٹ میرے ساتھ آؤ۔“ نیل اسے نوک کر اپنے کمرے میں لے گئے۔ اور بٹھانے کے بعد بولے۔

”تم نے کبھی مجھ سے کوئی بات نہیں چھپائی نہ کبھی جھوٹ بولا۔“

”میں ابھی بھی میں چھپا رہی۔ بس یہ۔۔۔“ اس نے فوراً ”دوبٹے میں سے نکال کر تصویر نیل کر دی۔

”میں نے جان بوجھ کر نہیں نکالی۔ روپے لیتے ہوئے یہ خود خود میرے ہاتھ میں آئی تھی۔“

نیل کی نظریں تصویر پر تھیں۔ اس کی بات کے جواب میں کچھ نہیں بولے نہ ہی اسے دیکھنا سمجھی۔

”میرا یقین کریں نیل بھائی! میں سچ کہہ رہی ہوں۔ ماما کی اجازت سے میں نے ان کی الماری کھلا پیسے لیتے ہوئے یہ۔“

نیل نے آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے دیکھا۔ تو اس نے سر جھکا لیا پھر قدرے انہیں پکار کر اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

”نیل بھائی! یہ ماما کے ساتھ پایا ہیں ناں؟“

”ہیں۔“ نیل جو کہ پھر ذرا سائنات میں سرہلا کر بولے۔ ”جاؤ یہ جہاں سے اٹھائی ہے اسے نو آؤ۔ ورنہ اگر پھو پھو کو معلوم ہو گیا تو وہ بہت ناراض ہوں گی۔“

”پہلے مدعو کو دکھا دو پھر رکھ دوں گی۔“ اس نے کہا تو نیل نے اس کے ہاتھ سے تصویر جھین لی۔

”انہم اچھی لڑکی ہو۔“ نیل مطمئن ہو کر مسکرائے۔

”بچے اسے دین رکھ دوں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

جس شاہاش جلدی کرو۔“ نیل نے تصویر اسے تھمائی تھی کہ مدیہ کی آواز آنے لگی۔

”نیل! اب اس نے سب سے کہہ دیا ہے۔ اب بتاؤ کیا کرتا ہے۔ کہاں ہو تم؟“ مدیہ غالباً ”اپنے کمرے میں“

نیل نے جواب اسی طرف آ رہی تھی۔

”نیل نے گھبرا کر پہلے اپنے ہاتھ میں تصویر اور پھر نیل کو دیکھا تھا۔

”بے وقوف لڑکی!“ نیل نے اس کے ہاتھ سے تصویر لے کر اپنے ٹیکے کے نیچے کھکا دی پھر اٹھ کر اس کے

”نیل! اب اس نے سب سے کہہ دیا ہے۔ اب بتاؤ کیا کرتا ہے۔ کہاں ہو تم؟“ مدیہ غالباً ”اپنے کمرے میں“

نیل نے گھبرا کر پہلے اپنے ہاتھ میں تصویر اور پھر نیل کو دیکھا تھا۔

”بے وقوف لڑکی!“ نیل نے اس کے ہاتھ سے تصویر لے کر اپنے ٹیکے کے نیچے کھکا دی پھر اٹھ کر اس کے

”نیل! اب اس نے سب سے کہہ دیا ہے۔ اب بتاؤ کیا کرتا ہے۔ کہاں ہو تم؟“ مدیہ غالباً ”اپنے کمرے میں“

نیل نے گھبرا کر پہلے اپنے ہاتھ میں تصویر اور پھر نیل کو دیکھا تھا۔

”بے وقوف لڑکی!“ نیل نے اس کے ہاتھ سے تصویر لے کر اپنے ٹیکے کے نیچے کھکا دی پھر اٹھ کر اس کے

”نیل! اب اس نے سب سے کہہ دیا ہے۔ اب بتاؤ کیا کرتا ہے۔ کہاں ہو تم؟“ مدیہ غالباً ”اپنے کمرے میں“

نیل نے گھبرا کر پہلے اپنے ہاتھ میں تصویر اور پھر نیل کو دیکھا تھا۔

”بے وقوف لڑکی!“ نیل نے اس کے ہاتھ سے تصویر لے کر اپنے ٹیکے کے نیچے کھکا دی پھر اٹھ کر اس کے

”نیل! اب اس نے سب سے کہہ دیا ہے۔ اب بتاؤ کیا کرتا ہے۔ کہاں ہو تم؟“ مدیہ غالباً ”اپنے کمرے میں“

نیل نے گھبرا کر پہلے اپنے ہاتھ میں تصویر اور پھر نیل کو دیکھا تھا۔

ہوئے کہا۔  
 ”۲۰ نئی جلدی میں تو یہ نہیں ہو سکتا تھا۔ خیر پھر کسی دن ان کے لیے بھی کوئی پروگرام رکھ لیں گے“ مہاجر  
 نمکونہ پلیٹ درمیان میں رکھتے ہوئے کہا۔  
 ”اس پروگرام میں ایک نئی خوش خبری ہونی چاہیے، یعنی نیل بھائی نے ایک عدد لڑکی پسند کر لیا۔  
 شرارت سے نیل کو دیکھا لیکن انہوں نے سنجیدگی سے ڈانٹ دیا۔  
 ”فضول بکواس نہیں کرو۔“  
 ”یہ فضول بکواس نہیں ہے نیل بھائی! عمر بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ پتا ہے اماں جی ہر وقت کیا دعا کرتی ہیں  
 صباحت عمر کی تائید میں بولنے لگی تھی کہ وہ ٹوک کراٹھ کھڑے ہوئے۔  
 ”بس میں نے سب سن لیا ہے۔ اب تم لوگ چاہو تو محفل جمائے رکھو۔ میں سونے جا رہا ہوں کیونکہ مج  
 اٹھنا ہے۔“  
 ”آپ کے بغیر محفل کیا جے گی۔ ہم بھی چلتے ہیں۔“ حرم بھی اٹھ گیا تو باقی سب نے اس کی تقلید کی۔

♥-♥-♥

مدیجہ اور صباحت امتحانوں سے فارغ ہوئیں تو دونوں کپاس کرنے کو کچھ نہیں تھا۔ صباحت تو گھر کے  
 میں دلچسپی لیتی تھی۔ اسے کچھ مطالعے کا شوق بھی تھا۔ کبھی نیل بھائی کوئی کتاب لادیتے بھی رہا  
 منکوا لیتی۔ اس لیے وہ زیادہ بور بھی نہیں ہوتی تھی۔ لیکن مدیجہ کو ایسا کوئی شوق نہیں تھا۔ گھر کے کام کا  
 ہی نہیں چاہتی تھی۔ یہاں تک کہ اسے کمرے کی صفائی بھی اس سے نہیں ہوتی تھی، البتہ کپاس جانے  
 ہوتی تو وہ سب سے پہلے تیار ہوتی تھی، لیکن ان دنوں کپاس جانے کا بھی کوئی پروگرام نہیں بن سکا تھا کیونکہ  
 احمد دونوں کے امتحان قریب تھے۔ وہ نیچے جا کر بھی بور ہوتی تھی۔ اس روز ناشتے کی ٹیبل پر وہ آئیہ سے کئے  
 ”مما! آپ مجھے کچھ دنوں کے لیے ٹھیک ماموں کے پاس اسلام آباد بھیج دیں۔“  
 ”کیوں؟“ آئیہ نے ناشتے سے ہاتھ روک کر اسے یوں دیکھا جیسے اس کا یہ اچانک پروگرام اس کی بے  
 آیا ہو۔

”چھٹیاں ہیں ممما! اور مجھے اسلام آباد دیکھنے کا شوق ہے۔“ اس نے کہہ کر صباحت کو دیکھا کہ شاید وہ  
 ہاں میں ہاں ملائے گی لیکن اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔  
 ”چھٹیاں ہیں تو کچھ گھرداری سیکھو اور جہاں تک شوق کی بات ہے تو سمیجہ کی شادی پر لے چلوں گی۔  
 لینا اسلام آباد۔“

آئیہ نے اس کی بات مانی نہیں تو رد بھی نہیں کی اور اس کی اس حکمت عملی پر وہ برا سامندہ بنا کر بولی۔  
 ”سمیجہ جی کی شادی پتا نہیں کب ہوگی اور اس وقت ممما! ہماری چھٹیاں بھی نہیں ہوں گی۔ آپ  
 ہمیں واپس لے آئیں گی۔“

”تو تم کتنے دن رہنا چاہتی ہو وہاں؟“ آئیہ نے پیشانی میکر کر اسے دیکھا۔  
 ”کم از کم دس دن۔“ وہ آئیہ کی پیشانی کا بل نہیں دیکھ رہی تھی، جب ہی بڑے آرام سے بولی۔  
 صباحت نے بو کھلا کر آئیہ کو دیکھا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔  
 ”تم بھی جانا چاہتی ہو؟“

”جی ممما! ہم دونوں جائیں گے۔“ صباحت سے پہلے مدیجہ بول پڑی۔  
 ”تم خاموش رہو۔ میں صبا سے پوچھ رہی ہوں۔ کیوں صبا؟“ آئیہ نے مدیجہ کو ٹوک کر اسے دیکھا  
 سے بولی۔

”نہیں ممما۔ میں آپ کے ساتھ سمیجہ جی کی شادی میں جاؤں گی۔“  
 ”ہاں یہی مناسب ہے۔ ہم سب سمیجہ کی شادی میں چلیں گے۔“ آئیہ حتمی انداز میں ایک طرح

کرا کے اٹھ کھڑی ہوئی اور جیسے ہی کمرے سے نکلی۔ مدیجہ صباحت پر بگڑ گئی۔  
 ”میں نہیں میری بات سے اختلاف کرنا ضروری تھا۔ جانے کی ہائی بھرتیں تو کیا ہو جاتا۔ آرام سے اسلام آباد

مردم آئے۔“  
 ”ہاں۔ میرے کہنے سے تو مجھے بھیج دیتیں نہیں۔“  
 ”انکل بھیج دیتیں۔ انہوں نے تم سے پوچھا ہی اس لیے تھا۔ میری بات تو وہ کبھی مانتی ہی نہیں۔ تمساری مانتی  
 ”انکل بھیج دیتیں۔ تم دونوں ان کی سگی اولادیں ہونا، میں تو بس۔“  
 ”نیل بھائی صالی کی۔ تم دونوں میں آیا کے جاری تھی کہ نیل ٹوک کر بولے۔

مدیجہ نے میں جو منہ میں آیا کے جاری تھی کہ نیل ٹوک کر بولے۔  
 ”مدیجہ! یہ کیا فضول باتیں کر رہی ہو۔ پھوپھو نے کہا تو سے سمیجہ کی شادی میں لے چلیں گی۔“  
 ”مدیجہ! یہ جائے گا شادی میں، میں تو ہرگز نہیں جاؤں گی۔“ وہ خامسے جارحانہ انداز میں کرسی دھکیلتی کھڑی  
 ”اب ہی جائے گا شادی میں، میں تو صباحت برتن سمیجہ جی ہوتی بولی۔  
 ”آپ اور کمرے سے نکل گئی۔ تو صباحت برتن سمیجہ جی ہوتی بولی۔  
 ”نہج سارا دن میری شامت آتی رہے گی۔ کوئی ایسا طریقہ بتائیں نیل بھائی! جو اس کا موڈ جلد ٹھیک  
 ہو جائے۔“

”ہاں اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔“ نیل کو کالج سے دیر ہو رہی تھی اس لیے اختصار سے کام لیتے اٹھ گئے۔  
 صباحت نے برتن لے جا کر کچن میں رکھے پھر بوا کے کہنے پر آئیہ سے دوپہر کے کھانے کی بابت پوچھنے اس کے  
 کمرے میں آئی تھی کہ اس کے پیچھے میمونہ بھابی پکارتی ہوئی آگئیں۔  
 ”آئیہ بھابی!“ آئیہ نے انہیں پیچھے کا اشارہ کیا تو وہ بجائے میں بولیں۔

”پیچھے نہیں آئی۔ یہ پوچھنے آئی ہوں کہ مدحو اور صباحت کیا کر رہی ہیں؟“  
 ”کچھ نہیں مائی جی! آپ کو کوئی کام ہے تو بتائیں۔“ صباحت نے فوراً ”متوجہ ہو کر کہا۔  
 ”وہ تو یہ کو کالج جانا ہے فارم جمع کروانے۔ سونیا کورات سے کچھ حرارت ہے۔ اگر تمہیں مدحو تو یہ کے ساتھ چلی  
 جاؤ تو یہ اکلے جاتے ہوئے وہ گھبرا رہی ہے۔“ میمونہ بھابی نے کہا تو آئیہ اس سے بولی۔  
 ”تم چلی جاؤ صبا! اور بھابی سونیا کا آب نے مجھے رات میں کیوں نہیں بتایا۔ چلیں، میں دیکھتی ہوں اسے۔“

آئیہ اپنا فرسٹ ایڈ باکس اٹھا کر میمونہ بھابی کے ساتھ نیچے چلی گئی۔  
 صباحت کو تیار ہونے میں پندرہ منٹ لگے۔ اس دوران وہ اپنے آپ بول کر مدیجہ کو سناتی رہی کہ وہ تو یہ کے  
 ساتھ کالج جا رہی ہے۔ اس کا خیال تھا، شاید بوریت سے نکلے کی خاطر وہ بھی ساتھ چلنے کو کہے گی لیکن اس نے کوئی  
 توجہ نہیں دی۔ تب وہ اسے خدا حافظ کہہ کر نیچے آئی تو تو یہ تیار کھڑی تھی۔ وہیں سے اونچی آواز میں اپنے جانے کا  
 ٹاکرہ لڑنا باہر نکل آئیں۔

تو یہ کے لیے کالج نہ تھا۔ لیکن وہ یہاں دو سال مکمل کر چکی تھی اس لیے لائن میں کھڑے ہونے کے بجائے  
 مدیجہ کی آواز میں چلی گئی اور تو یہ کی فیس کے ساتھ فارم جمع کروا کر جلدی فارغ ہو گئی تو تو یہ کہنے لگیں۔  
 ”اب مجھے میری کلاسز بھی دکھا دو تاکہ میں فول بننے سے بچ جاؤں۔“

”ہاں چلو۔ کلاسز کے ساتھ لا سبریری اور کینٹین بھی دکھا دیتی ہوں۔“ وہ کلاسز کا رخ کرتی ہوئی بولی۔ ”ویسے  
 ایک بڑھ مینے کی بات ہے۔ ہمارا رزلٹ آجائے گا تو پھر ہم ساتھ ہی آئیں گی۔“  
 ”لیکن مدیجہ تو کہہ رہی تھی وہ آئرز کرے گی اور اب یونیورسٹی جائے گی۔“ تو یہ نے کہا تو اسے حیرت ہوئی  
 کیونکہ مدیجہ نے اس سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی اور وہ اپنی حیرت چھپا بھی نہیں سکی۔

”جہاں مدحو نے مجھے تو نہیں بتایا۔“  
 ”رات ہی تو بات ہو رہی تھی۔ تم اس وقت اوپر تھیں۔ زبردست بحث ہوئی تھی مدحو اور احمد بھائی میں۔“  
 ”ک بات پر؟“ وہ قدرے الجھ گئی۔  
 ”اسی بات پر۔ مدحو کہہ رہی تھی آئرز کرے گی اور احمد بھائی کا کہنا تھا کہ تمہیں اسی کالج میں گریجویشن کرنا





”اور ماثویہ! ۳ سے اب ٹوپہ کی فکر ستاری تھی۔“  
 ”ڈونٹ وری۔ میں معلوم کرتی ہوں۔“ آسیہ اس کا گل تھیک کر کرے سے نکل گئی تو سر ہلایں  
 جھگوتی ہوئی اس کے سر پر اکھڑی ہوئی۔



جب تک آسیہ کا فون نہیں آگیا۔ میمونہ بھابھی جلے پیر کی لمبی کی طرح چکراتی رہیں کیونکہ اس وقت  
 میں سے کوئی بھی گھر پر نہیں تھا اور وہ پریشان تھیں کہ صبح کے پیچھے کے دوڑا میں۔ ٹوپہ نے بس اتنا  
 وہاں کوئی بیگانہ ہوا ہے جس کی وجہ سے ٹریفک بند ہو گئی ہے۔ قسمت سے ایک بس اتنی جس میں وہ  
 اسے تو سوار کر دیا لیکن خود رہ گئی۔ اور ہنگامے کا سن کر ہی میمونہ بھابھی کے ہوش اڑ گئے تھے۔ سونیا کی  
 بھی ان پر کچھ اثر نہیں ہوا تھا۔ ایک گھنٹہ حقیقتاً ان پر بہت بھاری گزرا تھا۔ جب آسیہ کا فون آیا تو  
 ٹوپہ کی خیریت معلوم کرنے کے ساتھ صبح کی اسے پاس موجودگی کا اطمینان دلایا تب ان کی جان میں  
 شکر کرتی ہوئی سونیا کے پاس آکر بیٹھی تھیں کہ مدیحہ آکر پوچھنے لگی۔  
 ”مامی جی! ابھی تک صبا اور ٹوپہ کالج سے نہیں لوٹیں؟“  
 ”ٹوپہ آگئی ہے اور صبا وہاں سے پھوپھو کے پاس چلی گئی۔“ سونیا نے کہا پھر فوراً ۳ سے ساری صورت  
 تو وہ برا سامنے بنا کر بولی۔

”صبا ایسی ہی پاگل ہے۔ مجھ ہی ہے جو وہ ماما کے پاس پہنچ گئی۔“  
 ”اے حالات میں تم کیا کرتیں۔“ سونیا نے پوچھا۔  
 ”مدیحہ کیلئے اچکا کر گئی۔ اصل میں اس کا موڈ ابھی تک ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ شاید اس لیے کہ رُ  
 پڑی ہوئی تھی۔“  
 ”چلیں امی! اب آپ کھانا کھالیں۔ میرا خیال ہے صبا کے انتظار میں مدحونے بھی نہیں کھایا۔  
 ! چلو تم بھی امی کے ساتھ کھاؤ، عمر اور احمد بھائی تو تہا نہیں کب آئیں گے۔“ سونیا نے کہا تو وہ اٹھتی ہوئی  
 ”مجھے ابھی بھوک نہیں ہے۔“  
 ”کیوں، کھانے کا وقت ہے۔ بھوک کیوں نہیں ہے۔ بیٹھو، میں یہیں لے کر آتی ہوں۔“ میمونہ  
 ٹوکتے ہوئے کہا۔

”نہیں مامی جی! میں سچ کہہ رہی ہوں۔ مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔ آپ کھائیں پلیز۔“ وہ قد  
 سے منع کرتی سونیا کے کمرے سے نکل آئی۔  
 نیپیل سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ وہ ان کے پیچھے ایک ایک سیڑھی پر جیسے سوچ سوچ کر پاؤں رکھ  
 نیپیل کو اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو ٹپٹ گرو کھا اور فوراً ایک طرف ہٹ کر اسے  
 اشارہ کیا لیکن خلاف عادت اس نے آگے جانے سے انکار کر دیا۔  
 ”کیا بات ہے۔ کچھ ناراض ہو؟“ نیپیل کو اچھٹا ہوا۔

”میری ناراضگی کی کسی کو کیا ہوا۔“ وہ روٹھے لہجے میں بولی۔  
 ”کسی کو ہونہ ہو۔ مجھے۔“ نیپیل نے ایک اسٹیپ نیچے آکر اس کا بازو تھما اور اپنے ساتھ ساتھ  
 ہوئے کہنے لگے ”تم یہ کیوں چاہتی ہو کہ تمہارے منہ سے بات نکلے اور فوراً پوری کر دی جائے  
 مجبوری بھی سمجھا کرو۔“  
 ”مما کو کوئی مجبوری نہیں ہے۔“ وہ فوراً بولی۔  
 ”مجبوری صرف پیسے کی نہیں ہوتی اور بہت سی باتیں ہوتی ہیں۔“ وہ اب آنگن کی دھوپ

”تجسس سمجھنا چاہیے۔ اب تم چھوٹی بچی نہیں ہو۔ تمہیں کیس بھیجے سے پہلے پھوپھو کو  
 بٹا دے گا اس کے بعد بھی شاید ہی ان کا دل آمادہ ہو۔“  
 ”وہ صبح سے یہی سوچتی رہی تھی اور حد درجہ شاک تھی۔  
 صرف میرے لیے ان کا دل تنگ ہے اور بس۔“ وہ صبح سے یہی سوچتی رہی تھی اور حد درجہ شاک تھی۔  
 ”نہیں ایسا مت کہو۔ وہ تمہیں بہت چاہتی ہیں، صبا سے بھی زیادہ۔“ انہوں نے بہت نرمی سے اس کے  
 سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ لیکن وہ سخت سے سر جھٹک کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔  
 چنانچہ بددلت صبا نے زہر ب کما تب ہی بوا آکر پوچھنے لگیں۔  
 ”ڈونٹ! نیپیل نے زہر ب کما تب ہی بوا آکر پوچھنے لگیں۔“

”اب تمہارے لیے کھانا لگا دوں؟“  
 ”نہیں! ابھی تو انتظار کر لیتا ہوں۔ پھوپھو آنے والی ہیں۔ ان کے ساتھ ہی کھاؤں گا۔“ وہ گھڑی دیکھ کر  
 ہنسنے لگی۔  
 ”ان دو بچوں نے بھی نہیں کھایا۔“ بوائے نے کہا۔  
 ”نہیں! ابھی تو انتظار میں ہیں۔“ انہیں اچانک صبا کا خیال آیا۔  
 ”وہ صبح سے گئی ہوئی ہے اور شاید اسی کے انتظار میں مدحونے اب تک بھوک بیٹھی ہے۔“ بوائے نے اپنی سمجھ کے  
 مطابق کہا۔  
 ”آسیہ اور صبا کو آتے دیکھ کر سوال ان کے ہونٹوں میں رہ گیا۔  
 ”سلام علیکم نیپیل بھائی! آپ بھی ابھی آرہے ہیں؟“ صبا نے قریب آکر سلام کرنے کے بعد پوچھا۔  
 ”ہاں! اور کم کیا پھوپھو کے ساتھ چلی گئی تھیں؟“  
 ”دیکھو! مجھے مدیحہ کے غصے سے کھرا کر آسیہ کے ساتھ گئی ہوگی، پوچھنے کے انداز سے بھی ظاہر تھا۔ جسے سمجھ کر  
 دت تھی۔“

”میں ٹوپہ کے ساتھ کالج گئی تھی پھر وہاں سے ماما کے پاس چلی گئی۔“  
 ”اچھا! جلدی سے ساتھ منہ دھو لو بوا کھانا لگا دوں۔“ آسیہ ان دونوں کو نوک کر بوا سے کہتی اپنے کمرے میں چلی  
 گئی۔  
 ”صبا کے کمرے میں اتنی توجہ دینے سے دیکھتے ہی تکیے میں منہ چھپا لیا۔  
 ”مجھے دیکھ کر منہ چھپانے کا مطلب؟ میں تمہاری سرال سے تو نہیں اتنی چلو اٹھو بوا کھانا لگا رہی ہیں۔“  
 ”صبا نے اپنا تکیہ اس پر اچھا لیتے ہوئے کہا اور ر کے بغیر دواش روم میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد منہ ہاتھ دھو کر  
 اپنے کمرے میں اسی طرح منہ چھپانے پڑی تھی۔  
 ”کھانا کھالیا کیا تم نے؟“ صبا نے اس کے منہ پر سے تکیہ کھینچ کر پوچھا تو وہ زور سے چیخی۔  
 ”نہیں! کھانا اور نہ کھاؤں گی۔“

”نہیں! بھوک بڑا تال کوئی فائدہ نہیں۔ ابھی راستے میں ممانے مجھے اتنا لبا لیکر دیا ہے اگر تم اس لیکچر سے بچنا  
 انا تو فوراً!“ ”موز ٹھیک کر کے نیپیل پر آجاؤ ورنہ میری تو کھر آنے تک بچت ہو گئی۔ تمہاری شام تک مھچائی ہو  
 ناں کی ہو پھر نہ ممانے میں نے تمہیں خبردار نہیں کیا۔“  
 ”بہارہ تکیہ اس پر پھینک کر کمرے سے نکل گئی۔  
 ”مدیحہ نے ایک بل سوچا پھر فوراً اٹھ گئی تھی۔“

زندگی	میں	ایسے	بھی	لوگ	ہیں
دیکھتے	ہی	آنکھوں	کو	ایتھے	لگتے
آرزو	یہ	ہوتی	ہے	اپنا	کہہ
اسی		لے		تو	سکوں

”یار! تمہارے پاس کوئی اور کیسٹ نہیں ہے۔ صبح سے اسی کو ریو اینڈ کر کر کے من رہے ہو۔“

پک گئے ہیں۔“

عازم نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونسنے ہوئے کہا تو علی نے چونک کر اسے دیکھا پھر کیسٹ اٹھ کر

”سوری مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ تم بھی یہاں موجود ہو۔“

”ایسا اس وقت ہوتا ہے ڈیڑھ گھنٹہ قبل خیال میں کوئی اور ہو۔ کون ہے؟“ آخر میں عازم کے ہونٹوں پر

مسکراہٹ چمکی تھی۔

”ایک تو یہ بڑی مشکل ہے۔ ادھر کوئی بات منہ سے نکلی اور تم نے جھٹ فسانہ بنایا۔“ اس کا ایک

تھوڑا سا دیر سے نظر سے بھی چرا گیا۔

”میرے افسانے بہت جلد حقیقت کا روپ دھار لیتے ہیں۔ یہ تم بھی جانتے ہو عازم جاکر گناہ

زندگی میں ایسے بھی لوگ ملتے ہیں

دیکھتے ہی آنکھوں کو اچھے لگتے ہیں

”اب تمہیں کیا ہوا؟“ اس نے فوراً ٹوکا۔

میں تمہارے افسانے کی حقیقت جاننے کی کوشش کر رہا ہوں اور کسی حد تک جان بھی چکا ہوں۔

میں ایس ڈی ایم کا عمدہ سنبھالا والا شاہ علی جاناگیر کسی کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو چکا ہے اور۔“

”یاس“ اس سے آگے ایک لفظ نہیں۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر عازم کو مزید بولنے سے روکا تو وہ اس

کر سی پیچ کر بیٹھتا ہوا بولا۔

”بولنے دو یار! ابھی تو آغاز کیا ہے۔ انجام کی پتہ نہیں گئی بھی ابھی کروں گا۔“

”اے بھائی۔ میرے آغاز، انجام کو چھوڑو، اپنی فکر کرو۔ بابا جان نے تمہیں جس کام کے لیے بھجایا

شام سے پہلے نمنا دو پھر سکندر چاچا آجائیں گے تو ہو سکتا ہے، تمہیں ان کے ساتھ شاہ پور جانا پڑے

کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بولا تھا۔

”اے خوب یاد دلایا۔ سکندر چاچا کو لینے بھی جانا ہے۔ کتنے بجے ہے ان کی فلائیٹ۔“ عازم ایک

گیا۔

”چھ بجے۔“ اس نے بتایا تو عازم کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگا۔

”میرا خیال ہے۔ سکندر چاچا فوراً شاہ پور نہیں جائیں گے۔ حلف کی تقریب تک انہیں یہیں

احتیاطاً ان کے لیے کرہ سیٹ کروادو اور بابا جان کے لیے بھی کیونکہ حلف کی تقریب میں وہ بھی ضرور

آخر سکندر چاچا منسٹر بننے والے ہیں۔“

”ہوں۔“ وہ پر سوچ انداز میں سر ہلا کر بولا۔ ”یہ سب میں کرلوں گا۔ تم اپنے کام نمٹاؤ۔ میری

چاہ ہے ناں تمہیں۔“

”فوتو“ میرے پاس اپنی پیجیر و ہے۔“ عازم اپنی پیجیر و پر اترا یا در نہ دو مہینے پہلے تک گاڑی کے

خوشامد کرتا تھا۔

”اے تمہاری پیجیر و کو تو میں بھول ہی گیا تھا۔“ وہ ہنسا۔

”تمہارا قصور نہیں ہے۔ جب آنکھوں کو کوئی اچھا لگنے لگے تو تندرہ اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہے۔

اسی موضوع کی طرف آیا تو وہ فوراً ”اٹھ کھڑا ہوا۔“

”میں سوئے جا رہا ہوں، تم جہاں کہیں بھی جاؤ سپانچ بچے لوٹ آنا پھر یہیں سے ساتھ اریو رٹ

”چھی بات ہے اور ہاں سنو۔“ عازم بول بولا جیسے اسے کوئی بہت اہم بات یاد آئی ہو۔

علی جاناگیر پوری طرح متوجہ ہو گیا تھا۔

”وہ جو کوئی نہیں ہے اے میرا سلام کہنا۔“ عازم شرارت سے کہہ کر بھاگتا ہوا بابا ہر نکل گیا تو اس سے

شرارت پھیلی تھی۔

”بہت دیر لگے۔“

”بڑا بڑا اور کچھ دیر سوئے کی غرض سے بیڈ روم میں آیا تو بے تحاشا آنسو بہاتی ہوئی لڑکی کا قصور ساتھ

دور درشت دلوں کی طرح نیند آنے تک وہ اسے سوچتا رہا تھا۔

♥ ♥ ♥ ♥

”اب تمہیں چاہے ہو کیا؟“ صباحت نے میز پر ہاتھ اترتے ہوئے عمر کو غلجٹ میں جاتے دیکھ کر وہیں سے پکار

کر رہا تھا۔

”Under the Neem tree“

”اب تمہیں چاہے ہو کیا؟“ صباحت نے میز پر ہاتھ اترتے ہوئے عمر کو غلجٹ میں جاتے دیکھ کر وہیں سے پکار

کر رہا تھا۔

”اب تمہیں چاہے ہو کیا؟“ صباحت نے میز پر ہاتھ اترتے ہوئے عمر کو غلجٹ میں جاتے دیکھ کر وہیں سے پکار

کر رہا تھا۔

”اب تمہیں چاہے ہو کیا؟“ صباحت نے میز پر ہاتھ اترتے ہوئے عمر کو غلجٹ میں جاتے دیکھ کر وہیں سے پکار

کر رہا تھا۔

”اب تمہیں چاہے ہو کیا؟“ صباحت نے میز پر ہاتھ اترتے ہوئے عمر کو غلجٹ میں جاتے دیکھ کر وہیں سے پکار

کر رہا تھا۔

”اب تمہیں چاہے ہو کیا؟“ صباحت نے میز پر ہاتھ اترتے ہوئے عمر کو غلجٹ میں جاتے دیکھ کر وہیں سے پکار

کر رہا تھا۔

”اب تمہیں چاہے ہو کیا؟“ صباحت نے میز پر ہاتھ اترتے ہوئے عمر کو غلجٹ میں جاتے دیکھ کر وہیں سے پکار

کر رہا تھا۔

”اب تمہیں چاہے ہو کیا؟“ صباحت نے میز پر ہاتھ اترتے ہوئے عمر کو غلجٹ میں جاتے دیکھ کر وہیں سے پکار

کر رہا تھا۔

والپس کرو۔ میں نیل بھائی سے منگوالوں گی۔“ وہ اسے مزید چڑاتا ہوا بھاگ گیا تو وہ بڑبڑاتی ہوئی کہتا ہوا ”نیل بھائی! میں نے اس کے تپے ہوئے چہرے کو دیکھ کر پوچھا ہوں۔“

”کہاں؟“

”ہاں، ہری جانے کی بات کر رہی تھیں تم۔“ انہوں نے کہا تو وہ چونک کر بولی۔

”ہاں، وہ عمر ابھی اپنے کسی کام سے جا رہا تھا۔ کہنے لگا کل لے جاؤں گا۔ کوئی بات نہیں۔ کل ہر ڈسٹرکٹ کے ان کی ٹیبل صاف کرنے لگی۔“

”مگر کہاں ہے؟“ سوڈا ٹھیک ہوا اس کا کہ نہیں؟“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد نیل نے پوچھا۔

”جی اب تو ٹھیک ہے۔ کل اباس جی سے ممائی شکایتیں کر کے دل کی بھڑاس نکال چکی ہے۔“

”پتا ہے کیا کہہ رہی تھی کہ مماس سے بالکل ہمارا نہیں کرتیں۔ اس کی کوئی بات نہیں ہانتی

آپ کی ہر بات مان لیتی ہیں۔ میں نے کہا ہم اس کی طرح ایسی کوئی بات کرتے ہی نہیں ہیں جو نہ

لیے اسے ایسا لگتا ہے کہ مماس ہمارا بات مان رہی ہیں۔ اس پر اس نے مجھے بے نقط سنا لیا۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”اس نے اپنے حیلے پر نظر ڈال کر کہا۔ پھر نیل سے پوچھنے لگی ”آپ کو کچھ منگوانا ہے

نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

”نیل نے کہا۔“ وہ بے وقوف ہے۔“

گلدان۔ کیا قیمت تھی اس کی؟

”نہ بہت زیادہ نہ بہت کم۔ یاد رکھیے گا آج ہی کے دن۔“

وہ دلکش مسکراہٹ کے ساتھ کتا دوکان سے نکل کر جانے کس سمت غائب ہو گیا۔ وہ اس نے گئی۔

”جی بی بی! آپ نے انہیں قیمت ادا کر دی؟“ دوکاندار نے دوبارہ اس کی طرف آکر پوچھا تو وہ بڑا ارادہ اثبات میں سر ہلایا۔

”پھر یہ وہ سراپس آپ کا ہوا۔“ دوکاندار نے جلدی سے ایک گلدان بیک کر کے اس کے سر اٹھاتے ہوئے اچانک خیال آنے پر اس نے پوچھا۔

”کیا پر اس بھی ان کی؟“

”بارہ سو انہوں نے آپ سے۔“

”اتنے ہی لیے ہیں۔“ وہ جلدی سے کہہ کر دوکان سے نکل آئی اور سونیا کی تلاش میں گردن مگر طرف دیکھنے لگی۔ ایک جگہ وہ پرس خریدتی نظر آئی تو وہ تیز قدموں سے اس کے پاس پہنچ کر بولی۔

”مجھے کہاں چھوڑ دیا آپ نے؟“

”میں نے کہاں چھوڑا۔ تم ہی غائب ہو گئیں۔ یہ پرس دیکھو، اچھا ہے ناں۔“ سونیا کا دھیان تھا۔

”جی اور کیا خریدتا ہے۔“ وہ جیسے اب یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔

”بس اور کچھ نہیں۔ سونیا نے پرس کی قیمت ادا کی پھر اسے دیکھ کر بولی۔ ”تم شاید تھک گئی ہو؟“

”نہیں بس اب چلیں۔“ اس نے منع کیا لیکن سونیا نے جیسے سنا ہی نہیں زبردستی اسے آٹس کر رکشہ میں لے کر آئی تھی۔



گھر آتے ہی اس نے سب سے پہلے علی جمائیکر کا دیا ہوا کارڈ الماری میں اپنے کپڑوں کی تولی اس کے بعد اپنی جمع شدہ رقم نکال کر گنتی تو کل چار سو تھے۔ وہ واقعی پریشان ہو گئی کہ بانی آٹھ سو کہ آسید یا نیل سے لینے کا مطلب تھا انہیں ساری بات بتانی پڑی اور جانے کیوں وہ اس شخص کے بار ہوئے ڈر رہی تھی۔ شاید اس کے اندر خوف تھا کہ کہیں اس واقعے کے ساتھ وہ پہلا واقعہ بھی ما

جب وہ اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی تھی۔ گو کہ اس کے دل میں کوئی جو نہیں تھا لیکن کچھ مہما اتنی سخت گہری تھی کہ مجبوری بھی تسلیم نہیں کرتی تھی (یہ اس کا فطری رد عمل تھا) اس لیے اس پہلے اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کلینک کیسے پہنچی۔ بہر حال اب یہ نئی مصیبت گلے بڑ گئی تھی۔ کئی بار چاہا کہ وہ کون سا پیسے لینے یہاں تک آجائے گا لیکن ہر بار اسے وہ اپنے دروازے پر دستک دیتا محسوس

کمری شام سیاہ آچل اوڑھ رہی تھی اور اسے اپنی پریشانی میں لاسٹ جلانے کا خیال ہی اندھیرے میں بیٹھی تھی۔ جب نیل نے دروازے میں آکر پکارا۔

”صبا!“

”جی!“ وہ چونکنے کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں! لاسٹ کیوں نہیں جلائی۔“ انہوں نے کہا اور برہہ کرٹیو لاسٹ کاٹن آن کر دیا تو اس آنکھوں پر رکھ لیے۔

”وہ۔“ نیل بھائی! سر میں درد ہو رہا تھا۔“

”تو مجھ سے کہا ہوتا یا بوا سے وہ چائے ہی بنا دیتیں۔ مدد کو کہاں ہے؟“ انہوں نے قریب آکر۔

نیل نے اپنی تھی وہ توبہ کے ساتھ کیرم کھیل رہی تھی۔ ”اس نے اندر ہی اندر خود کو سرزنش کرتے ہوئے

بہت جلدی لڑی ہے۔ جاتی ہے تو گھنٹوں کے حساب سے وہیں جم جاتی ہے۔ کوئی کام ہو تو بات بھی ہے۔ چلو

بے نیل بوا سے چائے کا ہوتا ہوں۔ کچھ کھانا ہو تو وہ بھی بنا دو۔“

”جی نہیں۔ چائے بھی نہیں پوں گی، آپ کو پینے ہو تو میں بنا دیتی ہوں۔“ وہ نیل کو پریشان ہوتے دیکھ کر

”نہیں۔“ سرکار دیا یہ بھی نہیں ہے کہ میں مریضوں کی طرح لیٹ جاؤں۔“

”نہیں۔“ سرکار دیا یہ بھی نہیں ہے کہ میں مریضوں کی طرح لیٹ جاؤں۔“

”نہیں۔“ سرکار دیا یہ بھی نہیں ہے کہ میں مریضوں کی طرح لیٹ جاؤں۔“

”نہیں۔“ سرکار دیا یہ بھی نہیں ہے کہ میں مریضوں کی طرح لیٹ جاؤں۔“

”نہیں۔“ سرکار دیا یہ بھی نہیں ہے کہ میں مریضوں کی طرح لیٹ جاؤں۔“

”نہیں۔“ سرکار دیا یہ بھی نہیں ہے کہ میں مریضوں کی طرح لیٹ جاؤں۔“

”نہیں۔“ سرکار دیا یہ بھی نہیں ہے کہ میں مریضوں کی طرح لیٹ جاؤں۔“

”نہیں۔“ سرکار دیا یہ بھی نہیں ہے کہ میں مریضوں کی طرح لیٹ جاؤں۔“

”نہیں۔“ سرکار دیا یہ بھی نہیں ہے کہ میں مریضوں کی طرح لیٹ جاؤں۔“

”نہیں۔“ سرکار دیا یہ بھی نہیں ہے کہ میں مریضوں کی طرح لیٹ جاؤں۔“

”نہیں۔“ سرکار دیا یہ بھی نہیں ہے کہ میں مریضوں کی طرح لیٹ جاؤں۔“

”نہیں۔“ سرکار دیا یہ بھی نہیں ہے کہ میں مریضوں کی طرح لیٹ جاؤں۔“

”نہیں۔“ سرکار دیا یہ بھی نہیں ہے کہ میں مریضوں کی طرح لیٹ جاؤں۔“

”نہیں۔“ سرکار دیا یہ بھی نہیں ہے کہ میں مریضوں کی طرح لیٹ جاؤں۔“

میں رہتی ہیں۔“ آخر میں ان کے سوال پر وہ گڑبڑا گئی۔

”جی۔“ وہ کرسی دھکیل کر کھڑی ہوئی تو مدحیہ نے ایک دم خیال آنے پر پوچھا۔

”سنو، تم نے بھی کچھ خریداری کی؟“

”ہاں، نیبل بھائی نے پیسے دیئے تھے میں نے دو سوٹ لے لیے۔ ایک تمہارا، ایک اپنا، کھانا تمہارے بیڈ پر رکھے ہیں۔“ وہ ٹیبلر کربول رہی تھی لیکن انداز سے غلٹ عیاں تھی۔

”تم کہاں بیچے جارہی ہو؟“

”نہیں۔“ اس بار وہ انحصار سے کام لے کر فوراً وہاں سے نکلی اور اپنے کمرے میں آکر مخلصانہ رکھنے کی خاطر کتابوں کا شفاف صاف کرنے کھڑی ہو گئی۔

”کچھ دیر بعد مدحیہ آئی اور شارپ میں سے دونوں سوٹ نکال کر پوچھنے لگی۔

”میرا کون سا ہے؟“

”جو تمہیں پسند آئے، وہی لے لو۔“ وہ اپنے کام میں مصروف ہوئی۔

”اور اگر مجھے دونوں پسند آئیں۔“

”دونوں لے لو۔“ اسے اس وقت کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

”اے ہوئے۔ اتنی فراخ دلی۔“ مدحیہ نے بڑے محفوظ انداز میں نعوں لگایا تب ہی نیبل نے دروازے پر کھڑا ہوا۔

”مدحو! چائے بناؤ گی۔“

”میں۔“ جیسے کوئی بہت برا کام کہا گیا ہو۔ ”ہوا سے کہہ دیں ناں۔“

”جو اگلاں جی نے بلایا ہے۔ ویسے بھی میں چائے کے لیے ان سے نہیں کہتا۔ چلو دو منٹ کے کا گھنٹے بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہری اب۔“

نیبل قدرے رعب سے کہتے وہیں سے پلٹ گئے۔ تو وہ ہڑوانے لگی۔ جس پر صباحت نے اپنا کام ”فضول کو اس بند کرو“ میں جاری ہوں۔“

”چائے بنانے۔“ مدحیہ نے خوش ہو کر پوچھا۔

صباحت نے تاسف سے اسے دیکھا پھر سر جھٹک کر کمرے سے نکل کر کچن کا رخ کیا۔ اور منٹوں کر نیبل کے کمرے میں آئی تو وہ اسے دیکھ کر یوں مسکرائے جیسے انہیں بتا تھا چائے وہی لائے گی۔

”آپ نیبل بھائی! یا تو مدحو سے کام لےنا ہی نہیں کریں یا پھر زبردستی اس سے کروایا کریں کیونکہ؟ کرنا بالکل اچھا نہیں لگتا۔“ وہ ان کے سامنے نیبل پر کپ رہتی ہوئی بولی۔

”اس نے منع تو نہیں کیا تھا۔ خیر، تم اگر کوئی کام نہیں کر رہیں تو یہاں میرے پاس بیٹھو۔“ نیبل کپ اٹھاتے ہوئے کہا تو ان کے پاس بیٹھنے کے بجائے وہ کارپٹ پر لیٹتی ہوئی بولی۔

”نیبل بھائی! میں آپ کے پوچھنے سے پہلے ہی بتا دیتی ہوں کہ میں بہت پریشان ہوں۔ مجھ سے اب ہو گیا ہے۔ جسے پورا کرنے کے لیے میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔“

نیبل نے کتابھی قیاس کیا، یہ نہیں سوچا تھا جو وہ کہہ رہی تھی۔

”میں سوینا جی کے ساتھ بازار گئی تھی ناں وہاں ڈیکوریشن بیسوز دیکھتے ہوئے ایک قیمتی گلدان ہم گر کر ٹوٹ گیا۔ بارہ سو روپے کا تھا اور جو خاتون خرید چکی تھیں انہوں نے مجھ سے اتنی رقم کا مطالبہ میرے پاس ایک پیسہ نہیں تھا اور ابھی بھی صرف چار سو، میں باقی آٹھ سو۔ آپ پلیر ماکو میں بتائے اس نے صرف صنف میں جھوٹ سے کام لیا۔ باقی ساری حقیقت بتا دی تو نیبل کچھ دیر غام

دیکھتے رہے پھر کہنے لگے۔

”تمہیں آتے ہی بتانا چاہیے تھا۔ خواہ مخواہ اپنے آپ پریشان ہوتی رہیں۔ اس طرح مسئلے حل خیر اس وقت تو میرے پاس بھی اتنے پیسے نہیں ہیں۔ کل شام تک انتظام کروں گا۔ کب دینے؟“

میرا مطلب ہے، وہ اسی دوکان پر آئیں گی۔ کل آپ انتظام کر دیں گے تو پرسوں صبح میں ٹوبہ کے ساتھ جا رہے ہوں گی۔“

”اس خدشے کے تحت کہ کہیں نیبل ساتھ چلنے کا نہ کہہ دیں نہ صرف ٹوبہ کا نام لے دیا بلکہ ایسا وقت کا ہوئے تھے۔“

پھر بات ہے اب تم ریلیکس ہو جاؤ اور جا کر کھانا کھاؤ۔“ انہوں نے کہا تو وہ فوراً کھڑی ہو گئی لیکن پھر رک

نا۔

پہلے تو نہیں کہیں گے ناں۔“

بے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔

”مک، یو، تنیک، یو، نیبل بھائی!“ وہ واقعی بہت ہلکی پھلکی ہو کر ان کے کمرے سے نکلی تھی کہ مدحیہ کی بے چارہ آواز سارے میں گونج گئی۔

باجلدی آکر دیکھو، شاہ سکندر حیات ہیاتھ منٹر کا حلف اٹھا رہے ہیں۔“

حت نے بے اختیار ڈرائنگ روم کی طرف قدم بڑھایا تھا لیکن دو سراقدم اٹھنے سے پہلے ہی آسیہ کی سخت لٹ تھی۔

”کوصا!“

احت نہ صرف رک گئی بلکہ سسم بھی گئی تھی۔

”میں نے کمرے میں جاؤ۔“ آسیہ اس کے قریب سے گزر کر ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئی تو اس نے بے حد ہو کر اپنے پیچھے دیکھا۔

”میں بھی تھینا“ مدحیہ کی آواز پر نکلے تھے اور آسیہ کے توروں سے وہ بھی پریشان کھڑے تھے۔

”میں بھائی!“ صباحت کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔ ”مدحو کو دیکھیں۔“

”میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تب ہی آسیہ کی آواز آئی۔ وہ مدحیہ پر خفا ہو رہی

بدکڑی ہوئی۔ شاہ سکندر حیات ہیاتھ منٹر کا حلف اٹھائے یا پرائم منسٹر کا، تمہارا کیا تعلق۔“

”میں نے ماما، میرا باپ ہے۔“ پہلی بار خائف ہونے کے بجائے مدحیہ غالباً ”اپنے باپ کی حیثیت کے زعم“ کے مقابل کھڑی ہو گئی تھی۔ ”بھئی آپ نے ہمیں ان کے بارے میں نہیں بتایا جس سے میں یہ سمجھتی

ہو کہ کوئی اور اہل اہل شخص ہو گا لیکن وہ تو شاہ پور کے رئیس ہیں اور اب منسٹر بھی میں ان کے بارے میں بتا سکتی ہوں اور بتاؤں گی کہ میں منسٹر شاہ سکندر حیات کی بیٹی ہوں۔“

”نسا اب!“ آسیہ کی آواز کے ساتھ پھنسر کی گونج پر صباحت نے دہل کر نیبل کو دیکھا اور ان کا رکنے کا اشارہ

از کر کے بھاگ کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تھی۔

”ماما، پلیر، آپ مدحو کو معاف کر دیں۔“ صباحت عقب سے آسیہ کو دونوں بازوؤں کے حلقے میں لے کر

نہاؤ اس سے۔ آئندہ اس کی زبان پر شاہ سکندر کا نام آیا تو۔“ آسیہ نے ایک جھٹکے سے اپنا آپ چھڑا کر

”میں نہیں آئے گا ماما! کبھی نہیں آئے گا۔ میں سمجھا دوں گی اسے۔ آپ پلیر ریلیکس ہو جائیں۔“

”میں آئندہ بے حد سہمی ہوئی ہاتھ جوڑ کر کہہ رہی تھی۔“

حکمت عملی کے بعد وہ یوں مطمئن ہو گئی تھی کہ اس کے اندر کوئی خدشہ رہا ہی نہیں تھا اگر کبھی

[illegible]

نہ بے میں گزر گئی۔

بہنوں کے پرکھتے تھے۔  
 پنہل کی بستی میں ہر روز اس کے نام کاک پھول کھاتا۔

رہی کہنت میں ستاروں کی کھکشاؤں میں قدم رکھنے لگی تھی۔

تو ہانک مچے اس کی آنکھ لھلھ گئی تھی یا اس کی روح میں شہر چھو کر اٹھایا گیا تھا۔  
رنگد رچات نے نہیں اپنی رھیل بنانا ہے تو اس کا معاوضہ بھی دیا ہوگا۔“

ابن کبریاؑ پر وہ گھماؤ تھا جسے بیٹیوں کے سامنے بے نقاب کرنے کا خیال ہی جان لیوا تھا اور اسے لگ رہا تھا  
 سہل سے اس کے اب کا خیال نکالنے کے لیے اسے کوئی حاس سے گزرنا ہو گا۔

[illegible]

میں نے اس کا جواب دیا کہ میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ اور کوئی جواب نہ ملنے پر آگے

”نیل نے آسہ کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر پکارا تو وہ قسم بے ہوشی میں بڑبڑانے لگی۔

میں نے اس کو دیکھا تو جانتی تھی کہ یہ وہی ہے۔ "بیکل" مجھ کو بلانے ہی رہے تھے۔ اس کی بڑبڑاہٹ سن کر میں دھکے دینے لگی تھی۔ وہ مجھ سے کہتا تھا کہ "اس کی بڑبڑاہٹ سن کر میں دھکے دینے لگی تھی۔" میں نے اس کو دیکھا تو جانتی تھی کہ یہ وہی ہے۔ "بیکل" مجھ کو بلانے ہی رہے تھے۔ اس کی بڑبڑاہٹ سن کر میں دھکے دینے لگی تھی۔ وہ مجھ سے کہتا تھا کہ "اس کی بڑبڑاہٹ سن کر میں دھکے دینے لگی تھی۔"

بلکہ ایسا کرو یا سمیٹیں آنٹی کو فون کر کے انہیں فوراً آنے کو کہو

ان کی بات سن کر مکئیہ منہ پر سے ہٹا کر بہت خاموش نظر آئی۔

جانبہ صیاحت پریشان ہو گئی۔

میں رک کر پہلے یا سمین کو فون کیا پھر آسیہ کے کمرے میں آئی تھی۔

تقریباً "میں منٹ بعد یا سمین آئی تو اس کے ساتھ میونہ بھا بھی اور اباجی بھی اوپر آگئے تھے۔ رات جب کلینک سے آئی اس وقت تو ٹھیک ٹھاک تھی پھر ایک دم سے اٹنا بخار کیسے ہو گیا۔ نظروں سے نیل کو دیکھنے لگے۔

"چائیں اباجی! میں نے تو خود ابھی دیکھا ہے۔" نیل نظرس چرا گئے۔

"بہت تیز بخار ہے۔ صابینا! جلدی سے برف کا پانی اور کپڑے لے کر آؤ اور یہ میڈسن نیل دے۔ باکس میں ہوں تو رو نہ فوراً "منکو آؤ۔" یا سمین پرچہ نیل کو تھما کر انجکشن تیار کرنے لگی۔ پھر جہاں بازو میں گئی وہ کراہ کر بڑبڑانے لگی۔

"مدحو کو روکو" سے مت جانے دو۔"

"کہاں ہے مدحو؟" میونہ بھا بھی نے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد نیل سے پوچھا۔

"اپنے کمرے میں چچی یہ میڈسن تو نہیں ہیں۔ میں لے کر آتا ہوں۔"

نیل اگلے کسی سوال سے بچنے کی خاطر میڈسن کے بہانے فوراً "چل پڑے۔ پھر اچانک کسی دنیا مدحہ کے کمرے میں جھانک کر بولے۔

"مدحہ! چلو پھو پھو کپاس جا کر بیٹھو اور انہیں یقین دلاؤ کہ تم کہیں نہیں جا رہی۔"

مدحہ کچھ کچھ بھی نہیں اور نہ ہی سمجھنے کے لیے کوئی سوال اٹھایا چپ چاپ ان کے قریب سے گزر کرے میں داخل ہو گئی تھی۔

دوپہر تک آسیہ بے ہوشی کے عالم میں جانے کیا کیا بولتی رہی تھی جو صرف وہ تینوں ہی سمجھ رہے تھے۔ سب سوالیہ نشان بنے ہوئے تھے۔ کبھی صحبت کو دیکھتے جو آسیہ کے سرانے کے پاس سے ہٹتی اور کبھی مدحہ کو جو مسلسل آسیہ کے پیروانے میں لگی ہوئی تھی اور کسی کسی وقت سب کی نظر بھاگرا سے پھلتے آتو بھی صاف کر رہی تھی۔

پھر دوپہر میں کچھ بخار کا زور ٹوٹا تو یا سمین نے خصوصاً "اماں جی اور اباجی کو اطمینان دلا کر نیچے بھاگنا صحبت کو زبردستی وہاں سے اٹھا کر اپنے ساتھ کھانا کھلایا پھر انہیں تسلی دیتی ہوئی بولی۔

"اب فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ شام تک آسیہ سکون سے سوئے گی۔ تمہاری اس کے پاس مدحہ نہیں ہے۔ اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔ شام میں دیکھنا وہ بالکل ٹھیک ہوگی اور یہ تم دونوں اتنا دانا کیا اس سے پہلے اس گھر میں کبھی کوئی بیمار نہیں ہوا۔ بیٹا! جہاں تندرستی ہے وہاں بیماری بھی نہ کمرے میں جاؤ۔ آسیہ کے پاس میں ہوں۔"

"آپ بھی تو تھک گئی ہوں گی ماما جی۔ آپ آرام کریں۔" صحبت نے یا سمین کا احساس کر کے گال تھک کر بولی۔

"میں آسیہ کے پاس آرام ہی کروں گی، چلو جاؤ شاباش۔" یا سمین دونوں کو ان کے کمرے میں ڈھک کرے میں لے گئی تھی۔

شام میں آسیہ کا بخار تقریباً "اتر چکا تھا۔ لیکن جس ذہنی اذیت سے وہ گزری تھی اس کے اثرات اٹھ کر بیٹھ توئی لیکن بہت کم قسم تھی۔ یا سمین نے زبردستی اسے دلیہ کھلایا اور اس کے اندر مدحہ اس کے ساتھ مسلسل اس کی دلجوئی بھی کر رہی تھی پھر میونہ بھا بھی بھی آگئیں لیکن ان کی گفتگو نہیں بہلا پارہی تھیں۔

جب عدیل یا سمین کو لینے آئے تو وہ اباجی اور خلیل بھائی کو ساتھ لے کر آسیہ کے کمرے میں جنہیں ایک ساتھ دیکھتے ہی اس کا ذہن پھر کہیں پیچھے جھٹک گیا تھا۔

دنت جب ان سب نے آکر اس سے پوچھا تھا کہ کیا تم شاہ سکندر کے نام کے ساتھ گالی بن کر رہ سکتی ہو۔ عدیل نے تمہاری؟" عدیل نے پوچھا تو اس نے چونک کر انہیں دیکھا پھر ذرا سا اثبات میں سر ہلایا۔ جی ہاں ایساں! بیٹھیں۔" میونہ بھا بھی نے کھڑے ہو کر اپنی جگہ پر اباجی کو بٹھایا اور خلیل کے لیے کرسی کے قریب کی۔ عدیل خود ہی یا سمین کے پاس بیٹھ گئے تھے۔

زینب کو بیٹھنے ہوئے دیکھا پھر سر جھکا لیا تھا۔ جس پر اباجی بغیر کسی تمہید کے کہنے لگے۔

"تو سمجھتا بیٹا کہ اب تمہیں کسی بات سے خائف ہونے کی ضرورت ہے۔ تمہاری بچیاں ماشاء اللہ بچھو دار ہو گئی ہیں پھر تمہیں کس بات کی فکر ہے؟"

نیل آنکھوں میں یکبارگی پانی جمع ہو کر قطرہ قطرہ پلکوں سے ٹوٹ کر اس کے اپنے ہاتھوں پر گرنے لگا۔

نیل اباجی! میں نے غلط تو نہیں کہا۔ یہ شاہ سکندر کی منشری سے خوفزدہ ہو گئی ہے۔" عدیل نے اسے روتے اپنی بات کی تصدیق ہونے پر فوراً "اباجی سے کہا۔

نیل اور میونہ بھا بھی نے ایک دوسرے کو دیکھ کر آنکھوں آنکھوں میں یوں اشارا کیا جیسے کیا معاملہ ہے۔

ی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ اسے خوفزدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔" اباجی نے زور دے کر کہا تو وہ بھیلیوں نہ صاف کرنے کے بعد کہنے لگی۔

شاہ سکندر یا اس کی منشری سے خوفزدہ نہیں ہوں بلکہ اس کے سامنے آنے سے پریشان ہو گئی ہوں جیسے لڑکی پر دیکھ کر دیکھ کر اور وہاں سے خوشی سے بے قابو ہو کر ایک دوسرے کو بتایا تھا کہ وہ ان کا باپ ہے۔" اس نے کس گفتگو کے تحت مدحہ کے ساتھ صحبت کو بھی شامل کر لیا۔

نیل کہے پتا چلا کہ وہ ان کا باپ ہے۔ کیا اس ساری دنیا میں شاہ سکندر حیات نام کا ایک ہی شخص ہے۔" بھائی نے ناگوار سی سے کہا تو وہ جڑبڑ ہو کر بولی۔

نیل نے غلطی ہوئی جو خود پر قابو نہیں رکھ سکی اور ان دونوں کو ڈانٹ دیا۔ اگر ہوش میں رہ کر بات کرتی تو آرام ملا سکتی تھی کہ وہ ان کا باپ نہیں ہے اور میرے ڈانٹنے سے اپنے آپ تصدیق ہو گئی۔ اب بتائیے میں کیا باب تک میں بھی آپ کی طرح سوچتی رہی ہوں کہ میری بیٹیاں بڑی اور سمجھ دار ہو گئی ہیں۔ مجھے اب کوئی بات رات سارا اطمینان چھین لیا ان دونوں نے۔"

نیل کہہ رہی تھیں۔" میونہ بھا بھی نے پوچھا۔

نیل نے نہیں لیکن تجسس ضرور ہو گئی ہیں اور اب جب ہر روز اس کے بارے میں ٹی وی پر یا اخبار میں کوئی خبر ملے گی تو ان کے اندر مزید جاننے کی خواہش ہوگی۔" اس نے کہا تو عدیل پر سوچ انداز میں سر ہلاتے ہوئے

ی تو غلطی کی بات ہے۔"

ان بات نے مجھے پریشان کیا ہے۔ میں شاہ سکندر تو کیا اس کے پورے خاندان سے لڑ سکتی ہوں لیکن بیٹیوں

نیل سے اس کی فطری جذبہ کو نکال پھینکنا مجھے اپنے اختیار میں نہیں لگ رہا۔ کتنی سختی کروں۔"

نیل نے اسے کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اباجی ٹوک کر کہنے لگے۔ اس طرح تو ان کے اندر ضد بھی سما جائے۔

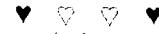
نیل نے یہ تو گا کہ تم انہیں ان کے باپ کی اصلیت بتا دو۔"

نیل نے ایسے بھی اب وہ سمجھ دار ہو گئی ہیں۔ انہیں اصلیت معلوم ہونی چاہیے۔ ورنہ باپ کی ظاہری شان و شوکت ہو کر کہیں ایسا نہ ہو وہ تمہیں قصور وار سمجھنے لگیں۔" خلیل بھائی نے اباجی کی تائید کرتے

یہ کہہ کر ان کے سامنے مدحہ کی آواز گونجنے لگی۔

نیل نے بھی نہیں ان کے بارے میں نہیں بتایا جس سے میں یہ سمجھتی رہی کہ وہ کوئی آوارہ اوپاش شخص ہو۔" وہ بڑبڑا کر کہیں نہیں بتا سکتی تو میونہ بھا بھی بتا دیں گی۔" عدیل نے اسے متوجہ کر کے کہا تو وہ گہری

سانس سینے کے اندر روک کر نہی بھی۔ ”نہیں میں بتا دوں گی۔“



علی جمالیگر، بابا جان اور شاہ سکندر حیات کو رخصت کر کے عازم کے ساتھ واپس اندر آیا تو بھگ کر اس نے ریسیور اٹھایا تھا لیکن پھر بہت عجلت میں بات کر کے بے دلی سے ریسیور بجاتو عازم پر گراتا ہوا کہنے لگا۔

”یار! میں دو دن سے دیکھ رہا ہوں۔ تم ہریٹل پر بھگ کر ریسیور اٹھاتے ہو پھر مایوس ہو کر کٹہرے مطلب ہے، تمہیں کسی خاص فون کا انتظار ہے۔ ایم آئی رائٹ؟“

”رائٹ۔“ اسے جیسے اب کسی ساتھی کی ضرورت تھی جب ہی ہتھیار ڈال دیے۔

”کہیں وہی تو نہیں۔“ عازم فوراً ”سیدھا ہو بیٹھا۔“

”وہی ہے۔“ وہ اعتراف کر کے مسکرایا تو عازم یکدم انجان بن گیا۔

”وہی کون، میرا مطلب ہے اس کا پورا یا سو ڈانٹاؤ۔“

”بائو ڈانٹا معلوم ہوتا تو میں یوں انتظار میں بیٹھا ہوتا خود نہ رنگ کرتا اسے۔“ وہ اپنی بے بسی پر گویا ”چہ چہ۔ تمہیں معلوم نہیں ہے اور اسے معلوم ہے“ عازم نے افسوس کے ساتھ اس کا ہاتھ سلگ کر بولا۔

”اے ابھی معلوم نہیں ہے۔ بس صرف میرا کارڈ ہے اس کے پاس جو پرسوں اتفاقاً ”سرراہ لاکار اسے ہتھایا تھا۔“

”اور یہ اتفاقاً ”سرراہ کون سی ملاقات تھی۔“ عازم نے نظا ہر سنجیدگی سے پوچھا۔

”دوسری۔ کیوں؟“ وہ بتا کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا تو عازم کندھے اچکا کر بولا۔

”یونی آئی اپنی معلومات میں اضافے کے لیے پوچھ لیا۔ کوئی گناہ کیا۔“

”تکو مت یہ بتاؤ اس نے فون کیوں نہیں کیا۔“ وہ چڑ کر بولا۔

”یہ تمہی اس سے تیسری سرراہ ملاقات میں پوچھا۔“ عازم اسے مزید چڑا کر زور سے ہنسا اور اس ہونٹ جھپٹے پر فوراً ہاتھ اٹھا کر بولا۔

”مذاق میں مذاق کر رہا تھا۔ اب سنجیدہ ہو جاتا ہوں۔ ہاں تو کیا کہہ رہے تھے تم اس نے فون کیا کیونکہ تم نے حماقت کی۔ اپنا کارڈ اسے تھمانے کے بجائے اس کا نمبر وغیرہ لینا چاہیے تھا تمہیں۔“ ”چونکہ یہی کچھ ایسی تھی۔“ علی جمالیگر نے کہا پھر اپنے آپ اس سے دونوں ملاقاتوں کی پوری دی۔ جیسے سن کر عازم پر سوچ انداز میں کہنے لگا۔

ابھی تو یہ بھی طے نہیں ہے کہ آیا وہ لڑکی تم سے متاثر ہوئی بھی ہے کہ نہیں اور اگر ہوئی بھی نہیں کہ فوراً ”تم سے رابطہ کرے۔ اس کے ساتھ کوئی پراہم بھی ہو سکتی ہے یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہو۔ لہذا صبر سے انتظار کرو۔ اگر وہ مقررہ دن آئی تو یہ ساری باتیں اسی سے پوچھ لیتا۔“

”صبر سے انتظار کروں پانچ دن۔“ علی جمالیگر نے یوں کہا جیسے پانچ صدیاں۔

”اس چکر میں ایسا ہی ہوتا ہے بھائی۔ ویسے میری مانو تو اس چکر کو میں ختم کر دو۔ ایسا نہ ہو سکتا تمہیں بھی کوئی روک لگ جائے۔“ یہ عازم نے کہا تو اس نے بے نیازی سے جھکا۔

”میں چاہا چاہا میں کی طرح بزدل نہیں ہوں۔“

”بزدل تو جرح چاہا چاہا میں بھی نہیں ہیں۔ ان کے ساتھ یقیناً ”بابا جان نے سیاست چلی ہوگی۔“ ہیں بابا جان اور اب دیکھنا سکندر چاہا سے کسی سیاست کروائیں گے۔ ان کا تو بس نام ہو گا سار جان کے چلیں گے۔“

”یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن میں ان کے ہاتھوں کھٹ پٹی نہیں بنوں گا۔ مجھے اپنی زندگی جینا۔“

بت پہلے طے کر لیا تھا۔ اس لیے اب کی خواہش اور اصرار کے باوجود میں ان کے ساتھ زمینداری کے کاموں میں نہ لگا۔ مجھے بہت اذیت ضرور کرتے ہیں لیکن میں مستقل وہاں رہ نہیں سکتا ہو کہ شاہ پور میں کم و بیش تمام میں سولیات موجود ہیں پھر بھی وہ شہر نہیں لگتا اس لیے کہ وہاں بسنے والے اپنی سوچ نہیں بدلتے۔ اپنے ہاں کی باتیں کو دیکھ لو۔ ہمارے ساتھ کالونیٹ میں بڑھی ہیں۔ پھر یہاں سے اچھے کا بجز سے گریجویشن کیا لیکن ان کی بیوی دی جا رہی رہی تھی۔ اپنے سے کمتر کو انسان ہی نہیں سمجھتیں۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے اس سے انہیں بے غرض نہیں۔ بس ان کے پاس سب کچھ ہے وہ خوش ہیں مگر ہیں۔“

وہ اپنے ماحول پر بہت تاسف کا اظہار کر رہا تھا۔

”اور کیا کریں۔“ عازم اس کی طویل گفتگو سے اکتا کر بولا۔

”کرنا چاہیں تو بہت کچھ کر سکتی ہیں۔ لیکن کچھ کرنے کو وہ اپنی توہین سمجھتی ہیں۔ جبکہ میں زندگی کو متحرک دیکھنا چاہتا ہوں۔ میرا اپنا ایک آئیڈیل ہے۔ صبح جب میں انھوں تو آفس جانے تک میرے ہر کام میں میرے ساتھ بیٹھتا ہوں۔ اور شام میں گھر آنے پر بھی اپنے استقبال میں اسے ہی دیکھنا چاہتا ہوں نہ کہ ملازم بھگ کر میرا بیٹھتا ہے۔“

اس کی آنکھوں میں اپنی آئیڈیل زندگی کا عکس جھلما رہا تھا۔

”یہ ساری باتیں پہلے سے اسے بتا دیتا۔“ عازم پھر شونے سے باز نہیں آیا۔

”تھے؟“ اس نے اپنے خیال سے چونک کر پوچھا۔

”ہی گلداں والی کو،“ دینے یا رتے میں اس سے پیسے مانگ کر اچھا نہیں کیا۔ کہہ دیتے، ٹوٹنے والی چیز تھی ٹوٹ گئی ہے وہ نہ متاثر ہونے والی بھی متاثر ہو جاتی۔“

تو میں کون سا اس سے پیسے لے لوں گا۔ مجھے اگلی ملاقات کا بہانا چاہیے تھا اور فوری طور پر یہی ذہن میں آیا کہ طرح طرح کے آئے گی تو اس سے بہت ساری باتیں کر لوں گا۔“ اس نے لکنا۔

”ایک نہیں یقین ہے کہ وہ ضرور آئے گی۔“ عازم نے پوچھا تو وہ پر یقین انداز میں اثبات میں سر ہلاتا ہوا اٹھ کھڑا

”غور آئے گی اور اب میں سونے جا رہا ہوں کیونکہ صبح بونی جوان کنی ہے۔“

”لوں! ایس ڈی ایم صاحب کو پہلے ہی دن لیٹ نہیں ہونا چاہیے اور سنو، تم تو پھر شام میں ہی آؤ گے اور میں رات نکل جاؤں گا۔ کوئی کام ہو تو ابھی بتا دو، میرا مطلب ہے شاہ پور میں کسی کے لیے کوئی پیغام وغیرہ۔“ آخر عازم کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ چلی تھی جس سے وہ سمجھ گیا کہ اس کا اشارا کسی کی طرف ہے اور اس سے ہی اس کی پیشانی پر ناگوار کی لکیں برسمٹ آئی تھیں۔



کئی کے لیے کوئی پیغام نہیں ہے۔ ناؤ گڈ ٹائٹ۔“ وہ فوراً ”اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا۔

اس کا چھٹا بھلا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ اس لیے صبح عازم کے اٹھنے سے پہلے ہی آفس روانہ ہو گیا۔ اور شام میں اس کے خیال سے خوش تھا کہ عازم جا چکا ہو گا اور وہ تو واقعی جا چکا تھا۔ لیکن اس کے لیے جو لافہ چھوڑ گیا تھا اس میں بھڑکے اسے دھجکا لگا تھا۔

”بھڑکنا۔ تمہارا انتظار ختم ہوا۔ سرراہ ملاقات والی نے جانے کس کے ہاتھ یہ بارہ سو روپے بھجوائے ہیں۔“ شعل شاد سے شعل فرما رہا تھا ورنہ آنے والے سے یہ ضرور پوچھتا کہ بھائی تم کون ہو۔ اس کے کیا لگتے ہو۔“ اس نے بھر حال وہ جو کوئی بھی تھا کرم دین کو یہ لافہ تھا کر چلا گیا۔ ”کن لو پورے بارہ سو روپے۔“

”اے اے۔“ اس نے لافہ نیبل پر پیچینک کر کر مہین کو پکارا تھا۔



میرزا بیچو جاری ہوں، کیونکہ مجھے ابھی غنیمت نہیں آ رہی۔“  
نہیں آ رہی بیچو انوں کو تو آ رہی ہوگی۔ ان کی غنیمت کیوں خراب کرتی ہو۔“ صباحت نے ٹوکا لیکن وہ ان  
کو زبردستی سے بھاگتی ہوئی بیٹھیاں اتر گئی۔  
”صباحت نے سر جھکا اور اپنے کمرے کے دروازے تک آئی تھی کہ نیپیل کی اسٹک کی  
پٹ کر دیگیا۔“

”جہ میں چائے کا پلے آرہے تھے۔  
”پلے چائے آپ نے خود پانی ہے؟“ اس نے حیرت سے کہا تو نیپیل ذرا سا مسکرائے۔  
”ہاں، کوئی ایسا مشکل کام تو نہیں ہے۔“  
”اس کو کچھ سے کتنا چاہئے تھا۔“ وہ ان کے ساتھ چلتی ہوئی ان کے کمرے میں آگئی۔  
”ہو نہیں؟“ نیپیل نے اس کی بات ان سنی کر کے پوچھا۔  
”نہیں، گاؤں نیپیل بھائی کہ مذہ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اس نے ماسے معافی مانگی اور کہہ رہی  
تھی شاہ سکندر کا نام نہیں لے گی۔“ اس نے خوش ہو کر کہا لیکن نیپیل نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔  
”چائے کے دو تین سب لینے کے بعد موضوع ہی بدل گئے۔“

”نہ اصرار بھائی کے ہاتھ بھجوا دیئے تھے۔“ اس نے بظاہر سرسری انداز میں جواب دیا۔  
”کاتھ؟“ نیپیل نے جب سے اسے دیکھا۔“ اس نے کیسے بھجوانا ہو گا اس خاتون کو؟“  
”نہ کی بات نہیں تھی۔ اصل میں مجھے ماما کی وجہ سے جانے میں دیر ہو گئی تھی۔ آگے وہ خاتون اپنا  
س دکان پرے کر چلی گئیں۔ تب میں نے اصرار بھائی کے ہاتھ ان کے ایڈریس پر بھجوا دیئے اور اصرار بھائی  
نے کہہ کر ان کی ملازم کاٹھا تھا۔ وہ اسے دے کر آگئے۔ ان تک پہنچ گئے ہوں گے۔“ وہ ہنسٹھل سنبھل کر

”نہ سبوج انداز میں یوں سر ہلایا جیسے ”کیا پتا۔“  
”نان کا فون نمبر بھی ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں فون کر کے معلوم کر لوں گی۔“ وہ اندر ہی اندر پریشان ہو گئی  
مذہر معلوم کر لینا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کبھی راستے میں پھر ملیں اور تمہیں پکڑ لیں کہ میرے پیسے نکالو۔“  
”آج چل پڑی۔“

”کڑکس گی۔ میں نے بھجوا تو دیئے ہیں۔“  
”راہیو انفرم سے۔ ان کا ریسپو کرنا بھی کنفرم ہونا چاہئے۔ ویسے ایسے ادھورے کام تو عمر کرتا ہے۔ امر تو  
”نہ اندر سے۔“ آخری جملہ نیپیل نے جیسے اپنے آپ سے کہے تھے۔  
”بیمہ پوری بن گئی۔ کیونکہ اس نے امر سے یہی گناہا کہ گھر سے جو بھی نکلے اسے تھما دیجیے گا اور امر  
”نہ فون کر لینا۔ اور اب تم جاؤ یہاں سے۔ مجھے بیک پر تیار کرنا ہے۔“ انہوں نے مک خالی کر کے  
”نہ جگہ کل چھٹی کا دن ہے۔“ وہ شاید اٹھنا نہیں چاہ رہی تھی۔

”نہ اصرار بھائی۔“ تمہیں اگر غنیمت نہیں آ رہی تو کوئی کتاب لے جاؤ۔“ نیپیل نے اپنے سامنے کتاب  
”نہ اصرار بھائی نے ایک نظر ان کے کتابوں کے ریک پر ڈالی لیکن اس وقت کچھ دھڑکنے کا مودہ نہیں تھا۔  
”نہ اصرار بھائی میں سر ہلانی ان کے کمرے سے نکلی تو پہلے خالی مگ چن میں رکھا۔ پھر کھلی چھت پر کھلتے  
”نہ اصرار بھائی کی کتاب زندگی کے اوراق پھر سے اٹھنے لگا تھا۔“

مدیہ اور صباحت سر جھکائے بیٹھی تھیں۔  
”آسیہ نے اپنی زندگی کا وہ باب جو سیل کر دیا تھا، اسے احتیاط سے کھول کر ان کے سامنے حرف بہ حرف  
تھا۔ اس کے بعد بغور ان کے چہروں کو دیکھ رہی تھیں۔“

صباحت کے چہرے پر دکھ کا تاثر بہت واضح تھا۔ اور مدیہ کے چہرے پر محسوس کیا جانے والا تنفر  
کتنی دیر کی خاموشی کے بعد آسہ بھرا پتے ابولنے لگی تھی۔  
”یہ مت سمجھنا کہ میں نے محض ضد میں تمہیں تمہارے باپ سے دور رکھا۔ بلکہ میں تم دونوں کو یہ  
بے وقعت نہیں ہونے دینا چاہتی۔ تم اس کے سامنے جاؤ اور وہ تمہیں اپنی اولاد ماننے سے انکار کر دے تو  
اپنی نظروں میں تمہاری کیا وقعت رہ جائے گی۔ بس اسی خیال سے میں تمہیں روکتی ہوں۔ اور یہ غلط نہیں  
جب شاہ سکندر کے باپ نے مجھے اس کی بیوی تسلیم نہیں کیا تھا تو تمہیں بھی اپنے خاندان کا نام نہیں دے  
میری بیٹیاں ہو صرف میری۔ میں تمہیں ہر اس راستے پر جانے سے روکوں گی، جہاں شاہ سکندر کی پرچھاؤ  
کا شائبہ ہو گا اور اگر تمہیں میری مرضی کے خلاف چلنے کی کوشش کی تو۔“

آسیہ نے ہنٹ پیچ لے لیے تھے لیکن اس کا ٹھہرا ہوا سر لہجہ ان دونوں کی رگوں میں لہو منجمد کر گیا تھا۔  
”تمہارا رزلٹ کب آ رہا ہے؟“ قدرے توقف سے آسیہ نے موضوع بدل دیا۔  
”پتا نہیں ماما! شاید اگلے ہفتے، کنفرم نہیں ہے۔“ صباحت کو بولنے میں ساری توانائیاں صرف کرنا  
تھیں۔

”ہوں۔ دو مہینے تم لوگوں نے بیکار وقت ضائع کیا۔ کوئی کورس ہی کر لیتیں۔“ آسیہ کو اب افسوس ہوا کہ  
اسے پہلے کیوں نہیں آیا۔ ”خیر اب رزلٹ آجائے تو اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔ گریجویشن کے بعد پھر کپیوٹر  
کر لیتا۔ فیکری نما ضرور پڑھا کرو۔ اس کی برکت سے باقی نمازیں بھی وقت پر ادا ہو جاتی ہیں۔ چلو اب  
”۔“

”مما! آپ کی طبیعت تو ٹھیک سے ناں۔؟“ صباحت نے اٹھتے ہوئے مدیہ کو کہنی ماری تھی۔  
”ہاں بہت بہتر ہوں۔ کل سے کلینک جاؤں گی۔“ آسیہ نے کن اکھیوں سے مدیہ کو دیکھا جو قدرے  
سی ہو گئی تھی۔ پھر ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔

”مما! آپ کی یہ حالت میری وجہ سے ہوئی ہے ناں۔ آئی ایم سوری ممما۔ مجھے معاف کر دیں۔ میں پھر  
سکندر کا نام نہیں لوں گی۔ میں آپ کی بیٹی ہوں، آپ کے نام کے ساتھ سر اٹھا کر چوں گی۔“  
آسیہ نے اس کا سراپے سینے سے لگا دیا تو اس کے ساتھ صباحت کی پلکیں بھی نم ہو گئی تھیں۔  
”مما! آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں۔؟“ مدیہ اس کے سینے میں منہ چھپائے پوچھ رہی تھی۔

”نہیں بیٹا! میں کبھی تم سے ناراض نہیں ہو سکتی۔ تم صبا اور نیپیل میری کل کائنات ہو۔“ آسیہ نے  
ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی چومی پھر ایک بازو پھیرا۔ صباحت کو دیکھا تو وہ بھی اس کی آغوش میں سما گئی  
”میری جان، تو تم میری زندگی میرا غرور میرا مان اور تم میرا مان بھی نہیں توڑنا۔“ آسیہ دونوں کو ہانڈ  
بھیچ کر بولی پھر ان کے سر جوڑ کر انہیں خود سے علیحدہ کیا تو مدیہ اٹھتی ہوئی بولی۔

”مما! ابھی آپ کچھ دن آرام کریں۔ کلینک جا میں گی تو۔“  
”بس بیٹا بہت آرام کر لیا۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ آسیہ نے مسکرا کر انہیں اپنی طرف سے اطمینان  
پھرا پتے پیچھے تکیہ سیدھا کرنے لگی تو صباحت احساس کر کے بولی۔  
”چلو خود اب ماما کو سونے دو۔“

”گڈ نائٹ ممما!“ مدیہ نے زیر و پلور کا بلبل جلا کر ٹیوب لاسٹ آف کر دی اور صباحت کے پیچھے کمرے  
کر آئی تو آہستہ آواز میں بولی۔



لیٹ گئی تھی۔

\*. ☆. \*. ☆. \*

تھے ہی اس سے کہا۔ حالانکہ وہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ عمار اور ثوبیہ کی شوخ نظروں سے بچنے کی خاطر ”اس میں سمجھنے والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔“ وہ لاپرواہی سے کہہ کر بائیک کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”ایک سہ ماہی ہے۔“ صرف تمہارے لیے۔“ احرار نے بایک اشارت کرتے ہوئے کہا پھر اسے اشارہ کیا کہ وہ اپنے دوست سے لایا ہوا ہے۔ صبح میرس پر کھڑی ہاتھ ہلا رہی تھی۔ جو اب ”وہ مسکرائی تھی کہ احرار نے جھٹکے“ کے ساتھ بھاڑی۔

”مین روڈ پر آکر احرار نے پوچھا۔

”وہ موڈ میں آکر بنی۔“

مطلب۔؟ امر سمجھا نہیں۔

اے! وہ بچوں کی طرح خوش ہو کر بولی۔

۴۴۔ تم بائیک دیکھ کر چیخ پڑو گی اور اس پر بیٹھنے سے منع کرو گی۔ ۴۵۔ حمر کو واقعی یہ خدشہ

ہوئے آج آپ اتنے موڈ میں کیسے آگئے۔؟ وہ اس کی بات انہی سن کر گئی۔

”نے میری بات جو مان لی“ احرر نے کہا تو وہ قدرے حیران ہوئی۔

وہنا کہ۔؟

مہارت کے ساتھ گریجویشن کرنے کی۔ چچا جو اگر تم اپنی مرضی کرتیں تو میں سمجھتا، تمہیں میری بالکل پروا نہیں۔ اور ہاں اسے اتنے دنوں سے میں یہ سوچ سوچ کر ریشان تھا کہ کہیں تم اپنی مرضی کر کے میری محبت کا مذاق نہ اڑائیں۔ صرف گوئی سے اپنے خدشے کا اظہار کر رہا تھا۔

ایک دم چپ سی ہو گئی تھی۔

”نئے اپنے بہن بھائیوں کے سامنے بھی شرمندہ ہونا پڑتا۔ گو کہ کسی نے کچھ نہیں کہا تھا۔ لیکن مجھے اپنے آپ کو لانا چاہیے سب یہ دیکھنا چاہتے ہوں کہ آیا کم عمری بات مانتی ہو کہ نہیں۔“

”درمیں نے آپ کی بات مان لی۔“ وہ اپنے لہجے میں استہزا چھپا نہیں سکی لیکن ٹریفک کے شور نے لاج رکھ لی۔

”اس خوشی میں پہلے اس کرم۔“ احمر نے بایک روکتے ہوئے کہا۔ ”تم یہیں رکو میں لے کر آتا ہوں۔ کون

”ٹانکسٹ اور صبا کے لیے پست۔“ اس نے صباحت کابیوں کہا کہ وہ اس سے کہہ کر آیا تھا۔

”بھانجے لیے ابھی کیوں۔ ابھی ہمیں پورا شہر گھومنا ہے۔ واپسی میں گھر کے قریب سے سب کے لیے لے لیں۔“ عمر کہتا ہوا آگے بڑھ گیا اور فوراً ”بی دو! آؤں کریم لے کر آیا تو وہ اس کے ہاتھ سے اپنی چاکلیٹ لیتی ہوئی

مجلس شورای اسلامی

”نہایت پرستش میں کھومنا۔“

نہیں کیا۔ کیا؟“

نہیں۔ نہ تو شک ہے کہ شورش نے دماغ ہلا دیا ہے۔ انتہائی ادبیات سواری ہے یہ۔ آئندہ کبھی اس پر نہیں

یہ کہ اگر آپ کا بایک خریدنے کا خیال ہو تو فوراً "دل سے نکال دیں۔" وہ ایک ہاتھ سے اپنی کپڑی دہاتی ہوئی

”ایسا کہ چلو اب تمہیں کسی پر سکون جگہ لے چلوں۔“ ”اُحمر نے بانیک اسٹارٹ کی۔ پھر اس کے بیٹھے پر کہنے لگا: ”میری بانیک سے زیادہ یعنی گاڑی خریدنے کی حیثیت نہ ہوئی تب تو مجبوری ہوگی۔“

زلزلہ کے بعد مدیہ نے بہت خاموشی سے صباحت کے ساتھ دوبارہ کالج جانا شروع کر دیا۔ یونیورسٹی جانے کے شوق میں آنرز کا شوشہ چھوڑا تھا۔ اس پر قائم رہنے کے لیے اسے آسیرے اور تب بھی کچھ رنجش یقینی تھی۔ اور اب شاید وہ اسے کچھ دیر کے لیے بھی ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔ آنرز کا خیال چھوڑ کر سابقہ بیچیکٹ سے ہی سمجھوٹا کر لیا تھا۔ جس سے گھر کی فضا تو شاید ہونے لگی تھی لیکن وہ خوش نہیں تھی۔ کیونکہ یہ بات اس کے مزاج میں ہی نہیں تھی کہ خود پر جبر کر کے جائے اس کے برعکس خلاف مزاج بات پر وہ شروع ہی سے احتجاج کرتی تھی۔ لیکن اب مجبوری نے ابھی کچھ دن پہلے اپنے زخموں کو بے نقاب کیا تھا جن سے انھیں والی میس میں وہ محسوس کر رہی تھی۔ اس میں مزید اپنی طرف سے اضافہ کرنا فی الحال ممکن نہیں تھا۔ فی الحال یوں کہ وہ زیادہ عرصہ تک کسی طاری نہیں رہ سکتی تھی۔ اور ایسا اس لیے تھا کہ اس کے نزدیک سب سے اہم اس کی اپنی ذات تھی۔

اور یہ طے ہے کہ صرف اپنی ذات کو اہمیت دینے والے کبھی خوش نہیں رہتے۔ کبھی مطمئن رہے ایک سے شامی بھی رہتے ہیں۔ بہر حال مدیحہ کے کالج جانے پر جہاں مصاحبت اور فیمل حیران تھا، طور پر یہ سب کچھ خوش تھا کہ مدیحہ نے اپنی مرضی کرنے کے بجائے اس کی بات مان لی ہے۔ اور اس نو روزہ اپنے کسی دوست سے بائیک لے آیا اور آسمے سے اجازت لینے کے بعد اس کے پاس آکر کھنے لگا۔ ”سنو فیل آج بڑے موزمیں ہوں۔ چلو تمہیں بھی سیر کراؤں۔“

”صرف مجھ؟“ ”جیہے اپنی طرف اشارہ کرتی ہوئی استغرائے ہنس۔ ”مما سے پوچھا ہے؟“  
 ”کیوں وہ منع کریں گی؟“ ”اُحر نے قصداً ’’نجان بن کر پوچھا کہ وہ کندھے اچکا کر بولی۔“

”جی نہیں۔ وہ میری پھوپھی ہیں۔ انہیں مجھ پر پورا بھروسہ ہے اور انہوں نے بخوشی اجازت دے کر فائنل تیار ہو جاؤ۔“ اصرار کرتا کہ کما کہ وہ جیسے یقین کر بھی رہی تھی اور نہیں بھی۔ الماری کی طرف رک کر اسے دیکھنے لگی۔

”کم آن بار! میں مذاق نہیں کر رہا۔ اچھا جاؤ خود پھو پوسے پوچھ آؤ۔ جلدی جاؤ۔ وہ نیچے اتر گئی ہیں۔ نہیں سیدھی نکل جائیں گی۔“ اور اصرار نے اس کی بے یقینی محسوس کر کے کہا۔

”میں نہیں جا رہی۔“ اس نے قدرے جھنجھلا کر الماری کھول لی۔  
 ”کیا مطلب، میرے ساتھ نہیں جا رہیں۔“

”تمہارے پوچھنے نہیں جاری۔ آپ نے پوچھ کر تو لیا ہے۔ وہ بیگنر اتار کر اسکی طرف پلٹی تھی۔ آگئی۔ اور اسے دیکھ کر معنی خیز شریر مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”تو آپ دونوں باہر جا رہے ہیں۔“

”جنتنا۔ آپ کو کوئی اعتراض ہے۔“ احرار نے فوراً اس کی طرف گھوم کر کہا۔

”جی نہیں۔ میں کیوں اعتراض کروں گی جب ممانے اجازت دے دی۔“ صاحت کی بات سننے  
واش روم کا رخ کیا اور پڑے تبدیل کر کے نفی تو جلدی جلدی بالوں میں برش پھیر کر بولی۔

”میں تیار ہوں۔“  
 ”وہی گندہ اوکے صبا! تمہارے لیے آکس کریم لیتا آؤں گا۔“ احرار نے مدحیہ کے جلدی تیار ہوئے۔

پھر صبا جت کو ماتھہ ہلاتا کمرے سے نکل گیا تو مدیہ بھاگ کر اس سے پہلے میڑھیاں اترتی ہوئی بغیر سے باہر آئی تھی۔

”تمہارا بھانگنا میری سمجھ میں نہیں آیا۔؟“

”مجبوری۔ نہیں میں مجبوری سے بھی کمپروماز نہیں کروں گی۔ آپ کی ایک بات مان لی ہے میں یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر بات مان لوں گی۔“ اس نے ذرا بھی مروت نہیں برلی۔

”پھر تو مجھے ہر صورت باہر جانا پڑے گا۔“ اصرار نے اس کی صاف گولی کا بارمانے بغیر کہا۔ پھر ٹنک سے نکل کر کلفٹن روڈ پر آیا تو ریڈ سگنل دیکھ کر جھنجھلا گیا۔

”الحوالہ۔ میں سوچ رہا تھا یہاں سے اسپڈ سے بھگاؤں گا۔“

”آپ ابھی بھی بھگا سکتے ہیں۔ کوئی دیکھ تھوڑی رہا ہے۔“ وہ ادھر ادھر دیکھتی ہوئی بڑے آرام سے

”اللہ دیکھ رہا ہے۔“ اصرار نے جس بے ساختگی سے کہا ویسے ہی اس کی ہنسی بھی بے ساختہ بھی تر

لینڈ کروزر بانیگ کے قریب آن رکھی مدیجہ نے ہونسی ہنستے ہوئے سرسری نظر سے دیکھا تھا اور فوراً

کراچیا چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔ کیونکہ وہ اپنی زندگی کے اس موڑ پر بھی جہاں اگر بانیگ رہے کھڑے

تب بھی لینڈ کروزر اور اس میں موجود علی جمالی کی اپنی تمام تر وجاہتوں کے باوجود اسے متاثر نہیں کر سکا

لے اس کی زندگی میں آچکے تھے اس کے بعد علی جمالی کی گہری نظروں پر اس کا رد عمل فطری تھا۔

سگنل آن ہوتے ہی اصرار نے اسپڈ سے بانیگ بھگائی اور پیچھے علی جمالی کے دھتارہ گیا کہ ایک بار تو وہ

دیکھے گی لیکن اسے سخت مایوسی ہوئی تھی۔

\* ☆ \* ☆ \*

علی جمالی کی تہنیر کر لینے والی پر سنالشی سے بخولی آگاہ تھا لیکن اس کے اندر اپنے پچاشاہ سکندر

اپنی وجاہتوں کا زعم نہیں تھا۔ اور نہ ہی اس کی سوچ ان جیسی تھی کہ جو چیز پسند آجائے اسے ہر قیمت

پر حاصل کرے۔ جب ہی اس نے اول روز بھی صباحت نے جہاں کہا وہیں اسے ڈراپ کر دیا تھا اور دوسری بار

آپ منوانے کے بجائے ایک طرح سے اختیار اسے دے آیا تھا۔ اس یقین کے ساتھ کہ وہ کچھ پیٹ

کرے گی۔ لیکن اب مدیجہ نے جس طرح اس کے دیکھنے پر ناگواری سے منہ موڑا تھا۔ اس سے حقیقت

دھچکا لگا تھا۔ اس کے باوجود وہ کسی زعم میں اس کے تعاقب میں نہیں گیا۔ سوچا بھی نہیں بلکہ وہیں

مخالف سمت موڑ لی تھی۔ لیکن اس کا دل جانے کیوں اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھا کہ

منہ موڑ سکتی ہے۔

”ایک لحظہ کو بھی اس کے چہرے پر شناسائی کا تاثر نہیں لہرایا۔“ وہ مسلسل الجھ رہا تھا۔

”ہو سکتا ہے اس کے ساتھ کوئی پرابلم ہو یا وہ کیسے انجیج ہو۔“ معاً عازم کی بات یاد آنے کے

اس نوجوان کا خیال آیا جس کی طرف اس تمام عرصے میں ایک بار بھی اس کا دھیان نہیں گیا تھا حال

ہی سوچنا چاہیے تھا کہ وہ بانیگ پر جس کے ساتھ بیٹھی تھی وہی اس کی طرف سے منہ موڑنے کا سبب

بہر حال اب سبب سمجھ میں آیا تھا تو اسے اپنی زندگی کا سب سے بڑا المیہ لگ رہا تھا کہ وہ لڑکی جو اوا

تک ایک لمحہ کو بھی اس کے ذہن سے محو نہیں ہوئی تھی وہ اس آنے سے پہلے ہی بہت دور تھی۔

نے بس تھوڑی سی کوشش کی بھی اس لڑکی کے خیال کو جھٹکنے کی اور کامیابی سے پہلے ہی یہ کوشش

کیونکہ اس کا تصور ایسا نرم جھوٹا تھا جو ترستی آنکھوں میں جہاں پر سکون نیند لاتا وہاں آگے ایک

لے جاتا تھا۔ جس میں رنگ خوشبو، باہل، ہوا جانے کتنی خوبصورتیاں تھیں۔

کبھی کبھی ازان حقائق کی تگنیوں کو خیل کی شیرمنوں میں بھلانے کی کوشش کرتا ہے۔ حالانکہ

کوئی نوعمر لڑکا نہیں تھا اور نہ ہی اس کی زندگی میں آنے والی وہ کوئی پہلی لڑکی تھی۔ لیکن جسے دیکھ

جانے کو بل چاہتے وہ صرف وہی تھی اور وہ بار بار جاتا تھا۔ یوں کہ اس کے بعد لگتا تھا زندگی بس یونہی گز

رتی تبدیلیاں آئیں اس کے اندر کی دنیا نہیں بدلے گی۔

اس بیک اینڈ پر وہ آس سے نکلا تو ایک دم سے شاہ پور جانے کا پروگرام بنالیا۔ گزشتہ دو مہینو

اس کی وجہ سے اپنا جانا ملتوی کر رہا تھا کہ کہیں اس کی غیر موجودگی میں اس کا فون آئے یا وہ خود

دی تھی اس لیے گھر آکر اس نے بہت غلٹ میں شاور لیا اور گرم دین کو اپنے جانے کا بتا کر اسی

رات کے کھانے تک شاہ پور پہنچ جائے۔ لیکن کراچی کی ٹریفک الامان۔ ایک گھنٹہ تو اسے صدر

گھاٹ اس کے بعد بھی راستہ صاف نہیں تھا۔ مجبوراً اس نے دوسرا روٹ اختیار کیا۔ جو خاصا طویل

۔ ٹریفک میں پھنس کر جو وقت ضائع ہونا تھا اس کی نسبت یہ طویل راستہ بہتر تھا۔ تاہم آباد سے

رہچڑاؤ سب کے راؤنڈاؤٹ سے اس نے ٹرن لیا تھا کہ اچانک نظروں کے سامنے وہ آگئی۔

اس کا خیال جھٹکنے کی اس نے بس تھوڑی سی سعی کی تھی اور وہی ہی تھوڑی سی کوشش اس نے

یعنی اسے نظر انداز کر کے آگے نکل آیا۔ لیکن اگلے راؤنڈاؤٹ سے اس نے گاڑی واپس اسی

سے اور چند منٹوں بعد ہی گاڑی سے اتر کر لائبریری میں داخل ہوا تو پہلی نظر میں وہ اسے آخری

الماری کے قریب کھڑی نظر آئی۔ اس کے ساتھ اور کوئی نہیں تھا جب ہی وہ بڑے آرام سے اس

بول۔

نے چونک کر دیکھا اور بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے اس کے ہونٹ ذرا سے نیم وا ہو کر ایک

غم ہو گئے تھے۔

گاڈ۔ آپ نے بچا نا تو۔“ وہ ذرا سا مسکرایا تو وہ اس پر سے نظریں ہٹا کر الماری میں دیکھتی ہوئی بولی۔

داشت اتنی کمزور نہیں ہے۔“

سا اور تیر بھی کہ کبھی کبھی انسان کو مصلحتاً انجان بنانا پڑتا ہے اس نے اپنے تئیں اس روز کی اس کی

روہ کیا سمجھتی۔ خاموشی سے اپنی مطلوبہ کتابیں تلاش کرنے میں لگی رہی۔

نے اس روز کے بعد پھر فون نہیں کیا۔“ علی جمالی نے اس کی نظروں کے سامنے سے کتاب کھینچتے

لیں بار رٹائی کر چکی ہوں لیکن آپ کے ہاں سے کسی نے ریسو نہیں کیا۔“ اس نے کہا تو وہ حیران ہو کر

”مجھے وہی پیسوں کا کلفٹن دے کا تھا کہ آپ کو مل گئے۔“ وہ کہہ کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی تو فوراً

پچھنی خاطر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا پھر اس پر نظر پڑی پس تو دل حیدر پر پھٹنے لگا۔

طلب ہے آپ کو نہیں ملے۔“ وہ اس کی خاموشی سے خود ہی نتیجہ اخذ کر کے بولی۔ ”ٹھیک ہے میں

لے گی۔“

ما۔“ وہ فوراً بولا۔ ”میں آپ سے پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

نہ ہو لیکن مجھے ہے کیونکہ میں کسی کا قرض نہیں رکھتی۔“ وہ بھی فوراً بولی تھی۔

پاسے قرض سمجھتی ہیں تو پھر آپ کو خود آکر مجھے لوٹانے ہوں گے۔ دوسری صورت میں میں واپس

لے لے بنا راہ ہی اس کے آنے کی شرط رکھ دی تو وہ کچھ پریشان ہو گئی۔

میں ایسے آسکتی ہوں۔“

ہاں آئی ہیں۔“

پشتہ تر آئی میں میرا بھائی چھوڑ کر گیا ہے اور لینے بھی آئے گا۔ میں اکیلی تو سو رہی۔“ اس نے الجھ کر

کہا مسئلہ ہے کہ آپ کیسے آتی جاتی ہیں۔“ وہ قدرے لا پرواہی سے کندھے اچکا کر کہنے لگا۔ ”اور میرا

دلہ میں اپنے معاملے میں کسی تیسرے شخص کو انوالو نہیں کرنا۔ آپ کے علاوہ کوئی بھی آیا۔ میں پیسے

سامنے نہیں آؤں۔“

”کوئی نہیں آئے گا۔ میں نہیں آرڈر کر دوں گی۔“ وہ ناراضگی سے کہہ کر آگے بڑھ گئی۔

”میری آرڈر واپس نہیں لے سکتا کیا۔“ اس نے فوراً ”بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا تو وہ زچ ہو کر ہل گیا۔“

”آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟“

”اس بات کا جواب جب آپ آئیں گی تب دوں گا اور ہاں یا در کہیے گا پانچ بجے کے بعد اس سے پہلے نہیں ملوں گا۔“ اس کے سیدھے

وہ اس کی پوری کھلی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرایا اور اسے مزید کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر فوراً ”ہاں“

مگر تیز قدموں سے باہر نکل آیا اور گاڑی میں بیٹھنے ہی ایک بار پھر شاہ پور جانے کا ارادہ مٹا کر دیا تھا۔

”نیل بھائی! رات میں یہ نیل کے لیے چائے لے کر ان کے کمرے میں آئی تو انہیں مصروف لگی۔“

”میں کچھ دیر آپ کے پاس بیٹھ سکتی ہوں۔؟“

”ہاں بیٹھو۔“ نیل نے اپنی مصروفیت ترک کیے بغیر کہا تو اس نے چائے کا گام ان کے قریب لایا۔

پھر ان کے پاس بیٹھی ہوئی بن۔

”آپ آج اپنے کام تو بند کریں۔ مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“ نیل نے سراونچا کر کے اسے

بند کر کے ایک طرف رکھتے ہوئے بولے۔

”باتیں کرنے کے لیے نہیں یہی وقت کیوں ملتا ہے۔ شام میں کہاں تھیں۔؟“

”شام میں، میں عمر کے ساتھ لا بیریری گئی تھی۔ پتا ہے اتنی اچھی کتابیں لائی ہوں۔ پڑھنے کے

لیے۔“

”اچھا یہی بتانا تھا۔“ نیل نے چائے کا گام اٹھائے ہوئے کہا۔

”نیل یہ میں نے آپ کی بات کا جواب دیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ جو خاتون تھیں ناں گور

تک میس نہیں پہنچے اور میں نے سوچ لیا ہے کہ مزید ایک پیسہ میں انہیں نہیں دوں گی۔“ اس نے اُم

اپنا فیصلہ بھی سنا دیا تو نیل چائے کے دو سب لینے کے بعد پوچھنے لگے۔

”میں نے فون کیا تھا اور مجھے لگتا ہے، نیل بھائی وہ جھوٹ بول رہی تھیں، انہیں ضرور پیسے ملے

”میں نے فون کیا تھا اور مجھے لگتا ہے، نیل بھائی وہ جھوٹ بول رہی تھیں، انہیں ضرور پیسے ملے

تھیں۔“ نیل نے اس کے سکلے پر حیرت سے دیکھا پھر اپنے آپ سمجھ کر کہنے لگی۔ ”نیل بھائی نے ڈانٹ کر

ہاں آجہ کیا۔ ہر وقت ان کے سر پر سوار رہتی ہو۔“

”نیل! انہوں نے نیل ڈانٹا۔ مجھے تمہاری کابل پر غصہ آ رہا ہے۔ اس وقت سے کیا کر رہی تھیں جواب

دینے پر بھی استری کر دینا بھی تم نے بھی میرا کام کیا ہے۔“ اس نے فوراً ”اپنے سکلے کا زمہ دار مدیہ کو ٹھہرا

تھیں۔“

”میں کام کرنے کے لیے پیدا نہیں ہوئی۔“ مدیہ کے آرام سے کہنے پر وہ مزید چیخ گئی۔

”انہوں نے تو اب زادی ہو۔“

”بالکل ہوں۔ جا کر مدیہ۔ میرے باپ کے ہاں کتے ملازم ہوں گے۔“ مدیہ کے منہ سے پھر باپ کا سن کر وہ

ظہ کو کی پھر تاسف سے سر جھٹک کر بولی۔

”ختم غلطی کی ممانے۔ تمہیں شاہ سکندر کے حوالے کر دیتیں تو اچھا تھا آج حویلی والوں کی خدمت میں کرتی پھر

تھیں۔“

”میں خدمت میں کر رہی ہوتی۔“ مدیہ بہت زور سے ہنسی اُنداڑا لیا تھا جیسے یہ کام تم تو کر سکتی ہو۔ میں نہیں۔ اور

پھر غلطی۔“

”نیل آپ کو سمجھتی کیا ہو۔؟“ مدیہ اسی طرح ہنستی رہی تب وہ بڑبڑاتی ہوئی لائٹ آف کر کے اپنی جگہ پر آ

ٹپنے لگی۔

”میں استری نہیں کروں گی۔ صبح کالج سے دیر ہو جائے گی۔“ مدیہ نے ہنسی روک کر کہا۔

”نیل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مزید اس کی طرف سے کوئی بھی بدل گئی۔ اگلی شام نیل اسے اپنے ساتھ لے

گیا۔“

نہیں ہوں، تمہیں اگر بہت ضروری چاہیں تو خود جا کر میرا ریک کھنگال لو۔“ وہ ٹیس کی طرف جاتی ہوئی۔  
 ”ریک تو میں تمہارا کھنگال لوں گی پکے سے۔ بتاؤ تمہیں ہوا کیا ہے اور وہ دو کماں ہے؟“ ثوبیہ نے میز پر اس کے پیچھے آتے ہوئے پوچھا تو اس نے آخری بات کا جواب دیا۔  
 ”مدحو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ماما سے آرام کرنے کا کہہ چکی ہیں، لہذا وہ آرام فرما رہی ہیں۔“  
 ”ابو، بتاؤں کمو۔ تمہیں اس کا آرام فرمانا مہل رہا ہے۔“ ثوبیہ ہنسنے ہوئے بولی۔  
 ”نہیں، اس وقت وہ کوئی ہانا نہیں کر رہی۔ واقعی میں طبیعت خراب ہے اس کی جا کر دیکھ لو۔“  
 ہوئے بانیگ کی آواز پر نیچے دیکھا پھر ثوبیہ کا بازو ہلا کر پوچھنے لگی۔  
 ”یہ سونیا آپ کی کماں کی تھیں؟“  
 ”کسی دوست کے ہاں، ثوبیہ جواب دے کر مدحیہ کو دیکھنے اس کے کمرے میں چلی گئی تو اس نے اچھی پوچھ لیا۔

”کماں جا رہے ہیں۔؟“  
 ”چلو گی؟“ ”آخر نے کما تو وہ سمجھی اسے مدحیہ سمجھ کر ہلکا رہا ہے جب ہی ہنستی ہوئی بولی۔  
 ”مدحو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، وہ کہیں نہیں جاسکتی۔“  
 ”میں غم سے کہہ رہا ہوں۔“ ”آخر نے کما تو اس نے اپنی طرف اشارہ کیا پھر چانک کسی خیال سے رکنے کا کہہ کر ہنسنی ہوئی اپنے کمرے میں آئی اور الماری کھول کر اپنا پرس کھینچ لیا۔  
 ”توئی میں ذرا اصرار بھیانی کے ساتھ جاری ہوں۔ میرے آنے تک تم مدحو کے پاس بیٹھنا۔ میں بس اوروں میں آجاؤں گی۔“ وہ بہت عجلت میں کہتی ہوئی کمرے سے نکلی تھی۔  
 \* ☆ \* ☆ \*

وہ آفس سے لوٹا تو آگے عازم کے ساتھ بابا جان موجود تھے۔  
 ”السلام علیکم بابا جان،“ اس نے سلام کے ساتھ فوراً ”برہہ کر بابا جان کے پیروں چھوئے تو انہوں نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے ساتھ بٹھالیا۔  
 ”خوش رہو۔ مصروف زیادہ ہو گئے ہو یا شاہ پور کا راستہ بھول گئے ہو؟“ بابا جان نے وعادینے کے لئے اتنے مہینوں کی غیر حاضری کو ختم کیا تو وہ سر کھٹاتے ہوئے بولا۔  
 ”کھ کا راستہ کون بھولتا ہے بابا جان! بس نئی نوکری ہے، سوچتا ہوں اچھی طرح جم جاؤں پھر تو گھر ہی ویسے فون تو میں ہر دوسرے دن کرتا ہوں۔“  
 ”ہاں پتا چلتا ہے ہمیں۔“ بابا جان نے آہستہ سے اس کا کندھا تھپکا پھر عازم سے مخاطب ہوئے۔  
 ”ہو عازم آجاؤ بابا، پیچہ صاحب اسی وقت ملیں گے۔“  
 ”جی بابا جان جا رہا ہوں۔“ عازم اٹھ کھڑا ہوا۔  
 ”اور دیکھو۔ سات بجے سے پہلے آجاتا۔“ بابا جان نے تاکید کی۔  
 ”جی۔“ عازم اسے آنکھوں آنکھوں میں جانے کیا اشارہ کرتا ہوا نکل گیا اور وہ ابھی سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔  
 ”بابا جان نے اسے مخاطب کر لیا۔  
 ”تمہیں اس کی کوئی مسئلہ تو نہیں ہے۔“  
 ”جی نہیں، بہت آرام سے ہوں۔ اور اپنی جانب سے مطمئن۔ گھر میں اور آفس میں بھی کُل ہے۔“ اس نے اپنی طرف سے پورا اطمینان دلایا۔  
 ”لیکن ہم تمہارے اکیلے رہنے سے مطمئن نہیں ہیں اس لیے ہم نے سوچا ہے کہ جلد تمہاری شادی ویسے بھی اب ماشاء اللہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے ہو اور شادی کی عمر بھی یہی ہے۔“ بابا جان جیسے کہ رہے تھے وہ اسی قدر بے چین ہو رہا تھا۔

”اس روز تمہارے اماں بابا بھی اسی سلسلے میں بات کر رہے تھے۔ جمائیکر کو شہر مانو کی بیٹی پسند ہے اور تمہاری بہن کی آواز پر بابا جان کی بات ادھوری رہ گئی۔ اس نے محض اس موضوع سے بچنے کی خاطر اٹھ کر جانا چاہا۔ اس سے پہلے ہی کہہ دینا چاہا تھا۔“  
 ”ابو، کیا کہہ رہے تھے؟“ بابا جان نے اسے دیکھا تو وہ اندر ہی اندر جڑبڑہو کر بولا۔  
 ”ابو، بابا بے بارے میں غلط سوچ رہے ہیں۔ پہلے انہیں بیٹیوں سے فارغ ہونا چاہئے۔“  
 ”کیا ساتھ ساتھ ہی کر دیں گے۔“ بابا جان نے کما تب ہی کرم دین اگر اس سے بولا۔  
 ”ابو، کوئی مصاحبت لی لی آتی ہیں۔“  
 ”ابو، کوئی جگہ سائنٹ ہوا غالباً“ بابا جان کی وجہ سے ورنہ شاید اٹھ کر کھانا پھر بہت سنبھل کر بولا تب

بابا جان۔ میری ممان۔“  
 ”بابا جان، کھڑا رکھا ہے ممان کو۔ جاؤ کرم دین! اندر لے آؤ۔“ انہیں بابا جان کرم دین سے کما پھر اسے دیکھا تاہو بولا۔  
 ”بابا جان، آپ اگر کچھ دیر آرام کرنا چاہیں تو۔“  
 ”نہیں بہت آرام کر چکے، ہم تمہارے آنے سے پہلے۔“ بابا جان نے کما پھر گلاس ڈور سے داخل ہوتی لڑکی کو لگے جو بہت نروس لگ رہی تھی اور کافی فاصلے پر رگ کر بولی۔  
 ”سلام علیکم۔ علی جمائیکر سے آواز پر فوراً پلٹ کر اسے دیکھا اور ایک پل کو بابا جان کی موجودگی فراموش کر گئی۔  
 ”سلام، کیسی ہیں آپ۔؟“  
 ”میں یہ۔“ وہ جلدی سے اپنا پرس کھولنے لگی۔

”سب بعد میں۔ پہلے آپ شریف رکھیں۔“ اس نے کما تو مصاحبت جانے کس خیال کے تحت پلٹ کر ہال سے باہر دیکھنے لگی۔  
 ”ابو، ابھی سے آپ کے ساتھ۔؟“ اس نے سمجھ کر پوچھا۔  
 ”جی نہیں، وہ بہت نروس ہو رہی تھی۔“  
 ”ابو، پوچھی، آرام سے بیٹھ کر بات کرو۔ اتنا گھبرا کیوں رہی ہو۔“ بابا جان نے نرمی سے کما تو وہ ایک بزرگ کی طرح پرسکون ہو گئی اور ان کے قریبی صوفے کا انتخاب کر کے وہیں جا بیٹھی۔  
 ”ابو، امان پچی کے لیے کوئی۔“ بابا جان نے اسے مخاطب کر کے اسی قدر کما تھا کہ وہ بول پڑی۔  
 ”نہیں شکریہ۔ بس آپ اپنے۔“

”ابو، پوچھنے پر اتنی رگھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر غالباً ”چائے وغیرہ کا کہنے کے لیے فوراً“ سے نکل گیا تھا۔  
 ”ابو، ایک نظر بابا جان کو دیکھ کر سر جھکا لیا کیونکہ وہ بڑی گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہے تھے اور نہ صرف اسے پوچھنے لگے۔  
 ”ابو، تمہارا۔؟“  
 ”ابو، مصاحبت شاہ۔“ اس نے بہت سنبھل کر جواب دیا۔  
 ”ابو، پوچھتی ہو۔؟“ بابا جان جانے بوی کی بات کرنے کی غرض سے سوال کرنے لگے یا باتوں باتوں میں پوچھنا اور علی سے تعلق جانا چاہتے تھے۔  
 ”ابو، کرم دین میں ہوں۔“  
 ”ابو، تمہارے والد کیا کرتے ہیں۔؟“

”وہ۔۔۔“ پھر زور سے ہو گئی۔ سمجھ میں نہیں آیا کیا جواب دے اور بابا جان اپنے طور پر سمجھ کر اترے۔

”اوہ نہیں۔۔۔۔۔“

صباح کے دل کو دھچکا سا لگا۔ فوراً بول پڑی تھی۔

”جی نہیں، میرے والد بہت بڑے آدمی ہیں۔ آپ نے ان کا نام ضرور سنا ہو گا۔ شاہ سکندر حیات فرہیاتہ مشرق۔“

بابا جان کی آنکھوں میں اچانک بے پناہ تحیر سمٹ آیا تھا اور ساتھ میں کچھ یقین اور کچھ غیر یقینی کی لہر تھی۔ پھر اسی عالم میں بولے۔

”تم شاہ سکندر حیات کی بیٹی ہو۔“

”جی۔۔۔۔۔ لیکن میں ان کے ساتھ نہیں رہتی۔ میں اپنی ماما کے ساتھ رہتی ہوں۔ میری ماما ڈاکٹر ہیں۔ اور انجانے میں ان پر بڑے انکشاف کر رہی تھی۔“

”ہوں۔“ بابا جان نے پر سوچ انداز میں ذرا سا سر ہلایا پھر پوچھنے لگے۔ ”صلی کے ساتھ کب سے دوستی ہے؟“

”جی نہیں۔ میری کوئی دوستی نہیں ہے۔ میں تو انہیں پیسے دینے آئی ہوں۔ آپ انہیں بلائیں۔“ وہ بولنے کے ساتھ اپنا پرس نکالنے لگی تھی۔ تب ہی وہ خود ڈرائی وہلکا ہوا آیا تو بابا جان اسے دیکھ لگے۔

”صلی! یہ جی تمہیں کس بات کے پیسے دینے آئی ہے؟“

”وہ انہوں نے میرا گھداں تو ڈوبا تھا بابا جان!“ وہ سمجھ گیا کہ وہ بابا جان کو اپنی آمد کا مقصد بتا چکی ہے؛ چونکہ بغیر کئے لگا۔ ”اسی کے پیسے دینے آئی ہوں گی۔ ایک بار پہلے بھی بھجوا چکی ہیں جو کرم دین کے نہ تھے۔“

”ہائیں!“ وہ اچھل پڑی۔ ”یہ کرم دین کون ہے؟“

”میرا ملازم اور میں نے آپ کو اس لیے بلایا تھا کہ آپ کی امانت واپس کر سکوں نہ کہ مزید پیسے لینے کے لیے۔“ صلی جہانگیر نے اس کا پہلے سے بھجوا ہوا الفافہ جیب سے نکال کر اس کی طرف برہمائی کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”معاف کیجئے گا، آپ بہت۔۔۔“ وہ ایک دم ہونٹ بھیج گئی پھر خامسے جا رہا نہ انداز میں سامنے سے ہوئی تیز قدموں سے باہر نکلتی چلی گئی تھی۔

صلی جہانگیر نے کچھ بوکھلا کر بابا جان کو دیکھا پھر اس کے پیچھے آیا تھا لیکن برآمدے ہی میں رک گیا کیونکہ وہ بایک برتن بھٹی نظر آئی تھی اور پھر فوراً ہی بایک نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

”مائی گاؤ!“ صلی جہانگیر اس صورت حال سے خاصا بد دل سا ہو کر مزید آگے بابا جان کا سامنا کرنے پریشان ہو گیا۔ دل چاہا میں سے کہیں باہر نکلا۔ اے اور پھر بابا جان کے جانے کے بعد ہی واپس لوٹے کے غصے سے اچھی طرح واقف تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ ایسے معاملات میں وہ کس طرح دخلت کرے؟

فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ اپنے تایا شاہ یونس حیات کے بیٹے کی آنا ”فانا“ شادی وہ بھولا نہیں تھا اور ابھی با آئے سے پہلے اس کے بارے میں بھی تو کچھ کہہ رہے تھے۔ پھر پھو شہرانا کی بیٹی یا پھر۔

”اوہ نو!“ اس نے فوراً ”سر جہانگیر بہت ہمت کر کے اندر آیا۔ بابا جان کسی گہری سوچ میں تھے۔“

بھی نہیں دیکھا۔

”آپ کے لیے جائے بناؤں بابا جان؟“ اس نے بیٹھنے کے ساتھ کچھ ڈرتے ڈرتے انہیں مخاطب کر کے ساتھ انہوں نے گہری سانس چھیننی پھر اسے دیکھ کر پوچھنے لگے۔

”کچھ کہا تم نے؟“

”جی چاہئے۔“

”ہاں ناؤ، میری بی بی لیتے ہیں۔ وہ بچی تو ناراض ہو کر چلی گئی۔“ بابا جان نے کہا تو وہ نظریں چرا کر بولا۔

”ہاں وہ میری غلطی ہے۔ مجھے اس سے جھوٹ نہیں بولنا چاہیے تھا۔“

”جی سے جانتے ہو اسے؟“ بابا جان کے ہلکے پھٹکے انداز سے وہ ٹھٹھک گیا۔

”میں میں زیادہ نہیں جانتا بابا جان! بس ایک دو باری ملاقات ہوئی ہے۔“

”مجھی لڑکی ہے۔ تمہیں پسند ہے؟“ بابا جان نے اس کے جواب کو یکسر نظر انداز کر کے پوچھا۔

”جی! اس کا جی نہ سمجھنے والا تھا جس پر بابا جان براہ راست اسے دیکھ کر بولے۔

”مگر میں پسند تو پسند کر لو کیونکہ ہم اسے تمہارے لیے پسند کر چکے ہیں۔“

”جی! اس کا تجیر انتہا کو چھو گیا تھا۔“

”ہاں جی جی نگار ہے ہو، ہماری باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آرہیں۔ وہ لڑکی صبح شاہ اسے ہم جلد سے جلد اس گھر میں لانا چاہتے ہیں کیونکہ ہمیں تمہارا اکیلا رونا پسند نہیں۔“

بابا جان نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کما تب بھی اسے اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آیا۔

”کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“

”تمہاری اور صبح کی شادی کیا تمہیں اس پر اعتراض ہے؟“



”نہیں لیکن میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔“ صلی جہانگیر نے ایک طرح سے اس کے اتنے پتے سے اعلیٰ کا اظہار کیا تھا۔

”ہم جانتے ہیں اور جتنا جانتے ہیں۔ اس سے زیادہ جاننے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔“ بابا جان نے کہا تو وہ مزید جہان ہوا۔

”آپ کیسے جانتے ہیں؟“

”ہمارا خون ہے وہ ہمارے سکندر کی بیٹی، سکندر نے تو ہمیں نہیں بتایا لیکن دیکھ لو قدرت نے کیسے ہمارے خون کو ہم سے ملا دیا۔“ بابا جان کی آنکھیں جانے کس خیال سے چمکنے لگی تھیں پھر ایک دم جیسے اپنے اس خیال سے کل کر گئے، یہ بات ابھی تم کسی سے نہیں کہو گے۔ خاص طور سے اس لڑکی پر اپنا آپ ظاہر نہیں کرنا یعنی اسے یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ تمہارا تعلق شاہ پور سے ہے۔ سمجھئے۔“

”میں کچھ کہیں سمجھ رہا۔“ وہ واقعی الجھ گیا تھا۔

بابا جان کچھ دیر تک اسے دیکھتے رہے پھر کہنے لگے۔

”یہ بات تو ضرور تمہارے علم میں ہو گی کہ سکندر نے یہاں شہر میں بھی شادی کی تھی۔ یہ لڑکی صبح اس کی بیٹی ہے۔ ابھی اس نے ہمیں اپنے باپ کا نام شاہ سکندر حیات بتا دیا ہے اور یہ کہ وہ ہیاتہ مشرق ہیں اس کے بعد کسی نمائندگی کی تلاش نہیں رہ جاتی۔“

بابا جان نے ہمیں یہ تو بتایا تھا کہ یہاں اس کی بیوی ماں بننے والی ہے۔ اس کے بعد کبھی کوئی ذکر نہیں کیا ہوتا ہے اس عورت نے چالاکی کی ہو اور سکندر سے بیٹی چھپائی ہو یا بیٹی صورت میں وہ اپنی بیٹی کی صورت میں نہیں دے گی اور ہم ہر قیمت پر اسے حاصل کریں گے۔ تم ہماری بات سمجھ رہے ہو نا۔“

”وہ تو غور سن رہا تھا اور سمجھ بھی رہا تھا۔ اس نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔“

”بس تو جب تک صبحت اس گھر میں نہیں آجاتی تب تک اس پر اپنا آپ ظاہر نہیں کرنا پاتا۔ گے کہ اس کی ہاں تک کیسے پہنچا جائے۔“ بابا جان نے کہا تو کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ پوچھنے لگا۔  
 ”اور بچا جان، میرا مطلب ہے، انہیں آپ بتائیں گے یا بے خبر رہیں گے۔“  
 ”ابھی تم کچھ نہیں کہہ سکتے اور یہ سوچنا تمہارا کام نہیں ہے۔ تم بس شادی کی تیاری کرو۔“  
 بابا جان نے اس کا کندھا تھپکا تو وہ سر جھکا کر کسی خیال سے ہنسکرایا تھا۔

صبحت واپس آئی تو برآمدے میں بیٹھے نبیل اسے دیکھتے ہی پوچھنے لگے۔  
 ”تم کہاں گئی تھیں؟“

”احمر بھائی کے ساتھ گلدان والی خاتون کے گھر۔“ وہ کرسی ان کے قریب کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔  
 ”میے دے دیے؟“

”نہیں، میرا مطلب ہے میں پیسے دینے ہی گئی تھی لیکن آگے انہوں نے بتایا کہ پہلے میں نے جو وہ انہیں مل گئے ہیں۔ اصل میں ان کے ملازم نے وصول کیے تھے اور شاید انہیں دینا بھول گیا تھا۔ معذرت کر رہی تھیں۔“ وہ اس صورت حال کے لیے پہلے سے تیار بھی بغیر جھجکے بول گئی۔  
 ”چلو تمہاری بچت ہو گئی اور سنو، آئندہ اگر ایسی کوئی بات ہو تو مجھے فوراً بتانا۔“ نبیل کی تاکید پر اثبات میں سر ہلایا پھر ایک دم ہاد آتے پر پوچھنے لگی۔

”مدھو کی طبیعت کیسی ہے؟ تو یہ ہے اس کے پاس یا چلی گئی۔“  
 ”کیا وہ مدھو کو؟“ نبیل نے چونک کر دیکھا۔

”دوپہر میں گلے میں تکلیف کی شکایت کر رہی تھی پھر سو کر اٹھی تو بخار بھی تھا۔ ممداد بے گئی؟  
 نے گرم پانی سے غرارے کرنے کو بھی کہا تھا جو شاید مجھے کرنے نہ دیں گے۔“ وہ بولتی ہوئی اٹھ کھڑی ہو کر نے نہیں کروانے۔“ نبیل کے تصحیح کرنے پر وہ ہنستی ہوئی کمرے میں آئی تھی۔  
 مدحہ اور توشیہ لڈو کھیلنے میں مصروف تھیں۔ اس نے فوراً ”تو کتنے کے بجائے پہلے اپنا پرس المارڈ کھڑکی سے پردے میں مینے ہوئے نہ لگی۔“

”مغرب کا وقت ہو رہا ہے، کچھ دیر کے لیے کھیل بند کرو۔“

”آگئی بڑی بی۔“ مدحہ اپنی گوٹ چلتی ہوئی بڑی دانی تو توشیہ بے ساختہ ہنسی جس پر وہ اسے دیکھ کر پوچھ  
 ”تم نے اپنے ٹولس تلاش کر لیے؟“

”نہیں یہ گیم ختم ہو جائے پھر کروں گی بلکہ تم دیکھ لو۔“ توشیہ نے کہا۔ تو اس بار مدحہ زور سے ہنس کر  
 ”کیا ہوا۔“ توشیہ کو اس کی ہنسی سمجھ میں نہیں آئی جبکہ وہ سمجھ گئی اور کچھ کہنا چاہتی تھی کہ عمر کے  
 کا دھیان ادھر منتقل ہو گیا وہ برآمدے میں نبیل بھائی سے پتا نہیں کیا کہ رہا تھا۔  
 مدحہ اور توشیہ بھی لڈو چھوڑ کر سننے کی کوشش کرنے لگی تھیں پھر مدحہ اسے دیکھ کر بولی۔  
 ”دیکھو تو صبا! کون آیا ہے؟“

”عمر ہے، پتا نہیں کیا کہہ رہا ہے۔“ اس نے کہا پھر جانے لگی تھی کہ عمرو ہیں آگیا۔  
 ”احمر بھائی نہیں ہیں یہاں کہاں گئے؟“ عمر نے کمرے میں نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔  
 ”وہ دوست کی بایک واپس کرنے گئے ہیں۔ خیریت کیا ہوا۔“ اس نے جواب کے ساتھ پوچھا۔  
 ”ان کا رزلٹ آیا ہے۔ فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن لی ہے انہوں نے۔“ عمر نے خاصے پر جوڑ  
 تو تینوں خوشی سے چیخ پڑیں۔

”وائفی کہاں رہ گئے احمر بھائی، ہم ان سے ٹریٹ لیں گے۔“

”ڈبل ٹریٹ کیونکہ اس کا لڑشپ پر ان کا امریکہ جانے کا خواب بھی سمجھو پورا ہو گیا۔“

”کہا تو اس بار خوشی کے اظہار میں مدحہ شریک نہیں تھی۔ خاموشی سے صبحت اور توشیہ کو دیکھنے لگی پھر  
 نے عمر اس کے پاس آ بیٹھا اور جھک کر اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے شرارت سے بولا۔  
 ”ابھی فوراً تو نہیں جا رہے جو آپ اداس ہو سکیں۔“

”کیوں اداس ہوں گی۔“ مدحہ نے اسے گھور کر دیکھا تب ہی احمر اندر آتے ہوئے بولا۔  
 ”دشمنوں کی طبیعت ناساز ہے۔“

”صبحت نے کہا تو عمر فوراً بولا۔

”صرف اداسی ہے۔ ایک منٹ کے لیے سب خاموش ہو جائیں۔ ذرا مدھو کو گانے دیں ہاں مدھو کیا گاؤ

بانے والے رے شہر ذرا رک جاؤ۔“

نیا قاعدہ گانا شروع کیا تو مدحہ نے تکیہ اٹھا کر اس کے منہ پر کھینچ مارا۔

”رے رے کیا ہو رہا ہے۔“ احمر نے عمر کی جوابی کارروائی سے پہلے ہی اس کا بازو پکڑ کر وہاں سے اٹھا دیا۔ پھر  
 لب لباب کو دیکھ کر بولا۔ ”نہیں تم لوگوں کو خوش خبری سنانے آیا تھا لیکن اب ہمیں بتاؤں گا۔“

”نہیں، ہم پھر بھی ٹریٹ ضرور میں گے۔“ توشیہ نے کہا تو احمر نے چونک کر اسے دیکھا پھر کرسی کھینچ کر بیٹھتے  
 ایک خبر پہنچ گئی۔“

”بہت بہت مبارک ہو اور اب جلدی سے بتائیں، ٹریٹ کب دے رہے ہیں۔“ صبحت نے  
 کے ساتھ فوراً ”ٹریٹ کا مطالبہ کیا۔

”ابھی میں دوں۔“ احمر نے بول دیکھا جسے اس نے الٹی بات کہہ دی ہو۔

”نہیں تو تیار ہو دیں گے۔ جی نہیں، آپ کو دینی ہوگی اور زبردست قسم کی، ابھی پروگرام بنائیں۔“ صبحت  
 نے شور مچایا تھا۔

”شور نہ کر کمرے میں آئے اور دونوں کو خاموش کرانے کے بعد پوچھنے لگے۔  
 حائل ہے؟“

”پاس ہونے کی خوشی منائی جا رہی ہے۔“ احمر نے کہا تو صبحت پھر چیخ پڑی۔

”میں ہمہما قاعدہ خوشی منانے کی بات کر رہی ہیں۔“

”جیب خرچ پر۔“ احمر نے غلڑا لگایا تو نبیل بے ساختہ مسکرائے پھر آگے آکر مدحہ کے بیڈ پر بیٹھتے

”وائفی زیادتی ہے۔“

”کیوں نبیل بھائی۔ فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن لی ہے احمر بھائی نے تو کیا اس خوشی میں ہمیں ٹریٹ  
 بسے۔“ صبحت نے احتجاج کرتے ہوئے کہا تو نبیل نے اس کی بھی تائید کر دی۔

”اچھا ہے۔“ پھر مدحہ کی خاموشی محسوس کر کے اسے ٹوکا۔ ”کیوں مدھو! تم کیوں خاموش ہو کیا تمہیں احمر  
 کی خوشی نہیں ہوئی۔“

”نہیں، اس کو تو بہت خوش ہوئی تھی۔“ مدحہ سے پہلے عمر بول پڑا۔ ”لیکن جب احمر بھائی کے باہر جانے کا  
 ہو گیا۔“

”چونکہ مدحہ کو دیکھا تھا جو عمر کی بات سن کر انجان بننے کی کوشش کرنے لگی تھی اور جب کامیابی  
 ہو اس پر بگڑ گئی۔“

”نہیں، نبیل اور تمہاری آنکھیں بھی کمزور ہیں۔“

”نہیں دیکھ رہا میں۔ دل سے محسوس کر رہا ہوں تمہاری اداسی، اور میرا دل بالکل ٹھیک کام کرتا



ہے کہیں تم اسے بھی کمزور بنا دو۔“ عمر نے لڑنے کے انداز میں کہا۔  
 ”بس، اب لڑنا مت شروع کرو۔ نیل بھائی منع کریں انہیں۔“ صابحت نے بد مزگی کے ذرا غفلت کی تو نیل نے تنبیہ کرنے میں دیر نہیں کی۔  
 ”ہاں، بھی یہ لڑنے کا موقع نہیں ہے، آرام سے بات کرو۔“  
 ”میں آرام سے ہی بات کر رہا تھا اور کوئی غلط بات بھی نہیں کی آپ خود دیکھ لیں مدحو کے چہرے  
 ”باس۔“ نیل نے ہاتھ اٹھا کر عمر کو بولنے سے روک دیا پھر کہنے لگے۔  
 ”بات ہو رہی تھی باقاعدہ خوشی منانے کی اور وہ بھی احمر کے خرچ پر۔ اب احمر سے پوچھنا یہ  
 کرنے پر اعتراض کیوں ہے۔“  
 ”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے نیل بھائی! آپ جب چاہیں مجھ سے ٹیٹ لے لیں۔“ احمر نے  
 باری باری سب کو دیکھ کر بولے۔  
 ”لو احمر تو تیار ہے۔ اب تم لوگ پروگرام سیٹ کر لو۔ لیکن کوئی لمبا چوڑا پروگرام مت بنالیا!  
 پارٹی ٹھیک رہے گی۔ کیوں مدحو؟“ آخر میں انہوں نے بلا ارادہ مدحیہ کو مخاطب کیا تھا اور وہ کندہ  
 سے بولی۔

”مجھے کیا پتا۔“  
 ”مدحو کو نہیں چھینس نیل بھائی! آپ کو پتا تو ہے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ صابحت  
 کہ کوئی محسوس نہ کرے فوراً بات بناتے ہوئے بولی ”ورنہ یہ ہو سکتا ہے کہ مدحو کسی پروگرام میں  
 نہیں چلو مدحو! تم آرام کرو اور ہاں تم نے دوائی کہ نہیں۔“  
 مدحیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔  
 ”بہت اے کچھ کھلا دو پھر دیتا۔“ نیل اٹھتے ہوئے بولے تو ان کی تھلید میں احمر بھی کھڑا ہو  
 بچا کر مدحیہ کو جانے کیا اشارہ کیا کہ اس نے مسکرا کر سر جھکا لیا تھا۔

\*\*\*

رات کے کھانے کے بعد شاہ سکندر اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے کہ ان کی بیٹی الماس  
 کے بولی۔

”ہاما! آپ کو بابا جان یاد کر رہے تھے۔“

”جی ہاں! آپ انہوں نے رک کر پوچھا۔“

”جی کہہ رہے تھے کھانے کے بعد آپ ان سے مل لیں۔“ الماس نے کہا تو انہوں نے خواہ  
 جان کے کمرے کا رخ کیا کیونکہ اس وقت وہ سیاسی حالات پر باتیں کرنے اور سننے کے موڈ میں  
 جان کے پاس جب سے وہ فشر بنے تھے ہی ایک موضوع تھا۔  
 ”السلام علیکم بابا جان!“ انہوں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سلام کرنے کے ساتھ پوچھا

”اب تو ہم تمہیں یاد ہی کرتے ہیں۔ ملاقات تو کبھی کبھار ہوتی ہے۔“ اوٹینہو۔“ بابا جان کا  
 تھا۔

شاہ سکندر خاموشی سے ان کے پاس بیٹھ گئے تو بابا جان نے پہلے وہی سیاست کا موضوع چھیڑ  
 لگے۔

”ہر دوسرے دن کی آمد و رفت سے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ تم کراچی ہی میں رہائش اختیار کر  
 وہیں لے جاؤ۔“  
 ”نہیں بابا جان! اول تو یہ آمد و رفت کوئی مسئلہ نہیں ہے دوسرے مہر النساء بھی کراچی؟

”شاہ سکندر نے کہا تو بابا جان قصداً ”تعب کے اظہار کے ساتھ بولے۔  
 ”میں مہر النساء آمادہ کیوں نہیں ہوگی۔ کیا اسے ابھی بھی کوئی خدشہ ہے۔؟“

”نہیں خدشہ۔؟“ شاہ سکندر فوراً ”سمجھ نہیں پاتے۔“

”دو جوتم نے ایک غلطی کی تھی۔ ہمارا مطلب بے شادی۔“ بظاہر بابا جان کا انداز سرسری سا تھا۔  
 ”شاہ سکندر ہونٹ بھیج کر دوسری سمت دیکھنے لگے، وہ بھولے نہیں تھے، لیکن اتنے برسوں بعد بابا جان نے ذکر  
 سے انہیں اذیت سے دوچار کر دیا تھا۔

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے  
 بی بی متوجہ کیے بغیر کہا پھر جیسے یاد کرتے ہوئے بولے۔ ”اس سے بھی تو تمہاری اولاد تھی۔ وہ کیا نام تھا اس ڈاکٹری

”ابا تیبہ۔“  
 ”شاہ سکندر نے چونک کر انہیں دیکھا لیکن ان کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہیں تھا جس سے پتا چلتا کہ وہ کسی  
 میں مقصد سے یہ موضوع لے بیٹھے ہیں اور انہیں اپنی طرف دیکھتے یا کر بابا جان پوچھنے لگے۔

”ہاں اسے اس کے پاس بیٹھا بیٹی۔؟“  
 ”مجھے نہیں معلوم، جب میں نے اسے طلاق دی تھی۔ اس وقت وہ ماں نہیں بنی تھی۔“ شاہ سکندر نظریں چرا  
 روئے تھے۔

”بعد میں بھی تم نے معلوم نہیں کیا۔؟“ بابا جان کی کھوجتی ہوئی نظریں ان کے چہرے پر جم گئیں اور وہ بہت  
 رنے کے بعد بولے تھے۔

”نہیں اور کیوں معلوم کرتا جب آپ اسے اپنا، اپنے خاندان کا نام دینے پر تیار ہی نہیں تھے پھر اس کے لیے  
 تر تھا کہ وہ صرف اپنی ماں کو بچانے اور بس۔“

”وہ بے شک اپنی ماں کو بچانے لے لیکن خود اسے اپنی بچپان کے لیے کیا باب کے نام کی ضرورت نہیں ہوگی۔ بے  
 کے نام کی اولاد کا کوئی مستقبل نہیں ہو تا سکندر۔ فرض کرو اگر کوئی بیٹی ہوئی تو کون شادی کرے گا اس سے۔؟“ بابا  
 نے ایک بار پھر ان کی شہرہ رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا کہ وہ چکر لگے۔

”ایسا کیا کرنا چاہتے ہیں آپ۔؟“  
 ”یہی کہ اپنی اولاد کو لاوارثوں کی طرح مت چھوڑو۔ اگر بیٹا ہے تو اسے اس کا حق دو تاکہ وہ اپنی زندگی سنوار سکے  
 لڑتی ہے تو اسے یہاں لانے کی تدبیر کرو۔ اپنا اپنے خاندان کا نام دے کر اسے رخصت کرو گے تو ساری زندگی  
 بارے کی وہ دور نہ۔“ بابا جان نے قصداً ”بات ادھوری چھوڑ کر انہیں دیکھا تو وہ بمشکل سنبھل کر کہنے لگے۔

”آپ کی بات ٹھیک ہے بابا جان! لیکن ہمارا اب کوئی اختیار نہیں کیونکہ میں نے آئیہ سے وعدہ کیا تھا کہ میں  
 لی زندگی میں مداخلت نہیں کروں گا۔ اس کے بعد بھی اگر میں ان کے در پر سوالی بن کر جاؤں تب بھی وہ کسی  
 نہ پرائی اولاد کو یہاں بھیجے پر آمادہ نہیں ہوں گی۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ آپ اس بات کو یقیناً ختم کر دیں۔

”جی لکھی ذہین خاتون تھیں انہوں نے یقیناً ”اولاد کی اچھی پرورش کی ہوگی اور آئندہ بھی اس کے لیے دینی  
 نیک کر سکیں گی۔“

”وہ تو بھی اچھی پرورش کرے باپ کا نام دے بغیر اولاد کو کہیں بھی باعزت مقام نہیں دلا سکتی۔ خصوصاً بیٹی  
 ”بابا جان نے کہا تو شاہ سکندر نے یوں ہونٹ پیچھے پیچھے خود کو کچھ کہنے سے باز رکھا ہو۔

”چنانچہ ناموشی چھائی رہی۔ پھر بابا جان ہنکارا بھر کر بولے۔  
 ”یوں تم اگر خود کو آئیہ سے کے وعدے کا پابند سمجھ کر اس کی زندگی میں مداخلت نہیں کرنا چاہتے تو ٹھیک ہے  
 یہ معاملے سے دور رہو، ہم خود کوئی تدبیر کر لیں گے۔“

”نہیں بابا جان! اب آپ کچھ نہیں کریں گے۔“ شاہ سکندر فوراً ”بولے تھے۔ ”میں نے آپ کے کہنے پر آئیہ  
 نکلنے کی شرط پڑی تھی کہ آپ بھی اس کی زندگی میں مداخلت نہیں کریں گے اور آپ نے وعدہ کیا تھا۔“

”یاد ہے ہمیں، بھولے نہیں ہیں۔ ہمیں اس عورت سے کوئی سروکار نہیں، ہم صرف تمہاری اولاد کی سوچ رہے ہیں۔ تمہیں بھی سوچنی چاہیے۔ اگر بچی ہے تو اس کے لیے اسی جوتلی میں رشتے موجود ہیں۔ جہاں گھیر کے بیٹوں میں سے تم جس کے ساتھ کوٹے، ہم اس کی شادی کر دیں گے۔ اس طرح تمہاری بچی کو قریب رہنے کی لیکن مسئلہ وہی ہے کہ وہ عورت آسہ نہیں مانے گی۔“ بابا جان نے دھیر سے بات کرتے ہوئے آخر میں کچھ شغریں کما تھا۔

شاہ سکندر پر سوچ انداز میں انہیں دیکھتے گئے بولے کچھ نہیں۔

”اور ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم شاہوں کی بیٹیاں غیروں میں نہیں بیاہی جاتیں، ہم آسہ کے ساتھ کوٹے کرنے نہیں جا رہے۔ آخر کہیں نہ کہیں تو اسے بیٹی بیاہنی ہوگی۔ ساری زندگی اپنے پاس تو نہیں بٹھا رہے گی۔ پھر کیوں نہ اس بیٹی کو اس کا اصل گھر اصل مقام مل جائے۔ ہم ٹھیک کہہ رہے ہیں ناں۔“

بابا جان نے اپنی بات کی تصدیق کے لیے شاہ سکندر کو سوچوں کے بھنور سے نکالا تو وہ گہری سانس کھینچ کر بولے۔

”کہہ تو آپ ٹھیک رہے ہیں لیکن۔“

”تم صرف ہائی بھرو۔“ بابا جان فوراً بول پڑے۔ ”باقی سارے کام ہمارے اور ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ آسہ سے بیٹی چھین کر نہیں لائیں گے بلکہ اسی کے گھر سے شاہ علی جہانگیر کے ساتھ بیاہ کر لائیں گے۔“

شاہ سکندر نے کچھ دیر سوچنے کے بعد ان بات میں سر ہلایا پھر محض اپنی بات رکھنے کی خاطر کہنے لگے۔

”اب بتائیں بابا جان، آسہ کے پاس بیٹی ہے یا بیٹا۔“

”ہم معلوم کر لیں گے۔ بیٹا ہوا تب بھی ہم اس کے لیے بہت کچھ کریں گے۔“ بابا جان نے اندر ہی اندر منہ ہمو کر کہا تھا۔

”اچھی بات ہے اب آپ آرام کریں۔“ شاہ سکندر اٹھ کھڑے ہوئے اور شب بخیر کہہ کر کمرے سے نکلے ان کے ذہن پر اپنی ہی بات دستک دینے لگی تھی۔

”بتاتے آسہ! میں نے کیا سوچا ہے اگر ہماری بیٹی ہوئی تو ہم اس کی شادی علی جہانگیر کے ساتھ کریں گے۔“ علی جہانگیر کے لیے یہ انکشاف بڑا خوش کن تھا کہ صحبت اس کی عمر زاد ہے اس کے بعد بابا جان نے اس کے ساتھ اس کی شادی کا طے کر کے تو گویا اسے پھر سے زندہ کر دیا تھا۔ اس کے باوجود وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی زبردستی ہو۔ کیونکہ اس کے پیش نظر صرف اپنی خوشی نہیں تھی۔ وہ اس سے بھی اس کی فز معلوم کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے ضروری نہیں تھا کہ وہ اس پر اپنا آپ ظاہر کرے۔ وہ اپنے اسی پرانے سے خود کو اس کے سامنے کھڑا کر سکتا تھا۔ یوں جیسے اتفاقاً ”سامنا ہوا ہو جیسے پہلے کی بیاہ ہوا تھا اور اس کے لیے شام لا بری جانے لگا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس روز یہاں سے وہ جو کتابیں لے گئی تھی۔ وہ واپس کرنے آئے گی اور وہ انہی بھی تو آپس میں نہیں سمجھی اس کے ساتھ دوسری لڑکی کو دیکھ کر وہ خاصا جڑبڑہوا پھر نظر اہراجن۔ سارا دھیان اس پر رکھ کر انتظار کرنے لگا کہ کہیں تو وہ دوسری لڑکی ادھر ادھر ہوگی۔

وہ دونوں کتابیں دیکھتی ہوئی اس کی پشت پر الماری کے پاس آکھڑی ہوئیں تو اس کا دل چاہا ساری دامن چھوڑ کر اس کا ہاتھ پکڑ لے اور بغیر کسی تہدید کے پوچھنے کہ وہ اسے کیسا لگتا ہے اور ابھی وہ اپنے دل سے جرات کر گزرنے سے باز نہ کھینے کی سعی کر رہا تھا کہ اس کے ساتھ کھڑی دوسری لڑکی آگے بڑھتی نظر آئی فوراً ”کرسی دھکیل کر اٹھا اور اس کے برابر کھڑا ہوا کہ سابقہ انداز میں اسے متوجہ کیا۔

”ہیلو۔“

صحبت نے چونک کر اسے دیکھا پھر فوراً ”نظر انداز کر کے ٹوبہ کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگی تو وہ مجھ اگلی شخص سے اشارہ کرتا ہوا بولا۔

”آپ کی دوست ادھر جا رہی ہیں، جانے دیں یا اگر پکارنا چاہیں تو بے شک پکاریں گی کیونکہ مجھے جو کتابیں...

نے بھی کہہ سکتا ہوں۔

”یہاں آتا ہے آپ کو؟“ صحبت کچھ گھبرا کر اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

”جیت کچھ ہے لیکن اس وقت صرف اتنا کہوں گا کہ میں آپ کو پسند کرتا ہوں اور آپ کی طرف سے یہ باتوں کے آپ مجھے نا پسند نہیں کرتیں۔“ وہ اسے نظروں کی گرفت میں لے کر سوالیہ نشان بن گیا۔

”کابل یکبارگی بہت زور سے دھڑکا تھا بمشکل خود پر قابو پا کر بولی۔

”راہ میں یہ یقین نہ دوں تو؟“

”مجھوں گا آپ کے دل کی ہستی میں پہلے ہی کوئی اپنے نام کے پھول کھلا چکا ہے جس کی محبت میں آپ نے نکل چکی ہیں کہ۔“

”نہیں۔“ وہ بے اختیار اس کی بات کاٹ گئی۔ پھر احساس ہونے پر نظریں چراتے ہوئے بولی۔ ”آپ کو بارے میں کچھ قیاس کرنے اور مجھے کا کوئی حق نہیں ہے۔“

”نہیں، مجھے یہ حق میری محبت نے دیا ہے جس کا میں پوری ایمانداری سے اعتراف کرتے ہوئے آپ کو ی کر رہا ہوں اور جب تک آپ جواب نہیں دیں گی، میں یونہی قیاس کرتا رہوں گا اور ہر دوسرے موڑ پر ہلوں گا بھی ضرور۔“ وہ بے حد مضبوط لہجے میں بولا تھا۔

نت نے ذرا سی پللیں اٹھا کر اسے دیکھا پھر نظروں کا زاویہ بدل کر ٹوبہ کو دیکھنے لگی جو شیشے کی الماریوں میں باقی آخری سرے تک چلی گئی تھی۔

”کیس کی نہیں آپ؟“ اس نے ٹوکا تو صحبت نے ٹوبہ کی طرف سے دھیان ہٹا کر پھر اسے دیکھا اور نفی دیا تو وہ یوں کا سوال اٹھانے کے بجائے پوچھنے لگا۔

”نہیں گنجیج ہیں۔“ صحبت نے دوبارہ نفی میں سر ہلایا تو وہ بہت مطمئن سا ہو کر بولا۔

”ایک آخری بات میں آپ کو کیسا لگتا ہوں۔“

”نا اقول۔“ وہ کہہ کر آگے بڑھ گئی تو اس کے لیے کو دیکھتے ہوئے علی جہانگیر دھیرے سے مسکرایا تھا اس کے چہرے پر اترتے رنگوں کی قوس قزح دیکھ چکا تھا۔

”یوں کہاں چلی گئی تھیں۔“ وہ ٹوبہ کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی تھی کہ مدحیہ نے چلا کر پوچھا۔

”ٹوبہ! مختصر جواب دے کر وہیں برآمدے میں بیٹھ گئی تھی۔

”میں جاسکتی تھیں۔“ مدحیہ نے اس کی طرف سر موڑا۔ انداز ہنوز تھا جو اسے سخت ناگوار گزرا پھر بھی طے ہوئی۔

”میں نے پوچھ لیا تھا اور تم سو رہی تھیں ورنہ جاتے ہوئے تمہیں بھی ضرور بتا کر جاتی گو کہ یہ کوئی ایسا نہیں ہے۔“

”خٹک کہا۔“ عمر سنتا ہوا آگیا اور اس کی تائید کرنے کے بعد مدحیہ کو دیکھ کر بولا۔ ”تم کیا اس کی دادی ہو جو بدعرب جاتی ہو۔“

”دست چاقی مت بولا کرو۔“ مدحیہ نے اسے ٹوکا تو وہ لڑنے کے انداز میں کہنے لگا۔

”صرف تمہارا نہیں ہے سب کا ہے، ایسا میرا کیا غریب سب جاسکتے ہیں وہاں کوئی ٹیکس نہیں لگتا۔“

”تو بے ساختہ ہنسی اٹھی تھی۔

”مدحیہ نے نکتہ سے سر جھکا کر کہا۔“ تمہاری فضول باتوں پر فضول لوگ ہی بنتے ہیں۔“

”مطلب ہے ایک تمہیں چھوڑ کر باقی سب یہاں فضول ہیں بابا باب۔“ عمر خاصے بے دھتکے انداز میں ہنسا یہ مزہ سلگ کر کچھ کہنا چاہتی تھی کہ صحبت فوراً ”بول پڑی۔

”ایسا کوئی مطلب نہیں ہے عمر! یہ صرف تمہیں اور مجھے فضول سمجھتی ہے اور میرا خیال ہے غلط بھی ہے۔“

”تمہارا خیال بالکل غلط ہے۔ میں ثابت کر سکتا ہوں۔“ عمر نے کہا۔

”اچھا اچھا اس وقت نہیں پھر کبھی فرصت سے ثابت کرنا ابھی تو مجھے اور بہت کام ہیں۔“ صاحبزادہ سیڑھیاں بچھاٹک کر اوپر آگئی اور پہلے لائبریری سے لائی ہوئی کتابیں اپنے کمرے میں رکھیں پھر باہر پوچھنے لگی۔

”مدحو کو کیا ہوا ہے؟“

”ہوا ہے کیا پوچھ رہی ہو مجھ سے پوچھو۔“ عقب سے مدحیہ نے کہا تو اس نے فوراً پلٹ کر دیکھ کر کہا۔

”ہاں تم ہی بتاؤ۔“

”تمہیں یاد نہیں ہے، دوسرے میں ہم نے کیا پروگرام بنایا تھا پھر تم ٹوبہ کے ساتھ کیوں چلی گئیں؟“

”کہا تو وہ پیشانی پر ہاتھ مار کر بولی۔“

”وہ سواری سواری مدحو مجھے بالکل یاد نہیں رہا تھا، چلو ابھی چلتے ہیں۔“

”جی نہیں، تمہارے ساتھ تو اب میں کبھی نہیں جاؤں گی۔“ مدحیہ نے غصے سے کہا۔

”تمہاری مرضی ویسے پرمانے والی تو کوئی بات نہیں ہے۔ بس میں انسان ہوں بھول ہو گئی مجھے بھی کر رہی ہوں اس کے بعد بھی تمہارا غصہ نہیں جاتا۔“ وہ تاسف سے کہتی کچن میں داخل ہو گئی اور چائے کا پانی رکھ کر ہوا سے پوچھنے لگی۔

”نیل بھائی کہاں گئے ہیں ہوا۔؟“

”پتا نہیں بیٹا۔ ابھی تمہارے بڑے ماموں کا فون آیا تھا، وہ بھی پوچھ رہے تھے، اور کہہ رہے تھے کہ بہت دنوں سے ان کی طرف نہیں گئے۔“ ہوا نے کہا تو وہ خاصی متعجب ہوئی۔

”ہائیں، نیل بھائی بڑے ماموں کے ہاں نہیں گئے تو پھر روزانہ کہاں جاتے ہیں۔“

”کہیں بھی جاتے ہوں، تمہیں کیا۔“ دروازے کے پاس کھڑی مدحیہ نے ٹوٹنا ضروری سمجھا، ہانڈ بلی گئی تو وہ کچھ بے خیالی میں بوا کو دیکھنے لگی۔

”تھک تو ہے بیٹا، تم کیوں پریشان ہوئی ہو۔ نیل میاں کوئی بچہ تو نہیں ہیں۔“ ہوا نے اپنی کچھ، اسے تسلی دی تو وہ چونک کر بولی۔

”میں پریشان نہیں ہو رہی ہوا۔ خیر چھوڑیں، یہ باتیں آپ چائے پیئیں گی۔“

”نہیں اور مدحو کے لیے بھی نہیں بنانا۔ وہ ابھی بی کرینچے لگی تھی۔“

”اس کے لیے تو میں ویسے بھی نہیں بناؤں گی۔“ اس نے کہا پھر صرف اپنے لیے ایک گلاس میں ٹیس کی طرف نکل آئی۔

ابھی شام پوری طرح نہیں اتر چکی تھی۔ وہ ریٹنگ کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی اور چائے دھیرے دھیرے پینے لگتا ہے بھی لگی تھی۔ کوئی خوبصورت سا گیت تھا۔ جس کے بولوں میں ہو کر بیگانہ ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ شام گہری ہو چکی تھی۔ ہوا نے آکر لائٹ جلائی تب وہ بری طرح سوچنے لگی۔

”یہاں اکیلی کیوں بیٹھی ہو بیٹی۔؟“ ہوا نے غالباً ”یونہی پوچھ لیا تھا جب ہی جواب کا انتظار کیا۔“

گئیں۔ اس نے گہری سانس کھینچتے ہوئے سروانچا کیا تو نظروں کے عین سامنے شام کا پہلا ستارہ جگمگاٹا۔

اس کے ہونٹ آپ آپ مسکرانے لگے تھے کہ لگا ستارے کی جگہ اس چہرے نے لے لی جس نے تلے تلخ کر لینے والی آنکھیں بولنے لگی تھیں۔

”مجھے یہ حق میری محبت نے دیا ہے جس کا میں پوری ایمان داری سے اعتراف کرتے ہوئے کر رہا ہوں اور جب تک آپ جواب نہیں دیں گی۔ میں یونہی قیاس کرتا رہوں گا اور ہر دوسرے ملوں کا بھی ضرور۔“

جبر اگر بلیکس جیکس پھر دوبارہ اس طرف دیکھا تو وہی آنکھیں تھیں۔

”خبر بات کہ میں آپ کو کیسا لگتا ہوں۔“

”اوپر کی خوبصورت جواب سوچنے لگی تھی کہ نیل کی اسٹک کی آواز نے ایک لحٹ اس کے ذہن کو خاموشی میں تنگ تنگ کی آواز بہت واضح تھی۔ وہ سنبھل کر یوں بیٹھ گئی جیسے ان کی آمد سے بے خبر ہو۔“

”ابھی انہوں نے نیل کے پکارا تھا۔“

”اس نے گردن موڑ کر انہیں دیکھا پھر اپنی جگہ سے کھڑی ہو کر پوچھنے لگی۔“

”نیل نے گئے تھے آپ؟ بتا کر بھی نہیں گئے۔“

”نیل نے مدحو سواری بھی اور تم۔“ ابھی بات ان کے ہونٹوں میں تھی کہ وہ بول پڑی۔

”میں ٹوبہ کے ساتھ لائبریری گئی تھی۔“

”نیل جاتے ہوئے بتایا تھا تم نے اور اب مدحو کہاں گئی ہے۔؟“ انہوں نے بیٹھتے ہوئے اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”نیل ہوگی۔“ اس نے قدرے لا پرواہی سے کہا۔

”نیل تو آئی۔“ قریباً ”آدھا گھنٹہ میں اماں جی کے پاس بیٹھا ہوں۔ اس کی آواز بھی سنائی نہیں دی۔“ نیل بڑے بڑے انداز میں بولے تو اس نے اٹھ کر ریٹنگ سے نیچے جھانک کر دیکھا اور کوئی نظر نہیں آیا تو وہ دوبارہ بولنے لگی۔

”کہاں گئے نیل بھائی، ہوگی سونیا آپ کے کمرے میں“ ابھی جب ماما کے آنے کا وقت ہو گا تو یہ دیکھیے گا ان کے ہاتھ کی آواز۔“

”نیل بس ہوں کر کہہ گئے تو قدرے توقف سے وہ انہیں متوجہ کر کے کہنے لگی۔“

”نیل بھائی، وہ بڑے ماموں کا فون آیا تھا۔ آپ کا پوچھ رہے تھے، میرا تو خیال تھا آپ وہیں گئے ہوں گے۔“

”نیل میں کئی دنوں سے وہاں نہیں گیا۔ جاؤں گا ایک دو دن میں، فوراً تو نہیں بلایا بیٹا۔؟“ نیل نے بولنے سے تیار کر پوچھا۔

”نیل میرا مطلب سے فون ہوا نے سنا تھا اگر انہیں کوئی کام ہو گا تو وہ پھر فون کر لیں گے یا آپ۔“ عمر کے آنے کی بات ادھوری رہ گئی۔

اسلام علیکم نیل بھائی۔! ”عمر خاصے تھکے ہوئے انداز میں سلام کر کے نیل کے قریب کرسی گھسیٹ کر بیٹھا۔“

”نیل بھائی میں سر تھام کر بولا۔“ ”توبہ تو یہ چکر ادا اس لڑکی نے۔“

”اس نے بے اختیار پوچھا۔“

”نیل بھائی، میں نے سنا تھا کہ تمہاری بہن مدحیہ بیگم اسے پردیس جانے والے کے لیے کوئی تحفہ خریدنا تھا۔ اس تحفے کے سارے بازاروں کی خاک چھاننے کے بعد آخر اس نے تحفہ خریدا ابھی تو ایک ریڑھی والے نے اسے منے جانے لگا۔“

”نیل اس کی بے ساختہ ہنسی میں بے یقینی شامل تھی۔“

”نیل محبت بول رہا ہوں پوچھو لو جا کر اس سے۔“ عمر اس کے سننے سے مزید تپ گیا۔

”نیل میں تمہارا لیٹن کر رہی ہوں۔ یہ بتاؤ اس نے احمر بھائی کے لیے تحفہ کیا کیا۔“ اس نے فوراً ”نیل“

”نیل اس نے آکس کریم لینے بھیج دیا تھا اور جب میں واپس آیا تو وہ اطمینان سے بولی ”میرا کام ختم ہو چکا ہے میں تمام راستہ پوچھتا رہا کہ کیا خریدا لیکن اس نے بتا کے نہیں دیا۔ عمر کو غالباً ”اسی بات کا غصہ“

”نیل پوچھنا ہی نہیں چاہیے تھا۔“ نیل جو بہت خاموشی سے دونوں کی باتیں سن رہے تھے ٹوک دیا۔

”کیوں نہیں بھائی! اس میں اتنی رازداری برتنے کی کیا بات ہے۔“

”ہے یا نہیں، یہ بتاؤ! احمر کے دیزے کا کیا ہوا۔؟“ نیل نے فضول بحث چھوڑ کر کام کی بات پوچھ کر ایک لٹ بدل گیا۔

”مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں ہے نیل بھائی! ان ہی سے معلوم کیجئے گا۔“

”اچھا آئے تو بھیجنا اسے میرے پاس۔“ نیل کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے پھر اپنے کمرے کی طرف ہوئے رگ کر بولے۔

”صبا! پھوپھو آئے والی ہوں گی کھانا لگا دو۔“

”جی اچھا۔“ وہ انہیں جواب دے کر عمر کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔ ”سنو کھانا ہمارے ساتھ کیا ہے؟“

”تمہارے پسندیدہ کوفتے بنائے ہیں۔“

”ساتھ میں کیا ہے روٹی یا چاول۔؟“

”دونوں! چلو اٹھو ماما آ رہی ہیں۔“ اس نے ریڈنگ سے آسیہ کی گاڑی دیکھ کر کہا پھر بھاگ کر کچن کا رُخ بابا جان نے شاہ جہانگیر کو اپنے کمرے میں بلایا تھا اور ایک طویل عرصے بعد ان کے انداز میں وہی راز جیسی شاہ سکندر کو آسیہ کے حصار سے نکالنے میں انہوں نے برلی تھی۔ جسے شاہ جہانگیر نے ان کے داخل ہوتے ہی محسوس کر لیا تھا لیکن ظاہر نہیں ہونے دیا اور مست انجان بن کر بیٹھتے ہی اپنی مصروفیات جو محل سے سننے کے بعد بابا جان بولے تھے۔

”تم نے ہمیں اتنا بے خبر کیسے سمجھ لیا جہانگیر! ہم صرف اپنی اولاد ہی کی نہیں اولاد کی اولاد کی بھی خبر جو تم نہیں رکھتے۔“

”یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں بابا جان! ہم از کم میں اپنی اولاد سے بے خبر نہیں ہوں۔“ شاہ جہانگیر نے کہا۔

”اچھا پھر تو تمہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ شہر میں تمہارے بیٹے علی نے جو لڑکی پسند کی ہے وہ کون ہے؟“

”غور! نہیں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ چکر اگئے۔“

”علی! علی نے شہر میں۔۔۔ نہیں بابا جان! آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہوگی۔“

”ہمیں کسی نے اطلاع نہیں دی جہانگیر! خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئے ہیں اس لڑکی کو اور اس میں جاننے کے بعد یہ فیصلہ بھی کر چکے ہیں کہ علی کی شادی اسی کے ساتھ ہوگی۔“

بابا جان نے حتیٰ انداز میں اپنا فیصلہ سنا کر شاہ جہانگیر سے اختلاف کا حق ہی جیت لیا البتہ ان کے سوال اٹھ رہے تھے جنہیں سوچنے کے بعد وہ کہنے لگے۔

”میں نہیں سمجھتا بابا جان! کہ آپ نے یہ فیصلہ علی کی محبت میں کیا ہو گا کیونکہ محبت کو آپ نے نہیں بنے دیا۔ اگر ایسا ہو تا تو آج سکندر کی دوسری بیوی یہاں موجود ہوتی۔ آپ اسے طلاق نہ دلو اتے ہو۔“ بابا جان نے ان کی بات سکون سے سن کر بتا کر ابھرا پھر کہنے لگے۔

”ٹھیک سمجھتے ہو تم ہمارے فیصلوں میں محبت کی کمزوری شامل نہیں ہوتی اور ابھی بھی ہم نے علی نہیں سوچا بلکہ وہ لڑکی جسے علی پسند کرتا ہے اسے اس حویلی میں لانا مقصد ہے۔ کیونکہ وہ ہمارا خون سکندر کی بیٹی۔“

”آپ کا مطلب ہے۔“ شاہ جہانگیر اس انکشاف پر بس اسی قدر کہہ سکے۔

”ہاں اسی شہزادی ڈاکٹری کی اولاد جس کے بارے میں سکندر کو بھی معلوم نہیں تھا ہم نے بتایا ہے بھی کہ اس کی بیٹی کو ہم علی کے ساتھ بیاہ کر لیں گے۔“ بابا جان اسی سکون سے بول رہے تھے۔

”ٹھیک ہے بابا جان! لیکن آسیہ وہ اپنی بیٹی ہمیں دینے پر کیونکر آمادہ ہوگی۔“ شاہ جہانگیر نے بھی اس خدشے کا اظہار کیا جو ادرہ پہلے سے موجود تھا۔

”یہ سوچنا ہے ہمیں کہ اس سے بیٹی کس طرح حاصل کی جائے۔ سکندر سے ہم وعدہ کر چکے ہیں کہ آسیہ سے بیٹی لائیں گے بلکہ اسی کے گھر سے شاہ علی جہانگیر کے ساتھ بیاہ کر لائیں گے اور ہم اپنے وعدہ سے پھر تے۔ تم کوئی ایسی تدبیر کرو کہ آسیہ اس رشتے پر راضی ہو جائے۔“ بابا جان نے کہا تو ان کی آخری بات جہانگیر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔

”نا ممکن۔“

”یہاں کچھ ناممکن نہیں ہے جہانگیر! ہمیں ہر قیمت پر اس لڑکی کو حاصل کرنا ہے اور سکندر سے کیے وعدے مطابق۔“ بابا جان نے ان کے ناممکن کہنے پر ناگواری کے اظہار کے ساتھ کہا تھا۔

”جہانگیر خاموش ہو کر سوچنے میں لگ گئے۔ پھر اچانک کسی خیال کے تحت پوچھنے لگے۔

”کہا لڑکی جانتی ہے کہ علی سے اس کا کیا رشتہ ہے۔؟“

”نہیں اور ہم نے علی کو حتیٰ سے منع کر دیا ہے کہ ابھی وہ اس پر اپنا آب ظاہر نہ کرے اور نہ اس کے سامنے اپنی شاہ پور کا ذکر کرے۔“ بابا جان نے کہا تو شاہ جہانگیر فوراً ہٹوئے تھے۔

”پھر تو کوئی مسئلہ نہیں ہے بابا جان! ہم کسی اور کے ذریعے سے یہ رشتہ طے کروا لیتے ہیں۔ میرا مطلب ہے ہذا خاندان کا کوئی اور فرد کیونکہ آسیہ اور اس کے گھر والے سکندر کو جانتے ہیں یا پھر انہوں نے مجھے دیکھا۔“

”ہوں۔“ بابا جان کتنی دیر سوچ انداز میں سر ہلانے کے بعد کہنے لگے۔ ”تم اپنی بیگم اور بیٹی کو علی کے پاس دو اور انہیں سارا معاملہ سمجھا کر بیگم سے کہو کہ وہ آسیہ سے راہ و رسم بڑھا کر اس سے بیٹی مانگے، ہمیں یقین ملے گا۔“

”میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کے لیے انکار نہیں ہوگا۔“

”غور! آسیہ کو شہ نہ ہو تو۔“ شاہ جہانگیر نے کہا۔

”اں کے لیے سب سے زیادہ ہمیں محتاط رہنے کی ضرورت ہوگی، سمجھتے تم۔“ بابا جان کے لہجے میں تنبیہ

”بالکل سمجھ گیا بابا جان! اور اب مجھے عارفہ (بیگم) کو سمجھانا ہے۔“ شاہ جہانگیر جیسے نئی مہم کے لیے تیار ہو کر بیٹھے۔

مزید کی غیر معمولی طویل خاموشی ٹوٹنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ پچھلے ڈیڑھ دو گھنٹے سے احمر اپنی ساری باتیں کا کام ہو کر آخر میں جھنجھلا گیا تھا۔

”تو اس کے لیے مددجو! کچھ بولو ورنہ میں سمندر میں کود جاؤں گا اور یہ صرف میری دھمکی نہیں ہے میں جو کہتا ہوں اس عمل کرنا ہوں۔“

”میرا ذہن سوچ سے نظریں ہٹا کر اسے یوں دیکھنے لگی جیسے پوچھ رہی ہو کیا پولوں اور وہ سمجھ کر کہنے لگا۔

”تو مجھے مشلا۔“ یہ کہ تم میرے جانے سے اواس ہو اور یہ کہ باہر جا کر میں تمہیں بھول نہ جاؤں۔ روزانہ خط لکھ دو۔“

”کیا۔“ وہ بے اختیار بول پڑی۔ ”میں کوئی روزانہ دو زانہ نہیں لکھوں گی۔“

”چوتھے میں ایک۔“ احمر نے اس کی خاموشی ٹوٹنے پر دل ہی دل میں شکر کرتے ہوئے کہا۔

”آج کل ایک خط لکھنے میں پورا ایک ہفتہ لگتا ہے اس کے بعد پوسٹ کروانے میں آج کل ایک دن بھٹکتا ہے۔ اس حساب سے آپ کے پندرہ خطوں کے جواب میں میرا ایک خط آپ کے پاس پہنچے گا۔“

”کیسی لڑکی؟“ میرادل رکھنے کی خاطر ہی کہہ دیتیں کہ روزانہ خط لکھو گی۔“ ”اگر تم کے لیے میں ہلکا سا خط لکھوں۔“ چلیں اب کہہ دیجیے ہوں روزانہ لکھوں گی۔“ اس کے نروٹھے سے انداز پر وہ گہری سانس کھینچ کر بولی۔

”تمہیں تو دل رکھنا بھی نہیں آتا۔“

”زبردستی رکھو آئیں گے تو ایسے ہی رکھوں گی ناں۔“ وہ خفگی سے کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی تو احرام لیا ساختہ ہنسا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھاتے ہوئے کہنے لگا۔

”کیا چاہتی ہو تم؟“ سارا وقت تمہاری خوشامد کرتا رہوں۔ پہلے دو گھنٹے تم نے خاموشی میں گزار دی تھیں ناراض ہو رہی ہو۔ اگر اسی طرح کرنا تھا تو آئی کیوں نہیں میرے ساتھ۔“

”یہ آئی تو آپ ناراض ہوتے۔“ وہ اسی طرح منہ پھلا کر بولی تھی۔

”اگر میری ناراضگی کی پروا ہے تو فوراً اپنا موڈ ٹھیک کرو۔ ورنہ میں جانے کے وقت تک تم سے کوئی کروں گا۔“ ”اگر تم کے دھمکی آمیز لہجے پر وہ کچھ خائف سی ہو کر اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

”آپ بہت خراب ہیں ایک تو مجھے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔“

”ہمیشہ کے لیے تو نہیں جا رہا۔“ وہ فوراً بولا تھا ”اور پھر تمہارے لیے ہی جا رہا ہوں، تمہیں بائیک سے“

”آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے وہاں سے گاڑیاں لے کر آئیں گے۔“

”خریدنے کے قابل تو بن کر آؤں گا ناں اور پھر تم جس گاڑی پر ہاتھ رکھو گی وہی تمہاری بس تم میری کرتی رہنا۔“ ”کوئی ناں۔“ ”اگر تم نے جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا تو اس نے فوراً اپنا چہرہ دوسری لیکن اس کی آنکھوں میں تیرتی نمی دیکھ چکا تھا۔

”تم آنا مدعو! اگر اس طرح کرو گی تو میں اپنا جانا کینسل کر دوں گا۔ بے وقوف لڑکی! دو سال کی تو باندیوں گزر جائیں گے۔“ ”اگر تم نے اس کی آنکھوں کے سامنے چٹکی بجاتی تو وہ مزید سر جھکا کر پچلکوں تک آؤ پر سمیٹنے لگی۔

”چلو اب یہاں بیٹھنا خطرناک ہے۔ لوگ مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے ہیں۔“ ”احرام کا دھیانا خاطر اٹھ کھڑا ہوا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے پوچھنے لگا۔ ”پانی میں چلو گی؟“

وہ نفی میں سر ہلا کر اپنا دوشہ سنبھالنے لگی جسے تیز ہوا اڑائے لیے جاری تھی بس ایک سر اس تھا۔

احمر نے برہم کر دوپٹے کا دوسرا سر اٹھام لیا اور اس کی گردن میں لپیٹ کر آگے بڑھ گیا تو وہ قدرے سر اس کے پیچھے چلنے لگی۔

”آؤں گے تمہیں کچھ اور۔“ ”بائیک کے قریب رک کر احمر نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ تو اسے دل رکھنے کی خاطر قصداً ”مسکرا کر بولی۔

”کچھ اور۔“ لیکن میں کچھ نہیں بتاؤں گی یعنی جو آپ کا دل چاہے۔“

”اچھی بات ہے چلو۔“ ”احمر نے بائیک اشارت کر کے اسے اشارہ کیا کہ اس کے بیٹھے ہی اسپینڈ دی تو وہ چیخ پڑی۔

”آہستہ۔ میں گر جاؤں گی۔“

احمر پر اس کے چیخنے کا کچھ اثر نہیں ہوا بلکہ وہ مظلوظ ہو رہا تھا جب ہی بائیک کو دائیں بائیں لہرا اپنے فیورٹ ریٹورنٹ کے سامنے رکا تو وہ فوراً اچھل کر اس سے دور جا کھڑی ہوئی اور خوشگوار گھورتے ہوئے بولی۔

”بس میں آج آخری بار آپ کے ساتھ آئی تھی۔ آئندہ کبھی کہیں نہیں جاؤں گی اور مجھے کچھ ہے میں جاری ہوں۔“

”رے۔“ ”احمر بائیک بند کر کے اس کے قریب آیا۔ ”کہاں جا رہی ہو۔؟“

”جاؤں گی۔“ وہ چیخ کر بولی۔

”جاؤں رہی ہو چلو گھر ہی چلتے ہیں۔“

”نہیں۔ مجھے آپ کے ساتھ نہیں جانا۔“ ”آپ جائیں اپنی بائیک پر میں پہنچ جاؤں گی کسی نہ کسی طرح۔“ وہ کہتی تھیں تو قدموں سے ایک طرف چل پڑی تو احمر بوکھلا کر چند قدم اس کے پیچھے چلا پھر خیال آنے پر واپس ایک اشارت کر کے اس کے قریب لے گیا۔

”ایک لکڑی بن سے مددو! چلو نیٹھو۔“

”نے کہا ناں! آپ کے ساتھ نہیں جانا تو نہیں جانا۔“ ”اس نے ایک طرف رک کر حتیٰ انداز میں کہا پھر

”اچھی بات نہیں ہے مددو! ذرا سی بات پر غصے میں آجاتی ہو۔ چلو اب میں بہت آرام سے چلاؤں گا۔“

”زی سے نوکتے ہوئے کہا لیکن اس نے کوئی دھیان نہیں دیا۔

”انہیں تم نے میں کیا کہہ رہا ہوں۔ اکیلی جاؤ گی تو پھوپھو کو کیا جواب دو گی۔ آج چھٹی کا دن ہے۔ وہ گھر پر ہی اصرار ہے اسے کہ اس کے غصے سے خائف کرنا چاہا تو یہ ایک دم رک کر اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

”اچھا مجھے جان سے مار دیں۔ میں اکیلی ہی جاؤں گی۔“

”بک بے جاؤ اور۔“ ”احمر نے وارننگ کے انداز میں انگلی اٹھائی تھی پھر ایک دم ہونٹ بھیج گیا تو وہ سر جھٹک کر پڑی اور جیسے ہی خالی رکشہ نظر آیا اس میں بیٹھ گئی۔

”پہلو در وہیں رک کر جاتے ہوئے رکشہ کو دیکھتا رہا پھر اپنی بائیک اس کے پیچھے لگادی اور تمام راستہ اپنے منہ بٹھا رہا کہ وہ کیوں اسے آئیہ کے عتاب سے بچانا چاہتا ہے۔

”بے سامنے مدید جیسے ہی رکشہ سے اتری احمر بائیک اس کے قریب لے آیا اور جب سے والٹ نکالتا ہوا اندر جاؤ۔“ وہ چند قدم پیچھے ہٹ گئی لیکن اندر نہیں گئی تو احمر نے پہلے رکشہ فارغ کیا پھر اسے دیکھ کر پڑے بولا۔

”بڑیوں رہی ہو، جا کر تباؤ پھوپھو کو اپنا کارنامہ بہت طرم خان بنتی ہوناں، کسی دن میرے ہی ہاتھوں سے دھاؤں گی۔“ ”بھلا پھوپھو کا خیال کرتا ہوں ورنہ۔“ ”وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے گیٹ دھکیلتی ہوئی اندر ریدھی اور جانے کے لیے تیزی سے صحن عبور کر کے برآمدے تک آئی تھی کہ عمر راستے میں آگیا۔

”رے رے یہ آمدھی طوفان کی طرح کہاں جا رہی ہو۔ میں یہاں کب سے تمہارے انتظار میں آئیں۔“

”بے رنگے بیٹھا ہوں اور وہ پرس آف ویلز کہاں ہیں۔“

”اے آف ویلز بیٹھا ہونے کی بائیک واپس کریں گے پھر آئیں گے۔“ ”اس نے طنزیہ لہجے میں کہہ کر سر جھٹکا۔

”اٹھو بڑے بھائی نے تمہاری موجودگی میں کسی اور کو لفٹ کرا دی ہے جب ہی تمہارا موڈ۔“

”ہمت۔“ ”وہ عمر کو دھکا دے کر میڑھیاں پھیلاتی اور آئی تو سامنے آئیہ کو دیکھ کر قدرے جھجک گئی۔ گو کہ اس انت سے ہی احمر اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا پھر بھی وہ اپنے آپ میں سمٹ سی گئی اور آئیہ نے محسوس نہ کیا تھا۔

”اٹھو! اس کی طرف سے دھیان ہٹایا تھا کہ وہ فوراً اپنے کمرے میں داخل ہو گئی اور بیڈ پر گر گئی ہوئی پڑے بولی۔

”میں تمہیں ممتا سے پوچھ لیتے ہیں۔“

”پوچھ لیتے ہیں۔“ ”صحاحت نے اس کی خود کلامی سن کر پوچھا تو اس نے چونک کر آواز کی سمت گردن موڑی

”اٹھو! اتنی کڑی دیکھ کر بولی۔

”میں تم سے تو کچھ نہیں کہا۔“

”میرے علاوہ اور کون ہے یہاں“ اچھا سمجھ گئی اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہو۔“

صباحت شرارت سے ہنسی اور اس کے خاموش رہنے پر استری کا پلگ نکالتے ہوئے بولی۔ ”سورڈ! مداخلت نہیں کروں گی۔ تم اپنا شغل جاری رکھو میں جاری ہوں۔“

”سنو!“ اس نے اچانک کسی خیال کے تحت صحبت کو پکار لیا۔ ”کیا واقعی احرامی ہفتے جا رہے ہیں؟“

”ہاں کیوں؟“ صحبت سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”بس پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے جیسے۔“ وہ اپنے ہی خیال میں گم رہ کر جانے کیا کہتے ہوئے خاموش رہی۔

”کچھ دیر رک کر صحبت اس کے پاس آئی تھی اور دھیرے سے اس کا کندھا ہلا کر بولی۔

”تم کچھ زیادہ محسوس کر رہی ہو مدحو! کوئی بہت لمبے عرصے کے لیے تو نہیں جا رہے احمر بھائی جلدی گے۔“

”اے ہاں۔“ اس نے چونک کر خود کو سنبھالا پھر اٹھتے ہوئے بولی۔ ”چلو ماما اکیلی پتا نہیں ہمارے بارہ سوچ رہی ہوں گی۔“

”یہی کہ تم مجھے احمر بھائی کی عزت میں گزرے لمحات کی روداد سنارہی ہوگی۔ ویسے کہاں لے گئے تمہیں۔؟“

”ساحل پر لیکن پتا نہیں کیوں آج مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگا اور میں نے احمر کو ناراض بھی کر دیا۔ لیکن میرا کوئی تصور نہیں ہے وہ بایک اتنی اسپڈ سے چلا رہے تھے کہ مجھے غصہ آگیا اور واپسی میں میں نے پکارنے سے اس کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔“

پھر چند دن بڑی افرا تفری میں گزرے جس شام احمر کو جانا تھا اس روز صبح ہی سے گھر میں چل پل شروع تھی۔ یا سمین، شمرہ اور روبی کے ساتھ آگئی اور بڑے بھیا بھی افس جاتے ہوئے اپنے بال بچوں کو ادھر چھو تھے اور کسی کام میں ہاتھ بٹانے کے بجائے سب کزنز احمر اور مدحہ کو پیچھے لے کر ہوتے تھے۔ جس سے جتنا منظور ہو رہا تھا مدحہ اتنی ہی بوکھلائی جا رہی تھی۔ کیونکہ بہت کوشش کے باوجود وہ ہمیشہ کی طرح کی کوئی جواب نہیں دے پا رہی تھی اور جب عمر حد سے بڑھنے لگا تب وہ سب کے درمیان سے نکل کر اور آگئی تو سب کے بلانے پر بھی نہیں گئی۔ احمر جانتا تھا کہ وہ مذاق میں کسی بات کو بھی ضد نہیتی ہے۔ اس لیے وقت وہ خود ہی اس کے پاس آگیا تھا۔

”میں جانتا ہوں تم یہاں کیوں آگئیں۔ اس لیے ناں کہ۔“ شرر مسکرا ہٹ کے ساتھ کہتے ہوئے احمر کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا تو وہ گھبرا کر بولی۔

”اے ماما آ رہی ہیں۔“

”تو جلدی سے مسکرا کر خدا حافظ کہہ دو ورنہ جب تک کوئی بلانے نہیں آئے گا میں اسی طرح کھڑا گا۔“ احمر نے کہا تو مسکرانے کی کوشش میں اس کی آنکھوں میں پانی اتر آیا جسے چھپانے کے لیے اس نے چاہا تھا کہ وہ اس کی طرف جھک کر بولا۔

”خدا حافظ۔ پھر آہستہ سے اسے چھوڑ کر کمرے سے نکل گیا تو وہ گم صم کھڑی رہی پھر ایسے ہی عالم شمر دھیرے چلتی ہوئی تیس پر آکر نیچے دیکھنے لگی۔ سب بڑے ہی احمر کو چھوڑنے جا رہے تھے بانی کزنز کیسے تھے سب سے مل کر جب وہ گاڑی میں بیٹھنے لگا تب سرواچھا کر کے اسے دیکھ کر مسکرایا تو ذرا سا ہاتھ اٹھا ساتھ اس کے ہونٹوں نے بے آواز جیش کی تھی۔

”خدا حافظ۔“

چند لمحوں میں آگے پیچھے تینوں گاڑیاں روانہ ہو گئیں تو اس کی آنکھوں کے سامنے دھند چھا گئی تھی۔ کچھ دیر میلے کا شور، ہنگامہ اور ساری افرا تفری تھم گئی تھی۔ اس نے اپنے کمرے میں آکر سو کر دی۔ پھر کھڑکی سے پردے سمیت رہی تھی کہ صحبت کے ساتھ شمرہ اور روبی آگئیں۔ جنہیں دیکھ کر

سترانی پھر صحبت کو مخاطب کر کے پوچھنے لگی۔

”سنو! یہاں پورٹ گئی ہیں یا کیننگ۔“

پورٹ پھر کمرہ رہی تھیں وہیں سے کیننگ چلی جائیں گی۔“ صحبت جواب دے کر واش روم میں چلی گئی۔

”کیوں نہیں گئیں احمر بھائی کو کسی آف کرنے تمہیں تو ساتھ جانے سے کوئی منع نہ کرتا۔“ شمرہ نے پوچھا تو اسے کندھے اچکا کر بولی۔

”یہاں ہی۔“

”جہاں نے بھی اصرار نہیں کیا۔؟“ روبی کو جانے کیوں حیرت ہو رہی تھی۔

”جہاں میں جب دیکھا کہ لڑکیوں میں سے کوئی بھی نہیں جا رہا تب انہوں نے مجھ پر چھوڑ دیا اور ظاہر ہے میں ہی اسی لیے جانے پر اصرار نہیں کیا۔“ وہ سرسری انداز میں کہہ کر مسکرائی تب ہی صحبت واش روم سے ہوئے بولی۔

”میرا خیال ہے چائے کے لیے بوا سے کسنے کی زحمت بھی کسی نے نہیں کی ہوگی۔“

”وہ راز ہی زحمت تم کرو۔ باقی پینے کی زحمت ہم کر لیں گے۔“ مدحہ نے فوراً تکیے سے کمر ہٹا کر ٹانگیں پھیلانے کو مہموبستی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ارے نہیں تم بیٹھو میں جا رہی ہوں۔“ صحبت شمرہ کو بٹھا کر کمرے سے نکلی تھی کہ فون کی بیل پر وہیں سے بار کر جائے گا کہا پھر بڑھ کر ریسور اٹھا لیا تھا۔

”نیل۔“

”صباحت شاہ کیسی ہیں آپ۔؟“ ادھر سے بہت دلکش لمبے میں پوچھا گیا۔

”فون، علی جا لیں۔“ اس نے بے حد گھبرا کر اپنے پیچھے دیکھا پھر آواز دبا کر بولی۔ ”آپ کو میرا نمبر کہاں سے؟“

”میں ایک عزیز سے جو اتفاق سے آپ کی ماما پینشنٹ ہے۔“ علی جا لگی کہ آواز تارہی تھی جیسے اسے غصے کا لہرہ منظور ہو رہا ہے۔

”ماما پینشنٹ لیکن ممانو۔“

”جینٹل کو نہیں دیکھتیں، یہی ناں۔“ وہ فوراً بولا تھا۔

”مجھے نہیں پتا۔“ وہ اس بحث سے دامن بچا کر قدرے منت سے بولی۔ ”آپ پلیز آئندہ یہاں فون نہیں کیجئے۔“

”نہر کہاں کروں۔؟“ وہ غالباً ”موڈ میں تھا۔“

”یاد مطلب ہے آپ کا۔؟“ وہ بشکل اپنی آواز پر قابو پا کر ناگواری سے بولی۔ جسے محسوس کر کے وہ ایک دم شجیدہ ہوئی۔

”میں کچھ غلط کہہ گیا۔ آپ خفا تو نہیں ہیں۔؟“

”نہر فون بند کریں۔ پھر کسی وقت میں خود آپ کو رنگ کروں گی۔“ شمرہ کے پکارنے پر وہ جلدی سے بولی تو اس نے فوراً پوچھا۔

”نہر! میرے ناں آپ کے پاس۔؟“

”اے میں انتظار کروں گا۔“ ادھر سے سلسلہ منقطع ہوا تو اس نے بے تحاشا دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھ کر گہری سانس لی پھر ریسور رکھ کر کمرے کا رخ کیا تھا۔



جب دل بے اختیار ہو جائے تو ساری احتیاطیں دھری رہ جاتی ہیں اور صباحت شاہ جتنی محتاط رہا ہے رچیلنا نہیں چاہتی تھی وہی سامنے نہ کیا تھا۔ پھر بھی اس پر قدم رکھنے سے پہلے اس نے اسے ملنے کی بہت کوشش کی، لیکن ایسے عالم میں دل کیسے ہر بات کا جواب پہلے سے موجود ہو سکتا ہے اور پھر کوری زمین پر چاہت کے قطرے نہ لگانے والا کوئی عام شخص بھی تو نہیں تھا وہ اگر اب تک اس سے ملتی تو صرف آسیدہ کے خوف سے جو ابھی بھی موجود تھا۔ لیکن علی جمالیہ کی سحر انگیز شخصیت کے ساتھ اس کی سجاوٹ اس پر حاوی ہو گئی تھیں۔ جب ہی تو دل سارے اندیشوں کے جواز گھر رہا تھا۔

”ضروری تو نہیں جو کچھ ماما کے ساتھ ہوا میرے ساتھ بھی ہو۔“

”وہ اگر شاہ سکندر کی طرح فراڈ ہو تا تو پہلے ہی مقام پر مجھے پر پوزیوں کرتا۔“

عجیب موڈ آ گیا تھا جہاں سارے موسم ایک ساتھ اترتے ہیں اور صباحت شاہ نے بار بار اس پر رائے رکھتے ہوئے بھی دل کو یہ یاد رکھا تھا کہ اس کے بارے میں سوچنے اور فیصلہ کرنے کا اختیار صرف اس کے پاس ہے۔ دو صورتوں میں دل کو اس کا فیصلہ ماننا ہو گا۔ اور یہی بات علی جمالیہ سے کہنے کے لیے اس نے اس کا ہاتھ کرتے ہوئے گھڑی پر نظر ڈالی تھی۔ ساڑھے پانچ ہو رہے تھے۔

”پتا نہیں وہ گھر پر ہو گا کہ نہیں؟“ اس نے سوچا تھا کہ ادھر دوسری تیل پر ریسیور اٹھنے کے ساتھ اس نے سنائی دی۔

”نیل، علی جمالیہ اسپیکنگ۔“

”جی میں ہوں صباحت۔“ اگرچہ اس نے بہت سنبھل کر کہا پھر بھی آوازیں ہلکی سی لرزش تھیں۔ ”کیسی ہیں صباحت؟ میں ابھی آپ ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔“ علی جمالیہ کو جیسے اچانک مدت مل گئی تھی۔

”کیا کیا سوچ رہے تھے؟“

”میں یہ پتا نہیں آپ کتنا انتظار کروائیں گی۔“ علی جمالیہ نے کہا تو اس نے بے اختیار پوچھا تھا۔

”آپ کتنا انتظار کر سکتے تھے؟“

”میں نے فضول سا جملہ ہرگز نہیں کہوں گا کہ زندگی کی آخری سانچوں تک۔ پتا نہیں زندگی کتنی ہے۔ کل نہیں۔ ویسے آپ کیا سنا چاہتی ہیں؟“

”کچھ نہیں میں نے تو بس یونہی پوچھ لیا تھا۔“ وہ قدرے شینٹائی تھی۔

”چلیں اور بھی جو کچھ پوچھنا ہے تو میں پوچھ لیں۔“ اس کی ذرا سی ہنسی کی آواز سن کر وہ خاموش ہو گئی۔

توقف سے اس نے کریڈل پر ہاتھ مار کر بیکار۔

”ہیلو صباحت! آپ خاموش کیوں ہو گئیں؟“

”وہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں آپ سے کیسے کہوں۔“ اس کے سوچتے ہوئے انداز پر وہ فوراً ہلکا۔

”کوئی خاص بات ہے یا کوئی پر اہم۔“

”میرے لیے تو خاص بات ہے۔ اب پتا نہیں آپ اس کو اہمیت دیتے ہیں کہ نہیں۔“

”صباحت شاہ! وہ بہت سنجیدہ لہجے میں گویا ہوا تھا۔ ”آپ کی عام بات بھی میرے لیے خصوصی اہم ہوگی۔“

”بھئی ایسا گمان بھی نہیں کیجیے گا کہ میں۔“

”ایک منٹ۔“ اس نے ٹوک کر کہنے کی بجائے۔ ”تو یہی کی آواز آرہی تھی شاید وہ اس کے بارے میں تھا۔“

”تب وہ جلدی سے اسے مخاطب کر کے بولی۔“

”سنیں علی! میں پھر بات کروں گی۔“

”اوکے“ خدا حافظ۔“ علی جمالیہ نے سمجھ کر کہا تو وہ آہستہ سے ریسیور رکھ کر باہر نکل آئی اور عقبہ کندھوں سے تھام کر اپنی طرف گھٹائی ہوئی پوچھنے لگی۔

بات ہے کیا پھر دو اور عمر میں کوئی تکرار شروع ہو گئی ہے۔“  
”نیل، چلیں۔“ شکیل پچا آئے ہیں۔ ”سمیٹھ آپ کی شادی ہے۔“ ”تو یہ نے خوش ہو کر بتایا تو وہ بھی خوش ہو گیا۔“

”بے شادی؟“  
”جی ہاں۔ میں تو صرف شادی کا سن کر بھاگی آئی ہوں۔“ ”تو یہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔  
”پہلے تو بتا چکے گا ناں۔“ میں تو صرف شادی کا سن کر بھاگی آئی ہوں۔“ ”تو یہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔  
”جی ہاں۔ میں تو صرف شادی کا سن کر بھاگی آئی ہوں۔“ ”تو یہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

”جی ہاں۔ میں تو صرف شادی کا سن کر بھاگی آئی ہوں۔“ ”تو یہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

”جی ہاں۔ میں تو صرف شادی کا سن کر بھاگی آئی ہوں۔“ ”تو یہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

”جی ہاں۔ میں تو صرف شادی کا سن کر بھاگی آئی ہوں۔“ ”تو یہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

”جی ہاں۔ میں تو صرف شادی کا سن کر بھاگی آئی ہوں۔“ ”تو یہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

”جی ہاں۔ میں تو صرف شادی کا سن کر بھاگی آئی ہوں۔“ ”تو یہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

”جی ہاں۔ میں تو صرف شادی کا سن کر بھاگی آئی ہوں۔“ ”تو یہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

”جی ہاں۔ میں تو صرف شادی کا سن کر بھاگی آئی ہوں۔“ ”تو یہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

”جی ہاں۔ میں تو صرف شادی کا سن کر بھاگی آئی ہوں۔“ ”تو یہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

”جی ہاں۔ میں تو صرف شادی کا سن کر بھاگی آئی ہوں۔“ ”تو یہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

”جی ہاں۔ میں تو صرف شادی کا سن کر بھاگی آئی ہوں۔“ ”تو یہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

”جی ہاں۔ میں تو صرف شادی کا سن کر بھاگی آئی ہوں۔“ ”تو یہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

”جی ہاں۔ میں تو صرف شادی کا سن کر بھاگی آئی ہوں۔“ ”تو یہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

”جی ہاں۔ میں تو صرف شادی کا سن کر بھاگی آئی ہوں۔“ ”تو یہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

”جی ہاں۔ میں تو صرف شادی کا سن کر بھاگی آئی ہوں۔“ ”تو یہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

”جی ہاں۔ میں تو صرف شادی کا سن کر بھاگی آئی ہوں۔“ ”تو یہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

”جی ہاں۔ میں تو صرف شادی کا سن کر بھاگی آئی ہوں۔“ ”تو یہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

”جی ہاں۔ میں تو صرف شادی کا سن کر بھاگی آئی ہوں۔“ ”تو یہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

”جی ہاں۔ میں تو صرف شادی کا سن کر بھاگی آئی ہوں۔“ ”تو یہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

”جی ہاں۔ میں تو صرف شادی کا سن کر بھاگی آئی ہوں۔“ ”تو یہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

”جی ہاں۔ میں تو صرف شادی کا سن کر بھاگی آئی ہوں۔“ ”تو یہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

”جی ہاں۔ میں تو صرف شادی کا سن کر بھاگی آئی ہوں۔“ ”تو یہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

”جی ہاں۔ میں تو صرف شادی کا سن کر بھاگی آئی ہوں۔“ ”تو یہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

اسے یوں دیکھا جیسے وہ بھول رہی ہو لیکن جواب میں اس نے آسیدہ کو یاد دلایا۔  
 ”یہ تو آپ کو اس وقت سوچنا چاہیے تھا جب میں نے آپ سے چھٹیوں میں کہا تھا۔“  
 ”میری سمجھ میں نہیں آتا، تم اسلام آباد میں اتنے دن کیوں رہنا چاہتی ہو۔“ تمہاری سمجھ سے کوئی  
 نہیں ہے اور اگر گھومنے پھرنے کا شوق ہے تو وہ بھی دو دن میں پورا ہو سکتا ہے۔“ آسیدہ اس کی بے کار مزاح  
 آکر بولی تھی۔

”مجھے صرف اسلام آباد نہیں گھومنا مری، سوات اور۔۔۔“

”یہاں اور وہاں اسلام آباد میں بھی کوئی اتنا فارغ نہیں ہے جو تمہیں گھماتا پھرتا رہے۔“ آسیدہ نے  
 قدرے ناگواری سے کہنے لگی تمہیں یہ فضول بات کہنے سے پہلے سوچنا چاہیے کہ میں نے تمہیں چو  
 کیوں نہیں بھیجا۔ اس لیے کہ میں پسند نہیں کرتی۔ یہیں اس شہر میں تمہارے بڑے ماموں اور عہد  
 ہیں بھی ان کے ہاں میں نے تمہیں ایک رات رہنے کی اجازت دی ہے؟ تم میرے ساتھ جاؤ گی اور میر  
 ہی تو کی، سمجھیں۔“

”جی!، مدھیہ نے بہت جزیبہ ہو کر سر جھکایا تھا۔



چھٹی کا دن تھا۔ خلاف معمول آدھا دن علی جماعت گھر نے سو کر گزارا۔ جس سے اس کی طبیعت بوجھ  
 تھی۔ شاور لینے کے بعد بھی سر بھاری تھا۔ وہ کرم دین سے چائے کا کمرہ کراؤن میں آ بیٹھا اور لیوی آ  
 چھیل بدل بدل کر دیکھنے لگا، کسی چھیل پر کوئی ایسا پروگرام نہیں تھا جسے دیکھ کر ذہن فریض ہو تا جب ہی  
 اس نے لیوی بند کر دیا پھر اٹھ کر ریک میں کوئی اچھی کیسٹ تلاش کر رہا تھا کہ شاہ جماعت کی بیوی اور بیٹی  
 ساتھ آگے جنہیں دیکھ کر وہ خوش ہونے کے ساتھ حیران بھی ہوا۔ ماں باپ سے ملنے کے بعد رابعہ کی طر  
 ہوا تو شرارت سے بولا۔

”شاپنگ کرنے آئی ہو گی ناں۔ تمہارا دل نہیں بھرتا۔“

”نہیں اور اب تو روز شاپنگ ہو گی کیونکہ اب ہم ہمیں رہیں گے آپ کے ساتھ۔“ رابعہ نے کہا تو وہ  
 کو دیکھنے لگا۔

”ہاں بابا جان نے بھیجا ہے ہمیں تمہاری شادی کے سلسلے میں۔“ عارفہ بیگم تصدیق کرتے ہوئے ہنسا  
 بولیں۔ ”وہ جو یہاں تم نے لڑکی پسند کی ہے اس کے ساتھ۔“

”او فوہ! یہ باتیں آرام سے بیٹھ کر کرنے کی ہیں۔ تم آتے ہی شروع ہو گئیں۔“ شاہ جماعت نے قدرے  
 بیوی کو ٹوکا پھر اس سے بولے۔ ”علی بیٹا کوئی چاہے پانی۔“

”جی! آپ آرام سے بیٹھیں بلکہ ادھر بیڈ روم میں چلیں، میں وہیں چائے بھجواتا ہوں۔“ اس  
 جماعت کو بیڈ روم میں پہنچ کر کرم دین کو پکارا اور اس سے انتظار میں چائے کا کہنے کے بعد عارفہ بیگم کے  
 ہوئے بولا۔

”تو آپ کو بابا جان نے بھیجا ہے۔“

”ہاں اور بڑی ناکسیر کی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، اس ڈاکٹر نے کہا تو انہوں نے گھر میں گئے نہیں  
 اس کی بیٹی کے لیے اتنے بے چین ہو رہے ہیں۔ پھر بیٹا بھی میرا ماں۔ میں۔ یوں بھائی کے بھی تو لڑکے؟  
 میں سے کسی کے ساتھ کیوں نہیں بیاہ لے جاتے اسے۔“ عارفہ بیگم نے سخت سے کہا تو وہ خاصا جزیبہ  
 ”لا حول ولا قوہ کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ بابا جان کوئی زبردستی تو نہیں کر رہے۔ صباحت پہلے میری  
 اس کے بعد بابا جان کو اس کے بارے میں معلوم ہوا تو فوراً اس سے میری شادی پر تیار ہو گئے ورنہ شاید  
 چچا سکندر کی طرح ایک جنگ لڑتی رہتی۔“

”ہو نہ۔۔۔“ عارفہ بیگم سر جھٹک کر رہ گئیں۔

”آپ اس طرح نہیں کریں۔ جب یہ طے ہے کہ میری شادی صباحت کے ساتھ ہی ہو گی تو بابا جان  
 نے اور میری پسند کو دل سے قبول کریں۔ تب تو ہی آپ اعتماد کے ساتھ ڈاکٹر آسیدہ کے پاس جا سکیں گی۔“ اس  
 نے اس کو سمجھاتے ہوئے کہا تو رابعہ اس کی تائید کرتی ہوئی بولی۔

”جب کہ رہے ہیں بھائی۔ آپ کا یہ رویہ تو سارا کام خراب کر دے گا گی۔ بقول بابا جان کے ڈاکٹر آسیدہ بہت  
 عزت ہے۔“ آپ جانتی ہیں۔ اگر اسے ذرا ساسی شبہ ہو گیا کہ آپ اس کی  
 ہونانے پر مجبور کی گئی ہیں تو وہ صاف انکار کر دے گی اور بابا جان انکار نہیں سنا چاہتے۔“

پھر ابھی امی کو آرام کرنے دو۔“ اسے اپنی شادی کا موضوع اس انداز سے اچھا نہیں لگا تو رابعہ کو ٹوکے ہوئے  
 ”ایک تو سفر کی تھکان اوپر سے تم امی کو پریشان کر رہی ہو۔“

”رابعہ! پوری آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھا تو اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کے  
 بارے میں کچھ نہ کہنے کا اشارہ کیا۔

”میں امی۔ دیکھیں ہمارے لیے کون سا کمرہ ٹھیک رہے گا۔“ رابعہ ماں کو اٹھا کر لے گئی تو وہ پونہی ٹھلنے کے  
 بلانے کا ایک چکر کاٹ کر دوبارہ بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد رابعہ واپس آئی اور اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔

”نانی! مجھے تو بس آپ فوراً اس لڑکی سے ملو امیں۔ ایمان سے جب سے سنا ہے میں تو اسے دیکھنے کو مری جا  
 ں۔ کیا بات خوب صورت ہے؟“

”بات نہیں تمہاری نزدیک خوب صورتی کیا ہے۔“ اس نے فوراً ”صباحت کے بارے میں کچھ کہنے سے  
 رتے ہوئے کہا۔“ اس لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ جو چیز مجھے پسند ہو وہ تمہیں بھی اچھی لگے۔“

”ہاں نہیں۔ خوب صورت چیز دیکھنے میں سب کو خوب صورت ہی لگتی ہے۔ جیسے سکندر رچا کی بیٹی الماس۔ کیا  
 اس جیسی ہے۔“ رابعہ کا اشتیاق فطری تھا۔

”ہاں۔ سوچتے ہوئے انداز میں اس کی نظریں ایک نقطے پر مرکوز ہو گئیں۔ ”مالبا“ الماس اور صباحت کا موازنہ  
 لگا تھا۔ الماس ہو ہو اپنی ماں کی تصویر بھی سوائے آنکھوں کے جن پر شاہ سکندر کی مہر لگی تھی اور ادھر  
 کے کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی غور نہیں کیا تھا لیکن اب دونوں چہروں کو ایک  
 ہونے ہوئے وہ اس واضح مشابہت پر اسے آپ مسکرایا تھا۔

”رے! میں نے آپ سے کوئی اتنی مشکل بات تو نہیں پوچھی جو آپ گہری سوچوں میں ڈوب گئے۔“ رابعہ  
 نے ہنسنے پر اس کا چہرہ ایک طرف متوجہ ہوا۔

”ابو جھٹھا تھا تم نے؟ ہاں وہ صباحت وہ بالکل تو الماس جیسی نہیں ہے بس تھوڑی سی مشابہت ہے دونوں میں۔  
 ”وہ؟ لیٹا۔“

”بگب ملو امیں گے اس سے؟“ رابعہ نے بے تابی سے پوچھا۔

”خود کہاں ملتا ہوں اس سے جو تمہیں ملو امیں لگا۔ وہ خاصی بڑی لڑکی ہے یا شاید بہت محتاط۔ مجھے فون تک  
 سے منع کر چکی ہے اور خود اسے جب کبھی موقع ملتا ہے تو رنگ کر لیتی ہے اور اب جب بھی اس کا فون آئے

تمہاری بات کر دوں گا، ٹھیک۔“

”ٹھیک نہیں۔ میں اتنا مالبا انتظار نہیں کر سکتی۔ آپ بس ابھی میری بات کر امیں اس سے۔“ رابعہ کی بے  
 ”مسکرا کر لکھی میں سر ملانے لگا تو وہ ضدی لہجے میں بولی۔

”اے؟ کیوں نہیں؟“

”لیکے وہ منع کر چکی ہے۔“

”ماتے آپ کو منع کیا ہے کیونکہ آپ مزہ ہیں اور ابھی تو میں بات کر لوں گی۔ ادھر کسی اور نے ریسور اٹھایا  
 ”ماتے آرام سے کہہ سکتی ہوں کہ صباحت کو یاد دے۔“

”نہ! کہا تو اس کا مطلب سمجھنے کے بعد بھی وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اسے ٹیلی فون سیٹ اٹھا لانے کا اشارہ کیا



تھا۔

راجہ فوراً اٹھی اور ٹیلی فون سیٹ لا کر اس کے قریب رکھ دیا۔ تو چند لمحے توقف سے اس نے ریسیور راجہ کو ہٹا دیا پھر نمبر ڈائل کرنے کے بعد پوری توجہ سے اسے دیکھنے لگا تھا۔  
”ہیلو السلام علیکم۔“

”صباحت ہے!“

”جی میں اس کی دوست ہوں راجہ۔“ پھر آواز تھیں پر ہاتھ رکھ کر اسے دیکھ کر شریر مسکراہٹ کے ساتھ  
”آری ہے۔“

”لاؤ مجھے دو۔“ اس نے فوراً ریسیور جھپٹ کر کان سے لگایا تو دھڑ سے صبحت پوچھ رہی تھی۔

”ہیلو کون؟“

”میں ہوں علی۔“ اس نے بڑے آرام سے سامنے نیپیل پر یوں ٹانگیں سیدھی کیں جیسے اب اس۔  
گفتگو ہوئی۔

”میرے خدا! آپ نے میرا مطلب ہے میرے بھائی سے آپ نے۔“ صبحت گھبراہٹ میں ٹھیک۔  
بھی نہیں باری تھی۔

”ریلیکس صبحت! آپ کے بھائی سے میری سسٹرنے بات کی تھی۔“ اس نے سمجھ کر اطمینان دلایا؛  
لگا۔ ”صل میں میری سسٹر بہت دنوں سے کہہ رہی تھی کہ آپ سے ملاقات کرادوں اور میرے مسلسل با  
اس وقت ناراض ہو گئی تو میں نے سوچا آپ سے بات کرا رہی ہوں۔ اگر آپ خود کو مشکل میں محسوس کر رہے  
میں فون بند کر دیتا ہوں۔“

”نہیں! ایسی کوئی بات نہیں۔ ویسے میں خود آپ کو رنگ کرنے والی تھی یہ بتانے کے لیے کہ میں اسلام  
رہی ہوں اپنی کزن کی شادی میں۔“

”چھا تو میں گی کب؟“ اس نے فوراً پوچھا۔

”میرا خیال ہے تین چار دن میں واپسی بھی ہو جائے گی۔“ اس کے جواب پر وہ مطمئن سا ہو کر بولا۔  
”اچھی بات ہے اور یہ میری سسٹر سے ذرا ہیلو ہائے کر لیں تاکہ اس کی ناراضگی دور ہو۔“ اس کے ما

اس نے ریسیور راجہ کو ہٹا دیا۔

”جی! میرا نام راجہ ہے ابھی دو مینٹ پبلیٹی اے کا امتحان دیا ہے۔“

”یہاں نہیں دینی میں ہم لوگ عرصہ دراز سے وہیں مقیم تھے۔ بلکہ میرے فادر تو ابھی بھی وہیں ہیں۔ آپ  
بھائی نے نہیں بتایا؟“

راجہ سکھایا ہوا سبق اتنی سہولت سے دہرا رہی تھی کہ وہ بھی حیران ہو کر سن رہا تھا۔

♥♥♥

صبحت سوٹ کیس بند کر رہی تھی کہ مدیہ روک کر بولی۔

”ٹیک منٹ پہلے مجھے دیکھنے دو۔ میرے کون کون سے سوٹ رکھے ہیں؟“

”اوہ! اب تم ساری اپنی خراب کرگوئی کوئی ضرورت نہیں اسے کھولنے کی تمہارے وہ سارے سوٹ  
ہیں جو تم نے کئے تھے۔“ صبحت اس کا ہاتھ جھٹک کر سوٹ کیس لاک کرنے لگی۔ لیکن اس نے پھرتی سے  
جھپٹ لی۔

”خدا کے لیے مدحو! صبح سے استری کر کر کے میری کرا انگری ہے۔“

”تم میں کون سا ایک ایک کپڑا نکال کر دیکھوں گی۔“ مدیہ سوٹ کیس کھولنے ہوئے بولی۔ پھر اس پر  
اپنے کپڑوں کا جائزہ لے رہی تھی کہ عمر اسے پکارنا ہوا آگیا۔  
”مدحو! کہاں ہو مدحو؟“

”کیا ہے؟“ اس نے سوٹ کیس میں سے سر نکال کر اسے دیکھا۔

مدیہ سے اچھی سی چائے پلاؤ وہ بھی اپنے ہاتھ کی تباہیوں گا گیا ہے۔“ عمر نے کرسی پر بیٹھ کر سامنے بیڈ پر  
بٹن بھلا میں جیسے واقعی اس کے حکم کی تعمیل ہوگی۔

تباہیوں کے کوئی شوق نہیں ہے سننے کا۔ کیا ہوا ہے کیا نہیں۔“ مدیہ نے حسب عادت کوئی نوٹس نہیں

نہاری مرضی۔“ عمر فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر جیب سے لفافہ نکال کر لہراتے ہوئے بولا۔ ”میں نے کوئی بڑی  
باؤ نہیں کی بس ایک کپ چائے۔“

نہ کا خط ہے؟“ مدیہ نے چلانے کے ساتھ لفافہ جھپٹنے کی کوشش کی لیکن عمر نے پھرتی سے ہاتھ پیچھے کر

نہیں کیا۔

”جو عمر! اگر میرا ہے تو فوراً مجھے دے دو ورنہ۔“ مدیہ کے دھمکی آمیز انداز پر وہ لا پرواہی سے کندھے اچکا کر

نہاری ہے، لیکن ملے گا چائے کے بعد۔“

بڈاں کی ایک نہیں دس کپ پہلے خط دو۔“

اب مجھے تمہارا اعتبار نہیں۔ پہلے چائے۔“ عمر کو جانے کب کب کا بدلہ لینے کا موقع مل گیا تھا۔ مزید لفافہ  
رولا۔ ”آؤ کیا خوشیو ہے۔ لگتا ہے بڑے بھائی نے سارے جہیزوں کو نچوڑ دیا ہے۔“

ن کتنے کینے ہو تم۔ میں ماموں جی سے تمہاری شکایت کر دوں گی اور آخر کو بھی لکھوں گی کہ تم مجھے بلیک میل  
ہو۔“

ب کرگوئی لیکن چائے نہیں بناؤ گی۔ چہ چہ۔ ایک نمبر کی کام چور۔“ عمر نے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے  
بڑھچیک دیا اور جانے لگا کہ وہ پکار کر بولی۔

نہاریا جیجے چائے بناتی ہیں۔ اگر بی لینا۔“

ہے عمر میں تو جیسے چائے کا کال پڑا ہے۔“ عمر بری طرح تلملا گیا تھا۔

نہاریا نہیں بتاؤ ہے اس کا۔ چلو تم نیپیل بھائی کے کمرے میں میں وہیں چائے لے کر آتی ہوں۔“

نت جو خاموشی سے دونوں کی تکرار دیکھ اور سن رہی تھی، بیشیہ کی طرح صورت حال کی نزاکت کا احساس کر  
نہاریا کر کے کمرے سے نکل گئی تو مدیہ نے بیڈ پر سے لفافہ اٹھا کر بے اختیار ناک کے ساتھ لگایا اور خودی ہنس

نہاریا پر گر کر لفافے میں سے خط نکالا تھا۔

نہاریا سے پکاروں! کیا نام ہے تمہارا۔“

نہاریا میرا کوئی قصور نہیں، یہاں آکر میں اپنے آپ کو بھی بھول گیا ہوں نہ نہ۔ یہ مت سمجھنا کہ بڑھائی کی  
ہے بلکہ حسین نظاروں اور جلووں نے میرے ہوش بھلا دیئے ہیں۔ کہاں کہاں سے اور کس کس کی طرف

نہاریا پڑاؤں! ادھر نیلا سمندر ہے ادھر نیلی آنکھیں۔ میں دونوں میں فرق کھوجنے لگتا ہوں۔ پھر اوپر دیکھتا  
پڑے آسمان پر صرف ایک اکیلا چاند اس کے آس پاس دور دور لکیریں کوئی ستارہ نہیں۔ شاید سارے

نہاریا رات آئے ہیں۔ جب ہی تو اپنی جنگ لگا ہٹ ہے۔ مدحو میرا کیا ہو گا۔ اگر میں اپنے مقصد سے ہٹ گیا تو  
نہاریا اس آؤں گا۔ دیکھو میرے لیے دعا کرنا۔ کوئی ناں؟“

نہاریا ساتھ اس کا دل دوتا گیا تھا۔ یہ نہیں اصرار ہے کچھ لکھا تھا یا اسے ستانے کو محض مذاق۔ کچھ بھی تھا۔ وہ  
نہاریا جس وحشت پڑی رہی۔ کیونکہ کسی بھی ضدی اور خود سرسی، تھی تو بہر حال لڑکی جس کی آنکھوں

نہاریا گئے تھے اور سجانے والا خود ان کا دشمن ہو رہا تھا۔  
نہاریا مذاق نہیں کرنا چاہیے۔“ کتنی دیر بعد اس نے سب مذاق سوچ کر خود کو سہارا دینے کی کوشش کی  
نہاریا اس میں کامیاب ہو کر خط دوبارہ لفافے میں بند کیا پھر اسے اپنی الماری میں چھپا کر گمزنے سے لپٹی

پتہ در سے مایہ جی کے پاس ہوں اور اس سے پہلے لان میں تھی۔ اماں جی نے صبا سے کہا ہو گا۔

ماں نے کہیں تو ان کا کام ہو چکا ہوتا۔ آسہ نے بیٹھے ہوئے کہا۔

زہد ہونے کا مطلب آپ نے سمجھ لیا کہ۔ وہ منہ پھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

مہمان نے کیا سمجھ لیا بیٹا! جا کر اماں جی سے پوچھو، وہ بار بار تمہارا نام لے کر کہہ رہی ہیں کہ انہوں نے تم سے ہر کام کا تھا۔ آسہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دھیرج سے کہا تو چادر کے ساتھ ہی اسے اماں جی کا کام یاد آ گیا لیکن

انہوں نے ہی غنا تھا۔

مہمان مہمان کر رہی ہوں اماں جی سے۔ وہ بظاہر سادگی سے کہہ کر کمرے سے نکلی تو اپنی بھول پر بجائے شرمندہ کے ہنسی ہوئی اماں جی کی چادر تلاش کرنے لگی جسے انہوں نے استری سے سکھانے کو کہا تھا اور اس نے کے مطابق جانے کس کوئے میں ڈال دی تھی۔

ہاں ہے؟ شعر نے اسے اپنے کمرے میں آتے ہی متلاشی نظروں سے ادر اور دھڑکتے پا کر پوچھا تو وہ بے

پاس ہوئی۔

پار۔

ہرے رنگ کی؟ شعر نے شرارت سے کہا۔

ہرے۔ وہ چونک کر اشعر کی طرف متوجہ ہوئی۔ نہیں اشعر بھائی! اماں جی کی چادر۔ وہ غالباً براؤن کلر کی

پٹنے دیکھی ہے۔

ہاں مگر دو روز سے رنگ پر پھیلی ہوئی دیکھ رہا ہوں۔ ابھی بھی وہیں ہوگی لیکن میرا خیال ہے ابھی تک

پس ہوگی۔

سکھانے ہی کے لیے اماں جی نے مجھے دی تھی اور میں بتا نہیں کہاں رکھ کے بھول گئی۔ خیر چھوڑیں۔ وہ

میں کام چھوڑ کر آرام سے بیٹھتے ہوئے بولی۔ میں نے سنا ہے آپ بھی باہر جا رہے ہیں۔

نکلتا ہے۔

میں میرا مطلب ہے آپ کو تو یہاں اچھی جاب مل گئی ہے پھر کیوں جا رہے ہیں۔

اچھی جاب پر جا رہا ہوں آفس کی طرف سے ایک سال کی ٹرننگ کے لیے اس کے علاوہ وہاں کچھ اور کرنے کا

ارادہ میں ہے اور نہ ہی ٹرننگ کے بعد وہاں مزید قیام کا خیال ہے۔ اشعر نے بہت سیدھے سادے انداز

میں بات کا جواب دیا تھا۔

یہ تو آپ یہاں بیٹھ کر کہہ رہے ہیں ناں وہاں جاتے ہی آپ کے ارادے بدل جائیں گے۔ ایک سے دو سال

پہلے کا احمر نے؟ شعر نے اس کی بات کاٹی تو وہ بھی فوراً بولی تھی۔

میں کچھ نہیں بتا۔ میں تو بس سنی سنائی کہہ رہی ہوں کہ باہر جا کر لوگ گھریا کر کیا اپنے آپ کو بھی بھول جاتے

ہاں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں لیکن تمہیں احمر پر بھروسہ ہونا چاہیے۔ اشعر اس کا سر ہلا کر مسکرا دیا تو وہ کچھ

مہمان کو کراس کے کمرے سے نکل آئی۔

مہمان نے لڑکیاں ڈھولک پینے کی تیاری کر رہی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی ٹوپیہ چلائی۔

مہمان نے ڈھولک اسے دو۔ آؤ ناں مدحو۔

مہمان نے اچھی میں بجا لیتا ہوں۔ ادھر سے گزرتے عمر نے وک کر فوراً مداخلت کی تو مدحیہ اسے دیکھ کر

مہمان کو توڑکیوں میں بیٹھنے کا شوق ہے۔

مہمان نے توڑکیاں کوئی غیر تھوڑی ہیں سب اپنی ہیں۔ عمر دھڑلے سے سب کے درمیان بیٹھ گیا اور ڈھولک پر

دیکھا احمر بھائی نے ہر ایک پل کا احوال لکھ بھیجا ہے۔ صبا نے اسے دیکھتے ہی چھیڑا تو وہ بس ذرا ہنسنے

لگی۔ تم از کم مجھے تو دھواؤ۔ دیکھو تو احمر بھائی نے اپنے جذبات کو کس طرح۔

دیکھو موت۔ وہ فوراً ٹوک کر بولی۔ احمر کوئی دنیا سے نرالے تو نہیں ہیں جو ان کی تحریریں بھی انوکھی ہیں

وہی باتیں جو سب لکھتے ہیں۔ انہوں نے بھی لکھی ہیں۔ صبا نے اس کی اندرونی کیفیات سے بے خبر شوخی سے باز نہ

آئی۔ تو میں کیا کروں؟ وہ چڑ گئی تھی۔ بری طرح جھڑک کر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگی تو صبا نے جوں

کر اسے دیکھا پھر موضوع بدلنے ہی میں عافیت سمجھی تھی۔

مہمان نے سوچا سوچ کر سوچ کیسے بند کر دیا تھا یا ایسے ہی کھلا چھوڑ دیا ہے۔

پتا نہیں جا کر دیکھ لو۔ اس نے جیسے بادل غماز سے جواب دیا تھا۔ اصل میں اب اس کا کسی بات میں دل نہ

لگ رہا تھا۔ احمر کے خط نے حقیقتاً اسے دکھ پہنچایا تھا۔ حالانکہ وہ ایسا تو نہیں تھا۔ ایسی دل جلانے والی بات

اس نے کبھی مذاق میں بھی نہیں کی تھی۔ پھر اسے کہا ہو گیا تھا۔

دیکھیں سچ تو وہ۔ اس کا ذہن ان ہی باتوں میں الجھ رہا تھا۔ جب ہی صبا کی مداخلت ناگوار گزر رہی تھی

اپنے کمرے میں بند ہونے کا وقت نہیں تھا۔ کیونکہ آسہ آنے والی تھی اور اس کے آگے ہی سب نے یہاں

روانہ ہونا تھا۔ ایک بار اس نے سوچا کہ وہ کوئی بہانہ کر کے اسلام آباد جانے سے منع کرے لیکن اس خیال سے کہ یہاں

پر خوار خواہ سب کاموڈ خراب ہو گا۔ اس نے اپنی سوچ جھٹک دی پھر احمر کی طرف سے دھیان ہٹانے کی کوشش

وہ کچھ بھگتی گئی تھی۔ اس کے بعد اسلام آباد جا کر ہی اس کاموڈ ٹھک ہوا تھا۔ اب پتا نہیں جب تک تبدیل نہ

کا دھیان بنا دیا تھا یا کوئی اور بات جس سے وہ اپنے اصل رنگ میں آگئی تھی۔

اللہ مایہ جی! آپ کا گھر کتنا خوب صورت ہے۔ سارا گھر دیکھنے کے بعد وہ سیما بھائی کے پاس آئی تھی

پتا ہے میں نے چھٹیوں میں مہمان سے کہا تھا کہ مجھے اور صبا کو آپ کے پاس بھیج دیں لیکن مہمان ہی نہیں

وقت آکر میں آتی تو اتنے بہت سارے دن آپ کے گھر رہتی۔ سچ مجھے تو یہاں آکر بہت اچھا لگ رہا ہے۔

تم ابھی بھی بہت سارے دن رہنا۔ سیما بھائی نے اس کی ٹھوڑی چھو کر کہا تو وہ مایوسی سے بولی۔

اب نہیں رہ سکتی کیونکہ کالج مکمل ہیں اور اگلے مہینے سمسٹر بھی ہونے والے ہیں البتہ آپ مہمان سے

کہ وہ اس بار ہمیں چھٹیوں میں ضرور بھیجیں۔ خیر اس بار میں خود تمہیں لینے آؤں گی۔ سیما بھائی نے

پہلے بھی آسہ کو منع کرنا چاہیے تھا۔ خیر اس بار میں خود تمہیں لینے آؤں گی۔ سیما بھائی نے

خوش گردیا۔

سچ مایہ جی! بس جیسے ہی چھٹیاں ہوں گی میں آپ کو فون کر دوں گی اور آپ لینے آئیں گی تب تو مہمان

نہیں کر سکیں گی۔

ہوں اصل میں آسہ تم دونوں کے بغیر رہ نہیں سکتی۔

ہم دونوں نہیں تینوں، نیل بھائی کو بھی وہ کہیں نہیں جانے دیتیں۔ اس کے یاد دلانے پر سیما

سادتہ مسکرائیں۔

ہاں تم تینوں۔

اور بتا ہے مایہ جی میں۔ آسہ کے آنے سے اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

مدحو! تم یہاں بیٹھ ہو بیٹا! اماں جی نے تم سے کوئی کام نہ تھا۔ آسہ نے اسے دیکھ کر کہا۔

مجھ سے۔ اپنی طرف اشارہ کر کے اس نے سوچتے ہوئے انداز میں پوچھا پھر نفی میں سر ہلایا۔

ہاتھ مارنے کے ساتھ شروع ہو گیا۔

”بہناو بہنا! تیری ڈولی میں سجاؤں گا۔“

لڑکیاں تالیاں پیٹ کر اس کا ساتھ دینے لگیں تو وہ بھی رہ نہیں سکی فوراً ”بیٹھ کر سب کے ساتھ شادی“

تھی۔

♥♥♥

اگلے روز مسجد رخصت ہو کر چلی گئی تو کچھ دیر رخصتی کے بعد کی فضا قائم رہی یعنی محسوس کی جانے لگی تھی۔ خواہ کتنے لوگ ہوں پھر بھی پتا چلتا ہے کہ کوئی ایک چلا گیا ہے۔ ایسے ہی ساری افزائش اچانک ختم ہو گئی۔ شام میں کپڑے بدلنے کے لیے جتنا شور اور جوش تھا۔ اب اتنی ہی خاموشی اور کالی۔ مدیہ نے کپڑے بدلے لیکن آتارے ہوئے کپڑوں کو تمہ کر کے سوٹ کیس میں رکھنے کا کام صبحات کے سر ڈال دیا اور اس احتجاج سے پہلے ہی کمرے سے نکل کر آئی تو آگے سیما بھاگتی چائے کے کمرے سے اسی تھمادی۔

”بیٹا! اپنے ناموں جی کے کمرے میں دے آؤ اور دیکھنا کپڑے تمہارے آکر اور لے جانا۔“

”جی اچھا!“ وہ رے لیے خشک بھائی کے کمرے میں آگئی اور آئیہ کے سامنے نیپل پر رے رکھ کر پوچھا: ”مما اور کپڑے چائیں؟“

”چائے دو کی سب کو تو پتا چلے گا۔“ آئیہ کہہ کر بڑے بھائی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ پہلے بھی وہ ان کی بات رہی تھی۔ پتا نہیں کیا موضوع تھا اور وہ جتنا کام سے بھاگ رہی تھی اتنی پھنس گئی تھی۔ ایک ایک کپڑے ڈال کر باری باری سب کو تھما لی گئی۔ آخر میں نیپل اور اشعرہ گئے اور دھر دھر اس خالی ہو گیا تو وہ اشعرہ کو دے بولی۔

”آپ تو چائے نہیں پئیں گے ناں۔“

”تم نہ پلانا چاہا ہو تو اور بات ہے۔“ اشعرہ نے کہا۔ ساتھ ہی اسے چائے لانے کا اشارہ بھی کیا تو وہ اے گ ہوئی تھما س لے کر کچن میں آگئی۔

”مائی جی، کپڑے تو کم نہیں ہوئے، چائے کم ہو گئی ہے اور اب آپ کسی اور کے ہاتھ بھجوا دیں کیونکہ مجھے بلا رہی ہیں۔ وہ تھما س سیما بھی کو تھما کر فوراً ”کچن سے نکل کر کمرے میں آگئی۔ جہاں صبا ت اور ڈ جوڑے جانے کا باتیں کر رہی تھیں۔ دوسری طرف روٹی۔ مریم اور رجا کے ساتھ مصروف تھی۔ عمار اور وہیں موجود تھے لیکن ان سب کی طرف ان کی پشت تھی اور کھڑی سے باہر جھانکتے ہوئے پتا نہیں کس چیز پر رہے تھے اور دھڑکی بھی آن تھا اور غالباً ”سب بیوی دیکھ رہے تھے، لیکن درمیان میں خبریں آجائے سب کی توجہ اس سے ہٹ گئی تھی۔

”اس بے چارے کو نہیں سنا تو بند ہی کر دو۔“ وہ کہتی ہوئی ٹی وی بند کرنے کے ارادے سے اس کی بڑھی تھی کہ روٹی جیج پی۔

”نہیں خود اپنے نہیں کرنا۔ ابھی پروگرام کا بقیہ حصہ آئے گا۔“

”کوئی خاص پروگرام آ رہا تھا؟“

اس نے پوچھا لیکن روٹی پھر اپنی باتوں میں مصروف ہو گئی تھی اس لیے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ رے اچکا کر اپنے پیچھے کے لیے جگہ دیکھنے لگی تھی کہ شاہ سکندر کے نام پر اس کی نظرس فوراً ٹی وی اسکرین پر کسی سینار کی جھلکیاں تھیں اور اب یہ کوئی نئی بات نہیں تھی اکثر ہی خبراتے میں نہیں جھلک نظر آ جاتی تھی۔ جسے وہ اور صبا ت اگر اس کی ہوتیں تو شوق سے دیکھتی تھیں اور سب کی موجودگی انجان بن جاتی تھی۔ اس وقت سب موجود تو تھے لیکن اتفاق سے کوئی بھی متوجہ نہیں تھا۔ اس لیے وہ دیکھنے بھی لگی تھی۔ پھر جیسے ہی منظر دلا اس نے کمرے سے نکلتے ہوئے سوچا۔

”شاہ سکندر، یہیں اسلام آباد میں موجود ہیں۔“

”کیا بات ہے، تم ابھی سوئیں نہیں؟“ خشک بھائی کے کمرے سے نکلتے ہوئے آئیہ نے اسے دبا

کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

”یہ سو گیا رہ ہوئے ہیں ماما اور میں اکیلی تو نہیں جاگ رہی، اندر سب بیوی دیکھ رہے ہیں۔“

جتنے نہیں ہو تم لوگ۔“ آئیہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔ تو وہ بونہی ٹپکتی ہوئی گلاس والے کے قریب آکھڑی برابر لان میں جلتے جلتے تھے رنگ برنگے قمقموں کو دیکھنے لگی، شادی کا ہنگامہ سر پڑنے کے ساتھ جانے کی روٹی بھی ماند پڑ گئی تھی۔

”امم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ عقب سے نیپل کی آواز پر اس نے گردن موڑ کر انہیں دیکھا تو وہ ایک لحظہ کو

میں جھپٹ کر اکر بولے۔

”میری جی، کیا بات ہے یہاں کیوں کھڑی ہو اور باقی سب لوگ کیا سو گئے؟“

نیپل کی وی وی کوئی پروگرام آ رہا ہے، شاید وی دیکھ رہے ہیں۔“ وہ جواب دے کر دوبارہ رخ موڑ گئی۔ تو

وہ آواز سے نیپل اس کے قریب آکر پوچھنے لگے۔

”مما کسی سے جھگڑا ہوا ہے؟“

اپنے آپ سے ”اب خدا را مطلب مت پوچھنے کھڑے ہو جائے گا۔“ اس کے لمحے میں اچانک تنفر

نکل بھائی! ”کچھ دیر بعد اس نے خود ہی انہیں نکارا۔“ ایک بات مانیں گے۔“

ہوں۔“ نیپل بغور اسے دیکھ رہے تھے سوچتے ہوئے انداز میں ہوں کی آواز نکالی تو وہ ان کی طرف متوجہ ہو

”وہ کرس۔“ تالیس گے نہیں۔“

بل فوراً ”کچھ نہیں کہہ سکتے، کیونکہ انہیں حیرت ہو رہی تھی کہ اس نے کبھی اس طرح ان کے ساتھ راز

انداز میں باتیں نہیں کی تھیں نہ کبھی اپنا کوئی مسئلہ انہیں بتایا تھا۔

یہی جگہ اگر صبا ہوئی تو آپ فوراً ”اس سے وعدہ کر لیتے۔ میری بات کیوں ماننے لگے آپ؟“ وہ ان کی

پاس مایوس ہو کر بولی۔

میں میں تم سے بھی وعدہ کر رہا ہوں۔ بتاؤ کیا بات ہے۔“ نیپل نے چونک کر فوراً ”کہا تو اس نے پہلے ادھر

بھاگتا ہوا آواز میں جلدی جلدی بولنے لگی تھی۔

شاہ سکندر سے ملنا چاہتی ہوں۔ آپ پلیز مجھے ان کے پاس لے چلیں وہ یہیں اسلام آباد میں ہیں۔ میں

لنڈن میں انہیں دیکھا ہے۔“

اس نے کچھ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا تھا۔ یہ لڑکی ان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی نہ جگہ دیکھتی تھی نہ

یکل جب جس وقت جو بات دماغ میں سما جائے اور اسے سمجھنا بھی بہت مشکل تھا۔ وہ حقیقتاً ”اند رے

پٹان ہو گئے تھے بمشکل خود پر قابو پا کر کہنے لگے۔

موا شاہ سکندر کوئی عام شخص نہیں ہیں۔ ان سے ملنے کے لیے پہلے اپنا نمبر لینا پڑے گا اور یہاں اسلام

”توبہ کرو۔ تمہیں کون چکروے سکتا ہے۔“

نیل نے فوراً ”کان کو ہاتھ لگایا پھر اسے سونے کی تاکید کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے تو وہ بجائے ان کی بات عمل کرنے کے پھر گاؤں والے سے باز دیکھنے لگی تھی۔ اصل میں احمد کے خط کا ایک ایک لفظ اس کے دل میں جھونکا تھا اور بہت کوشش کے بعد بس کچھ دیر کو ہی وہ اپنا دھیان ہٹا پانی اس کے بعد پھر اسے ہی سوچنے لگی۔ اس کے اندر تو جیسے ایک احساس انگڑائیاں لینے لگا اور یہ اس کے اپنے احساسات تھے اپنی سوچ تھی اور شاید انہوں نے طور پر وہ فرار بھی دھونڈ رہی تھی۔

پھر اگلے روز سچھپے کے ولیم سے فارغ ہوتے ہی اس نے واپسی کی رٹ لگا دی۔ حالانکہ یہ سب بھی اس کے اصرار پر آئیہ مزید دو تین روز قیام پر آمادہ ہو چکی تھی لیکن وہ اپنی خدمت سے باز نہیں آئی اور منوا کر رہی تھی۔

♥♥♥

اسلام آباد سے آنے کے چوتھے روز صاحت کو فون کرنے کا موقع ملا تھا۔ مدحیہ سونیا کے ساتھ اس کی دوست کے ہاں گئی ہوئی تھی اور نیل ابھی اٹھ تھے۔ ان کے جانے کے کچھ دیر بعد وہ آکر علی جمائیکر کے کمرے پر گزرتی ہوئی گئی، دل ہی دل میں شکر کرتے ہوئے بولی۔

”کیسے ہیں آپ؟“

”صاحت! وہ خوشگوار سے احساس میں گھر کر بولا۔ ”آپ کیسی ہیں اور یہ آپ نے آئے میں اتنے دن دیکھے۔“

”نیل! آتو میں تین چار روز پہلے ہی گئی تھی لیکن خیر چھوڑیں یہ بتائیں آپ کی سسٹر کیسی ہیں؟“ وہ فوراً ہانپ کر بولی۔

”بالکل ٹھیک اور آپ سے ملنا چاہتی ہے۔ اس سلسلے میں بتائیں کیا کروں؟“ اسے سیدھا آپ کے گھر لے آیا۔

”اف نہیں۔“ وہ گھبرا کر فوراً بولی تھی۔ ”گھر آنے کی بات نہیں کریں پلیز آپ کی سسٹر اگر میری کانٹا ہو تو تب تو بات بن سکتی تھی۔“

”پھر آئی مین بات کیسے بنے گی۔ میں نے اپنی والدہ اور بہن کو دینی سے بلایا، یہی اسی مقصد کے لیے ہے کہ سلسلہ آگے بڑھے اور میری والدہ تو صبح شام مجھے نوکتی ہیں کہ میں کب انہیں آپ کے گھر لے کر جاؤں گا۔“

علی جمائیکر نے سنجیدگی سے کہا تو وہ مزید پریشان ہوئی اور سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے تو قدرے توقف سے کہنے لگا۔

”بیکلو صاحت! کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی ہے؟“

”نیل! مجھے کچھ بتائیں۔“ وہ عاجزی سے بولی۔

”کیا بتائیں؟“

”جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں۔ آپ کی والدہ اور بہن اس طرح کیسے آسکتی ہیں میرا مطلب بغیر کسی گاڑی کے۔“

نیل پانچ بجے اگر میں وہاں نہیں پہنچی تو سمجھ لیجیے گا کہ بہت چاہتے اور بہت کوشش کے باوجود نہیں آئے۔

جانے کیسے کچھ ترنگ میں کہہ گئی پھر فوراً ”کریڈل پر ہاتھ بھی رکھ دیا۔ اس کے بعد ریسور رکھتے ہوئے وہ پٹسکرانی تھی۔

♥♥♥

پندرہ روز کا لچ سے آتے ہی اسے شام کی فکر ہو گئی تھی۔ گوکہ لاہور کی کام پر توبہ فوراً ”ساتھ چلنے کو تیار ہو لیکن اس کی موجودگی میں وہ علی جمائیکر سے بات نہیں کر سکتی تھی جبکہ عمر اسے لاہور کی تک چھوڑ کر چلا جاتا تو یہاں بھی ایک کامیاب تھا فوراً بولا۔

نیل نے اسے جانوں گا۔“

نیل نے اسے جانوں گا۔“

نیل نے اسے جانوں گا۔“

نیل نے اسے جانوں گا۔“

نیل نے اسے جانوں گا۔“

نیل نے اسے جانوں گا۔“

نیل نے اسے جانوں گا۔“

نیل نے اسے جانوں گا۔“

نیل نے اسے جانوں گا۔“

نیل نے اسے جانوں گا۔“

نیل نے اسے جانوں گا۔“

”سبھ کر رابعہ کو ٹوکتے ہوئے بولا۔  
”رابعہ! میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ یہ اکیلی کہیں نہیں جاتیں۔“  
”ہمارے ساتھ اکیلی کہاں ہوں گی؟ کیوں صباحت۔“ رابعہ نے اسے مخاطب کیا تو وہ اندر ہی اندر بڑبڑاتی ہوئی۔

”آپ سمجھیں نہیں۔ اصل میں مجھے لائبریری کے علاوہ اور کہیں جانے کی اجازت نہیں ہے اور میرا بھی میں بھائی کے ساتھ آتی ہوں۔“  
”چلو تم وہاں جا کر بیٹھو۔“ علی جنانگیر نے اکتا کر رابعہ کو ٹیبل کی طرف دھکیل دیا پھر اسے دیکھ کر بولا۔  
اس کی باتوں کو مانڈ نہیں کیجیے گا۔“  
”آپ کو بتانا چاہیے تھا کہ آپ کی سسٹر بھی ساتھ ہوں گی۔“ وہ اس کی بات ان سنی کر کے آگے بڑھ کر بولی۔

”کل تک ایسا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ بس ابھی آتے ہوئے سوچا“ اسے آپ سے ملوایں دوں۔ برتے رہی تھی اگر آپ کو اس کا آنا اچھا نہیں لگتا۔“  
”نہیں یہ بات نہیں ہے۔“ وہ فوراً بول پڑی۔ ”بس میں اچانک کسی بات کو فیس نہیں کر سکتی۔“  
”چلیں آئندہ خیال رکھوں گا۔“  
”تھنک یو۔“ وہ دوسری روم میں مڑ کر ریک دمکھنے لگی اور پھر جس کتاب کی طرف ہاتھ بڑھایا وہ اس ہی علی جنانگیر نے کھینچ لی اور کھول کر اوپر سے نیچے تک پورے صفحے پر نظر ڈالی پھر دھیمی آواز میں پڑھتے ہوئے کے چہرے پر مبہم سی مسکراہٹ تھی۔

کبھی یوں ملیں کوئی مصلحت کوئی خوف دل میں ذرا نہ ہو  
مجھے اپنی کوئی خبر نہ ہو۔ تجھے اپنا کوئی پتا نہ ہو  
کبھی دھوپ دے کبھی بدلیاں دل و جان سے دونوں قبول ہیں  
مگر اس محل میں نہ قید کر جہاں زندگی کی ہوا نہ ہو  
تیرے اختیار میں کیا نہیں۔ مجھے اس طرح سے نواز دے  
یوں دعائیں میری قبول ہوں میرے لب پہ کوئی دعا نہ ہو

♥-♥-♥

عمر پھر اتر کا خط لہراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا تھا۔  
مدیہ نے دیکھتے ہی سبھ لیا کہ پہلے وہ چائے کا مطالبہ کرے گا اس کے بعد بھی بہت عاجز کر کے خدا گا۔ اس لیے پہلے ہی بول پڑی۔  
”سنو، مجھ سے کوئی امید نہ رکھنا۔ میں چائے تو کیا تمہیں پانی بھی نہیں پلاؤں گی۔ بے شک ڈرکھو۔“  
”یعنی تمہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔“ عمر جمل سا ہو گیا تھا۔

”بالکل نہیں۔“ وہ اطمینان سے بولی۔  
”یہ سراسر زیادتی ہے مدحو کہ بڑے بھائی تو تمہیں اتنا مانتے ہیں اور تمہیں کوئی پرواہی نہیں احتجاج کیا۔“  
”تم مجھے ایک میل نہیں کر سکتے۔“ سبھ۔ ”وہ اٹھ کر الماری کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔“ خط رستا۔  
یہاں سے کیونکہ میں اس وقت کسی بحث کے موڈ میں نہیں ہوں۔“  
”میں کوئی بحث نہیں کر رہا، بس اتنا بتا دو کہ محض چائے پلانے کے ڈر سے تم ایسا کہہ رہی ہو یا وہ

پہلی نہیں؟“ عمر ایک دم سنجیدہ ہو گیا تھا۔  
”میں بھی سمجھ لو۔“ اس نے لاپرواہی سے کہہ کر الماری کھولی اور خود کو مصروف ظاہر کرنے لگی۔  
”میں کیوں سمجھ لوں۔“ مجھنے والے تمہیں نہ سمجھے۔“ عمر خط اس کی طرف پھینک کر کمرے سے نکل گیا تو اس نے الماری بند کر کے اپنے پیروں کے پاس سے لفافہ اٹھایا پھر پھاٹک کر عمر کو پیچھے سے پکارا۔  
”سنو عمر!“

عمر نے پلٹ کر دیکھا تو اسی کے انداز میں لفافہ لہرا کر ہنستی ہوئی بولی۔  
”غیب کیا یو“

عمر نے رہا تھا پھر تباہ ہوا سیڑھیاں اتر گیا تو اس نے دوبارہ کمرے میں آکر دروازہ بند کر لیا اور لفافے کو انٹ پلٹ رکھنے لگی جیسے کھونا بھی چاہتی ہو اور نہیں بھی کیونکہ گزشتہ خط سے وہ ابھی تک تپتی ہوئی تھی اور اب پتا نہیں پڑتا کیا لکھا تھا۔  
”مجھ سے ہونے کے باوجود اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ کھول کر پڑھے۔ شاید اس لیے کہ ہمت خود کو تسلیم کروایا تھا اور اب اپنی ذات کی ذرا سی نفی بھی اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ کتنی دیر نہ ہوئے اور اوہ سے ادھر ٹھلنے کے بعد اس نے لفافہ چاک کیا تھا۔“  
”اس نے تمہارے جواب کا انتظار کیا مدحو! لیکن پھر تمہاری بات یاد آئی کہ تمہیں ایک خط لکھنے میں کتنا دیر لگے گا۔ ویسے میں نے کوئی جواب طلب بات لکھی بھی نہیں تھی۔ بس اپنی کیفیات بیان کر ڈالیں جنہیں بڑھاپا نہیں تمہاری کیا کیفیت ہوئی۔ تم نے میرا مذاق اڑایا یا مجھ پر غصہ آیا۔ یہ ضرور لکھنا تاکہ آئندہ میں محتاط رہاؤں۔“

اور بال ٹوپیہ نے مجھے سمیٹ کر شادی کی تصویریں بھیجی ہیں ان میں تمہاری دو تصویریں ہیں۔ دونوں میں صبا اور ساتھ ساتھ ہو۔ اور میں تم سے یہ کہوں گا مدحو کہ تم مصنوعی کے بجائے چاہے صبا کا اصلی مل نوج کر اپنے چہرے پر پھر بھی صبا نہیں بن سکتیں۔ آئندہ ایسی کوشش نہیں کرنا اور اگر تمہیں صبا بننے کا اتنا ہی شوق ہے تو۔  
”ٹالی فٹ۔“ میں کیوں صبا جیسی بننے لگی۔ میسنی جی حضور کی کرنے والی۔ مجھے کوئی شوق نہیں ہے۔“  
اس نے بے حد تملاکر خط بھاڑ ڈالا اور لکھتی دیر اپنے آپ کو کھینچتی رہی پھر اسے آپ نارمل بھی ہو گئی اور خط کے مدحو کے کیسے حیران پھر پریشان سی ہو کر اٹھیں جوڑنے کی کوشش کرنے لگی تھی کہ دروازے پر دستک کے صباحت کی آواز آئی۔ وہ تشویش سے پوچھ رہی تھی۔  
”مدحو دروازہ کیوں بند کر رکھا ہے۔“

اس نے جلدی سے سارے ٹکڑے اکٹھے کر کے لفافے میں ڈالے اور لفافہ الماری میں چھپانے کے بعد دھکوتے ہوئے بولی۔  
”نندہ ہوں، مری نہیں ہوں۔“

”میں تمہارے دشمن۔“ صباحت اندر آتے ہوئے بولی۔  
”جانی ہو۔ میرے دشمن کون ہیں؟“ اس نے قدرے شوقی سے دیکھا تو صباحت چیخ پڑی۔  
”نہو! جو اس گھر کے کسی فرد کے نام لیا تو۔“

”اُبلے۔“ وہ ہنستی ہوئی بیڈ پر جا گری۔ پھر کتنی کھڑی کر کے ہتھیلی پر سر نکاتی ہوئی صباحت کو متوجہ کر کے پوچھنے لگی۔  
”سنو، کبھی تم نے یہ خواہش کی ہے کہ تم میرے جیسی ہو تیں۔ یعنی تمہاری سوچیں، تمہاری عادات سب مجھ جیسی۔“

صباحت نے بے اختیار نفی میں سر ہلایا تو وہ ایک دم پھر کراٹھ بیٹھی۔  
”مجھے بھی ایسا کوئی شوق نہیں ہے کہ میں مدیہ کے بجائے صباحت نظر آؤں اور تمہاری طرح ہر ایک کی خوشی لگتی ہو یا اگر پیچھوں۔“

”تو تم سے کس نے کہا ہے ایسا کرنے کو۔“ صباحت نے الجھ کر پوچھا۔

”کسی نے نہیں لیکن چاہتے سب یہی ہیں۔ میں جانتی ہوں۔“  
 ”کوئی نہیں۔“ بیٹھے تو بھی کسی نے نہیں کہا۔ تم پتا نہیں کیوں اپنے آپ سب سے شامی ہو جاتی ہو۔  
 سب تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔ ابھی بھی نیچے تمہارا ذکر ہو رہا تھا پتا ہے مائی جی کیا کہہ رہی تھیں کہ نہ  
 بھی وہ تمہارے جیسی لڑکی ڈھونڈیں گی۔“ صباحت کے سیدھے سادے انداز پر وہ مزید چڑھ کر بولی۔

”تم اسے میری تعریف سمجھ رہی ہو۔“

”تعریف ہی کر رہی تھیں مائی جی کہ مجھے مدحو جیسی لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔“

”ہو نہ!“ اس نے نخوت سے سر جھٹکا تو صباحت کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر پوچھنے لگی۔  
 ”ویسے اس وقت تمہیں کس بات کا غصہ ہے۔ نیچے تو تم کہیں نہیں پھر ٹیل بھائی نے کچھ کہا ہے۔“  
 ”ٹیل بھائی ہوتے کہاں ہیں آج کل۔“ مجھے تو کس کھانے پر ہی نظر آتے ہیں۔“ اس نے کہا پھر کچھ  
 بولی۔ ”ہوں اب سمجھی۔ مجھ سے کترا رہے ہیں ٹیل بھائی۔“

”کیوں؟ تم سے کیوں کترا میں گے؟“ صباحت کو اس کا بل بل بدلتا موڈ سمجھ میں آ رہا تھا نہ اس کی بات پر۔  
 ”بس ہے ایک بات، تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔ پہلے میں آج ٹیل بھائی سے نمٹ لوں۔“ وہ پہلے  
 دیکھ کر بولی پھر اپنے آپ جانے کیا بڑبڑانے لگی تھی۔

علی جہا نگیر بہت خاموشی سے رابعہ کی باتیں سن رہا تھا جو وہ صباحت کے بارے میں اپنی ماں سے کہہ رہی  
 ”ہے تو پاری لیکن کچھ مغرور سی لگتی ہے اب پھر میرے سامنے پوز کر رہی تھی زیادہ بات ہی نہیں کی اور  
 بھی مجھے ٹوک کر ایک طرف ٹھادیا تھا ورنہ میں اس سے اس کی ماں کی عادات اور مزاج کا ضرور پتا چلا جیتے۔  
 ”کہوں اس کی والدہ کے مزاج سے تمہیں کیا لینا دینا۔“ علی جہا نگیر نے مداخلت کرتے ہوئے کہا تو رابعہ  
 پہلے عارفہ بیگم بول پڑیں۔

”کیوں نہیں نے؟ پہلے تو ہمارا اس سے واسطہ پڑتا ہے۔ بقول بابا جان کے بڑی چالاک عورت۔  
 تمہارے ابا کا کہنا ہے کہ بس بڑھی نکاحی سمجھ دار ہے جیسے شہر کی دوسری عورتیں نظر آتی ہیں اور اس کے  
 بھی عام ہے۔“ عارفہ بیگم کچھ ناگوار سی سے کہہ رہی تھیں کہ فون کی تیل پر خاموش ہو گئیں۔  
 علی جہا نگیر نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف بابا جان تھے۔

”السلام علیکم بابا جان!“

”جی ابا کافون آیا تھا؟“ انہوں نے امی کو ساری بات سمجھا دی ہے۔“

”میں بس ابھی لے جا رہا ہوں امی اور رابعہ کو بھی۔“

”جی جی اچھا۔“

”خدا حافظ!“ اس نے ریسیور رکھ کر گھڑی پر نظر ڈالی پھر اٹھتے ہوئے بولا۔

”چلیں امی، ڈاکٹر آئیے آجی ہوں گی۔“

عارفہ بیگم اپنی چادر سنھاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں پھر رابعہ کے ساتھ آگے بڑھی تھیں۔  
 کچھ دیر بعد علی جہا نگیر کی گاڑی مختلف سڑکوں پر دوڑتی ہوئی آئیے کے کلینک کے گیٹ پر رکی تھی۔  
 ”تم ہمیں رک کر انتظار کرو گے ما؟“ عارفہ بیگم نے اترتے ہوئے علی جہا نگیر سے پوچھا۔  
 ”اب پتا نہیں آپ کو کتنی دیر لگے۔ اگر جلدی فارغ ہو گئیں جب۔“ علی جہا نگیر خود نہیں سمجھا  
 کرنا چاہیے۔

”تھک ہے پھر تم ہمیں روکو۔“ عارفہ بیگم خود انتظار کی زحمت سے بچنے کے لیے اسے انتظار میں چھ  
 کے ساتھ گیٹ میں داخل ہوئیں پھر برآمدے سے آگے راہداری اس کے بعد کا سترے نمبر لے کر  
 میں اطمینان سے دھنسن کر بیٹھ گئیں اور بہت تیکھی نظروں سے ہر طرف کا جائزہ لینے لگیں۔ جبکہ رابعہ

پوچھتی تھی۔ اس کے اندر ایک تجسس سا جاگ اٹھا تھا۔ گلاس وال سے اندر آئیے کو دیکھ کر فوراً ”عارفہ بیگم  
 لا کر سرگرمی میں بولی۔  
 ”وہ دیکھیں ڈاکٹر؟ کیا یہی سکندر چاچا کی؟“  
 ”عارفہ بیگم نے بری طرح اسے گھورا تو وہ بسور کر بولی۔

”اون ساں رہی ہیں۔“

”ابھی کتنی ہے اور تم اگر چہ نہیں بیٹھ سکتیں تو جاؤ بھائی کے پاس۔“ عارفہ بیگم نے اسے مزید ڈانٹ بھی  
 نہ روہ خاصی ناراض سی ہو کر آبی باری کا انتظار کرنے لگی، اور کافی دیر بعد ان کی باری آئی تھی۔  
 رابعہ اپنے تدریج بھائی کو جو وہ کے ساتھ کھڑی ہوئیں اور پھر پہلے رابعہ کو آگے کر کے اس کے پیچھے آئیے کے  
 میں داخل ہوئی تھیں۔

پہلے اپنے پیشہ ورانہ انداز میں دونوں ماں بیٹی کو دیکھتے ہوئے رابعہ کے سلام کا جواب سر کے اشارے سے  
 تھ ہی ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ بھی کیا تو رابعہ اس کے قریب بیٹھ کر عارفہ بیگم کو یوں دیکھنے لگی جیسے اس کی  
 کے بارے میں وہی بتاؤں گی۔

”ا! آئیے بھی عارفہ بیگم کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”میری بیٹی ہے۔ کچھ کھائی پیتی نہیں ہے۔ دیکھیں، کتنی کمزور ہو رہی ہے۔“

رابعہ بیگم نے خاصی تشویش کے ساتھ کہا تو آئیے رابعہ کو دیکھ کر ڈاکٹر اسٹمسکرائی پھر اس کی کھائی تھام کر اپنے  
 رانداز میں پوچھنے لگی۔

”یوں ناشتا کیوں نہیں کرتیں؟“ آئیے کے نرم لہجے میں کوئی فرق نہیں آیا۔

اس لیے کہ میں ابھی ہی بارہ بجے ہوں اس وقت اگر ناشتہ کروں گی تو دوپہر کا کھانا رہ جائے گا پھر امی کو یہ فکر ہو  
 میں کھانا نہیں کھائی۔“

”اب کی یہ روئین کیوں ہے۔ پڑھتی نہیں ہو۔“

”پڑھ لیا اس نے لی اے کا امتحان دیا ہے اور اب تو اس کی شادی کریں گے۔“ رابعہ کے بجائے عارفہ بیگم نے  
 دیا تو آئیے ان کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگی۔

”نوپاؤں! اسے کسی دوا کی ضرورت نہیں ہے۔ بچے جہاں پڑھائی ختم ہوئی اپنی روئین خراب کر لیتے ہیں۔  
 اسے دیر تک سونے سے باز رہیں پھر یہ خود ہی سب کھائے پیے گی اور پتا! آپ خود سمجھ دار ہو! آپ کو اپنی  
 پریشان نہیں کرنا چاہیے۔“ آئیے نے آخر میں رابعہ کو دیکھا تو وہ اٹھتی ہوئی بولی۔

”اٹی تو کس پو بھی پریشان ہو جاتی ہیں۔“

”لیا کو لی! ماں جو ہوں۔“ عارفہ بیگم اٹھ کر رابعہ کی جگہ پر آ بیٹھیں اور اپنی تکلیف بتانے لگیں۔

”میری ٹانگوں میں بہت درد رہتا ہے۔ خاص طور سے ایڑیوں میں۔“ آئیے نے پوری توجہ سے ان کی تکلیف  
 پوچھیں اٹھا کر میڈیسن لکھنے سے پہلے پوچھا۔

”ہم۔“

”بیگم عارفہ جہا نگیر۔“ عارفہ بیگم کے لہجے میں جانے کیسا قافریہ سمٹ آیا تھا۔

”بیگم عارفہ جہا۔“ آئیے کے ذہن میں اچانک جھماکا ہوا تھا۔ چلتا ہوا قلم رک گیا اور بے اختیار انہیں دیکھ کر  
 ”نپ شاہ پور سے آئی ہیں؟“



لوہو لہو کہاں کہیں کراچی میں ہے؟“ عارفہ بیگم نے انتہائی معصوم بن کر پوچھا۔

آسیہ فوراً جواب نہیں دے سکی تو قدرے توقف سے عارفہ بیگم خود ہی کہنے لگیں۔

”ہم تو یہاں کانفرنس روڈ پر رہتے ہیں۔ وہ بھی ابھی دو مہینے ہوئے ہیں یہاں آئے ہوئے اس سے پہلے تھے میرے میاں ابھی بھی وہیں ہیں ان کا اپنا پرنس ہے۔ اب سبوں سے وہاں جے ہوئے ہیں۔ آسکتے تھے۔ میں اپنے بیٹے اور اس بیٹی کی وجہ سے آئی ہوں۔ اس کی مفتی یہاں چچا کے گھر میں کی ہوئی ہے۔ کے لیے کسی اچھی لڑکی کی تلاش میں ہوں۔ مل جائے تو پھر انشاء اللہ دونوں کیساتھ شادی کروں گی۔“

آسیہ بالکل غیر ارادی طور پر ان کی باتیں سننے لگی تھی۔ جب وہ خاموش ہوئیں تو یونہی سر ہلا کر کہنے لگیں۔

”آپ یہ میڈیسن ایک ہفتہ استعمال کریں اس کے بعد میرے پاس آئیے گا۔ اگر ضرورت ہوئی تو دوں گی۔“

”میں نے دینی میں بہت علاج کرایا۔ جب تک وہ استعمال کرتی درد میں کمی ہوتی اور جہاں وہ پھرتا تکلیف، آخر کہاں تک وہ اکھاؤں تک آگئی ہوں۔“ عارفہ بیگم نے کہا۔

”اب انشاء اللہ ایسا نہیں ہوگا۔“ آسیہ نے کہہ کر ٹیل کاٹن پیش کیا تو رابعہ اگلے مریض کی آمد کا اشارہ کھڑی ہوئی اور ماں کو بھی انھنے کا اشارہ کیا۔

”چھا ڈاکٹر صاحبہ! میں پھر ایک ہفتہ بعد آؤں گی۔“ عارفہ بیگم اٹھتے ہوئے بولیں اور آسیہ کے متوجہ ناک سیکڑتی ہوئی رابعہ کے ساتھ باہر آ گئیں۔

علی جمائیکر گاڑی کے ساتھ ٹیک لگائے اطمینان سے کھڑا تھا۔ انہیں آتے دیکھ کر بھی اس نے کم مظارو نہیں کیا تو رابعہ نے خود ہی خودی گاڑی کا دروازہ کھول کر پہلے عارفہ بیگم کو بٹھایا پھر دوسری طرف سے لیے فرسٹ ڈور کھولتے ہوئے بولی۔

”بھائی! کیا میں ڈرائیو لے کر آ رہا ہوں۔“

”ہیں! علی جمائیکر نے چونک کر اسے دیکھا پھر جلدی سے دروازہ کھول کر بیٹھ گیا اور بہت جلدی سے باوجود خود کو فوراً کچھ پوچھنے سے باز رکھ کر گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی اسپید سے مین روڈ پر لے کر آیا تھا کہ عارفہ بیگم اپنے آپ بولنے لگیں۔

”تو یہ کیسی چالاک عورت ہے۔ بابا جان نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ وہ تو شکرے میں پہلے سے تیار تھا۔ معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ تار رابعہ؟“

”ہوں۔“ رابعہ زور زور سے اثبات میں گردن ہلانے لگی۔

”کیا کیا ہوا تھا؟“ علی جمائیکر اب رہ نہیں سکا۔ اسپید آہستہ کر کے مر میں عارفہ بیگم کو دیکھ کر پوچھ لگیں۔

”بہت تیز عورت ہے۔ میں نے جیسے ہی اپنا نام بتایا، پوچھنے لگی شاہ پور سے آئی ہیں۔ بتاؤ بھلا۔“

بات تو نہیں ہے سالوں گزر گئے۔ سکندر نے بھی کبھی اس کے سامنے میرا ذکر کیا ہو گا تو نام نہیں لیا ہو گا۔ جمائیکر بھی ایک صرف تمہارے باب کا نام تو نہیں ہے پھر بھی وہ خند ٹھک گئی تھی۔

”اور آپ؟ آپ نے کیا کہا؟“ علی جمائیکر نے بے صبری کا مظاہرہ کیا۔

”میں نے بھائی! اسی نے تو کمال کر دیا۔“ رابعہ فوراً بول پڑی۔ خاصا پر جوش انداز تھا۔ ”حالانکہ میں لیکن امی نے اتنے سکون سے جواب دیا کہ ڈاکٹر آسیہ تو کیا اس کا۔“

علی جمائیکر نے تینبھی نظروں سے رابعہ کو دیکھا جس سے وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔

”ایک ہفتہ بعد بلایا ہے۔ اب دیکھو، کتنے عرصے میں بات بنتی ہے۔ ادھر بابا جان اتنے بے صبر ہیں۔ جلدی میں معاملہ خراب ہو سکتا ہے۔ یہ بات تم بابا جان کو سمجھاؤ نا۔“

عارفہ بیگم کہہ کر شیشے سے باہر دیکھنے لگیں۔

انہی نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

غصوں پر ”خوشبو“ کھولے بڑے انتہاک سے اس پر جھکی ہوئی تھی۔

انہی رسوائی تیرے نام کا چچا دیکھوں  
اک ذرا شعر کہوں اور کیا کیا دیکھوں  
نہند آجائے تو کیا محفلیں بپا دیکھوں  
آنکھ کھل جائے تو کیا تنہائی کا صحرا دیکھوں  
تو میرا کچھ نہیں لگتا ہے مگر جان حیات  
جانے کیوں تیرے لیے دل کو دھڑکتا دیکھوں  
بند کر کے میری آنکھیں وہ شرارت سے ہنسنے  
بوچھے جانے کا میں ہر روز تماشا دیکھوں

آمد خاموشی سے ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اسٹک کی آواز اس کے بعد وہ کرسی کھینچ کر بیٹھے لیکن وہ اتنی اسٹک کی آواز پر چوکی نہ کرسی گھسیٹنے جانے پر، نیل اسے متوجہ کرنے لگے تھے کہ پھر کسی خیال سے بہت خاموشی سے اس کے ہاتھ ہوئے سر کو دیکھنے لگے۔ کتنے لمحے یوں سر کے کہ اسے نیل تو کیا شاید ن تھی۔ پھر کھٹے پلٹے ہوئے سراو نچا کیا تو نہ صرف اچھل پڑی بلکہ بری طرح سٹپٹا بھی گئی تھی۔

”آپ آپ کب آئے؟“

”نہیں میری آمد کا پتا نہیں چلا۔“ نیل بلا ارادہ جتا گئے۔

”یہ ہی اتنی خاموشی ہے۔“ اس نے بھی بے ساختہ کہا لیکن فوراً احساس بھی ہو گیا۔ ”نہیں شاید تونوں سے دیکھ رہا ہوں؟ اتنی گن ہو کہ اپنے آس پاس کی کچھ خبر ہی نہیں۔ کوئی نئی کتاب ہاتھ آگئی بات کو پرانی کتابوں میں ڈھونڈنے لگی ہو۔“ نیل نے بظاہر ہلکے پھلکے اذاس میں کہا اور مسکرائے۔

”وہ گھبرا گئی“ میرا مطلب ہے۔ نئی بات کیا ہو سکتی ہے اور کتاب بھی نئی نہیں ہے۔ یہ دیکھیں،

کی تعریف کرو۔“ نیل نے کتاب اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا تو اس نے نچلا ہونٹا دانتوں میں بچنے کے بعد معذوری ظاہر کی۔

”مٹی البتہ محسوس کر سکتی ہوں۔“

اس بظاہر کتاب پر تھیں لیکن سارا دھیان اس کی طرف تھا اس کی بات سن کر کچھ بولے نہیں تو سے وہ انہیں متوجہ کر کے پوچھنے لگی۔

”ہاں جو نے آپ سے کوئی کام لیا تھا؟“

”نیل! جانے یاد نہیں تھا یا قصداً؟“ انجان بن کر پوچھا تو وہ ذرا سے کدھے اچکا کر بولی۔

”وہ کہہ رہی تھی کہ آپ نے اس کا کام نہیں کیا، جب ہی اس سے کترا ہے ہیں۔“

وہ جو کام اس نے کہا ہے، وہ اتنا آسان نہیں ہے پھر بھی میں کوشش کر رہا ہوں۔“ نیل نے ناراضگی سے، مجھے بتائیں۔“ اس نے عادت کے مطابق فوراً اپنی خدمات پیش کیں۔

”نیل! کچھ کتے کتے خاموش ہو گئے پھر گہری سانس کھینچ کر بولے۔“ مدحو بڑی جلدی بدگماں

ہو جاتی ہے حالانکہ میں اپنی سی پوری کوشش کر رہا ہوں۔“  
 ”کس بات کی، مجھے بھی تو بتائیں یا مدحو نے منع کیا ہے آپ کو۔“ اس نے الجھ کر کہا۔  
 ”نہیں اس نے تو منع نہیں کیا۔“ نیبل نے پرسوج انداز میں کہہ کر اسے دیکھا۔

”درازا ماما کے کمرے سے نیلے رنگ کا شاپران کے پاس لے جاؤ۔“ مدحیہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی  
 کہا۔  
 ”صباحت نے وارڈروب بند کر کے اسے دیکھا۔“

”جی جی کے پاس۔“ مدحیہ بتا کر واش روم میں چلی گئی اور کچھ دیر بعد نکلی تو صبحت موجود نہیں تھی۔ اس  
 ہی آواز میں ٹیپ راکارڈر آن کیا پھر پروے برابر کر کے لٹینا چاہتی تھی کہ فون کی بیل پر جھنجھلا گئی۔  
 ”جیڑ ہو جاتی ہے لوگوں کو کہ میں لٹینے جا رہی ہوں۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے نکلی اور ریسورٹا تھا کر خاصی  
 ٹٹا ہو گیا۔

”جیڑ؟“  
 ہن احمدؒ اچھر سے اصر کی آواز سننے ہی ایک لخت اس کا موبڈل گیا۔  
 ”جیڑ؟“ جیڑ نہیں کون۔ خیر چھوڑیں۔ آپ کیسے ہیں اور یہ اس وقت میرا مطلب ہے آپ کے ہاں تو  
 فزی پر چل رہا ہو گا۔“

”جیڑ نہیں ہے اور میں نے سوچا چلو۔ صبح کے آغاز سے پہلے تم سے معافی مانگ لوں۔“ اصر نے کہا تو وہ  
 بے ہوش ہوئی۔  
 ”بات کی؟“ پھر فوراً ہی خود سے سمجھ کر کہنے لگی۔ ”اچھا وہ جو آپ نے اٹے سیدھے خط لکھے ہیں تو جناب  
 پر معافی مانگنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میں سمجھ گئی تھی کہ۔“

”جیڑ نہیں۔“ اصر نے ٹوک دیا۔  
 ”مخاموش ہو گئی تو چند ساعتوں کے لیے جیسے کائنات تھم گئی تھی۔ پھر اصر نے اچانک دھماکا کر کے محشر  
 میں سماں شادی کر رہا ہوں۔“

”مخاموشی سے اسے دیکھتے رہے بولے کچھ نہیں۔“  
 ”نہیں نیبل بھائی! آپ مدحو کا یہ کام نہیں کریں گے، اگر ماما کو معلوم ہو گیا تو انہیں بہت دکھ ہو گا اور پھر  
 ہمیشہ آپ مجھے اور مدحو کو سمجھاتے رہے ہیں کہ ہمیں ماما کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کرنا چاہیے پھر  
 کیسے۔“ وہ بہت دکھ اور تاسف سے بول رہی تھی۔

”نیبل نے ہونٹ بھیچ کر گہری سانس کو پراثر آنے سے روکا تھا۔  
 ”کچھ دن سکون سے گزرتے ہیں وہ پھر کوئی شوشہ چھوڑ دیتی ہے۔ شاید اسے سب کو پریشان کر کے مرنے  
 کہیں وہ بیچ بچ تو پاگل نہیں ہے۔“ نیبل کی خاموشی پر وہ اپنے آپ بولنے لگی تھی۔ ”میں ماما سے کہوں گی  
 کسی سائیکالوجسٹ کے پاس لے جائیں اور نیبل بھائی آپ اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں مجھے کچھ بولنے  
 نہیں۔“

”میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم بہت جلدی پریشان ہو جاتی ہو اور وہی دیکھ رہا ہوں۔“ نیبل نے اپنی زہ  
 کا انداز بدلنے ہوئے کہا۔  
 ”تو کیا یہ پریشانی کی بات نہیں ہے۔“ وہ روہانی ہو گئی۔  
 ”ہاں اب رونا بھی شروع کر دو۔“ نیبل کو جانے کیوں غصہ آ گیا۔ ”مدحو جیسے چلی گئی ہے ناں شاہ سکندرؒ  
 اور اب تم اسے کبھی نہیں دیکھ سکو گی۔“ اسی بات سے ڈرتی ہوئی ناں اور پھوپھو بھی تو ایسا کبھی نہیں ہو گا اور  
 گی بھی تو زیادہ دن وہاں رک نہیں سکے گی۔ اس لیے کہ وہ کسی ماحول میں خود کو ایڈجسٹ نہیں کر سکتی۔  
 برعکس ماحول کو اپنی مرضی کے تابع رکھنا چاہتی ہے اور اس گھر میں تو پھر اس کی مرضی چل جاتی ہے کہ اس  
 سب کو پھوپھو کا خیال رہتا ہے اور شاہ سکندر کے ہاں تو بالکل ہی برعکس ہو گا پھر بتاؤ وہ کیسے رہے گی وہاں۔“

”آپ یعنی آپ مدحو کی فوری ضرورت ہے۔“ وہ واقعی چکرائی تھی۔  
 نیبل نے نظریں مڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے پھر کمرے کی طرف جاتے جاتے انہوں نے بے اختیار اس کے  
 رکھا تھا۔  
 ”نیبل بھائی!“ اس نے عقب سے پکارا لیکن وہ ان سنی کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے تو وہ سرا  
 دیکھتی رہ گئی تھی۔

”نیبل بھائی!“ اس نے عقب سے پکارا لیکن وہ ان سنی کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے تو وہ سرا  
 دیکھتی رہ گئی تھی۔

”مدحو نے کہا تو وہ اسے دھکا دے کر  
 لٹائی کے کمرے میں لیکن پہلے خوش خبری میں سنوں گا، جلدی بتاؤ۔“ عمر نے کہا تو وہ اسے دھکا دے کر



ہے کہنے لگی۔ ”اگر سچ جیج ایسی کوئی بات، ہوتی تو وہ یہاں امی کو فون کرتے۔“  
 نیک کہا آپ نے۔ ”عمر فوراً“ تاکید کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ بڑے بھائی کی شرارت ہے۔ ضرور دھونے  
 کی کوئی ایسی دھنسی بات لکھی ہوگی جس کے جواب میں انہوں نے ایسا مذاق کیا۔“  
 بیاد بہت سنجیدہ تھے۔ ”اس نے لاپرواہی سے کہہ کر صباحت کو دیکھا تو وہ اسے خاموش رہنے کا اشارا  
 دے دی۔“

”حققت ہے، وہ ماموں جی آکر معلوم کر لیں گے۔“  
 نیک کے لیے ہمیں اجازت دیجئے اللہ حافظ۔ ”مدحیہ بہت سی، ہوئی بولی پھر صباحت کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ

میرزا لجات تھے۔ خلیل بھائی کال بک کر دیا کوئی فون پر نظر نہ جمائے بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ ابا جی،  
 بونہ بھائی نیل اور آسیہ بھی وہیں موجود تھی۔ اس کے باوجود کمرے میں گہرا سکوت تھا جسے فون کی نیل

خلیل بھائی نے فوراً ”سیور اٹھا یا تھا۔“ ”ہاں امیر کیسے ہو بیٹا؟“  
 اب ٹھیک ہیں۔ تم ہوا شام میں فون کیا تھا تم نے۔“  
 کیا تھا؟“

اکل ٹھیک ہے۔ میں جو پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو۔“

عمر جو کچھ کہہ رہا تھا، خلیل بھائی بظاہر بڑے سکون سے سن رہے تھے۔  
 رہا ہے؟“ ”اماں جی سے صبر نہیں ہو سکا۔ ان کا بازو ہلا کر پوچھا لیکن وہ متوجہ نہیں ہوئے اور اصرار سے

نے تم نے یہاں کا کیوں نہیں سوچا۔ میں تمہاری پھوپھو کو کیا جواب دوں گا۔ تمہارے کہنے پر ہم نے  
 بت طے کی تھی۔ کوئی زبردستی نہیں ہوتی تھی تمہارے ساتھ اور تم بالکل غلط کہہ رہے ہو۔ گرین کارڈ  
 مل نہیں ہوتے ویسے بھی اللہ کا شکر ہے ہمارے ساتھ کوئی ایسے مسائل نہیں ہیں، ٹیلو ہیلو۔“ شاید  
 ان کی۔ خلیل بھائی نے پاپس ہو کر ریسورسز دیا پھر دھکے سے بولے تھے۔

”اسے ایسی امید نہیں تھی۔“

”میمونہ بھابی اسی قدر کہہ سکیں پھر رونے لگیں۔“

نیا کیا کر رہی ہیں۔ ”آسیہ نے فوراً ٹوک کر ان کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنالیا پھر اپنے تئیں انہیں تسلی  
 ”امامانان نہیں ہے ماشاء اللہ بہت سچہ دار ہے۔ کچھ اچھا سوچ کر ہی اس نے یہ قدم اٹھایا ہو گا۔“  
 سوچ کر اور یہاں منتقلی کیا سوچ کر کی تھی اس نے۔ اس وقت بھی نادان تو نہیں تھا۔ جو اسے اپنی نادانی  
 خلیل بھائی کہتے ہوئے اٹھ کر کمرے سے نکل گئے۔

نذر منہ کیا ہے اس نے ہمیں۔ ”میمونہ بھابی نے آسیہ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔“

”کچھ کہہ رہی ہیں۔“ ”آسیہ نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔“ ”ہم کوئی غیر نہیں ہیں۔ اس گھر  
 کے ہر کچھ کہنے کے ساتھ ہیں۔“

”نیک کتنی ہے دلہن۔“ ”ابا جی تاکید کرتے ہوئے میمونہ بھابی سے کہنے لگے۔“ ”تمہیں اس کے سامنے  
 ہنسی کی ضرورت نہیں ہے۔ اصرار جیسے تمہارا بیٹا ہے ویسے آسیہ کا۔ اس کے اس اقدام پر تم دونوں کا  
 بے ہوشا چاہیے۔ کسی نئے رشتے کو درمیان میں لا کر فاصلے مت پیدا کرو۔ پھر یہ سب قسمت کی باتیں  
 اندر اصرار کا جو ذہنیں لکھا ہو گا اور شاید اسی میں بہتری ہوگی۔“

آگے بڑھ گئی اور اماں جی کے کمرے میں داخل ہوتے ہی بولی۔  
 ”خواتین و حضرات میں آپ کے لیے زبردستی خبر لائی ہوں۔ جسے سنتے ہی آپ خوشی سے اچھل پڑیں گے۔“  
 ”مدحیہ!“ آسیہ نے گردن موڑ کر اسے کچھ تینہنہی نظروں سے دیکھا۔  
 ”آپ سیشن تو ماما! وہ آسیہ سے کہہ کر باری باری سب کو دیکھنے لگی تو عقب سے عمر اس کے بالوں کو بڑبڑا رہا  
 کر بولا۔“

”اب بتا بھی دو۔“  
 ”اے کیا بتا دوں۔ پہلے مٹھائی وغیرہ لاؤ اور ہاں ڈھولک بھی بجنی چاہیے کیونکہ اصرار بھائی وہاں شادی کر رہے  
 ہیں۔“ ”وہ واقعی کمال ضبط کا مظاہر کر رہی تھی۔“

آسیہ اور میمونہ بھابی قدرے سناٹے میں آکر اسے دیکھنے لگیں جبکہ صباحت اور سونیا کے ہونٹوں سے چہرہ  
 آواز میں گنا گنا تھا اور اماں جی بس ایک لحظہ کو غصہ ٹھیکیں پھر اس پر بڑبڑائیں۔

”باؤلی ہو گئی ہو کیا بونہ میں آتا ہے بک دیتی ہو۔“  
 ”میں سچ کہہ رہی ہوں اماں جی! اصرار بھائی نے ابھی ابھی فون پر بتایا ہے مجھے۔“ اس نے زور دے کر کہا تو میمونہ  
 بھابی کے حلق سے چھٹی چھٹی آواز نکلی۔

”ک۔ کیا بتایا ہے اس نے؟“  
 ”یہی کہ وہ شادی کر رہے ہیں۔ اچھا ہے ناں، اماں جی اس گھر میں ایک انگریز لڑکی آجائے گی، جس کی آنکھیں  
 نیلے سمندر جیسی ہوں گی اور۔“

وہ بولتی جا رہی تھی۔ کھنکھاتی ہوئی آواز اور درمیان میں کہیں کہیں کھلکھلاتی ہنسی جس نے سب کو دشت حیرت  
 میں ڈھکیل دیا تھا۔  
 عمر نے آہستہ سے اس کا بازو تھاما اور کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔

”کیا کیا بوسا ہے۔“  
 ”تمہیں یقین نہیں آ رہا، ابھی کال ملاؤ امریکہ کی اور پوچھ لو اصرار بھائی سے۔“ اس نے کہا تو عمر کچھ دیر بغور نا  
 دیکھتا رہا پھر دھیرے سے پوچھنے لگا۔

”اور کیا کہا بڑے بھائی نے؟“  
 ”کچھ نہیں، بس یہی بتایا کہ وہ شادی کر رہے ہیں۔“ وہ عمر کی نظروں سے اندر رہی اندر دیکھنے لگی تھی۔  
 ”اور تم اسے خوشخبری کہہ رہی ہو۔“

”کیوں یہ خوشی کی خبر نہیں ہے اور یہاں سب۔“  
 وہ ایک لحظہ کو خاموش ہوئی پھر جیسے اچانک سمجھنے کا اظہار کرتی ہوئی کہنے لگی۔

”اچھا اب سمجھی سب کو میری خوشی پر حیرت ہو رہی ہے۔ یہی بات ہے ناں۔ چلو تم میں اس کی شکل  
 ہوں۔ تم کو تو آنکھوں میں آنسو بھی بھر لوں۔ لیکن یہ ہے بہت مشکل کام اور تم تو جانتے ہو میں کتنی سلی  
 ہوں۔“

عمر خاموشی سے اس کے چہرے کے ایک ایک نقش کو دیکھتا رہا۔ پیشانی سے ہونٹوں تک کہیں سے توجہ  
 کوئی قیامت بنتی ہے لیکن وہ مدحیہ بھی بات بے بات قیامت برپا کر سکتی تھی تو چھپا بھی سکتی تھی۔ بڑی رازدار  
 بول کر عمر کو بول دیکھنے لگی جیسے تمہیں کیا ہوا ہے۔ بھی صباحت اور سونیا اماں جی کے کمرے سے نکلیں  
 دونوں کو خاموشی سے کھڑے دیکھ کر سونیا تیزی سے قریب آکر پوچھنے لگی۔

”کیا پھر اصرار بھائی کا فون آیا ہے؟“  
 ”نہیں تو کوئی؟“ وہ سونیا کی طرف گھوم کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔  
 ”سچ بتاؤ مدحیہ! تم مذاق تو نہیں کر رہی یا ہو سکتا ہے اصرار بھائی نے تمہارے ساتھ مذاق کیا ہو۔“ ”سونیا ناں

”شاید“۔ آسہ نے دکھ سے سوچا۔ پھر موضوع بدلنے کی خاطر خاموش بیٹھے نیل کو دیکھ کر پوچھنے لگی۔  
 ”بنا آج چھٹی کے دن تم کہاں چلے گئے تھے؟“  
 ”جی، مجھ سے کچھ کہا۔“ نیل نے چونک کر دیکھا۔  
 ”کہاں رہے سارا دن؟“ اس بار ابائی نے پوچھا۔  
 ”ڈیڈی کی طرف چلا گیا تھا۔ دوسرے دن وہاں رہا اس کے بعد ڈیفنس ایک دوست کے پاس۔“ نیل بتاتا رہا  
 کھڑے ہوئے۔ چلیں پھوپھو! اے کھانا لگا دیا ہو گا۔“  
 ”ہاں چلو اور بھابی آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ چلیں انھیں آپ بھی کھانا وغیرہ کھا کر۔“  
 آسہ نے اٹھتے ہوئے میونہ بھابی کو بھی ساتھ کھڑا کیا پھر کمرے سے نکل کر نیل کے ساتھ اوپر آئی۔  
 ہوا کھانا لگا رہی تھیں۔ جبکہ مدیہ اور صباحت لی دی کے سامنے بیٹھی بڑے انہماک سے ڈرامہ دیکھ رہی تھیں۔  
 ”مدو! آؤ بیٹا کھانا کھا لو۔“ آسہ نے بالکل غیر ارادی طور پر صرف مدیہ کو پکارا شاید اس لیے کہ اس کا ذہن  
 مسلسل اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔  
 ”بس دو منٹ نما! اینڈ دیکھ لوں۔“ مدیہ نے نی دی پر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا تبھی اسکرین بلیک ہو گئی۔ پھر  
 بقیہ خبرنامہ کے بعد۔

”لو ہو گیا اینڈ۔“ صباحت اسے چھیٹی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔  
 ”کتنا بور کرنے لگے ہیں یہ نی دی والے۔ پورے دس منٹ ہیں نو بجنے میں اور ڈرامہ دیکھنا دو منٹ کا رہ گیا۔“  
 ”مدیہ نے جھنجھلا کر نی دی بند کر دیا پھر ہاتھ دھونے کے بعد نیل پر آکر بیٹھی اور آسہ کو دیکھ کر کہنے لگی۔  
 ”احمر بھائی سے بات ہو گئی آپ کی؟ میں نے سچ کہا تھا نا۔“  
 ”چلو کھانا کھاؤ۔“ آسہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ آیا اسے احساس نہیں ہے یا پوڈ کر رہی ہے۔  
 ”واقعی نما! آپ کی بات ہوئی ہے احمر بھائی سے۔ کیا کہا انہوں نے؟“ صباحت نے پوچھا تو آسہ کو ایک دم غم  
 آ گیا۔  
 ”کچھ نہیں، کچھ نہیں کہا اس نے تم دونوں کو فضول باتیں کرنے کی عادت ہو گئی ہے۔ کھانے کے وقت گھر  
 خاموش نہیں رہ سکتیں اور تمہیں اس سے کیا احمر نے شادی کی ہے یا نہیں۔“  
 ”ہاں ہمیں کیا۔“ مدیہ نے لا پرواہی سے کندھے اچکائے پھر صباحت کو کہنی مار کر اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔  
 نیل کچھ حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ مدیہ کی لا پرواہی پر مزید متعجب ہوئے اور پھر کھانے کے دوران بار بار  
 دیکھتے رہے۔ اس وقت جب مدیہ نے نیچے جا کر سب کو خوش خبری سنائی تھی وہ موجود نہیں تھے تب ہی اب حیران  
 رہے تھے۔

صباحت اور مدیہ پہلے کھانا ختم کر کے اٹھ گئیں، تب وہ آسہ کو متوجہ کر کے پوچھنے لگے۔  
 ”پھوپھو! کیا مدو جو پہلے سے معلوم تھا۔ وہ احمر کی شادی کا؟“  
 ”ہاں، شام میں احمر کا فون آیا تھا۔ اسی نے اینڈ کیا تھا اور بتا نہیں اس نے کس انداز سے اسے بتایا کہ وہ  
 سے بھاگتی ہوئی آئی تھی۔ باقاعدہ سب کو خوشخبری سنائی۔“ آسہ سوچتے ہوئے انداز میں بول رہی تھی۔  
 نادان تو نہیں ہے جو اسے احساس نہ ہوا پھر کچھ زیادہ سمجھ دار ہو گئی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے۔“  
 نیل کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہیں اس لیے بس سر ہلا کر رہ گئے۔  
 ”چلو یہ بھی اچھا ہے کہ اس نے محسوس نہیں کیا۔ گو کہ احمر نے اچھا نہیں کیا مگر ہم کیا کر سکتے ہیں۔ بلکہ اب  
 میں یہ کہوں گی کہ اچھا ہوا اس نے اسی وقت یہ قدم اٹھالیا۔ اگر شادی کے بعد۔“  
 آسہ نے اچانک کسی خیال سے جھرجھری لی تھی پھر نیل کی طرف دیکھے اٹھ کر چلی گئی۔  
 نیل کو آسہ کا جانا بہت غیبت لگا ورنہ انہیں اٹھنے کے لیے کوئی تدبیر کرنی پڑتی جو کہ اس وقت بہت

ماں تو ڈراما صاحت کو بلا دو۔“

اگر ادھر سے صاحت ہی نے ریسیو کیا تب کے بلانا ہے۔“ رابعہ اپنی بات پر خود ہی ہنسی لیکن اس نے ان کے ریسیور سے تھمایا پھر مرمیہ داخل کر کے اسے دیکھنے لگا تھا۔

لو! دوسری طرف مدیہ تھی۔

صاحت! میں ہوں رابعہ۔“ رابعہ آواز سے دھوکا کھا کر جتنی خوشی ہو کر بولی ادھر سے اتنا ہی تلخ لہجہ تھا۔

میں میں صاحت نہیں ہوں۔“

اگر میں پکیزہ صاحت کو بلا دوں۔“ رابعہ قدرے بوکھلا گئی تھی۔

دوسری ریسیور تھکی کی آواز آئی تو رابعہ نے ناگواری سے ریسیور کو گھورا پھر علی جمائیکر کو دیکھ کر بولی۔

میں کون یا گل ہے۔“

اچھے دو۔“ علی جمائیکر نے اس کے ہاتھ سے ریسیور لے کر کان سے لگایا تبھی ادھر سے صاحت نے ریسیور

فلا۔

کون؟“

یہ ایسی ہیں آپ۔“

اگل ٹھیک۔“ صاحت کی آواز بہت دھیمی ہو گئی تھی۔ اس نے پہلے رابعہ کو جانے کا اشارہ کیا پھر اس سے

بہت دلوں سے آپ نے فون نہیں کیا تو میں نے سوچا میں ہی آپ کی خیریت معلوم کر لوں۔ سب ٹھیک تو ہے

میں۔“ صاحت کے مختصر جواب پر وہ چڑ گیا۔

آپ کو اندازہ ہے کہ میں کس شدت سے آپ کے فون کا انتظار کرتا ہوں۔ کیا کرتی رہتی ہیں سارا وقت

انتائیں ہو سکا کہ۔“

علی جمائیکر اس طرح بات نہیں کریں۔“ اس کے عاجزی سے ٹوکنے پر وہ ہونٹ بھیج گیا۔ پھر چند لمحے توقف سے

اس سبھی کچھ کر بولا۔

اگر میں ساری ایک تو آپ خیر چھوڑیں۔ یہ بتائیں لا سیریری کب جاری ہیں۔“

اگر میں کوئی پروگرام نہیں۔“

اگر میں انہوں کل کاروگرام رکھ لیں۔“

میں اور پکیزہ اصرار نہیں کیجیے گا۔ کیونکہ آج کل ماما کا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔ وہ کہیں جانے کی اجازت

دیں گی۔“ صاحت نے منع کرنے کے ساتھ سبب بتایا تو وہ جو یہی جانتا چاہتا تھا بظاہر سرسری انداز میں پوچھنے

یا ہوا آپ کی ماما کو؟“

وہ سیریری سسر۔“ وہ اسی قدر کہہ کر خاموش ہو گئی۔

پکیزہ سسر بھی ہیں؟“ اس نے کچھ حیران ہو کر پوچھا تو ادھر وہ ہنس پڑی۔

پکیزہ کی ماما میری بہن نہیں ہو سکتی۔“

وہ ابھی بھی حیران تھا۔ جس پر وہ محفوظ ہو کر بولی۔

میں سوچتی۔“

وہ ایک دم ہونٹ بھیج گیا۔ غالباً“ پوچھنے جا رہا تھا کہ آسیہ نے دوسری شادی کر لی تھی۔ لیکن فوراً

پوچھنے پر خاموش ہو گیا اور پھر فوراً“ بات بھی بتا گیا“ ابھی شاید آپ کی سسر نے ہی فون ریسیور کیا تھا۔“

نہیں بد تمیزی تو نہیں کی اس نے؟“

”مدیہ!“ کچھ دیر غور سے دیکھنے کے بعد جہاں ان کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی وہاں دل پر چوٹ کی تھی کہ یہ وہ لڑکی تھی جو چھین لیتا جانتی تھی اور کبھی اپنی اس حرکت پر نادم بھی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اب اس طرح رد رہی تھی۔ شاید اپنی بے بسی پر یا شاید اس کی بے وفائی پر جانے کیا بات تھی جو وہ پیش کی طرف سے احتجاج کرنے کے بجائے بے آواز آنسو بہا رہی تھی جو براہ راست ان کے دل پر گرنے لگے تھے۔ بہت چاہنے کے باوجود وہ اس کے پاس جانے کی ہمت نہیں کر سکے کیونکہ اس سے کچھ بعد نہیں تھا انہر سامنے دیکھ کر بے قابو ہو سکتی تھی اور رات کے اس سپردہ کس کس سے کیا کیا کہتے یہی سوچ کر وہ بہت خاموش رہ اپنی جگہ پر آکر لیٹے تو ان کا دل اس کے آنسوؤں کے بوجھ تلے دبا جا رہا تھا۔

♥ ♥ ♥ ♥

علی جمائیکر، آج جتنی جلدی گھر جانا چاہتا تھا اتنی ہی آفس میں دیر ہو گئی تھی۔ پھر گھر آتے آتے فون گئے تھے آدھے میں قدم رکھتے ہی اس نے رابعہ کو پکارنا شروع کر دیا اور لاؤنچ میں آیا تو وہ کوئی غیر ملکی چینل دکھنے لگا مگر نہ تھی کہ اس کی آواز جتنا نہیں سنی نہیں یا جان بوجھ کر دھیمان نہیں دے رہی تھی۔ اس نے برہہ کر لی کا ہا ہی سمجھنا تب وہ چیخ پڑی۔

”کیا کر رہے ہیں بھائی لگا نہیں ناں۔“

”سٹ اپ!“ اس نے قدرے غصہ دکھا کر اسے خاموش کر دیا پھر صوفے پر بیٹھ کر جوتوں کے تسمے کو

ہوئے بظاہر سرسری انداز میں پوچھا۔ ”امی کہاں ہیں؟“

”اپنے کمرے میں۔“ رابعہ کی رو بھی ہوئی آواز آئی۔

”خیریت!“ اس نے سر اٹھا کر کے اسے دیکھا۔ ”طبیعت تو ٹھیک ہے ناں ان کی۔ ڈاکٹر کے پاس گئی تھیں

”صل میں تو آپ بھی پوچھنا چاہتے ہیں اور میں تفصیل سے اس وقت بتاؤں گی جب آپ لی دی ان

گے۔“ رابعہ نے فوراً ”سمجھ کر کہا تو اس نے پھریشانی پر شکائیں ڈال لیں۔

”بالکل نہیں۔ ہر وقت لی دی ہوئی کوئی اور کام نہیں ہے نہیں۔“

”کیوں نہیں آپ کے کام سے گئی تو کبھی امی کے ساتھ بیمار نہ ہوتے ہوئے بھی خود کو بیمار ظاہر کرنا؟“

آسیہ کا کچھ سننا لیکن آج تو وہ خود مریض لگ رہی تھیں۔ ”رابعہ نہ بتانے کا کہہ کر بھی بتانے لگی تھی۔“

پریشان بھی لگ رہی تھیں۔ امی کی باتوں پر کوئی توجہ ہی نہیں دی اور فوراً ”نسخہ لکھ کر ہاتھ میں تھام لیا۔“

”اس سے یہ کیسے سمجھ لیا تم نے کہ وہ پریشان تھیں؟“ اس نے بر سوچ انداز میں کہا۔

”ان کے چہرے سے لگ رہا تھا۔ پھر بار بار بالوں میں انگلیاں پھنسا کر سر کو جھکا دے رہی تھیں جیسے کہ

کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یوں رابعہ نے باقاعدہ آسیہ کی طرح کر کے دکھایا تو وہ اندر سے

چھین سا ہو گیا اور اسی سوچتے ہوئے انداز میں بڑبڑایا۔

”کیا پریشانی ہو سکتی ہے؟“

”یہ تو ہم نے نہیں پوچھا کیونکہ ابھی اتنی زیادہ جان پہچان تو نہیں ہوئی ان سے۔“ رابعہ نے اس کی

سن کر کہا تو اس نے چونک کر دیکھا پھر اٹھتے ہوئے بولا۔

”اچھا تم کھانا لگواؤ۔ میں چینیج کر کے آتا ہوں۔“

رابعہ نے اٹھنے کی زحمت نہیں کی وہیں سے کمر دین کو پکار کر کھانا لگنے کو کہہ دیا۔

علی جمائیکر کا ذہن آسیہ کی پریشانی کو سوچتے ہوئے صاحت تک جا پہنچا تھا کہ کہیں اس کے ساتھ

نہیں ہے جس کی وجہ سے آسیہ پریشان ہے۔ چینیج کرتے ہوئے اور پھر کھانے کے دوران کچھ دیر

رہا۔ کتنی باتیں تھیں اور ہر بات کے اختتام پر سوالیہ نشان جس سے اس کی بے چینی سوا ہوئی۔ تب

کھانا ختم کر کے وہ رابعہ کو اشارہ کرتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔

کچھ دیر بعد رابعہ اس کے پیچھے آئی تو وہ فوراً ”میں فون سیٹ اپنے قریب سمجھ کر بولا۔“

”بھٹ سے تو بات نہیں ہوئی۔ راجہ بات کر رہی تھی اور میرا خیال ہے اس کے ساتھ بھی کوئی بدتمیز نہ ہو گا۔“ اس نے بظاہر ہلکے پھلکے سہیلے انداز میں پوچھا۔

”نہیں بس موڈی ہے۔“  
”تو اس موڈی کی وجہ سے آپ کی ماما موڈ آف ہے۔“

”ہاں بس۔“  
”نہیں تو جب ان کا موڈ ٹھیک ہو تب آپ خود مجھے رنگ کیجئے گا اور اس میں زیادہ دیر نہیں ہوگی۔“  
”اللہ حافظ!“ دھڑ سے سلسلہ منقطع ہو گیا تو وہ ریسور رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور ادھر سے ادھر ٹٹلے گا۔

”جیسے لگی تھیں۔ جبکہ ذہن میں جھکڑ چل رہے تھے۔“  
”دروازے پر ہلکی سی دستک کے ساتھ نیل نے پکارا۔ دوسری اور پھر تیسری بار تب پہلے اس کی حرکت ہوئی پھر اٹھ کر ست روی سے جا کر دروازہ کھولا تو نیل نے تشویش سے پوچھا۔

”نیل! اس نے ہاں کی صورت گہری سانس کھینچی پھر سامنے سے ہٹ کر نیل کو اندر آنے کا راستہ دیا۔  
”نیل نے اندر آتے ہوئے بس پوچھی کہہ دیا۔  
”نیل! اس نے ہاں کی صورت گہری سانس کھینچی پھر سامنے سے ہٹ کر نیل کو اندر آنے کا راستہ دیا۔  
”نیل نے اندر آتے ہوئے بس پوچھی کہہ دیا۔  
”نیل! اس نے ہاں کی صورت گہری سانس کھینچی پھر سامنے سے ہٹ کر نیل کو اندر آنے کا راستہ دیا۔“

”نیل! اس نے ہاں کی صورت گہری سانس کھینچی پھر سامنے سے ہٹ کر نیل کو اندر آنے کا راستہ دیا۔“  
”نیل نے اندر آتے ہوئے بس پوچھی کہہ دیا۔“  
”نیل! اس نے ہاں کی صورت گہری سانس کھینچی پھر سامنے سے ہٹ کر نیل کو اندر آنے کا راستہ دیا۔“  
”نیل نے اندر آتے ہوئے بس پوچھی کہہ دیا۔“  
”نیل! اس نے ہاں کی صورت گہری سانس کھینچی پھر سامنے سے ہٹ کر نیل کو اندر آنے کا راستہ دیا۔“

”نیل! اس نے ہاں کی صورت گہری سانس کھینچی پھر سامنے سے ہٹ کر نیل کو اندر آنے کا راستہ دیا۔“  
”نیل نے اندر آتے ہوئے بس پوچھی کہہ دیا۔“  
”نیل! اس نے ہاں کی صورت گہری سانس کھینچی پھر سامنے سے ہٹ کر نیل کو اندر آنے کا راستہ دیا۔“  
”نیل نے اندر آتے ہوئے بس پوچھی کہہ دیا۔“  
”نیل! اس نے ہاں کی صورت گہری سانس کھینچی پھر سامنے سے ہٹ کر نیل کو اندر آنے کا راستہ دیا۔“

”نیل! اس نے ہاں کی صورت گہری سانس کھینچی پھر سامنے سے ہٹ کر نیل کو اندر آنے کا راستہ دیا۔“  
”نیل نے اندر آتے ہوئے بس پوچھی کہہ دیا۔“  
”نیل! اس نے ہاں کی صورت گہری سانس کھینچی پھر سامنے سے ہٹ کر نیل کو اندر آنے کا راستہ دیا۔“  
”نیل نے اندر آتے ہوئے بس پوچھی کہہ دیا۔“  
”نیل! اس نے ہاں کی صورت گہری سانس کھینچی پھر سامنے سے ہٹ کر نیل کو اندر آنے کا راستہ دیا۔“

”نیل! اس نے ہاں کی صورت گہری سانس کھینچی پھر سامنے سے ہٹ کر نیل کو اندر آنے کا راستہ دیا۔“  
”نیل نے اندر آتے ہوئے بس پوچھی کہہ دیا۔“  
”نیل! اس نے ہاں کی صورت گہری سانس کھینچی پھر سامنے سے ہٹ کر نیل کو اندر آنے کا راستہ دیا۔“  
”نیل نے اندر آتے ہوئے بس پوچھی کہہ دیا۔“  
”نیل! اس نے ہاں کی صورت گہری سانس کھینچی پھر سامنے سے ہٹ کر نیل کو اندر آنے کا راستہ دیا۔“

”نیل! اس نے ہاں کی صورت گہری سانس کھینچی پھر سامنے سے ہٹ کر نیل کو اندر آنے کا راستہ دیا۔“  
”نیل نے اندر آتے ہوئے بس پوچھی کہہ دیا۔“  
”نیل! اس نے ہاں کی صورت گہری سانس کھینچی پھر سامنے سے ہٹ کر نیل کو اندر آنے کا راستہ دیا۔“  
”نیل نے اندر آتے ہوئے بس پوچھی کہہ دیا۔“  
”نیل! اس نے ہاں کی صورت گہری سانس کھینچی پھر سامنے سے ہٹ کر نیل کو اندر آنے کا راستہ دیا۔“

”نیل! اس نے ہاں کی صورت گہری سانس کھینچی پھر سامنے سے ہٹ کر نیل کو اندر آنے کا راستہ دیا۔“  
”نیل نے اندر آتے ہوئے بس پوچھی کہہ دیا۔“  
”نیل! اس نے ہاں کی صورت گہری سانس کھینچی پھر سامنے سے ہٹ کر نیل کو اندر آنے کا راستہ دیا۔“  
”نیل نے اندر آتے ہوئے بس پوچھی کہہ دیا۔“  
”نیل! اس نے ہاں کی صورت گہری سانس کھینچی پھر سامنے سے ہٹ کر نیل کو اندر آنے کا راستہ دیا۔“

بہا! آپ کی ماما جی آپ کو بہت یاد کرتی ہیں۔“ ٹھیک بھائی، مدیہ کے لٹھ مارنے والے انداز میں سلام کا دے کر کہنے لگے۔ ”کہہ رہی تھیں۔ مدیہ کی چھٹیاں ہو گئی ہوں تو اسے لے آئیے گا۔ چلو گی؟“  
بھی چھٹیاں نہیں ہوئیں اور ہوں گی بھی تو ماما نہیں جانے دیں گی۔“ مدیہ کا روٹھا ہوا لہجہ سب سے سن کر ہاتھ کر رہا تھا۔

یہ نہیں جانے دیں گی بھی، آپ کو تو میں ابھی آپ کو ساتھ لے چلوں آئیہ منع کر کے تو دیکھے۔“ انہوں نے اپنا ہاتھ کا احساس دے کر کہا تو اس سے پہلے صاحت بول پڑی۔  
بھی نہیں ماموں جی! امتحانوں کے بعد لے جائیے گا۔“

کچھ بچے اعتراض ابھی سے شروع ہو گیا۔ ”مدیہ نے یوں سر جھٹکا جیسے اسے صاحت کی مداخلت سخت اذیت دے رہی ہو۔“

میں کوئی اعتراض، کوئی عذر نہیں سن رہا۔ صبا کا نہ آئیہ کی طرف سے سنوں گا۔ چلو آپ تیاری کر دو صبح کے بعد سے آپ کو میرے ساتھ جانا ہے۔“

”جی ماموں جی! آپ مجھے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔“ مدیہ کی خوشی میں بے یقینی بھی تھی۔ ”مما منع نہیں کرتی۔“

”ان کے یقین دلائے پر اس نے گردن اٹھا کر صاحت کو دیکھا جیسے اب اسے کوئی نہیں روک سکتی۔“ پھر بھاگتی ہوئی اور آئی اور اسی وقت الماری میں سے اپنے کپڑے نکال نکال کر بند کر دیتے تھے۔  
”کیا کر رہی ہو؟“ کچھ دیر بعد صاحت کمرے میں داخل ہوئی اور سمجھنے کے باوجود ٹوک گئی۔

”تیاری ہم جلدی سے سوٹ کیس خالی کر دو۔“ وہ اپنے کام میں مصروف رہ کر بولی۔  
”وہ تو میں کر دوں گی لیکن بہتر یہ ہے پہلے تم ماما سے پوچھ لو۔“ صاحت نے ہر گھڑکی سے پردے سمیٹتے ہوئے

”ماموں جی پوچھیں گے۔ مجھے تو وہ صاف منع کر دیں گی۔“

”ٹھیک منع کریں گی۔“ اور اسی وقت ماما نے دیکھا کہ وہ صاحت کے ساتھ تھیں۔ ”مما تمہارے بھلے بات کرتی ہیں۔“ صاحت نے دھیر سے اسے سمجھانا شروع کیا تھا کہ وہ کھانا کھا کر الماری بند کر کے اس

فریڈلٹ کرنا تھا جوڑی ہوئی بولی۔

”میں رہنے دو بہت ہو گیا میرا بھلا! اب کچھ برا ہو جائے دو۔“

”اللہ نہ کرے جو کچھ برا ہو۔ تمہاری ساتھ تو بات کرنا ہی فضول ہے۔“ صاحت بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے نکل کر صبح تک کر خود ہی سوٹ کیس اتار کر خالی کرنے میں لگ گئی۔

آئیہ اپنے وقت پر کلینک سے لوٹی تو کچھ دیر بیٹھی ہی بیٹھی پھر ٹھیک بھائی کے ساتھ اوپر آئی تھی۔ جس سے

اور اطمینان سے ہو گئی کہ اسے آئیہ سے اپنے جانے کے متعلق بات نہیں کرنی پڑے گی۔ ورنہ ساری

ناتک بعد بھی اندر سے خائف تھی۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ آئیہ خود اسے بھیج رہی ہے تو یقیناً ”اس کی فائدہ“

بازو جانے سے منع کر دیتی اور آئیہ ظاہر ہے اس کی ماں تھی۔ اسے اچھی طرح سمجھتی تھی۔ ”جی تو اسے شبہ نہیں ہوئے دیا تھا۔ اس کے سامنے ٹھیک بھائی کے ساتھ کتنی بحث کے بعد اسے بھیجے پر رضامند ہوئی تھی۔“

بہرے جانے کے بعد ماحول کی کشیدگی تو کیا کم ہوتی بلکہ اور اسی گھمائی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سب کے

مذاہب ایک رابطہ تھی ہر وقت اوپر سے نیچے، نیچے سے اوپر کبھی اتنے میڈمیں ابھی عمر کے ساتھ تھکا اور ادھر

سہل بات چلائی۔ بس اسی کی آواز کو نکال کر تھی اور اب ایک دم خاموشی تھی۔  
نہت صبح کاج جانے کے لیے نیچے اتاری تو سب کو سلام کرتی ہوئی تھیں۔ اس کے ساتھ باہر نکل جاتی اور واپسی میں

آئیہ مدھی اوپر آجاتی۔ حالانکہ وہ شروع سے مدیہ کے رویوں کی تلاشی کرتی آئی تھی اور ابھی بھی کرنا چاہتی

در اسے خود پر قابو پانے میں لگی اس کے بعد ایک اور مصیبت کہ گاڑی اشارت ہو کے نہیں دی۔ بلکہ اس کے وہ تھک گئی تو نیچے اتر کر کڑی تلاش میں نظریں دوڑانے لگی۔ ”بھی وائٹ بھیس اس کے پاس ہے۔“  
اس نے توجہ نہیں دی۔ لیکن جیب اسے مخاطب کیا گیا تب چونک کر دیکھنے لگی۔ ”چوہہ شہناش اس کے پاس ہے۔“  
پر زور دیا تو ماما بھی یاد آگیا۔ وہ راجہ بھی۔ بڑے خلوص سے کہہ رہی تھی۔

”وہ ان کے صاحب! کہاں جائیں گی آپ، آئیے ہم ڈراپ کر دیں گے۔“  
آئیہ نے بلارا اور ذرا سا جھک کر راجہ کے ساتھ ڈرائیو نگ پر بیٹھنے علی جمائیکر کو دیکھا پھر راجہ کی طرف

کر بولی۔

”نو تو پر اہم بیٹا! بس یہیں کلینک جانا ہے۔“  
”ہم اسی راستے پر تو جا رہے ہیں۔ آئیے پلیز۔“ راجہ نے اتر کر اس کے لیے دروازہ کھولا تو وہ اپنی طرف اشارہ کر کے بولی۔

”اصل میں میری گاڑی۔“  
”وگاڑا! ایک سسٹم ہوا ہے کیا؟“ راجہ نے فوراً پوچھا۔

”نہیں اللہ کا شکر ہے۔ ہر طرح سے بچت ہو گئی۔ بس اس میں کچھ خرابی ہو گئی ہے۔ کلینک سے دور کڑا کر دوں گی وہاں سے کوئی مکینک آجائے گا۔“

”پھر تو آپ کو جلدی کلینک پہنچنا چاہیے۔“ راجہ نے اس انداز سے کہا جیسے اسے جلدی ہی پہنچا سکتی

ساتھ اسے بیٹھنے کا اشارہ بھی کیا تو اس نے مزید پس و پیش نہیں کی۔  
”یہ میرے بھائی ہیں۔“ راجہ اس کے ساتھ بیٹھتے ہی علی جمائیکر کا تعارف کروانے لگی۔ ”فی الحال

ہیں۔ انشاء اللہ جلد ہی ہر موٹ ہو کر ڈی سی کلاں گے۔“  
”بھاشا اللہ۔“ علی جمائیکر پر نظر ڈالتے ہوئے آئیہ کے ہونٹوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

”اور جب بڑی سی ہو جائیں گے تب میں اپنی فرزند کی شاندار سی دعوت کروں گی۔ آپ بھی آئیے گی ناں۔“ راجہ کو حقیقتاً موقع مل گیا تھا۔

”میں تمہاری فرزند میں تو شامل نہیں ہو سکتی بیٹا!“ آئیہ منع نہیں کر سکی تو باہی بھی نہیں بھری۔  
”ان کی بدرز بھی ہوں گی اور ان میں تو آپ شامل ہو سکتی ہیں۔ میں آپ کو اسپیشلی انوائٹ کروں

آپ نہیں آئیں تو میں پارٹی ہی ٹینسل کر دوں گی۔“  
راجہ کے پر جوش انداز پر وہ ذرا سا مسکرا کر رہ گئی کیونکہ علی جمائیکر نے اس کے کلینک کے سامنے گا

دی تھی۔  
”اگے بیٹا! تھینک یو۔“ وہ راجہ کے مزید اصرار کرنے سے پہلے شکریہ ادا کر کے اتر آئی اور کے بغیر

بندر کر لیا تھا۔

پھر اسی رات آئیہ نے ٹھیک بھائی کو فون کر کے انہیں ساری صورت حال سے آگاہ کرنے کے

لے جانے کو کہا تو ٹھیک بھائی نے نہ صرف فوراً ہامی بھری بلکہ دو دن بعد ابھی گئے تھے۔ ایک تو انہیں

خیال تھا دوسرے کچھ اپنی غرض بھی تھی کہ سمینا کی شادی اور احمر کے باہر جانے سے خصوصاً ”سیا“

اکلی ہو گئی تھیں۔ وہ خود سارا دن تو آفس میں ہوتے لیکن شام میں واپسی پر وہ بھی محسوس کرتے تھے

فرصت میں آئیے تھے۔ شام کا وقت تھا۔  
اس وقت آئیہ گھر پر نہیں تھی اور ٹھیک بھائی نے ماں جی اور ابا جی تک سے آئیہ کے فون کا ذکر

کے برعکس جیسے پہلے آفس ٹور پر ایک آدھ دن کے لیے آیا کرتے تھے ابھی بھی یہی ظاہر کیا تھا۔ وہ ابائی

کے کمرے ہی میں بیٹھتے تھے۔ باری باری سب آکر انہیں سلام کر کے چاچکے تھے۔ صاحت کے سامنے

آئی تھی یوں جیسے زبردستی لائی گئی ہو اور واقعی صاحت اسے زبردستی لائی تھی۔

خواب میں آپ۔ میں اب آپ سے بات نہیں کروں گی۔" وہ مزید روٹھ کر ان کے کمرے سے نکل تھی،  
فلک کرک گئی۔  
بے راجہ آری تھی اور اس کے پیچھے عارفہ بیگم بھی تھیں۔



ہاتھ کے راجہ اسے مخاطب کرتی اس نے اٹے بیروں دوبارہ نیل کے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ  
اس کاٹن بڑی زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

نیل میں کیا ہوا؟ نیل برش رکھ کر پلٹے تو اسے دروازے کے ساتھ لگے، کچھ کر تشریف لے چکا تھا۔  
"کچھ نہیں۔"

یہ دروازہ کیوں بند کر گیا؟ کون آتا ہے؟  
نیل آپ کے کمرے میں کون آ سکتا ہے۔ وہ تو شاید ماما کیس، لیکن میں نہیں جانتی انہیں۔ چتا نہیں  
میں نے انہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" بوکھلاہٹ میں وہ پہلے سے اپنی صفائی پیش کرنے لگی ہوئی۔  
نیل دیکھا۔ کیا کہہ رہی ہو۔ ہٹو مجھے دیکھنے دو۔" نیل کی کچھ میں کچھ نہیں آیا۔ اپنی اسٹک اٹھا کر اسے  
ہٹنے کا اشارہ کیا تو وہ جلدی سے بولی۔

نیل۔ آپ نہیں دیکھیں گے وہ خواتین ہیں۔  
یہ مطلب ہے تم نے پھر کوئی حماقت کی ہے۔ بلکہ نقصان اب کیا توڑا ہے؟" نیل کو ایک دم گلہ ان والا  
ایا لیکن وہ سمجھی نہیں۔

مطلب؟  
طلب ہے تم کسی خاتون کا گلہ ان تو کر پریشان تھیں اور اب ان خواتین کا جانے کیا نقصان کر آئی ہو جو وہ  
نہ پہنچ گئی ہیں۔ حالانکہ میں نے تم سے اسی وقت کہا تھا کہ آئندہ ایسی کوئی بات ہو تو مجھے فوراً بتا دینا۔"  
سالے طور پر سمجھ کر تنہا شروع کر دی تو وہ اندر ہی اندر جڑ بڑھ کر بولی۔  
نیل بات نہیں ہے نیل بھائی! میں نے کسی کا کوئی نقصان نہیں کیا۔"

بچپ کیوں رہی ہو؟  
مطلب پ رہی ہوں۔ سامنے تو کھڑی ہوں۔" وہ ان کی جرح سے عاجز آ گئی۔  
نیل نے ان کے سامنے جاؤ۔ تب میں سمجھوں گا کہ تم نے کچھ نہیں کیا یا پھر ابھی بھی وقت ہے۔ مجھے ج  
پھر مجھ کے سامنے میں تمہارا دفاع کر سکوں۔"

نیل آپ کو جب میں نے کچھ کیا ہی نہیں خواہ مخواہ پیچھے پڑ گئے ہیں۔ ہاں نہیں تو۔" وہ روٹھے لمبے میں  
نیل کے بیڑ پر بیٹھ گئی۔  
نیل میں کمال بیٹھ رہی ہو۔ جاؤ پھوپھو سے پوچھ کر آؤ کہ انہیں کوئی کام تو نہیں ہے پھر میں جاؤں۔"

نیل نے پوچھتے ہوئے چلے جائیں۔  
نیل لڑکی! پھوپھو کے پاس خواتین موجود ہیں۔ میں نہیں جاسکتا چلو اٹھو جلدی کرو۔ مجھے دیر ہو رہی

نیل نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا دیا۔ تو وہ سمجھ گئی کہ اب اس کی ایک نہیں چلے گی اس لیے مزید پس و پیش  
کے بغیر بولی ہوئی ان کے کمرے سے نکل آئی اور کچھ دیر راہداری میں رک کر خود پر قابو پایا پھر ڈرائنگ روم

تھی لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کسی سے کیا کہے، کیونکہ مدیہ نے کس وقت بھی خاص طور سے ان کا  
نام لے کر کسی پر کچھ نہیں بتایا تھا بلکہ سب نے اسے طور پر یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ اسی کا بدلہ لے رہی ہے اور اس  
اسے حق بجانب سمجھتے ہوئے اس کے سامنے مجرم بھی بنے ہوئے تھے اور یہ کوئی قابلِ فحش بات نہیں تھی کہ اس کا  
اس کے لیے بغض اوقات انسان سرخرو ہو کر بھی سرنگوں ہی رہتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ مدیہ  
تو چلی گئی تھی لیکن وہ اندر سے شرمندہ تھی اور کسی کو اپنے سامنے شرمندہ دیکھ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس لیے سب  
سے کٹ کر رہ گئی تھی۔

کتنے دن ہو گئے تھے مدیہ کو گئے ہوئے۔ اس کا کسی بات میں دل بھی نہیں لگ رہا تھا۔ کتنا سوچتی امتحان قریب  
ہیں۔ اسے پڑھنا چاہیے لیکن اس پر بھی عمل نہیں کر پاری تھی اور نہ ہی اس نے علی جمائیکو فون کیا تھا صرف  
اس لیے کہ وہ ملنے پر اصرار کرے گا تو اسے لائبریری جانے کے لیے ٹیسیہ یا عمر سے کتنا پڑے گا اور گو اسے پھر  
تھا کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی منع نہیں کرے گا پھر بھی وہ کترا رہی تھی۔

عجیب روٹھے پھیلے دن تھے اور چھٹی کا دن تو اور بڑ کر دینے والا تھا۔ ناشتے کے بعد اس نے سوچا کہ آج  
دن اپنے کمرے کی صفائی کرنے میں گزارے گی، لیکن اس کام میں اسے صرف پندرہ منٹ لگے، کیونکہ مدیہ تو کمر  
نہیں جو ہر شے کو کسی پھینک دیا کرتی تھی اور اس کا پھیلاؤ اسیٹے میں وقت لگتا تھا۔ وہ تب بھی کڑھتی تھی اور اب  
جلدی فارغ ہونے پر بھی کڑھ رہی تھی پھر نیل کے کمرے میں آئی تو وہ اسے دیکھتے ہی کہنے لگی۔

"تمہیں چھٹی کے دن بھی چین نہیں ہے۔" وہ ان سنی کر کے ان کی رائیٹنگ میبل کی گرد احتیاط سے صاف  
کرنے لگی۔ پھر کھڑکی سے باہر دسٹر بھاڑ کر پلٹی تو انہیں تیار دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"آپ چھٹی کے دن کہاں جا رہے ہیں۔"

"یہاں کی طرف جاؤں گا پھر وہاں سے۔"

"ڈیفنس۔" اس نے فوراً کہا تو نیل چونک کر دیکھنے لگی۔

"تمہیں کیسے پتا ہے؟"

"آپ ہی سے اکثر سنا ہے کہ پہلے یا پکی طرف گیا تھا پھر وہاں سے ڈیفنس ایک دوست کے پاس۔" اس

سیدھے سادے انداز پر نیل مطمئن ہو کر بولی۔

"ہاں، دوست کے پاس۔" پھر بات بدلنے کی خاطر پوچھنے لگی۔ "پھوپھو کیا کر رہی ہیں۔"

"پتا نہیں" اپنے کمرے میں ہیں مجھے لگتا ہے نیل بھائی، ماما جو کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ دیکھیں  
دن ہو گئے ہیں وہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ امتحانوں کی فکر بھی نہیں ہے اسے۔ آپ اسے بلانے کی کوئی  
کر رہی ہیں۔"

"وہ ہم میں سے کسی کے کہنے پر نہیں آئے گی۔" نیل نے کہا۔

"تو پھر شکیل ماموں سے کہیں۔ وہی اسے چھوڑ جائیں۔ ورنہ ماما کو آپ جانتے ہیں کسی دن اچانک ان  
ہائی ہو گیا تو اسی وقت روانہ ہو جائیں گی یہاں سے اور مدو کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی لے آئیں گی۔" اس  
اپنے تین نیل کو اس وقت سے خائف کیا لیکن وہ مسکرا کر بولی۔  
"فکر نہیں کرو۔ ایسا نہیں ہو گا کیونکہ پھوپھو نے خود اسے بھیجا ہے۔"

"ماموں جی کے مجبور کرنے پر ہاں۔"

"نہیں بلکہ شکیل چچا کو پھوپھو نے اسی مقصد سے بلوایا تھا کہ وہ آکر مدو کو لے جائیں۔ یہاں اس کی مدد  
حد سے بڑھتی جا رہی تھی اس لیے سمجھیں۔" آخر میں نیل نے اس کا سر ہلایا تو وہ سمجھ کر روٹھے ہوئے  
نیل بات آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی۔ میں خواہ مخواہ پریشان رہی۔"

"کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تم ایسے ہی پریشان رہتی ہو خواہ مخواہ۔" نیل کا انداز چھینرنے والا تھا۔

میں داخل ہوتے ہی بولی۔ "مما! وہ نیل بھائی کمرہ رہے ہیں۔ کوئی کام ہو تو بتا دیجئے۔ وہ بڑے ماموں کی طرف جا رہے ہیں۔"

"یہ آپ کی بیٹی ہے۔" آسیہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی عارفہ بیگم نے اس سے پوچھ لیا۔  
"جی۔" آسیہ انہیں جواب دے کر اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ "ہاں بیٹا! نیل سے کلاس وقت ہوئی۔"

نیل ہے البتہ شام میں وہ دروازہ جلدی آجائے تو۔  
"جی اچھا" وہ آسیہ کی بات پوری نے بغیر وہیں سے پلٹ آئی اور نیل کو اپنے کمرے کے دروازے میں کوا دیکھ کر آہستہ آواز میں بولی۔  
"کوئی کام نہیں ہے، بس شام میں جلدی آجائیے گا۔"

"نیکوں؟"  
"مجھے کیا بتا ماما کہہ رہی ہیں۔" وہ ان کے قریب سے نکل کر کمرے کے اندر آ گئی۔  
"چھی بات ہے۔" نیل جلتے گئے تو اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر گہری سانس لی پھر دروازے سے زرا نکال کر انہیں جانے ہوئے دیکھنے لگی۔

جب وہ بیڑھیاں اتر گئے تب کچھ مطمئن سے ہو کر اس نے میسر کی طرف جانے کا سوچا مگر وہاں عارفہ بیگم کی باتیں سن سکے اور ابھی اپنی سوچ پر عمل کرنے کے لیے وہ خود کو تیار کر رہی تھی کہ بوا چائے اٹھائے راہداری میں نمودار ہوئیں، جہیں دیکھتے ہی اس نے جلدی سے دروازہ بند کر لیا اور آکر اپنے باغیچے گئی۔

اس کے اندر جتنا تجسس تھا اس سے زیادہ پریشان ہو رہی تھی کہ اگر آسیہ نے ان لوگوں کے بارے سے پوچھ لیا تو وہ کیا جواب دے گی۔ گوکہ علی جمائیک نے اسے اطمینان دلایا تھا کہ وہ کوئی ایسی راہ نکالے گا آسیہ اس سے کوئی سوال نہ کرے۔ اب پتا نہیں وہ اس میں کامیاب ہوا تھا یا نہیں۔ یہ تو اس کی بالادار جانے کے بعد ہی معلوم ہو سکتا تھا اور اتنی دیر تک وہ مطمئن نہیں ہو سکتی تھی۔ تجسس پریشانی خیز ایک احساس کو بھی دبا نہیں پادری تھی کہ مزید اندیشے سر ابھارنے لگے تھے۔ تب ہی دروازہ کھلنے کے آواز پر وہ ہڑوا کر اٹھ بیٹھی۔

"کون ہے بوا؟"  
"میں۔" رابعہ اندر آتے ہوئے بولی۔ "میرے آنے پر تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟"  
وہ خاموش رہی۔  
"اصل میں خواتین کی باتوں سے میں بور ہو گئی تھی اور تھینکس گاڈ کہ تمہاری امی نے محسوس تمہارے پاس بھیج دیا۔ کیا کر رہی تھیں؟" تو وہ اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"کچھ نہیں۔"  
"نیکن کچھ سوچ تو ضرور رہی ہوگی۔" رابعہ کی معنی خیز مسکراہٹ سے نظریں چرا کر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔  
"نہ نہ! ایک مخصوص لے پر دھڑکنے لگا تھا۔ جس سے چہرہ گلابی ہو گیا تو رابعہ ہنستی ہوئی بولی۔  
"نہ نہ بتاؤ پھر بھی میں جانتی ہوں۔ ویسے آج ہم اس مقصد سے نہیں آئے بلکہ میں تمہاری امی کو آسیہ اور عارفہ بیگم کے آنے سے رابعہ کی بات ادھوری رہ گئی اور وہ بھی فوراً "بیڈ" سے اتر کر عارفہ بیگم کو سلام بھی کیا تو وہ آگے آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے آسیہ سے بولیں۔

"مما! عارفہ بیگم کو سلام بھی کیا تو وہ آگے آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے آسیہ سے بولیں۔  
"مما! عارفہ بیگم کو سلام بھی کیا تو وہ آگے آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے آسیہ سے بولیں۔  
"جی آئی! میں بھی کچھ کہنے والی تھی۔ اسے ضرور ساتھ لائیے گا۔" رابعہ نے فوراً "تائید" کے کہا۔  
"ہوں دیکھو۔" آسیہ اپنے کسی خیال میں تھی۔

مما! عارفہ بیگم کو سلام بھی کیا تو وہ آگے آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے آسیہ سے بولیں۔  
"مما! عارفہ بیگم کو سلام بھی کیا تو وہ آگے آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے آسیہ سے بولیں۔  
"جی آئی! میں بھی کچھ کہنے والی تھی۔ اسے ضرور ساتھ لائیے گا۔" رابعہ نے فوراً "تائید" کے کہا۔  
"ہوں دیکھو۔" آسیہ اپنے کسی خیال میں تھی۔

مما! عارفہ بیگم کو سلام بھی کیا تو وہ آگے آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے آسیہ سے بولیں۔  
"مما! عارفہ بیگم کو سلام بھی کیا تو وہ آگے آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے آسیہ سے بولیں۔  
"جی آئی! میں بھی کچھ کہنے والی تھی۔ اسے ضرور ساتھ لائیے گا۔" رابعہ نے فوراً "تائید" کے کہا۔  
"ہوں دیکھو۔" آسیہ اپنے کسی خیال میں تھی۔

مما! عارفہ بیگم کو سلام بھی کیا تو وہ آگے آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے آسیہ سے بولیں۔  
"مما! عارفہ بیگم کو سلام بھی کیا تو وہ آگے آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے آسیہ سے بولیں۔  
"جی آئی! میں بھی کچھ کہنے والی تھی۔ اسے ضرور ساتھ لائیے گا۔" رابعہ نے فوراً "تائید" کے کہا۔  
"ہوں دیکھو۔" آسیہ اپنے کسی خیال میں تھی۔

مما! عارفہ بیگم کو سلام بھی کیا تو وہ آگے آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے آسیہ سے بولیں۔  
"مما! عارفہ بیگم کو سلام بھی کیا تو وہ آگے آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے آسیہ سے بولیں۔  
"جی آئی! میں بھی کچھ کہنے والی تھی۔ اسے ضرور ساتھ لائیے گا۔" رابعہ نے فوراً "تائید" کے کہا۔  
"ہوں دیکھو۔" آسیہ اپنے کسی خیال میں تھی۔

مما! عارفہ بیگم کو سلام بھی کیا تو وہ آگے آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے آسیہ سے بولیں۔  
"مما! عارفہ بیگم کو سلام بھی کیا تو وہ آگے آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے آسیہ سے بولیں۔  
"جی آئی! میں بھی کچھ کہنے والی تھی۔ اسے ضرور ساتھ لائیے گا۔" رابعہ نے فوراً "تائید" کے کہا۔  
"ہوں دیکھو۔" آسیہ اپنے کسی خیال میں تھی۔

مما! عارفہ بیگم کو سلام بھی کیا تو وہ آگے آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے آسیہ سے بولیں۔  
"مما! عارفہ بیگم کو سلام بھی کیا تو وہ آگے آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے آسیہ سے بولیں۔  
"جی آئی! میں بھی کچھ کہنے والی تھی۔ اسے ضرور ساتھ لائیے گا۔" رابعہ نے فوراً "تائید" کے کہا۔  
"ہوں دیکھو۔" آسیہ اپنے کسی خیال میں تھی۔

مما! عارفہ بیگم کو سلام بھی کیا تو وہ آگے آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے آسیہ سے بولیں۔  
"مما! عارفہ بیگم کو سلام بھی کیا تو وہ آگے آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے آسیہ سے بولیں۔  
"جی آئی! میں بھی کچھ کہنے والی تھی۔ اسے ضرور ساتھ لائیے گا۔" رابعہ نے فوراً "تائید" کے کہا۔  
"ہوں دیکھو۔" آسیہ اپنے کسی خیال میں تھی۔

مما! عارفہ بیگم کو سلام بھی کیا تو وہ آگے آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے آسیہ سے بولیں۔  
"مما! عارفہ بیگم کو سلام بھی کیا تو وہ آگے آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے آسیہ سے بولیں۔  
"جی آئی! میں بھی کچھ کہنے والی تھی۔ اسے ضرور ساتھ لائیے گا۔" رابعہ نے فوراً "تائید" کے کہا۔  
"ہوں دیکھو۔" آسیہ اپنے کسی خیال میں تھی۔

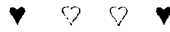
مما! عارفہ بیگم کو سلام بھی کیا تو وہ آگے آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے آسیہ سے بولیں۔  
"مما! عارفہ بیگم کو سلام بھی کیا تو وہ آگے آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے آسیہ سے بولیں۔  
"جی آئی! میں بھی کچھ کہنے والی تھی۔ اسے ضرور ساتھ لائیے گا۔" رابعہ نے فوراً "تائید" کے کہا۔  
"ہوں دیکھو۔" آسیہ اپنے کسی خیال میں تھی۔

ابھرنے لگی، جو ایک دن شاہ سکندر کے ساتھ اس کے کانونیت آئی تھی۔ اس وقت اگر وہ کسی شاعر کا دوست تھی تو اس وقت بھی خوب صورت غزل کے سانچے میں ڈھلی تصویر لگ رہی تھی میک اب سے بے پناہ چہرہ اور سیدھی مانگ کے ساتھ ڈھیلی ڈھالی چوٹی زیورات کے نام پر کاتوں میں ٹاپس تھے اور کھائی میں دواغ علی جمائیکر کو اس عورت کے بجائے اپنے چچا شاہ سکندر پر رحم آئے گا تب ہی رابعہ اس کے قریب آ

جائی ایماں کیوں کھڑے ہیں۔ وہاں چلیں ناں ڈاکٹر آسیہ کے پاس۔ آخر آپ کو انہیں متاثر کرنا ہے۔  
ہوں ہوں۔ میں شاید انہیں متاثر نہیں کر سکتا۔ اس نے پر سوچ انداز میں نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔  
یہاں کیا می ہے آپ میں ماشاء اللہ۔

اس نے ٹوک کر رابعہ کو مہمانوں کے پاس جانے کا اشارہ کیا تو وہ حیران ہو کر بولی۔  
اسٹاپ۔ میں تو آپ کی تعریف کر رہی ہوں اور آپ۔

فصل باہیں نہیں کرو، چلو جاؤ۔ اس بار اس نے قدرے سختی سے ٹوکا اور اسے وہیں بڑھاتے چھوڑ کر اپنے بے کاغذ خیال۔



ہاں بی! کو کہ میں یہاں بہت بور ہو گئی ہوں پھر بھی واپس آ کر اپنی نہیں جاؤں گی۔ مدھیہ نے بیڑے کے قریب بیٹھ کر اس پر کھٹے نکتے ہوئے کما تو سیما بھا بھی ایک نظر اس پر ڈال کر بولیں۔

ہاں تو بیٹا! کون کہہ رہا ہے ابھی تمہیں واپس جانے کو جب سبک دل چاہے رہو۔

میرا مطلب ہے، میں بیٹیں پڑھنا، اتنی ہوں اور اس کے بعد جاب بھی نہیں کروں گی۔ آپ ماما سے کہیں یہیں کسی کالج میں ایڈمیشن کراؤں اور ساتھ ہاسٹل میں بھی۔

ہاسٹل میں کیوں۔

ٹوٹک میں آپ پر جوہ نہیں بننا چاہتی۔ اپنے تئیں وہ بڑی سمجھ داری سے کام لے رہی تھی۔

برہما بھی کو بے ساختہ ہنسی آگئی جسے روکنے کی انہوں نے کوئی کوشش نہیں کی۔

فصل ٹھیک کہہ رہی ہوں ماما جی! مجھے یہاں آئے ہوئے ایک مہینہ ہو گیا اور زیادہ سے زیادہ آپ مجھے ایک بار روایت کر لیں گی اس کے بعد۔

تو فنی کی باتیں مت کرو۔ اسے جدوجہد سنجیدہ دیکھ کر سیما بھا بھی کی ہنسی کو بریک لگ گئے۔ ٹوٹکے ہوئے نہیں۔ پتا ہے جب تم پیدا ہوئی تھیں۔ ہم نے اسی وقت آسیہ سے کہا تھا کہ تمہیں ہمارے پاس چھوڑ دے اگر اس وقت وہ ہماری بات مان لیتی تو تم شروع سے بیٹیں، ہو تیں تو کیا میں تمہیں بوجھ سمجھتی ایسا کیسے سوچ رہی ہوں؟

آپ سمجھ نہیں رہیں۔ وہ روٹھے لہجے میں بولی۔

تم سب سمجھ رہی ہوں۔ تم یہاں پڑھنا چاہتی ہو ناں تو ہو جائے گا تمہارا ایڈمیشن اور اس کے لیے ہمیں اسے اجازت لینے کی بھی ضرورت نہیں ہے، سمجھیں تم۔ لا حول ولا میں تو تمہیں بہت عقل مند سمجھتی تھی ناں تو آسیہ سے بھی زیادہ احمق ہو۔

ماما! حق نہیں ہیں ڈاکٹر ہیں۔ وہ ان کی خفگی سے خائف ہو کر بولی۔

انہوں نے کاکلی خاص شعبہ نہیں ہوتا۔ یہ ہر شعبے میں پائے جاتے ہیں۔ بے شک اپنے سبب سبب میں ماسٹر ہو کر دوسرے معاملات میں احمق ہی رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر اپنی ماما کو دیکھو۔ تعلیمی میدان میں اتنی ذہین ہونے پر فخر تو لینے کی لیکن زندگی کے دوسرے معاملات میں اتنی ہی احمق ثابت ہوئی۔

برہما بھی کھٹے اس کی بات پر مذاق میں شروع ہوئی تھیں۔ لیکن پھر آسیہ کا ذکر کرتے ہوئے سنجیدہ ہو گئیں۔ ماما جی! آسیہ کو دیکھتی ہوں تو مجھے افسوس ہوتا ہے کہ اس نے اپنے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ یا تو شاہ سکندر کے

جتنے کیف آگئیں تھے۔ اب اتنی ہی بورت تھی۔ رہ رہ کر صباحت پر غصہ آ رہا تھا اور بہت کوشش کے باوجود اس طرف سے دھیان بھی نہیں ہٹا رہا تھا۔ ادھر بات کیا ہوئی، وہ جواب کیا دیتا۔ آخر اس کے دوست جینے نہ دیا۔

”کہاں الجھے ہو یا؟ میں اتنی دیر سے نوٹ کر رہا ہوں۔ تم مسلسل ہمیں انڈر کر رہے ہو اور اب انہیں بھی اس کا اشارہ نبیل کی طرف تھا۔ وہ سمجھ کر اندر ہی اندر خود کو سرزنش کرتا ہوا نبیل کی طرف متوجہ ہو کر پچھتے پچھتے

آپ کی کیا مصروفیات ہیں۔؟“  
”گورنمنٹ کالج میں لیکچرار ہوں اس کے علاوہ بھی سارا وقت پڑھنے پڑھانے میں گزرتا ہے۔“ نبیل نے

سے انداز میں بتایا تو ان کے قریب رہی ان کی اسنگ کو دیکھتے ہوئے علی جمائیکر نے بے اختیار ہنسون پکا کر کہا۔  
جیسے اسے حیرت ہوئی ہو۔ پھر فوراً ”موضوع بدل گیا۔“

”مجھے لگتا ہے میں نے پہلے بھی آپ کو نہیں دیکھا ہے۔“  
”اتفاق ہے میں بھی اس وقت سے یہی سوچ رہا ہوں کہ آپ کو کہاں دیکھا ہے۔“ پر سوچ انداز میں کہنے پر

نبیل کو اچانک یاد آگیا۔ ”ہاں لا سبرری میں۔ ایک دو بار وہیں دیکھا ہے۔“  
”مائی گاڈ! کہیں صباحت کے ساتھ تو نہیں دیکھ لیا۔ اس نے سوچا اور قدرے رک کر بولا ”ہو سکتا ہے م

نے بھی وہیں دیکھا ہو۔“  
”بھائی آپ کا فون ہے۔“ عقب سے رابعہ نے پکار کر کہا تو وہ دل ہی دل میں شکر کرتا ہوا ان سے معذرت کر کے فوراً اٹھ کر لابی میں آگیا۔

”ہیلو علی جمائیکر اسپیکنگ۔“  
”میں نک پو۔“ ادھر سے صباحت کی قدرے ہنستی ہوئی آواز آئی تو اس کی ساری کوفت پل میں رخت ہو گئی

لیکن بظاہر خفگی سے گویا ہوا۔  
”کس بات کا شکریہ ادا کر رہی ہیں؟“

”خود ہی سمجھ جائیں۔“  
”سوری۔ میں نہیں سمجھ سکتا۔“ اس نے صاف انکار کر دیا لیکن ذہن پر زور بھی دینے لگا تھا۔

”بھئی! ماما تک پہنچنے کے لیے آپ نے جو بھی طریقہ اختیار کیا۔ میں وہ سب تو نہیں جانتی۔“ ان آپ نے نوٹ کر کوئی آج نہیں آنے دئی اس کے لیے تھیک پو آئین۔

اس نے وضاحت کے ساتھ دوبارہ شکریہ ادا کیا تو وہ شاکی ہو کر بولا۔  
”لگتا ہے آپ کو میرا اعتبار نہیں تھا اور اس لیے آپ آئیں بھی نہیں۔“

”نہیں علی! میرے آنے کا سبب بے اعتباری نہیں بے اعتباری ہے۔“ وہ بڑی سادگی سے اعتراف کر گئی جس سے اس کی ظاہری خفگی پل میں ہوا ہو گئی بے ساختہ مسکرا کر بولا۔

”وہ اقبال نے کیا کہا ہے کہ اچھا ہے دل کے ساتھ رہنا سببان عقل۔“  
”جی ہاں میں نے اسی پر عمل کیا ہے۔“ وہ ہنسی۔

”گڈ اور اس کے اگلے مصرعے پر عمل کا کب تک ارادہ ہے۔“ اس نے محظوظ ہو کر پوچھا تو وہ بے ساختہ بولا۔  
”اس پر پہلے عمل ہو چکا۔“

علی جمائیکر کا دلکش قہقہہ بڑا جان دار تھا۔ ادھر وہ بیٹھا گئی۔  
”میں فون بند کر رہی ہوں۔“ اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

”بہنو ف!“ وہ ریسیور رکھ کر لابی سے نکلا تو رابعہ سب مہمانوں کو کھانے کے لیے لان میں لے جا رہی تھی۔  
وہیں رک کر آسیہ کو دیکھنے لگا وہ سفید ساڑھی میں بڑی باوقار اور سب میں نمایاں لگ رہی تھی۔

علی جمائیکر بالکل غیر ارادی طور پر اسے شاہ سکندر کے ساتھ سوچنے لگا تو اس کے ذہن کے کیوں کیوں



شش نہ کریں اور اگر انہوں نے میرے ساتھ اس سلسلے میں کوئی زبردستی کی تو میں چمچ اپنے باپ کے ہاتھ میں لے کر دوں گی۔“  
 ایک دم سنجیدہ ہو کر اپنی بیٹی زانیہ وارنگھ دوہرائی تو وہ رو پڑی۔  
 دہری ہو مدھو! تمہیں ذرا احساس نہیں کہ۔“

لوں میں احساس بناؤ۔ میرے ساتھ جو ہوا اس پر دوسرے کو احساس کیوں نہیں دلایا جاتا۔ میری تقدیر لایا جاتا ہے اور تم کس حساب سے میری دادی اباں بننے کی کوشش کرتی ہو۔ بڑی عقل ہے تمہارے مدھیہ نے تنفر سے فون پٹ دیا تھا۔  
 مدھیہ! اس نے بے قراری سے کریڈل پر ہاتھ مارا پھر باؤس ہو کر ریسور رکھ دیا اور ہتھیلیوں سے دلی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھی تھی کہ بیل کی آواز پر ہاتھ نیچے گرا کر انہیں دیکھنے لگی۔  
 اونیو تھا؟ وہ پوچھ رہے تھے۔

برہی تھی؟  
 نہیں جی! اس سے پوچھ لیں۔ اس کی آنکھیں پھر چھلکنے کو ہو رہی تھیں۔ اس لیے جلدی سے کہہ کر میں آئی۔

انہیل اس کے پیچھے چلے آئے۔ یہ کیا یوقنی ہے۔ تم جانتی تو مدھو کو پھر اس کی باتوں پہ رونے کا مجھے بتاؤ اب کیا کیا ہے اس نے؟  
 کہہ رہاں نہیں آئی۔ وہیں پڑھے گی! اپنی بارکس شیٹ وغیرہ منگوائی ہے اس نے کہہ رہی تھی زبردستی تو وہ چمچ شاہ سکندر کے پاس چلی جائے گی۔ اس نے روتے ہوئے بتایا تو نیل گہری سانس لے لے

بارک سدھو کی تم دونوں۔  
 نے کیا کیا ہے۔ وہ فوراً بولی۔  
 ہاں کیا کتنی ہو سوائے رونے کے اور اسے دھمکانے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں۔ بس ساری زندگی میں رونا ہونوں۔ نیل کو جانے کیوں غصہ آگیا تھا۔  
 ان جلدی اپنی آنکھیں صاف کرنے لگی۔

سکندر کے پاس جانے کی وہ ضرور جائے آخر پاپ ہے اس کا۔ تمہیں اگر باپ سے ملنے کا شوق نہیں ہے تو رو کو جانے دو۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ تمہیں بھی جانا چاہیے۔  
 ہاں! کی میں بھی جاؤں گی۔ لیکن اس طرح نہیں جیسے مدھو بات بے بات دھمکی دیتی ہے میں ماما کی باتوں کی۔ وہ کہہ کر ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی تو پہلی بار نیل بجائے اسے چپ کرانے کے سسے نکل گئے۔

بدلتے احساس ہوا تو ہاتھ نیچے گرا کر بہت حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھا پھر ان کے پیچھے جانے کا بس سوچا۔ بہت نہیں ہوئی کیونکہ ان کا غصہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس کے رونے پر تھا یا مدھیہ پر اور کسی پر نہیں تو وہ کبھی نہیں کرتے تھے کہ اسے رو تپھوڑ کر چلے جائیں۔  
 مدھیہ پر ابھی ہوئی ادھر سے ادھر ٹھٹھنے لگی پھر اچانک کھانے کا خیال آیا تو سب بھول کر ان کے

ہاتھوں میں لے کر کھانا گرم کروں؟  
 نیل کیلے کھانا کھڑے تھے اس کی سمت ذرا سی گردن موڑ کر پوچھنے لگے۔  
 ہاں! ہاں!

ساتھ کچر دماڑ کر لیتی یا پھر۔“  
 ”آپ کا مطلب ہے، ماما کو دوسری شادی کر لینی چاہیے تھی۔“ سیما بھابی کے خاموش ہو جانے پر اس نے سمجھ کر پوچھا تو وہ نظرس چراتے ہوئے بولیں۔  
 ”نہیں، میرا یہ مطلب نہیں ہے۔“  
 ”پھر کیا اچھا نہیں کیا ممانے؟“

”یہی کہ تمہیں شروع سے میرے پاس نہیں چھوڑا۔“ سیما بھابی بڑی خوب صورتی سے بات بتائیں اور پھر سے اس کی ٹھوڑی پھوڑ کر گھسنے لگیں۔ ”خیر! اب تم میرے پاس ہو اور میں تمہیں ہرگز واپس نہیں جانے دوں گی۔ تم یہیں پڑھو گی اور یہیں تمہاری شادی ہوگی ٹھیک۔“  
 وہ سر ہچکا کر اپنے ناخن دیکھنے لگی۔  
 ”تم اگر پہلے کہیں تو اب تک تمہارا ایڈمیشن ہو بھی چکا ہوتا۔ خیر میں آج ہی ٹکٹیل سے کہوں گی۔“

”ان سے پہلے آپ ماما سے پوچھ لیں۔“ وہ مستحالی۔  
 ”تم کہتی ہو تو پوچھ لیں گے اس سے بھی۔“ سیما بھابی کو اس وقت وہ چھوٹی سی معصوم بچی لگ رہی تھی اور اسی طرح اسے بہلا رہی تھیں۔

♥ ♥ ♥ ♥  
 سردیوں کی راتیں ایک تو جلدی شروع ہو جاتی ہیں دوسرے سناٹا بھی چھا جاتا ہے۔ ابھی آٹھ بجے تھے اور گرا رہا تھا جانے کتنی رات بیت گئی ہو۔ وہ عشاء کی نماز پڑھنے جا رہی تھی جب آسیہ کا فون آیا تھا کہ اسے آنے میں ہو جانے کی اس لیے وہ کھانا کھا لے۔  
 وہ نماز پڑھ کر فارغ ہو گئی تو بوائے اس سے کھانا لگنے کا پوچھا اور اسے بھوک تو لگ رہی تھی۔ لیکن نیل! نہیں تھے اس لیے منع کرتے ہوئے بولی۔  
 ”آپ کھائیں بوا! میں جب نیل بھائی آئیں گے ان کے ساتھ کھالوں گی۔“

”آسیہ تو آنے والی ہوگی ناں۔“  
 ”نہیں ماما کا فون آیا تھا۔ وہ دیر سے آئیں گی اور آپ کو ان کے انتظار میں بیٹھے رہنے کی ضرورت نہیں۔ آپ کھانا کھائیں اور لحاف میں جا لیں۔ ماما کے لیے کھانا میں گرم کر دوں گی اور یہ نیل بھائی پتا نہیں کہاں رہیں۔“  
 آخر میں وہ برپا تھی ہوئی نیل کو دیکھنے کی غرض سے بالکلونی کا دروازہ کھولنے لگی تھی کہ فون کی تیل پر دروازہ کرا لالی میں آگئی۔

”آپ تو میرے میں ہو گئے تم سب۔“ دوسری طرف مدھیہ تھی اس کی آواز سنتے ہی شروع ہو گئی۔ بہت کرنے لگی تھی ناں میں تم سب کو۔ چمچ بتاؤ کتنے نفل کھانے کے پڑھے مے نے اور تمہارے۔“  
 ”جو موت اور فوراً واپس آؤ۔ میں بہت بور ہو گئی ہوں اور اس پھی۔“ اس نے ٹوک کر کہا۔  
 ”میرے بغیر۔“ مدھیہ کی حیرت میں ڈوبی آواز آئی۔

”اور نہیں تو کیا۔“  
 ”اچھا کبھی آ جاؤں گی تم سے ملنے۔ فی الحال تو تم میرے ڈاکو مینٹس بھیج دو کیونکہ میں یہاں کان لچ میں لے رہی ہوں۔“ مدھیہ نے اس پر احسان کرتے ہوئے کہا تو وہ چمچ پڑی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“  
 ”اے سیدھی سادی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔ میری انٹر کی مارکس شیٹ اور سرٹیفکیٹ پڑھ کر نہیں۔ یہاں امتحان ہونے والے ہیں تم فوراً واپس آؤ۔“  
 ”نہیں صا۔ میں اب وہاں نہیں آؤں گی میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ تم ماما کو بھی بتا دینا اور ان سے کہنا۔“

نہیں اکیلی کیسے کھاتی۔“  
 ”کیوں، پچھو کہاں ہیں؟“  
 ”کلینک، فون آیا تھا ان کا کہ انہیں دیر ہو جائے گی اور اتنی دیر تو ہو گئی ہے، ابھی تک نہیں آئیں۔“  
 ”والہاک! پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔“  
 ”آجائیں گی، تم کھانا گرم کرو۔“ انہوں نے سرسری انداز میں کہہ کر بن موڑ لیا تو وہ وہیں سے پلٹ کر آگئی۔  
 ”کھانا گرم کیا پھر نیبل پر رکھ کر نیبل کو بلا لائی اور ابھی دونوں نے کھانا شروع کیا تھا کہ آسیہ آگئی۔  
 ”تم لوگ اب کھانا کھا رہے ہو۔ میں نے کہا ابھی تھا میرا انتظار نہیں کرتا۔“ آسیہ نے تعجب کے ساتھ صاف گوتی سے بولی۔

”آپ کے انتظار میں دیر نہیں ہوئی ماما! نیبل بھائی بھی نہیں تھے اور آپ کو پتا ہے میں اکیلی نہیں کھاؤں  
 آسیہ نے چیخ کر کہنے سے روک دیا۔ نیبل کو دیکھا لیکن پوچھا نہیں کہ انہیں کہاں دیر ہوئی۔  
 ”وہ ماما! جو کافون آیا تھا۔“ قدرے توقف سے اس نے اسی قدر کہا تھا کہ آسیہ نے فوراً پوچھا۔  
 ”اچھا! آئے کو کہا ہے اس نے۔“  
 اس نے کچھ شٹا کر نیبل کو دیکھا، لیکن وہ بہت انجان نظر آئے جیسے سناہی نہیں، تب وہ اندری اندر فا کر بولی۔  
 ”آئے کو تو نہیں کہا بلکہ وہ تو وہیں رہنے کی بات کر رہی تھی۔“  
 ”کہا مطلب؟“ آسیہ کا منہ کی طرف جانا ہوا تھا درمیان میں ہی رک گیا۔  
 ”مجھے نہیں پتا ماما! وہ کہہ رہی تھی وہیں کالج میں ایڈمیشن لے گی۔“  
 آسیہ نے جانے کیوں خاموشی اختیار کر لی اور کھانے میں مصروف ہو گئی جس سے وہ پریشان ہو کر پوچھے  
 ”تو کیا ماما! آپ اسے وہیں رہنے دیں گی؟“  
 ”نہیں آجائے گی وہ بلکہ میں خود لے آؤں گی اسے۔ اگلے ہفتے ڈاکٹر زکونشن میں مجھے اسلام آباد جانا  
 میں اسے بھی لیتی آؤں گی۔“ آسیہ نے دھیر سے اسے اطمینان دولا یا پھر نیبل کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔  
 ”نیبل! تم کل چار بجے کھ رہی رہنا۔ کچھ مہمان آئیں گے۔“  
 ”کون؟“ نیبل نے کچھ بے دھیانی میں پوچھ کر سوالیہ نظروں سے دیکھا۔  
 ”وہ اس روز جن کے ہاں ہم لوگ گئے تھے۔ میرا خیال ہے وہ۔“  
 آسیہ ایک دم خاموش ہو گئی تو نیبل نے غالباً سمجھ کر بے اختیار اسے جن نظروں سے دیکھا اس کا  
 زور سے دھڑکنے لگا تھا اور فرار کا ایک ہی راستہ نظر آیا۔ فوراً ”برتن سمیٹ کر چن کی راہ لی لیکن  
 عروج پر پہنچ گیا تھا۔ ایسے میں اسے مدد کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ اب اس مقام پر وہ اسے  
 تب بھی اس کے ذریعے سے ایک ایک بات اسے معلوم ہو سکتی تھی۔  
 پھر رات دیر تک اسے نیند نہیں آئی۔ جانے کیا کچھ سوچ رہی۔ محبت کی جس شاہراہ پر وہ چل  
 اس کی منزل صاف نظر آتی اور بھی درمیان میں خدشات گھیر لیتے اور محبت کی راہ گزر تو لگتی ہی  
 رنگ بھولوں سے ڈھکی ہوئی۔ پتا ہی نہیں چلتا کہاں کانٹے چھپے ہیں۔ بہر حال اگلے دن کالج سے آکر  
 کو نہ کو نہ جکا دیا لیکن اس وقت وہ بری طرح جھنجھلا گئی جب مہمانوں کو اوپر بلانے کے بجائے آسیہ  
 اور نیبل کو بھی وہیں بلا لیا۔ وہیں دیکھتی رہ گئی پھر اس انتظار میں ٹھنسنے لگی کہ کسی وقت اسے بھی بلایا  
 ایسا بھی نہیں ہوا۔ تقریباً ”ایک گھنٹہ بعد نیبل واپس اوپر آئے تو ان کی اسٹک کی آواز سننے ہی وہ جلا  
 کھول کر بیٹھ گئی۔  
 ”صبا! نیبل نے اس کے دروازے پر آکر پکارا تو وہ منظر ہونے کے باوجود بھی چونک کر کھڑی ہو  
 ”جی بھائی!“

”نیل کے نوکے پر وہ چونک کر بولی۔  
 ”سلانہ! وہ تو میں نے کل ہی سی دیا تھا۔ بس ابھی دے رہی ہوں۔“  
 ”میں۔ نیچے اماں جی کو دے آؤ۔“ نیبل کہہ کر وہیں سے پلٹ گئی تو وہ بے اختیار ان کے پیچھے لپک کر  
 ”مہمان۔“  
 ”بے رک کر دیکھا تو بری طرح سٹپٹا گئی۔  
 ”برا مطلب ہے نیچے مہمان ہیں۔“  
 ”نیل! بغیر کچھ بتائے اپنے کمرے میں داخل ہو گئے تو وہ اپنے دھڑکنے والے دل پر ہاتھ رکھ کر بیڑیا کی  
 ”نیل! مجھے کیا ہو رہا ہے۔“ پھر الماری میں سے کرتا نکال کر نیچے آئی تو آسیہ، اماں جی اور میمونہ بھابی سے  
 بیات کر رہی تھیں جو اسے دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ جس سے اس کا دھڑکنے والا دل ٹھہر گیا بہت محتاط سی ہو  
 ”نیل! بولی۔  
 ”اماں جی! آپ کا کرتا۔“  
 ”نیل! وہ مہمان بھی ٹانگہ دیے ہیں۔“ اماں جی نے اس کے ہاتھ سے کرتا لیتے ہوئے پوچھا۔  
 ”نیل! کرے آپ کو پسند آجائے۔“ اس نے توبیہ کی تلاش میں ادھر ادھر نظر سر دوڑاتے ہوئے کہا اور وہ  
 ”اماں جی! تو ممانی سے پوچھنے لگی۔  
 ”نیل! کہاں ہے ماما جی؟“  
 ”نیل! کے ساتھ بازار گئی ہے۔ بیٹھو ابھی آتی ہوگی۔“  
 ”نیل! کہاں گئی؟ وہ بیٹھی بھی کہ میمونہ بھابی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔  
 ”نیل! کوئی ناراضگی ہے کیا؟“  
 ”نیل! اماں جی! میں آپ سے ناراض ہونے کی جرات کر سکتی ہوں بھلا ہر گز نہیں۔ وہ تو امتحانوں کی وجہ سے  
 ”نیل! کوئی ہوں ورنہ آپ کو دیکھنے بغیر تو میرا کھانا بھی ہضم نہیں ہوتا تو مجھ میں ماما سے۔“  
 ”نیل! میمونہ بھابی کی گردن میں بازو ڈالتے ہوئے کہا تو وہ اس کا گال ٹھپک کر بولیں۔  
 ”نیل! جانتی ہوں۔“  
 ”نیل! کون سا خیر و خرابی امتحان ہو جائیں۔“  
 ”نیل! تو سیدھے بھی ہوا بتایا ہوا ہے امتحانوں کو اور اس کے نوٹس ہی نہیں پورے ہوتے اور وہ کیا ہوتے  
 ”نیل! دس سالہ پیپر۔ پتا نہیں کیا پڑھتے ہو تم لوگ۔ ہم تو سیدھے سیدھے کتابیں پڑھتے اور امتحان دیتے  
 ”نیل! میں جانتی تھی۔“  
 ”نیل! ان کے الم علم کہنے پر ہنسی ہوئی بولی۔  
 ”نیل! کے ہیں ہم لوگ چلو جاؤ اپنی پڑھائی کرو تم۔“ میمونہ بھابی نے اس کی کمر پر دھپ جمتاے ہوئے  
 ”نیل! ہنسی ہوئی میڑھیاں بھلا نکلی۔

”نیل! کون سا خیر و خرابی امتحان ہو جائیں۔“  
 ”نیل! تو سیدھے بھی ہوا بتایا ہوا ہے امتحانوں کو اور اس کے نوٹس ہی نہیں پورے ہوتے اور وہ کیا ہوتے  
 ”نیل! دس سالہ پیپر۔ پتا نہیں کیا پڑھتے ہو تم لوگ۔ ہم تو سیدھے سیدھے کتابیں پڑھتے اور امتحان دیتے  
 ”نیل! میں جانتی تھی۔“  
 ”نیل! ان کے الم علم کہنے پر ہنسی ہوئی بولی۔  
 ”نیل! کے ہیں ہم لوگ چلو جاؤ اپنی پڑھائی کرو تم۔“ میمونہ بھابی نے اس کی کمر پر دھپ جمتاے ہوئے  
 ”نیل! ہنسی ہوئی میڑھیاں بھلا نکلی۔

”نیل! کون سا خیر و خرابی امتحان ہو جائیں۔“  
 ”نیل! تو سیدھے بھی ہوا بتایا ہوا ہے امتحانوں کو اور اس کے نوٹس ہی نہیں پورے ہوتے اور وہ کیا ہوتے  
 ”نیل! دس سالہ پیپر۔ پتا نہیں کیا پڑھتے ہو تم لوگ۔ ہم تو سیدھے سیدھے کتابیں پڑھتے اور امتحان دیتے  
 ”نیل! میں جانتی تھی۔“  
 ”نیل! ان کے الم علم کہنے پر ہنسی ہوئی بولی۔  
 ”نیل! کے ہیں ہم لوگ چلو جاؤ اپنی پڑھائی کرو تم۔“ میمونہ بھابی نے اس کی کمر پر دھپ جمتاے ہوئے  
 ”نیل! ہنسی ہوئی میڑھیاں بھلا نکلی۔

”نیل! کون سا خیر و خرابی امتحان ہو جائیں۔“  
 ”نیل! تو سیدھے بھی ہوا بتایا ہوا ہے امتحانوں کو اور اس کے نوٹس ہی نہیں پورے ہوتے اور وہ کیا ہوتے  
 ”نیل! دس سالہ پیپر۔ پتا نہیں کیا پڑھتے ہو تم لوگ۔ ہم تو سیدھے سیدھے کتابیں پڑھتے اور امتحان دیتے  
 ”نیل! میں جانتی تھی۔“  
 ”نیل! ان کے الم علم کہنے پر ہنسی ہوئی بولی۔  
 ”نیل! کے ہیں ہم لوگ چلو جاؤ اپنی پڑھائی کرو تم۔“ میمونہ بھابی نے اس کی کمر پر دھپ جمتاے ہوئے  
 ”نیل! ہنسی ہوئی میڑھیاں بھلا نکلی۔

”نیل! کون سا خیر و خرابی امتحان ہو جائیں۔“  
 ”نیل! تو سیدھے بھی ہوا بتایا ہوا ہے امتحانوں کو اور اس کے نوٹس ہی نہیں پورے ہوتے اور وہ کیا ہوتے  
 ”نیل! دس سالہ پیپر۔ پتا نہیں کیا پڑھتے ہو تم لوگ۔ ہم تو سیدھے سیدھے کتابیں پڑھتے اور امتحان دیتے  
 ”نیل! میں جانتی تھی۔“  
 ”نیل! ان کے الم علم کہنے پر ہنسی ہوئی بولی۔  
 ”نیل! کے ہیں ہم لوگ چلو جاؤ اپنی پڑھائی کرو تم۔“ میمونہ بھابی نے اس کی کمر پر دھپ جمتاے ہوئے  
 ”نیل! ہنسی ہوئی میڑھیاں بھلا نکلی۔

”نیل! کون سا خیر و خرابی امتحان ہو جائیں۔“  
 ”نیل! تو سیدھے بھی ہوا بتایا ہوا ہے امتحانوں کو اور اس کے نوٹس ہی نہیں پورے ہوتے اور وہ کیا ہوتے  
 ”نیل! دس سالہ پیپر۔ پتا نہیں کیا پڑھتے ہو تم لوگ۔ ہم تو سیدھے سیدھے کتابیں پڑھتے اور امتحان دیتے  
 ”نیل! میں جانتی تھی۔“  
 ”نیل! ان کے الم علم کہنے پر ہنسی ہوئی بولی۔  
 ”نیل! کے ہیں ہم لوگ چلو جاؤ اپنی پڑھائی کرو تم۔“ میمونہ بھابی نے اس کی کمر پر دھپ جمتاے ہوئے  
 ”نیل! ہنسی ہوئی میڑھیاں بھلا نکلی۔

”نیل! کون سا خیر و خرابی امتحان ہو جائیں۔“  
 ”نیل! تو سیدھے بھی ہوا بتایا ہوا ہے امتحانوں کو اور اس کے نوٹس ہی نہیں پورے ہوتے اور وہ کیا ہوتے  
 ”نیل! دس سالہ پیپر۔ پتا نہیں کیا پڑھتے ہو تم لوگ۔ ہم تو سیدھے سیدھے کتابیں پڑھتے اور امتحان دیتے  
 ”نیل! میں جانتی تھی۔“  
 ”نیل! ان کے الم علم کہنے پر ہنسی ہوئی بولی۔  
 ”نیل! کے ہیں ہم لوگ چلو جاؤ اپنی پڑھائی کرو تم۔“ میمونہ بھابی نے اس کی کمر پر دھپ جمتاے ہوئے  
 ”نیل! ہنسی ہوئی میڑھیاں بھلا نکلی۔

”ہوں۔“ چند منٹ بعد بابا جان متوجہ ہوئے اور انہیں متوجہ کرنے کے لیے ہٹکارا بھر کر بولے۔ ”کوئی نام ہے؟“

”میرا نام اخبار ہے۔“ انہوں نے اخبار تمہ کر کے واپس دی رکھ دیا پھر بابا جان کو دیکھ کر مسکرا کر بولے۔ ”نہر خبریں اخباروں میں نہیں چھپتیں۔“

”جو اب! بابا جان کی مسکراہٹ بے ساختہ تھی۔“

”آپ سنا میں وہ جو اب بھی بیگم گرامی سیٹھل ہوئی ہیں انہوں نے کچھ معاملہ آگے بڑھایا یا نہیں۔“ شاہنشاہ غالباً اسی مقصد سے آئے تھے جب ہی فوراً اصل موضوع کی طرف آگئے۔

”میں بھی ہم علی سے اسی سلسلے میں بات کر رہے تھے۔ اس نے بتایا ہے، آج دہن بیگم باقاعدہ اس کا رشتہ لگتی تھیں۔“

”پھر کیا جواب دیا آسہ نے؟“ شاہ سکندر بے صبری کا مظاہرہ کر گئے جس پر بابا جان نے بڑی کھوجتی ہوئی نظر سے انہیں دیکھا پھر قصداً ”سرسری انداز میں بولے۔

”سوچنے کو وقت مانگا ہے اس نے اور پھر اپنے بھائیوں سے مشورہ بھی ضرور کرے گی ان کی درپر جو بچو اب تک۔“

”لیکن وہ کسی رپوچھ تو نہیں ہے۔“ شاہ سکندر بلا ارادہ کہہ گئے۔

”یہ تو ہی جانتے ہوں گے، بہر حال ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں۔ ہم صرف تمہاری بیٹی کے لیے فکر ہیں۔ اگر آسہ بیگم نے اسے اپنے ہی خاندان میں بیاہ دیا تو یہ اس بچی پر برا ظلم ہو گا۔ ساری زندگی اسے اپنے دادا کے طعنے سننے پڑیں گے۔ خیمیں اس نے بھی دیکھا ہی نہیں اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ دراصل رگوں میں دوڑتا مارا خون ہے۔ جس کی وجہ سے ہم بادیخے اس کے لیے فکر مند ہیں اسی طرح اس کے باپ دادا کا طعنہ سنا عذاب ہو گا یہ بالکل فطری بات ہے۔ اس لیے جب تک وہ بچی اسے لوگوں میں نمبر ہمیں چین نہیں آئے گا! بابا جان نے بڑی خوب صورتی سے اس میں تاریک پہلو سمجھا کر کہا تو وہ اندر ہی اندر ہو کر بولے۔

”چتا نہیں بابا جان! اس بچی کے دل میں ہمارے لیے کیا ہے۔ محبت، نفرت یا کچھ بھی نہیں۔“

”ہوئے والوں نے تو نفرت کا بیج ہی بویا ہو گا۔ خیر، ہمیں اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”انشاء اللہ خوش رہی ہوگی اور ہاں تم نے اس کے بارے میں کچھ سوچا ہے۔“

بابا جان نے محض ان کا دھیان مٹانے کی خاطر ان دو سرور بچی کا ذکر چھیڑ دیا تو وہ چونک کر کہنے لگی۔

”الماس تو بہت چھوٹی ہے بابا جان! ابھی تو میرٹ کیا ہے اس نے۔ اور میرا ارادہ اسے ڈاکٹر بنانے کا۔ اللہ ذہن ہے آسانی سے میڈیکل میں جاسکتی ہے۔“

”دس۔“ بابا جان نے سوچتے ہوئے انداز میں ہوں کی آواز نکالی پھر کافی دیر بعد بولے۔ ”اچھی بات۔ شاہ سکندر اٹھ کھڑے ہوئے۔

”میں چلتا ہوں بابا جان! آپ آرام کریں۔“

بابا جان نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا تو وہ انہیں شب بخیر کہہ کر کمرے سے نکل آئے اور جب ان میں داخل ہوئے تو آگے میر النساء منتظر کھڑی تھیں۔ دیکھتے ہی کہنے لگی۔

”شاہ! آپ نے اتنی بڑی بات مجھ سے چھپائی۔“

شاہ سکندر کچھ بولے نہیں لیکن جسم سوالیہ نشان بن گئے تھے۔

”کیا سچ ہے کہ شہر میں آپ کی کوئی اولاد ہے جسے بابا جان میاں لانے کی تدبیر کر رہے ہیں۔“

میر النساء کے غور میں اضافہ ہی کیا تھا اور اب تو خاصے جارحانہ انداز میں پوچھ رہی تھی۔

”ہاں۔“ شاہ سکندر مختصر جواب دے کر فہم کی پراچھیٹے تو وہ تھملا کر ان کی طرف پلٹی۔

اس کی ماں مرگئی ہے کیا۔؟“

باب میر النساء۔“ وہ بے اختیار چلائے پھر فوراً ہونٹ بھیج کر خود پر قابو پانے کے بعد کہنے لگے۔

بابا جان میاں لانے کی تدبیر کر رہے ہیں وہ میری بیٹی ہے اور مجھ پر اتنا ہی حق رکھتی ہے جتنا الماس۔ لیکن سے کیا دانا۔ یہ تو نہیں تھا کہ میرے پاس دینے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اگر وہ محروم رہی تمہاری وجہ سے۔ تمہاری وجہ سے میرا لڑکا بابا جان نے مجھے مجبور اور بے بس کر کے مجھ سے وہ کچھ دینے نہیں چاہتا تھا اور میں تو ابھی بھی اتنا مجبور ہوں کہ خود جا کر اپنی بیٹی کو نہیں لاسکتا۔ اسے لانے کے لیے تو تدبیریں کرنی پڑ رہی ہیں۔ خدا معلوم اتنے برسوں بعد انہیں یہ خیال کیسے آیا کہ میری اور بھی کوئی بیٹی ہے اور یہ کہ اسے اس کا حق ملنا چاہیے۔ کتنی عجیب بات ہے پہلے خود اسے محروم کیا اور اب خود

اپنی بیٹی میں استغناء آمیز دکھ تھا۔

شاہ بڑے ضبط سے سن رہی تھی۔ اس کے خاموش ہونے پر تڑخ کر بولی۔

بابا جان کو اگر اس کا خیال آئی گیا ہے تو اسے میاں لانے کی کیا ضرورت ہے۔ جو اس کا حق دینا دلانا مجبور ہیں۔“

بابا جان کو سب سے پہلے مجھے بھجوانا پڑے گا۔“ شاہ سکندر کو جانے کیا سوچ محفوظ کر گئی۔

طلب ہے آپ کا۔“

”میں نے سمجھو تو اور بات ہے البتہ یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ وہ بچی میرے لیے کسی طرح بھی الماس سے کم نہیں ہے۔ شک اس سے کوئی تعلق نہ رکھنا لیکن اسے کوئی رک پچھانے کی بھی کوئی شش نہ رہا۔“ شاہ سکندر ہونے لکچے میں سخت تنبیہ تھی۔

”میرا لڑکا نے سخت سے سر جھکا۔“ وہ آئے گی تب تو۔“

”آئے گی۔“ یقین سے کہتے ہوئے شاہ سکندر جانے کہاں کھو گئے تھے۔



دقت بہت موڑنا کر پڑھنے بیٹھی تھی کہ عمر نے بہت خاموشی سے آکر اس کے سر پر ہاؤ کی آواز نکالی تو وہ ہلچل مچا کر ہٹک کر نکلے دل پر ہاتھ رکھ کر تار اٹھکی سے بولی۔

”میرا بیٹا ہے اگر میرا ہارٹ ٹیکل ہو جاتا تو؟“

”عمر نے قہقہہ لگا کر اس کا مذاق اڑایا۔“

”سیدھی شرافت سے طے جاؤ یہاں سے ورنہ میں ماما کو پکار کر تمہاری خوب کھجائی کرواؤں گی۔“ اس نے قہقہے سے بڑی طرح تپ کر دھمکی دی تو وہ بجائے مرعوب ہونے کے اس کے سامنے بیڑ پڑھے گیا اور ایک معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”جائ جاؤں گا سیدھی شرافت سے۔ تمہارا تم کون سے طریقے سے جاؤ گی۔“

”مال جاؤں گی۔ میرا کمرہ ہے یہ۔“

اسے سے نہیں گھر سے جانے کی بات کر رہا ہوں۔ سنا ہے تمہارے لیے کسی نای گرامی کا پر پوزل آیا نامعنی خیزی میں شوخی بھی شامل ہو گئی تھی۔

”بس ہے تمہارا؟“ وہ ”نای گرامی“ پر اچھل پڑی۔

”اسے پوچھنے آیا ہوں اور تم مجھ سے پوچھ رہی ہو۔ سیدھی طرح بتاؤ، کسی اے سی ڈی سی کا رشتہ آیا

بڑے بیٹھے ہوئے رعب سے کہا تو وہ نظروں کا زاویہ بدلتے ہوئے بولی۔

”ہاں۔“

راکی لعنت۔“ وہ خلیفہ انداز میں ہاتھ اٹھا کر بولا۔  
 ہو جاتا ہے۔“ اس نے پھر جانے کے لیے قدم بڑھائے تو عمر ایک ہی جست میں اس سے پہلے  
 اٹھا اور وہ لمبی رکی نہیں۔ اس کے پیچھے نکل کر چلے اسے بھاگتے اور میڑھیاں اترتے دیکھا پھر  
 بے پروا تنک دینے کے بعد اندر بھاگ کر پوچھنے لگی۔

اس سے؟“  
 یہ اونچا کر کے سینے تک کبل اوڑھے لیٹے ہوئے کچھ پڑھنے میں مصروف تھے۔ کتاب پر سے  
 حوالہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

بشرپ کرنا تو نہیں چاہتی تھی۔ لیکن۔“ وہ اندر آ کر رک گئی۔

ہے؟“ نبیل نے نرمی سے کہا پھر بھی وہ کچھ سٹپٹائی۔

تھا تھا کہ آج آپ طارق روڈ گئے تھے؟“

؟“ صاف انکار کے ساتھ نبیل کے کیوں نے اسے مزید بوکھلایا۔ بڑبڑانے کے انداز میں عمر کو

تو وہ کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے بولے۔

تمہارے ساتھ یہاں آؤ۔“

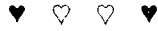
باری ہوں۔“

یہ رعب سے پکارا تو بہت دھیرے دھیرے آگے آتی ہوئی بولی۔

ہاؤ عمر کہہ رہا ہے کہ اس نے آپ کو طارق روڈ پر دیکھا تھا ایک لڑکی کے ساتھ۔ میں نے اس کی

نہیں کیا نبیل بھائی۔“

میں تصدیق کرنے آئی ہوں۔“ نبیل کے چہرے لہجے نے اس کا پورا وجود سن کر دیا تھا۔



آسیر نے بیٹیوں کے مستقبل کے بارے میں سوچا ہی نہ تھا۔ اسے شروع سے ان کی فکر تھی اور  
 دونوں کو اعلیٰ تعلیم دلا کر کسی قابل بنانے کے بعد ان کی شادیاں کرے۔ لیکن دونوں میں سے کوئی  
 اتنی اچھی نہیں تھی۔ بہت محنت کے بعد بس یہ تھا کہ اچھے نمبروں سے پاس ہو جاتی تھیں اور ظاہر  
 لیے ان کا یہ رزلٹ خاصا مایوس کن تھا اور بہت جلد اس نے ان کی اعلیٰ تعلیم کا خواب جھوٹا کر دیا  
 یا تھا کہ دونوں کو گریجویشن کرا کر ان کی شادی کر دے گی اس کے خیال میں بیکار لڑکیوں کی عمریں  
 وہ نہیں تھا۔

بلکہ جب مدح کی مستثنیٰ ہوئی تھی تو وہ کیونکہ گھر کی بات تھی اس لیے اسے اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ  
 علامات طے کرتے ہوئے اسے کن مراحل سے گزرنا ہوگا، اتنا فانا“ جیسے مدح کی بات طے ہو گئی  
 بالخصوص صحت کے لیے بھی جب کوئی اچھا رشتہ آیا، وہ اسی طرح اس کے فرض سے سبکدوش ہو  
 اس سے پہلے ہی احمر نے باہر شادی کر کے اس کے دل کو جو دھچکا پہنچایا تھا اس سے رشتوں پر سے  
 اس کا تھا تھابت بھی وہ بہت محتاط ضرور ہو گئی تھی اور یہ جان لیا تھا کہ بیٹیوں کی شادی آسان بات  
 بہمات کے لیے جو پر پوزل آیا تھا اس کے بارے میں اس کا خیال تھا مکمل چھان بین کا کام عدیل  
 ہرگز۔ لیکن اتفاق سے ان دونوں عدیل بھائی اپنے بڑے نور پر جان بول گئے ہوئے تھے اور اسے کوئی  
 سن بھی خود اسے بھی اسلام آباد جانا تھا۔

آپاں سے واپس آنے کے بعد عدیل بھائی سے بات کرے گی اور کیونکہ یہ طے تھا کہ اس نے  
 نہیں کرنا اس لیے عارف بیگم کو بھی اس نے کوئی امید افزا جواب نہیں دیا تھا اس کے باوجود چار  
 سچے کہ وہ پھر ان موجود ہوئیں۔ اتفاق سے اسی شام چھ بجے اس کی اسلام آباد کی فلائیٹ بھی اور  
 ان کا ادھر وہ خاصی جربز ہوئی۔ اپنی بیکنگ کا کام صحت کو سونپ کر وہ بڑی جلت میں۔ نیچے آئی اور

”سچ کہو۔ تمہیں پتا نہیں ہے۔“  
 ”میں سچ کہہ رہی ہوں۔ کل کوئی مہمان آئے تو تھے۔ لیکن مجھے نہیں پتا، وہ کس لیے آئے تھے۔ مہمان  
 نیچے ہی بٹھایا تھا پھر نبیل بھائی کو بھی وہیں بلا لیا۔“ وہ رک رک کر تباہی بھی کہ عمر نے ٹوک دیا۔

”بس مان لیا تمہیں نہیں پتا“  
 ”بس مان لیا ناں۔ اب جاؤ مجھے پڑھنے دو۔“ اس نے دل ہی دل میں شکر کرتے ہوئے دوبارہ کتاب اٹھائی۔  
 ”کیا کرو گی پڑھ کر وہ ڈی سی تم سے نوکری تو نہیں کروائے گا اور اگر کروائی بھی ہوئی تو اپنی سفارش پر نہ

کسین تھانے دانی لگوا دے گا۔“

”کیا؟“ اس نے چیخنے کے ساتھ کتاب عمر کے سر پر دے ماری۔ ”بہت ہی کمینے ہو تم تھانیدارانی لگواؤ ناں۔“

بیوی کو اور اپنی سالی کو اور۔“

”سناں گو۔“ عمر نے فوراً لقمہ دیا۔

”ہاں بہت اچھے لگو گے تھانیدارنیوں میں گھرے ہوئے۔ ادھر سے وہ مارے گی ادھر سے وہ۔“ وہ بولے چارہ

تھی اور عمر نے جا رہا تھا۔ جب وہ خاموش ہوئی تب بڑی معصوم سی شکل بنا کر بولا۔

”ان ساری باتوں کے لیے ڈی سی ہونا ضروری ہے جو کہ میں نہیں ہوں۔ خیر کوئی بات نہیں تم ان سے نہ

تمہاری یہ ساری خواہشیں پوری کر دیں گے۔“

وہ سمجھ گئی کہ وہ باز آنے والا نہیں ہے اس لیے ایک دم خاموشی اختیار کر لی اور کچھ بے نیازی بھی دکھانے لگی

”ارے اصل بات بتانا تو میں بھول ہی گیا۔“ قدرے توقف سے عمر نے اچھل کر اپنے تئیں اسے چوڑا

لیکن اس کی بے نیازی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

”ایمان سے صاحب! تم سنو کی تو حیران ہو جاؤ گی بلکہ تمہیں یقین بھی نہیں آئے گا خود میں اپنی آنکھوں سے دیکھ

بھی یقین نہیں کر رہا۔“ عمر نے مزید جس بیدار کرنے کی کوشش کی اور اس بار کامیاب ہو گیا۔

”کیا کیا یہ پتا ہے۔“ وہ پوری طرح متوجہ ہو گئی۔

”وہ اپنے نبیل بھائی۔ آج میں نے انہیں طارق روڈ پر ایک لڑکی کے ساتھ دیکھا تھا۔“ عمر نے اس کی

جواب کر جتنی آہستہ آواز میں بتایا کہ وہ اتنی زور سے چیخی۔

”جھوٹ مت بولو۔“

”جو چاہے تمہارے لو۔“

”نبیل بھائی لڑکی کے ساتھ۔“ وہ بے یقینی سے نفی میں سر ہلانے لگی۔

”اور لڑکی بھی خاصی ماڈرن، بلکہ جینز پر آف وائٹ شرت پہنے ہوئے تھی اور بہت اترا کر چل رہی

میں۔ بہت کوشش کی ان تک پہنچنے کی لیکن براہر ٹریفک کا میرے روڈ کراس کرنے تک وہ دونوں گاٹن

کر میری نظروں کے سامنے سے نکل گئے۔“

عمر نے جوش سے بتاتے ہوئے آخر میں مایوسی کا اظہار کیا۔

میں ابھی پوچھتی ہوں نبیل بھائی سے۔“ وہ اٹھنے لگی تھی کہ اس نے روک دیا۔

”ان سے کیا پوچھو گی؟“

”یہی کہ ان کے ساتھ لڑکی کون تھی۔“ وہ ساگی سے بولی۔

”جلدی کیا ہے۔ ذرا صبر سے کام لو اور دیکھو کہ وہ خود سے کب بتاتے ہیں۔“

”وہ پتا نہیں کب بتائیں گے میں اتنا صبر نہیں کر سکتی۔“ وہ واقعی کھڑی ہو گئی۔

”تمہاری مرضی لیکن خیر وار جو میرا نام لیا تو میں صاف مکر جاؤں گا کہ میں نے تم سے کچھ نہیں مانا۔“

”تمہارے ساتھ کما تو وہ جاتے جاتے رک کر بولی۔

”اس کا مطلب ہے تم نے جھوٹ بولا ہے۔“

اُسے شوہر۔ میرا مطلب ہے صباحت کے باپ کو۔ کیا نام بتایا ہے ان کا؟“ عارفہ بیگم حد کر رہی تھیں یا یہ ضبط جواب دے رہا تھا۔ جوہ رانی میونہ بھائی کی طرف پھیل کر اٹھ کر چلی آئی۔

”آمین نے آپ کی تمام چیزیں سوٹ کیس میں رکھ دی ہیں پھر بھی آپ دیکھ لیں۔ کچھ تو نہیں گیا۔“

”نہ اے دیکھتے ہی سوٹ کیس کھول کر لے کر آتا تو وہ اچھتی نظر ڈال کر بولی۔“

عارفِ بیکم سے ابتدائی رسمی کلمات بھی خاص عجلت میں ادا کر کے کہنے لگی۔  
 ”صالحہ! مجھے آج اسلام آباد مانا ہے۔ چھ بجے میری فلائیٹ ہے۔ آپ اگر آنے سے پہلے فون کر



سگریٹ نہیں پینے دی۔ میں جیسے ہی سگریٹ نکالنے کے لیے جیب پر ہاتھ رکھا تو فوراً "ٹوک دیتیں وہ میری بات نہیں سنا رہا تھا۔"

میں نے کہا: "جیسے کبھی ایسا۔"

میں نے کہا: "تو آپ جیسے ہمسفر نہیں ملتے۔" انہوں نے دھوئیں کے مرغلوں میں سے اسے دیکھا تھا۔ اتنی دیر تو اسے دور سے دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا کہ اس نے کیا کیا ہے۔

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے زندگی کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔" ان کا دل چاہا اس سے پوچھیں اتنے برس اس نے کیا کیا ہے۔

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے زندگی کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے زندگی کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے زندگی کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے زندگی کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے زندگی کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے زندگی کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے زندگی کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے زندگی کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے زندگی کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے زندگی کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے زندگی کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے زندگی کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے زندگی کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے زندگی کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے زندگی کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے زندگی کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے زندگی کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے زندگی کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے زندگی کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے زندگی کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے زندگی کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے زندگی کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے زندگی کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے زندگی کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے زندگی کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے زندگی کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے زندگی کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے زندگی کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے زندگی کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے زندگی کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے زندگی کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے زندگی کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے زندگی کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے زندگی کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے زندگی کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے زندگی کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے زندگی کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔"

اتنے قریب اس ستم گر کی موجودگی سے آسیر کا دل ڈوبنے لگا۔ کیونکہ فرار کی کوئی راہ نہیں تھی۔ بے شکل زہر قابو پا کر اس نے کچھ غیر محسوس طریقے سے پہلے نظروں کا زاویہ بدلا پھر بیک سے سر ہٹا کر سیدھی ہو بیٹھی۔

دشمن آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے شاہ سکندر ایک ٹک اسے دیکھے جا رہے تھے غالباً "یہ ڈر تھا کہ آنکھیں پھٹنے سے پتلا ٹوٹ جائے گا۔"

اس نے ان کی بات کا جواب دیا نہ ہی چہرے پر کوئی تاثر ابھرا بلکہ یوں جیسے وہ اس سے نہیں کسی اور سے مخاطب ہوں۔

"آسیر پلیر اتنی انجان نہ بنیں، میں آج بھی اس وعدے کا پابند ہوں، خود سے آپ کے راستے میں نہیں آیا۔"

چند گھنٹوں کی ہم سفری قسمت کی مہربانی ہے یا ستم ظریفی، میرے لیے بہر حال اس کا ایک ایک پل انمول ہے۔ میں آپ کا تاحیات ممنون رہوں گا اگر جو آپ ناراضگی اور نفرت سے نظریں چرا کر فقط اس سفر میں اور کچھ نہیں تو دوست ہی سمجھ کر بات کریں، مجھ سے۔"

شاہ سکندر کے انداز میں لمحے میں عاجزی تھی۔

وہ بے اختیار ذرا سی گردن موڑ کر انہیں دیکھنے لگی۔

"شاہ سکندر کا مقصد کچھ جانا یا دوا تجبی بھی ساتھ بیٹھے ہوں تو بات کر لیتے ہیں، ہم میں تو پھر کبھی آشنائی تھی۔"

شاہ سکندر کا مقصد کچھ جانا یا دوا تجبی بھی ساتھ بیٹھے ہوں تو بات کر لیتے ہیں، ہم میں تو پھر کبھی آشنائی تھی۔

شاہ سکندر کا مقصد کچھ جانا یا دوا تجبی بھی ساتھ بیٹھے ہوں تو بات کر لیتے ہیں، ہم میں تو پھر کبھی آشنائی تھی۔

شاہ سکندر کا مقصد کچھ جانا یا دوا تجبی بھی ساتھ بیٹھے ہوں تو بات کر لیتے ہیں، ہم میں تو پھر کبھی آشنائی تھی۔

شاہ سکندر کا مقصد کچھ جانا یا دوا تجبی بھی ساتھ بیٹھے ہوں تو بات کر لیتے ہیں، ہم میں تو پھر کبھی آشنائی تھی۔

شاہ سکندر کا مقصد کچھ جانا یا دوا تجبی بھی ساتھ بیٹھے ہوں تو بات کر لیتے ہیں، ہم میں تو پھر کبھی آشنائی تھی۔

شاہ سکندر کا مقصد کچھ جانا یا دوا تجبی بھی ساتھ بیٹھے ہوں تو بات کر لیتے ہیں، ہم میں تو پھر کبھی آشنائی تھی۔

شاہ سکندر کا مقصد کچھ جانا یا دوا تجبی بھی ساتھ بیٹھے ہوں تو بات کر لیتے ہیں، ہم میں تو پھر کبھی آشنائی تھی۔

شاہ سکندر کا مقصد کچھ جانا یا دوا تجبی بھی ساتھ بیٹھے ہوں تو بات کر لیتے ہیں، ہم میں تو پھر کبھی آشنائی تھی۔

شاہ سکندر کا مقصد کچھ جانا یا دوا تجبی بھی ساتھ بیٹھے ہوں تو بات کر لیتے ہیں، ہم میں تو پھر کبھی آشنائی تھی۔

شاہ سکندر کا مقصد کچھ جانا یا دوا تجبی بھی ساتھ بیٹھے ہوں تو بات کر لیتے ہیں، ہم میں تو پھر کبھی آشنائی تھی۔

شاہ سکندر کا مقصد کچھ جانا یا دوا تجبی بھی ساتھ بیٹھے ہوں تو بات کر لیتے ہیں، ہم میں تو پھر کبھی آشنائی تھی۔

شاہ سکندر کا مقصد کچھ جانا یا دوا تجبی بھی ساتھ بیٹھے ہوں تو بات کر لیتے ہیں، ہم میں تو پھر کبھی آشنائی تھی۔

شاہ سکندر کا مقصد کچھ جانا یا دوا تجبی بھی ساتھ بیٹھے ہوں تو بات کر لیتے ہیں، ہم میں تو پھر کبھی آشنائی تھی۔

شاہ سکندر کا مقصد کچھ جانا یا دوا تجبی بھی ساتھ بیٹھے ہوں تو بات کر لیتے ہیں، ہم میں تو پھر کبھی آشنائی تھی۔

شاہ سکندر کا مقصد کچھ جانا یا دوا تجبی بھی ساتھ بیٹھے ہوں تو بات کر لیتے ہیں، ہم میں تو پھر کبھی آشنائی تھی۔

شاہ سکندر کا مقصد کچھ جانا یا دوا تجبی بھی ساتھ بیٹھے ہوں تو بات کر لیتے ہیں، ہم میں تو پھر کبھی آشنائی تھی۔

شاہ سکندر کا مقصد کچھ جانا یا دوا تجبی بھی ساتھ بیٹھے ہوں تو بات کر لیتے ہیں، ہم میں تو پھر کبھی آشنائی تھی۔

شاہ سکندر کا مقصد کچھ جانا یا دوا تجبی بھی ساتھ بیٹھے ہوں تو بات کر لیتے ہیں، ہم میں تو پھر کبھی آشنائی تھی۔

شاہ سکندر کا مقصد کچھ جانا یا دوا تجبی بھی ساتھ بیٹھے ہوں تو بات کر لیتے ہیں، ہم میں تو پھر کبھی آشنائی تھی۔

شاہ سکندر کا مقصد کچھ جانا یا دوا تجبی بھی ساتھ بیٹھے ہوں تو بات کر لیتے ہیں، ہم میں تو پھر کبھی آشنائی تھی۔

شاہ سکندر کا مقصد کچھ جانا یا دوا تجبی بھی ساتھ بیٹھے ہوں تو بات کر لیتے ہیں، ہم میں تو پھر کبھی آشنائی تھی۔

”ابن ابیہلم“ نہیں اس کا ہر انداز زیر تھا۔  
 ”نور ابیہلم“ آپ پروپزل کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ تو بے ایک پروپزل اگر میں اس کی طرف سے مطمئن ہو گئی تو انشاء اللہ جلد صبا کی شادی کروں گی پھر۔“ وہ ایک دم ہونٹ بچھڑائی اچانک خیال آیا تھا کہ اگر صرف ایک بیٹی کی خبر ہے۔  
 ”کون کون ہے آئی میں وہ لڑکا کیا آپ کی فیملی میں ہے۔؟“ شاہ سکندر پورے دھیان سے اس کی طرف پوچھ رہے تھے۔  
 ”نہیں غیر لوگ ہیں اس کے والد کا دینی میں بزنس ہے اور وہ لڑکیاں کراچی میں غالباً اسٹنٹ کسٹمرز شاید بیٹی بہر حال اس کے بارے میں مکمل چھان بین کے بعد ہی میں کوئی فیصلہ کر سکوں گی۔“ اس نے سہولت سے بتا کر انہیں دیکھا تو فوراً بولے۔  
 ”میں اس سلسلے میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں یعنی اگر آپ کہیں تو اس لڑکے کے بارے میں معلومات دیں وہ فوراً جواب نہیں دے سکی۔ حالانکہ صرف جی یا نہیں کرنا تھا لیکن وہ سوچنے میں لگ گئی کہ یہ کام ان سے نہ چاہیے یا نہیں۔  
 ”اطمینان رکھیں کم از کم بیٹی کے معاملے میں تو میں کوئی کوتاہی نہیں کر سکتا۔ اچھا ہی سوچوں گا اچھا چاہوں گا۔“ اس بار انہوں نے ”آپ کی بیٹی“ کہنے سے قصداً گریز کرتے ہوئے ایک طرح سے جواب دیا کہ وہ ان کی بھی بیٹی ہے اور اس نے سمجھ کر ذرا سائنات میں سر ہلایا پھر کہنے لگے۔  
 ”تو لڑکے کا نام علی ہے۔ علی جمالیہ کراچی میں گائٹن روڈ پر رہائش ہے۔ اس کے ساتھ اس کی والدہ اور ایک بہن ہے۔ والد کے بارے میں بتا چکی ہوں، دینی میں ہوتے ہیں۔ اب اس کے بارے میں جو آپ مطلع کر چاہیں، ان کی مین خاندان۔ اس لڑکے کا ذاتی کیریئر وغیرہ اور اگر آپ کو وہ مناسب لگے تو مجھے بتا دیجئے گا۔ مثلاً کے حق میں فیصلہ دے دوں گی۔“  
 ”ہوں۔“ انہوں نے گہری سانس کے درمیان ہوں کی آواز نکالی پھر کوٹ کی اندرونی جیب سے بین اورچ سی ڈائری نکال کر لڑکے کا نام پتہ لکھا پھر اس سے پوچھنے لگے۔  
 ”اور آپ سے میں کہاں کوٹھیکٹ کروں۔؟“  
 وہ اپنے کھینک کا نمبر لکھوا کر بولی۔  
 ”شام پانچ سے آٹھ بجے تک مجھ سے اس نمبر بات ہو سکتی ہے۔“  
 ”اس کے علاوہ؟“ انہوں نے بظاہر سرسری انداز میں پوچھا لیکن وہ ایک دم نرم ہوئی بن گئی۔  
 ”کہیں نہیں۔“  
 ”اوکے“ میں بہت جلد علی جمالیہ کے بارے میں ساری معلومات آپ تک پہنچا دوں گا۔“ انہوں نے اور بین واپس اندرونی جیب میں رکھا پھر اسے دیکھ کر ٹیبل پر چیلے انداز میں مسکرا کر پوچھنے لگے۔  
 ”آپ یہ بتائیے اپنی بیٹی کی شادی میں مجھے انوائٹ کریں گی یا نہیں۔؟“  
 ”نہیں۔“ اس نے بے مروتی کی حد کر لی اور شاہ سکندر نے پہلے بھی کہیں کیوں کا سوال نہیں اٹھایا تو بھی خاموش ہو رہے تو ایک محسوس کی جانے والی دیوار درمیان میں حائل ہو گئی تھی۔  
 سفر تمام ہونے کو تھا لیکن اب منزل کیس نہیں تھی اور ان دونوں کے اندر کوئی جتنو بھی نہیں تھا کہ انہیں منزل پہلے ملی تھی اور سفر بعد میں۔ جسے زندگی کی آخری سانسون تک جاری رہنا تھا۔ اپنی اپنی جگہ جانے کون سے وقت میں کھو گئے تھے۔ چونکہ اس وقت جب بائیک پر سیٹ پلٹ باہر درخواست کی جا رہی تھی۔  
 شاہ سکندر نے اسے یوں دیکھا جیسے پھر جانے کب ملاقات ہو اور وہ انجان سی بن کر پلٹ باندھ بیٹھا۔

اس کے بعد اپنا پرس کھول کر اس میں جھانکنے لگی۔ یوں ہی ادھر ادھر ہاتھ مار کر کچھ تلاش کرنے کی کوشش کی۔  
 ”میرا خیال ہے یہ پرواز نہیں تک بھی۔“ شاہ سکندر نے بغیر اسے مخاطب کیے کہا تو وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔  
 ”میرا خیال ہے یہ پرواز نہیں تک بھی۔“ شاہ سکندر کی ٹانگیں راستہ روکے ہوئی تھیں اور وہ اطمینان سے اپنا بریف کیس بند کرنے میں مصروف تھے۔  
 ”ایکس کیو ڈی۔“ اس نے متوجہ کیا تو انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور راستہ دینے کے بجائے فوراً ”کے“ ہو کر اس سے آگے چلنے لگے۔  
 ”یہڑھیاں اترنے تک وہ ان کے پیچھے پیچھے تھی پھر ایک دم قدم ہٹا کر آگے بڑھنے لگی کہ وہ پکار کر بولے۔  
 ”آہ! خدا حافظ نہیں کہیں گی۔؟“  
 ”خدا حافظ۔“ وہ ایک پل میں خود پر قابو پا کر اعتماد سے مسکرائی تھی۔

\*~\*~\*

وہ بہت ڈرتے ڈرتے نیبل کے کمرے میں داخل ہوئی تھی لیکن وہ موجود ہی نہیں تھے۔ جس پر وہ اطمینان کا راس لے کر کمرے کی صفائی میں لگ گئی۔ دو دن ڈسٹنگ نہیں کی تھی تو اتنی گرو جمع ہو گئی تھی۔ بید کی چادر بھی ہلج رہی تھی۔ ڈسٹنگ کے بعد اس نے الماری میں سے دھلی ہوئی چادر نکال کر بچھائی پھر تکیے کا غلاف بدل کر بنے لیا پر دھلی ہوئی پٹی تو دروازے میں نیبل کو کھڑے دیکھ کر گھبرا کر نکلا۔  
 ”وہ میں“ کمرہ گندہ ہو رہا تھا۔ میں“ میں نے سوچا۔“  
 نیبل کچھ بولے نہیں۔ دروازے سے ہٹ کر اسے نکل جانے کا اشارہ کیا تو وہ ایک دم روبانسی ہو گئی۔  
 ”میرا کیا تصور ہے۔ مجھے تو عمر بے بتایا تھا۔ آپ مجھ سے کیوں خفا ہیں۔؟“  
 ”کوئی خفا نہیں ہوں میں بس جاؤ یہاں سے۔“ وہ آگے آتے ہوئے بولے۔  
 ”کیوں جاؤں میں کہیں نہیں جا رہی۔“ وہ وہیں بید پر ڈھے گئی۔  
 ”مہا بھئی اس وقت تنگ نہیں کرو۔ میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔“  
 ”پریشان۔“ وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔ ”آپ پریشان ہیں نیبل بھائی، کس بات سے۔ ممانے کچھ کہا ہے لیکن ممانو یہاں میں ہیں پھر پھر کس نے۔“  
 ”الف“ ایک تو تم بتائیں کیا چیز ہو۔“ نیبل نے اپنا سر تھما لیا۔  
 ”آپ کچھ بھی کہیں“ میں جب تک آپ کی پریشانی نہیں جان لوں گی یہاں سے ہلوں گی ہی نہیں۔“ وہ دوبارہ بڑبڑائی۔  
 ”تو نیبل سر جھٹک کر واش روم میں چلے گئے۔  
 وہ انتظار کرنے کے ساتھ اپنے آپ فیاں بھی کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ جیسے ہی نکلے فوراً ”شروع ہو گئی۔“  
 ”آپ میری عادت سے اچھی طرح واقف ہیں نیبل بھائی پھر اس طرح کیوں کر رہے ہیں۔ ٹھیک ہے میں آپ کی پریشانی دور نہیں کر سکتی لیکن۔“  
 ”باس۔“ نیبل نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا پھر اس کے پاس بیٹھے ہوئے نرمی سے بولے۔ ”میرا خیال ہے کہ کوئی پریشانی نہیں ہے۔“  
 ”ابھی تو آپ کہہ رہے تھے۔“  
 ”زبان کچھ غلط پھسل گئی میری بہن! کہنا یہ چاہ رہا تھا کہ میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ سمجھیں یا نہیں۔“ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ جم کر زور سے ہلایا تو وہ بسور کے انداز میں پوچھنے لگی۔  
 ”اور آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں۔؟“

”کس بات سے؟“  
 ”وہ جو عمر کے کہنے میں آکر میں نے آپ سے لڑکی کا پوچھا تھا۔“ وہ ایسی ڈری ہوئی نظروں سے انہیں دیکھتی تھی جیسے اس بات سے ابھی وہ ہتھ سے اکھڑ جائیں گے لیکن اس کے برعکس وہ ہنستے ہوئے بولے۔  
 ”وہ بھی احمق ہے اور تم بھی۔ اور میں احمقوں سے ناراض نہیں ہوں۔“  
 ”لیکن آپ عمر سے پوچھنے کا ضرور کہ اس نے ایسی بات کیوں کہی؟“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔  
 ”پوچھ لوں گا۔ ابھی تو تم مجھے چائے پلاؤ پھر مجھے جانا بھی ہے۔“ انہوں نے کہا تو اس نے جاتے جاتے سر پوچھا۔

”کہاں؟“  
 ”کہاں کا کیا مطلب؟ یعنی اب تم میرے جانے آنے پر پابندی لگاؤ گی۔“  
 ”میں کیوں پابندی لگاؤں گی۔ میں تو اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ۔۔۔“  
 ”جاؤ دیکھو کس کا فون ہے۔“ ٹیلی فون کی بیل سن کر اسے ٹوک دیا۔  
 ”بہر حال کہیں بھی جائیں۔ جلدی واپس آئیے گا۔ مجھے آج آپ سے پڑھنا ہے۔“ وہ کہتی ہوئی بھاگ کر میں آگئی۔  
 ”ہیلو۔“

”صاحت شاہ سے بات ہو سکتی ہے۔“ ادھر سے علی جمائیکر نے اس کی آواز پہچان کر دلکش انداز میں کہا بھی اتر کر بولی۔  
 ”جی نہیں، وہ تو اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔“  
 ”کوئی بات نہیں، آپ تو ہیں ناں۔ میں آپ سے بات کر لیتا ہوں۔“ ادھر بڑا مظلوظ لہجہ تھا۔  
 ”مجھے کیا بات کر سکتے ہیں؟“  
 ”وہی جو صاحت سے کہنی تھی۔“  
 ”یہ تو سراسر فاول ہے۔“ اس نے بمشکل ہونٹوں تک آئی ہنسی روک کر کہا۔  
 ”کیا کروں، وہ نہیں تو ہنسی اور تو نہیں تو کچھ نہیں۔“ وہ اچانک جذبات کی رو میں بہہ کر گنگنا لگا۔  
 ”تیرے نام سے یہی سچی ہوئی میری زندگی کی کتاب ہے مجھے دیکھنا یہی نصین ہے تیرے بعد سارا سراب ہے وہ اس کی دلکش آواز میں کھو گئی تھی۔“  
 ”صباح! علی جمائیکر نے پہلی بار اس کے نام کو مختصر کیا تو وہ چونک کر بولی۔

”جی۔“  
 ”آپ کو دیکھے ہوئے، آپ سے ملے ہوئے بہت دن ہو گئے بلکہ لگتا ہے زمانے بیت گئے۔ کچھ عرصہ“  
 ”حم کریں۔ ابھی آجائیں۔“ اس کے لہجے کی بے قراری دل میں پلچل مچا گئی۔  
 ”بہت مشکل ہے۔“  
 ”ناممکن تو نہیں ہے ناں، کوشش کریں پلیز۔“ اس کے عاجزانہ اصرار پر وہ سوچ میں پڑ گئی۔  
 ”ہیلو صاب! کیا ہوا؟“ کچھ انتظار کے بعد اس نے پکار کر پوچھا۔  
 ”کچھ نہیں، آئی مین میں کوشش کرتی ہوں اگر کامیاب ہوئی تو گھر سے نکلنے سے پہلے آپ کو فون کروں۔“  
 اس نے جلدی سے کہہ کر ریلوے پر رکھ دیا اور وہیں سے کچن کا رخ کیا۔  
 کچھ دیر بعد جب چائے لے کر ٹیبل کے کمرے میں آئی تو وہ بڑے آرام سے سو رہے تھے۔ کوئی اور ذرا وہ ہرگز انہیں نہ اٹھائی لیکن اب مجبوری تھی۔ علی جمائیکر کی خواہش کو رد کرنا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔  
 چائے کا کپ سائیڈ کارنر پر رکھ کر پہلے انہیں پکارا پھر آہستہ سے ان کا کندھا ہلایا تو وہ آنکھیں کھول کر

”آپ کو سونا تھا تو چائے کیوں نہ پلائی؟“  
 ”نہیں، مجھے سونا نہیں تھا۔ وہ اٹھ بیٹھ۔ لاؤ چائے کہاں ہے۔؟“  
 ”اس نے کپ اٹھا کر انہیں تھمایا پھر ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔  
 ”آپ کو پس جاتا ہے۔“  
 ”ہاں۔“  
 ”مجھے بھی لے چلیں۔ میرا مطلب ہے میں لائبریری جاؤں گی۔ آپ مجھے وہاں چھوڑ دیجیے گا۔“ اس نے بڑی سہولت سے کہا۔  
 ”نہیں کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ انہوں نے صاف منع کر دیا۔

”کہوں؟“  
 ”کیونکہ مجھے واپس میں دیر ہو سکتی ہے پھر تم کس کے ساتھ آؤ گی۔ ویسے بھی تمہیں ابھی امتحان کی تیاری کرنی پڑے گی۔“  
 ”لائبریری کی کتابوں کا کیا کرو گی۔“  
 ”نیل کی بات ٹھیک تھی۔ وہ مایوس سی ہو کر ان کے پاس سے چلی آئی اور ان کے کہیں جانے کا انتظار کرنے لگی۔  
 علی جمائیکر کو فون کر کے بتا کہ وہ اپنی کوشش میں ناکام ہو گئی ہے۔

\*~\*~\*  
 تین روزہ سیمینار کے بعد آسیہ کو اب فراغت ملی تھی تو اس نے سب سے پہلے مدیحہ سے واپس چلنے کی بات کی۔  
 ”اس کی اپنی ضد تھی۔“  
 ”مجھے نہیں جانا ماما میں یہیں رہوں گی۔“  
 ”یہاں رہنے کی کیا تک ہے۔ وہاں تمہارے امتحان ہونے والے ہیں۔ صاب تمہارا ایڈمٹ کارڈ بھی لے آئی۔“  
 ”پتو کس تاریخ سے پیپر شروع ہیں۔“ آسیہ نے حتی الامکان اپنے بچے پر کنٹرول رکھ کر کہا۔  
 ”ابھی کوئی امتحان نہیں دے رہی۔ مجھے یہاں ایڈمیشن لینا ہے اور میں نے صاب کو فون بھی کیا تھا کہ میری مارکس بٹ بیچ دے، کیوں نہیں بھیجی اس نے یہاں ایڈمیشن ہو رہے ہیں۔ ڈیٹ نکل گئی تو میرا ایک نہیں دو سال لپٹ جائیں گے۔“ مدیحہ کا انداز حتی تھا۔  
 ”فضول باتیں مت کرو۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔“ آسیہ چڑ گئی۔  
 ”نہیں ماما! اگر ماماوں جی اور ماما جی بھی یہ کہہ دیں کہ ان کے گھر میں میرے لیے جگہ نہیں ہے تب بھی میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔“ مدیحہ جانے اپنے دل میں کیا ٹھان چکی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اسے کسی کی پروا ہو تو اپنی بھی نہیں کہ اس کے ساتھ جو ہونا ہے ہو جائے۔  
 ”آسیہ! دیر سنائے میں آکر اسے دیکھتی رہی پھر بہت سنبھل کر نرمی سے بولی تو اس کے اُبے میں عاجزی در آئی۔

”ابا! تم ایسا کیوں کر رہی ہو، کیوں مجھے دکھ دیتی ہو۔“  
 ”میں دکھ نہیں دے رہی ماما، آپ سمجھیں۔ میرے وہاں ہونے سے آپ زیادہ پریشان نہیں بلکہ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔“ آسیہ نے زور دے کر کہا۔  
 ”ابا! اور میں اب بھی اگر گئی تو پہلے سے زیادہ کروں گی کیونکہ مجھ سے منافقت نہیں ہوتی۔ جو میرے اندر ہے وہ ظاہر کروں گی۔ میرے اندر نفرت ہے سب کے لیے۔ میں محبت ظاہر نہیں کر سکتی۔ آپ اگر اس گھر میں نہ جاتے ہیں تو مجھے یہیں رہنے دیں۔ بے شک یہاں باشل میں ڈال دیں اگر یہ خدشہ ہے کہ میں ماما جی کو تنگ کر دوں۔“  
 جس طرح آسیہ کی نرمی میں عاجزی در آئی تھی اسی طرح اس کی ہٹ دھرمی میں محسوس کی جانے والی آزدگی



تھی اور آسیہ ماں تھی جو بچوں کے احساسات ان سے زیادہ سمجھتی ہے۔ اس کی آزدگی پر تڑپ کر اسے اپنے ماتو اگایا۔  
 ”میری جان! مجھے تمہاری طرف سے کوئی خدشہ نہیں۔ میں تو صرف تمہیں اپنی نظروں کے سامنے رکھنا چاہتی ہوں۔“

”صاف ہے ناں ماما! آپ کے پاس بظاہر تو کوئی فرق نہیں ہے ہم دونوں میں۔“  
 اس کی بے وقوفی کی حد تک سادگی آسیہ کو حیران کر گئی۔ اس کا سراپے سینے سے لگا کر اس پر اپنی ٹھونک پڑی ہوئی کہنے لگی۔

”ایک بار میمونہ بھابھی نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہاری بیٹی مدح و ست ہے ووقوف ہے۔ تو میں مذاق سمجھ کر ہنسی۔ کاش وہ مذاق ہی ہوتا لیکن تم نے تو حد کر دی بیٹا۔ صاف صاف ہے تم کو۔ میرے دل میں تم دونوں کے ساتھ محبت الگ نہیں ایک جیسی ہے۔ تم نے تو وہ بات کی کہ سوئی تمہیں چھپے اور پی میں صبا کی انگلی میں بانٹھ دوں گا۔ وہ اسے اپنے سینے میں بھیج کر ذرا سانس دے گی۔ یہی سیما بھابھی آئیں اور اس منظر سے لطف اندوز ہو کر بولیں۔“

”واہ! یہاں تو تختیں لٹائی جا رہی ہیں۔ کچھ میری جھولی میں بھی ڈال دو۔“  
 ”کچھ کیوں بہت ہیں آپ کے لیے بھی۔ یہ تو وہ خزانہ ہے جتنا لٹاؤ اتنا بڑھتا ہے۔ کیوں مدح؟“ اس نے بھابھی سے کہہ کر مدح کا چہرہ ہاتھوں میں لیا تو وہ نظریں چرا کر بولی۔

”چاہے نہیں ماما! آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔“  
 ”اپنے دل کو محبتوں سے آباد کرو گی تو سمجھو گی۔ نفرتیں انسان کو کھوکھلا کر دیتی ہیں اور اکیلا بھی۔“

آسیہ نے اس کی پیشانی چومی پھر سیما بھابھی کو دیکھ کر کہنے لگی۔  
 ”کیا جاؤ کر دیا ہے آپ نے میری بیٹی پر۔ یہ میرے ساتھ جانا ہی نہیں چاہتی۔“

”ٹھیک تو ہے، میرے پاس رہے گی مدح۔ تم اس کے ساتھ زبردستی نہیں کرو۔“ سیما بھابھی نے اس کی گردن پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”زبردستی کی بات نہیں ہے بھابھی! وہاں اس کے امتحان ہونے والے ہیں۔ خواہ مخواہ سال ضائع کر دینا۔“  
 فائدہ۔ ”وہ رچ جو کر بولی۔“

”کوئی فرق نہیں پڑتا ایک سال سے۔ اس کی عمر نہیں نکل جائے گی۔ بس تم اس کی مارکس شیٹ وغیرہ یہ یہاں ایڈمیشن لے لے گی۔ ویسے تمہیں اس کے یہاں رہنے پر اعتراض کیوں ہے؟“ سیما بھابھی نے اسے ٹوکا۔

”میں کیا کہوں۔ جب آپ لوگ پہلے ہی طے کر چکے ہیں۔“ وہ سمجھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔  
 ”یہاں رہو لیکن دل لگا کر پڑھنا۔ کم از کم گریجویشن تو کرو۔“

”صرف گریجویشن ہی نہیں ماما! میں آپ کو اور بھی بہت کچھ کر کے دکھاؤں گی۔“ مدح نے خوش اس کا دل تھک کر سیما بھابھی کو اشارہ کرتی ہوئی ٹھیک بھائی کے کمرے میں آ گئی۔

ٹھیک بھائی کبل میں بیٹھنے لگی وی دیکھ رہے تھے۔ اسے دیکھا تو ریموٹ کنٹرول اٹھا کر وہیں سے اٹھ کر بولے۔  
 ”آؤ بیٹا! تمہارے سینما رز کا سلسلہ ختم ہوا یا نہیں۔“

”ہو گیا۔“ وہ آرام سے صوفے میں دھس کر بیٹھ گئی۔ ٹانگیں بھی اور سمیٹ لی تھیں۔  
 ”سرور ہے یہاں کبل میں آ جاؤ۔“ ٹھیک بھائی نے دوسرے کبل کی طرف اشارہ کیا۔

”بس تھک ہے آرام سے ہوں۔ آپ بیوی دیکھ رہے تھے؟“  
 ”ہاں بس کوئی خاص پروگرام نہیں تھا۔ تم سناؤ کوئی نئی مازہ۔“

مدح کی طرف سے اطمینان نہیں ہو رہا تھا۔  
 ”نہیں۔ وہ تو بہت اچھی بچی ہے۔ میرا خیال ہے تم نے اس پر بے جا سختی کی ہے۔ جب ہی وہ تمہارے کرتی ہے۔ یہاں تو بالکل ٹھیک ہے اور اسے یہیں رہنے دو۔ وہ یہاں ایڈمیشن کی بات کر رہی ہے۔ ٹھیک رہنے دو۔“ ٹھیک بھائی نے مدح کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک بھائی! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا اس لڑکی نے تو مجھے۔“  
 ”ہاں تمام اس کی فکر نہیں کرو۔ یہ میری ذمہ داری ہے۔ تم صرف صبا کا سوچو۔“

”ٹھیک بھائی نے ٹوک کر کہا تو وہ خاموش ہو کر جانے کیا سوچنے لگی۔ کبھی سیما بھابھی چائے لے کر آئیں اور مدح کے دیکھ کر میاں سے پوچھنے لگیں۔

”مسئلہ ہے؟“  
 ”مسئلہ نہیں۔ ہاں آسیہ! ہم کوئی نئی مازہ سن رہی تھیں۔“ ٹھیک بھائی نے بیوی کو جواب دے کر اسے متوجہ کرنے کے لیے کہا۔

”نہیں! مسئلہ نہیں ہے۔ تم نے تو وہ بات کی کہ سوئی تمہیں چھپے اور پی میں صبا کی انگلی میں بانٹھ دوں گا۔ مجھے صبا کے بارے میں مشورہ کرنا تھا۔ اس کے لیے ایک پروپوزل آیا ہے۔ لڑکا ماشاء اللہ ہر لحاظ سے اچھا ہے۔“

”اگر ضرور ہے۔ اس لیے میں کچھ ڈر رہی ہوں۔“  
 ”ب قسم کی باتیں ہیں۔ قسمت اچھی ہو تو غیر اسے ہو جاتے ہیں۔ نہیں تو اپنیوں کو غیر ہونے میں دیر نہیں۔“

”سیما بھابھی کا اشارہ احمر کی طرف تھا۔ وہ سمجھ کر ان کی تائید کرتے ہوئے بولی۔  
 ”تو اب تھک کر رہی ہیں لیکن ادھر وہ لوگ شادی بھی جلدی کرنا چاہتے ہیں۔“

”اگر اچھا رشتہ ہے تو کرو۔ منع نہیں کرو۔ لڑکیوں کی عمر ذرا زیادہ ہو جائے تو پھر اچھے رشتوں کا مسئلہ ہو جاتا ہے لڑکا کرنا ہے لڑکا؟“

”ٹھیک بھائی نے فوراً ”مشورے کے ساتھ پوچھا تو وہ تفصیل سے علی جمائیکر کے بارے میں بتانے لگی۔  
 ”اسی دن آسیہ واپس آئی تو اسے اکیلے دیکھ کر صبا حث نے پہلا سوال مدح کے بارے میں کیا۔“

”مدح نہیں آئی ماما؟“  
 ”نہیں بیٹا! وہ وہاں خوش تھی پھر تمہارے ماموں جی اور ماما جی کا بھی اصرار تھا کہ اسے وہیں رہنے دوں! اس نے مجبور ہو گئی۔ تم کل ہی اس کی مارکس شیٹ وغیرہ بھجوا دیتا۔“ آسیہ نے بتا کر آخر میں تاکید کی تو وہ روپائی

”آپالہ وہ ہمیشہ وہیں رہے گی۔“  
 ”نہیں کیوں ملی اے مگر کے آجائے گی۔“ آسیہ نے یوں کہا جیسے یہ دو سال نہیں دو دن کی بات ہو۔

”آپالہ صرف نہیں ماما! میرا اس کے بغیر دل نہیں لگتا۔ آپ اسے فوراً واپس بلا لیں۔“  
 ”مگر کیا کرنا؟ جب وہ اتنا ہی نہیں چاہتی۔ کم کم کوشش کر کے دیکھو شاید تمہاری بات مان لے۔“ آسیہ نے خود

”فوری طور پر کر کے بات اس پر ڈال دی۔“  
 ”تو وہ پہلی ہی جواب دے چکی ہے بلکہ دھمکیاں بھی دے رہی تھی۔“

”تو تم نے کچھ مدت کمو۔ وہ اگر خوش ہے تو ٹھیک ہے۔“ آسیہ نے بات ختم کر دی پھر قدرے توقف سے

”نہیں۔“ ”میرا کوئی فون تو نہیں آتا تھا۔؟“  
 ”نہیں نہیں! ایک خاتون کا فون آیا تھا۔ پوچھ رہی تھیں آپ کب آئیں گی۔؟“ وہ روانی میں بتا کر نظریں

”مگر ذہن میں پہلا خیال عارف بیگم کا آیا اور اس سے تصدیق کرنے کی بجائے اپنے آپ سے بولی۔  
 ”بیگم کا ہو گا خیر تم تاؤ امتحان کی تیاری ہو رہی ہے ناں۔“

”شما باش۔“ آسہ اس کا گل تھپک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

پھر اگلے روز اس کے ٹھیک جانے سے پہلے عارفہ بیگم آن موجود ہوئیں اور مسلسل اس کے پاس اصرار کرتی رہیں۔ بڑی مشکل سے وہ انہیں آئندہ پر مال سکی اور یہ بھی کہہ دیا کہ اب وہ خود ہی نہیں فون اور اس کے لیے انہیں صبح کے امتحان ختم ہونے تک انتظار کرنا پڑے گا جبکہ خود اسے شاہ سکندر انتظار تھا جو کام اس نے عدل بھائی کے لیے سوچا تھا وہ شاہ سکندر نے اپنے ذمہ لے لیا تھا تو اس کے خیال اسے اس سلسلے میں کسی تردد کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ شاہ سکندر نے اس کے ساتھ اچھا لیا یا برا نہ پالے تو اچھا ہی سوچیں گے۔

انسان ہمیشہ سے تقدیر کے سامنے بے بس ہے۔ جو بات ہوتی ہے اس کے لیے پہلے سے تیار واقعات جیسے ترتیب سے لکھ دیے جاتے ہیں۔ اتنے برسوں سے پہلے تو ہمیں شاہ سکندر سے اس طرح ہوا تھا۔ عین اس وقت کیوں جب بی بی کی قسمت کا فیصلہ ہونا تھا۔ اس نے اس اتفاق کو سوچا بھی تو وقت اور ان ہی پر بھروسہ بھی کر لیا کہ وہ باپ ہیں، انہیں زیادہ حق ہے اور وہ زیادہ بہتر مشورہ دے سکتے ہیں اور مشورے سننے کے لیے اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تیسرے دن جب وہ مریضوں سے فارغ ہو کر آرام وارڈ کے راولڈر نکل رہی تھی کہ شاہ سکندر کا فون آگیا۔

”ہیس ڈاکٹر آسہ امپیکٹ۔“ اس نے دروازے سے واپس پلٹ کر ریسورٹ اٹھایا تھا۔

”کیسی ہیں ڈاکٹر صاحبہ آپ؟“ شاہ سکندر نے بظاہر رسمی انداز میں پوچھا لیکن ان کے لہجے میں تھپی جو پہلے اندر بالکل چھپائی تھی اور اب دل دھپنے لگتا تھا۔

”جی، میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ بہت مستعجل کر بولی تو کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی کیونکہ وہ کر رہے تھے کہ وہ بھی ان کا احوال پوچھے گی، ”سا“ ہی سہی پھر اس کی طرف سے یاس ہو کر ہی بولے تھے۔

”وہ آپ کا ایک کام تھا میرے ذمہ اور اس سلسلے میں کچھ کہنے سے پہلے مجھے یہ پوچھنے کی اجازت۔ آپ میری فراہم کردہ معلومات پر یقین کر لیں گی۔“

”یقین کرنا میری مجبوری ہے سکندر حیات! کیونکہ دنیا کا کوئی باپ کم از کم اپنی بیٹی کا برا نہیں سوچنے بہت سہولت سے جتا دیا۔

”آپ ہمیشہ سے بہت ذہین ہیں آسہ! لیکن افسوس اپنے معاملے میں آپ نے اپنا ذہن استعمال نہ ذرا سی سمجھ داری سے کام لیتیں تو۔۔۔“

”پلیز۔“ وہ ٹوک کر بولی۔ ”آپ مجھے علی جانگیر کے بارے میں بتائیں۔“

”اچھا لڑکا ہے۔“ وہ فوراً شروع ہو گئے۔ ”خاندان بھی اچھا ہے۔ میں دینی میں اس کے باپ ہوں۔ اگر آپ مجھ سے پوچھیں گی تو میں یہی کہوں گا کہ اپنی بیٹی کے لیے یہ جتنا اچھا سوچ سکتا تھا تو سے بھی بڑھ کر ہے۔ ہی آڈوری اسٹوٹ بوائے۔ آج وہ بس مقام پر ہے اس میں زیادہ اس کی اپنی ہے۔ خدا کے بعد خود پر بھروسہ کرنے والے اسی طرح کامیاب ہوتے ہیں۔ وہ انشاء اللہ مزید ترقی آپ کو فوس تو نہیں کر سکتا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اس سے اچھا پڑوئل اور ہوی نہیں سکتا۔“

وہ جو پوری توجہ سے سن رہی تھی۔ ان کے خاموش ہونے پر پوچھ انداز میں بولی۔

”اس کا مطلب ہے مجھے ہابی بھرنی چاہیے۔“

”بہتر تو یہی ہے، آگے آپ کی مرضی۔“

”اوکے بہت بہت شکریہ۔“

”دک بات کا۔“ شاہ سکندر نے فوراً پوچھا لیکن اس نے بڑے آرام سے ریسورٹ رکھ دیا اور رات وہ کافی حد تک مطمئن ہو گئی تھی۔ بس ایک ٹھنک تھی کہ وہ اتنی جلدی صبا کی شادی نہیں کرنا چاہتا کہ وہ اپنے اس کرلیٹی پھر لیکن عارفہ بیگم نے اپنی پہلی آمد پر ہی کہہ دیا تھا کہ انہیں فوراً ”شادی کرنا“

چے میاں کے پاس دینی جانا ہے اور انہوں نے مزید اپنی کچھ مجبوریاں بتائی تھیں۔

رات آسہ دیر تک اماں جی، ابا جی، خلیل بھائی اور میوہ بھابی کے ساتھ بیٹھی ان سے مشورہ کرتی رہی پھر عقدہ فیصلہ ہی تھا کہ اگر وہ اس رشتے پر مطمئن ہے تو پھر اسے شادی میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ جہاں تک باپ کے کرنے کی بات ہے تو وہ شادی کے بعد بھی کر سکتی ہے۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ یوں اس طرف سے جی ہو کر اس نے صاحت کے امتحانوں تک خاموشی اختیار کر لی اور جس روز وہ آخری پیپر سے فارغ ہوئی، آسہ نے عارفہ بیگم کو فون کر کے اگلے روز رات کے کھانے کی دعوت دے ڈالی اور علی جانگیر کو بھی ساتھ بلاتا۔

\*~\*~\*

جانگیر گاڑی کے ساتھ ٹپک لگائے بہت خاموشی سے وہ سارے لوازمات دیکھ رہا تھا جو عارفہ بیگم کرم دین گاڑی میں رکھوا رہی تھیں۔ ایک دو بار اس نے ٹوکا بھی کہ انہوں نے صرف کھانے پر بلایا ہے اور تو کچھ بچہ سب لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ جس پر عارفہ بیگم نے یہ کہہ کر اسے خاموش کر دیا کہ تمہیں بلانے پر یوں ہی نہیں بلایا۔

جانگیر کے مرحلہ تمام ہوا تو اس نے شکر کرتے ہوئے جلدی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور رابعہ کو کلم سے بیٹھنے کو کہا تو وہ ہنستی ہوئی بولی۔

”کہ بہت جلدی ہے۔“

”کچھ آٹھن کر رہے ہیں۔ تم کیا چاہتی ہو۔ عین کھانے کے وقت پر پینیں۔“ اس نے ٹار انگی سے کہہ کر کوٹکھا اور ان کے بیٹھنے ہی گاڑی اشارت کر دی۔

کافی خوش تھی۔ تمام راستہ اس سے مذاق کرتی رہی جبکہ عارفہ بیگم کا کچھ بتا نہیں چل رہا تھا کہ آیا اب وہ نئے خوش ہیں یا بابا جان کی وجہ سے مجبور ہیں اور اگر مجبور تھیں تب بھی آسہ اور اس کے تمام گھر والوں نے انہوں نے نہیں ایسا کوئی تاثر نہیں دیا۔ اس کے برعکس جیسے ان کی دلی مزبور آئی ہو۔

رے صبر کا بہت امتحان لے لیا آپ نے۔“ کھانے کے بعد عارفہ بیگم نے آسہ کے سامنے باقاعدہ اپنا باول۔ ”آپ تو خوش ہماری جھولی میں ڈال دیں۔“

اسے نہیں۔ اماں جی اور ابا جی سے نہیں۔“ آسہ نے اپنے بوڑھے ماں باپ کو دیکھتے ہوئے کہہ کر عارفہ بیگم انہیں خان کی طرف موڑ لیا۔

پکا امانت ہے۔“

اس قدر کہ کر خاموش ہو گئے کیونکہ انہیں وہ وقت یاد آگیا تھا جب انہوں نے یہی الفاظ آسہ کے لیے اس وقت سامنے شاہ جانگیر تھے اور اب انہیں کیا خبر تھی کہ اس جگہ ان کا بیٹا برا بھلا نہ ہے۔

سب مل مبارک سلامت کا شور۔ پھر عارفہ بیگم گاڑی میں سے مٹھائی اور دیگر سامان نکلوا کر لے آئیں تو علی جانگیر کی جگہ گئی تھی اور جانے وہ کس کوٹے میں چھپی تھی جسے دیکھنے کو علی جانگیر کا بے تاب دل بری رہا تھا۔

”میں صبا کے پاس جا رہی ہوں، کوئی پیغام؟“ رابعہ نے مٹھائی کی پلیٹ اٹھا کر سرگوشی میں اسے اطلاع دیا تو پوچھا تو وہ اس سے دیکھ کر رہ گیا کیونکہ اس کے ساتھ ہی خلیل بھائی بیٹھے تھے۔

”ابا جان! عارفہ بیگم کے ساتھ اوپر آئی اور مٹھائی کی پلیٹ صبا کے آگے کر لی ہوئی شوخی سے بولی۔

”ابا جی منہ میٹھا کر لیں۔ کیا یاد کر سکیں۔“

”ابا جی سے آخر میں مٹھائی ملی۔“ عارفہ نے فوراً ”نکڑا لگا تو رابعہ کچھ خجل سی ہو کر بولی۔

”ابا جان! یہ سب سے پہلے حق تو ان کا تھا۔“

”سب سے پہلے حق کی تلفی ہو گئی۔ اب اس کا ازالہ کون کرے گا۔“

بھی دخل انداز مت ہونے دناور نہ بہت ڈسٹرب ہو جاؤ گے۔“  
 پھر کے اندر لیکنٹ سناٹا چھا گیا۔ کوئی ایسی بات تو نہیں کی تھی شاہ سکندر نے بلکہ شاید اسے خبردار کیا تھا۔  
 اسے بری طرح محسوس ہوئی تھی۔ گویا اب تک اس کی حیثیت صرف کھ پٹی کی سی تھی۔ وہ اپنی محبت  
 نے نہیں بلکہ باباجان کی حکمت عملی سے اپنی منزل تک پہنچا تھا۔ یہ بات جب اس لڑکی کو معلوم ہوگی  
 جو محبت سے حاصل کیا ہے تو وہ اس کی محبت پر کب یقین کرے گی۔ کبھی نہیں۔ ساری زندگی وہ اس کے  
 ستارے گا۔

دو ریسپوررھ کر ادھر سے ادھر ٹھٹھٹھ لگا۔ اس کا ذہن بری طرح منتشر ہو گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا  
 معا فون کی بیل پر اس کے قدم جہاں تھے وہیں رک گئے لیکن اسے ریسپور اٹھانے کا خیال نہیں آیا۔  
 بجے کے بعد فون خاموش ہو گیا۔ تب بھی اسے احساس نہیں ہوا۔ عجیب موڈ تھا۔ جب منزل دو گام رہ گئی  
 اگلے شدہ راستوں میں الجھ رہا تھا۔

رابعہ نے اس کا دروازہ کھیل کر اسے پکارا تو وہ ایسی ہی الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔  
 میرا تو خیال تھا آپ خوشی سے جمو رہے ہوں گے لیکن آپ تو ایسے لگ رہے ہیں جیسے کوئی افسوس  
 آپہ۔“ رابعہ نے اس کے افسردہ چہرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

شباب۔  
 بے بھائی کیا ہوا ہے؟“ رابعہ قدرے متوحش ہو گئی۔  
 میں کئی احوال تم جاؤ یہاں سے۔ میں سو رہا ہوں۔“ وہ کوٹا تارتا ہوا ڈیرنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔  
 باتیں آپ نے فون کیوں نہیں اٹھایا۔ ادھر باباجان بات کر رہے ہیں۔“ رابعہ نے قدرے اوچی آواز  
 نہ وہاں سنی کرتا ہوا ڈیرنگ روم میں بند ہو گیا۔

\*-\*-\*

ثوبہ اور عمرا بھی اس کے پاس سے اٹھ کر گئے تھے اور اس نے سکون کا سانس بھی نہیں لیا تھا۔ نہ نیں  
 کہ انہوں نے ان تینوں کی طرح اسے تنگ نہیں کرنا تھا پھر بھی ان کی آمد سے وہ اندر ہی اندر پریشان  
 ہو نظری شرم تھی جو اس کا سر آپ جھک گیا۔

میں پوچھنے آیا تھا کہ تم نے کھانا کھایا یا نہیں۔“ نبیل نے اس کی جھجک سمجھتے ہوئے قصداً کچھ بے خبری  
 اختیار کیا تاکہ وہ آرام سے بات کر سکے۔

ہوائے زبردستی کھلا دیا تھا۔ حالانکہ اس وقت مجھے بھوک بھی نہیں تھی۔ آپ نے کھالیا۔؟“ اس نے  
 کھانا تو چھوٹا میل بیٹھتے ہوئے بولے۔

مادر چائے بھی پی لی۔ تمہاری چھٹی ہو گئی۔ اس وقت چائے نہیں بنانی پڑے گی تمہیں۔“  
 بتایا کہ رہے ہیں جیسے میں چائے بنانے سے کتراتا ہوں۔“ اس نے شاکا نظروں سے دیکھا تو وہ ہنس

نہ خیر تم کسی کام سے نہیں کتراتیں وہ تو۔“  
 نہ ہے تو اپنا کام بھی نہیں کرتی۔“ وہ فوراً بول پڑی۔

نہ خیر لڑکی ہے وہ بھی۔ اب دیکھو وہاں جا کر رہ گئی۔ پھوپھو نے بھی اجازت دے دی اسے۔ اگر مجھے  
 نہیں سمجھی اسے بھیجے کا مشورہ دیتا۔“ نبیل کو اب افسوس ہو رہا تھا۔  
 ہنسے تو کھانا تو زیادہ غرض کہیں نہیں رہ سکتی۔“ اس نے یاد دلایا۔  
 نہیں رہ سکتی۔ ابھی بھی وہ خوشی سے وہاں نہیں رکی ہوگی۔“ نبیل نے یقین سے کہا۔

نہ خیر اسے بہت مس کرتی ہوں۔“  
 میں تو عادت ڈال لیتی چاہیے اس کے بغیر رہنے کی۔ کیونکہ تم خود یہاں کچھ وقت کی مہمان ہو۔“ نبیل

”علی بھائی۔“ رابعہ فوراً بولی۔ ”ہلاؤں انہیں۔“  
 ”اے واہ! آپ تو کچھ زیادہ ہی فری ہو رہی ہیں۔ صرف مٹھائی کھا کر آپ کے علی بھائی میڈم میں نہ  
 سکتے۔“ سونپا نے کہا۔

”تو پھر انہیں نیچے لے چلتے ہیں۔“  
 ادھر ان کی نوک جھونک جاری تھی اور نیچے عارفہ بیگم جلدی شادی پر اصرار کر رہی تھیں اور آسہ اور  
 تھی لیکن تیاری کی ہمت ضرور چاہتی تھی جس کے لیے عارفہ بیگم کو دو تین مہینے بھی بہت کم رہتے تھے۔

”کیا تیاری کرنی ہے آپ کو؟ زیور، کپڑا، کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ اس  
 مجبوریاں ہیں جو میں اتنی جلدی کر رہی ہوں۔ دینی میں علی کے والد کو کھانے وغیرہ کی پرالیم ہے۔ میں صرف  
 شادی کر کے وہاں جاؤں تو یہاں علی اکیلا ہو جائے گا۔ اس لیے میں چاہتی ہوں اس کا گھر بھی بسا کر۔“

سے زیادہ مہینے لے لیں آپ۔“  
 عارفہ بیگم نے نئے سرے سے اپنی مجبوریاں گنوا کر فٹ سے کہا تو آسہ شش و پنج میں کبھی امان  
 دیکھتی تھی، کبھی خلیل بھائی اور میمونہ بھانجی کو۔ آخر میں قریب بیٹھے نبیل سے سرگوشی میں پوچھنے لگی۔

”تم کیا کہتے ہو بیٹا۔؟“  
 ”میں کیا کہوں؟“ نبیل کی پوچھیں۔“ نبیل کی کہہ سکتے تھے۔  
 آسہ نے اباجی کو دیکھا لیکن وہ متوجہ نہیں تھے جبکہ عارفہ بیگم اس پر نظریں جمائے بیٹھی تھیں اور

سننے کے لیے بڑی بے تاب نظر آ رہی تھیں۔ تب وہ باہمی بھرتی ہوئی بولی۔  
 ”نیک ہے، دو مہینے بعد لیکن میں یہ ضرور کہوں گی کہ صبا نے ابھی تھوڑا سا امتحان دیا ہے  
 آپ اسے لی اے ضرور کرائیے گا، اگر آپ کے ساتھ مجبوری نہ ہوتی تو میں اس کے لیے اسے کرنے

کی شادی کر لیتی۔“ علی اسے بی اے کیا ایم اے بھی کرائے گا۔“ عارفہ بیگم خوش  
 ”اس کی آپ فکر نہ کریں۔ علی اسے بی اے کیا ایم اے بھی کرائے گا۔“ عارفہ بیگم خوش

وقت تاریخ طے کر کے ہی اٹھی تھیں۔  
 پھر گھر آتے ہی علی جہا نکیر نے سب سے پہلے شاہ سکندر کے نمبر ڈائل کیے تھے کیونکہ منجھانہ  
 کی بھی کہ آج آسہ کے ساتھ جو بھی معاملہ طے ہو، وہ سب سے پہلے انہیں بتائے۔ یہ تاکید بابا  
 بھی تھی لیکن انہوں نے سب سے پہلے کی شرط نہیں رکھی تھی اور اگر رکھتے تب بھی شاید

سے رابطہ کرنا۔  
 ”میں شاہ سکندر حیات۔“ ان کے انداز میں بے دھبائی تھی۔  
 ”السلام علیکم چچا جان۔“ اس نے سلام کیا تو اس بار جیسے وہ پوری جان سے متوجہ ہوئے

وہنا بھول گئے اور بے آہی سے پوچھا۔  
 ”ہاں، کوہینا کس بار۔؟“  
 ”سب طے ہو گیا چچا جان۔“ آئی مین ڈاکٹر آسہ نے نہ صرف رشتے پر باہمی بھرتی ہے بلکہ

شادی کی تاریخ بھی دے دی ہے۔“ علی جہا نکیر نے خوش خبری سنا کر انہیں حیران کر دیا۔  
 ”واقعی۔ کب کب بے شادی۔؟“  
 ”اپریل کے پہلے ہفتے میں۔“

”دیر کی گڈ، باباجان کو بتا دیا تم نے۔؟“  
 ”جی نہیں، آپ نے کہا تھا سب سے پہلے آپ کو بتاؤں۔ اب باباجان کو آپ بتاؤں۔“  
 پوچھا تو شاہ سکندر یہ ذمہ داری اس پر ڈال کر ہنسنے لگے۔

”تم، تم، بتانا اور اس سے پہلے میری ایک بات سن لو مٹا کہ شادی کے بعد تم اپنے  
 222

”بی تھی مدحو۔“  
 جانے کے سوا اور آتا ہی کیا ہے، ہونم۔! اس نے سگ کر سر جھٹکا۔

”نک کہہ رہی ہو۔ وہ دلوں سے کہتی ہے۔“  
 نے کہاں کھو گئے تھے۔ وہ کچھ دیر انہیں دیکھتی رہی پھر چائے بنانے کا کہہ کر وہیں سے واپس پلٹ گئی

\*-\*-\*

اپنے جذبات چھپانے میں ہمیشہ سے کمال حاصل تھا لیکن اس وقت جانے انہوں نے کوشش نہیں  
 ہم ہو گئے تھے جو فون پر عارفہ بیگم سے آسیہ کی رضامندی کے ساتھ شادی کی تاریخ دینے کا سن کر وہ  
 نے قابو ہو گئے تھے اور بال کرے میں ہنکراتی ہوئی آواز میں شاہ جہانگیر کو پکارا کہ ان کے ساتھ ادھر  
 جان بھی گھر آکر اپنے کمرے سے نکل آئی تھیں۔

خیر النساء بھی پہلی کے بعد دوسری بیڑھی پر پاؤں رکھتی ہی وہیں رنگ تمام کر کھڑی ہو گئی تھیں۔  
 یہ بوجہ گھر اہتمام سے بیٹے کی بات پتی ہوئی۔ ”بابا! آواز میں غیر معمولی گونج تھی۔  
 نے میں مٹھائی تقسیم کراؤ یوں کی ماں۔ علی کی شادی طے ہوئی۔ یہ بی بی شان سے اس کی بات لے کر  
 لہو لہو کر رخصت کر کر اپنے پیسے اسی حویلی میں لے کر آئیں گے۔ بہت چھپا لیا ڈاکڑنی نے اسے، ہم  
 ہماری باری ہے۔“

خیر النساء نے نخوت و تنفر سے سر جھٹکا تھا۔  
 بی بی سے سمجھ کر بھی نہیں سمجھ رہی تھیں۔

نہ نے آگے آکر بابا جان کا بازو تھام لیا اور دھیرج سے کہنے لگے۔

بہت تھک ہے بابا جان! لیکن اس طرح بی بیانی بات بکڑ سکتی ہے۔ عین وقت پر اگر آسیہ نے انکار کر دیا  
 بدنامی ہو جائے گی۔

نہ نے ان کی بات سمجھ کر چند لمحوں کے لیے خاموشی اختیار کر لی پھر کھنکھار کر پہلے گلا صاف کیا اس کے بعد

نہ کے سارے انتظامات یہیں سے ہوں گے اور بارات بھی یہاں سے جائے گی پھر ہم علی کے گھر رک کر  
 نہ گئے جب ادھر نکاح ہو جائے گا تب ہم خود جا کر دلن کو رخصت کرا لائیں گے۔“

خیال ہے بابا جان یہاں سے کسی کو جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ علی سے کہہ دیتے ہیں وہ دلن کو  
 نہ لے آئے گا۔ ”شاہ جہانگیر غالباً“ کوئی بد مزگی ہمیں چاہتے تھے۔

بابا جان! ہمارے علی کی شادی ہو اور ہم شریک نہ ہوں یہ تو ممکن ہی نہیں ہے پھر ہم نے سکندر سے  
 نہ اس کی بیٹی کو ہم شاہ علی جہانگیر کے ساتھ رخصت کرا کر لائیں گے۔ ”بابا جان کے منہ سے جو پہلی  
 نہ اس سے بے کو تیار نہیں تھے۔

بی بی مرضی۔ ”شاہ جہانگیر نے ان کی ضد سمجھ کر ہتھیار ڈال دیے۔  
 وہاں سے اسے بھی اطلاع کرو۔ اس کی بیٹی کی شادی ہے۔“

بابا جان! سکندر کا خیال آیا تھا اور اوپر بیڑھیوں پر کھڑی خیر النساء چیخ کر کہیں۔  
 نہ اس ایک بیٹی ہے الماس اور کوئی نہیں۔“



خیر النساء کی بات سے زیادہ اس کا چیخ کر کہنا ناگوار گزار تھا اور یہ تھی بھی انہونی۔ بھلا ان کے سامنے  
 نہ اس کی آواز میں بات کی تھی۔

کے سیدھے سادے انداز کے باوجود وہ پل ہی ہو گئی اور ان کے پاس سے اٹھنے کا ہانا سونے لگی۔ مشکل  
 وہ اس کے کمرے میں بیٹھے تھے اس لیے فوری طور پر کوئی ہانا سمجھ میں نہیں آیا تو بات بدلتی ہوئی کہنے لگی۔  
 ”آج شہر کا فون آیا تھا۔ ٹیلی بھائی وہ کہہ رہی تھی۔ کچھ وقت نکال کر اسے پر دھا یا کر رہیں۔“

”بابا! عدیل چاچو نے بھی کہا تھا مجھ سے اور میں اب تک اپنے وقت کی سیٹنگ نہیں کر پایا۔ کوشش  
 کہ۔“ فون کی نیل سے ان کی بات ادھوری رہ گئی۔

”اس وقت مدحو ہوگی۔“ وہ کہتی ہوئی بھاگ کر لابی میں آگئی اور ریپور اٹھایا تو دوسری طرف واقعی مدحو  
 اس کی آواز سنتی ہی کہنے لگی۔

”بہت کمینہ ہو تم۔ بتایا ہی نہیں کہ تمہاری شادی ہو رہی ہے۔“  
 ”میں کیا بتاتی۔ مجھے خود ابھی ابھی پتا چلا ہے کہ ماما نے میری شادی طے کر دی ہے۔“ اس نے مدحو  
 ناراضگی کے خیال سے خود کو بے خبر ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

”کیو مت نہ تو نہیں ہو سکتا۔ ابھی رشتہ آیا اور ابھی شادی طے ہو گئی۔ آخر کچھ سلسلہ تو چلا ہوگا۔“ مدحو  
 فوراً ”لوک کر جاتا تو وہ اندر ہی اندر خائف ہو کر کہی۔

”ہاں سلسلہ تو کافی دنوں سے چل رہا تھا لیکن مجھے یہ کب معلوم تھا کہ ماما بھی بھریں گی۔“  
 ”تم سے پوچھتے بغیر تو ابھی نہیں بھری ہوگی۔“ مدحو شاکی تھی۔

”جی نہیں! ماما نے مجھ سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی۔ نہ کسی کے ذریعے سے میری رائے پوچھی  
 چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ اب تم کب آ رہی ہو۔“ اس نے اپنی صفائی دینے کے بعد پوچھا تو مدحو لاپرواہی  
 بولی۔

”نظارہ ہے تمہاری شادی رہی آؤں گی۔ ماماں جی اور ماما جی کے ساتھ۔“  
 ”ہائے نہیں مدحو! ایسے نہیں کرو۔ ماماں جی اور ماما جی تو عین وقت پر آئیں گے جبکہ میں اس وقت  
 شدت سے تمہاری کمی محسوس کر رہی ہوں۔ تم جلدی آ جاؤ پلیز۔“

اس کی منت کا مدحو پر کوئی اثر نہیں ہوا۔  
 ”کسے آ جاؤں۔ یہاں میری کلاس شروع ہو گئی ہیں اور ہاں تمہارے پیپر کیسے ہوئے۔“

”تھک ہوئے ہیں۔“ وہ روٹھے لہجے میں بولی۔  
 ”چلو تمہیں کون سا آگے بڑھنا ہے۔ آرام سے گھر واری کرنا۔ ویسے کرتے کیا ہیں موصوف بلکہ پہلے

ہیں کیسے۔“ ”مدحو اچانک مشتاق ہو گئی تھی۔  
 ”مجھے نہیں پتا، خود آ کر دیکھ لو۔“ اس کا لہجہ ہنوز تھا۔

”کیا مطلب؟ کیا تم نے دیکھا بھی نہیں۔“  
 ”نہیں۔“ وہ صاف مکر گئی۔

”یا علی تو نہیں ہو گئیں۔“ بغیر دیکھے شادی کرو گئی اور یہ ممانا تھی تو کسی کب سے ہو سکتی جو تم  
 تمہیں دکھایا۔ اپنے آپ فیصلہ کر لیا اور تم نے مان بھی لیا۔ آخر ایسی کیا مجبوری ہے تمہارے ساتھ۔“ مدحو  
 کی سعادت مندی سے چڑھی تھی۔

”کوئی مجبوری نہیں۔ مجھے ماما پورا بھروسہ ہے۔“  
 ”پھر تو تمہارا اللہ ہی حافظ ہے۔“ مدحو کی استہزاء نے اسے سخت گراں گزری۔

”بہت بد تمیز ہو تم۔ میں خواجہاں نہیں مرس کرتی ہوں حالانکہ تمہارے بغیر یہاں بڑا سکون ہے۔“  
 نہیں۔ سب بہت خوش ہیں۔ پتا ہے ابھی یہاں۔“ اس کی بات جاری تھی کہ ادھر سے مدحو نے سلسلہ  
 کر دیا۔

وہ ریپور پتھر کر رہی تھی کہ اپنے کمرے میں آئی تو نیل ابھی تک وہیں بیٹھے تھے۔ اسے دیکھتے ہی پوچھنے

مہر النساء کی اتنی جرات پر بی بی جان پریشان ہو گئیں۔ شاہ جہانگیر الگ ہو کھلا گئے تھے پھر بھی اس سے بیزار باباجان، مہر النساء کی بدتمیزی پر اسے سخت الفاظ میں کچھ کہتے، وہ بولی بڑے۔  
 ”تم اپنے کمرے میں جاؤ مہر النساء! تمہارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔“  
 ”قیوں نہیں، میں ہر اس معاملے سے تعلق رکھوں گی جس میں شاہ کا نام آئے گا۔“ مہر النساء، باباجان کو کڑے تیور دیکھنے کے باوجود اپنی جگہ جم کر کھڑی تھی۔  
 ”ہمیں طیش مت دلاؤ مہر النساء! ورنہ ہم ابھی اسی وقت تمہارا شاہ سے تعلق توڑ دیں گے اور اس کے ہمیں کچھ زیادہ تردد نہیں کرنا پڑے گا۔“ باباجان نے ایک ہی وار میں اس پھری ہوئی عورت کے پیر اٹھا دیے تھے کہ اس بار وہ بولی تو اس کی آوازیں وہ غفر نہیں تھا۔  
 ”پھر بھی اس طوائف کی بی بی یہاں نہیں آئے گی۔“ اس کے ساتھ ہی وہ دو سیڑھیاں بھلا نک کر تینوں اپنے کمرے میں چلی گئی۔  
 ”باجاگل ہے۔۔۔۔۔“ شاہ جہانگیر نے اس انداز سے کہا کہ باباجان اس کی باتوں کو کوئی اہمیت نہ دیں۔  
 ”مسئلہ تو نہیں بنے گی؟“ باباجان نے پر سوچ انداز میں شاہ جہانگیر کو دیکھا۔  
 ”نہیں، آپ چھوڑیں اسے اور بی بی جان کو سارا پروگرام سمجھائیں کیونکہ یہاں کے سارے انتظام تو ان ہی کرتے ہیں۔“ شاہ جہانگیر نے خوبصورتی سے ان کا دھیان ہٹا دیا تھا۔

\*~\*~\*

علی جہانگیر جتنا سوچتا اسی قدر الجھ رہا تھا۔ اسے محبت میں دھاندلی کسی طور مناسب نہیں لگ رہی تھی مسئلہ یہ تھا کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ البتہ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ صباحت کو اعتماد میں لے کر اس پر اپنا نظا پر کر دے اور اس سب سے سوجا بھی لیکن صباحت کی بزدلی سے خائف تھا کہ وہ بھی اس کے لیے بے رحم ہو سکے گی۔ اس تمام عرصے میں وہ اسے اتنا تو جان گیا تھا کہ محبت سے دستبرداری میں خواہ اس کی جان کیوں جائے وہ اپنے بہوں کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتی۔ اس لیے اسے ہم نوا بنانے کا وہ بس سوچ کر رہ گیا اور وہ نے ساتھ معاملہ یہ تھا کہ وہ کسی قیمت پر اسے کھونا نہیں چاہتا تھا اور اس طرح شادی کر کے اس کی نظر ٹٹو اعتبار بننا بھی کھل رہا تھا۔ عجیب شش دہچ میں تھا۔ اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی پر اسے کچھ کچھ لگ رہا تھا۔ بس خاموشی سے عارفہ بیگم کو فون پر باباجان کی ہدایات سننے اور پھر ان پر عمل کرتے ہوئے کچھ جس پر راجہ نے نئی بار سے اسے فون پر اپنی دلی تمنا پوری ہونے پر بجائے خوش ہونے کے پریشان نظر آئے۔ اسے فم فیشن پر ابلتر سے منسوب کر کے ٹال گیا تھا لیکن وہ شاید مطمئن نہیں ہوئی تھی جب ہی اس وقت ہمارا رہی تھی۔

”غایہ کہہ رہے ہیں آپ، آفس کی پرا بلنر سے آپ کبھی اس طرح پریشان نہیں ہوئے۔ ضرور کئی باتیں آپ انہیں بتائیں گے تو میں صبا سے پوچھوں گی۔“  
 ”اس سے کیا پوچھوں گی؟“ اس نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔  
 ”آپ کی پریشانی کا سبب کیونکہ مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور جانتی ہوگی یا پھر وہی ہے۔“ راجہ کے اتے قیاس پر وہ ایک ٹوٹا کوٹھنک گیا پھر فوراً ”سر جھٹک کر بولا۔“  
 ”باجاگل ہو تم، وہ خود اس بات سے پریشان ہوگی کہ اتنے دنوں سے میں نے اسے فون نہیں کیا۔“  
 ”کیوں نہیں کیا؟“

”اس لیے کہ بہن آفس کے معاملات میں الجھا ہوا ہے۔ ادھر سے اطمینان ہو گا تب اس سے بات ورنہ وہ بھی تمہاری طرح اپنے سیدھے قیاس کرنے بیٹھ جائے گی۔“ اس نے خوبصورتی سے بات چلائی۔  
 ”یہ تو ہے۔“ راجہ رائیڈ کرتے ہوئے بولی۔ ”ویسے وہ آپ کے فون نہ کرنے پر بھی قیاس کر رہی ہے۔“  
 ”پہلے کہ بدگمان ہو، آپ اسے اپنی مصروفیات کی داستان سنا کر یقین دلائیں کہ اتنے فیشن میں بھی

بنا رہا ہے اور ہاں یہ بھی کیسے گا کہ۔“  
 ”ایہ! وہ اندر ہی اندر جڑ بڑھ رہا تھا جب ہی ٹوک دیا۔ تو راجہ چڑ کر بولی۔  
 ”بہن! قیاس باگل ہوں، خواہ مخواہ آپ کا خیال کرتی ہوں۔“  
 ”بہن! خیال کرتی ہو، اس وقت بھی احسان کر دو کہ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔“ وہ اس کے چڑنے کا نوٹس نہ لیتے بلکہ۔  
 ”کی مرضی۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی پھر جاتے جاتے رک کر کہنے لگی۔ ”ویسے میں آپ کو یہ بتانے آئی تھی کہ غافل آئیہ سے صباحت کو اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت لے لی ہے۔“  
 ”بطلب۔“ وہ ایک دم متوجہ ہوا تھا۔  
 ”طلب کی۔۔۔۔۔“ خیر چھوڑیں اس وقت آپ تمہاری چاہتے ہیں لہذا شب بخیر۔“ راجہ اس پر احسان کرتی ہوئی کہ وہ ایک ہی جست میں دروازے پر آکر اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔  
 ”یہ بھی طرح بتاؤ۔ کیا بات ہے۔ صباحت کو کہاں لے جانے کی اجازت ملی ہے تم نے۔“  
 ”نہ کو کیا، آپ اپنی آفیشنل پرا بلنر حل کرتے رہیں اور مجھے میرا کام کرنے دیں۔“ راجہ نے کورا جواب دینے سے ہٹا ہوا بولا۔  
 ”کیک ہے جاؤ تم۔“

”ہاں۔“ راجہ نے دروازہ کھول کر اسے یوں دیکھا جیسے وہ اس کی خوشامد کرے گا لیکن وہ بڑے آرام سے پرا بلنر چابیٹھا کو نکھک جانتا تھا کہ جو بھی بات ہے کے بغیر اسے نیند نہیں آئے گی اور واقعی وہ جھنجھلاتی ہوئی پلٹ گئے سر آکھڑی ہوئی۔  
 ”خیر خراب ہیں بھائی آپ، ذرا سی منتیں نہیں کر سکتے۔ آخر میں نے بھی تو آپ کے لیے ڈاکٹر آئیہ کی اتنی باتیں تب کہیں جا کر انہوں نے ہابی بھری تھی۔“  
 ”کی بات کی؟“ اس نے بظاہر سرسری انداز میں پوچھا۔  
 ”صباحت کو ہمارے ساتھ بھیجے کی تاکہ، ہم شادی کی شاپنگ اس کی پسند سے کر سکیں اور پتا ہے کل کا دن ملے۔“  
 ”پروگرام بتاتے ہوئے کچھ رجوش ہی ہو گئی تھی۔“ میں چار بجے اسے لیتی ہوئی طارق روڈ پہنچ جاؤں گی پھر وہاں آجائے گا اور ہاں امی تو اس بات کا بالکل پتا نہیں چلنا چاہیے کیونکہ آپ جانتے ہیں وہ ذرا۔“  
 ”ہمارا اگر ڈاکٹر آئیہ نے امی سے پوچھ لیا تب؟“ وہ اس کی بات سمجھ کر بولا۔  
 ”نہی تب دیکھی جائے گی بلکہ آپ ہی سنہیالیے گا۔ میرا کام آپ کو صباحت سے ملوانا ہے کیونکہ اس روز یہاں کہہ رہے تھے کہ شادی سے پہلے آپ ایک بار اس سے ملنا چاہتے ہیں۔ کہا تھا ناں آپ نے۔“ آخر میں اسے دروازے سے تصدیق چاہی۔

”الہ۔“ اس نے پر سوچ انداز میں سر ہلایا پھر راجہ کے جانے کے بعد بھی وہ کتنی دیر تک اسی طرح بیٹھا رہا کہ اس کا ذہن ایک بار پھر اس بات میں الجھ گیا تھا کہ اسے اپنا اصل ظاہر کرنا چاہیے یا نہیں۔ ہر دو صورتوں کے لیے خسارہ ہی خسارہ تھا اور پھر جس خسارے کی تلافی ممکن ہو سکتی تھی وہ اس کے بارے میں سوچنے لگا۔

\*~\*~\*

”بہن! اپنی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے راجہ کو دیکھا تو وہ مسکرا کر بولی۔  
 ”باجاگل ہے، میں تم دونوں کے ساتھ اچھی نہیں لگوں گی۔“  
 ”بطلب۔“ وہ بالکل نہیں سمجھی۔  
 ”نہ پوچھو۔“ راجہ کے اشارے پر اس نے فوراً ”گردن موڑی اور علی جہانگیر کو دیکھ کر گھبرا کر راجہ کا ہاتھ

چاہتا تو نہیں ہوں لیکن اگر چاہوں کہ میری خاطر ساری دنیا کو چھوڑ دو تو چھوڑ دوں گی؟“ وہ اسے پرکھ رہا

تھک کر اسے دیکھنے لگی۔

”ہاں ہاں یاں۔“ اس نے اس کی انگلی کو ہلکا سا جھکا دے کر اصرار کیا تو وہ رو ہانسی ہو گئی۔

”اب ایسی باتیں نہیں کریں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”وہ قصداً نہیں بڑا۔“ بے وقوف لڑکی اتم سے تو مذاق بھی نہیں کیا جاسکتا۔

”مذاق نہیں کر رہے بلکہ شاید مجھے آزمانا چاہتے ہیں۔ بے ناں ہے ناں یہی بات۔“ اس نے دکھ سے کہا۔

”نہیں صبا! ایسی بات نہیں ہے۔“ وہ عاجز آکر بولا۔ ”بس چھوڑو اس موضوع کو، چلو کچھ شاپنگ کر لیں

اپنا موڈ ٹھیک کرو۔“

”بات بتائیں، کیا آپ جانتے ہیں کہ میرے پیرٹس میں علیحدگی ہو چکی ہے؟“ وہ اس کی بات بیکسر

اور غمی اور جانے کس خیال کے تحت پوچھا۔

”ہاں کیوں؟“ وہ جواب کے ساتھ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”برائیاں اس لیے آپ میری طرف سے یہ یقین چاہتے ہیں کہ کبھی زندگی میں ایسا کوئی موڑ آیا تو۔“

”وہ صبا! میں ایسا کوئی موڑ نہیں آنے دوں گا۔“ وہ سمجھ کر فوراً بول بڑا۔ ”جو کسی دوراے پر کھڑے ہو کر

لے لیے انتخاب مشکل ہو جائے۔ نہیں ایسا کبھی سوچنا بھی مت۔ مجھے تمہارے پیرٹس کی علیحدگی سے کوئی

بہت دور نہیں اور نہ میں سبب جانتا چاہتا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ تم نے میرے مذاق کو سنجیدگی سے لیا۔“

”جھکا کر آنکھوں میں آنی نمی اپنے اندر تارنے لگی۔ جانے کیوں دل سہم گیا تھا۔

”اب میری طرف دیکھو۔“ اس نے بے چین ہو کر پکارا تو وہ اس کی طرف دیکھنے کے بجائے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں کھڑا ہوں گی۔“ وہ روٹھے لہجے میں کہتی ہوئی دستوراً ان سے نکل آئی اور پرس میں سے رومال نکال کر

منہ سے اسے آنکھیں صاف کیں پھر اس کی گاڑی کی تلاش میں نظریں دوڑا رہی تھی کہ وہ آگیا اور آہستہ

سائے کندھے پر ہاتھ رکھ کر گاڑی کے پاس لے آیا۔

”میں کٹائی فیل کر رہا ہوں۔“ گاڑی پارکنگ سے نکالتے ہی وہ اسے مخاطب کیے بغیر کہنے لگا۔ ”پتا نہیں میں

نے میں غلطی کی یا تم نے سمجھنے میں۔ بہر حال کتنی عجیب بات ہے کہ اس موڑ پر بجائے خوش ہونے کے تم مجھ

کا ہنسی ہو رہی ہو۔“

”میں علی! میں شاکی نہیں ہوں۔“

”غافل ہو۔“

”میں۔“

”میں۔“

”میں۔“

”تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔“

”سربراہ، چلو جاؤ۔“ رابعہ نے ہنستے ہوئے اس کی طرف کا دروازہ کھلیل دیا۔ تو وہ آہستہ سے بولی۔

”تم بھی چلو ناں۔“

”ارے تم تو ایسے گھبراہڑی ہو جیسے پہلی بار علی بھائی کا سامنا ہوا ہو۔“ رابعہ نے اس کے ٹھنڈے ہاتھ کو ہاتے

ہوئے کہا۔ تب ہی علی جمنا تگیر قریب آکر بولا۔

”آئیے صبا! اور یاں! رابعہ! تم گھر جاؤ۔ انہیں میں۔“

”نہیں پلیز۔“ وہ مزید گھبرا کر فوراً بول پڑی۔

”ڈرو مت، تمہاری مماسے میں نے پوچھ لیا تھا۔“ رابعہ نے اسے اطمینان دلایا۔ تب وہ اتر کر ایک طرف

کھڑی ہو گئی۔

”علی جمنا تگیر! رابعہ سے بات کرنے کے بعد ڈرائیور سے کچھ کہہ رہا تھا پھر سیدھا ہو کر اس کی طرف پلٹ کر بولا۔

”آئیے۔“

وہ خاموشی سے اس کے پیچھے چل پڑی۔ گوکہ پہلی بار اس کے ساتھ نہیں تھی لیکن کچھ عرصے بعد جس بندھن

میں بندھنے والی تھی اس کا حجاب تھا جو اس کی نظریں علی جمنا تگیر کے قدموں سے اوپر نہیں اٹھ رہی تھیں اور اگر

پاس کا تو بالکل ہوش نہیں تھا۔ پتا نہیں کس طرف جا رہا تھا وہ۔ اس نے جان کر بھی کیا کرنا تھا اور پھر جہاں وہ رکا کر

کے قدم بھی نہیں اٹھائے۔

”بھیس۔“ علی جمنا تگیر نے کتاب اس نے چونک کر سر اٹھایا اور چاروں اور نظروں اٹھائی بیٹھ گئی۔

”کیسی ہیں آپ؟“ علی جمنا تگیر نے اس کے سامنے بیٹھے ہوئے پوچھا۔ بڑا محتاط انداز تھا، ہمیشہ سے مختلف:

لہجے میں شوقی تھی نہ نظروں میں وارفتگی اور براہ راست اسے دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔

”تھک ہوں آپ کیسے ہیں؟“ وہ اس کے بدلے انداز محسوس کرتی ہوئی بولی۔

”کیا لگے گی؟“

”کچھ نہیں۔“ اس کے فوراً منع کرنے پر وہ نہ صرف متوجہ ہوا بلکہ اپنے رویے کا احساس بھی ہو گیا، جب:

”مسکرا کر بولا۔

”کیوں، میرا ساتھ بھی نہیں دیں گی۔ آئی مین میں چائے پینا چاہتا ہوں۔“

”ضرور پیئیں، میں آپ کو تو منع نہیں کر رہی۔“ وہ ٹیبل کی چٹائی سطح پر انگلی سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچتی:

بولی۔

”یہ تو نہیں ہو سکتا کہ میں چائے پیوں اور آپ ناراض ناراض سی بیٹھی رہیں۔ اب یہ مت کہہ دیجئے گا

آپ ناراض نہیں ہیں۔“

”نہیں ہوں۔“

”میری طرف دیکھ کر کہیں۔“ علی جمنا تگیر نے ہاتھ بڑھا کر اس کی ادھر ادھر پھسلتی انگلی کو اپنی دو انگلیوں:

درمیان جکڑ لیا تو وہ گھبرا کر بولی۔

”کیا کر رہے ہیں چھوڑیں پلیز۔“

”پہلے میری ایک بات کا جواب دو۔ کتنا پیار کرتی ہو مجھ سے؟“ وہ ایک دم آپ سے تم پر آکر اسے جانے:

امتحان میں ڈال گیا۔

”پتا نہیں۔“ وہ پریشان ہو گئی۔

”چلو یہ بتا دو، میری خاطر کیا کر سکتی ہو۔“

”آپ کیا چاہتے ہیں؟“ وہ الجھ کر بس ایک نظر اسے دیکھ سکی۔

”نہیں۔“

”کیوں۔؟“

وہ خاموش رہی تو قدرے توقف سے اپنے آپ کہنے لگا۔

”ویسے میری طرف سے کوئی پابندی نہیں ہوگی بلکہ اگر تم کوگی تو میں خود تمہیں ان کی پاس لے جاؤں گا۔“  
وہ پھر ان سنی کر کے شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ جانے کیوں اسے انہیں ہونے لگی تھی اور کچھ عجیب سا بھی لگ رہا تھا۔ وہ خود اپنے باپ کے بارے میں خواہ کچھ بھی سوچے یا کہے لیکن تیسرے شخص کے منہ سے مدد ہی نہیں اچھی نہیں لگ رہی تھی اور وہ اسے روک بھی نہیں سکتی تھی کہ جانے دیا کیجئے اور وہ اس کے منہ سے مونس سے ہی سمجھ کر خاموش ہو گیا تھا۔

\*~\*~\*

اس کی شادی میں بہت کم دن رہ گئے تھے۔ تیاریوں میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا تھا اور آسیر کو کوئی مشکل نہیں ہوئی تھی۔ سب ہی اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ کپڑوں کی تیاری میں میمونہ بھابھی سونیا اور اماں کی تھیں اور باہر کے کاموں میں نیپیل اور عمر بھی پیش پیش تھا اور یہ صرف اس کی محبت تھی جو اب سب اس کے لیے اسے ضروری کام بھی بھول گئے تھے۔ ہر شام عدیل بھائی بھی یا سمین اور دونوں بیٹیوں کے ساتھ آجاتے تو اور روش ہو جاتی تھی لیکن اسے جس کا انتظار تھا وہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ جس سے اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ حالانکہ جانتی تھی کہ ابھی بھی وہ آئے گی تو دل چلانے والی باتیں ہی کرے گی اور شاید وہ اس کی عادی ہو چکی تھی۔ جب ہی صبح شام لون کر کے اس کی منتیں کر رہی تھی اور اس وقت تو رونے بھی لگی تھی۔  
”مددو! کیا تمہیں ذرا بھی مجھ سے محبت نہیں ہے۔“

”یہ کیا بات ہوئی، یعنی میں آجاؤں تو محبت اور نہ آؤں تو چہ چہ۔ تم ہمیشہ سے ایسی ہی احمقانہ سوچ رکھتی ہو۔“  
مدحیہ نے الناس کا مذاق اڑایا۔

”تو تم نہیں آؤ گی۔“

”کیوں نہیں آؤ گی۔ ابھی تو پورا ایک ہفتہ پڑا ہے۔ شکیل ماموں نے دو دن پہلے کی سیٹیں کنفرم کر والی ہیں اور ظاہر ہے میں بھی ان ہی کے ساتھ آؤں گی۔“

”کیا ضرورت ہے تب بھی آنے کی۔“ اس نے چیخ کر ریسورٹ پر ڈیا اور آسیر پوچھتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی تو نیپیل پہلے سے موجود تھی، دیکھتے ہی کہنے لگے۔

”اس بار پھوپھو کی ساری آمدنی ٹیلی فون کے بل میں چلی جائے گی۔ اسے تو خیر احساس نہیں ہے، تم ہی کچھ خیال کر لو۔“

”میں خیال کروں، ہمیشہ مجھ ہی سے یہ توقع کیوں کی جاتی ہے اور اسے صرف احساس نہیں ہے، کہہ کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔“ وہ ایک دم پھٹ پڑی۔ ”اس لیے تو وہ اتنی سیر ہو گئی ہے اور وہی صبح ہے۔ ٹھیک ہی مجھے احمق کہتی ہے میں ہوں احمق۔“

”صبا!۔“ نیپیل نے ہر کہہ کر اسے کندھوں سے تھام لیا۔ ”اتنا غصہ۔ میں نے تو یوں ہی ایک بات کی تھی۔“  
وہ ہاتھوں میں چڑھ کر رونے لگی۔

نیپیل سمجھ گئے۔ اصل میں اسے مدحیہ کا نہ اتنا راز رہا ہے اور وہ کیا کر سکتے تھے۔ ان کے اختیار میں ہوتا تو اسے بہت پہلے لے آتے۔ اس کے معاملے میں تو وہ بھی بے بس تھے۔

”تمت رو“ تم جانتی ہو۔ مجھے کتنا دکھ ہوتا ہے جاؤ منہ دھو کر آؤ۔“ انہوں نے اس کا رخ وادش روم کی طرف موڑ دیا تھا۔

پھر رات میں ڈھولک کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ پہلے نیچے اور جب اباجی اور خلیل بھائی تک آنے لگے تب اوپر آگئے تھے وہ، ٹمہو اور رولی کے بہت اصرار پر سب کے ساتھ آکر ٹیبلٹی بھی کھ کر آہ بھر کر بولا۔

”اے صبا! تم پہلی جاؤ گی تو میرا کیا ہو گا۔ میں بہت روؤں گا ایمان سے۔“

وہ اس کا توں بھی آج کل ذرا ذرا سی بات بدل بھرتا تھا۔ اس روانی سے آسیر جھٹکے اور ایسی ہنسی بندھی کہ جب کراتے کراتے تھک گئے، ساتھ ساتھ عمر کو بھی اتار رہے تھے کہ اس نے کیوں ایسی بات کی۔

”ہم لوگ خواہ مخواہ میرے پیچھے پڑ رہے ہو اور اسے بھی چپ کرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جی بھر کر رونے دو، اچھے سارے آنسو میںیں بہا لے۔ آگے بہت خوش رہے گی۔“ عمر سب کی سن سن کر آخر بول پڑا۔

”خوش تو انشاء اللہ رہے گی لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ۔“ سونیا پھر شروع ہونے لگی تھی کہ وہ ہاتھ جوڑ

”اب۔“ جس خدا کے لیے یہ ڈانٹ پھینکار کا سلسلہ ختم کریں اور ڈھولک سنبھالیں۔“

”ایک دم چھوٹا نہیں کب آئے گی۔ سب سے اچھی ڈھولک دی، بجاتی ہے۔“ تو یہ نے ڈھولک اپنی طرف نیچے ہونے کہا تو وہ رونے کے درمیان جل کر بولی۔

”نہیں آئے گی وہ۔“

”ابا مطلب مددو شادی میں نہیں آئے گی۔“ ٹمہو نے حیران ہو کر پوچھا۔  
”ہر جھٹک کر رہے گی تو عمر کے ساتھ رولی بھی نیپیل کی طرف گھوم کر ان سے پوچھنے لگی۔“

”نیپیل بھائی! مددو نہیں آئے گی۔“

”اے کیوں نہیں۔ اس کے بغیر بھلا شادی ہو سکتی ہے۔“ نیپیل نے صبا کو گھورتے ہوئے کہا۔

”یہ اب تک تو اسے آجاتا چاہیے تھا۔ کوئی سالگرہ تو نہیں ہے۔ جواب نہیں تو اباجی ہار سہی۔ شادی ہے جو نہیں ایک ہی بار ہوتی ہے۔ کیوں نیپیل بھائی۔“ عمر نے کہہ کر نیپیل سے تصدیق چاہی تو وہ ان سنی کر کے اٹھتے ہوئے۔

”میرا خیال ہے۔ سونا چاہیے۔ چلو تم لوگ بھی اٹھو بہت رات ہو گئی ہے۔“

”اے نہیں نیپیل بھائی! ہم ڈھولک بجا میں گے۔“ رولی نے لجاجت سے کہا۔

”کل بجالینا، چلو اٹھو۔“ نیپیل نے سب کو اٹھادیا، آخر میں صبا کو اس کے کمرے میں چھوڑ کر گئے

اگلے دن سے وہ سب کے بلانے پر بھی اپنے کمرے سے نہیں نکلی۔ رات گئے تک ڈھولک کے ساتھ ہنسی کی آواز اس سے سونے نہیں دیتی تھیں اور یہ نہیں تھا کہ اسے کسی بات سے دلچسپی نہیں تھی بلکہ متضاد بات میں ہر کر اس کا دل کچھ سہم سا گیا تھا۔ یعنی کبھی پالنے کی خوشی، کبھی اس گھر سے جانے کا غم، کبھی مدحیہ پر اور زیادہ یہ کہ اس کے جانے کے بعد آسیر اکیلی ہو جائے گی۔ ان ساری باتوں کی وجہ سے وہ الگ تھک پڑی

کیا کچھ سوچتی رہتی اور مدحیہ پر تو اسے اتنا غصہ تھا کہ اپنے کہنے کے مطابق جب وہ دو دن پہلے آئی تو اسے غصے سے منہ موڑ لیا جس پر مدحیہ بجائے اسے منانے کے انکارا راض ہو کر بولی۔

”اکیسے بار دی تھیں تم مجھے کہ میں تمہارے خُرخے اٹھاؤں، خوشامدیں کروں۔ مجھ سے ایسی توقع مت

”اکی ہوں میں جو تم سے کوئی توقع رکھوں گی۔ جانتی نہیں ہوں کیا میں تمہیں؟“ اور تم نے کیوں زحمت کی

”تمہارے بغیر۔“

”نہیں ہو سکتا تھا میرے بغیر۔“ مدحیہ فوراً ”لوگ گئی“ تم سے تین بار باں میں ہی کہلو اؤں گی۔“

”نہ! اس نے سر جھٹک کر منہ موڑا تو مدحیہ نے لپک کر اس کی گردن پر ہاتھ رکھ دیا۔

”باہونہ، میرے بغیر کرتیں شادی بتاؤ۔ میں تمہیں ہم سے اڑا دوں گی اور کیا نام ہے اس کا علی جمائیکر کو بھی

”۔“

”سایک تو چوری اوپر سے سینہ زد رہی۔“ وہ اس کے ہاتھ سے اپنی گردن جھڑاتی ہوئی بولی۔

”مجھ سے منہ موڑو گی تو ایسے ہی کروں گی۔“ مدحیہ ہنستی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔  
 ”بہت بری ہو تم۔“ اس کا سارا غصہ جھاگ بن کر میٹھ گیا۔

\*~\*~\*

”شاہ! مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہو رہا۔“ مہر النساء بہت تلملائی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔  
 شاہ سکندر نے پہلے الماس کو کمرے سے جانے کا اشارہ کیا پھر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔  
 ”ہاں! کیا برداشت نہیں ہو رہا۔“

”اس لڑکی کے سوا گت کے لیے یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، آپ کچھ نہیں رہے۔ باباجان نے سب کو ای کام لگا رکھا ہے۔ یوں جیسے کہیں کی مہارانی آنے والی ہو۔ حویلی میں پہلی شادی تو نہیں ہے یہ نہ ہی پہلی ہو آ رہی ہے۔ اس سے پہلے بولس بھائی کے بیٹے کی شادی ہوئی تو اس کی دہن کے لیے تو اتنے اہتمام نہیں کیے گئے تھے۔“  
 ”یہاں معاملہ ذرا دوسرا ہے مہر النساء! اور دل کا بھی، یعنی باباجان کے سب سے جیتے پوتے کی شادی ہے۔ آنے والی صرف بہو ہی نہیں، بیٹی بھی ہے جو اب تک محروم رہی۔ شاید باباجان اسی کی تلافی کر رہے ہیں۔“  
 سکندر نے سمجھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔  
 ”ہو نہ تلافی، باباجان تلافی کر رہے ہیں اور آپ کیا کریں گے؟۔“ مہر النساء کے لہجے میں تفرکے ساتھ طنز

سمٹ آتا تھا۔  
 ”دیکھو مہر النساء! میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ تم اس بچی کے لیے دل میں بغض مت رکھو۔ اس آنے سے تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ وہ زیادہ دن یہاں نہیں رہے گی۔ علی اسے اپنے ساتھ لے جا گا۔“

”اب بھی کیوں نہیں، یہ سارے انتظام وہیں شہر میں ہوتے۔ یہاں لانے کی ضرورت کیا ہے۔“

”بس باباجان کا شوق ہے۔“  
 ”شوق نہیں شاہ! وہ مجھے اذیت دینا چاہتے ہیں۔“  
 ”یہ شخص تمہارا خیال ہے۔ باباجان نے ہمیشہ تمہیں اہمیت دی ہے۔ کبھی تمہاری حق تلفی نہیں ہو۔ یہاں تک کہ تمہاری بد تمیزوں کو بھی برداشت کیا ہے انہوں نے اور تم ان کی اتنی سی خوش برداشت کر رہی ہو۔ یاد رکھو باباجان ایک حد تک ہی ذہیل دیتے ہیں۔“ شاہ سکندر حتی الامکان ضبط کر رہے تھے پھر

میں منتہی کر گئے۔  
 ”کیا کریں گے وہ نکال باہر کریں گے مجھے حویلی سے، نہیں شاہ! اب یہ ممکن نہیں ہے، میری اولاد وہاں ہے اور آپ یہ سن لیں کہ اتنا بھی اس لڑکی کے یہاں آنے کے حق میں نہیں ہے۔“ مہر النساء نے جواب

خبردار کیا تو ان کی پیشانی پر بے شمار لکیریں کھینچ گئیں۔  
 ”اتنا کیا کہتا ہے وہ؟۔“  
 ”میری کہ کسی رکھیل کی اولاد ان کی برابری نہیں کر سکتی۔“ مہر النساء نے اس بار کچھ آرام سے کہہ کر

دکھائی تو وہ بری طرح سلگ کر بولے تھے۔  
 ”وہ رکھیل کی اولاد ہے اور آٹا، آٹا کس کی اولاد ہے۔“  
 ”میری۔“ مہر النساء نے گردن اڑائی تھی۔  
 ”ہاں صرف تمہاری۔“ ان کا وارکاری تھا۔  
 مہر النساء چیخ پڑی۔ ”کیا مطلب ہے آپ کا؟۔“  
 ”جو چاہے سمجھ لو۔“ شاہ سکندر سر جھٹک کر جانے لگے کہ مہر النساء ان کے سامنے آگئی۔  
 ”ایک بات بتا میں شاہ! وہ اکثر اپنا حشر بھول گئی جو بیٹی کو یہاں بھیج رہی ہے۔“  
 ”وہ تمہیں بھیج رہی ہم لارہے ہیں۔“ شاہ سکندر بے اختیار کہہ گئے۔

”ہاں تو ایک ہی ہے۔ وہ بھیجے یا آپ لائیں۔ اس نے اعتبار کیسے کیا یا آپ نے کوئی بھاری ضمانت دی ہے؟“  
 ”میں جانیدا دیا اپنا آپ۔“ مہر النساء طنز کے ساتھ مشکوک نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔  
 ”میراں پاؤں میں کیوں الجھ رہی ہو مہر النساء! جب میں کہہ چکا ہوں کہ تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا تو میرا یقین زبردست شاہ سکندر نے نرمی سے کہہ کر اسے سامنے سے ہٹایا اور کمرے سے نکل گئے۔



ہے ایک افزا تفری محی تھی۔ حالانکہ سارا دن ہاتھ لیکن ناشتے کے بعد سے ہی سب کو اپنی تیاری کی فکر ہوتی تھی۔ مدحیہ کے لیے آئیہ نے بہت چاہ سے مندی کلر کا کرتا اور تنگ پاجامہ بنایا تھا۔ جیسے اب وہ ریجیکٹ کی کھڑی تھی۔

”آخر کیا خرابی ہے اس میں۔“ صباحت نے اس کے سوٹ کے ساتھ کا جھلملا تا دوشہ بیڈ پر پھیلاتے ہوئے پچھلا۔  
 ”بس مجھے نہیں اچھا لگ رہا۔ ماما کو اور کوئی کلر نہیں ملا تھا اور یہ تنگ پاجامہ تمہیں پتا ہے مجھے کتنا برا لگتا ہے۔“ مدحیہ نے بیڈ پر پھیلا دوشہ کھینچ کر اس کا گولہ سا بنا کر اچھال دیا۔

”لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔ اتنی ایمر جنسی میں تو کوئی تمہیں تمہاری پسند کے کپڑے ہی کر نہیں دے گا۔ اسی لیے میں تمہیں جلدی بلارہی تھی تاکہ سہولت سے اپنی تیاری کر سکو، لیکن تمہیں تو سب کیا کرایا ملنا چاہیے۔“

”بہنو بچی۔“  
 ”ہرگز نہیں، یہ تم اپنے جینز میں رکھ دو، چار دن بعد تمہاری مندی ہوگی تو اس میں پن لینا۔“ مدحیہ نے

دھچکا کر کہا تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔  
 ”کی الحال تو تم اسے میری مندی میں پہنو۔ چار دن بعد میں پہن لوں گی۔“  
 ”بس تم ہی پسنا۔“ مجھے کوئی اور انتظام کر کے دو، ورنہ میں نہیں جاؤں گی۔“ مدحیہ کی ہٹ دھرمی پر اس نے اپنا

بھونٹ لیا۔  
 ”یالہ کیا چیز ہو تم، اتنے کم وقت میں میں کہاں سے انتظام کر کے دوں، نیچے سب لوگ تیار ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ اچھا ایسا کرو۔ ریڈی میڈ لے آؤ لیکن جاؤ گی کس کے ساتھ۔“ صباحت مشورہ دے کر خود ہی اچھبے میں پڑھ

کی۔  
 ”میری بیٹی رہی جیسے یہ سیرے سے اس کا مسئلہ ہی نہ ہو۔“  
 ”عمر سے کھولے جانے تمہیں، ہمیں حیدری مارکیٹ سے جیسا سوٹ چاہو گی مل جائے گا۔“ صباحت مصطحاً اس کے رویے کو نظر انداز کر رہی تھی۔  
 ”ہاں، جیسے تمہارا باپ پوے گا۔“

”باب کو بھو دو۔“ میں دے رہی ہوں اپنی ساری جمع پونجی۔“ صباحت نے ہنستے ہوئے وارڈروب کھول لی تو مدحیہ

نرا ہونے لگی۔  
 ”چار پانچ سو کا سوٹ میں نہیں لوں گی۔“  
 صباحت کچھ نہیں بولی۔ آرام سے کپڑوں کی تہوں میں سے پیسے نکال کر گئے پھر پلٹ کر اس کے ہاتھ پر رکھتی

بولی۔  
 ”تو پورے ڈھائی ہزار ہیں۔ زبردست سوٹ آئے گا اور دیکھو عمر نہ مانے تو تو یہ کو لے جانا۔“

”اور اگر وہ بھی نہ مانی تو میں اس کی چلی جاؤں گی۔“  
 مدحیہ کبھی ہونی کمرے سے نکل گئی تو اس نے یوں سر ہلایا جیسے وہ اسے کبھی نہیں سمجھا سکتی پھر اس کے وہ کپڑے جو



سہارے آتے دیکھ کر چیخ پڑی۔

”کیا ہوا مدحو؟“

”کچھ نہیں ہوا، ہٹو سامنے سے۔“ عمر نے قدرے تیز ہو کر کہا۔

مدحہ کے منہ سے ایسی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے بہت تکلیف میں ہو۔

وہ سینے پر ہاتھ رکھے ایک طرف ہٹ کر دیکھنے لگی جب سونیا نے آرام سے مدحہ کو بیٹ پر لٹا دیا تب وہ بھل کر اس کے پاس آئی اور قریب بیٹھ کر اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے لیا۔

”کیا ہوا مدحو؟“

”سیڑھیوں سے پھسل گئی ہیں محترمہ! پیر میں موج آگئی ہے۔ پھوپھو کہاں ہیں؟“ عمر نے ہٹا کر پوچھا تو سونیا جلدی سے بولی۔

”پھوپھو پیچھے ہی ہیں، جاؤ بلا لاؤ۔“

عمر چلا گیا تو وہ اٹھ کر مدحہ کا پیر دیکھنے لگی پھر آہستہ سے انگلی سے چھوا تو وہ چیخ پڑی۔

”ہاتھ نہیں لگانا۔“

وہ اچھل کر پیچھے ہٹی تو سونیا نے اسے تھام لیا۔

”تم بیٹھو آرام سے، پھوپھو آکر دیکھ لیں گی۔“

”ان کے دیکھنے سے کیا اسے تکلیف نہیں ہوگی اور تمہیں ضرورت کیا تھی سیڑھیاں پھلانگنے کی۔ آرام سے نہیں اتر سکتی تھیں۔“ وہ روبانسی ہو کر مدحہ پر بکڑنے لگی۔

”ادوہ! میں نے کہا تھا۔ تم ادھر بیٹھو۔“ سونیا اسے پیچ کر دوسری طرف لے آئی۔

کچھ دیر بعد آسہ آئی تو مدحہ کی موج چیک کرنے سے بیڈ تینج تک اس نے سکون اور تحمل کا مظاہرہ کیا۔ اس کے بعد وہ بھی اسے سخت ست کرنے سے باز نہیں رہ سکی تھی۔

مدحہ آنکھوں پر بازو رکھے چپ چاپ سستی رہی۔ آخر صباحت کو اس پر رحم آیا۔

”بس کر بس ماما! آب پجاری جان بوجھ کر تو نہیں کری۔“

آسہ نے ذرا سا سر جھٹکا پھر کھڑی دیکھ کر سونیا کو جلدی تیار ہونے کا کسمتی ہوئی کمرے سے نکلی گئی تو مدحہ آنکھوں سے بازو ہٹا کر رونی آوازیں بولی۔

”سونیا جی! میں کیسے جاؤں گی۔“

”تم کہاں جا سکتی ہو، بس آرام کرو اور دیکھو پیر کو زیادہ ملانا جلانا نہیں ورنہ شادی کے دن بھی ایسے ہی پڑا رہو گی۔“ سونیا نے دھینج سے تنبیہ بھی کی تو وہ خفگی سے بولی۔

”اس سے تو اچھا تھا۔ میں آتی ہی نہ۔“

”اے نہیں زیادہ چوٹ نہیں ہے۔ صبح تک انشاء اللہ سو جن اتر جائے گی پھر تم چل سکو گی۔“ سونیا نے تسلی دی پھر صباحت کو اس کا خیال رکھنے کا کسمتی ہوئی چلی گئی۔

”چلو میں بور ہونے سے بچ گئی۔“ صباحت نے جھٹکے پھلے انداز میں کہا تاکہ اسے ملال نہ ہو پھر مزید ان دھیان پانے کی خاطر ادھر ادھر کی باتیں چھیڑ دیں تو کچھ دیر میں واقعی وہ بھل گئی تھی۔

پھر اگلے روز مدحہ کے پیر کی سو جن تو اتر گئی لیکن چلنے میں اسے کچھ تکلیف ہو رہی تھی جس سے آسہ اسے مزید آرام کرنے کا کہہ دیا تاکہ اگلے دن تک وہ بالکل ٹھیک ہو کر بارات کا استقبال کر سکے اور اسے بھی لٹا۔

چلنا اچھا نہیں لگ رہا تھا اس لیے اس نے بلا چوں و چرا آسہ کی بات مان لی اور جب صباحت کو مندی کی کمی محسوس ہونے لگی تو اسے لپٹی رہی۔ نیچے سے گانے اور ڈھول کی آوازیں اور پربک آوازیں سننے لگیں۔

کسی وقت وہ کان لگا کر سننے لگی پھر اچانک ذہن کہیں اور بھٹک جاتا۔ صباحت کے جانے کا خیال آیا تو پھر وہ اس سوچنے لگی کہ اب بس وہ یہاں ایک ہی رات کی مہمان ہے اس کے بعد وہ اپنی زندگی کے نئے سفر پر روانہ ہو جائے گی۔

نئی عجیب بات ہے۔ میں نے ابھی تک اس کے ہم سفر کو نہیں دیکھا۔ وہ اپنے آپ پر ذرا سانسہ تھکی کے پورٹک کی آواز سے چونک کر ادھر دیکھتی ہوئی بولی۔

”آجاؤ۔“

ان کے جانے کے ساتھ نیل اندر آتے ہوئے بولے۔ ”کیسی طبیعت ہے تمہاری۔؟“

پہلی طبیعت خراب کب تھی۔“ اس نے یوں ہی لپٹے لپٹے کہا یعنی ذرا سا سرا و نچا کرنے کی زحمت بھی نہیں بلکہ قدرے جھل سے ہو کر بولے۔

”میرا مطلب ہے تمہارا پیر۔“

”جانے میں کچھ تکلیف ہو رہی ہے۔“

”یہ تو میں سمجھتی تھی۔“ نیل نے اس کا خیال کر کے کہا۔

”نہیں نہیں۔ صبا کے سسرال والے تبھی سن گئے اس کے دونوں ہن بھائی لنگ۔“ اس نے اپنی زبان ہاتھ چپکائی تو ایک پل میں ضبط کی جانے کن منزلوں سے گزر کر نیل اس کی تائید کرتے ہوئے ہوئے

نہیں ایسا نہ ہو وہ صبا میں بھی کوئی عیب تلاش کرنے بیٹھ جائیں۔“

نواب پر کچھ حیران ہوئی لیکن بولی کچھ نہیں۔ تو قدرے توقف سے نیل پوچھنے لگے۔

”نہیں مستقل اسلام آباد رہنے کا سوچ لیا ہے۔؟“

”ہاں۔ کج پیش کے بعد دیکھیں کیا کرتی ہوں۔“ اس نے سرسری انداز میں جواب دیا۔

”بس پھوپھو کا خیال کرنا چاہیے۔ صبا کے جانے سے وہ اکیلی ہو جائیں گی۔“

”بھئی تو ہیں، آپ کیوں نہیں خیال کر لیتے۔“

”انہوں نے ابھی اسی قدر کہا تھا کہ وہ بول پڑی۔

”اب آپ کا فرض نہیں ہے۔؟“

”نہیں۔“

”مجھے ہیں تو شادی کر کے ماما کو اچھی سی بھولا دیجیے۔“

”ہی!۔“ وہ ذرا سانسے۔ ”مجھ سے تو کوئی عام سی بھی شادی پر آمادہ نہیں ہوگی۔“

”اے۔؟“ اس نے پہلے بے دھیانی میں کہا پھر خودی چوری بن گئی۔ غالباً اپنی کئی بات یاد آگئی تھی اور نیل کے کچرے پر نظریں جمائے کھڑے تھے۔ مسکراتے ہوئے وہیں سے پلٹ گئے۔

\*\*\*

بچے آسہ خود صباحت اور مدحہ کو پوٹا پرار چھوڑ آئی تھی۔ اس کے بعد انہیں لانے کی ذمہ داری نیل اور نی کو سونپ کر وہ اس طرف سے مطمئن ہو گئی تھی۔

مات بچے کے قریب وہ سب کے ساتھ میں جال پہنچ گئی۔ مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ وہ کچھ دیر بھی خلیل بھائی اور خلیل بھائی کے ساتھ گیٹ پر کھڑی رہتی تھی پھر اندر چلی آئی اور لڑکیوں کو بارات نکالنے کے لیے گیٹ پر جانے کا کہہ کر اماں جی کے پاس بیٹھتی ہوئی بولی۔

”میرا ہٹ ہو رہی ہے اماں جی۔“

”اے، صبح سے دیکھ رہی ہوں ایک ایک کے ساتھ مغز ماری کر رہی ہو اور یہ لڑکیاں نہیں آئیں ابھی بلکہ انہی نے اس کے قدرے سے ہوئے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”ماں کی بلکہ وہ آ رہی ہیں۔“ وہ مووی کیمرے کی تیز روشنی میں صباحت کو دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے نیرسہ ماما بھی اور دوسری طرف مدحہ بھی جو صباحت سے زیادہ اپنا شرارہ سنبھالنے میں لگی ہوئی تھی۔

ان کی خوشی کبھی پوری نہیں ہوگی بھابھی۔“ آسیہ نے روتے ہوئے کہا تب ہی عارفہ بیگم آگئیں اور فاتحانہ  
بہن مسکرائی ہوئی بولیں۔  
”سارک ہو، کہاں ہے دلہن، باہر لے آئیں اسے۔“

بہن کل خود پر ضبط کرنے کے بعد بولی۔  
”بھگے افسوس ہے، آپ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکیں، جا کر کہہ دیجئے اپنے خسر نامدار سے کہ وہ آسیہ  
والدین کے سامنے ناگ بھی رکھیں گے تب بھی وہ اپنی بیٹی نہیں دے گی۔“

”جی تو ہماری ہوگئی ڈاکٹر صاحبہ! اب نہ دینے کا کیا سوال؟“ عارفہ بیگم نے اس کے کندھے سے پیچھے ڈیرنگ  
لے اندر بھاگنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تو آسیہ نے جلدی سے پیچھے کر دروازہ بند کر دیا اور اس کے ساتھ  
کریں کھڑی ہوگئی جیسے کوئی اندر جانے کی جرات نہیں کر سکتا۔

”اسی وہ۔۔۔“ راجہ بھائی کوئی آئی تھی۔ اور جانے کیا کہنا چاہتی تھی کہ آسیہ کو دیکھ کر خاموش ہوگئی پھر  
بولے عارفہ بیگم کو کچھ اشارہ کیا تو وہ واپس پلٹی ہوئی بولیں۔

”میں مردوں سے بات کرتی ہوں دیکھیں وہ کیا کہتے ہیں۔“  
”ہونہ!“ آسیہ نے تنفر سے سر جھکا پھر ذرا سا دروازہ کھول کر سر اندر کر کے صباحت سے بولی۔

”صبا! یاد دروازہ اندر سے بند کر لو اور جب تک میں نہ کہوں، نہیں کھولنا۔“  
”کیوں ماما۔“ صباحت کو کسی گڑبڑ کا احساس پریشان کر رہا تھا۔

”جس نے جلدی سے کہہ کر دروازہ اپنی طرف کھینچا پھر کسی سوچ میں کھڑے تشکیل  
ہو گیا تو وہ تمام کر بولی۔

”پہلے بھائی! امہانوں کو رخصت کریں۔“  
”نہا بھائی نے چونک کر اسے دیکھا پھر گہری سانس کھینچ کر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ وہ بول پڑی۔

”کچھ نہیں کہیے گا بھائی۔ صبا میری دلہیز پر سسک سسک کر مرجائے مجھے یہ گوارا ہے لیکن شاہ پور کے کسی  
نہی کی گلی میں بننے والوں کی اسے۔“

”نہا بھائی نے ہونٹ پیچ کر ذرا سا اثبات میں سر ہلایا پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چل پڑے۔ اور دونوں لان  
پہاڑے تھے کہ ایک بار پھر فائرنگ کی آواز سے فضا گونج گئی اس کے ساتھ ہی آگے پیچھے نئی گاڑیاں گیٹ پر آن  
ہیں اور ایک ساتھ سب کے دروازے کھلنے لگے۔

”نہا بھائی اسے چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔  
”اندر سے پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ بارات کے ساتھ آئے مہمان اٹھ کر باہر جا رہے تھے جس سے وہ  
لجھان سے ہو کر اباجی کی طرف بڑھی تھی کہ دو لمبے چوڑے جوان رانٹیلے لیے ہوئے اس کے سامنے آئے۔

”دلہن کہاں ہے؟“  
”مٹا اپ۔“ وہ زور سے چیختی تو اس کی آواز سن کر مدیہ بھاگتی ہوئی آگئی۔ اور اس پر اتنی رانٹیلے دیکھ کر سہم  
ڈھلے۔

”ان سے بات نہیں کریں ممالیہ ڈاکو ہیں۔“  
”تو بھائی یہی ہے دلہن۔“ عقوب سے راجہ نے اونچی آواز میں کہا۔ تو ان میں سے ایک نے فوراً ”بڑھ کر  
بہن کی کلائی تھام لی اور اس سے پہلے کہ آسیہ کچھ سمجھتی اس نے جھنجھٹے سے مدیہ کو پیچھے کر اس کے منہ پر رومال  
دیا اور فوراً ”کندھے پر لا کر گیٹ پیار کر گیا۔

”مذہب! آسیہ ایک دم حواس باختہ ہو کر چیٹی۔ اباجی! بھائی روکیں انہیں۔“  
”مذہب! آسیہ ہوش کو“ عدیل بھائی نے بھاگ کر اسے کندھوں سے تھام کر جھنجھوڑا تو وہ ان کے بازوؤں میں  
نہا کی تھی۔

”خوشی کا اظہار ہو رہا ہے۔“  
”اوگاڑا! میں دیکھوں۔“ مدیہ بھاگی ہوئی لان میں اتر گئی۔

395

”آسیہ ان کے پیچھے ڈیرنگ روم میں آئی اور دروازہ بند کرتی ہوئی بولی۔  
”مذہب! اتم سو نیا وغیرہ کو کس جاؤ۔ بارات آنے والی ہوگی۔“

”جب آئے گی، پہلی جاؤں گی۔“ مدیہ لا پرواہی سے کہہ کر آئینے میں اپنا جائزہ لینے لگی۔  
”بھابھی! آپ یہاں بیٹھیں گی یا میمونہ بھابھی کو بھیج دوں۔“ اس نے صباحت کی کھوڑی چموت بھر  
بھابھی سے پوچھا۔

”میں یہاں ہوں یہاں، تم البتہ باہر جاؤ۔ میرا خیال ہے بارات آگئی ہے۔ شور ہو رہا ہے۔“  
”میں بھی نے دروازے کی طرف کان لگاتے ہوئے کہا۔ تو وہ بہت غلٹ میں مدیہ کو ساتھ آنے کا ہوتے

ڈیرنگ روم سے نکل کر گیٹ کی طرف آئی تو سب سے پہلے عارفہ بیگم سے سامنا ہو گیا۔ ان سے مل کر  
دوسری خواتین کی طرف بڑھنا چاہا لیکن عارفہ بیگم نے بڑی خوبصورتی سے اسے باتوں میں لگا کر اسے ساتھ  
چلنے پر مجبور کر دیا تھا پھر کچھ دیر وہ ان کے ساتھ بیٹھی جب نکاح کے لیے تشکیل بھائی اور خلیل بھائی کو ڈیرنگ

کی طرف جانے دیکھا تب عارفہ بیگم سے معذرت کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور پہلے میمونہ بھابھی کے پاس  
ان سے اس پیکٹ کی بابت پوچھا جس میں دولہا کے لیے گھڑی، قلم اور انگوٹھی وغیرہ تھیں اور ان کے بتانے  
کر گاڑی میں سے وہ پیکٹ نکال لانے کو کہا پھر ڈیرنگ روم کی طرف آئی تو دروازے ہی میں رک گئی کیونکہ

اندر جگہ کم تھی دوسرے اچانک دل سہم سا گیا تھا۔ غالباً اس تمام عرصے میں اب یہ خیال آیا تھا کہ وہ  
زیادہ اس کی اپنی تھی وہ پرانی ہو رہی ہے اور اس خیال نے اس کی آنکھیں نم کر دی تھیں۔ جس سے اسے  
دھندلا گیا تھا اور اب بھی یہ دھند چھٹی نہیں تھی کہ سماعتوں میں اتر کر نکاح خواں کی آواز ذہن کے کسی بند

جا لگی تھی۔  
”شاہ علی جاگتے ولد شاہ جاگتے حیات کے ساتھ تمہیں یہ رشتہ منظور ہے؟“

”نہیں۔“ آسیہ نے پورا زور لگا کر چیخا چاہا تھا لیکن اس سے پہلے اسے بڑی زور کا جکڑ آیا اور سنہلنے  
اس کا ہاتھ دروازے پر یوں لگا کہ خلیل بھائی نے چونک کر دیکھا اور فوراً ”بڑھ کر اسے کندھوں سے تو  
ساتھ لگاتے ہوئے آہستہ سے بولے۔

”موصدا بننا! موصدا۔“  
وہ ساری توانائیاں صرف کر کے بھی حلق سے کوئی آواز نہیں نکال سکی۔ البتہ آنکھیں لباب بھر گئیں

بہت لمبی انداز میں نفی میں سر ہلایا تو خلیل بھائی اسے تقریباً ”ٹھٹھٹے ہوئے ڈیرنگ روم سے باہر۔  
دونوں بازوؤں کے حلقے میں لایا تو اس کا پورا وجود جھٹکنے لگا رہا تھا۔

”معا۔ سارے میں مبارک سلامت تمہی آوازیں گونجنے لگیں پھر قریب سے گزرتے خلیل بھائی کی آواز  
”اچھا نہیں ہوا۔“

”انتا بڑا دھوکا۔“ میسا بھی ”میاں سے کہہ رہی تھیں۔  
”بس خاموش رہو۔“ خلیل بھائی نے انہیں ڈانٹا تب وہ پورا زور لگا کر ان کے بازوؤں سے نکل کر

”میں خاموش نہیں رہوں گی، ہرگز نہیں۔ جا کر کہہ دیں سب سے، جس طرح آئے ہیں؟“  
جاگتے ورنہ میں۔“

”آسیہ! آسیہ! ہوش سے کام لو۔“ خلیل بھائی ٹوک کر بولے۔  
”میں بھی تو ہوش میں آئی ہوں بھائی۔“ وہ رو پڑی۔

”مما! ممما! کیا ہوا۔؟“ مدیہ بھاگ کر اس کے پاس آئی تھی کہ اسی مل فائرنگ کی آواز سے پوری ف  
”یہ کیا ہو رہا ہے ماموں جی۔؟“ مدیہ نے سہم کر خلیل کو دیکھا تو وہ گہری سانس کھینچ کر بولے۔  
”خوشی کا اظہار ہو رہا ہے۔“

”اوگاڑا! میں دیکھوں۔“ مدیہ بھاگی ہوئی لان میں اتر گئی۔

394

اتنی افزائش میں کوئی نہیں سمجھ پارہا تھا کہ کیا ہوا ہے۔ خلیل بھائی اپنے مہمانوں سے معذرت کر کے انہیں رخصت کر رہے تھے۔

خلیل بھائی ابھی بھی مصلحت کا دامن تھامے ہوئے تھے اور اس دھوکا دہی پر بجائے علی جمائیک پر ناراض ہونے کے بہت مضبوط کہہ رہے تھے۔

”ٹھیک ہے۔ اب صاحت آپ کی امانت ہے لیکن اس وقت رخصتی ممکن نہیں ہے اس کے لیے مناسب وقت کا انتظار کرنا پڑے گا۔“ پھر وہ علی جمائیک کے ساتھ اس کی گاڑی تک گئے تھے اور جب انہیں عدیل کے بازوؤں میں جھونٹی آسیدہ کو دیکھ کر تشویش سے پوچھنے لگے۔

”اسے کیا ہوا ہے؟“

”جانتیں بھائی! میں تو اس کی چیخ سن کر۔“ البانی کے آنے سے عدیل کی بات ادھوری رہ گئی۔

”چلو بیٹا! اب جو بھی ملے کرنا ہے گھر چل کر کرو! اباجی نے کہا۔“

”جی اباجی! آپ اماں جی اور بیچوں کو لے کر چلیں۔ ہم بھی آ رہے ہیں۔“

خلیل بھائی کہتے ہوئے غیر محسوس طریقے سے آسیدہ کے سامنے آکھڑے ہوئے تاکہ البانی کی اس پر نظر نہ پڑے۔



دستک کی آواز پر اس نے چونک کر دروازے کی سمت دیکھا پھر قریب جا کر آہستہ آواز میں پوچھا۔

”کون؟“

”میں ہوں نیل دروازہ کھولو بیٹا۔“ نیل کی آواز سن کر اس نے کچھ دیر سوچا پھر دروازے کا لاک کھول کر طرف سے پیچھے موڑ کر کھڑی ہو گئی۔ نیل اندر داخل ہوئے اور اسے اکیلے دیکھ کر پوچھا۔

”اور کوئی نہیں ہے یہاں۔“

وہ ایک دم پلٹ کر ان کے بازو سے لگ گئی۔

”نیل بھائی! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے مہمان کہاں ہیں اور یہ اتنی گولیاں کیوں چل رہی تھیں کیا کوئی؟“

”کچھ نہیں ہوا چلو میرے ساتھ۔“ نیل نے نوک کر کہا۔

”کہاں؟“

”یہ سامان تمہارا ہے یہ بھی لے لو۔“ نیل اس کا کہاں نظر انداز کر گئے۔

”لیکن ممانے تو کہا تھا۔ میں ان کے علاوہ کسی کی۔“

”ادھر وہ! تم چلو تو۔“ نیل قصداً سمجھلائے پھر خود ہی پیکٹ اور بیوٹی بکس اٹھا کر اسے تھماتے ہوئے بولا۔

الحال کوئی سوال مت کر دیکھو کہ میں جواب نہیں دوں گا بس اتنا سن لو کہ ہم گھر جا رہے ہیں۔“

اس کے ہونٹ ذرا سے نیم ہوا ہوئے لیکن کچھ بول نہیں سکی۔ اس لیے نیل نے منع کیا تھا بلکہ جو تھی۔ پھر سر جھکا کر ان کے ساتھ چل پڑی۔

ڈرینک روم سے باہر ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ اندر ہی اندر الجھنے لگی لیکن سروانچا کر کے نہیں دیکھا اور اسی طرح گاڑی میں بیٹھ گئی جب نیل اس کے برابر بیٹھے تب اس سے مزید صبر نہیں ہوا۔

طرف دیکھ کر عاجزی سے بولی۔

”جانتا میں نیل بھائی! گھر میں سب ٹھیک ہیں ناں۔“

نیل نے ذرا سا اثبات میں سر ہلایا پھر اسے ایک بازو کے حلقے میں لے کر اپنے ساتھ لگایا یوں جیسے چھلنے ہوئی بچی کو سہارا دیا جائے اور وہ پھر بھی مطمئن نہیں ہوئی مزید عروسی جوڑے نے اسے پابند کر دیا تھا جو داخل ہو کر وہ کسی سے فوراً کوئی سوال نہیں کر سکی اور سیدھی اوپر چلی آئی۔ اپنے کمرے میں داخل ہو کر بند کرنے لگی تھی کہ بھاگتے قدموں کی آواز سن کر رک کر انتظار کرنے لگی۔ چند لمحوں بعد سونیا آئی۔

”میں نے سوچا تمہاری مدد کروں۔“ سونیا نے بظاہر ہلکے پھلکے انداز میں کہا کہ اسے اپنے پیچھے دروازہ بند

ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔

نیل کیا ہوا ہے؟ اتنی خاموشی کیوں ہے؟ ممان اور مدھو کہاں ہے؟

”جی ہاں! چلو تم پہلے کمرے تبدیل کر کے منہ بائیں دھو لو۔“ سونیا نے کہا اور ہر گھراں کے دوپٹے میں لپکتے ہوئے گئی اس کے بعد زیور انار کر الماری میں رکھنے کے ساتھ اس کے لیے ایک سوٹ بھی نکال لیا۔

”نہا کر بولی۔“

”نیل! وہاں بھوک لگی ہو تو بتاؤ میں کچھ کھانے کو لے آتی ہوں۔“

”بھوک نہیں ہے۔“ وہ کہتی ہوئی واش روم میں چلی گئی۔

نیل تو سونیا کو موجود نہ پا کر وہاں ہی ہو گئی دل چاہا چیخ کر سب کو پکارے اور پوچھے کہ اسے اتنا بے خبر کیا ہوا ہے ایسی کیا بات ہو گئی ہے جو اس سے چھپائی جا رہی ہے۔

”بے خدا! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ بہت بے دلی سے اس نے عروسی شرارہ بیڈ پر پھینکا اور خود بھی ڈھسے لگی تو علی جمائیک کا خیال آیا۔

”جی! جی! جی! تو ٹھیک ہیں ناں؟“ وہ فوراً ”اٹھی تھی کہ سونیا ٹرے میں چائے کے ساتھ بسکٹ وغیرہ لے کر

نے سوچا، تم تک پہنچ کر گوگی میں چائے بنا لوں گی۔“ سونیا نے ٹرے اس کے سامنے رکھ دی پھر بیٹھے لگی۔

”میں جانتی ہوں تم بہت اچھے رہی ہو اور پریشان بھی ہو۔“

نیل بولی۔ ”وہ نوک کر بولی“ جو بھی کہنا ہے سیدھے صاف لفظوں میں کہہ دیں میں سب سن لوں گی۔“

نیل لیکن خیر اصل بات یہ ہے کہ پھوپھو تمہاری شادی علی جمائیک کے ساتھ نہیں کرنا چاہتیں۔“ سونیا بد مہلتانہ کا فیصلہ کر کے یوں کہا جیسے یہ کوئی بات ہی نہ ہو۔

”میرا مطلب ہے۔“ اس کا دل ڈوبنے لگا تھا۔

نیل اس کا مطلب سمجھ رہی ہوں۔“ سونیا فوراً بولی۔ ”وہ جو علی جمائیک سے ناں وہ شاہ سکندر کا بھتیجا ہے اور یہ مانے پہلے سے نہیں بتائی تھی ورنہ پھوپھو پہلے ہی انکار کر دیتیں، یعنی اپنی اصلیت چھپا کر وہ تمہیں

اپنا رہے تھے دھوکے سے۔“

”اے۔“ اس نے اپنی آواز کیسے دور سے آتی لگی تھی۔

”نیل! دھوکا نہیں ہے۔“ سونیا چائے کا سپ لیتی ہوئی بولی۔

”نیل! تم صدمہ ہی ہو گئی۔“

جی! بھی ان کی اصلیت نہ کھلتی تو تم تو پہنچ چکی تھیں شاہ پور۔“ سونیا اس کی کیفیت سے بے خبرانی کے حال اللہ جانے تمہارے ساتھ کیا سلوک ہوتا۔ بہر حال اس وقت تمہیں بہت اہمیت سے کام لینا ہے، پھوپھو کے سامنے انہیں یقین دلاؤ کہ تم انہیں چھوڑ کر نہیں جاؤ گی۔ سمجھیں تمہارے یہاں آجانے سے نہ ہو گئی کیونکہ نکاح ہو چکا ہے اور اس کے بل پر وہ تمہیں لے جانے کی کوشش ضرور کریں گے۔“

”نیل۔“ وہ جانے کس خیال سے سسم کر رہی تھی۔

”نیل۔“ سونیا نے چائے کا کپ رکھ کر اس کے گرد دونوں بازوؤں کا حلقہ بنا لیا۔ ”یہ کیا حماقت کر رہی ہو؟“

”نیل! تم جانتے ہو۔“ جانتا نہیں پھوپھو کو ہوش آیا کہ نہیں۔“

”نیل! تمہیں کچھ کرنا چاہی۔“ ممان کو کیا ہوا ہے؟“

نیل عدیل چاچو ہم میں سے کسی کو کمرے میں جانے ہی نہیں دے رہے تم چلو شاید تمہیں جانے دے گا تو اس نے فوراً ”اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”نیل کہاں ہے؟“

”میں تو میں نے نہیں دیکھا شاید پھوپھو کے پاس ہوگی۔“

خدا۔ ”وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی اور اگلے پل چاروں اور چھوٹی لڑیوں کو بے دردی سے کھینچنے لگی۔ لڑیاں اس کے وجود سے لپٹ گئی تھیں۔ کچھ بازوؤں میں الجھ گئیں جس سے اس کی جھنجھلاہٹ میں

دبا۔ ”آگ لگا دوں گی میں سب کو۔“ وہ بری طرح تملتا کر بڑبڑاتی تھی کہ دروازہ کھلنے کے ساتھ علی

پہلے ہو کر بولا۔

”پہلے“

”پہلے لڑیوں سے آزاد کرانے کی سعی بھول کر اسے دیکھنے لگی۔

”کوئی اٹھاڑے کا۔“ علی جتنا تیرنے سارے میں بکھرے پھولوں کو دیکھتے ہوئے قدرے محفوظ

باندھ رکھا تھا کہ وہ تیز ہو کر بولی۔

”آپ؟“

”وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا سانس جیسے مجھے نہیں جانتیں۔ وہ لڑیوں سمیت مسہری سے اتر کر اس

نزلولی۔

”آپ ہی کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔“

”بہائیں مانتا ہوں کہ یہ سب۔۔۔۔۔“

”ن علی جتنا تیریں۔“ وہ ایک دم سمجھ کر خامے تسنن انداز میں اس کے گرد چکر کاٹ کر پھر اس کے

پاؤں پر چڑھ گئی۔ ”چھوٹے آپ سے پوری ہمدردی ہے کہ آپ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے۔“

”بے ہمارا۔“ وہ کچھ ٹھٹھک کر دیکھنے لگا۔

”یہ کہ میں صاحبت نہیں ہوں اور نہ ہی اس کی طرح معصوم، مسکین اور بزدل ہوں، سمجھے آپ۔“

”بچار کما تو علی جتنا تیر پیداشانی پر بے شمار شنائیں ڈال کر اسے یوں دیکھنے لگا جیسے اس کی بات سمجھنے کی

یاد۔

”ہاں ہی چھوڑ کر ٹھٹھنے کے انداز میں دروازے تک آئی اور اسے پورا کھول کر باہر دیکھنے لگی۔ طویل

نار اور اس سے آگے غالباً ”تیرس اور بس“ میں تک روشنی تھی اس کے بعد گھپ اندھیرا تھا۔

”یوں ہی جگہ ہے۔“ اس نے پلٹ کر پوچھا۔

”نار ایک دم پلٹا اور اسے دروازے کے پتوں بچ کھڑے دیکھ کر خاصا متعجب سا ہو کر اس کی طرف بڑھتے

زکات سے سب لوگ کیا کہیں گے۔“

”اؤل کے کہنے کی کبھی پروا نہیں رہی۔“ وہ بے نیازی سے کہہ کر رہاداری میں نکلی تھی کہ علی جتنا تیر

ت میں اس تک پہنچ کر اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولا۔

”نار کو۔“

”ت لگاؤ مجھے۔ میں نے کہا نہیں، میں صبا نہیں ہوں۔“ وہ جھٹکے سے اپنا بازو اس کی گرفت سے چھڑا کر

بھاگتی قسمت کو رو رہی ہوگی۔ اس بزدل کو رونے کے علاوہ اور آتا ہی کیا ہے، ہونہ۔“

”میں نے پہلی بار ٹھٹھک کر اسے سر تپا دیکھا۔ وہی آنکھیں، وہی ہونٹ، وہی سر! کوئی فرق نہیں تھا پھر

بہائیں کر گیا۔

”ناما نہیں ہو۔“ پھر انگوٹھے سے دائیں جانب اشارہ کر کے بولا۔ ”ادھر چلی جاؤ۔ باباجان ابھی لاؤنج

رہ نہیں جو بھی کہنا ہے ان سے کہو۔“

”بابان! آپ کے فادر۔“ وہ اس کے اشارے کی سمت دیکھ کر پھر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر

سڑھیاں پھیلاکتی ہوئی نیچے آئی تھی۔

”ابا جی کے کمرے کے باہر میونہ۔“ بھائی جی سیما بھی اور اماں جی بیٹھی تھیں جب کہ دروازے کے پاس علی اور

نبیل کھڑے تھے اور وہ جو بیٹھیاں پھیلاکتی ہوئی آئی تھی بس ایک لحظہ کو غصہ لگی۔ پھر ایک دم آگے بڑھ کر بولی۔

”مجھے مت روکے گا نبیل بھائی! میں ماما کو دیکھوں گی۔“

”دیکھ لینا بیٹا، دیکھ لینا ذرا صبر کرو۔“ نبیل سے پہلے عدیل نے کہا تو وہ چل کر بولی۔

”نہیں ماماں جی! میں صبر نہیں کر سکتی۔ مجھے اندر جانے دیں۔“

”جانے دو۔ شاید اسے دیکھ کر۔“ میونہ بھائی اسی قدر کہہ کر خاموش ہو گئیں تو عدیل کچھ دیر کو ان کی طرف

متوجہ ہوئے پھر احتیاط سے دروازہ کھول کر آہستہ آواز میں اس سے بولے۔

”ماما کو پریشان نہیں کرنا بیٹا۔“

”نہیں۔“ وہ دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوئی لیکن آسیہ کو دیکھتے ہی بے اختیار اسے پکارا۔

”ماما۔!“

”آسیہ بالکل سیدھی ساکت لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔ اس کی آواز پر بھی اس کے وجود میں کوئی حرکت

ہوئی البتہ آنکھیں پانیوں سے بھر گئی تھیں۔

”ماما۔“ وہ آسیہ کے قریب جا بیٹھی اور دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر اس پر جھک کر دھیرے سے بولی۔

”میں آپ کے پاس ہوں ماما۔“

”آسیہ نے ذرا سی پلکیں جھپکیں تو آنکھوں کا پانی روانی سے کناروں سے بہنے لگا۔

”ماما پلیز! رو میں نہیں، میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔“ اس کے لمبے میں عاجزی کے ساتھ بے

دکھ تھا۔

”آسیہ نے آنکھیں بند کر لیں اور بہت کوشش کے بعد اس کے ہونٹوں سے سسکی کی صورت نکلتا تھا۔

”مدحو۔“

”تم تو بہت بہادر ہو بیٹا۔“ ماما جی سر ہانے بیٹھ کر آسیہ کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگے ”ہمت سے“

تمہاری مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہو گا صبا جو بیٹا مدحو کو بلا لاؤ۔“

وہ اٹھنے لگی تھی کہ آسیہ نے ایک دم اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور آنکھوں سے لگا کر بولی۔

”مدحو نہیں ہے ابابائی! مدحو نہیں ہے۔ وہ لگنے لگے۔“

”کون؟“ ماما جی سے زیادہ خلیل بھائی اور خلیل بھائی چونکے تھے۔

”مدحو کو لے گئے۔ نہیں ماما! میں بلاتی ہوں اسے۔“ وہ ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا کر مدحو کو دیکھنے

تھی۔



مدحو نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولی تھیں۔

بڑا خوبصورت ماحول تھا۔ جنازی ساز مسہری چاروں طرف سے گلاب کی لڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھی اور

ذہن کو تھک ابھی پوری طرح بیدار نہیں ہوا تھا اس لیے فوری طور پر سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے۔

نے اٹھنے کی کوشش کی۔ کتنی دیر تک پلکیں جھپک جھپک کر خود پر تنے گلابوں کے سائبان کو دیکھنے لگی۔

تھک کر زار پر کو آنکھیں بند کی تھیں کہ اس کے ذہن میں جھماکے ہونے لگے۔

شادی، افغانی، فائرنگ اور پھر۔۔۔ اس کے سینے میں دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ سانس بھی نہ

تھیں۔ جیسے میلوں بھاگتی آئی ہو۔

”گرینڈ فور شاہ حیات محمد۔“ وہ اس کا رد عمل دیکھنے کی خاطر اس پر نظریں جماتا رہا۔  
وہ ایک دم اچھل پڑی۔

”جس کیپا، تم تو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ آسہ کے پاس تمہاری بیٹی ہے یا بیٹا۔“ باباجان نے کہا تو وہ انہیں  
نے کی بجائے سہولت سے بولے۔

”اب تو جان گیا ہوں کہ ایک نہیں دو بیٹیاں ہیں، صباحت اور مدحیہ۔ آپ یقین نہ کریں تب بھی یہ حقیقت  
میں آئی ہے۔“

”جی“ آپ شاہ پور میں ہیں۔ یہ شاہ پور ہے، یعنی میں۔“  
”وہ کچھ دیر اس کے پیچھے دیکھتی رہی پھر جیسے خواب کے عالم میں دھیرے دھیرے چلتی ہوئی ریڈنگ کے پاس  
نیچے دیکھنے لگی۔ وسیع و عریض لاؤنج تیز روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ درمیان میں ایرانی قایم کے چاروں اطراف  
صوفیوں پر جانے کون کون رہا تھا۔ کسی شناسا چہرے کی تلاش میں اس کی نظریں سمجھتی ہوئی شاہ سکندر  
نہیں تو اس کے دل میں ایک لہری اٹھی تھی اور دوسرے پل وہ بیڑھیاں اتر کر ان سب کے درمیان آ  
ہوئی۔

”ہیں“ باباجان نے تعجب سے اسے بول دیکھا جیسے یہ کہاں سے آئی۔  
”میں نے سوچا“ آپ لوگ اپنی جیت کی خوشی منارہے ہوں گے۔ میں بھی آپ کے ساتھ شامل ہو جاؤں۔  
کہہ کر زور سے ہنسی اور پھر ایک ایک کو دیکھ کر ہنسی چلی گئی۔ اس کی ہنسی میں واضح تمسخر تھا۔  
شاہ جہانگیر نے بول کھلا کر شاہ سکندر کو دیکھا لیکن وہ اپنی جگہ پریشان ہو کر باباجان کو دیکھ رہے تھے جن کا چہرہ  
اور توہین کے احساس سے سرخ ہو گیا تھا پھر وہ ایک دم اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر دھاڑے۔

”خاموش۔“  
مدحیہ کی ہنسی وہیں تھم گئی، لیکن وہ خائف نہیں ہوئی بلکہ براہ راست ان کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔  
”تو آپ ہیں شاہ حیات محمد، میرے باپ کے باپ۔“

”صبا“ شاہ سکندر نے سرزلش کے انداز میں بولا تھا کہ وہ چیخ کر بولی۔  
”صبا نہیں ہوں میں لیکن آپ کیا جانیں گے کبھی دیکھا ہو تب تو۔“  
”آرام سے بیٹا، آرام سے۔“ شاہ جہانگیر نے صورت حال سنبھالنے کی سعی کی۔  
”آرام سے۔“ وہ طنز آمیز تنہائی سے گویا ہوئی۔ ”باپ“ دادا، بیٹی کو اغوا کر کے لے آئے ہیں اور یہ بھی  
جانتے کہ وہ کون ہے۔ مدحیہ ہوں میں مدحیہ سکندر۔“

”مدحیہ۔“ شاہ سکندر کے ذہن میں جھجک چلنے لگے تھے۔  
”آس“ ہماری بیٹی ہوئی تو، ام اس کا نام مدحیہ رکھیں گے۔“  
”ہوں“ اچھا نام ہے۔“ اس نے سوچتے ہوئے انداز میں کہہ کر پھر خوشی سے پوچھا تھا۔ ”ویسے کا  
مدحیہ؟“

”کیا مطلب؟ تم مجھے ایسا سمجھتی ہو۔“  
”میرے خدا۔“ انہوں نے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر سر کو ذرا سا جھکا دے کر مدحیہ کو دیکھا تھا۔ وہ ا  
اسی زہر خند سے بول رہی تھی۔

”آپ نے ماما کو دھوکا دے دیا لیکن اس سے بڑا دھوکا آپ نے خود کھایا ہے۔ صباحت میری بہن ہے  
ہیں۔ بنانے والے نے صرف ہماری شکلیں ایک جیسی بنائی ہیں، مقدر ایک جیسے نہیں لکھے۔“ آخر  
کس خیال سے اس کے لہجے میں آزدگی سمٹ آئی تھی۔

”جھوٹ بولتی ہو تم۔“ باباجان اس کا یقین کرنے کو تیار نظر نہیں آ رہے تھے۔  
”نہیں باباجان۔“ شاہ سکندر نے آگے بڑھ کر مدحیہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”میری بیٹی جھوٹ  
رہی۔“

مدحیہ نے چونک کر شاہ سکندر کو دیکھا اور اپنے کندھے پر ان کے ہاتھ کے لمس کو یوں محسوس کیا جیسے  
اپنی احساس کو ترس رہی ہو۔

”آس“ ہماری بیٹی ہوئی تو، ام اس کا نام مدحیہ رکھیں گے۔“  
”ہوں“ اچھا نام ہے۔“ اس نے سوچتے ہوئے انداز میں کہہ کر پھر خوشی سے پوچھا تھا۔ ”ویسے کا  
مدحیہ؟“

”کیا مطلب؟ تم مجھے ایسا سمجھتی ہو۔“  
”میرے خدا۔“ انہوں نے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر سر کو ذرا سا جھکا دے کر مدحیہ کو دیکھا تھا۔ وہ ا  
اسی زہر خند سے بول رہی تھی۔

”آپ نے ماما کو دھوکا دے دیا لیکن اس سے بڑا دھوکا آپ نے خود کھایا ہے۔ صباحت میری بہن ہے  
ہیں۔ بنانے والے نے صرف ہماری شکلیں ایک جیسی بنائی ہیں، مقدر ایک جیسے نہیں لکھے۔“ آخر  
کس خیال سے اس کے لہجے میں آزدگی سمٹ آئی تھی۔

”جھوٹ بولتی ہو تم۔“ باباجان اس کا یقین کرنے کو تیار نظر نہیں آ رہے تھے۔  
”نہیں باباجان۔“ شاہ سکندر نے آگے بڑھ کر مدحیہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”میری بیٹی جھوٹ  
رہی۔“

مدحیہ نے چونک کر شاہ سکندر کو دیکھا اور اپنے کندھے پر ان کے ہاتھ کے لمس کو یوں محسوس کیا جیسے  
اپنی احساس کو ترس رہی ہو۔

”آس“ ہماری بیٹی ہوئی تو، ام اس کا نام مدحیہ رکھیں گے۔“  
”ہوں“ اچھا نام ہے۔“ اس نے سوچتے ہوئے انداز میں کہہ کر پھر خوشی سے پوچھا تھا۔ ”ویسے کا  
مدحیہ؟“

”کیا مطلب؟ تم مجھے ایسا سمجھتی ہو۔“  
”میرے خدا۔“ انہوں نے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر سر کو ذرا سا جھکا دے کر مدحیہ کو دیکھا تھا۔ وہ ا  
اسی زہر خند سے بول رہی تھی۔

”آپ نے ماما کو دھوکا دے دیا لیکن اس سے بڑا دھوکا آپ نے خود کھایا ہے۔ صباحت میری بہن ہے  
ہیں۔ بنانے والے نے صرف ہماری شکلیں ایک جیسی بنائی ہیں، مقدر ایک جیسے نہیں لکھے۔“ آخر  
کس خیال سے اس کے لہجے میں آزدگی سمٹ آئی تھی۔

”اب میں پہنوں گی کیا۔ ان میں تو ابھرن ہو رہی ہے۔“  
شاہ سکندر فوراً جواب نہیں دے سکے۔ غالباً ”فوری“ نام سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

اس نے کمرے میں ادھر ادھر نظر ڈالی پھر واش روم کھنکھایا۔ رات وہ صبا کے ساتھ نہ لی پارلر سے تیار ہوئی تھی۔ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتے ہوئے اسے جانے کیا کچھ یاد آیا۔ پھر ان ہی سوچوں کی گرفت میں رہ کر اس نے پیر میک اب صاف کیا پھر منہ دھویا اس کے بعد بالوں میں شکر کے نفی تو بیڈ پر تین چار سوٹ رکھے تھے۔ باقی کچھ ہنگامے ہوئے۔ جنہیں دیکھ کر بھی اس نے قصداً ”نہ“ انداز کر دیا اور اپنا ڈیوٹہ اٹھا کر شانے پر ہکا باری تھی کہ الماس مزید دوسوٹ لے کر آئی۔

”پاپا دیکھیں یہ کیسے۔“ الماس دروازے سے داخل ہونے کے ساتھ بولنے لگی تھی لیکن اسے دیکھتے ہی خاموش ہو گئی۔  
اس نے اپنی مصروفیت ترک کر کے بے اختیار سراپا کیا اور الماس کے دونوں ہاتھوں میں ٹنگر دیکھ کر غور سے بولی۔

”میں اتن نہیں پہنتی۔“  
”تمہاری مرضی۔“ الماس نے جواباً ”ناگواری کے کنارے کے ساتھ دونوں ٹنگر بیز پر اچھال دیے اور اوپر جانے لگی کہ شاہ سکندر اسے پکار کر بولے۔

”الماس! یہ تمہاری بڑی بہن ہے مدحیہ۔“  
الماس کچھ نہیں بولی لیکن اندازاً یہاں تھا جیسے میں کیا کہیں۔  
”اور مدحیہ بٹا!

یہ میری پھولی بہن ہے۔“  
وہ فوراً ”کہہ کر ذرا سانس ہی پھر شاہ سکندر کو دیکھ کر بولی۔ ”مجھے بھوک لگی ہے۔“  
”ہاں چلو بی بی جان کھانے پر انتظار کر رہی ہیں۔“ شاہ سکندر کہتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھے تو وہ ان پیچھے چلتی ہوئی الماس کے قریب رک کر بولی۔  
”تم بھی چلو۔“ اور اس کے کچھ کہنے سے پہلے آگے بڑھ گئی۔

ڈانکنگ ہال میں باباجان کے علاوہ سب موجود تھے۔ اس نے داخل ہوتے ہی سب پر اپنی نظر ڈالی تھی پھر ہی یوں کھانے میں مصروف ہو گئی جیسے پیشہ سے یہیں رہتی آرہی ہو۔ یعنی کوئی تکلف نہیں نہ غیرت۔ ماسب کے درمیان وہ خود کو اجنبی محسوس کر رہی تھی حتیٰ کہ قریب بیٹھے شاہ سکندر بھی اسے نہیں لگ رہے۔ پھر بھی اس نے کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا نہ ہی ذرا کو مہمان پوز کیا تھا اور سب سے پہلے کھانا ختم کر کے ہوئی اور کھانا سرو کر لی ملازمہ کو دیکھ کر بولی۔

”مجھے فوراً چائے چاہیے۔“  
”جائے کس نے کہا تھا۔ اس کے ساتھ بی بی دلی ہنسی۔ جسے وہ نظر انداز کرتی ہوئی ڈانکنگ ہال۔“  
کرلاؤنچ میں آبیٹھی اور گلاس وال ہے باہر دیکھنے کی غیور کو ریڈور سے آگے غالباً ”ذرا سیوے“ تھا۔ اس لان جس کی آخری حد نظر نہیں آرہی تھی۔

”تو یہ میرے باپ دادا کا گھر۔“ وہ اپنے آپ سے کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور ٹہلنے کے انداز میں رابڈاری نظر آئی اس میں داخل ہو گئی۔ دائیں ہاتھ پر بند دروازے کو ذرا سا ہٹھول کر دیکھا۔ وسیع دروازے جس کی سیاہی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ وہ فوراً دروازہ بند کر کے آگے چل پڑی۔ آخر میں بائیں جانب دروازہ وہ بھی بند تھا۔ اس نے ہینڈل کھما کر دروازہ کھلیا تو سامنے مسہری باباجان تھے۔ دروازے پر آواز پر ہی متوجہ ہو گئے تھے اور اسے دیکھ کر ان کی زبانی ٹھکن آؤہو گئی۔ جس سے وہ چند ٹانھے کھٹکھٹا آرام سے اندر داخل ہوتے ہوئے بولی۔

”کھانے پر نہیں آئے۔؟“

بی بی اتنی تیز نہیں کہے کہ بیوں کو پہلے سلام کیا جاتا ہے اور اندر آنے سے پہلے بھی اجازت لی جاتی ہے۔ یہ ہے۔ یہاں ہم جسے بلاتے ہیں وہی آتا ہے۔ خود سے آنے کی جرات کوئی نہیں کرتا۔ یہ ہم ہمیں پہلی اور ہمارے ہیں۔ آئندہ خیال رکھنا۔“ باباجان نے اس کی بدتمیزی کو ٹوک کر بتایا۔  
بی بی نے سلام نہیں کیا یہ میری غلطی ہے۔ اس کے بعد میں کچھ نہیں جانتی یعنی اس حویلی کے ادب اصول۔ نہ ہی وہ مجھ پر لڑا کو ہوتے ہیں۔ کیونکہ میں یہاں رہی نہیں اور نہ ہی رہنے کا ارادہ ہے۔ وہ ہے کہتی ہوئی بڑے آرام دہ انداز میں صوفے میں دھس گئی۔

بی بی یہیں کھتاخ بھی ہو۔ تمہاری ہاں نے۔“  
”ہاں کانام میں لہجے گا۔“ وہ فوراً ”بول پڑی۔“ ”ان سے آپ کا کوئی تعلق نہیں۔“  
”دین۔“ باباجان کا ضبط جواب دینے لگا تو فضل دین کو پکار کر بولے۔ ”سکندر کو بھیجو ہمارے پاس۔“  
”سکندر کیا کر لیں گے۔“ اس نے سوچا اور نیبل سے اخبار اٹھا کر گھٹنوں پر پھیلاتی ہوئی انہیں سنا کر بولی۔  
”میں شاید میرے اغوا کی خبر چھپی ہو۔ کہ شادی ہال سے دلہن کا اغوا۔“

”ان انتہائی قہر آلود نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔  
”نوں بعد شاہ سکندر کمرے میں داخل ہوتے ہی بولے۔  
”ہم ٹیک باباجان۔“

”ہاں اس پر سے نظریں ہٹا کر شاہ سکندر کو دیکھا اور سلام کا جواب دیے بغیر اس کی طرف اشارہ کر کے بی بی کو سب سے پہلے یہاں کے آداب سکھاؤ۔“

”نہ آہستہ سکھ جائے گی باباجان۔“ شاہ سکندر اس کی نشست کا انداز دیکھ کر یہی سمجھ کہ باباجان کو اس کا ہے بیٹھنا ناگوار کر رہا ہے۔ اس لیے بڑے آرام سے بولے تھے۔  
”نہ آہستہ یعنی تب تک ہم اس کی بدتمیزیاں اور گستاخیاں برداشت کرتے رہیں ہرگز نہیں۔ لے جاؤ رہے اور سمجھاؤ کہ اس وقت تک ہمارے سامنے نہ آئے جب تک ہمارے سامنے مودب کھڑے ہوتا ہے۔“ باباجان نے اتنے عرصے سے کہا کہ شاہ سکندر خائف سے ہو گئے لیکن وہ ہنوز سی لا پرواہ سے انداز میں بند کرتے ہوئے بولی۔

”بہن! ہاتھ باندھ کر۔ سوری یہ تو میں قیامت تک نہیں سیکھ سکتی۔“  
”بہن میرے ساتھ آؤ بیٹا۔“ شاہ سکندر اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑے۔  
”دراغصور۔“ وہ جاتے جاتے رک گئی۔

”اور سنو فون کر کے اپنی ماں سے پوچھو کہ ہم دلہن رخصت کرانے کب آئیں۔“ باباجان نے خاصے انٹس اجازت دینے کے ساتھ کہا۔  
”لو بے ساختہ ہنسی اور فوراً۔“ ہونٹوں پر ہاتھ بھی رکھ لیا لیکن شاہ سکندر اسے کھینچتے ہوئے باہر لے

”بی بی تیزی سے۔“  
”مجھے ان کی مصروفیت پر ہنسی آئی۔“ وہ بے شکل اپنی ہنسی روک کر کہنے لگی۔ ”یعنی وہ ابھی بھی یہ سمجھ رہا تھا کہ دلہن رخصت کر دیں گی۔ وہ نہیں جانتے لیکن آپ تو جانتے ہوں گے ماما کو اور صبا کو میں جانتی ہوں۔“  
”ماما صبا کے بغیر تو وہ ایک اچھا ادھر ادھر نہیں ہو سکتی۔“  
”یہ۔“ شاہ سکندر غیر ارادی طور پر پوری جان سے متوجہ ہو گئے تھے۔  
”یہاں مرضی کی مالک ہوں۔“ وہ گردن اٹھا کر بولی۔

”اچھی بات ہے۔ اب آپ بی بی جان کے پاس جاؤ، میں کسی کو بھیج کر آپ کے لیے کپڑے وغیرہ منگوا دوں۔“  
وہ بے جوہر اس لیے لڑائی تھی وہ بھی نہیں تھے۔ ”انہوں نے چلتے ہوئے کہا۔“

”تھے تو اس کے بعد میں جانتی کہ میں نے اس کی چیز لے لی۔“  
شاہ سکندر کچھ نہیں بولے اور اسے لاؤنج میں چھوڑ کر باہر نکل گئے۔

وہ بویں ہی ان کے پیچھے دیکھنے لگی تھی کہ گلاس وال سے نظر کو ریڈور میں کھڑے علی جمالیہ پر پڑی اور پھر دھیانی میں اسے ہی دیکھنے لگی۔ سفید کانٹن کے کلف لگے شلوار سوٹ میں اس کا درازہ زندہ اور نمایاں ہو گیا تو جانے اس کی رنگت بھی ہی ایسی یا سنہری دھوپ کا عکس تھا جو اس کے چہرے کو جاذب نظر بناتا تھا۔  
”صبا، تم ہمیشہ سے۔“ وہ جانے کیا سوچنے جا رہی تھی کہ اسی پل علی جمالیہ نہ صرف متوجہ ہوا بلکہ اس کے آگیا تھا۔

”ہیلو“ خاصا دوستانہ انداز تھا۔

وہ نظرس چرا کر دوسری سمت دیکھنے لگی۔

”کب ناراض ہیں؟“ علی جمالیہ نے پوچھا۔

”چائیں ابھی تک میں سمجھ نہیں سکی کہ مجھے کس بات کا اظہار کرنا چاہیے۔ ناراضی خوشی دکھ، افسوس،“  
”بس۔“ وہ ٹوک کر بولا۔ ”جب سمجھ جائیں تو بتا ضرور دیکھیں گے۔“

”اچھی بات ہے۔“ اس کے ہونٹوں سے اپنے آپ گہری سانس خارج ہوئی پھر ادھر ادھر دیکھ کر پوچھنے  
”اتنی خاموشی کیوں ہے۔ سب لوگ کہاں ہیں؟“

”اپنے اپنے کمروں میں۔“ علی جمالیہ نے سرسری انداز میں بتایا اور اس کے خاموش رہنے پر قدرے  
سے پوچھنے لگا۔

”سٹین“ آپ اپنے گھر فون نہیں کریں گی۔“

”اپنے گھر میں تو کھڑی ہوں۔“ وہ سمجھ کر بھی انجان بنی۔

”میرا مطلب ہے اپنی ماما کو۔“

”کیوں کروں؟ یہ بتانے کے لیے کہ میں یہاں خیریت سے ہوں۔ وہ میری فکر نہ کریں اور مزید صبا کو  
کرنے کا سوچیں۔ سوری، ممانہ تو میری کسی بات کا یقین کریں گی اور نہ ہی عمل“ اس لیے فی الحال میرا  
رابطہ کرنے کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔“

”میری بات کرادیں صبا۔“ وہ کسی طرح اپنے لیے بے قراری چھپا نہیں سکا۔

”سوری امین، میں جب تک ماما سے یہ معلوم نہ کروں کہ وہ کیا چاہتی ہیں تب تک میں کچھ نہیں کر  
مما کو فون بھی جب میرا دل چاہے گا کروں گی۔“ اس کے ”وہ بغیر کسی مروت لحاظ کے صاف منع کر کے آگے  
نہیں۔“

\*~\*~\*

آسمہ گھنوں کے گرد بازو پیٹے بیٹھی تھی اور ہر ایک کی بات کے جواب میں اس کی بس ایک ہی تکرار تھی  
”مجھے مدد چاہیے۔ وہ ظالم اسے مار ڈالیں گے۔“

”تم یہ کیوں بھوتتی ہو بیٹا کہ وہاں اس کا باپ بھی موجود ہے اور وہ خواہ کتنا بھی ظالم کیوں نہ ہو بیٹا۔  
زیادتی نہیں ہونے دے گا۔“ شکیل بھائی اس کی تکرار سے عاجز آ کر بولے تھے۔

”اور کیا تم تاجن پریشان ہو رہی ہو۔“ خلیل بھائی تائید کرتے ہوئے کہنے لگے۔ ”مدد کو تم جانتی نہیں؟  
سے خائف ہونے والی نہیں ہے۔ زیادتی تو کیا تیز لہجہ برداشت نہیں کر سکتی۔“

”اسی بات سے تو ڈر لگ رہا ہے مجھے۔ جذبات میں جانے کیا کر بیٹھے۔ بس آپ کسی طرح اسے بلا لیں  
”تم کیا چاہتی ہو، ہم ان کے در پر جائیں نہیں۔“ عدیل کو اپنا ایک بار جانا یاد تھا اس لیے سختی سے

کوئی نہیں جائے گا۔ تم انتظار کرو مدد خود آئے گی یا فون کرے گی تو تم خود اس سے بات کر لیتا۔“  
عزیز کی دن گزر گیا۔ اب تک اس کا فون آجانا چاہیے تھا اور نہ آنے کا مطلب۔ ”آسمہ کی تشویش

مطلب نہیں ہے۔“ خلیل بھائی نے ٹوک دیا۔

”پتا، تم حوصلے سے کام لو۔ ابھی تو تمہیں صبا کا معاملہ نمٹنا ہے۔ یوں ہمت باروگی تو یہ بچی ادھر کی  
ادھر کی۔“ اباجی نے دھیرج سے اسے صبا کا احساس دلایا۔

”ماں ہے؟“

”کمرے میں۔“ تمہیں اس کا خیال کرنا چاہیے۔ اصل زیادتی اس کے ساتھ ہوئی ہے اور وہی بے چاری  
محسوس کر رہی ہے کہ اس کی وجہ سے یہ سب ہوا جبکہ اس کا کوئی قصور نہیں۔ زیادہ وہ تمہارے لیے  
ہم اپنے آپ کو سنبھالو تب تو اسے سمجھا سکیں گے۔“

بھائی ٹھیک کہہ رہے تھے۔ وہ اب تک صرف مدد کے لیے پریشان تھی۔ صبا کا خیال ہی نہیں آیا  
ولایتی اور شکیل بھائی نے احساس دلایا تو وہ اس کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔

بھائی نے سب کو جلنے کا اشارہ کیا تو ایک ایک کر کے سب اٹھ گئے۔

کی فکر نہیں کرنا پڑتا، وہ اپنے باپ کے پاس ہے۔ ”اباجی نے جاتے جاتے کہا تو اس کا ذہن ایک بار پھر  
اٹھا۔

کے باپ پر ہی تو بھروسہ کیا تھا میں نے۔“ اس نے بید کی بیک سے سر نکاتے ہوئے دکھ سے سوچا۔

کس قدر گرا ہوا شخص ہے شاہ سکندر حیات۔ بیٹی کے معاملے میں بھی فریب دے گیا۔ غلطی میری ہے،  
ہاں کا یقین کیوں کیا۔ عدیل بھائی سے کہتی تو شاید اسی وقت علی جمالیہ کا اصل سامنے آجائے۔ یہاں تک  
پہنچتی اور اب تو مجھے ایک نہیں دونوں بیٹیوں کے لیے لڑنا ہے۔“

”نبیل نے دروازے تک آکر اسے پکارا تو وہ اپنی سوچوں سے نکل کر بولی۔

”تہہ بیٹا۔ آؤ۔“

”لکھنا نہیں کھایا۔“ نبیل نے اندر آتے ہوئے کہا۔

”لگے گی تو کھالوں گی۔ تم نے اور صبا نے کھایا۔“ آسمہ نے حتی الامکان خود کو نارمل ظاہر کرنے کی سعی  
کی۔

”نبیل اس کے پیروں کے پاس بیٹھ گئے تو قدرے توقف سے وہ بظاہر سرسری انداز میں پوچھنے لگی۔

”ن تو نہیں آیا۔“

”نبیل نے بے اختیار کہا تھا۔

”سے فون تو کرنا چاہیے تھا۔“

کوہا تو ہے پچھو! وہ کسی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیتی اور یہاں تو سمجھیں اس کی ایک آرزو پوری  
کرتی تھی۔ شاہ سکندر کے پاس جلی جاؤں گی۔“ نبیل جانے کس خیال میں کھو کر بول رہے تھے۔

”لے لینے سے گہری سانس خارج ہوئی تھی۔“

آپ فکر نہیں کریں، وہ زیادہ دن وہاں نہیں رہے گی۔ آجائے گی جلدی۔ آپ بس صبا کا سوچیں لیکن  
پہنچتی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کو جو فیصلہ کرنا ہو کر لے لیجئے اس کے بعد ہر کام مجھ پر  
جیسا آپ چاہیں گی وہی ہو گا۔“ نبیل کے مضبوط لہجے پر وہ کتنی دیر انہیں دیکھتی رہی پھر مبہم سی

کے ساتھ بولی تھی۔

”ہوتے ہوئے مجھے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے بھلا۔“

”ات اور۔“ نبیل اچانک کسی خیال کے تحت بولے تھے۔ ”کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے صبا سے ضرور

پوچھ لیجیے گا۔“

”صبا۔“ آسہ نہ صرف چونکی بلکہ کچھ ٹھٹھک بھی گئی تھی۔

”جی پچھو، کیونکہ وہ آپ کی بات سے اختلاف کرتی ہے نہ احتجاج۔ ابھی بھی آپ جو سوچیں گے وہ کچھ نہیں بولے گی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ۔“ نیل ایک دم خاموش ہو گئی۔

”تمہارا مطلب ہے وہ علی جمائیکر کے ساتھ۔“

”میرا ایسا کوئی مطلب نہیں ہے پچھو۔“ نیل فوراً بول پڑی۔ ”میں تو اس لیے کہہ رہی ہوں کہ میں غیر اہم نہ سمجھنے لگے کہ اس کی زندگی کے معاملے یوں طے ہوتے ہیں کہ اسے خبری نہیں ہوتی۔ ویسے اس پوچھنے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔“

”ہوں۔“ آسہ پر سوچ انداز میں سر ہلانے لگی تھی۔

\* \* \*

گزشتہ رات بھی اس کی آنکھوں میں کئی تھی اور اب بھی وہ کروٹیں بدل بدل کر تھک گئی تھی، لیکن نیند نہیں دی۔ آخر اس نے بستر چھوڑ دیا اور لائٹ آن کر کے میگزین لے کر بیٹھ گئی۔ لیکن بہت جلد اسے ادھر ہو گیا کہ جن باتوں کو وہ گزشتہ دو روز سے مسلسل ذہن سے جھٹک رہی ہے ان سے مزید پہلو بھی ممکن نہیں ہے۔ ”میرے خدا کیا ضروری تھا کہ جو کچھ ماما کے ساتھ ہوا وہ میرے ساتھ بھی ہو۔“ وہ بہت تھک کر پھر اُٹر

جگہ پر لیٹی تھی کہ اس کی نظروں کے سامنے فلم سی چل پڑی تھی۔

علی جمائیکر سے پہلی ملاقات سے لے کر آخری ملاقات تک۔ وہ اس کی ایک ایک بات، ایک ایک اندازہ رہی اور آخر میں اس نتیجے پر پہنچی کہ وہ باقاعدہ پلان کے تحت اس کی زندگی میں آیا اور شاہ سکندر کی طرح اسے بھی محبت کا قریب دے کر اسے حاصل کرنا چاہا اور یہ ایسی تلخ حقیقت تھی یا اس کی سوچ بہر حال بے حد دکھا والی تھی کہ اس سارے قصے میں اس کا بہت نقصان ہوا تھا کیونکہ اس نے اپنے دل کی ہستی میں بڑی جگہ چاہت سے اس کے نام کے بیچ بونے تھے اور پھر پوری ایمان داری سے ان کی آبیاری کی تھی اور اب جب کہ بستی پھولوں سے سج گئی تھی تو وہ اتنا مانگ رہا تھا۔

”تم میرے لیے کیا کر سکتی ہو۔“

”میں چاہتا تو نہیں ہوں لیکن اگر چاہوں کہ میری خاطر ساری دنیا کو چھوڑ دو تو چھوڑ دوگی۔“

”نہیں۔“ اس کی آنکھیں یکبارگی آنسوؤں سے لبریز ہو کر کناروں سے چھلک گئیں۔ ”تم چاہو گے تو نہیں کیونکہ تم جانتے ہی نہیں کہ محبت کیا ہے۔ تم نے صرف محبت کا ڈھونگ رکھا، قریب دیا مجھے اور چاہے تمہاری خاطر ساری دنیا کو چھوڑ دوں۔ میری دنیا ہے ہی کتنی۔“ ماما نیل بھائی اور مدحو، جنہیں اپنی طرف دینے کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا اور کیاستم ظریفی ہے کہ میری ذات ہی دکھ اور پریشانی کا باعث بن گئی

کے ذمہ دار تم ہو علی جمائیکر۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی، کبھی نہیں۔“ اس نے سر کے نیچے

سجھنے کر نہ پر رکھ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔

اور اس نے تو اس وقت جب علی جمائیکر اس کی زندگی میں آیا تھا سوچ لیا تھا کہ اس کے بارے میں سو فیصلہ کرنے کا اختیار صرف آسہ کو ہے اور ابھی بھی اس نے یہی سوچ کر خود کو الگ تنہا کر لیا تھا اور اسے

نہیں تھی کہ اس تسلسلے میں آسہ اس سے کوئی سوال جواب کرے گی پھر بھی وہ خود کو ایسی کسی صورت حال میں

تیار کرنے لگی تھی کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے کسی بھی انداز سے علی جمائیکر کے ساتھ اس کو اپنے

ہونے محسوس کر کے آسہ کو فیصلہ کرنے میں مشکل ہو۔

پھر صبح جب وہ سو کر اٹھی تو آسہ موجود نہیں تھی۔ اس نے بوا سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ آج ٹھیک تھا

بھابھی واپس اسلام آباد جا رہے ہیں اور اسی لیے آسہ اٹھتے ہی نیچے چلی گئی تھی۔ دل تو اس کا بھی چاہا کہ

ممانی سے ملنے جائے لیکن سب کا سامنا کرنے کے خیال سے ہی پریشان ہو گئی۔ گو کہ اس کا کوئی تصور

رہی اسے تصور وار سمجھ رہا تھا لیکن جن نظروں سے سب دیکھتے تھے اس سے وہ اپنے آپ میں کٹنے لگتی تھی۔ اچھے وہ چاہنے کے باوجود نہیں گئی اور باکا سنا سنا کر کے زبردستی خود کو جھاڑ پونچھ میں مصروف کر لیا۔ اس کام فائغ ہو کر بوا کی مدد کے ارادے سے بچن کی طرف جاری تھی کہ فون کی تیل پر بہت تیزی سے پلٹ کر اس پر رونا ٹھٹھا تھا کیونکہ اسے پہلے خیال مدیحہ کا آیا تھا اور اس نے بے اختیار اسے ہی پکارا۔

”پہلو مدحو۔“

”میں ہوں صبا، علی۔“ علی جمائیکر کی آواز سنتے ہی اس کے اندر ناگواری کے احساس کے ساتھ بے پناہ تفر بھر

نمودی، رانگ نمبر۔ ”اس نے فوراً“ ریسپونڈ کر دیا اور کتنی دیر وہیں کھڑی خود پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی

ی اس کا ذہن چمکنے لگا تھا کہ اتنا بڑا دھوکا دینے کے بعد علی جمائیکر نے اسے فون کرنے کی جرات کیسے کی۔ کیا

چاہتا ہے اب وہ اس پر۔

”صبا۔“ آسہ کی پکار پر وہ نہ صرف چونکی بلکہ فوراً ”ٹیلی فون کے پاس سے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ البتہ جواب

دے سکی۔

”کھ گئیں بیٹا، ناشتا کر لیا۔“ آسہ نے لابی میں آکر اسے دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے انشائت میں سر ہلادیا۔

”کیا بات ہے؟“ وہاں کیوں کھڑی ہو۔“ آسہ نے اس سے کہتے ہوئے ٹیلی فون کو دیکھا تو وہ بوکھلا گئی۔

”ہاں، میں صفائی کر رہی تھی۔“ نیل بھائی کا کمرہ اتنا گندہ ہو رہا تھا۔

”چھ ماما، سپاس آؤ۔“ آسہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

”اللہ۔“ اس نے ٹیلی فون کو خائف نظروں سے دیکھا پھر آسہ کے پیچھے اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی

دکھل ماموں چلے گئے۔

”ہاں، ابھی گئے ہیں۔ تم سو رہی تھیں اس لیے میں نے تمہیں بلایا نہیں۔ چلو پھر آئیں گے تو مل لینا۔“ آسہ

برسری انداز میں کہا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے خود کلائی کے انداز میں بولی۔

”ابھی تک مدحو کا فون نہیں آیا۔ بہت غیر ذمہ دار ہے۔“

”مدحو کو کیوں لے گئے ماما۔“ اس نے پوچھا تو آسہ نے چونک کر اسے دیکھا پھر تاسف بھری ذرا سی ہنسی کے

ذریعہ۔

”تمہارے دھوکے میں۔ وہ یہی سمجھے کہ دلہن وہی ہے اور یقیناً ”شاہ پور“ بننے تک وہ خود کو فوج سمجھتے رہے ہوں۔“

”مدحو دلہن۔“ اس کے اندر دور تک سناٹا پھیل گیا۔

”پریشان نہیں ہونا بیٹا، مدحو آجائے گی۔“ آسہ اپنی سمجھ کے مطابق اسے تسلی دینے لگی۔ ”میں اپنی غلطی

ذرا نہیں اور مدحو کو نہیں سمجھتے دوں گی۔“

”آپ کی کیا غلطی ہے ماما۔“ اس نے کم سم سے انداز میں پوچھا۔

”میری ہی غلطی ہے، جیسا کہ میں نے عارفہ بیگم کے سارے قبھلوں کا اعتبار کر لیا تھا اور ان کے کہنے کے مطابق

تمہاری شادی پر آمادہ بھی ہو گئی۔ انہوں نے جلدی کی ہی اس لیے تھی کہ کہیں پول نہ کھل جائے۔ خیر ابھی

بوفیس بڑا۔ ان کی حیات کا نہ تو ہرن ہو ہی گیا جو کا مزید۔“

یہ اپنے خیال میں بولتی ہوئی ایک دم خاموش ہو گئی پھر قدرے توقف سے اس کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر کہنے

لگے اب یہ احساس ہو رہا ہے کہ تمہاری شادی طے کرتے ہوئے میں نے تم سے پوچھا تک نہیں تھا۔ پتا



کر سکو، بالابہی بالا فیصلہ کر لیا، جیسے مدحیہ کے وقت میں کیا تھا۔ شاید اسی کی سزا ملی ہے مجھے۔ اصرارے وہاں شاہی کون اور تمہارے ساتھ یہ سب ہوا۔

”نہیں ماما، آپ ایسا نہیں سوچیں۔“ اس نے آسیہ کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ ”آپ کے فیصلے غلط نہیں تھے۔ بس میری اور مدح کی قسمت۔“

”قسمت خراب نہیں ہوتی بیٹا۔“ آسیہ کے لمبے میں بے پناہ آزر دگی سٹ آئی تھی اور جانے کس خیال سے آنکھیں بھی غم ہو گئیں۔ اس مقام پر شاید وہ ٹوٹ رہی تھی۔

”ماما، آپ رورہی ہیں۔“ وہ تڑپ کر اس سے ٹپٹ گئی۔

”نہیں بیٹا، میں رو نہیں رہی۔“ آسیہ نے ہنسنے کا قہقہہ کر کے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر بولی۔

”بہت زیادتی ہوئی ہے تمہارے ساتھ۔ تم مدح جیسی کیوں نہیں ہو۔ جیسے وہ ذرا اسی بات پر ہنگامہ کھڑا کر دیتی ہے۔ تم کیوں نہیں کرتیں۔ کیوں اتنا ضبط کرتی ہو۔“

وہ حیران اور پریشان بھی ہو گئی تھی۔

”کیسی باتیں کر رہی ہیں ماما۔ مجھے بہت الجھن ہو رہی ہے۔“ وہ آہستگی سے آسیہ کے ہاتھ ہٹا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”ہمیشہ سے آپ کو یہ شکایت رہی کہ مدح میرے جیسی کیوں نہیں ہے اور اب۔“

”ہاں اب احساس ہو رہا ہے کہ وہی ٹھیک ہے۔ وہ نہ ملے تو چھیننا جانتی ہے اور چھین جائے تو بزدلوں کی طرح چھپ کر آنسو نہیں بہاتی۔“

”شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“ اس نے دھیرے سے کہا اور جانے لگی کہ آسیہ روک کر بولی۔

”سنو بیٹا، میں اصل بات کہنا تو بھول گئی۔“

”جی۔“ وہ سوالیہ نشان بن گئی۔

”وہ کسی بھی طرح سہی علی جمائیکر کے ساتھ تمہارا نکاح ہو چکا ہے۔ اب تم بتاؤ مجھے اس سلسلے میں کیا کر چاہیے۔ میرا مطلب ہے تم کیا چاہتی ہو، یہ رشتہ قائم رہے یا۔“ آسیہ قصداً بات اوجھڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

”میں کچھ نہیں چاہتی ماما، جو آپ کا دل چاہے کریں۔“ وہ جلدی سے کہہ کر اس کے کمرے سے نکل آئی تھی۔

\*\*\*

وہ یوں ہی ادھر ادھر کی باتیں کرنے کی غرض سے بی بی جان کے کمرے میں آئی تھی۔ لیکن آگے مہر النساء کو بی جان کے ساتھ بیٹھے دیکھ کر اسے جانے کیا سو بھی جو اس پر خفا ہو چھینے لگی۔

”بی بی جان، میرے پیارے کہاں ہیں؟“

مہر النساء بری طرح تھملا کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی تھی کہ وہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔

”آپ کو پتا ہو گا انہی پیارے کہاں ہیں۔“

مہر النساء نے کوئی جواب نہیں دیا، اسی طرح تھملائی ہوئی کمرے سے نکل گئی تھی۔

”میں نہیں کیا ہوا؟“ اس نے بہت معصوم بن کر بی بی جان کو دیکھا پھر ان کے قریب بیٹھتی ہوئی ہنوز معصوم سے بولی۔

”میرا خیال ہے آٹنی مہر النساء کو میرا سا آنا اچھا نہیں لگا لیکن میں خود سے تو نہیں آئی۔ لائی گئی ہوں وہ۔“

”کدنیب کر کے۔“

”کیا کر کے؟“ بی بی جان سمجھی نہیں۔

”کدنیب، خچہ چھوڑیں۔ یہ بتائیں آپ تو میرے آنے سے خوش ہیں نا۔“

”تمہیں کیا لگتا ہے۔“ بی بی جان نے اس کی تھوڑی چھو کر کہا۔

بہت خوش ہے نا۔“ اس نے کھکھلا کر بی بی جان کے گلے میں بانٹیں ڈال دیں اور انہیں دائیں کی ہوتی بولی۔

”جی آپ سے مل کر بہت خوش ہوئی ہوں۔ آپ بہت اچھی ہیں۔ اماں جی سے بھی زیادہ۔ اماں جی کو جانتی ہوں۔“

”بہتر رہی ہو۔“

”اماں جی، ہم سب اماں جی کہتے ہیں۔ جیسے آپ سب کی بی بی جان ہیں۔“ وہ ان سے الگ ہوتی ہوئی بی بی جان کی ماں جی سے زیادہ اچھی ہوں۔“ بی بی جان خوش ہو کر بولی۔

”نہیں بابا جان، اماں جی سے زیادہ اچھے نہیں ہیں۔“ اس نے فوراً حساب برابر کر دیا پھر ایک دم خیال آنے پر چہرہ مار کر بولی۔

”میں آپ سے پیار کا پوچھنے آئی تھی۔ کہاں ہیں بابا، میں نے صبح سے انہیں نہیں دیکھا۔“

”ام تباؤ کیا ہے۔“ بی بی جان نے اسی قدر کہا تھا کہ اسے یاد آ گیا۔

”بابا۔ رات بتایا تھا انہوں نے کہ کج چھ بچے ان کی فلائٹ ہے اور یہاں سے تو وہ دو تین بجے ہی نکل گئے۔“

”علی جمائیکر نے آتے ہوئے اس کا آخری جملہ سن کر کہا۔

”ام تباؤ گئے ہیں۔“ علی جمائیکر نے کچھ بے دھیانی میں کہا تو وہ خفا ہو کر بولی۔

”مجھے معلوم ہے اور یہ بھی کہ وہ کب آئیں گے۔“

”وہ ذرا سا بس کر بی بی جان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”خا جائز دہجے بی بی جان۔“

”ہے ہو۔“

”بی بی جان کے گھٹنے چھو کر سیدھا ہوا تو وہ پوچھنے لگی۔

”بابا، میں کی۔“ اس نے بتا کر پوچھا تو وہ چند لمحوں سوچنے کے بعد بولی۔

”ام تباؤ نہیں۔“

”بی بی مرضی۔“

”تذوق ہے آپ میں اور صبا میں۔“ علی جمائیکر اس روز سے مسلسل ہر بات میں دونوں کا موازنہ کر رہا تھا۔

”بہتر ہے بغیر رہیں سکا۔“

”بہتر کہہ سکتے ہیں جبکہ آپ صبا سے۔“ وہ اچانک کچھ یاد آنے پر ایک لحظہ کو خاموش ہوئی پھر کہنے لگی۔

”ہاں اس روز بی بی جان کہہ رہے تھے کہ انہوں نے صبا کو پہلی بار آپ کے گھر میں دیکھا تھا۔ اس کا مطلب بدلوں۔ ادا کی گاؤں کتنی کمینہ ہے صبا، مجھے بتایا تک نہیں۔“

”بظلمت کچھ رہی ہیں۔“ علی جمائیکر نے یوں ہی کہہ دیا۔

”آپ نے اتنے یقین سے کہے کہہ کہ ہم دونوں میں بہت فرق ہے۔“ وہ جانے بی بی جان کی موجودگی فراموش نہ کیا تھا۔ ”نظر انداز کر رہی تھی جبکہ علی جمائیکر کو ان ہی کا خیال تھا جب ہی ٹاٹے ہوئے بولا۔

”ام تباؤ۔“ پھر فوراً ”بی بی جان کو خدا حافظ کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔

”بہتر بی بی جان میں اچھی آتی ہوں۔“ وہ اس کے پیچھے جاگ آئی تھی علی علی رکیں۔“

”کیا بات ہے۔“ وہ جیسے بادل خواستہ رکھا تھا۔  
 ”وہ آپ کراچی جا رہے ہیں ناں تو صبا سے بھی ملیں گے۔“  
 ”نہیں۔“ اس نے فوراً ”نہیں کہہ کر ہونٹ بھیج لے۔“  
 ”کیوں؟“

”اس کا جواب نہیں دے سکتا اور آپ میرے ذریعے سے اس سے کیا کہلوانا چاہتی ہیں۔ جو بھی کہتا ہے،  
 کہیں۔ کیلی فون موجود ہے۔“ علی جہانگیر کو اب تک یہ بات سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر وہ گھر فون کیوں نہ  
 کرتی۔

”فون تو میں کر لوں گی لیکن جو چیزیں میں اس سے منگوانا چاہتی ہوں۔ وہ فون کے ذریعے سے تو نہیں آئیں گے۔  
 خیر چھوڑیں یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔ خدا حافظ۔“ وہ یکدم بے نیازی سن گئی۔

”خدا حافظ۔“ وہ اندر ہی اندر جڑبڑہوتا ہوا ہر نکل گیا۔  
 ”میلی فون موجود ہے۔“ وہ اپنے آپ بڑبڑاتے لگی۔ ”آخر سب یہ کیوں چاہتے ہیں کہ میں گھر فون کر لوں۔  
 جانا چاہتے ہیں کہ مہار کیا بہت رہی ہو نہ۔ کوئی فرق نہیں پڑا ہو گا مہار کو۔ میں پہلے کون ساں کے پاس  
 تھی۔ البتہ صاف ضرور پریشان ہوگی اور وہ بھی اس خیال سے کہ کہیں میں نے اس کی سچ برفضہ تو نہیں کر لیا۔“  
 ”کر بھی سکتی ہوں۔“ اس نے اپنے آپ شامی ہو کر سوچا تھا کہ رابعہ اس کے پاس آکر بولی۔

”سنو، کہیں باباجان بلا رہے ہیں۔“  
 ”کیوں؟“

”یہ تو تم ان ہی سے پوچھنا۔ ویسے باباجان کے بلائے پر یہاں کیوں کا سوال کوئی نہیں اٹھاتا، بس فوراً پلڑ  
 ہے۔ یہ میں تمہیں اس لیے بتا رہی ہوں کہ کہیں تم ان سے نہ پوچھ لو۔“ رابعہ نے بڑے مخلصانہ انداز میں  
 سمجھا یا۔

وہ کندھے اچکا کر چل پڑی اور اس بار باباجان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی انہیں سلام کیا تھا۔  
 ”وعلیکم اسلام“ آؤ بیٹھو۔“ باباجان نے اپنے برابر اشارہ کیا۔  
 ”شکریہ۔“ وہ کمرے سے بیٹھ گئی۔

”خوش ہو، یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔“ باباجان پتا نہیں اچھے موڈ میں تھے یا اس سے بات کرنے کے  
 نہیں یہ لہانہ اور ہنار پڑ رہا تھا۔

”تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہے۔“ اس نے سیدھا سا جواب دیا۔  
 ”اور اپنی ماں کو فون کیا تم نے؟“ باباجان نے بظاہر سرسری انداز میں پوچھا۔  
 ”نہیں۔“

”کیوں۔ وہ پریشان نہیں ہوگی تمہارے لیے۔“  
 ”ہو نا تو نہیں چاہیے کہونکہ میں اپنے باپ کے گھر میں ہوں۔ ویسے آپ کو ان کی پریشانی سے۔“

باباجان ایک دم کھانسنے لگے۔  
 وہ سمجھ کر نظر انداز کرتی ہوئی ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ جب ان کی کھانسی رک گئی تب انہیں دیکھ کر بولے۔  
 ”معاف کیجیے گا باباجان، آپ بہت بزدل ہیں۔“

”ہا ہا۔“ باباجان نے زوردار فتنہ لگایا۔  
 ”میں مذاق نہیں کر رہی، سچ کہہ رہی ہوں۔ مہار سے بیٹی لینے کے لیے آپ نے طویل انتظار کیا اس نے  
 براہ راست ان سے بات نہیں کر سکتے۔ کیوں یہ خدشہ تھا نا کہ مہار انکار کر دیں گی۔ تو وہ تو انہیں کرنا ہی تو  
 بعد اصل جنگ لڑتی تھی آپ کو۔“ وہ انہیں بزدل ثابت کرنے کے لیے بڑی جرات کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

باباجان کی آنکھوں میں خیر سمٹ آیا تھا۔

اب تو آپ کبھی نہیں جیت سکتے کیونکہ آپ نے مہار کے ساتھ فائل کھلیا ہے۔ ویسے مجھے یہ کیم بڑا دلچسپ  
 ہے اور میری دعائیں اپنے باپ دادا کے ساتھ ہیں۔“ آخر میں وہ بڑے محفوظ انداز میں مسکرائی تھی۔

مہار نے ابھی اپنے باپ دادا کو صرف دیکھا ہے، جانا نہیں۔ ہم بارنا نہیں جانتے۔ آئیے سے بی بی جین لانا  
 بے باکس ہاتھ کاٹھیل تھا لیکن ہم تمہارے باپ سے کیے وعدے سے مجبور تھے۔ جو میں چاہتا تھا کہ آئیے  
 بی بی جین جائے اور ہمیں آئیے کے سامنے دامن پھیلا نا گوارا نہیں تھا۔“ باباجان بڑے مضبوط سے چپا کر بول  
 تھے۔

باباجان کیوں نہیں چاہتے تھے۔ ”وہ اسی ایک بات میں انک گئی تھی۔  
 ”حق ہے وہ۔“ باباجان نے شاہ سکندر کی حماقت سوچ کر سر جھٹکا۔ اسے بتانا غالباً ”ضروری نہیں سمجھا۔  
 مہار احمق ہیں، ابھی احمق۔“ اسے سیسا بھانسی کا آئیے کو احمق کہنا یاد آ گیا تھا۔ جب ہی زیر لب بڑبڑاتی  
 مہار چپ کر پوچھنے لگی۔

”آپ نے بتایا نہیں بابا نے کیا حماقت کی۔“  
 ”کوئی ایک حماقت۔“ باباجان کو فوراً احساس ہو گیا۔ ”نہیں تم بچی ہو۔ اپنے باپ کے بارے میں تمہیں ایسی  
 نہیں کرنی چاہیے۔ چلو جاؤ۔“

آپ نے مجھے بلایا کیوں تھا۔ ”وہ سمجھی شاید وہ اصل کام بھول گئے ہیں۔  
 تمہارا حال و احوال پوچھنے کے لیے۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا جھجک کہہ دینا اور ہاں آنا سے کو تمہیں رعبہ  
 پر کالائے اور اپنے باپ کا فارم بھی دیکھو جا کر۔“

”قالے جائے گا ہو نہ۔“ وہ آغا کا رویہ سوچ کر نخوت سے سر جھٹکتی ہوئی ان کے کمرے سے نکل آئی تھی۔  
 ”...\*...\*...“

بے بے کیف سے دن تھے۔ زندگی میں جیسے کچھ رہا ہی نہیں تھا سوائے انتظار کے۔  
 رعبہ کے فون کا انتظار۔

نہ اس کے بارے میں کیا فیصلہ کرتی تھی۔  
 اس انتظار کے اختتام پر کیونکہ اسے کسی اچھی بات کی امید نہیں تھی اس لیے اس کی طوالت غنیمت لگ  
 گی۔ البتہ خدشات چہن نہیں لینے دیتے تھے۔ مدیجہ کا خیال آتا تو وہ گھنوں اس کے بارے میں سوچتی رہتی  
 بنے شاہ پور والے اس کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔ شاید اسے کسی کال کو ٹھہری میں بند کر دیا ہے جب  
 اس نے فون نہیں کیا۔ ورنہ وہ پہلی فرصت میں اسے فون کرتی اور ایک ایک کے بارے میں بتاتی، خصوصاً  
 رعبہ کے بارے میں اور یہ ضرور ہوتی کہ وہ اپنے باپ کے پاس پہنچ گئی۔ وہ اس کا یہی جملہ سننے کو بڑی بے چین  
 لڑکی پر اس کی سلامتی کی دعا میں مانگتی۔

نہیں کی بار اسے علی جہانگیر کا خیال بھی آتا تھا۔ لیکن یوں کہ اس کے وجود میں نفرت اور تنفر کی آگ سی  
 لگی تھی اور ستم ظریفی یہ تھی کہ وہ اس کے خیال کو فوراً ”جھٹک بھی نہیں پاتی تھی۔ اس کی طرح اس کا  
 بڑا زور اور تھا۔ وہ لاکھ خود کو ادھر ادھر مصروف رکھنے کی کوشش کرتی لیکن اس کی گرفت سے نہیں نکل  
 نہ آخر اپنی بے بسی پر رو پڑتی۔

نہیں بھی کسی کا برا چاہتا نہ سوچا پھر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا۔“ کبھی آئیے بھی ایسا ہی سوچتی تھی۔ اب  
 سوچیں اس بات پر انک جاتی تھیں۔

نہایت وہ ٹیس پر بیٹھی خود کو بے حد تنہا محسوس کر رہی تھی اور اسے دکھ میں وہ تھی بھی تھا۔ کیونکہ کسی کو  
 بتا تھا نہ ہو۔ سب اس کے ساتھ ہونے والے صرف ایک الگے کو جانتے تھے۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ  
 نہ ان کے پر وہ اس شخص کی سنگت میں کتنی دور نکل گئی تھی کہ واپسی کا سفر اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور تھا۔

نہایت وہ ٹیس پر بیٹھی خود کو بے حد تنہا محسوس کر رہی تھی اور اسے دکھ میں وہ تھی بھی تھا۔ کیونکہ کسی کو  
 بتا تھا نہ ہو۔ سب اس کے ساتھ ہونے والے صرف ایک الگے کو جانتے تھے۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ  
 نہ ان کے پر وہ اس شخص کی سنگت میں کتنی دور نکل گئی تھی کہ واپسی کا سفر اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور تھا۔

نہایت وہ ٹیس پر بیٹھی خود کو بے حد تنہا محسوس کر رہی تھی اور اسے دکھ میں وہ تھی بھی تھا۔ کیونکہ کسی کو  
 بتا تھا نہ ہو۔ سب اس کے ساتھ ہونے والے صرف ایک الگے کو جانتے تھے۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ  
 نہ ان کے پر وہ اس شخص کی سنگت میں کتنی دور نکل گئی تھی کہ واپسی کا سفر اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور تھا۔

نہایت وہ ٹیس پر بیٹھی خود کو بے حد تنہا محسوس کر رہی تھی اور اسے دکھ میں وہ تھی بھی تھا۔ کیونکہ کسی کو  
 بتا تھا نہ ہو۔ سب اس کے ساتھ ہونے والے صرف ایک الگے کو جانتے تھے۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ  
 نہ ان کے پر وہ اس شخص کی سنگت میں کتنی دور نکل گئی تھی کہ واپسی کا سفر اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور تھا۔

نہایت وہ ٹیس پر بیٹھی خود کو بے حد تنہا محسوس کر رہی تھی اور اسے دکھ میں وہ تھی بھی تھا۔ کیونکہ کسی کو  
 بتا تھا نہ ہو۔ سب اس کے ساتھ ہونے والے صرف ایک الگے کو جانتے تھے۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ  
 نہ ان کے پر وہ اس شخص کی سنگت میں کتنی دور نکل گئی تھی کہ واپسی کا سفر اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور تھا۔

نہایت وہ ٹیس پر بیٹھی خود کو بے حد تنہا محسوس کر رہی تھی اور اسے دکھ میں وہ تھی بھی تھا۔ کیونکہ کسی کو  
 بتا تھا نہ ہو۔ سب اس کے ساتھ ہونے والے صرف ایک الگے کو جانتے تھے۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ  
 نہ ان کے پر وہ اس شخص کی سنگت میں کتنی دور نکل گئی تھی کہ واپسی کا سفر اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور تھا۔

اسے اپنے خوابوں کی کرجیاں سمیٹتے ہوئے آتا تھا۔  
 ”صبا! نیل نے دوسری بار پکارا۔ تب اس نے چونک کر دیکھا لیکن ہمیشہ کی طرح اپنی جگہ سے کھڑی نہیں ہوئی۔

”تامت سوچا کرو۔“ نیل اس کے قریب چیر کر کھینچتے ہوئے بولے۔ ”سوچنے سے مسئلے حل نہیں ہوتے۔ تم نے تو سب کچھ پھوپھو پر چھوڑ دیا ہے پھر تمہیں کیا پریشانی ہے۔“  
 ”مدحو! میں مدحو کے لیے پریشان ہوں۔“ وہ نظریں چرا لی ہوئی بولی۔  
 ”صرف مدحو کے لیے۔“ نیل کے کنبے میں جانے کیا تھا کہ اس کا دل پوری قوت سے پھیل کر سماتا تھا۔  
 ”سنو! میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ میں تمہیں تم سے زیادہ جانتا ہوں لیکن جانتا ضرور ہوں۔ اس بات سے تمہاری نہیں کر سکتیں کہ بہت ساری باتیں تمہارے لیے بتا جان لیتا ہوں۔“

اس نے بہت خائف ہو کر سر جھکا لیا کہ جانے وہ کیا کہنے جا رہے ہیں۔  
 ”اور تمہاری زندگی کے نئے باب کو میں نے اس وقت جان لیا تھا جب تم نے اس کا عنوان تجویز کیا تھا۔ رازداری برت لی تم نے صبا! اب مت چھوڑو۔ میں صرف تمہارا بھائی ہی نہیں دوست بھی ہوں۔ کیا ہر مسئلہ ہم نے دوستوں کی طرح شیر نہیں کیا۔“ نیل نے بہت دھیر ج سے اس کے راز میں شریک ہونے کا دعوہ کر لیا تھا۔

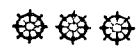
اس کی آنکھوں سے قطرہ قطرہ آنسو ٹپک کر گود میں رکھے اس کے ہاتھوں پر گرنے لگے تھے۔ جنہیں دیکھ کر نیل ایک دم خاموش ہو گئے پھر گردے تو قف سے اپنے آپ کہنے لگے۔  
 ”میں علی جمائیکر سے چند مہینے پہلے ملا ہوں اس لیے زیادہ اسے نہیں جانتا اور جتنا جانا اس کے بارے میں اب یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا پھر بھی میں تمہیں بتاؤں کہ پہلے ملاقات میں وہ مجھے بہت سچا اور کھرا لگا تھا۔ اس کے بعد جب رشتے کی بات چلی تب میں نے محسوس کیا کہ وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے۔ جبکہ اس کے ہر انداز میں مجھے بناوٹ نظر آتی تھی۔ جسے میں نے یوں اہمیت نہیں دی کہ ایک تو علی جمائیکر ہر لحاظ سے مضبوط لگ رہا تھا یعنی ہر مخالفت کو زیر کرنے والا۔ دوسرے تم تمہاری محبت۔ مجھے یقین تھا کہ تمہاری ساری محبت بہت جلد عارفہ بیگم کو تمہارا کر ویدہ بنا دے گی اور علی جمائیکر تو پیکل ہی۔“ وہ خاموش ہو کر جیسے اپنی سوچنے لگے تھے۔

وہ ابھی بھی اس طرح سر جھکائے بیٹھی تھی لیکن پوری جان سے ان کی طرف متوجہ تھی۔  
 ”چنانچہ میں نے علی جمائیکر کو سمجھنے میں غلطی کی یا تمہارا؟ تمہیں کیا لگتا ہے؟“ انہوں نے سوچتے ہوئے میں کہہ کر اچانک اس سے پوچھا۔  
 ”وہ کچھ بول سکی نہ ان کی طرف دیکھنے کی ہمت ہوئی۔ اگر علی جمائیکر تمہارے ساتھ ایماندار ہوا تب بھی وہ خاموش مت رہو صبا! مجھے بتاؤ تم کیا چاہتی ہو۔“  
 ”نہیں! ایسا مت کرنا۔ یہ اس کے ساتھ ہی نہ صرف اس لیے ٹھکرا دو گی کہ وہ شاہ جمائیکر کا بیٹا ہے۔“  
 ”تمہارے ساتھ بھی ظلم ہو گا کیونکہ تم کسی سے نفرت کر رہی نہیں سکتیں۔“  
 ”کرتی ہوں، علی جمائیکر سے شدید نفرت کرتی ہوں۔“ وہ ایک دم ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

”بے وقوف!“ نیل کے ہونٹوں پر مہم س مسکراہٹ پھیل گئی اور بڑے سکون سے اس کے چپ انتظار کرنے لگے۔  
 ”کتنی دیر بعد وہ پتیلیوں سے آنکھیں رگڑنے لگی تو نیل جیب سے رومال نکال کر اسے تھماتے ہوئے خود کو دھو کا مت دو۔ تم صرف پھوپھو کا خیال کر رہی ہو۔“  
 ”ہاں! مجھے ماما کا خیال ہے۔ ماما کے لیے میں جان بھی دے دوں گی۔ علی جمائیکر کی محبت اور ایمان مجھے کوئی غرض نہیں۔ میں وہی کروں گی جو ماما کہیں گی۔“ وہ رومال سے آنکھیں اور چہرہ صاف کرتے ہوئے

پالے جاری تھی۔  
 ”پھر رو لیوں ہو؟“

”مجھے اپنے آپ پر رونا آتا ہے۔ کیوں نہ ہو کہ میں آگئی میں۔“  
 ”چھ! چھ! ہلکے منہ دھو کر آؤ اور واسے چائے کا بھی کھتی آنا۔ نیل کو اس کے بے تحاشا ہتے آنسوؤں سے دکھ تھا۔ جب ہی اسے اٹھایا۔



”افی! نیل بھائی سب جانتے ہیں۔“ اس نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے سوچا پھر دوبارہ ان کے پاس بکے خیال سے ہی پریشان ہو گئی۔  
 ”ابا کروں؟“ ”واسے چائے کا کہہ کر وہ شش و پنج میں کھڑی تھی کہ فون کی بیل پر نیل وہیں سے پکار کر بولے۔  
 ”ماما! کھو کس کا فون ہے۔“  
 ”اس نے اگر ریسیور اٹھالیا۔“

”کیسی ہو صبا اور ماما کیسی ہیں؟“ دوسری طرف مدحوہ تھی۔  
 ”مدحو! تم تھک تو ہو۔“ وہ ایک دم بے اختیار ہو گئی۔  
 ”بالکل تھک کر مرمت کلاس اور بہت خوش۔“ مدحوہ کھلتی ہوئی آواز میں شروع ہو گئی تھی۔  
 ”میں بتا نہیں سکتی صبا! کہ مجھے یہاں آکر کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ یہ تو جج کوئی اور سی دنیا ہے۔ کوئی غم کوئی فکر ہمارے وہاں علی جمائیکر کتنا پیڑم، کتنا اسارٹ اور اتنا ہی محبت کرنے والا۔ اس پوری حویلی میں سب میں نمایاں ہے۔“  
 ”مدحوہ کی آواز سن کر جتنی خوش ہوئی تھی اب اتنی ہی غم صم اور دل تھا کہ اندر کسی اتھاہ میں ڈوبا جا رہا تھا۔  
 ”ما! نیل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلکے سے دبایا تھا۔  
 ”نہ دھندلائی آنکھوں سے نیل کو دیکھا تو وہ اس کے ہاتھ سے ریسیور لے کر اپنے کان سے لگا کر بولے۔  
 ”پلو گون؟“

”میں ہوں مدحو۔ وہ صبا کہاں گئی۔“ ادھر سے مدحوہ نے ہنوز اسی انداز میں پوچھا۔  
 ”یہی ہو مدحو کہاں ہو؟“ نیل اس کا سوال نظر انداز کر گئے۔  
 ”شاہ پور! اپنے باپ کے پاس۔ آپ نے تو میری بات نہیں مانی تھی نیل بھائی پھر بھی دیکھ لیں میں پہنچ گئی۔“ مدحوہ نے کھلکھلا کر کہا۔  
 ”اب تمہاری آرزو پوری ہو گئی۔ کسی بھی طرح سی۔“ نیل نے بادل خواستہ کہا تھا، جبکہ نظریں صباحت پر تھیں۔ جس کی آنکھیں روانی سے چھلک رہی تھیں۔  
 ”نپ کو افسوس ہو رہا ہے؟“ ادھر سے مدحوہ نے ٹوکا۔  
 ”اب تمہاری آرزو پوری ہوئے پر نہیں بلکہ غلط طریقے سے پوری ہوئے پر افسوس ہے۔“ انہوں نے تاسف سے

جج طریقے کے لیے تو میں سر پہن کر رہ گئی لیکن کسی نے میری نہیں سنی۔ اس لیے مجھے کوئی افسوس نہیں۔ خیر! یہ بتائیں ماما کہاں ہیں۔“  
 ”یامطلب! اتنے سے دنوں میں تم یہ بھی بھول گئیں کہ پھوپھو اس وقت کہاں ہوتی ہیں۔“ نیل کے جتانے کے شرمندہ ہونے کے حیرت سے بولی۔

”کلینک واقعی ممالیکینک گئی ہیں؟“

”تم کب آری ہو؟“ نیل اس کی حیرت اور سوال نظر انداز کر گئے۔

”کبھی نہیں۔“ مدیہ نے کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ تو نیل ریسیور رکھ کر صباحت سے بولے۔

”تم اس کے لیے رو رہی ہو، جسے کسی بات کی پردائی نہیں۔“

وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر اور شدت سے رونے لگی۔

”میرے خدا! مجھے ہمیشہ یہ افسوس رہے گا کہ پچھو پچھو نے تم دونوں کی خاطر خود پر زندگی کے دروازے بند کر دیے۔ کاش وہ اپنے لیے سوچتیں۔“

نیل کو جانے اس کے رونے پر غصہ آیا تھا یا مدیہ پر۔ گو کہ بہت ضبط کے بعد بولے تھے پھر بھی ان کا لہجہ نکتہ تھا۔

”بند کرو رونا، ورنہ میں تمہیں بھی اسی وقت شاہ پور پہنواؤں گا۔“

”نہیں۔“ وہ اسی طرح روتی ہوئی بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

\*~\*~\*

علی جاگیر نے اپنے لیے اس خسارے کو منتخب کیا تھا جس کی تلافی ممکن ہو سکتی تھی۔ یعنی اس نے سوا چھ تھاکر

شادی کے بعد وہ صباحت کو یقین دلائے گا کہ ان سارے جھگڑوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی وہ کمر

سازش میں شریک رہا ہے۔ بلکہ اس نے تو اس وقت صباحت کو پسند کر کے اپنانے کا فیصلہ کر لیا تھا جب وہ جانتا ہی

نہیں تھا کہ وہ کون ہے اور اسے یقین تھا کہ فوراً ”نہیں تو دھیرے دھیرے وہ اس کا اپنی محبت پر اعتبار حاصل کرنا

میں کامیاب ہو جائے گا۔“

لیکن یہاں تو سارا معاملہ ہی خراب ہو گیا تھا۔ یعنی حالات عجیب صورت اختیار کر گئے تھے اور بابا جان کی

حکمت عملی تو اس کی سمجھ میں آ رہی تھی لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس تمام عرصے میں مدیہ کہاں گئی؟

اس کی ماں اور بہن کو بھی نظر نہیں آئی۔ البتہ صباحت کے منہ سے اس نے ایک ادھ بار بہن کا ذکر سنا تھا۔ وہ

اس نے خصوصی طور پر نہیں بتایا تھا۔ ایک بار تو اس کے فون کرنے پر ادھر سے مدیہ نے ترغ کر کہا تھا کہ یہ

صباحت نہیں ہوں اور دوسری بار بھی کوئی ایسا ہی معاملہ تھا جو اسے اب سوچنے پر یاد آ رہا تھا اور یہ بھی کہ خود

نے مدیہ کے ذکر کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی ورنہ اگر وہ دلچسپی ظاہر کر کے پوچھتا تو یقیناً ”صباحت اس کے بار

میں بتاتی۔“

بہر حال اب تو اس نے خود ہی دیکھ لیا تھا بلکہ جان بھی گیا تھا کہ وہ صرف ظاہراً ”صباحت سے مشابہ ہے اور

پر اسے افسوس ہی نہیں، دکھ بھی تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ اس کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہوتی تھی

جب ہی وہ مایوس ہو کر واپس کراچی آ گیا تھا اور چھٹی منمنوخ کرا کے آفس بھی جوائن کر لیا تھا ورنہ اگر مدیہ اس

فون پر ہی صباحت سے بات کرانے کی ہامی پھر لیتی تو اتنی جلدی وہ کبھی نہ آتا۔ گویا دونوں بہنوں نے ہی اسے ایسا

کیا تھا اور مدیہ کی تو اسے زیادہ پروا نہیں تھی۔ البتہ صباحت کی طرف سے بہت فکر مند تھا کہ وہ لڑکی جانے

کے بارے میں کیا سوچتی ہوگی اور کتنا روٹی ہوگی۔ اس کے آنسوؤں پر بند باندھنے کے لیے ہی وہ دن میں کئی

اس کے نمبر ڈائل کرتا تھا۔ خصوصاً ”ان اوقات میں جب اسے یقین ہوتا کہ وہ اکلی ہوگی لیکن اس کا بھی کوئی

نہیں تھا کیونکہ ادھر وہ اس کی آواز سنتے ہی فون رکھ دیتی تھی۔ جس پر فون پر وہ جھنجھلا تا، غصہ بھی آتا پھر

حق بجانب سمجھتے ہوئے نئے سرے سے اس تک رسائی حاصل کرنے کی تدبیر سوچنے لگتا۔

اس وقت اچانک اسے نیل کا خیال آیا تھا اور یہ سوچ کر کہ وہ کم از کم فون تو بند نہیں کریں گے۔ اس نے

دیکھ کر ان کی موجودگی کا یقین کر کے نمبر ڈائل کیے تھے۔

تیسری بیل پر ریسیور اٹھنے کے ساتھ کسی خاتون (وا) کی آواز تھی۔ اس نے فوراً ”نیل کو بلانے کا کہہ نا

ت کوئی سوال نہ ہو۔“

نیل کی آواز سنتے ہی وہ سنبھل کر بولا۔

”سلام علیکم۔“ نیل نے کہا۔ ”آپ مجھ سے بات کرنا پسند کریں گے؟“

”خلافی طور پر ابھی میں اتنا دیوالیہ نہیں ہوا کہ نہیں کہہ کر سلسلہ منقطع کر دوں۔“ نیل نے کہا

نیل ہی بل میں شکر کرتے ہوئے پوچھا۔

”جی آپ؟“

”ٹھیک۔ آپ سنا میں کیسے یاد کیا؟“

”جیسے گا نیل صاحب! ہم ان رسمی باتوں سے آگے نکل آئے ہیں۔“ اس نے جڑبڑہو کر کہا تو ادھر

نیل نے سانس بولے تھے۔

”ان کے لہجے میں طنز بھی تھا۔ جسے محسوس کر کے وہ نظر انداز کر گیا۔“

”ہال میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”کئی اعتراض نہیں۔“

”کل دن میں جو وقت آپ کو سوٹ کرے بلکہ میرٹ میں لنچ پر میں آپ کا انتظار کروں گا۔“

”خدا حافظ۔“ ادھر سے سلسلہ منقطع ہوتے ہی اس نے گہری سانس کھینچی پھر ریسیور رکھ کر کل کا

ہونے لگا تھا۔

”ان اس نے آفس سے ہی میرٹ میں نیل ریزرو کوالی تھی اور مقررہ وقت سے کچھ پہلے ہی پہنچ بھی گیا

کے بعد اسے کوفت میں مبتلا کرنے والا انتظار بھی نہیں کرنا پڑا۔ یعنی نیل ٹھیک وقت پر آگئے تھے۔

”آپ نے میری دعوت قبول کی۔“ وہ بیٹھتی ہی بولا۔ پھر مینو پر نشان لگانے کے بعد پوری طرح نیل کی

ذہن پر کھینچنے لگا۔

”ابھی صفائی میں کچھ نہیں کہنا۔ اس لیے نہیں کہ میرے پاس کتنے کو کچھ نہیں بلکہ میں بہت عجیب سا

لوں گا اپنے ادا کے اس اقدام کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے۔ جس سے میری پوزیشن اتنی اگورڈ ہو گئی

ہی منکوحہ میری آواز تک سننے کی روادار نہیں رہی۔“

”یاد رکھو غلط اور ناجائز تو نہیں ہے۔“ نیل نے قدرے چھپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”نہیں۔“ وہ فوراً ”بولتا تھا۔“ ”میں انہیں حق بجانب سمجھتا ہوں۔“

”تو آپ کو سکون سے اس کے فیصلے کا انتظار کرنا چاہیے بلکہ اس کی ماکے فیصلے کا۔ کیونکہ وہ ہر بات کا

نہایت کو سوچ کر خود الگ ہو گئی ہے۔“

”نہایت کو سوچ کر خود الگ ہو گئی ہے۔“ ساتھ ہی اس کی پیشانی پر لکیریں بھی نمودار ہو گئی تھیں،

”جیسے انداز میں انہیں دیکھ کر پوچھنے لگا۔“

”آپ صباحت کو مجھ سے ملنے پر آمادہ کر سکتے ہیں؟“

”نہیں۔“

”صرف ایک بار۔“

”اس کی بے قراری اور آنکھوں سے چھلکنے جذبات کی سچائیاں دیکھ کر آہستہ سے اثبات میں سر ہلا کر

”نہیں کر رہا۔ البتہ کوشش ضرور کروں گا۔“

”اب یو اینڈ پلیز۔“ اس نے شکریہ کے ساتھ انہیں کھانے کی طرف متوجہ کیا، پھر بظاہر ہلکے پھلکے ”انداز میں

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ صباحت کی کوئی بہن بھی ہے بلکہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ جب مدحیہ سنے بتا دیا  
بھی بابا جان تو یقین کرنے کو تیار ہی نہیں تھے۔“  
”اور آپ؟“ نیل ایک دم پوری جان سے متوجہ ہو گئے تھے۔ ”آپ نے اس کی بات کا یقین کر لیا۔“  
”فورا۔“

”کیوں۔ میرا مطلب ہے بظاہر تو کوئی فرق نہیں ہے دونوں میں۔“  
”میں صرف ظاہر نہیں دیکھتا۔“ وہ یہ اختیار کر کے فوراً اپنی پلیٹ پر جھک گیا تو مبہم سی مسکراہٹ کے  
نیل نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹائی تھیں۔

\*~\*~\*

وہ لاؤنج میں بیٹھی گود میں رکھی مونگ پھلی کھانے کے ساتھ گلاس وال سے الماس کو دیکھ رہی تھی۔ جو روڑ  
یوں ٹھل رہی تھی جیسے کسی کا انتظار ہو۔ اور خود اسے شاہ سکندر کا انتظار تھا جن کی آن اسلام آباد سے آمد  
تھی۔ جب ہی الماس کے اس طرح ٹھلنے پر وہ یہی سمجھی کہ وہ اپنے انتظار کو اس پر جتا کر باپ کے ساتھ اس  
زیادہ اپنی وابستگی ظاہر کرنا چاہتی ہے۔

اور وہ مدحیہ بھی۔ ایسے فطری مظاہر کو بھی برداشت نہیں کرتی تھی۔ نانا بابا کے گھر میں اس کی کسی کر  
بنتی ہی اس لیے نہیں تھی کہ صباحت کو اس کے مقابلے میں زیادہ توجہ اور محبت حاصل تھی اور اس کی وجہ صبا  
کا ہر ایک پر جان چھڑکنا تھا لیکن اس نے یہ بھی نہیں سوچا تھا۔ بس اپنے آپ متفر اور شاکی ہو جاتی تھی۔ ابھی  
یہی حال تھا۔ الماس کے خلاف دل میں خواہ مخواہ ابال اٹھنے لگے تھے اور بالکل غیر ارادی طور پر وہ مونگ پھلی  
وائے منہ میں ڈالتی اور چٹکے الماس کی طرف اچھال رہی تھی۔ جیسے اس کا نشانہ لے رہی ہو۔ حالانکہ درمیان  
گلاس وال بھی اور اس سے بھی کافی فاصلے پر الماس ٹھل رہی تھی۔

بڑے گیٹ سے جیپ اندر داخل ہوئی تو کچھ دیر کو اس کا دھیان الماس کی طرف سے ہٹ گیا لیکن جب  
الماس کے قریب رکی اور اس میں سے اتر کر شاہ تیور نے جس انداز سے مسکرا کر اسے سلام کیا اس سے  
جگہ اچھل پڑی۔

”او گاڈ! تو یہ معاملہ ہے؟“  
شاہ تیور اسی طرف اُتر رہا تھا۔ وہ فوراً انجان بن کر اپنی مونگ پھلی میں مصروف ہو گئی لیکن جیسے ہی شاہ  
اس کے قریب سے گزرنے لگا اس نے پکار لیا۔

”اےکسکیوز می کرن۔“  
”جی مجھ سے کچھ کہا۔“ شاہ تیور نے رک کر اسے دیکھا۔

”ہاں وہ میں یہ پوچھنا چاہتی تھی کہ آپ وہی ہیں نا جو مجھے میرن ہال سے اٹھا کر لائے تھے۔“ اس نے نظا  
سا دگی سے پوچھا۔

شاہ تیور نے ہنس کر ایک طرح سے اعتراف کیا تو وہ ہتھیلی پر مونگ پھلی رکھ کر اس کی طرف برحالت  
ہوئی۔

”لیجیے، مونگ پھلی کھائیے۔“  
”شکریہ۔“ شاہ تیور اس کی ہتھیلی سے چند دانے اٹھا کر آگے بڑھ گیا تو اس کے غائب ہونے تک وہ  
پچھتے دیکھتی رہی پھر کسی خیال سے کندھے اچکا کر گردن سیدھی کی تو الماس کو سر پر کھڑے دیکھ کر پوچھا۔

”کیا بات ہے؟“  
”مہراں۔“ الماس نے اسے جواب دینے کے بجائے ملازمہ کو پکارا اور اس کے آنے پر ادھر ادھر بکھرے

کے چٹکوں کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ ”صاف کرو یہ سب۔ پتا نہیں کہاں سے آجاتے ہیں جاہل، جنگلی۔“  
انہیں جاتے جاتے لائے جاتے ہیں۔“ وہ خلاف عادت ایک دم آپے سے باہر ہونے کے بجائے آرام سے کہتی  
پڑھ کھڑی ہوئی۔ جس سے اس کی گود میں رکھی مونگ پھلی کا ربڑ پر پھیل گئی تھی اور وہ اس کی طرف اشارہ  
الماس سے بولی۔

”تم کھالو، تھوڑی آٹا کو بھی دے دینا۔“  
”ہنہ۔“ الماس نے نخوت سے سر جھکا۔  
”ہنہ! وہ اس کی نقل اتار کر ہنسی ہوئی اور آگئی۔

یہ کامرہ شاہ سکندر کے اسٹڈی روم سے ملتی تھا اور وہ جب دل چاہتا درمیانی دروازہ کھول کر اسٹڈی میں چلی  
کی۔ حالانکہ اسے مطالعے کا شوق کبھی بھی نہیں تھا اور ابھی بھی وہ ایسے کسی خیال سے نہیں آئی تھی۔ نہ  
نادر کوئی جستجس تھا کہ اپنے باپ کا انتخاب ہی دیکھ لے۔ اس کی جگہ اگر صباحت ہو تو ایک ہی دن میں  
نگال چکی ہوتی لیکن اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ محض مہر النساء پر اپنی اہمیت جتانے کی غرض سے اس نے  
رے میں آنا اپنا معمول بنالیا تھا۔ اصل میں اس کے یہاں آنے کے دوسرے دن مہر النساء ہی نے اپنے طور  
پر باور کرائے کی کوشش کی تھی کہ یہ شاہ سکندر کا خاص کمرہ ہے جس میں کسی کو بھی جانے کی اجازت نہیں  
اس کے کچھ دیر بعد ہی وہ شاہ سکندر کے پیچھے اس کمرے میں نہ صرف داخل ہو گئی بلکہ درمیانی دروازے کا  
ہی ان سے کھلوایا تھا۔ یہ کہہ کر کہ وہ جب بور ہوئی یا گھبرائے گی تو کتابوں میں اپنا دھیان پٹانے کی کوشش  
گی اور شاہ سکندر ظاہر ہے منع نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ وہ پہلی بار آئی تھی ورنہ شاید پس و پیش ضرور  
۔ بہر حال اس وقت وہ اپنے کمرے میں رکے بغیر سیدھی اسٹڈی میں آکر بیٹھی تو کچھ دیر الماس کے ساتھ  
دلی معمولی سی بھڑپ برائے آپ محظوظ ہوتی رہی پھر ایک دم اس کا دھیان گھر کی طرف چلا گیا تھا۔ ”آئیہ“  
صباحت وہ سب سے شاکھی تھی۔ کیونکہ اس کے خیال میں کوئی بھی اس کے لیے پریشان نہیں تھا۔ اس کے  
اپنے معمولات میں یوں مصروف ہو گئے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

مجھے کب کسی کی پروا ہے۔ بہت خوش ہوں میں یہاں آکر۔ سب میرے اپنے ہیں۔“ وہ جانے کس احساس  
کو خود کو باور کراتے لگی تھی کہ اچانک ٹیوب لائٹ آن ہونے سے چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی اور شاہ سکندر کو  
نعدا ”مسکرائی۔

”پکب آئے؟“  
نور ہوئی۔ نیچے بابا جان کے پاس تھا۔ ”شاہ سکندر ٹائی کی ٹاٹ ڈھیلی کرتے ہوئے اس کے قریب آگئے پھر  
ناکھڑے پر ہاتھ رکھ کر اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے پوچھنے لگے۔

”پاؤس تو نہیں ہو؟“  
”میں آؤس کیوں ہوں گی۔“

”نما نما اور سسٹر کے لیے فون کیا تھا؟“

”نما سے بات نہیں ہوئی۔ صبا اور نیل بھائی ٹھیک ہیں اور پوچھ رہے تھے کہ میں کب واپس آؤں گی۔“

”کمری انداز میں بتایا تو انہوں نے فوراً پوچھا تھا۔“  
”بہن کیا کہا؟“

”نما نہیں۔ نما پوچھیں گی تو انہیں بھی میں یہی جواب دوں گی۔“  
”نما کا مطلب ہے آپ یہاں خوش ہو سوری گئیں۔“

”ناؤ خوش ہوں پاپا! لیکن صبا یہاں آکر بھی خوش نہیں ہوگی۔ اسے ماما اور نیل بھائی کے علاوہ اور کوئی نظر  
نہ دے ان سے بہت کچھ سوچ سکتی ہے۔ ڈرنی بھی بہت ہے ماما۔ اگر وہ یہاں آجاتی ناں تو رو رو کر

ہنس سلسلے میں؟“ اس نے سروانچا کر کے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”شاہ علی جاکگیر کے بارے میں۔“ وہ عاجزی سے نوک کر گویا ہوئی۔ ”اور پھر میرا کیا تعلق۔ میں نیل بھائی پلینے میں یہ نام سننا نہیں چاہتی۔“ وہ عاجزی سے نوک کر گویا ہوئی۔ ”اور پھر میرا کیا تعلق۔ میں

چھوڑ چکی ہوں۔ آپ ان سے پوچھیں کہ انہوں نے کیا سوچا ہے۔“

”ہماری رخصتی کا سوچ رہی ہیں۔“ نیل نے اس کا رد عمل دیکھنے کے لیے اپنی طرف سے کہہ دیا۔

”میں نے اسے ایک بازو کے حلقے میں لے لیا۔“ میں نے تو یوں ہی کہہ دیا ہے ورنہ مجھے نہیں

ارے رہے۔“ نیل نے اسے ایک بازو کے حلقے میں لے لیا۔ ”میں نے تو یوں ہی کہہ دیا ہے ورنہ مجھے نہیں

پھوپھو نے کیا سوچا ہے۔ البتہ تمہارا ارادہ معلوم ہو گیا ہے بہت خطرناک ہے۔ آخر ہونا دیکھ کی بہن۔“

”صرف ہنسیاں دیتی تھی۔ میں عمل کروں گی۔“

”تم ان صبا! تمہارے منہ سے ایسی باتیں بالکل اچھی نہیں لگتیں۔ بیٹا! اتنا جذباتی نہیں ہونا چاہیے اور تم تو

ایلی نہیں تھیں پھر اب تمہیں کیا ہوا ہے۔ اگر مرہات پھوپھو پر چھوڑ چکی ہو تب تو تمہیں ہر دو صورتوں کے

بار دنا چاہیے۔“ نیل نے دھیرج سے ٹوٹے ہوئے کہا۔

”خاموش رہی۔“

”میری ایک بات مانو گی۔“ قدرے توقف سے نیل نے پوچھا۔

”سروانچا کر کے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔“

”میں چاہتا ہوں۔ تم ایک بار علی سے مل لو۔“

”اگلیں میں کیوں ملوں۔ اپنی پہچان کرانے کے لیے۔ اسے بتاؤں کہ میں صبا تھوں اور وہ جو اس کے پاس

ہے۔ وہ مدیحہ ہے۔ نہیں میں یہ نہیں کر سکتی۔ مدحوہاں خوش ہے تو بس ٹھیک ہے۔ اسے وہیں رہنے

دے۔“ وہ ایک دم ہاتھوں میں چہرہ پھیر کر رہی۔

”نیل اس کی باتوں میں الجھ گئے تھے۔ اس کے رونے پر بس چپ چاپ بکھتے رہے۔ کچھ دیر بعد وہ ہتھیلیوں سے

نرگزی ہوئی اٹھنے لگی تھی کہ انہوں نے ایک دم اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور بے اختیار بولے تھے۔

”سو محبت کرنے والے اپنی محبت کو چہروں سے نہیں ڈل سے پہچانتے ہیں۔ کیا کبھی میں نے تم پر مدیحہ کا گمان

جان بڑے دیتی۔“ وہ اپنی دھن میں بولے جارہی تھی۔

”شاید اس کے ذہن میں یہاں کا تصور خوفناک ہو گا۔“ شاہ سکندر نے کچھ سوچتے ہوئے انداز میں کہا تو وہ

سُنی کر کے ان کے پاس سے اٹھتے ہوئے بولی۔

”اس روز باباجان کہہ رہے تھے کہ ان کے لیے ماما سے بیٹی چھین لانا کچھ مشکل نہیں تھا لیکن وہ آپ سے

وعدے سے مجبور تھے کیونکہ آپ ایسا نہیں چاہتے تھے۔ کیا یہ سچ ہے؟“ اس نے ریک کی طرف جاتے جاتے

کر شاہ سکندر کو دیکھا تو وہ اثبات میں سر ہلانے لگے۔

”پھر تو باباجان کے اس سارے پلان سے بھی آپ بے خبر رہے ہوں گے۔“

”وہ ہنوز سرسری انداز اختیار کیے ہوئی تھی، لیکن اس بار شاہ سکندر کچھ ٹھٹھک گئے اور جواب سے بچ

خاطر سامنے نیل پر ناخنیں سیدھی کرتے ہوئے بولے۔

”میں بہت تھک گیا ہوں بیٹا! مراں سے کوٹھانے لے آئے اور دیکھنا میں موبائل کہاں چھوڑ آیا ہوں۔

بیدروم میں ہو گا۔“

”وہ انہیں دیکھتی ہوئی کمرے سے نکلی تو پہلے مراں کو پکار کر چائے کا کہا پھر ان کے بیدروم سے موبائل

واپس آئی تو انہیں سمجھانے کے بجائے خودی نمبر ہنسنے لگی۔

”مجھے دو۔“ شاہ سکندر نے ہاتھ بڑھایا تھا لیکن پھر ایک دم خاموش ہو گئے۔

”بیلو۔“

”کون، نیل بھائی؟“ وہ غیر محسوس طریقے سے شاہ سکندر کی طرف سے رخ موڑ کر بات کرنے لگی۔

”مما کو بلائیں۔ میں ان سے بات کروں گی۔“

شاہ سکندر اس کی پشت پر نظریں جمائے پوری جان سے متوجہ ہو گئے تھے۔

کچھ دیر بعد وہ سچ کر بولی تھی۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“

”کیوں کیوں نہیں کرنا چاہتیں۔“

”ظاہر ہے جہاں ہوں وہیں سے بات کر رہی ہوں۔“

”نہ میں آپ کو نہیں ممما کو بتاؤں گی۔“

”مجھے بات ہے انتظار کریں۔“ اس نے سلسلہ منقطع کر دیا اور کچھ دیر اسی طرح کھڑی رہی پھر

موبائل شاہ سکندر کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

”مما! شاہ سکندر کی طرف سے بات نہیں کرنا چاہتیں۔“

شاہ سکندر کچھ نہیں بولے۔ اس کے ہاتھ سے موبائل لے کر اپنا نمبر ہنسنے لگے تو وہ مزید کچھ کہنے کا

ترک کر کے اس کمرے سے نکل آئی تھی۔

\*\*\*

”مجھ سے کس بات ہے ناراض ہو؟“ نیل نے اس کے برابر بیٹھتے ہوئے پوچھا تو وہ بہت ساٹ لہجے میں بولی۔

”میں ناراض نہیں ہوتی۔ یہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔“

”تو پھر تمہاری اس خاموشی کو اور کیا نام دیا جائے، بولو۔“ نیل نے اس کے جھکے ہوئے سر کو ہلایا۔

”نہیں تو اپنی پریشانی تو بتاؤ۔“

”آپ سے کس نے کہا کہ میں پریشان ہوں۔“

”پہلے کون کتنا تھا۔ خیر اس بحث کو چھوڑو اور یہ بتاؤ۔ تم نے کیا سوچا ہے؟“ نیل فوراً اصل بات

آگئے۔

”نہیں باباجان! صبح کی پہلی منکوحہ ہے۔“ شاہ جہانگیر نے فوراً ان کی تائید کی۔

بات ختم کرتے ہی وہ کمرے سے نکل آئے کیونکہ باباجان کا رد عمل جانتے تھے اور یہ نہیں تھا کہ انہیں

پروا نہیں تھی بلکہ وہ مزید بحث نہیں کرنا چاہتے تھے پھر بابا جان کی ضد سے بھی واقف تھے اور جو کچھ ان کے ساتھ ہوا تھا وہ بھولے نہیں تھے لیکن وہی بات کہ انسان اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو نظر انداز کریتا ہے لیکن جب اولاد کی بات آتی ہے تو مصلحت بھی کوئی زیادتی برداشت نہیں ہوتی۔

اور شاہ سکندر اس سارے معاملے میں اگر خاموش رہے تھے تو اس کی کئی وجوہ تھیں۔ ایک تو بابا جان کی ضمانت، دوسرے علی جمائیکر کی ہر لحاظ سے انریکونو سٹائن کی تیسری بڑی وجہ یہ بھی کہ انہوں نے صاحت کو دیکھا نہیں تھا تو اس کے لیے ان کے اندر وہ محبت نہیں تھی جو ساتھ رہنے والی اولاد سے ہوتی ہے۔ اس لیے انہوں نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ آیا وہ لڑکی شاہ پور آتا بھی چاہے گی یا نہیں۔ گویا اس کے احساسات کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور اگر مدیہ کی جگہ صاحت ہی آجاتی تب بھی شاید وہ اسے اہمیت نہ دیتے، خواہ وہ کتنا اوپر اٹھ جائے۔ وہ یہ سوچ کر اطمینان سے رہتے کہ بابا جان نے اس کے ساتھ اچھا کیا۔ خاندان کا نام اور علی جیہ سافٹ سٹراس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا تھا لیکن اب یہ نہیں سوچ سکتے تھے۔ کیونکہ درمیان میں مدیہ آگئی تھی جس کے وجود سے ہی وہ لاعلم تھے۔ اس نے اچانک ان کے اندر سولی محبت کو یوں بیدار کیا تھا کہ اس کے ساتھ ان کی غیرت بھی جوش میں آگئی تھی اور اب وہ صرف باپ بزرگ کو سوچ رہے تھے تو انہیں بابا جان کا طرز عمل انتہائی نامناسب اور گھنایا لگ رہا تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ صاحت کو لانے کے لیے بابا جان پھر کوئی ایسا پلان بنائیں جس سے بیٹیوں کی نظروں میں وہ بھی بد وقعت ہو کر رہ جائیں۔

گوکہ مدیہ نے ابھی تک ان پر کچھ جنایاں نہیں کیں تھیں لیکن وہ اس خیال سے بھی پریشان ہو جاتے تھے کہ کسی دن وہ ان کے مقابل کھڑی ہوگئی تو وہ اسے کیا جواب دیں گے۔ ان کی زندگی میں یہ دوسرا شاید تیسرا مشکل ترین مرحلہ تھا۔ جہاں اگلے لمحے کے تصور سے ان کا دل بیٹھے لگتا تھا اور ذہن بری طرح منتشر ہو جاتا۔

پہلا مرحلہ وہ تھا جب جگہ عروسی میں موہو پکارتے ہوئے وہ کسی کمزور لمحے کی گرفت میں آگئے تھے۔ دوسری بار جب آسہ کے ہاتھ میں لٹاف چھو رہا تھا۔ اور اب اولاد کے لیے بھی بابا جان ان سے یہ توقع کر رہے تھے کہ وہ ان کے اشاروں پر چلتے رہیں گے۔ ”ہرگز نہیں۔ مدیہ اور صاحت لاورث نہیں ہیں۔ میں ان کا باپ ہلکتے مندر شاہ سکندر رجات میری اپنی ذاتی حیثیت ہے، شناخت ہے اور میں اپنی شناخت کے ساتھ اپنی بیٹیاں رخصت کروں گا۔“ وہ بہت مضبوط ارادے کے ساتھ سوچ رہے تھے۔ تب ہی دروازہ کھلنے کے ساتھ مدیہ اندر آتے ہوئے بولی۔

”آپ یہاں ہیں بابا! میں آپ کو نیچے ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔“  
”خیریت؟“ انہوں نے اسے اپنے برابر بٹھاتے ہوئے پوچھا۔  
”میں بہت بور ہو گئی ہوں۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ سب اپنے اپنے کمروں میں بند۔ کھانے کے وقت نکلے ہیں پھر غائب ہو جاتے ہیں۔ مجھ سے کتنا ہے میں یا۔“

”نہیں بیٹا! آپ سے کیوں کتنا میں گم۔ بس سب کا اپنا اپنا مزاج ہے اپنی اپنی دلچسپیاں ہیں۔ آپ کی ہل کیا اہمیتو فیروز تھیں؟“ انہوں نے اس کی بات کاٹ کر نرمی سے پوچھا۔  
”کوئی خاص نہیں پھر بھی زندگی مٹھ کر تھی۔ صبح ناشتے کے ساتھ ساتھ ماما کیچر پھر کالج جانے کی تیاری۔ صابلی جلدی جلدی کا شور مچاتی رہتی۔ مجھے اسے تنگ کرنے میں بہت مزہ آتا ہے اور نیل بھائی کو بھی۔ اور عرب ساتھ تو میری بیٹی ہی نہیں ہے۔ بہت لڑائی ہوتی ہے ہماری لیکن ہم ناراض نہیں ہوتے۔ بس لڑتے ہیں اور اب لڑتے بھی نہیں ہیں کیونکہ میں وہاں نہیں رہتی۔ آپ کو پتا ہے میں اسلام آباد میں ہوتی ہوں۔ اپنے خلیل کے پاس۔“ سے شاید سب یاد آ رہے تھے جو وہ شوق سے بتانے بیٹھ گئی تھی۔  
”کیوں ان کے پاس کیوں؟“ شاہ سکندر نے پوچھا تو وہ اصل بات کول کر گئی۔

مجھے اسلام آباد جانے کا شوق تھا۔ وہاں گئی تو پھر آئے کوئل ہی نہیں چاہا۔ ماما سے ضد کر کے وہیں رہ گئی ہیں ایڈیشن بھی لے لیا۔ اف میرا تو بہت نقصان ہو گیا۔ ایک ہفتے کی چھٹی تھی اور یہاں ایک مہینہ سے ایکدم اپنا کالج یاد کیا۔

”کون کون ہے آپ کے خلیل ماما کے گھر میں؟“ انہوں نے ایک خیال کے تحت پوچھا تھا۔  
”س ماما جی اور ماما جی ہیں۔ سمعیہ جی کی شادی ہو گئی اور اشعر بھائی لندن میں ہیں۔ شاید آنے والے ماما ہو سکتا ہے وہیں شادی کر لیں جیسے۔“ وہ روانی میں بتاتی ہوئی ایکدم خاموش ہو گئی۔  
”صاحت، وہ بھی آپ کی طرح ہے؟“ شاہ سکندر چاہتے تھے وہ یوں ہی بولتی رہے، جب ہی اس کے خاموش ہی فوراً سوال کر رہے تھے۔

”نہیں، وہ بہت ڈرپوک ہے۔ شادی والے روز اگر میری جگہ وہ ماما پر بند و قیں تنی ہوئی دیکھ لیتی تو اس کا تو وہیں ہلی ہو جاتا۔“

صاحت کی تعریف میں ہمیشہ سب سے پہلے اس کی بڑی کا ذکر کرتی تھی۔  
”شاہ سکندر اندر ہی اندر جڑ بڑھوئے اور صاحت کے بارے میں مزید جاننے کا خیال چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔  
”لوکے بیٹا! آپ اپنے کمرے میں جاؤ، مجھے کچھ کام کرنا ہے۔“  
”ہلے میرا مسئلہ تو حل کریں۔“

”بابا! مسئلہ ہے؟“ انہوں نے فوراً پوچھا۔  
”ہریت۔“ اس نے بوری شکل بنا کر کہا۔  
”بیٹا!۔ آپ کا کیا دل چاہتا ہے پڑھنا چاہتی ہو تو اسلام آباد لے چلوں یا نئے سرے سے کہیں اور۔“  
”نہیں، مجھے نہیں پڑھنا۔“ وہ بیزار سی بولی۔

”نیل بیٹا! ام از کم کریجویشن نو کر لینا چاہیے آپ کو۔“  
”اگلی فائدہ نہیں۔ جتنی تاج میری اب ہے، اگر نیچویشن کے بعد بھی اتنی ہی رہے گی۔ کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ مگر کیا ہاتھ آئے گی۔ کیا کروں گی ڈگری لے کر۔ نوکری تو نہیں کرنی مجھے۔“  
”ہوم میں آتا بولے جارہی تھی اور اسے دیکھتے ہوئے شاہ سکندر کا ذہن کہیں پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے کہا تھا۔  
”میرے خواب ایک خوبصورت گھر تک محدود نہیں ہیں۔ جس مقصد کے تحت میں نے تعلیم حاصل کی اسے نہیں چھوڑ سکتی۔“

\*~\*~\*

کرمیں سونیا کی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے تھے لیکن خوشیوں میں بے ساختگی نہیں تھی بلکہ جیسے ہر بات منوج کر اور سنبھل کر ہو رہی تھی۔ لڑکیاں ڈھولک لے کر بیٹھیں تو ایک لائن سے رلے رٹائے گانے شروع ہوئے۔ درمیان میں نہ کوئی چھینا چھینتی نہ ہنسی مذاق۔ شاید اس لیے کہ اس سے پہلے کی شادی نے جو مسائل دیکھے تھے گوکہ اس کی لپیٹ میں سب نہیں آئے تھے لیکن اپنے اپنے طور پر سب ہی محسوس کر رہے تھے۔ یوں ماما پر اس کے تمام پیچھے بھیجیاں جان چھڑکتے تھے پھر کیسے ممکن تھا کہ اس کی پریشانی کو وہ محسوس نہ کریں۔  
”اسیہ ظاہر نہیں کرتی تھی اور بھرپور طریقے سے ہر کام میں حصہ لے رہی تھی اور اسی کی طرح صاحت بھی کس کر رہی تھی کہ وہ اس خوبی پر اپنے ساتھ ہونے والی ٹریڈی کا سایا بھی نہ پڑنے دے۔ جب ہی کچھ زیادہ ہی دیکھ کا مظاہرہ کر رہی تھی پھر بھی سب بہت محتاط تھے۔

یونیا رخصت ہو کر اسلام آباد چلی گئی تو اگلے دن باقی سب گھر والے ویسے میں شرکت کے لیے روانہ ہو گئے۔ ماما ایکدم خالی ہو گیا۔ صرف اماں جی، آسیہ اور وہ تھی۔ اماں جی کی حیثیت خراب تھی۔ اس لیے آسیہ سے اپنا جانا ملوئی کرنا پڑا، ورنہ پروگرام تو ان کا بھی تھا اور آسیہ نے اس سے تو بہت کما کہ وہ بھی چلی جائے لیکن



ہل میں آنے والے ہیں۔“

ماخذ احافظ۔“

”وہ ریسوررکھ کر پلٹی تھی کہ پھر تیل بج اٹھی۔“

”اس بار اس نے کچھ بزاری سے ریسور اٹھایا تھا۔“

”یہاں پر جا رہا ہوں۔ مدیجہ کے لیے کوئی پیغام ہو تو بتا دیں۔“ دوسری طرف علی تھا۔ بغیر سلام دعا کے ہی بولا اور اس کا داغ جھجھکا گیا۔ حسب سابق ریسور پختہ لگی تھی کہ اچانک کسی خیال کے تحت رک گئی کچھ نہیں اور اس کے مزید کچھ کہنے کا انتظار کرنے لگی۔

”بہاجت! قدرتے توقف سے ادھر سے وہ پکار کر کہنے لگا۔ ”خفگی ناراضگی بجاہے لیکن پلینیری بھی تو بنایا تم مجھ سے مل سکتی ہو۔“

”نہ ہونٹ بچھڑ کر خود کو کچھ کہنے سے باز رکھا۔“

”اگر تم پر اس سلسلے میں کوئی باندی لگائی گئی ہے تو میں آجاتا ہوں۔ اب تو آسکتا ہوں اپنی منکوحہ سے ملنے پر کسی کو اعتراض بھی نہیں ہونا چاہیے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا۔“ آخر میں اس نے اس کی خاموشی کی سہیلی۔

”میں اس نے ریسور شیخ یا اور اس کی دیدہ دلیری پر تلملاتی ہوئی دوبارہ اماں جی کے پاس جا بیٹھی تھی اور کچھ جس انداز سے احمد کے بارے میں سوچ رہی تھی اب اس کی جگہ شاہ علی جمائیم آگیا تھا۔“

”نہرے روز سب لوگ اسلام آباد سے واپس آگئے، کیونکہ سب کام کان والے تھے۔ بس ایک وہ اور ٹوبہ بھی۔ ٹوبہ کو رزلٹ کا انتظار تھا۔ اس کے بعد اس کا ارادہ میڈیکل میں جانے کا تھا اور رزلٹ تو اس کا بھی نہ آیا تھا لیکن فور تھ ایئر میں ایڈمیشن شروع ہو چکے تھے اور اسے ابھی تک یہ معلوم نہیں تھا کہ آسیہ نے

”بارے میں کیا سوچا ہے۔ یعنی اس کی پڑھائی کے متعلق اور وہ خود چاہتی تھی کہ دوبارہ سے کالج جانا شروع کرے۔ لیکن آسیہ سے کہتے ہوئے ڈرتی تھی۔ کیونکہ ان دنوں آسیہ کا مزاج کے بارے میں کچھ اندازہ نہیں

”جی، بہت مہربان اور کبھی ذرا سی بات پر ہستے سے اکھڑ جاتی۔ اس لیے وہ ضرورت کے علاوہ ضروری بات بھی نہ کرنے لگی تھی اور گو کہ ایڈمیشن بہت ضروری تھا پھر بھی وہ ڈرتی تھی اور بہت ہمت کرنے پر بھی آسیہ کہہ سکی اور نیل کے پاس چلی آئی۔“

”بھائی! بے کار وقت ضائع کرنے سے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ میں بی اے کروں۔“ اس نے نیل کے لئے کاکپ رکھتے ہوئے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو وہ فوراً ”تائید کرتے ہوئے بولے۔“

”ما تمہیں پڑھنا چاہیے۔“

”آپ ماما سے کہیں نا۔“

”ماہ منع کر رہی ہیں کیا؟“

”ماہ وہ میرا مطلب ہے، میں نے ان سے بات نہیں کی۔ مجھے ڈر لگتا ہے نیل بھائی! شاید وہ منع کر دیں مگر کچھ کچھ کرنا خدا شہ ظاہر کیا تو نیل مجھے کر بولے۔“

”خیال ہے وہ پڑھنے سے نہیں روکیں گی۔ خبر میں بات کروں گا۔ ایڈمیشن تو ہو رہے ہیں۔ تم لیٹ نہیں بلکہ خیال کیوں نہیں آیا تمہیں۔“

”مالکین ماما سے کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ پتا نہیں کیا ہو گیا ہے انہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر ڈانٹ دیتی اور ریسور کر بولی۔“

”اؤف! تمہیں ان سے شکی نہیں ہونا چاہیے۔ جانتی تو ہو وہ کتنی پریشان ہیں۔ تم سے زیادہ انہیں مدحو بنے نیل نے دھیرج سے اسے ٹوک کر کہا تو وہ صوفے سے اٹھ کر ان کے پاس آ بیٹھی۔“

اس کا دل کچھ اچاٹ سا ہو گیا تھا۔ اماں جی کا ہانا کر کے رک گئی کیونکہ آسیہ سارا دن تو گھر میں نہیں ہوتی تھی۔ اس وقت بھی آسیہ کلینک جا رہی تھی۔ وہ اس کے پیچھے گیٹ بند کر کے واپس اماں جی کے پاس آ کر بیٹھی اور ان کی ٹانگیں دباتے ہوئے کہنے لگی۔“

”۲۴ گھنٹہ کی آخر نہیں آئے۔ کتنا انتظار کیا ماما جی نے، اور سونیا آپلی تو بہت دور ہی تھیں۔ انہیں اگر نہیں ہوتا تھا تو صاف منع کر دیتے۔ خواہ آس دلائی۔“

”ہاں! اماں جی نے ہاں کی صورت لمبی سانس کھینچی۔ ”پتا نہیں پردیس کی مٹی کیسی ہے۔ سارے رشتے بھرا دیتی ہے۔“

”۲۴ گھنٹہ ایسے تو نہیں تھے اماں جی! وہ تو سب سے بہت محبت کرتے تھے اور ذمہ دار بھی بہت تھے۔“ وہ ان دنوں میں کھو کر بولی جب احمد یہاں تھا۔

اماں جی پر غصہ کی طاری ہو رہی تھی۔ اس کی بات پر بس ہوں کر کے رہ گئیں تو ان کا چہرہ دیکھ کر اس نے خاموشی اختیار کر لی پھر آہستگی سے ان کے پاس سے اٹھ کر رز آمدے میں آ بیٹھی اور احمد ہی کو یاد کرتے ہوئے وہ جانے کیا کہہ سونے لگی تھی۔

”اگر احمد بھائی وہاں شادی نہ کرتے تو شاید یہ حالات نہ ہوتے۔ اس کے برعکس جیسے اشعر بھائی اور ان کی ایک ساتھ منگنی ہوئی تھی تو اب شادی بھی دونوں کی ساتھ ہی ہوتی۔ سونیا جی رخصت ہوتیں اور مدحو یہاں بیٹھی ہوئی دس بنی ہوئی۔ بہت غلط کیا احمد بھائی نے۔ انہیں شاید مدحو سے محبت بھی ہی نہیں۔ محض دل لگی با۔“ فون

تیل سے اس کی سوچیں منتشر ہو گئیں اور اماں جی کی نیند خراب ہونے کے خیال سے اس نے بھاگ کر ریم اٹھایا تھا۔

”ہیلو۔“

”کون مدحو! کیسی ہو؟“ دوسری طرف وہی تھا جسے ابھی وہ یاد کر رہی تھی اور اس کے منہ سے مدحوں کو دہناتا بولی۔

”جی نہیں، میں صبا ہوں اور اتفاق سے ابھی آپ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔“

”اچھا! دھروہ خوش دلی ہے نا۔“ پھر یہ نہیں کہو گی۔ بڑی عمر ہے تمہاری۔“

”کیوں نہیں۔ اللہ آپ کو میری عمر بھی لگا دے۔“

”بہت بےوقوف۔ چلو ذرا امی کو بلاؤ۔“ اصرار نے پھر بھری سرزنش کے ساتھ کہا۔

”مامی جی نہیں ہیں بلکہ کوئی بھی نہیں ہے۔ سب اسلام آباد گئے ہیں ویسے میں۔ آپ کیوں نہیں آئے؟“

اس نے تار کر پوچھا۔

”بس یا ر! پچھتی نہیں ملی اور سنو ہم کیوں نہیں گئیں؟“

”اماں جی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے ماما اور میں نہیں گئے۔“

”اور مدحو! اچھا ہوا تو وہیں ہوتی ہے نا۔“ اصرار نے ایک مدحو یاد آنے پر کہا تھا۔

”میں مدحو شاہ پور میں ہے۔ شاہ سکندر کے پاس۔“

”کیوں، میرا مطلب ہے وہاں کیوں چلی گئی۔ پھوپھو نے جانے دیا۔“

”جی! اس نے اختصار سے کام لیا۔“

”یقیناً بہت ضد کی ہوگی اس نے ضدی تو وہ شروع سے ہے۔ آئے گی کب؟“ اصرار نے مدحو کے اس انداز پر تاسف کا اظہار کر کے پوچھا تو اس نے لاعلمی ظاہر کر دی۔

”پتا نہیں۔“

”اچھا میں پھر فون کروں گا۔ کب تک آئیں گے سب لوگ؟“

”اچھا میں پھر فون کروں گا۔ کب تک آئیں گے سب لوگ؟“

”آپ تو کہتے تھے نبیل بھائی کہ مدحو اس گھر کے علاوہ اور کہیں بھی زیادہ دن نہیں رہ سکتی۔“

”میں اب بھی یہی کہتا ہوں۔“ نبیل فوراً بولے۔

”بس کریں بھائی! اتنے دن تو ہو گئے ہیں۔ کل بھی اس کا فون آیا تھا۔ کہہ رہی تھی۔ کبھی نہیں آؤں گی۔“

”سنی رہو اس کی باتیں۔ وہ نارمل نہیں ہے۔ ہمیشہ سے یہی سب کرتی رہی ہے کہ کسی نہ کسی سبب سے اس کے لیے پریشان رہیں۔ جس دن اسے اس کے حال پر چھوڑ کر سب اس سے بے پروا ہو گئے وہ ٹھیک ہو جائے گی۔“

”نبیل نے کہا تو اسے ان کی بات بالکل پسند نہیں آئی۔“

”ہائے نہیں نبیل بھائی! اس سے تو وہ اور چڑ جاتی ہے۔“

”کب تک چڑے گی۔“

”بس جانے دیں۔ یہ بتائیں۔ آپ مماسے کب بات کریں گے میرے کالج جانے کے سلسلے میں۔“ وہ پورا بات برائی۔

”مجھے ہی اور تم بس تیار رہو۔ مجھے یقین ہے پھوپھو منع نہیں کریں گی۔ بلکہ وہ اس بات پر ناراض ہوں گی کہ

نے پہلے کیوں نہیں یاد دلایا۔“

نبیل نے بات کے اختتام پر خالی کپ اٹھا کر اسے یوں تھمایا جیسے اب تم جاؤ یہاں سے اور وہ بھی اٹھ کھڑی تھی پھر دروازے کے قریب رگ کر پوچھنے لگی۔

”نبیل بھائی! آپ مدحو کے لیے سنجیدہ ہیں نا؟“

نبیل نے بہت بری طرح اسے گھورا تھا۔

وہ ہنسی ہوئی باہر نکل گئی۔

\*~\*~\*

وہ بی بی جان کو ڈھونڈتی ہوئی پہلے ان کے کمرے میں پھر ہال میں دیکھنے کے بعد باباجان کے خاص کمرے

طرف آئی تھی لیکن دروازے کے پاس ہی رک گئی کیونکہ اندر سے باباجان کے تیز بولنے کی آواز آ رہی تھی۔

نے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر کچھ دیر سوچا پھر اندر جانے کا ارادہ ترک کر کے واپسی پلٹی تھی کہ باباجان کی آواز پر پھر

گئی اور بہت آہستہ سے دروازے کے قریب ہو کر سننے لگی۔

”سکندر کا دماغ خراب ہے۔ کہتا ہے، ہم اس ڈاکٹر کی کیا پاس جائیں اور اس پر بھی اس کی مرضی کو دیکھنا

یاد دے۔ ہونہ۔“

”بہت خیال کر لیا ہم نے سکندر کا۔ اب نہیں کریں گے۔“ باباجان کی آواز وقفہ وقفے سے آ رہی تھی۔

غصے میں ادھر سے ادھر نکل رہے تھے اور جانے اندر اور کون کون تھا۔

”تم پہلی فرصت میں اس عورت کو پیغام بھیجو کہ مدیحہ کی سلامتی چاہتی ہے تو فوراً“ علی کی منکوحہ اس کے

پہنچا دے۔“

”میرے خدا! اس نے بہت دہان کر دیا دروازے کو دیکھا تھا۔“

”اور سنو مدیحہ پر کڑی نظر رکھو۔ وہ ضرور اپنی ماں کو فون کرتی ہوگی۔ ہم علی کا مسئلہ حل کر لیں پھر

بارے میں بھی سوچتے ہیں۔“

وہ اسی طرح سہمی ہوئی اٹل قدموں دھیرے دھیرے پیچھے ہٹنے لگی تھی پھر اب داری کے موڑ پر تیزی

ہوئے علی جمائیکر سے ٹکرائی اور اس سے پہلے کہ اس کے حلق سے چیخ بلند ہوئی جلدی سے اپنا ہاتھ ہونٹ

لیا۔

لے سے قاصر تھی۔ نفی میں سر ہلایا پھر علی جمائیکر کا بازو مضبوطی سے تھام کر کھینچتی ہوئی لاؤنچ

ہاں اور اسے صوفے پر دھکیل کر یوں دیکھنے لگی جیسے آیا وہ قابل اعتبار ہے کہ نہیں۔

نے کچھ کہا ہے۔ باباجان نے۔ علی جمائیکر نے پوچھا پھر خود ہی قیاس کیا۔

نہیں۔ وہ میں بارہ درری کی طرف نکل گئی تھی۔ ڈر سی گئی۔ اسے فوری طور پر جو سمجھ میں آیا اُمد دیا۔

”کون تھا وہاں؟“

”اُدھو جو گھنا سنا پیڑ ہے نا اس میں جھانک رہا تھا۔“ وہ اب اپنی بات پر قائم رہنے کے لیے پوری کمائی

تیار ہو گئی تھی۔

”مجھ کو کہا تو میں اس نے تمہیں؟“ علی جمائیکر نے ساختہ مسکراہٹ ہونٹوں میں دبا کر پوچھا۔

”وہ نظریں چرا کر سیدھی ہو گئی پھر ایک دم خیال آنے پر پوچھنے لگی۔“ آپ کراچی سے آ رہے ہیں؟“

”اور صبح واپس بھی جانا ہے۔ سکندر چچا یہیں ہیں یا نہیں اور پر اُٹلے ہوئے ہیں۔“

”ہاں۔“ کچھ دیر پہلے میں نے انہیں اپنے اسٹڈی روم میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ آپ وہیں چلے

باباجان سے مل لوں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا پھر جاتے جاتے رک کر بولا۔ ”میں نے صباحت سے پوچھا تھا کہ

لیے کوئی پیغام ہو تو۔“

پکی ملاقات ہوئی اس سے؟“ اس نے فوراً پوچھا۔

”ہاں۔ میں نے فون کیا تھا۔ البتہ نبیل بھائی سے باقاعدہ ملاقات ہوئی۔ میں اپنی زندگی میں بہت کم لوگوں

بڑھا ہوں اور ان کم لوگوں میں ایک فرد کا اضافہ نبیل بھائی۔ ہی ازوری جینٹلس۔“ اس نے کہا تو وہ بے

عکاسہ اچکا کر بولی۔

بی جگہ اگر صبا ہوئی تو نبیل بھائی کی تعریف پر خوشی سے پاگل ہو جاتی۔ اس کے اب جائیں ملیں اپنے

سے اور دیکھیں انہوں نے آپ کی شادی کی دوسری اور آخری قسط کا پلاٹ تیار کیا کہ نہیں۔“

ہاں دوسری بات پر جزبہ ہو کر آگے بڑھ گیا۔

”اچھے خطرناک لوگ ہیں۔ اپنی بار کو جیت کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔“ اس کی نیند اڑ چکی تھی۔

ایسا تو کو سوچتے ہوئے اسے اپنی زندگی کا اختتام نظر آنے لگا تھا۔

رہا تو میں ماما کو فون کر کے خبردار بھی نہیں کر سکتی۔ کتنی مجبور ہوں گی ماما۔ اگر انہوں نے میری وجہ سے

نابا تو پھر وہ بھی ہم دونوں کو نہیں دیکھ سکیں گی۔ ان لوگوں کو مجھ سے اور صبا سے کوئی محبت نہیں ہے بلکہ یہ

ہے اور اودھوی تسلیم نہیں کرتے۔ اس لیے ہمیں مٹانا ان کے لیے کوئی بڑی بات نہیں ہوگی۔“

غائب سوچتے سوچتے رات کے آخری پہر جا کر سوئی تھی پھر بھی صبح بہت جلدی اٹھ گئی اور یہ یقیناً ”اس

کا فون تھا جس نے اسے گہری نیند سوئے نہیں دیا تھا۔ دل و دماغ دونوں بوجھل ہوئے تھے۔ منہ پر پانی

پھینکا اور وہ ہاتھوں ہی سے چہرہ تھپتھپاتی ہوئی دوبارہ کمرے میں آئی اور تازہ ہوا کے لیے کھڑکی سے پردے

کے نیچے لان میں شاہ سکندر اور علی جمائیکر ایک ساتھ چہل قدمی کرتے نظر آئے اسے لگا جیسے وہ دونوں

کے اگلے پلان پر بات کر رہے ہوں۔ اس نے کچھ دیر سوچا پھر دوپٹہ اٹھا کر کمرے سے نکلی اور بیڑھیاں

دیکھا گئی ہوئی ان کے پاس چلی آئی۔

”اب نکلیا بابا۔“

”آج آپ جلدی اٹھ گئیں؟“ شاہ سکندر رک کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

”مجھے یہ خیال تھا کہ میرے اچھے سے پہلے کہیں آپ نکل نہ جائیں۔ رات آپ کو نہ جانے کی بات

تھا۔“ اس نے حاضر دماغی سے کام لیا۔



تاگواری اور غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔

”کم آن یار! یہ ضروری تو نہیں ہے کہ جیسا ہم سوچیں، چاہیں ویسا ہی ہو۔ کبھی کبھی۔“ وہ رُسے نہیں بڑے دلکش انداز میں کہتا ہوا اس کی طرف آنے لگا تھا کہ وہ ایک دم حرکت میں آئی اور کارنر سے کانچ کاغذ کاغذ اٹھا کر اسے کارنر کے کنارے پر دے مارا اور اس تیزی سے لوٹے کانچ اپنی مٹھی میں بھر کر بولی تھی۔

”شاہ علی جاناگیر! اگر آپ نے مزید ایک قدم بھی میری طرف بڑھایا تو میں یہ سارے کانچ اپنے حلق سے اتار لوں گی۔“

علی جاناگیر کے قدم وہیں رک گئے تھے۔



اس کی بند مٹھی سے قطرہ قطرہ لہو ٹپکنے لگا تھا۔ ہتھیلی میں کانچ چبھ رہے تھے۔ تکلیف بھی ہو رہی تھی یہ وہ اس طرح کھڑی تھی۔ بہت چونکا۔

علی جاناگیر اس کے خطرناک تیوروں کے ساتھ ارادے کی مضبوطی سے خائف ہو گیا تھا۔ یہ ہرگز وہی تھی جو ذرا سا تیز بولنے سے سسم جاتی تھی اور اس کی اس تبدیلی کا سبب خواہ کچھ بھی ہو وہ اس وقت یہ سب سے قاصر تھا۔ اس کا ذہن صرف اس صورت حال پر قابو پانے کی سوچنے لگا تھا۔

”دیکھو، تمہارا ہاتھ زخمی ہو رہا ہے۔ پھینک دو یہ سب۔“ وہ اس کی لہو پکاتی مٹھی کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

”نہیں آپ ہٹ جائیں سامنے سے اور جب تک میں باہر نہ نکل جاؤں آپ اس کمرے سے نہیں گے۔“ وہ دھیرے دھیرے قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہنے لگی۔

”رکوصاحت! میں وعدہ کر رہا ہوں۔ جب تک تم نہیں چاہو گی میں تم پر کوئی حق نہیں جتاؤں گا۔ میرا انتہا اور اس طرح مت جاؤ۔“

”استقرار! وہ تنہی سے کہہ کر ہونٹ بھیج گئی۔

”اوگاؤ! میں کیسے سمجھاؤں تمہیں۔ سنو تمہیں خود اپنے آپ پر تو بھروسہ نہ تھا۔ پھر کیوں ڈرتی ہو؟“

علی جاناگیر نے زچ ہو کر کہا پھر ایک دم جھپٹ کر اس کی کلائی تمام لی تو اس کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکلا اور دوسرے پل پورا زور لگا کر اس کی گرفت سے کلائی چھڑانے کی سعی کرنے لگی۔

”پاگل مت بنو صبا! اپنا ہاتھ دیکھو۔“

علی جاناگیر نے مجبور ہو کر اسے بید پر دھکیل دیا اور اس کا بازو گھٹنے کے نیچے دبا کر بہت احتیاط سے اس کی ہند کھولی تو ایک لٹخہ کو وہ خود بھی چکر اٹھا تھا۔ کتنے کانچ اس کی ہتھیلی میں اندر تک چلے گئے تھے۔

”خود دار! ہلنا نہیں۔“ وہ اسے دیکھ کر تیز لہجے میں بولا تو اس نے دوسرا بازو اپنی آنکھوں پر رکھ لیا کیونکہ ہم

تھی کہ اب اس کی کوئی بھی کوشش نہ صرف بے کار ہوگی بلکہ اسے مجبور اور بے بس بھی بنا کر رکھ دے گی۔ وہ نہیں چاہتی تھی۔

وہ دوبارہ اس کے ہاتھ کی طرف متوجہ ہوا اور بہت آرام و احتیاط سے ایک ایک کانچ نکالنے لگا۔ گاہے گاہے اس پر بھی نظر ڈال لیتا جو نکلا ہونٹ و انتوں میں دبائے بہت مضبوط کر رہی تھی۔ پھر بھی کسی وقت اس کے

”چلو آئیہ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ تم کتنی بہادر ہو۔“ وہ آخری کانچ نکال کر اٹھتے ہوئے بولا۔ پھر دوسرے تم سے فرسٹ آئیہ باکس اٹھا کر لایا اور دوبارہ اسی جگہ بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

”جو کانچ مجھے نظر آئے وہ میں نے نکال دیئے ہیں اور اب خون صاف کر کے ٹیوب بھی لگا دوں گا لیکن ذرا احتیاط کر لینا آئیہ میں ڈاکٹر کو دکھانا ضروری ہے۔ کو تو ابھی لے چلوں۔“

میں۔“ وہ بس ایک لفظ کہہ کر پھر ہونٹ بھیج گئی۔ جبکہ آنکھوں سے بازو بھی نہیں ہٹایا تھا۔

پہلے میں ماما کو دکھانا۔ ویسے کیا ہوگی ان سے؟“ دوسری بات پر وہ خود ہی محفوظ ہو کر مسکرایا تھا۔

بولی میں اسپرٹ لگا کر آہستہ آہستہ اس کا ہاتھ صاف کیا اس کے بعد ٹیوب پھینکا کر ہاتھ دھونے کے لیے

میں میں چلا گیا تو اس نے پہلے آنکھوں سے ذرا سا بازو ہٹا کر دیکھا اور اسے مہجور نہ پا کر فوراً ”اٹھ کر بیٹھی تھی

بلکہ اسے ہاتھ صاف کرنا ہوا گیا اور بہت انجان بن کر بولا۔

”ہو! ہو!“

ن گھر جاؤں گی۔“ وہ کہتی ہوئی بیڈ سے اتر کر کھڑی ہو گئی۔

میں تمہیں روکوں گا نہیں۔ لیکن اس طرح جانے بھی نہیں دوں گا۔“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

بامطلب؟“ وہ تیز کر بولی۔

بچہ جاؤ آرام سے یا چلو پہلے کھانا کھالیں۔ اس کے بعد بات کریں گے۔“

مجھے نہیں کھانا اور نہ میں آپ کی کوئی بات سنوں گی۔“ اس کے لہجے میں ضد اور خفگی تھی۔

نویہ طے ہے کہ میں اپنی بات کے بغیر تمہیں نہیں جانے دوں گا۔ آگے تمہاری مرضی۔ آج جانا چاہو یا چار

۔“ وہ ہنوز اسی سنجیدگی سے کہتا ہوا آرام سے صوفے پر جا بیٹھا اور ٹیبل سے سرکٹ اٹھا کر سگائے لگا تو وہ

طلب سمجھ کر بری طرح سلگ کر بولی۔

بالا بات کہنی ہے آپ کو؟“

ن طرح نہیں۔ یہاں آکر بیٹھو۔“ اس نے اطمینان سے اپنے برابر اشارہ کیا تو وہ کچھ دیر تک خستہ گیس

اسے اسے دیکھتی رہی پھر اس صوفے کے دوسرے کنارے پر خاصے تکلف سے بیٹھتے ہوئے استراخیہ انداز

پ کیا سمجھتے ہیں۔ جو آپ کہیں گے میں یقین کر لوں گی۔“

ن کے لیے میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ تم صرف سچائی سن لو اس کے بعد جو تمہارا دل چاہے کرتا۔“ وہ

بٹ سے بولا تھا۔

پ سے بڑی سچائی یہ ہے کہ آپ شاہ جاناگیر حیات کے بیٹے ہیں اور آپ نے مجھ سے اس حقیقت کو

رف اس خوف سے کہ کہیں میں تمہیں کھونہ دھل۔“ جس طرح وہ فوراً بولی تھی۔ اس طرف سے بھی

دب آیا تھا۔ پھر قدرے رک کر کہنے لگا۔

بہت بعد کی بات ہے۔ اس سے پہلے میں نے تمہیں دیکھا۔ پسند کیا اور اپنا نہ کا فیصلہ بھی کر لیا تھا اور اس

ن مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم ڈاکٹر آسیہ کی بیٹی ہو جس روز تم گلدان کے پیسے دینے یہاں آئی تھیں اگر

یاد ہو تو میں بابا جان موجود تھے۔ ان کے ساتھ باتوں میں تم نے انہیں بتایا تھا کہ تم شاہ سکندر حیات کی بیٹی

ن مارا کھیل وہیں سے شروع ہوا۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ میں اس کھیل میں شامل ہی نہیں تھا لیکن میں

ن نہیں تھا۔ اس لیے اس تمام عرصے میں بار بار میں نے سوچا کہ تمہیں ساری حقیقت بتا دوں لیکن تمہاری

نہتے ہوئے میں نے مجبوراً ”خود کو باز رکھا کیونکہ تم میں اپنے بارے میں سوچنے اور فیصلے کرنے کی جرات ہی

ن اور نہ میں اسی زمانے میں تمہاری محبت آزماسکتا تھا۔ تم پہلے مرحلے پر ہتھیار ڈالنے والوں میں سے ہو صاحت

ن اٹھا اس خوبی یا خامی سے تم خود بھی اچھی طرح آگاہ ہو۔ پھر بتاؤ میں خاموش نہ رہتا تو کیا کرتا۔“ وہ کچھ دیر

ن خاموش ہو گیا کہ شاید وہ بولے لگی لیکن وہ کچھ گم صم سی بیٹھی تھی۔

ن ہمارے لیے محبت سے دستبردار ہونا آسان ہے اس لیے اسے اپنے اختیارات تم نے اپنے ہیوں کو سوچ

ن اسے بولنے پر آمادہ نہ دیکھ کر وہ مزید گویا ہوا تھا۔ یہ کوئی قابل خیرات نہیں ہے صبا! اس لیے کہ ہمارے

ہیں۔ اس میں بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ کانچ چھ گئے تھے۔“  
 نیل بیٹا! میرا پاس لاؤ۔“ آسیہ اس کی ہتھیلی کو انگلی سے چھو کر دیکھ رہی تھی ایک دو جگہ کانچ کی چھین  
 بن ہوئی تو نیل کو مخاطب کر کے بولی۔  
 نیل پاس لے آئے پھر اس کے برابر بیٹھتے ہوئے بولے۔  
 ”کم از کم فون تو کر دیتیں۔“

”مجھے ہوش نہیں تھا اور جب ہوش آیا تو فوراً ”چل پڑی۔“ وہ نیل کی طرف دیکھ بغیر بولی۔ کیونکہ جانتی تھی  
 وہ اس کا جھوٹ فوراً ”کچل لیتے ہیں۔“  
 ”کہاں ہوا تھا ایک سیل فون؟“ آسیہ نے پاس میں سے کاشن اور بینڈنگ نکالتے ہوئے پوچھا تو وہ اندر رہی اندر  
 بان ہو کر کہنے لگی۔

”کانچ کے پاس اور اچھا ہوا کچھ کانچ فیلو ز ساتھ تھیں اور ان کا گھر بھی قریب تھا۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گئیں۔“  
 ”بڑے سوالوں سے بچنے کی خاطر دو سرا ہاتھ پیٹ پر رکھ کر بولی۔“ مجھے بھوک بہت لگ رہی ہے۔ آپ نے کھانا کھا  
 ”ہاں! نیل بھو اسے کہو اس کے لیے کھانا گرم کر دیں۔“

آسیہ نے اسے جواب دے کر نیل سے کہا پھر جلدی جلدی اس کے ہاتھ پر بینڈنگ کرنے لگی جب تک یہ کام  
 نہ ہو اب تک ادھر کھانا بھی گرم ہو گیا تھا اور اس ہانے اسے اچھے کاموں پر مل گیا۔ دایاں ہاتھ زخمی ہوا تھا اس  
 ہاتھ میں ہاتھ سے کھانے میں اسے کچھ دیر لگی اور کچھ اس نے جان بوجھ کر دیر لگائی تاکہ آسیہ کلینک کے لیے  
 جائے۔ کانچ تو بچ رہے تھے۔ نیل بھی اس وقت نیوشن کے لیے جاتے تھے۔ یوں ان دونوں کے جانے سے  
 طرح سے اس کی جان چھوٹ گئی تھی۔ جس پر وہ شکر کرتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی اور ان چند گھنٹوں میں جو  
 پیش آیا اسے پہلے مرحلے سے سوچنے لگی تو نہیں اس کا دل خوشگوار انداز میں دھڑکا اور کہیں سہم سا گیا۔ گویا  
 ملائقیات تھیں۔ جنہیں سوچتے ہوئے اس کی آنکھ لگ گئی۔ شاید تھکن کے باعث ورنہ یہ کوئی سونے کا وقت  
 نہ تھا۔ کچھ دیر میں مغرب کی اذان ہونے والی تھی اور پتا نہیں بوانے اسے نماز کے لیے اٹھایا کہ نہیں وہ اٹھ  
 نیل کے اٹھانے پر اٹھی تھی۔

اس وقت سونے کی کیا تک ہے۔ ابقیہ رات کیا جانے کا پروگرام ہے۔“ نیل نے نوکتے ہوئے کہا تو وہ ہاتھوں  
 الٹا ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔  
 ”نہیں کیسے سو گئی۔“ ماما آئیں کیا؟“  
 ”نیل ابھی اٹھ جے ہیں۔ جاؤ منہ دھو کر آؤ لیکن تمہارا تو ہاتھ۔“  
 ”شکر ہے دو سرا ہاتھ سلامت ہے۔“ وہ کہتی ہوئی اٹھ کر واش روم میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد واپس آئی تو نیل کو  
 بل پر نیم دراز دیکھ کر پوچھنے لگی۔  
 ”اب آپ سو رہے ہیں؟“

”نیل! اپنے پیچھے کتہ کتہ کر سیدھے ہو بیٹھ۔“ تمہارے ہاتھ میں تکلیف تو نہیں ہے؟“  
 ”ہے تو لیکن زیادہ نہیں ہے۔“ اس نے کہا اور پھر یہ سوچ کر کہ جب وہ سب جانتے ہیں تو انہیں یہ واقعہ بھی بتا  
 دینے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔  
 ”نیل! ایک سیل فون تھا تو نیل بھائی! وہ علی جہانگیر ہیں نا وہ راستے میں سے مجھے اپنے گھر لے گئے تھے۔“  
 ”اس کی پہلی بات پر متوجہ ہوئے تھے اور دوسری بات پر ان کی پیشانی پر لیکر س نمودار ہو گئی تھیں۔ جنہیں  
 علاوہ صرف خائف ہوئی بلکہ اپنی حماقت کا بھی شدت سے احساس ہونے لگا کہ اب اپنے ہاتھ زخمی ہونے کا  
 پیش کرے۔“

ہوں کے پیش نظر ہماری بہتری نہیں ہے بلکہ اپنا ہستی میں وہ ایک دوسرے کو بچاؤ کھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔  
 ہم دونوں تو ان کی بساط پر محض مہرے بن کر رہ گئے ہیں۔ ہمارے جذبات ہمارے احساسات ہماری محبت ہماری  
 کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔ وہ صرف اپنا کھیل کھیل رہے ہیں۔ جس میں ایک جیتے گا دوسرا ہارے گا۔ پوچھنا  
 اپنی جیت کی خوشی میں اور ہارنے والا اپنی ہار کے غم میں یہ بھی نہیں سوچے گا کہ اس میں ہم دونوں کا کیا نقصان  
 ہوا۔ ان باتوں سے میرا مقصد تمہیں تمہارے ہوں کے خلاف اکسانا نہیں ہے صبا میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تم  
 تمہاری مت بنو۔ تمہاری ممانہ کو یہ خدشہ ہے تاکہ کہیں ان کی کہانی نہ دہرائی جائے تو اس کے لیے وہ مجھ سے  
 مرضی کی شرائط طے کر سکتی ہیں۔ تم انہیں بتاؤ کہ تم مجھ سے۔“  
 وہ ایک دم خاموش ہو گیا پھر گہری سانس کے ساتھ اپنے آپ سے بولا تھا۔  
 ”چائیں! تمہیں مجھ سے محبت ہے بھی کہ نہیں۔“  
 ”محبت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جائز ناجائز کا فرق ہی بھلا دیا جائے۔“ وہ جن سوچوں میں تھی ان ہی میں گر  
 کر بولی تھی۔

”میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ لیکن خدا کے لیے تم میرے بارے میں ایسا مت سوچو۔ میں  
 دھاندلی میں شریک نہیں ہوں۔ اگر ہوتا تو اس وقت تم یہاں نہیں شاہ پور میں ہوتیں۔“ وہ اس کے ایک  
 زچ ہو گیا تھا اور وہ شاہ پور کے نام سے اچھل پڑی۔  
 ”آپ نے جو کتنا کھانا کھا لیا اب مجھے جانے دیں۔“  
 ”مائی گاڈ! اتنی دیر سے میں کیا صرف کھانا کھا کر رہا تھا۔ کم از کم اس پر کچھ تبصرہ تو کر دیا سوچنے کا ہی کہہ دو۔“  
 ”جہانگیر نے بڑی آس سے اسے دیکھا تو وہ یہاں سے نکلنے کی جلدی میں اثبات میں سر ہلا کر بولی۔

”ہوں! سوچوں کی ضرور۔“  
 ”گڈ! پھر مجھے کیسے پتا چلے گا کہ تم نے کیا سوچا ہے۔“  
 ”میں فون کروں گی۔“ وہ نظریں چرا کر بولی۔  
 ”اچھی بات ہے۔ میں انتظار کروں گا اور ہاں جاؤ گی کیسے۔ میں چھوڑ آؤں؟“ اس نے بڑے سادہ سے انداز  
 آفر کی تھی۔  
 ”نہیں! میں جلی جاؤں گی۔ میرا ایک شاید آپ کی گاڑی میں ہے۔“ وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی۔  
 ”چلو۔“ اس نے ہر گز رو روازہ بھول دیا تو وہ جلدی سے باہر نکل آئی۔ پھر اس سے بیک لیتے ہوئے  
 سرسری انداز میں پوچھنے لگی۔  
 ”میری کیسی ہے؟“

”بالکل ٹھیک اور بہت خوش۔“ وہ جانے کس خیال کے تحت مسکرایا تھا۔  
 ”میں چلتی ہوں۔“ وہ اس کی مسکراہٹ پر عجیب سا محسوس کرتی ہوئی فوراً ”گیت پار کر آئی تھی۔“

♥ ♥ ♥ ♥  
 جب وہ گھر میں داخل ہوئی آسیہ اور نیل پریشانی سے منہل رہے تھے کیونکہ اسے کبھی اتنی دیر نہیں ہوئی  
 اسے خود بھی احساس تھا اور اپنے طور پر انہیں مطمئن کرنے کے لیے اس نے تمام راستہ بہت کچھ سوچا  
 بھی آسیہ کو دیکھتے ہی وہ سٹپٹا گئی۔ اس پر آسیہ کا پوچھنا۔  
 ”کہاں رہ گئی تھیں؟“  
 ”وہ ماما! ایک سیل فون تھا۔ یہ میرا ہاتھ دیکھیں۔“ اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ سامنے کر دیا۔  
 ”آسیہ نرم پڑ گئی اور فوراً اس کی کلائی تھام لی۔  
 ”کیسے ہوا اور کہیں جوت تو نہیں آئی؟“



”جی نہیں جی۔ مجھے تو بالے گیا تھا۔“ مہراں نے اس بار لا علمی کا اظہار بہت مسکین سی شکل بنا کر کیا۔ تو وائٹ پیس کر بولی۔

”لو دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“

”وہ جی صفائی۔“

”کوئی صفائی و فانی نہیں کرنی۔“ وہ غصے سے کھڑی ہوئی تو مہراں نے بھاگ جانے ہی میں غایت سمجھی۔

”بڑی آئی صفائی کرنے والی ہونہ اور یہ میں کیوں اتنی پریشان ہو رہی ہوں۔ جب جانا ہو گا چلی جاؤں گی۔ کوئی روک سکتا ہے مجھے روک کر تو دکھائے کوئی۔ میں صبا نہیں ہوں جو رعب میں آجاؤں گی۔ میں تو جینے کا لڑنا ہی چاہتی ہوں۔“

”وہ غصے سے تلملاتی ہوئی ادھر سے ادھر مٹنے کے ساتھ اپنے آپ بولے جاری تھی۔

”پاپا آجائیں۔“ لیکن نہیں وہ تو بابا جان کے سامنے کچھ بول ہی نہیں سکتے، میں خود بات کرتی ہوں۔ ابھی اس وقت صاف کہہ دوں گی کہ اب میرا دل نہیں لگتا۔ مجھے واپس جانا ہے۔“ وہ ایک دم سے فیصلہ کر کے اس وقت دوبارہ اٹھا کر شانوں پر پھیلائی ہوئی کمرے سے نکل آئی۔

لاؤنج میں بی بی جان بڑی سو کے ساتھ جانے کس مسئلے پر بات کر رہی تھیں اسے دیکھ کر انہوں نے اپنی بات روک دی اور اسے پاس بلایا لیکن اس نے فاصلے پر ہی رک کر تجلّت میں پوچھا۔

”بابا جان کے پاس کوئی مہمان تو نہیں ہے۔“

”نہیں۔“ لیکن شاید وہ کہیں جا رہے ہیں۔“ بی بی جان نے کہا۔

”میں بھی گئے تو نہیں نا۔“ وہ اسی غلّت میں کبھی ہوئی تیز قدموں سے چل پڑی اور بابا جان کے کمرے کے پار رک کر پہلے دستک دی۔ اور ان کا جواب آنے پر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے ہوئے بولی۔

”السلام علیکم بابا جان!“

”جیت رہو۔“ بابا جان نے اونچا شملہ اپنے سر پر جماتے ہوئے اسے دیکھا تو وہ خاصی بے نیازی سے آگے بڑھنے پوچھنے لگی۔

”نہیں جا رہے ہیں؟“

”ہوں۔“ جواب میں انہوں نے نیکارا بھرا وہ بھی بادل خواستہ کیونکہ انہیں اپنے معمولات سے متعلق بالکل پسند نہیں تھے نہ کسی کو اجازت تھی اور وہ ان کی ناگواری محسوس کرنے کے باوجود بے ساختہ بولی۔

”میں بھی جا رہی ہوں۔“

”کہاں؟“ بابا جان کا اپنی اسٹک کی طرف بڑھتا ہاتھ رک گیا۔

”کراچی“ ایک دو دن مہما کے پاس رہوں گی پھر اسلام آباد چلی جاؤں گی کیونکہ میرے کالج بہت حق ہو رہا۔ آپ کسی سے کہیں مجھے چھوڑ آئے۔“ وہ بظاہر بڑے آرام سے کبھی ہوئی صوفے میں دھس گئی۔

”یہ اچانک تم نے جانے کا پروگرام کیسے بنالیا۔“ وہ بغور اسے دیکھ رہے تھے۔

”میرے پروگرام ایسے اچانک ہی بنے ہیں۔“ وہ بول کر خود ہی ہنسی۔ ”حالانکہ اس روز نیانے بہت اصرار کیا کہ میں ان کے ساتھ چلوں لیکن اس وقت میرا موڈ نہیں بنا اور اب میں فوراً جانا چاہتی ہوں۔“

”سکندر سے ملے بغیر؟“

”تو میں کون سا پیشہ کے لیے جا رہی ہوں۔ پھر آجاؤں گی۔“ وہ بھی ان ہی کی اولاد تھی۔ کسی طرح ہونے دے رہی تھی کہ وہ اندر سے مکنتی خانہ ہے۔

”وہ تو تھک ہے پھر بھی تم اس طرح نہیں جا سکتیں۔ جب تک سکندر نہ آجائے اور ہم اس کی اجازت تمہیں کسی کے ساتھ نہیں بھیج سکتے۔“ بابا جان نے اسے ٹالنے کی سعی کی تو وہ حیران ہو کر بولی۔

آپ کو بابا سے اجازت لینے کی ضرورت ہے؟“

”ہوں نہیں وہ تمہارا باپ ہے۔ ہم سے کہہ سکتا ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر ہم نے تمہیں کیوں جانے دیا نہیں جلدی کیا ہے۔ کل شام تک سکندر آجائے گا تب۔“

”نہیں۔“ کل شام تو بہت دور ہے۔ میں ابھی جاؤں گی، آپ بابا سے فون پر بات کر لیں وہ منع نہیں کریں گے۔“ وہ فوراً بولی تھی۔

”جان کچھ دیر تک پر سوچ انداز میں اسے دیکھتے رہے۔ پھر فون کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔

”نیک ہے، ہم سکندر سے بات کرتے ہیں۔ تم جب تک تیار ہو کر آؤ۔ ہم خود تمہیں لے کر جائیں گے اور سنو ہے کہو بیور کو ہمارے پاس بھیج دے۔“

”بی بہتر۔“ وہ بمشکل اپنی حیرت اور خوشی چھپا سکی اور فوراً ”ان کے کمرے سے نکل آئی۔ اتفاق سے شاہ تیمور عرف آقا تھا۔ وہ بڑی تجلّت میں اسے بابا جان کا پیغام دے کر ادھر چلی آئی۔ کسی خاص تیاری کی ضرورت نہیں رہا اپنے ساتھ کچھ لے جانا چاہتی تھی۔ بس کپڑے بدل لیے۔ پھر کمرے سے نکلی تو جانے کیا خیال آیا کہ پہلے باپ کے پاس چل آئی اور اسے مخاطب کر کے بولی۔

”آئی میں جا رہی ہوں۔“

”ماں؟“ مہراں نے یونہی پوچھ لیا اور نہ اسے کوئی غرض نہیں تھی۔

”راجی! بی ماما کے پاس۔“ بابا آجائیں تو ان سے کہتے گائیں انہیں فون کرتی رہوں گی۔“

”السلام علیکم کوئی جواب نہیں دیا تو وہ خدا حافظ کہہ کر وہیں سے پلٹ آئی اور نیچے آکر بی بی جان کو اپنے جانے کا حتمی کہہ کر شاہ تیمور آگیا۔

”ہوکن بابا جان انتظار کر رہے ہیں۔“

”جالی بی جان! میں پھر آؤں گی۔“ وہ کبھی ہوئی بی بی جان کے گلے لگ گئی۔

”مارا اپنا گھر ہے۔“ بی بی جان نے اس کی پیشانی چومی۔ تو وہ ان کے گال پر پیار کر کے شاہ تیمور کے پیچھے باہر نکل گئی۔

”جان گاڑی میں بیٹھ چکے تھے اور اس کے لیے دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ وہ ان کے برابر بیٹھ گئی تو شاہ تیمور نے

”نہیں جا رہے ہیں؟“

”ہوں۔“ جواب میں انہوں نے نیکارا بھرا وہ بھی بادل خواستہ کیونکہ انہیں اپنے معمولات سے متعلق بالکل پسند نہیں تھے نہ کسی کو اجازت تھی اور وہ ان کی ناگواری محسوس کرنے کے باوجود بے ساختہ بولی۔

”میں بھی جا رہی ہوں۔“

”کہاں؟“ بابا جان کا اپنی اسٹک کی طرف بڑھتا ہاتھ رک گیا۔

”کراچی“ ایک دو دن مہما کے پاس رہوں گی پھر اسلام آباد چلی جاؤں گی کیونکہ میرے کالج بہت حق ہو رہا۔ آپ کسی سے کہیں مجھے چھوڑ آئے۔“ وہ بظاہر بڑے آرام سے کبھی ہوئی صوفے میں دھس گئی۔

”یہ اچانک تم نے جانے کا پروگرام کیسے بنالیا۔“ وہ بغور اسے دیکھ رہے تھے۔

”میرے پروگرام ایسے اچانک ہی بنے ہیں۔“ وہ بول کر خود ہی ہنسی۔ ”حالانکہ اس روز نیانے بہت اصرار کیا کہ میں ان کے ساتھ چلوں لیکن اس وقت میرا موڈ نہیں بنا اور اب میں فوراً جانا چاہتی ہوں۔“

”سکندر سے ملے بغیر؟“

”تو میں کون سا پیشہ کے لیے جا رہی ہوں۔ پھر آجاؤں گی۔“ وہ بھی ان ہی کی اولاد تھی۔ کسی طرح ہونے دے رہی تھی کہ وہ اندر سے مکنتی خانہ ہے۔

”وہ تو تھک ہے پھر بھی تم اس طرح نہیں جا سکتیں۔ جب تک سکندر نہ آجائے اور ہم اس کی اجازت تمہیں کسی کے ساتھ نہیں بھیج سکتے۔“ بابا جان نے اسے ٹالنے کی سعی کی تو وہ حیران ہو کر بولی۔

”جی سائیں سلام بڑے سائیں۔“  
 ”اچھی گھر والی سے کہو ہماری پوتی کے لیے کھانے کا عمدہ انتظام کرے اور ذرا جلدی کیونکہ ہمیں آٹے ضرور ہے۔“ باباجان نے چوکیدار سے کہا پھر اسے دیکھ کر بولے۔  
 ”بس تھوڑی دیر میں چلتے ہیں۔“  
 ”جی! وہ یہی کہہ سکی۔“  
 ”تیور! تم پہلے اسے ریسٹ ہاؤس کی سیر کراؤ۔“ باباجان کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ تو وہ ان کے پیچھے بڑے پوچھنے لگی۔

”باباجان کہاں جا رہے ہیں؟“  
 ”وہ ادھر جہاں لوگ جمع ہیں۔ وہ سب باباجان کا انتظار کر رہے ہیں چلو ہم اندر چلتے ہیں۔“  
 اس نے باباجان کی طرف سے دھیان بٹا کر شاہ تیور کو دیکھا پھر اس کے ساتھ اندر آتے ہوئے پوچھنے لگی۔  
 ”یہاں کوئی رہتا بھی ہے؟“  
 ”چوکیدار اس کی بیوی اور بچے، ہم لوگ اکثر پکنک وغیرہ کے لیے یہیں آتے ہیں۔ ویسے یہ سارا علاقہ سکند کی ملکیت ہے۔ یہ ریسٹ ہاؤس بھی انہوں نے ہی بنوایا تھا۔“  
 وہ اپنے تئیں اسے بڑی مفید معلومات فراہم کر رہا تھا اور اس انداز سے جیسے وہ بڑی مشتاق ہوگی اور وہ ضرور اگر جو اس روز باباجان کی باتیں نہ سن چکی ہوئی جو وہ کہہ رہے تھے۔  
 ”اس سے کہو اگر مدیحہ کی سلامتی چاہتی ہے تو صباحت کو ہمارے حوالے کرے۔“  
 اس کے بعد اسے کسی بات سے دلچسپی نہیں رہی تھی۔ ابھی بھی بہت بے دلی سے سن رہی تھی۔  
 ”تم شاید تھک گئی ہو۔“ اس کی خاموشی محسوس کر کے آخر وہ ٹوک گیا۔  
 ”باباجان کب تک فارغ ہو جائیں گے؟“ وہ اس کی بات ان سنی کر گئی۔  
 ”یا اللہ! تم تو بہت ہی بور لڑکی ہو۔ میں مزید تمہارے ساتھ نہیں چل سکتا۔ تم مجھو یہاں میں باباجان کو آتا ہوں اور کھانے کا بھی پتا کرتا ہوں۔ اگر تیار ہوا تو ٹھیک ورنہ کراچی جا کر کھا میں گے۔“ وہ اس کی چیزا جھنجھال گیا تھا۔

”میں بھی چلتی ہوں۔“  
 ”کوئی ضرورت نہیں۔ باباجان یہیں آئیں گے۔“ وہ قدرے غصے سے کہہ کر زبردستی اتر گیا۔ وہ کچھ دیر پیچھے دیکھتی رہی پھر میز پر نکل آئی دور تک سبز ہی سبز تھا۔ اسے پہلی بار اس منظر میں کشش نظر آئی تو اس کا دھیان بٹ گیا۔  
 ”یہ سب میرے باپ کی جاگیر ہے۔ کتنے بڑے آدمی ہیں بابا۔ کتنے امیر کوئی کمی نہیں۔ چار کیا دس بڑا کر سکتے ہیں پھر انہوں نے ماما کو کیوں چھوڑ دیا۔ بے شک انہیں شاہ پور لے کر نہ آتے۔ نہیں اور کتنے ان کے بارے میں باباجان کو بھی بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ بلکہ ماما کو ساتھ لے کر یہ ملک ہی چھوڑ دیا۔ کیا بگاڑ سکتا تھا ان کا لیکن شاید۔“  
 اس کی سوچیں جانے کس سمت بہہ نکلی تھیں کہ عقب سے چوکیدار کی بیوی اسے پکار کر بولی۔  
 ”بی بی! کھانا کھا لیں۔“  
 ”جی! وہ چونک کر پوری اس کی طرف گھوم گئی اور سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔“  
 ”کھانا تیار ہے نیچے آجائیں۔“  
 ”چلو۔“ وہ ایک طرح سے انتظار ختم ہونے پر شکر کرتی ہوئی نیچے آئی تو سنگ روم میں ہی نیپیل پر کھانا

اس نے ہاتھ دھونے کے لیے ادھر ادھر دیکھا تو ایک دم سے باباجان اور شاہ تیور کا خیال آنے پر پوچھنے لگی۔

”باباجان کہاں ہیں؟“

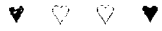
”بڑے سائیں! وہ تو جی چلے گئے۔“ عورت کے جواب سے وہ قدرے تشنگ گئی۔

”کہاں کہاں چلے گئے اور وہ تیور؟“

”پتا نہیں جی! بڑے سائیں اور تیور سائیں دونوں چلے گئے۔ میرے آدمی سے کہہ گئے ہیں آپ کا خیال رکھ۔ آپ ادھر ہی رہیں گی۔“ عورت اپنے سادہ سے انداز میں بتا رہی تھی۔

”نہیں۔“ اس کا ذہن بہت تیزی سے سوچنے لگا تھا اور پھر اس نے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ لیکن آگے گیٹ پر دو چوکیدار نے اسے روک لیا تھا۔

”بڑے سائیں کا حکم ہے جب تک وہ نہ کہیں آپ اور سے نہیں جا سکتا۔“



”وہ مدحو کا فون تو نہیں آیا؟“ آسیہ نے جاتے جاتے رک کر بظاہر سرسری انداز میں پوچھا تو صباحت اور نیپیل بک کر اسے دیکھنے لگے۔

”نہیں ماما! نیپیل کے اشارے پر صباحت نے جواب دیا تھا۔ ”کئی دنوں سے اس نے فون نہیں کیا۔ غالباً“

”بہت دل لگ گیا ہے اس کا بابا۔“ نالائق لڑکی کو اپنی پردھائی کی بھی فکر نہیں ہے۔ پتا نہیں کیا کرے گی۔“ آسیہ نے ناف بھرے انداز میں جیسے اپنے آپ سے کہا تھا۔

”پھوپھو! اگر آپ اجازت دیں تو میں فون کروں مدحو کو۔ اس کی خیریت معلوم کرنے کے لیے۔“ نیپیل نے اپنی سے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ فوراً بولی۔

”نہیں یہاں سے کوئی فون نہیں کرے گا۔“

”کیوں پھوپھو! آپ مدحو سے کیوں بدگمان ہو رہی ہیں۔ وہ خود سے تو نہیں گئی۔“

”میں اس سے بدگمان نہیں ہوں۔“ اسے نیپیل کا تو کتنا اچھا نہیں لگا ناگوار سی چھپا کر بولی تھی۔

”پھر آپ نے اسے اس کے حال پر کیوں چھوڑ دیا ہے بلکہ اس کی مرضی پر۔ کیا وہ اس قابل ہوگئی ہے کہ اچھے سے میں سیر کر سکے۔ نہیں پھوپھو! ابھی وہ ہر چھتھی چیز کو سونا سمجھنے والی عمر سے نہیں نکلی۔ ابھی قدم قدم پر اسے نہائی کی ضرورت ہے۔ اس سے پہلے کہ شاہ پور والے اسے اپنے رنگ میں ڈھال لیں آپ کو اسے وہاں سے نکلنے کی تک دو کرنی چاہیے۔“ نیپیل نے دھیر سے اسے مدیحہ کا احساس دلانے کی سعی کی تو وہ اندر ہی اندر جربز لڑ پڑی۔

”میں کیا کروں جب وہ آتا ہی نہیں چاہتی۔ ایسے میں ہماری کوشش کس کام کی آتا! ہمیں منہ کی کھانی پڑے گی۔“

”بہہ بہہ کہہ دے گی کہ وہ ہمارے ساتھ نہیں اپنے باپ کے پاس رہنا چاہتی ہے۔“

”وہ ایسا نہیں کہے گی۔“ نیپیل نے جیسے اپنے آپ کو تسلی دی تھی۔

”میرے دھک سے مسکرائی اور گہری سانس لے کے اندر روک کر کہنے لگی۔

”بہر حال۔ اب مدحو کا فون آئے تو تم اس سے پوچھ لینا کہ وہ کیا چاہتی ہے اگر یہاں آنے پر آمادہ ہے تو پھر۔“

”نیپیل بھائی جا کر اسے لے آئیں گے۔“ صباحت درمیان میں بول پڑی۔ پھر کچھ خائف بھی ہو گئی تو وہ اسے ڈکھائی چھوڑ کر گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے بولی۔

”مجھے یہ ہو رہی ہے اور بابا آج شام واپسی میں بھی دیر ہو جانے کی تم دونوں کھانا کھا لیتا۔“

”نہیں ماما! ہم آپ کا انتظار کریں گے۔ آپ خواہ گیارہ بجے آئیں۔ کھانا ہم ساتھ کھائیں گے کیوں نیپیل صباحت نے کہہ کر نیپیل کا بازو تھام لیا تو وہ بھی اثبات میں سر ہلانے لگی۔

”اگر ایسی بات ہے تو پھر ابھی چائے کے ساتھ کچھ نہ کچھ کھا لیں۔“ وہ انہیں تاکید کرتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔



”میں اتنی کمزور کبھی نہیں تھی۔ مجھے مدھونے کمزور کر دیا ہے۔“

گاڑی گیٹ سے نکلتے ہی اسے پھر مدیحہ کا خیال آ گیا تھا اور حقیقتاً ”وہ اس کے لیے بہت پریشان تھی اور بے بس بھی اس لیے اسٹینڈ نہیں لے رہی تھی ورنہ اگر مدیحہ اس کے پاس آنے پر آمادگی ظاہر کرتی تو وہ یوں خاموش نہیں بیٹھ سکتی تھی اور صباحت کے معاملے میں بھی وہ شخص مدیحہ کی وجہ سے چپ کھسکی اور چاہتی تھی کہ پہلے شاہ بوروالوں کی طرف سے ہو۔ جنہوں نے اب تک صباحت کے حصول کے لیے جانے کیوں پیش رفت نہیں کی تھی اور اسے کیونکہ رتی برابر بھی کوئی اچھی امید نہیں تھی اس لیے جیسے جیسے دن گزر رہے تھے اس کی پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا اور ابھی یہ جان کر کہ مدیحہ نے ایک ہفتے سے فون نہیں کیا وہ متوحش بھی ہو گئی تھی کہ خود اس نے ایک بار بھی مدیحہ کا فون نہیں سنا تھا پھر بھی اطمینان تھا جو کہ اب اچانک رخصت ہو گیا تھا۔ سارا وقت مرلیضوں کو اینڈ کرنے کے دوران بھی بار بار وہ ہمیشہ کی طرح اسے غیر ذمہ دار اور موڈی کہہ کر خود کو ہلکا بھی نہیں رہی تھی۔

”تقریباً“ دس بجے وہ ایک ڈیلیوری کیس سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آئی تو بہت تھک گئی تھی۔ زیادہ ذہن انتشار نہ تھا کہ کیا تھا۔ جو وہ فوراً ”کھر جانے کی بجائے اپنے اعصاب پر سکون کرنے کی خاطر منہ ہاتھ دھو کر بیٹھ گئی اور ماسی کو بلا کر چائے لائے کا کہا تو وہ اس کے سامنے پیبل سے ایک کارڈ اٹھا کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

”بی بی! یہ آدمی بہت دیر سے بیٹھا ہے۔“  
”کون ہے؟“ اس نے کارڈ لے کر اپنی آنکھوں کے سامنے کیا تو اس کے اعصاب مزید تن گئے۔ پیشانی پر ایک ساتھ کئی لکیریں ابھر آئی تھیں۔

”کیا کہوں گی اس سے؟“ ماسی پوچھ رہی تھی۔  
اس نے چونک کر ماسی کو دیکھا پھر چند لمحے سوچنے کے بعد بولی تھی۔  
”بھج دو اور سونو چائے ابھی ملتا نا۔“  
”جی اچھا!“ ماسی چلی گئی تو وہ ایک نظر اپنا جائزہ لے کر سیدھی ہو بیٹھی اور خود کو مصروف ظاہر کرنے کی خاطر اٹھا کر پیڈ پر چلانے لگی۔

اسٹیکل پل شاہ جہانگیر حیات دروازے میں نمودار ہو کر بولے۔  
”السلام علیکم۔“  
وہ سروانجا کر کے براہ راست انہیں دیکھنے لگی۔ بولی کچھ نہیں۔  
”مندر آگئے ہوں۔“ شاہ جہانگیر نے ہلکے سے دروازہ بجا کر اپنے تئیں اسے چونکا نا چاہا لیکن وہ بڑے آرام سے سامنے کرسی کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

”شرف لائیے۔“  
”شکریہ۔“ شاہ جہانگیر آکر بیٹھ گئے۔ تو اس نے پہلے اپنی رستہ واقع پر نظر ڈال کر ایک طرح سے جہاں کہے پاس زیادہ وقت نہیں ہے پھر انہیں دیکھ کر بولی۔

”فرمائیے۔ کیسے زحمت کی؟“  
”میں صباحت کے سلسلے میں حاضر ہوا ہوں کیا سوچا ہے آپ نے۔“ شاہ جہانگیر نے اس کا زور بخاندان ہوئے تہمد کا ارادہ ترک کر دیا۔

وہ اندر تک سبک لگ گئی تھی۔ دل چاہا اس شخص کو بری طرح بے عزت کر کے نکال باہر کرے۔ لیکن مدیحہ؟ تھا جو اسے بہت ضبط کرنا پھر بھی جب بولی تو اپنے میں غصہ تھا۔  
”آپ کو صباحت کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی اس بات سے سروکار کہ میں اس کے

ناپید بھول رہی ہیں کہ وہ میرے بیٹے علی کی منکوحہ ہے۔“ انہوں نے فاتحانہ انداز میں جہاں گیا تو وہ بھی تنفر

ن میں کچھ نہیں بھولی۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ایک بار پہلے بھی آپ میرے باپ کے دروازے پر آئے

بری باتیں دہرانے نہیں آیا۔ ”وہ فوراً“ بولے تھے۔ ”مجھے صرف صباحت کی رخصتی طے کرنی ہے۔“  
بیں شاہ جہانگیر حیات! اتنے نادان نہیں ہیں آپ جو میرا جواب نہ جانتے ہوں۔ انسان ایک بار دھوکا درود بھی انجانے میں سمجھے آپ اور اب آپ جاسکتے ہیں۔ ”وہ اب مزید ضبط نہیں کر سکتی تھی۔ انہیں کر خود بھی اٹھ کھڑی ہوئی تو شاہ جہانگیر اس کی تقلید کرتے ہوئے بولے۔

ملٹی کر رہی ہیں ڈاکٹر آسیہ۔“  
کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اپنی چیزیں سمیٹنے میں لگ گئی اور گو کہ شاہ جہانگیر بھی اس کی طرف افزائی کی امید لے کر نہیں آئے تھے پھر بھی اس کا رویہ انتہائی ہنگ آمیز لگا، بمشکل خود پر ضبط کرنے لے تھے۔

بال ہے اس وقت آپ تھکی ہوئی ہیں۔ اس لیے میری بات سمجھ نہیں رہے ہیں۔ گھر جا کر آرام سے رگولی بھی فیصلہ کرتے ہوئے یہ بات ذہن میں رکھیے گا کہ مدیحہ ہمارے بچے میں ہے۔“  
لب ہے آپ کا۔ ”وہ ایک دم سنجیدگی سے۔“

کی سلامتی کے لیے۔“  
اپ جہانگیر حیات! ”وہ کسی طرح خود پر قابو نہیں پاسکی۔“ آپ مجھے بلیک میل نہیں کر سکتے۔ ناؤ گیٹ

غیر نے چند لمحے رک کر اس کے تپے ہوئے سرخ چہرے کو دیکھا پھر ذرا سے کندھے اچکا کر باہر نکل گئے  
پار دونوں ہاتھ جہاں خود کو سہارا دیے کھڑی تھی ان کے جاتے ہی کرسی پر ڈھے گئی اور دونوں ہاتھوں میں  
مذہن کچھ سوچنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ مزید جسم سے جان بھی نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔  
بعد سرسبز کسی کام سے اس کے کمرے میں آئی تو اسے اس حالت میں دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

امیدم؟“  
نے آواز سن کر بھی کوئی حرکت نہیں کی تو سرسبز جلدی سے جا کر گلو کو زینا کر لے آئی اور اپنے ہاتھ سے گلاس  
نڈل سے لگا دیا۔

نڈل لے کر اس نے اپنا سر چیڑ کر بیک پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ تب ہی فون کی بیل بج اٹھی۔  
نے ریسیور اٹھا کر ہلو کہا۔ پھر اس سے بولی۔  
”آپ کے گھر سے فون ہے۔“

مقامت محسوس کر رہی تھی۔ ذرا سی آنکھیں کھول کر سرسبز کو دیکھا اور آہستہ آواز میں بولی۔  
”میں فارغ نہیں ہوں۔“

نے اس کی بات دہرا کر فون بند کر دیا تو اس نے اسے جانے کا اشارہ کر کے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ تنہائی  
لیکن تنہائی کہاں تھی۔ بند پلوں کے اندر ایک فلم سی چلنے لگی تھی۔ جس میں تسلسل نہیں تھا۔ ماضی  
واقعات گنڈھ ہو رہے تھے۔ ایسے ہی چہرے اور آوازیں سنیں۔  
”ان رکھیں۔ کم از کم بیٹی کے معاملے میں تو میں کوئی کوتاہی نہیں کر سکتا۔ اچھا ہی سوچوں گا“ اچھا ہی

شاہ سکندر نے کہا تھا اور ان کا اعتبار کر کے ہی اسے یہ دن دیکھنا پڑا تھا کہ دونوں بیٹیوں میں سے ایک کو اپنے ہاتھوں سے سولی چڑھانا تھا اور وہ ٹکس کی طرف سے دل پر پتھر پڑے۔  
”مرد جو صبا۔“  
”صبا مدحو۔“

بالکل غیر ارادی طور پر وہ انتخاب کرنے لگی تھی کہ ایک دم گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ جسے بھی دیکھ سے جاگی ہو۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور پیشانی کے ساتھ ہتھیلیاں بھی پسینے سے تر ہو گئی تھیں۔  
”میرے خدا!“ اس نے دونوں ہاتھوں کو آپس میں ملا کر گڑا پتھر انگلیاں بالوں میں پھنسا کر سر کو زور زور جھٹکے دے کر ایک طرح سے ساری سوچوں سے نجات حاصل کرنے کی سعی کی اور کسی حد تک کامیابی ہوئی۔  
گھر کا خیال آیا۔ بارہ بج چکے تھے۔ کھڑی دیکھتے ہی وہ گاڑی کی چابی لے کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

وہ کبھی اس طرح اور اتنا نہیں روئی تھی۔ نہ کبھی کہیں شکست تسلیم کر کے ہتھیار ڈالے تھے۔ اس کے ذرا سی زیادتی پر سارا گھر سربراہ اٹھ اٹھتی تھی اور جب تک اپنی منوا نہیں لیتی جیتن سے نہیں ہوتی تھی۔ لیکن کون تھا اس کی سننے والا۔ اتنے بڑے ریسٹ ہاؤس میں چوکیدار اس کی بیوی اور دو بیٹے جن پر بیچ چلا کر حاصل نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ بابا جان کے حکم کے غلام تھے اور ان بے بسوں سے بھی بڑھ کر اس پر بے ہوئی تھی جس نے اسے اتنا رلایا تھا۔ دوسرے شام ہو گئی اور پھر تاریکی کے ساتھ ساتھ خوفناک سناٹا چلنے لگا۔ وہ جس کمرے میں بیٹھی تھی اس کی کھلی کھڑکیوں سے دور تک نہیں زندگی کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ پھیلا ہوا بڑھون کے اجالے میں جتنا دلکش تھا اب اتنا ہی خوفناک اس نے چاہا کہ اٹھ کر کھڑکیاں بند کر دے۔ ہمت ہی نہیں ہوئی تو سر گھٹنوں میں چھپا لیا۔

کچھ دیر بعد بٹن آن ہونے کی ہلکی سی آواز کے ساتھ روشنی محسوس ہوئی تب ہی اس نے ڈرتے ڈرتے کیا اور چوکیدار کی بیوی کو دیکھ کر کچھ ڈھارس بندھی تو پوچھنے لگی۔

”کوئی آیا ہے؟“  
”نہیں بی بی! اس وقت کون آئے گا۔ آپ یہ کھانا کھا لو۔ دوسرے بھی نہیں کھایا۔“ چوکیدار نے اس کے سامنے زرخیز پھر نیچے بیٹھتے ہوئے کہنے لگی۔

”آپ روتی کیوں ہو۔ یہاں آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“  
”یہ کون سی جگہ ہے؟“ اس نے ان سنی کر کے پوچھا۔  
”سکندر سامیں کی جاگیر ہے۔ آپ پہلے کبھی اور نہیں آئیں؟“ اس نے ہتا کر پوچھا۔  
”نہیں کیا آتے ہیں یہاں؟“  
”کون؟“ وہ سمجھی نہیں۔

”بابا! شاہ سکندر جن کی یہ جاگیر ہے۔ وہ یہاں آتے ہیں؟“ اس نے اپنی بات پر زور دے کر پوچھا۔  
”میں تو جب سے یہاں ہوں نہیں آئے اس سے پہلے کا پتا نہیں۔ آپ بی بی کی خانا بھی کھانا۔“ چوکیدار نے اس کے سامنے کھسکا دیا تو اس نے پانی کا گلاس اٹھا لیا اور ایک گھونٹ لے کر پوچھنے لگی۔

”تم کب سے یہاں ہو اب یہ مت کہہ دینا کہ پیدا ہی نہیں ہوئی تھیں۔“  
”نہیں جی۔ شادی ہو کر اور آئی۔ اس سے پہلے تو بڑے سامیں کی حویلی میں تھی۔ بڑی چہ خدمت کی ہے میں نے اور میری ماں وہ تو ابھی بھی ادھر ہی ہے۔“  
”اچھا کون ہے تمہاری ماں؟“ اس نے گلاس رکھ کر کھانا شروع کرتے ہوئے پوچھا۔ اصل میں وہ جانے سے خائف تھی اس لیے بات کو طول دے رہی تھی۔

چراں۔“  
پھر وہ مرزا تمہاری بہن ہوئی۔“  
”جی۔ آپ کو کیسے پتا؟“ چوکیدار نے اسے یوں کہنے لگی۔ جیسے پچھنے کی کوشش کر رہی ہو۔  
”میں وہیں سے آ رہی ہوں۔“  
”جی۔ میں نے تو آپ کو ادھر نہیں دیکھا۔“  
”ہاں گاؤ۔“ وہ اٹھا گئی۔ ”تم کوئی اور بات نہیں کر سکتیں۔“  
اور کیا بات کروں۔“ وہ سوچ میں پڑ گئی۔  
”اچھا۔ بتاؤ بابا جان دوبارہ کب آئے گا کہہ سکتے ہیں۔“ اس نے فوراً اسے مشکل سے نکالا۔  
”نہیں جی۔ میرے آدمی کو بتا ہوا کہ پوچھ کر آؤں؟“ وہ اٹھنے لگی کہ اس نے روک دیا۔  
”میں صبح میں خود معلوم کروں گی اور سنو۔ تم نہیں میرے پاس سونا۔ بے شک اپنے دونوں بچوں کو لے

اپنے آدمی سے پوچھتی ہوں۔ وہ کہے گا تو آجاؤں گی۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے سامنے سے ٹرے اٹھا کر باہر نکل گئی۔ اس نے گہری سانس لی تھی۔  
”دیکھ کیسے لوگ ہیں دنیا میں کوئی حکمرانی کے نشے میں چور ہو کر بھی خوش نہیں اور کوئی غلامی میں بھی خوش۔“  
خانے کے بعد بدن میں چھ توانائی آگئی تھی اور ذہن بھی سوچنے کے قابل ہو گیا تھا البتہ اندر خوف جوں کا توں رہا تھا۔ جب ہی چوکیدار نے والیس آئے کا انتظار کرنے لگی اور وہ کوئی پندرہ منٹ کے بعد آئی تھی۔ اپنے بچے کو سینے سے لگائے ہوئے۔ اس کے بیڈ کے برابر نیچے گدا بچا کر بیٹے کو ملایا اور خود بھی اس کے ساتھ لیٹ بیٹھ کر مایہ ساری کارروائی خاموشی سے دیکھ رہی تھی فوراً پوچھنے لگی۔

”تم سو رہی ہو؟“  
”نہیں جی۔ مجھے پتا ہے آپ کو ڈر لگ رہا ہے۔ جب تک آپ سو نہیں جاؤ گی میں نہیں سوتی۔“ اس نے لمبی لمبی سانس لے کر کہا تو وہ برا سامنے بنا کر بولی۔  
”مجھے کوئی ڈر نہیں لگ رہا۔ تم سو جاؤ آرام سے۔“  
”جی۔ جی۔“  
”اے جی۔“ اس کی ہدایت کی حد ختم ہو گئی تھی۔ چچ کر بولی پھر سر جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی اور ادھر سے ادھر لگی۔

چوکیدار نے جب سادھ لی اور کچھ دیر میں سو بھی گئی تھی۔ اور سونا تو وہ بھی چاہتی تھی، لیکن نیند کا کہیں پتا نہ تھا۔ غصے غصے تھک گئی تو لائٹ آف کر کے اپنی جاگ پر آکر لیٹی اور کھڑکی سے ہوتی ہوئی اس کی نظرس آسمان بچے پر جاگرتے ستاروں میں جھپکنے لگیں۔ جبکہ ذہن کے درجہوں پر ایسی ہی کتنی قدمیں چلنے بچنے لگی

”ان جو اٹھ کر نہیں آتے تھے۔ سب کی محبتوں کے ساتھ اسے اس کے منفی رویوں کی چھب دکھلا رہے تھے۔“  
”اے خدا! ہماری زور سے بند کرنا کہ ادھر نہیں بھائی اپنے کمرے میں اچھل پڑتے۔“  
”جو کبھی مہمانوں دیتیں تو وہ فوراً شاکی ہو کر دھمکی دیتی۔“  
”ہاں بے باپ کے پاس چلی جاؤں گی۔“  
”نہیں خائف کر دیتی تھی وہ اپنے ایک چمچ سے سر کو خنہ دھا“ صبا تو اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر رو پڑتی

تھی۔

”خدا کے لیے مدد! تم شاہ سکندر کا خیال چھوڑ دو۔“

”کیوں؟ کیوں چھوڑ دوں۔ میرا باپ ہے وہ، کتنا ذمہ تھا اسے جو نیل کے سمجھانے کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں تھا۔ جو وہ جب بھی انہیں موقع ملتا اسے اور صبا کو احساس دلاتے تھے کہ ان دونوں کو صرف اپنی ممانعت کا خیال چاہیے جنہوں نے ان کی خاطر اپنی زندگی تیاگ دی اور میری سچ تھانیں اس کے اندر تو جیسے احساس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اننا ضد باندھ لیتی۔“

پھر احمد نے ہر شادی کیا کی اس کے دل میں ہر ایک کے خلاف نفرت بھر گئی تھی۔

اف ایک شخص کا بدلہ میں نے کس کس سے نہیں لیا۔ ماما جی، سونیا آبی بھلا ان کا کیا قصور تھا اور ماما جی تک کیا میں نے اس کی آنکھیں یکبارگی پائیوں سے بھر گئیں اور پھر ہر شخص کے ساتھ اپنا رویہ سوچ کر دہرا رہی تھی۔



صبح جب سورج کی کرنیں براہ راست اس کے چہرے پر پڑیں تب وہ انھی تھی اور منہ ہاتھ دھو کر کمرے نکلنے لگی تھی کہ شاہ تیور کی آواز سن کر رک گئی۔

”لی بی کہاں ہے؟“ وہ چونک کر ارنی سے اس کا پوچھ رہا تھا۔

”سورہی ہیں۔“

”شور تو نہیں چلایا تھا اس نے؟“

”نہیں جی، شور تو نہیں چلایا پر روٹی بہت تھیں۔“ چونک کر ارنی کے جواب پر وہ جڑبڑہونے لگی۔

”کھانا کھایا تھا؟“

”دوہریں تو نہیں رات میں کھایا تھا۔“

”اچھا جاؤ اٹھاؤ اسے۔“ وہ محاکم سے کہہ رہا تھا۔

وہ جلدی سے دروازے کے پاس سے ہٹ کر دوبارہ دوش روم میں بند ہو گئی اور خود کو اس کا سامنا کرنے کے تیار کرنے لگی۔ رات اس نے اس سوچ پر نہیں سوچا تھا کہ بابا جان کے اس اقدام پر اسے کیا رد عمل ظاہر چاہیے ابھی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بس یہ خیال تھا کہ اسے کمزور نہیں پڑنا اور نہ ہی لڑنا ہے۔ کیونکہ جانا بھی کہ وہ ان کا کچھ نہیں لگاؤ سکتی۔

چونکہ ارنی اس کے دروازے پر دستک دے کر جا چکی تھی۔ اس کے بعد بھی وہ کتنی دیر سوچتی رہی۔ پھر ماہر کر آئی تو شاہ تیور کو دیکھتے ہی کھلتی مفسر اہٹ کے ساتھ بولی تھی۔

”ہیلو کزن، کیسے ہو؟“

شاہ تیور غالباً ”کچھ اور سوچے بیٹھا تھا جب ہی جہان ہو کر دیکھنے لگا۔“

”بابا جان نہیں آئے؟“ وہ اس کی حیرت سے نظریں چڑا کر اڑھادھڑکنے لگی۔

”اب کسی طبیعت ہے تمہاری؟“ شاہ تیور نے اس کی بات ان سنی کر کے پوچھا تو وہ بے اختیار اس کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔

”میری طبیعت کو کیا ہوا؟“

”شریفان بتا رہی تھی کل تم روتی رہی ہو۔“ وہ اس کے چہرے پر جانے کیا کھوجنے لگا تھا۔

”ہاں، بہت روتی۔“ وہ سادگی سے اعتراف کرتے ہوئے بولی۔

”آپ مجھے چھوڑ کر جو چلے گئے تھے۔ اگر کراچی نہیں لے جانا تھا تو صاف منع کر دیتے۔ میں نے وہاں“

ہوئی اتنی ضد تو نہیں کی تھی خیر چھوڑیں۔ یہ بتائیں اب کیا پروگرام ہے؟“

الحال تمہیں یہیں رہنا ہے۔ وہ فوراً کہہ گیا پھر فوراً ہی وضاحت بھی کرنے لگا۔ ”میرا مطلب ہے تم رہو گئی تھیں اس لیے بابا جان نے پروگرام بنایا کہ تمہیں تمام رقبوں کی سیر کرائی جائے تاکہ تم فریض ہو

نی گاؤ اس کے علاوہ اور کتنے رہتے ہیں۔“ وہ متاثر نظر آنے لگی۔

ت ہیں۔ تم پہلے ناشتہ کر لو پھر چلتے ہیں۔“ اس نے کہہ کر شریفان کو پکارا اور اس کے آنے پر مدد کے لیے نے کو ماما تو وہ بول پڑی۔

ہائے ضرور لانا۔ میں نے کل سے چائے نہیں پی۔“ پھر آرام سے بیٹھتے ہوئے شاہ تیور سے بولی ”اور کزن کو لے آتے۔“

لے آؤں گا، کل لے آؤں گا۔“ وہ کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تو اندر کے خوف کے باعث اس نے فوراً ”پوچھا۔“

ماں جارہے ہیں؟“

اسے دیکھ کر مفسر کیا یوں جیسے سمجھ گیا ہو۔

میرا مطلب ہے آپ ناشتہ کریں گے؟“ اس نے جڑبڑہو کر بات بنائی۔

نہیں اگلیتہ چائے لی لوں گا۔“ وہ دوبارہ بیٹھ گیا۔

پھر بعد شریفان ناشتے لے آئی تو اس نے پہلے چائے بنا کر ایک کپ اسے تھمایا پھر خود ناشتے میں مصروف ہو

سنو، تم کراچی کیوں جانا چاہتی ہو؟“ قدرے توقف سے شاہ تیور نے اسے مخاطب کر کے پوچھا تو وہ سوچ کر

گل۔

اصل میں تو مجھے اسلام آباد جانا ہے۔ وہاں میرا کالج ہے۔ کراچی تو بس ایک دو دن رہوں گی۔ کچھ اپنی چیزیں لے کر رہا ہوں۔ یہ پوچھنا ہے کہ وہ صبا کی رخصتی کب کر رہی ہیں۔“

تمہارا کیا خیال ہے؟ وہ اسے رخصت کر دیں گی؟“

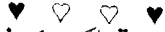
گرتا تو چاہیے۔“ وہ لا پرواہی سے کہہ کر وہاں سے ہاتھ صاف کرنے لگی پھر چائے کا آخری گھونٹ لے کر

نہیں سمجھ میں نہیں آتا اس بات کو اتنا مسئلہ کیوں بنایا گیا ہے۔ کیا یہ معاملہ آرام سے بیٹھ کر طے نہیں ہو

بابا جان کی مرضی وہ جیسے بھی طے کریں۔ یہ ہمارے سوچنے اور سمجھنے کی باتیں نہیں ہیں۔ چلو۔“ وہ موضوع

لے لے کر ہٹے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

”نومہ بابا جان کی مرضی۔“ وہ تنفر سے سوچتی اس کے پیچھے باہر نکلی تھی۔



اسے شاہ پوروالوں سے کوئی اچھی امید تو نہیں تھی لیکن یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ صبا کے حصول کے لیے وہ بڑا کوا قاعدہ برپا بنالیں گے اور پھر بیٹی کے بدلے بیٹی کی شرط رکھ کر اسے ہتھار ڈالنے پر مجبور کریں گے وہ بیٹی کی طرف سے مطمئن تو پہلے بھی نہیں تھی بس یہ خیال تھا کہ وہ اپنے باپ کے گھر میں ہے جہاں اگر وہ آرام نہیں تو تکلیف میں بھی نہیں ہوگی اس لیے اس نے ابھی تک مدد کی واپسی کے لیے کوئی پیش رفت نہیں کی۔ دوسرے اسے یہ بھی یقین تھا کہ جس روز مدد کا وہاں سے دل اچاٹ ہو گیا۔ وہ اسی روز واپس آجائے یہ تو اسے اب معلوم ہوا تھا کہ وہ اپنی خوشی سے وہاں نہیں رہ رہی بلکہ اس کے باپ دادا نے زبردستی اسے روکا ہے تاکہ اسے چارے کے طور پر استعمال کر سکیں۔ یعنی ان کے نزدیک مدد کی کوئی اہمیت نہیں تھی تو ایسی

صورت میں وہ صباحت کو وہاں پہنچنے کا کیسے سوچ سکتی تھی۔ وہ بھی اسی کی بیٹی تھی۔

شاہ جہانگیر کو تو رات اس نے صاف جواب دے دیا تھا۔ لیکن اس کے بعد اسے اب تک اسے ایک ماہ نہیں آیا تھا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح مدیحہ کو ان کے پتھن سے نکال لائے۔ اس کی سلامتی سے اپنی انا، خود داری و وقار سب داؤ پر لگا سکتی تھی۔ جسے برسوں پہلے شاہ سکندر کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے۔ اسے دم شاہ سکندر کا خیال آیا تو اس کے اندر دہکتے لالہ میں شدت آئی تھی۔ ہاشم وہ بھرے ہتھکے میں اس شخص پر گریبان پکڑ سکتی۔

”لیکن میں اسے آئینہ تو دکھا سکتی ہوں۔“ اس نے کھولتے ہوئے ہمارے سے سوچا اور اسی وقت کارڈ لیس اب لیکن ان کا کوئی نمبر اس کے پاس نہیں تھا۔ برسوں پہلے جب شاہ پور فون کیا تھا۔ تب بھی ڈائریکٹری میں نمبر نہیں اور ابھی پتا نہیں وہ کہاں تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ صباحت نے اس کے کمرے کا دروازہ کھولا اور غالباً ”نئے اندر آئی تھی لیکن اسے ابھی تک بستری میں دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”مما! آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟“

”ہاں کیوں؟“ اسے اس وقت صباحت کی مداخلت سخت ناگوار لگ رہی تھی۔

”طبع سے کمرے میں جو بند ہیں، اس لیے پوچھ رہی ہوں۔ گیارہ بج رہے ہیں۔ کلینک نہیں جانا آ رہا صباحت اس کے کیوں سے قدرے سہتا کر رہی تھی۔

”نہیں اس وقت نہیں جاؤں گی، سسٹر قانون آئے تو منع کر دینا۔ کتنا شام میں آؤں گی۔“

”اچھا! میں یہ بتانے آئی تھی کہ میں نیچے اماں جی کے پاس جا رہی ہوں۔ کوئی کام ہو تو بلا لیجیے گا۔“

”ابھی بات ہے، جاؤ اور یہ دروازہ بند کر دو۔“ وہ سرسری انداز میں کہہ کر اپنے لیے تکیہ ٹھیک کرنے میں لگی۔ پھر دروازہ بند ہونے کی آواز سن کر سیدھی ہوئی اور کچھ دیر سوچنے کے بعد کارڈ لیس پر علی جہانگیر کے نمبر کرنے لگی۔

”میں شاہ علی جہانگیر! تیسری بیل کے بعد اس کی آواز سنائی دی تھی۔

”میں ڈاکٹر آسیہ بات کر رہی ہوں۔“ اس نے خامسے روکے انداز میں کہا تو ادھر سے وہ فوراً بولا۔

”السلام علیکم!“

”وعلیکم السلام کیا تم بتا سکتے ہو کہ شاہ سکندر حیات اس وقت کہاں ہوں گے؟“ اس نے مختصر جواب کے پوچھا۔

”جی اس وقت کوئٹہ میں ہیں اور شام چھ بجے وہاں سے اسلام آباد کے لیے روانہ ہوں گے۔“ اس نے سکندر کا گلاب و گرام بھی بتا دیا۔

”کوئٹہ کا کوئی نمبر موبائل نمبر؟“ اس نے سائڈ کارڈ سے پین اور ڈائری اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

”جی موبائل نمبر ہے۔“ علی جہانگیر نمبر بتا کر پیچھے اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن اس نے فوراً ”تھکریہ کہہ کر ماٹھ قطع کر دیا اور پھر خود کو شاہ سکندر سے بات کرنے کے لیے تیار کرنے کے بعد ان کے نمبر مائل تھے۔

”میں شاہ سکندر حیات! بالکل وہی انداز تھا جو اس سے پہلے علی جہانگیر کا تھا۔

”جی میں ڈاکٹر آسیہ۔“ اس بار وہ اسی قدر کہہ سکی۔

”کیسی ہیں آپ؟“ ان کے لہجے میں ایک لخت، اشتیاق در آیا تھا اور وہ جو پھٹ پڑنے کو تیار تھی، ہنسی شکل میں۔

”میرے جواب سے آپ کو مایوسی ہوگی۔ یعنی میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”یہ تو خوشی کی بات ہے۔“ انہوں نے کہا تو وہ سکندر ان کی سہی کر کے پوچھنے لگی۔

”میری بیٹی مدیحہ کہاں ہے؟“

درمیں ”خیر ہے۔“

مدیحہ کی خیریت مطلوب ہے۔“ وہ ایک دم تیز ہو کر بولی تھی۔

علی ٹھیک ہے۔ کیا کسی نے اس کے بارے میں کچھ کہا آپ سے؟“ شاہ سکندر اس بار کچھ ٹھٹکے تھے۔

کے بھائی شاہ جہانگیر آئے تھے میرے پاس۔ موصوف یہ کہہ گئے ہیں کہ اگر میں مدیحہ کی سلامتی چاہتی ہوں تو ان کے بیٹے کے ساتھ رخصت کر دوں۔“ اس نے چہا چہا کر کہا تو دوسری طرف ایک دم خاموشی

شاہ سکندر حیات! آپ سن لیں۔ اگر میری بیٹی مدیحہ کو کچھ ہوا تو۔“

نہیں ڈاکٹر آسیہ! آپ اطمینان رکھیں اسے کچھ نہیں ہوگا۔“ وہ فوراً بولے تھے۔ ”کسی میں اتنی یقین ہے کہ میری بیٹی کو ہاتھ بھی لگا سکے۔ جہانگیر بھائی نے جو کچھ کہا، اس کے لیے میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔“

یہ سب نہیں جانتی۔ آپ مدیحہ سے کیوں فوراً واپس آجائے۔ مجھے اس کی طرف سے بہت تشویش

تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ صرف آپ کی بیٹی نہیں میری بیٹی ہے۔“ شاہ سکندر گو کہ شاہ

اس اقدام پر اندر رہی اندر تملارے تھے، لیکن اسے مسلسل اطمینان دلانے کی کوشش کر رہے تھے۔

اور آپ اس کے لیے اچھا سوچیں گے، اچھا کریں گے۔ جیسے صباحت کے لیے۔“ اس نے ان کی بات پر ہنسی کی۔

اس بات پر بحث نہیں کروں گا۔ کیونکہ آپ صرف ایک پہلو سے سوچ رہی ہیں اور ہاں آپ کو مدیحہ کی ضرورت نہیں ہے وہ اب میری ذمہ داری ہے اور صباحت پر بھی آپ مکمل اختیار نہیں رکھتیں۔ اس

میں کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے مجھ سے پوچھ لیجیے گا۔“

ابھی اچانک بدل گیا تھا۔ جانے اس کا طنز کرنا برا لگا تھا یا کوئی اور بات یاد آئی تھی۔ وہ بہر حال چند لمحوں کو

ن آئی پھر ایک دم جیسے ہوش میں آ کر انہیں پکارا لیکن ادھر سے سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔

”ف!“ اس کا دماغ کھولنے لگا تھا۔ دل چاہا ہر شے تھس تھس کر دے۔

مجھے جس شاہ پور والے میں ان کی دھمکیوں سے مرعوب ہو جاؤں گی۔ ہرگز نہیں۔ وہ میرا معاملہ تھا جو

ناموشی اختیار کرتی تھی۔ مدحو اور صبا کے لیے تو میں زمین آسمان ایک کر دوں گی۔ بڑے آئے حق جتانے

اسے پوچھ کر فیصلہ کروں ہونم۔“

خند سے سوچ رہی تھی اور پھر اسی وقت ایک فیصلہ کر کے ہی اٹھی تھی۔



اور نیل کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر ادھر سے ادھر چکراتی رہی، پھر اپنی الماری ٹھیک کرنے کھڑی ہو گئی۔

ماکی ضرورت نہیں تھی لیکن کرنے کو اور کوئی کام ہی نہیں تھا۔ جب سے نیل نے اس کا کالج جانا بند

اس کا خوسے بھی کچھ پڑھنے کو دل نہیں چاہتا تھا اور کام بھی کوئی اتنے نہیں ہوتے تھے۔ سارا وقت بیکار

اس کا ذہن بھی مٹا رہا تھا۔ کوئی اچھا خیال تو آتا ہی نہیں تھا اور وقت بھی جیسے ٹھہر سا گیا تھا یا اسے

منجھوتی سے شام ہوتی ہے اور بس، نہیں کوئی بالکل نہیں تھی کسی کسی وقت اس کا دل چاہتا وہ مدیحہ کی

چلا کر سب کو اپنی طرف متوجہ کرے اور پھر خوب بنے یا خوب روئے۔ پتا نہیں اس کے ساتھ کیا ہونے

باسب کچھ آسیہ پر چھوڑ کر بھی چین سے نہیں تھی۔ کیونکہ اسے اب علی جہانگیر کا خیال آتا تھا۔ جس کا

فنا کہ وہ شاہ جہانگیر کا بیٹا تھا اور یہ تصور کم از کم آسیہ تو معاف نہیں کر سکتی تھی۔ یہ وہ ابھی طرح جانتی

مائلے بہت چاہنے کے باوجود وہ علی جہانگیر کو فون نہیں کر رہی تھی کہ کہیں اس کی محبت میں بارگاہ اپنی ماں

کو غلط نہ سمجھنے لگے۔ وہ حقیقتاً ”اب دور اسے“ آکھڑی ہوئی تھی۔  
 ”صائب! فون آیا ہے۔“ بوائے اس کے کمرے کے دروازے میں آکر پکار کر کہا تو وہ الماری کا پٹ بند کر پوچھنے لگی۔  
 ”کس کا ہے؟“

”پتا نہیں کون ہے، پہلے نیل میاں کا پوچھا میں نے کہا نہیں ہیں تو بولا گھر میں جو بھی ہے بلاؤ۔“ بوائے بتانے لگھڑی ہوئی تھیں۔ وہ درمیان ہی میں نکل کر لابی میں آئی اور ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا تو دوسری طرف علی تھا۔ چھوٹے ہی بولا۔

”یار! تمہیں ذرا احساس نہیں۔ میں کتنی شدت سے تمہارے فون کا انتظار کر رہا ہوں۔“

”کیوں؟“ وہ بلا ارادہ کہہ گئی۔

”کیوں کا کیا مطلب؟ کیا تم نے نہیں کہا تھا کہ میری باتوں کو سوچنے کے بعد مجھے فون کرؤ گی۔“ علی جہانگیر دلایا تو وہ آزدگی میں گھر کر بولی۔  
 ”مجھے یاد ہے۔“

”پھر؟“

”پھر یہ کہ میں نے کچھ نہیں سوچا اور نہ سوچوں گی۔ اس لیے نہیں کہ مجھے آپ کی باتوں سے اختلاف ہے مجھے مہم کا خیال ہے اور میں کسی مقام پر بھی ان سے نظریں نہیں چرا سکتی۔“ وہ ہنوز آزدہ سی صاف گوئی سے رہی تھی۔

”اب میں تم سے کیا کہوں۔“ وہ جیسے عاجز آ گیا تھا۔

”کچھ نہ کہیں، کیونکہ میں کچھ نہیں کر سکتی۔“

”اچھا سنو، ہمیں معلوم ہے۔ آج تمہاری ممانے مجھے فون کیا تھا۔“ علی جہانگیر نے اصل میں یہی جانے لیے اس وقت فون کیا تھا۔

”نہیں! کیا کہا انہوں نے آپ سے؟“ اس نے لاعلمی کے اظہار کے ساتھ فوراً پوچھا۔

”ہمارے متعلق کوئی بات نہیں کی۔ سکندر چچا کا پوچھا اور ان کا موبائل نمبر لیا تھا۔ اس کے بعد مجھے معلوم انہوں نے سکندر چچا سے بات کی یا نہیں میں صبح سے ٹرائی کر رہا ہوں لیکن سکندر چچا کا موبائل بند پڑا۔ اب پتا نہیں تمہاری ممانے سے بات کرنے کے بعد انہوں نے بند کیا ہے یا۔“

وہ اس انداز سے بول رہا تھا جیسے اس کا دھیان اس بات کی طرف ہو کہ شاہ سکندر اور آسیہ کے درمیان کیا ہوئی ہوگی۔

اور اس کا دھیان آسیہ کی طرف چلا گیا کہ صبح وہ کلینک نہیں گئی تھی اور اپنے کمرے میں بند رہی تھی۔

”ہیلو صبا! قدرے توقف سے علی جہانگیر نے پکارا تو وہ چونک کر بولی۔

”جی۔“

”تم آج کل کالج نہیں جا رہیں؟“

”نہیں۔“

”دیکھیں میری وجہ سے تو نہیں چھوڑ دیا۔ دیکھو سچ بتانا۔“

وہ خاموش رہی جبکہ اس کے قیاس پر دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

”یہ توقف لڑکی! تم کیا سمجھتی ہو، میں تمہیں اس گھر سے اٹھا کر نہیں لے جا سکتا۔ سب کی موجودگی میں جانے کی جرات رکھتا ہوں۔“

”میرے خدا! اس نے گھبرا کر ریسیور رکھ دیا اور ہاگ کرا اپنے کمرے میں آئی۔ یوں جیسے وہ ابھی آ رہا ہو۔“

بعد پھر فون کی بیل بجنے لگی تھی۔ لیکن وہ نہیں گئی اور جب بوا کو جاتے دیکھا تو انہیں بھی روک دیا۔ کیونکہ لیسن تھا کہ وہی ہو گا جو اسے اس مقام پر لے آیا تھا کہ وہ کسی معجزے کے رونما ہونے کی دعا کرنے لگی تھی۔ کا خوشی سے مان جانا معجزہ ہی ہو سکتا تھا۔

نئی دیر وہ وقفہ وقفہ سے فون کی بیل سنتی رہی پھر جب یہ سلسلہ ختم ہو گیا تب اس کی باتوں کو سوچتے ہوئے کا وہن اس بات پر اٹک گیا کہ آسیہ نے شاہ سکندر کو فون کیوں کیا اور کیا بات ہوئی۔ ابھی اسے اپنا خیال آتا ہی تھا کہ اس کا وہ فون اس کے کسی کے متعلق بھی بات کی ہو اسے بہر حال حیرت ہو رہی تھی کہ اس کی ماں جو ایک فون صرف اس لیے نہیں سنتی تھی کہ وہ شاہ پور سے آتا تھا اس نے خود شاہ سکندر کو فون کیسے کر لیا۔ کیا بی ججور ہو گئی ہے یا بہت جرات مند ہو دو صورتوں میں اسے بہر حال ایک دھڑکا سا لگ گیا تھا اور وہ شدت سے کا انتظار کرنے لگی، کیونکہ وہی اسے خدشات سے نکالتے تھے اور روزانہ تو نیل آٹھ بجے تک آ جاتے تھے روز جانے کہاں رہ گئے تھے۔ وہ اپنے کمرے سے ٹیرس اور ٹیرس سے کمرے تک کے چکر لگا کر تھک گئی اور لی آمد ہوئی بھی تو نوبت وہ بھی آسیہ کے ساتھ جس سے وہ فوراً ”کچھ کہنے سے رہ گئی۔ البتہ ٹوکنے سے باز نہیں

”آپ کہاں چلے گئے تھے؟“

”میں پھوپھو کے ساتھ تھا۔“ نیل نے بے دھیانی میں جواب دیا اور اس سے پہلے کہ مزید کچھ کہتے، آسیہ اس بلی۔

”بنا! جاؤ پہلے کھانا لگاؤ۔“

وہ نیل کو دیکھتی ہوئی وہیں سے کچن میں چلی گئی۔

پھر کھانے کے بعد وہ معمول کے مطابق نیل کے لیے چائے لے کر ان کے کمرے میں آئی تو خلاف معمول وہ اسے ادھر ٹھہر رہے تھے۔ اسے دیکھنا تو رک گئے اور اسٹک سے چائے کا گم کارز نیل پر رکھنے کا اشارہ کیا تو برتی ہوئی آواز میں بولی۔

”مجھے جانے کا اشارہ نہیں کیجیے گا۔ میں نہیں جاؤں گی۔“

”کیوں؟“

”بس۔“ وہ گم کارز پر رکھ کر آرام سے صوفے میں دھنس گئی۔ تو نیل کچھ دیر تک اسے دیکھتے رہے پھر اس کی آکر بیٹھتی ہی پوچھنے لگے۔

”نیل! کیا بات پریشان کر رہی ہے تمہیں؟“

”شام میں علی جہانگیر کا فون آیا تھا۔“ اس نے رک رک کر بتایا اور نیل نے ایک دم گردن موڑ کر اسے دیکھا بکا کر بولی۔

”میں نے نہیں انہوں نے کیا تھا۔“

”اُس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔“

”پریشانی کی بات وہ ہے جو انہوں نے بتائی۔“ اس نے فوراً ”کہا تو نیل ایک بار پھر چونکے تھے۔

”نیل! کیا بتایا ہے اس نے؟“

”تارے تھے آج ممانے شاہ سکندر کو فون کیا تھا۔“ اپنے تئیں اس نے بڑے راز کا انکشاف کیا لیکن نیل اس پر جھٹکا جیسے یہ کوئی اہم بات نہ ہو اور چائے کا گم اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا تو وہ حیران ہو کر بولی۔

”آپ کو حیرت نہیں ہوئی نیل بھائی۔“

”نیل! حیرت کی کیا بات ہے؟“ نیل نے اطمینان سے کہا تو وہ الجھ کر بولی۔

”ہے کیوں نہیں۔ ممانے شاہ سکندر کا نام بھی نہیں سنا چاہتی تھیں پھر انہیں فون کرنے کا مطلب۔“

”اور جب تک آسیہ کا ان کی طرف سے دل صاف نہیں ہو جاتا اور بخوشی انہیں دونوں بیٹیوں سے ملنے کی اجازت نہیں دے دیتی وہ مدیحہ کو اعتماد میں لے کر آسیہ سے دور رہی رکھیں گے، کیونکہ اس عرصے میں ان کے دل میں الماس اور آغا کے برابر جگہ بنا چکی تھی۔ اس لیے اب ان کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ آسیہ بیٹی کی خاطر ہمیشہ کے لیے مدیحہ اور صبا سے دستبردار ہو جاتے۔ ایک بار پہلے وہ آسیہ کی خاطر ایسا کر چکے تھے انہیں صرف اس کا خیال تھا اور اب اس کے خیال کے ساتھ بیٹیوں کا احساس بھی تھا جنہیں وہ سمجھتے تھے اب ضرورت ہے ان کی ماں لاکھ پڑھی لکھی ذہین عورت سہی پھر بھی تمنا ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔

بہر حال تین روز بعد جب وہ اسلام آباد کی مصروفیات سے نکل کر شاہ پور پہنچے تو سیدھے مدیحہ کے کمرے میں پہنچے اور اسے موجود نہ پا کر یہی سمجھے کہ کہیں ادھر ادھر یا بی بی جان کے پاس ہوگی اس لیے اپنے کمرے میں آئیں تو میرا نساء سے اس کے بارے میں فوراً ”نہیں پوچھا تھا۔ یوں بھی میرا نساء کو یہ بات ناگوار گزرتی۔ وہ چاہتی تھی ان کی ساری توجہ اس کی اولاد پر مرکوز رہے۔

”آغا کہاں ہے؟“ وہ جب ایسی ہو کر بیٹھے تو پہلے میرا نساء سے آغا کا پوچھا تھا۔

”ہاں لالہ کی طرف گیا ہے۔“ میرا نساء نے بتایا۔

”خیر تو تم نے کسی کام سے بھیجا ہے یا۔“

”شریانو نے بلوایا تھا۔“ میرا نساء فوراً ”بولی تھی۔“ ”ہو گا اسے کوئی کام۔ آغا آئے گا تو خود ہی اس سے پوچھ

”تم نے نہیں پوچھا تھا؟“ انہیں میرا نساء کی غیر ذمہ داری بہت کھٹکتی تھی جب ہی ٹوکے بغیر رہ نہیں سکے۔

”مجھے کہاں بتانا ہے۔“ وہ صاف دامن بچا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”چائے کا کون جیراں سے؟“

”ہاں اور زرا مدیحہ کو میرے پاس بھیج دو۔“ انہوں نے کہا تو وہ جاتے جاتے رک کر بولی۔

”وہ چلی گئی۔“

”لہاں؟“ وہ ایک دم سیدھے ہو بیٹھے۔

”راچی اپنی ماں کے پاس۔“ میرا نساء کا انداز بے حد سرسری تھا۔

”کس کس کے ساتھ گئی ہے؟“ ان کی پیشانی پر ایک ساتھ کئی لیکیریں نمودار ہو گئی تھیں۔

”پانچ شاید بابا جان لے گئے تھے۔“

”بابا جان!“ وہ بے یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”لہاں جا رہے ہیں۔ میں چائے کا۔“

اسے بولتا چھوڑ کر کمرے سے نکل آئے تھے۔

دیر بعد وہ بابا جان کے کمرے میں داخل ہوئے اور انہیں سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گئے۔ کیونکہ بابا جان

بین سے بات کر رہے تھے اور جب اسے فارغ کر کے ان کی طرف متوجہ ہوئے تو انہوں نے دوبارہ سلام کیا۔

”سلام علیکم!“

”دش رہو۔ کب آئے؟“ بابا جان نے خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔

”نہرہ ہوئی۔ ابھی میرا نساء نے بتایا ہے کہ آپ مدیحہ کو کراچی چھوڑ آئے ہیں۔“ انہوں نے جواب کے

لی بغیر کسی تہمت کے اپنی بات کہہ دی۔

”بہت ضد کر رہی تھی شاید گھبرا گئی تھی یہاں۔ شہر والوں کا بھلا کہاں مل لگتا ہے گاؤں میں۔“ بابا جان

ٹھیکے کے نیچے ہاتھ ڈال کر جانے کیا تلاش کرتے ہوئے بول رہے تھے۔

”اب میرا انتظار تو کرنا چاہیے تھا۔“ وہ مدیحہ کے جانے کی تصدیق ہونے پر الجھ گئے تھے۔

”اتھا ہم نے اس سے کہ اپنے باپ سے مل کر جانا لیکن وہ نہیں مانی کہنے لگی۔ میں کوئی ہمیشہ کے لیے تو نہیں

بھرتاؤں گی تو بابا سے مل لوں گی۔“ بابا جان نے مدیحہ کے الفاظ دہرا کر انہیں دیکھا تھا۔

”مدیحہ مدیحہ کے لیے فون کیا تھا۔ اسے واپس بلانا چاہتی ہیں لیکن۔“ نیپیل ایک دم خاموش ہو گئے۔

”لیکن کیا وہ نہیں آنا چاہتی؟“ اس نے فوراً ”جو چھوٹا نیپیل لہری سرس کھینچ کر کہنے لگا۔

”جی نہیں وہ کیا چاہتی ہے۔ شاید آنا چاہتی ہے لیکن شاہ پور والے اسے نہیں آنے دے رہے۔ ان کا منہ

پہلے نہیں رخصت کریں پھر مدیحہ کو یہاں بھیجیں گے۔ یہ انتخابی اہلیات کو شش بہ ان کی پھوپھو کو بلک مینا

کر رہے ہیں۔“

وہ سناٹے میں آکر انہیں دیکھنے جاری تھی۔

”اب تک ہم یہ سمجھتے رہے کہ مدیحہ وہاں اپنی مرضی سے رہ رہی ہے اور خوش ہے لیکن وہ خوش نہیں ہے۔

جانتا ہوں۔ وہ اس گھر کے علاوہ کہیں نہیں رہ سکتی۔ اس پر جب کیا گیا تو دھڑکے گئے۔“

”اف نہیں۔“ وہ ایک دم ہاتھوں میں چروچھپا کر رو پڑی تو نیپیل ایک نظر اسے دیکھ کر خاموش ہو گئے۔

”کچھ دیر بعد وہ ہاتھ نیچے گرا کر پوچھنے لگی۔

”پھر آپ اسے کیسے لائیں گے؟“

”لے آئیں گے پہلے تمہارا معاملہ نمٹالیں۔“ نیپیل نے ہاتھ بڑھا کر تکیے کے نیچے سے ایک لفافہ کھینچا۔

اسے دیکھ کر بولے۔ ”پھوپھو نے تمہارے بارے میں فیصلہ کر لیا ہے۔“

وہ کچھ بولی نہیں لیکن اس کی نظریں ان کے ہاتھوں میں پکڑے لفافے پر جا پڑی تھیں جبکہ اندر دل لکڑ

خاموش ہو گیا تھا۔

”مدیحہ کو بھیجنے کے لیے جو شرط انہوں نے رکھی ہے۔ پھوپھو پہلے اس کا خاتمہ کر رہی ہیں۔ اس کے بعد وہ

دعا نہیں کر سکیں گے۔“

نیپیل نے کہتے ہوئے لفافے میں سے پیپر نکال کر اس کے سامنے کر دیئے جن پر ایک نظر ڈال کر اس

ناجی کے عالم میں انہیں دیکھا تو وہ قدرے رک کر بولے۔

”خلع کے کاغذات ہیں سائن کر دو۔“

اس کے اندر چھن سے کوئی چیز ٹوٹی تھی۔ پھی پھی آنکھوں سے کورٹ پیپر دیکھنے لگی جس پر اس کی طرف

تحریر لکھی گئی تھی۔ کیا ستم ظریفی تھی کہ اپنے دل کی بستی اسے اپنے ہاتھوں سے اجاڑی تھی اور کوئی اجازت

نہیں کرنا تھا۔ کیونکہ پہلے مرحلے پر ہی اس نے فیصلے کا اختیار آسیہ کو سونپ دیا تھا۔

نیپیل نے بین اس کے ہاتھ میں تھا کر پیپر پر اس جگہ اپنی انگلی رکھ دی جہاں اسے سائن کرنا تھا۔

اس کی آنکھیں یکبارگی پانیوں سے بھر گئیں اور اس سے پہلے کہ کوئی قطرہ پلکوں سے گرتا۔ وہ سائن کر کے

کھڑی ہوئی اور تیزی سے جانے لگی کہ نیپیل پکار کر بولے۔

”سنو میں جانتا ہوں تم پھوپھو کے اس فیصلے سے خوش نہیں ہو۔ اگر کو تو میں انہیں مزید اقدام سے روک

کوشش کروں۔“

”نہیں نیپیل بھائی! ممانے اپنی ساری زندگی ہمارے لیے وقف کر دی۔ میں کیا ان کے لیے اتنا بھی نہیں

کہ ان کے فیصلے کو قبول کر لوں۔“

وہ بہت ضبط سے کہہ کر ان کے کمرے سے نکل آئی، لیکن اپنے کمرے میں پہنچنے سے پہلے ہی اس کی آنکھ

پانی چھلک گیا تھا۔



شاہ سکندر کے تین دن اسلام آباد میں بے انتہا مصروف گزرے تھے۔ لیکن اس مصروفیت میں بھی انہیں

کا خیال آ رہا تھا اور انہوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ اسے شاہ پور نہیں رہنے دیں گے۔ جیسا کہ اس نے بتا دیا

اسلام آباد میں پڑھتی ہے تو وہ اس بجائے اسے اسلام آباد لے آئیں گے اور بائبل میں اس کی رہائش کا

”چنانچہ نہیں پھر آئے گی بھی کہ نہیں۔“ انہوں نے خود کلامی کے انداز میں کہا تھا۔ لیکن باباجان سن کر بولے۔  
”ضرور آئے گی۔ وعدہ کیا ہے اس نے ہم سے۔“

”آپ خود چھوڑ کر آئے ہیں اسے یا کسی کے ساتھ بھیجا ہے۔“ انہوں نے اچانک کسی خیال کے تحت چہرہ  
”کسی کے ساتھ کیوں بھیجتے، ہم خود لے کر گئے تھے اور اس کے گھر کے سامنے اتار کر آئے ہیں۔“

باباجان نے اس انداز سے کہا جیسے انہیں کسی کے ساتھ بھیجنے والی بات بری لگی ہو۔  
”اچھا! شاہ سکندر یقین کر بھی رہے تھے اور نہیں بھی اور اندر ہی اندر اچھ بھی رہے تھے کہ پانچ روز پہلے آئیہ

نے فون پر ان سے جو کچھ کہا تھا۔ اس میں کتنی صداقت تھی۔  
”اچھ رہو گے یہاں یا پھر کہیں جانا ہے؟“ باباجان نے انہیں سوچتے دیکھ کر فوراً ”ان کا دھیان بنانے کی

کوشش کی۔  
”بس دو دن ہوں پھر کینڈا جانا ہے۔“ انہوں نے سرسری اپنا پروگرام بتایا پھر پوچھنے لگے۔ ”آپ کو معلوم ہے

جہانگیر بھائی ڈاکٹر آسیہ کے پاس گئے تھے۔“  
”اچھا کب؟“ باباجان بکرا بھان بن گئے۔  
”تھیں! ایک ہفتے پہلے۔“

”تھیں کیسے معلوم ہوا؟“  
”ڈاکٹر آسیہ کا فون آیا تھا۔ بتا رہی تھیں، جہانگیر بھائی نے صحبت کی رخصتی پر زور دیا اور جب وہ نہیں مانیں تو

دھمکی کے طور پر یہ کہہ آئے کہ مدیہ ان کے قبضے میں ہے۔“ شاہ سکندر صاف گوئی سے بتا کر کہنے لگے۔  
”جہانگیر بھائی بہت غلط کر رہے ہیں۔ میں اپنی بیٹیوں کے بارے میں کوئی ایسی بات برداشت نہیں کروں گا

برسوں پہلے آپ نے آسیہ اور اس کے گھر والوں کو مار دینے کی دھمکی دی تھی۔ لیکن اب آپ سن لیں کہ اس گھر  
میں میری بیٹیاں رہتی ہیں۔ دھمکی تو دور کی بات اگر انہیں کوئی نقصان پہنچانے کا سوچا بھی گیا تو۔“

وہ قصداً بات ادھوری چھوڑ کر بونٹ بیچ گئے۔  
”تم ناخن بد لگان ہو رہے ہو سکندر۔ تمہاری بیٹیاں کیا ہماری کچھ نہیں لگتیں۔ خون ہیں ہمارا اور تم سے پہلے

ہم جہانگیر سے پوچھیں گے کہ اس نے ڈاکٹری سے ایسی بات کیوں کی۔“  
باباجان کو کہ اندر ہی اندر اس صورت حال سے بوکھلا گئے تھے۔ لیکن ظاہر نہیں کیا اور ان کی طرف دارا

کرتے ہوئے شاہ جہانگیر پر غصہ کرنے لگے تھے۔  
”بہر حال جہانگیر بھائی کو دوبارہ وہاں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کینڈا سے واپسی پر صحبت کا معاملہ میں نہ

طے کروں گا۔“ وہ دخل کی سے کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔  
”ہاں اور کوشش کرنا مدیہ کی بات بھی یہیں طے ہو جائے۔ تیور کے ساتھ۔“ باباجان نے کہا تو وہ انہیں

کر رہے تھے۔  
♥ ♥ ♥ ♥

”کتنی خوب صورت جگہ ہے اور کتنا سکون سے یہاں۔ میرا بس چلے تو میں ساری زندگی کے لیے یہیں  
جاؤں۔“ وہ چاروں اور دیکھتی ہوئی ایک جذب کے عالم میں بولی تھی۔

چند قدم آگے چلتا شاہ تیور اس کی بات سن کر رک گیا اور پلٹ کر پوچھنے لگا۔  
”رہ سکوں گی؟“

”کیوں نہیں؟ یہ تو میرے خوابوں سے بھی زیادہ حسین جگہ ہے۔ لیکن میرے اور کون سے خواب  
ہوئے جو یہ ہو گا۔“ وہ اچانک آزرہ نظر آنے لگی۔ لہجہ میں بھی دکھ سمٹ آیا تھا جسے محسوس کر کے شاہ تیور

کے قریب آگیا۔  
452

”تم خواب بھی دیکھتی ہو؟“

”جہیں حقیقت میں کچھ میسر نہ ہو، وہ خواب ہی دیکھتے ہیں۔“

وہ کالج کی طرف جاتی سرخ بھری کی روش پر قدم رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

”آپ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ میں اور عباس ماحول میں پروان چڑھے ہیں۔ کاش بابا شروع ہی میں ہمیں

چنناں لے آتے تو ہمارے اندر اتنی حرمیاں نہ ہوتیں۔ ہر بات ہر چیز کو ترسے ہیں ہم، ماما کے ساتھ جو کچھ  
اس میں ہمارا تو کوئی قصور نہیں تھا لیکن انہوں نے اور ان کے سب گھر والوں نے ہمیں ہی قصور وار سمجھ لیا

جی، ہم سے بدلہ لیتے رہے۔ بہت زیادتیاں ہوتی ہیں ہمارے ساتھ۔“  
”پھر بھی تم وہاں جانا چاہتی ہو؟“ شاہ تیور نے فوراً ”نہ کا تو وہ ایک دم تیز ہو کر بولی۔

”کس نے کہا، میں جانا چاہتی ہوں۔ سچ پوچھیں تو میں بھی نہیں جانا چاہتی میرے تو دوبارہ وہاں جانے کا سوچ کر  
دنگن کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پہلے سے بھی زیادہ برا سلوک ہو گا میرے ساتھ۔ لیکن میں کیا کروں۔ ادھر بابا جان

جو جلی میں بھی میرے لیے جگہ نہیں ہے شاید۔“  
”ارے یہ تم سے کس نے کہا۔“

”میں محسوس کر سکتی ہوں شاہ تیور! کوئی نہ کہے تب بھی میں جانتی ہوں کہ مجھے کوئی پسند نہیں کرتا۔ یہاں تک

بابا کو بھی میری پروا نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں یہیں رہنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ میری اصل شناخت یہیں سے  
ہے اگر ماما نے اتنی پابندیاں نہ لگائی ہوتیں تو میں بہت پہلے یہاں آچکی ہوتی اور اسے ساتھ صبا کو بھی لے آتی۔“

”غیر وہ تو اب آئی جائے گی اور تم بھی نہیں جاؤ گی۔“ شاہ تیور نے کہا تو وہ قدم روک کر اسے دیکھنے لگی۔  
”میں کہہ رہا ہوں ناں تم نہیں جاؤ گی۔“ اسے یقین دلانے کی خاطر اس نے زور دے کر اپنی بات دہرائی پھر کہنے

”تمہیں یہ کالج پسند ہے تو ہم نہیں رہیں گے۔“  
”ہم۔“ اس کے ہونٹ ذرا سے نیم ہوا کر پھر ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے۔

”تم اور میں، یا تمہیں میرے ساتھ رہنے پر کوئی اعتراض ہے۔“ شاہ تیور نے شوخ مسکراہٹ کے ساتھ اس  
کا انگوٹھ میں جھانکا تو وہ فرس سی ہو کر آگے بڑھتے ہوئے بولے۔

”چاہ نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“  
”ارے!“ وہ ذرا سا ہنسا۔ پھر قدم بڑھا کر اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں تمہارے خوابوں کو

نہیں دیکھتی ہوں۔“ شاہ تیور نے شوخ مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں تمہارے خوابوں کو  
نہیں دیکھتی ہوں۔“ شاہ تیور نے شوخ مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں تمہارے خوابوں کو

نہیں دیکھتی ہوں۔“ شاہ تیور نے شوخ مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں تمہارے خوابوں کو  
نہیں دیکھتی ہوں۔“ شاہ تیور نے شوخ مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں تمہارے خوابوں کو

نہیں دیکھتی ہوں۔“ شاہ تیور نے شوخ مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں تمہارے خوابوں کو  
نہیں دیکھتی ہوں۔“ شاہ تیور نے شوخ مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں تمہارے خوابوں کو

نہیں دیکھتی ہوں۔“ شاہ تیور نے شوخ مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں تمہارے خوابوں کو  
نہیں دیکھتی ہوں۔“ شاہ تیور نے شوخ مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں تمہارے خوابوں کو

نہیں دیکھتی ہوں۔“ شاہ تیور نے شوخ مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں تمہارے خوابوں کو  
نہیں دیکھتی ہوں۔“ شاہ تیور نے شوخ مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں تمہارے خوابوں کو

نہیں دیکھتی ہوں۔“ شاہ تیور نے شوخ مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں تمہارے خوابوں کو  
نہیں دیکھتی ہوں۔“ شاہ تیور نے شوخ مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں تمہارے خوابوں کو

نہیں دیکھتی ہوں۔“ شاہ تیور نے شوخ مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں تمہارے خوابوں کو  
نہیں دیکھتی ہوں۔“ شاہ تیور نے شوخ مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں تمہارے خوابوں کو

نہیں دیکھتی ہوں۔“ شاہ تیور نے شوخ مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں تمہارے خوابوں کو  
نہیں دیکھتی ہوں۔“ شاہ تیور نے شوخ مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں تمہارے خوابوں کو

نہیں دیکھتی ہوں۔“ شاہ تیور نے شوخ مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں تمہارے خوابوں کو  
نہیں دیکھتی ہوں۔“ شاہ تیور نے شوخ مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں تمہارے خوابوں کو

نہیں دیکھتی ہوں۔“ شاہ تیور نے شوخ مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں تمہارے خوابوں کو  
نہیں دیکھتی ہوں۔“ شاہ تیور نے شوخ مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں تمہارے خوابوں کو

نہیں دیکھتی ہوں۔“ شاہ تیور نے شوخ مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں تمہارے خوابوں کو  
نہیں دیکھتی ہوں۔“ شاہ تیور نے شوخ مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں تمہارے خوابوں کو

”خدا حافظ!“ اس نے موبائل بند کر کے واپس جیب میں رکھا پھر اس کے پیچھے اندر آیا تو وہ کھڑکی کے پاس کھڑی جانے کن سوچوں میں گم تھی۔

”اے!“ شاہ تیور نے قریب جا کر اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لرایا تو وہ چونک کر دو قدم پیچھے ہٹی پھر جانے کیا ہوا ہاتھوں میں چوہا چھپا کر رونے لگی۔

”ارے مدیحہ!“ شاہ تیور نے آہستگی سے اس کی دونوں کلاسیاں تھام کر ہاتھ نیچے کیے۔ ”کیا ہوا ہے؟“

”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”کس سے مجھ سے؟“ وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا سانس کی طرف جھکا۔

”نہیں۔“ وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑنے لگی۔

”پھر!“

”میری قسمت سے!“ اپنے خوابوں سے، کہیں مجھے رسوائی کر دیں۔“

”بیوقوف! میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ اپنے دل سے سارے ڈر، سارے خوف مٹاؤ والو اور بھول جاؤ اب تک جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا۔ بہت جلد ہم نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔“

وہ بہت مضبوط لمحے میں اسے اپنے ذات کا کان دے رہا تھا۔

وہ پلکیں جھپک جھپک کر اسے دیکھنے لگی۔

”کیا تم میرا یقین نہیں کر رہی؟“

وہ ذرا سائبات میں سر ہلا کر اس کی طرف سے رخ موڑ گئی۔ تب ہی باہر گاڑیاں رکنے کی آواز پر وہ چونک کر بولا۔

”لو آگئے سب لوگ۔“

”کون؟“ اس نے بے دھیانی میں پلٹ کر پوچھا۔

”کرزنز۔“ جاؤ تم منہ دھو لو ورنہ سب سمجھیں گے۔ میں تم پر ظلم و ستم تو ڈرتا رہا ہوں۔“ اس نے شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بھاگ کر واش روم میں بند ہو گئی۔

چند لمحوں بعد سارے میں ایک شور مچ گیا، علی جمالیگر بھی آیا تھا جسے دیکھ کر شاہ تیور حیرت بھری آواز میں چلایا۔

”ارے ڈی سی صاحب بھی آئے ہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ خدا کی قدرت ہے۔“

مدیحہ واش روم سے نکل کر آرہی تھی۔ بے ساختہ بولی۔

”کبھی، ہم ان کو کبھی ایسے کھڑے دیکھتے ہیں۔“

”ہائیں! ہم ہمارے قافلے میں تو نہیں تھیں۔ علی جمالیگر نے حیران ہو کر مدیحہ کو دیکھا تو اس سے پہلے شاہ تیور بول پڑا۔

”ہم قافلے کا استقبال کرنے کے لیے پہلے سے آگئے تھے۔“

”اچھا!“ علی جمالیگر ایک نظر شاہ تیور پر ڈال کر پھر سوچتے ہوئے انداز میں مدیحہ کی طرف متوجہ ہوا تو وہ فصا مسکرا کر بولی۔

”کیسے ہیں آپ؟“

”ٹھیک ہوں، تم کیسی ہو؟“

”بالکل ٹھیک اور اس کاٹھ میں آکر تو بہت خوش۔“

”تیور بھائی! اچانک پنے کا کیا انتظام ہے۔“ ایک طرف سے رابع نے پکار کر پوچھا تو شاہ تیور ادھر متوجہ

گیا۔

دست، سب کی فیورٹ ڈشز تیار کروائی ہیں۔“

وہ کس بات کی ہے۔ بس فوراً دستروان پھوٹاؤ پھر مجھے جانا ہے۔“ علی جمالیگر نے کہا۔

مطلب؟ آتے ہی جانے کی بات کرنے لگے۔“

یاد میں بہت ضروری کام چھوڑ کر آیا ہوں۔ سکندر پچاسے ملنا تھا لیکن وہ میرے شاہ پور پہنچنے سے پہلے ہی تھے۔ اب پتا نہیں کراچی میں بھی ان سے ملاقات ہوتی ہے کہ نہیں۔ پانچ بجے ان کی کینڈا کی فلائٹ

جاگگیر نے کہا تو مدیحہ بے ساختہ پوچھنے لگی۔

”کنڈا جا رہے ہیں؟ واپس کب آئیں گے؟“

”دس دن تو لگیں گے، تم چلنا چاہو کراچی تو میرے ساتھ چلو۔“ علی جمالیگر نے جواب کے ساتھ کہا تو تیور لپ پڑا۔

”میں یہ میرے ساتھ جائے گی کیوں مدیحہ؟“

”اس کے جواب پر علی جمالیگر ذرا سے کندھے اچکا کر بولا۔

”بے تمہاری مرضی آپ پلیر نہ کھانا۔“

”اچلو مدیحہ! امیربائی کے فرائض نبھادیں۔“ شاہ تیور نے چلتے ہوئے مدیحہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”سب حیران ہو کر دیکھنے لگے تھے۔

لہانا کھاتے ہی علی جمالیگر بہت غلت میں سب کو خدا حافظ کہتا ہوا نکل گیا تو کتنی دیر تک سب اسی کے میں باتیں کرتے رہے۔ خصوصاً اس کی شادی پر جو بد مزگی ہوئی تھی اس کا سب کو افسوس تھا۔ اور یہ کہ اس کا معاملہ طے کیوں نہیں ہوا۔

”جان ڈھیل دے رہے ہیں ورنہ ان کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے۔“ شاہ عازم نے کہا تو آغا اس کی تائید دہلا۔

”اچھے میرے باپ کو ڈھیل دی تھی۔ فرق اتنا ہے کہ انہیں اس چنگل سے نکالنا تھا اور علی کو پھنسانا ہے۔ با

آخر میں اس کے ساتھ دو چار تھپے اور بھی شامل ہو گئے تھے۔

”یہ کچھ پریشان سی ہو کر ایک ایک کی شکل دیکھ رہی تھی۔“ معا شاہ تیور کی اس پر نظر پڑی تو سب کو خاموش نہ ہوئے بولا۔

”ایک فضول باتیں شروع کر دی ہیں تم لوگوں نے۔“ چلو مدیحہ! ہم باہر چلتے ہیں۔“

”تاہم علی کی طرح یہ بھی۔“ عازم کے مسخرانہ انداز پر وہ اسے گھورتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور سب کے درمیان

”یہ کہا تھا پکڑ کر اسے بھی اٹھا دیا۔

”بالے جاؤ گے اسے؟“ آغا نے پوچھا لیکن وہ ان سی کرتا ہوا مدیحہ کو لے کر چل پڑا تو عقب سے الماس کی

”نا تھی۔

”بہاں کا انجام بھول گئی ہے۔“

”جاؤ آپ کو یقین آگیا کہ مجھے کوئی پسند نہیں کرتا۔“ گیت سے نکلتے ہی مدیحہ نے دکھ سے کہا۔

”ہائیں جو کرتا ہوں کیا تمہارے لیے صرف میری محبت کافی نہیں ہے اور کسی کی پروا مت کرو۔“

”میں نہیں کروں۔ آپ نے سنا نہیں۔ الماس کیا کہہ رہی تھی۔ اگر پاپا کی طرح آپ نے بھی مجھے۔“ اس کی

”اگلی تھی۔

”وف! سکندر پچاسے تمہاری ماں کو اپنی مرضی سے نہیں چھوڑا تھا۔ بابا جان نے مجبور کیا تھا انہیں۔“ وہ

”تو تمہاں کروش پر دھیرے دھیرے چلنا ہوا ساری کہانی دہرانے لگا تھا۔



وہ سراسیمہ سی سن رہی تھی۔

من نہیں تھی۔ کوئی اور معاملہ ہوتا تو وہ ہفتہ کیا میدان انتظار کر سکتا تھا اور اب تو جیسے ایک ایک پل اتنا اہم اس کا بس چلتا تو وہ وقت کو میس روک دیتا جو اس کی زندگی چھیننے کے درپے ہو گیا تھا۔

سوچنے کے بعد اس نے بابا جان کو فون کیا اور جب انہیں نوٹس کا بتایا تو وہ چیخ پڑے تھے۔  
ہو گئی ہے وہ عورت، اپنی زندگی سے سبق نہیں سیکھا اس نے جو اب بی بی کو طلاق دلو اگر گھر بٹھانا چاہتی ہے سمجھا دو کوڑ پکھری کرنا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ ہم اس کے پورے خاندان کو گھسیٹ لیں

اگر بس بابا جان! غصے اور جوش سے میرا مسئلہ حل نہیں ہو گا نہ ہی میں کوئی دھاندلی چاہتا ہوں آپ میری کو پیچھیں ڈاکٹر آسیہ کے پاس۔ اس نے ناراض لہجے میں ٹوک کر کہا۔

فائدہ مارا باپ، اسی پر تو ڈاکٹر نے یہ قدم اٹھایا ہے۔ بابا جان سخت تلمٹائے ہوئے لگ رہے تھے۔  
بکب گئے تھے ابا؟ اس نے فوراً پوچھا۔

بڑھ بھٹہ ہوا ہے۔ بہت بے عزتی کی اس عورت نے تمہارے باپ کی اس کے بعد بھی اگر تم چاہتے ہو بارہا سے وہاں جانے کو کہیں تو۔

ن۔ وہ ایک دم بول پڑا۔  
چاہو ہم کیا کریں۔

اگلے تو میری اپنی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا پھر بھی میں یہ ضرور کروں گا کہ اس سارے قصے میں صباحت کا کوئی حصہ ہے۔ اس لیے اس کی ماں کے کیے کی سزا سے نہیں ملتی چاہیے۔ اس نے کہا۔

با کا خیال کر کے تو ہم خاموش ہیں ورنہ۔ بابا جان فوراً بولے اور خاموش بھی ہو گئے۔  
بابا جان! میں پھر بات کروں گا۔ اس نے اجازت لے کر فون بند کر دیا۔

پھر بہت سوچنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اب شاہ سکندر ہی کو ڈاکٹر آسیہ کے پاس جانا چاہیے اور اس سے بہت جلد سے شاہ سکندر کا انتظار کرنا تھا۔

با کی تیل بج رہی تھی۔  
لے لے کچھ دیر انتظار کیا کہ صباحت فون اٹھائے گی، لیکن وہ پتا نہیں کہاں تھی آخر انہیں خود ہی کمرے سے

ایک نیکہ دوسری طرف کوئی مشغل مزاجی سے منتظر تھا۔  
بولے، نیل نے ریسپور اٹھایا اور دوسری طرف کی آواز سننے ہی بے اختیار ہو گئے تھے۔

دو کیسی ہو؟ کہاں ہو؟  
اتنے دنوں سے فون کیوں نہیں کیا۔ تم ٹھیک تو ہونا۔؟

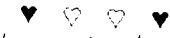
بابا کیا تم نے؟  
با کی سماعتوں نے جانے کیا سنا تھا کہ پورا وجود سن ہو گیا۔ بڑی مشکل سے انہوں نے ہاتھ نیچے گرا کر ریسپور

فائدہ اس کے بعد بھی وہیں کھڑے رہے اتفاق سے اسٹک بھی ہاتھ میں نہیں تھی ورنہ اس کے سارے خود کو ٹٹ لیتے۔ انتہائی بے بسی سے اپنے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے بے اختیار صباحت کو پکارا تھا۔

بابا!  
صباحت اپنے کمرے سے نکل کر آئی اور انہیں دیکھتے ہی بڑھٹھک گئی تھی۔

بابا! تم نے نیل بھائی؟  
نیل کراسے دیکھنے لگے۔ بولے کچھ نہیں تو قریب آکر صباحت نے ان کا بازو تھام لیا۔

نیل! بھائی۔ میاں کیوں کھڑے ہیں؟ پھر فون پر نظر پڑی تو اندر ہی اندر پریشان ہو کر پوچھنے لگی۔ کس کا تھا۔؟



علی جہانگیر ایئر پورٹ پر بس تھوڑی دیر کے لیے شاہ سکندر سے مل سکا تھا اور اصل بات جو وہ ان سے پوچھنا چاہتا تھا وہ بھی نہیں پوچھ سکا کیونکہ وہ اپنے وفد کے ساتھ تھے۔ اس لیے بس سلام دعا ہی ہوئی۔ البتہ اس بات پر اس نے بہت زور دیا کہ کینڈا سے واپسی پر وہ شاہ پور جانے سے پہلے اس کے پاس آئیں اسے ان سے بہت ضروری کام ہے اور انہوں نے ہائی تو بھلی تھی پھر بھی وہ ان کی واپسی کی تاریخ کنفرم کر کے آیا تھا تاکہ خود انہیں ریسپو کرنے جاسکے۔ اصل میں وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ آسیہ نے ان سے صباحت اور اس کے معاذ کیا بات کی۔ فطری سی بات تھی وہ یہی سوچ سکتا تھا، مدحیہ کی طرف اس کا بالکل دھیان نہیں گیا تھا۔ بہر حال ڈاکٹر سکندر کو سی آف کر کے جب وہ گھر پہنچا تو کمرے میں جانے کے ساتھ ہی اسے ایک لفافہ بٹھا کر ملا۔

”ابھی ایک آدمی دے گیا ہے۔ میرا لٹوٹھا بھی لٹوایا تھا اس نے۔“

”اچھا جاؤ۔“ وہ لفافے پر تامل دیکھ رہا تھا۔ فوراً ”کرم دین“ کو بھیج کر جانے کا کپ نیل پر رکھا اور لفافہ کھول کر دیکھا۔

نکالتے ہی ٹھنک گیا۔ پھر جب تحریر پر نظریں دوڑائیں تو بری طرح چکرا گیا۔ دل کسی طرح یقین نہیں کر رہا تھا صباحت خلع کا دعوا کر سکتی ہے۔

”میرے خدا۔“ اس نے صوفے کی بیک پر سر رکھا تو اس کا ذہن بری طرح چیخ رہا تھا جو بات گمان میں نہیں رہے ہو گئی تھی۔

گزشتہ تین چار روز سے وہ کتنا متحس ہونے کے ساتھ پر امید بھی تھا کہ آسیہ اور شاہ سکندر کے درمیان را ہونے سے اس کا معاملہ اب خوش اسلوبی سے طے پا جائے گا اور اس خیال کے ساتھ اس نے اس منزل سی کے حوالے سے بہت کچھ سوچ لیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اسے اپنے گھر میں چلتی پھرتی نظر آنے لگی تھی۔

میں تو کبھی کچن میں اور بیڈ روم میں جانے کیوں وہ دے پاؤں داخل ہوتی تھی۔ وہ بند آنکھوں سے اسے دیکھتے محسوس کرتا تھا اور بھی بے اختیار اسے چھونے کے لیے اس کا ہاتھ ہوا میں اٹھ کر رہ جاتا۔ تو اسے لگتا جیسے وہ کوئے میں کھڑی ہنس رہی ہے۔ کیسی بدھر ہنسی ہوتی تھی جو اس کے اندر خوشوار سی پھیل جاتی تھی۔

”نہیں صباحت شاہ! تم ایسا نہیں کر سکتیں۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی پنٹھوں کو زور سے دبایا پھر آجھکے سے سیدھا ہوبہٹھا اور سیلی فون سیٹ قریب کھینچ کر اس کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔

تیسری تیل کے بعد اس کی آواز سنائی دی تھی۔  
”ہیلو!“

”دیکھو! ابھی تمہاری طرف سے نوٹس موصول ہوا ہے۔ تم نے اپنی مرضی سے بھیجا ہے یا۔“ وہ چھوٹے لہجے میں بولا۔

اپنی مرضی سے بھیجا ہوا کسی اور کی کیا فرق پڑتا ہے۔“ وہ دہر دہاری ہوئی لگ رہی تھی۔  
”فرق پڑتا ہے صباحت شاہ! فرق پڑتا ہے۔“ وہ زور دے کر بولا۔ ”تم مجھ پر ہی نہیں اپنے آپ پر بھی ظلم

ہو۔“  
”میں فون بند کر رہی ہوں۔“

”یہی کر سکتی ہو تم۔“ اس نے خود ہی ریسپوئنس دیا۔  
”کبھی سوچنا خود ڈاکٹر آج

اس لڑکی کو وہ نہیں سمجھا سکتا تھا اور خود اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے۔ کبھی زیادہ دیر تک پاس جائے اور اپنی صفائی پیش کرنے کے ساتھ صباحت کے ساتھ وابستگی بھی بتا ڈالے۔ لیکن زیادہ دیر تک سوچ پر قائم نہیں رہ سکا کیونکہ اس کے خیال میں وہ ڈاکٹر آسیہ سے زیادہ بحث نہیں کر سکتا تھا البتہ شاہ صباحت پر اپنا حق جتا کر کچھ بھی کہہ سکتے تھے۔ لیکن وہ بھی آج ہی باہر گئے تھے اور ایک ہفتے سے پہلے

”کسی کا نہیں، وہ میں نے اسٹک پتا نہیں کہاں چھوڑ دی۔“ انہوں نے بات بناتے ہوئے خود کو سمارا دیا۔  
 خاطرِ صباحت کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔  
 ”بس نیل بھائی! اب اسٹک کا پیچھا چھوڑ بھی دیجیے۔ اس کے بغیر چل تو سکتے ہیں۔“ وہ ان کی اسٹک سے چڑ  
 بولی تھی۔  
 ”کیا کروں؟ عادت ہو گئی ہے۔ اس کے بغیر خود کو خالی خالی سامحوس کرتا ہوں ابھی دیکھو ہاتھ میں نہیں تھم  
 میں۔“ وہ جانے کیا کہتے جا رہے تھے کہ ایک دم خاموش ہو گئے۔  
 ”یہ یہاں رکھی تو ہے۔“ صباحت ان کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی تو سامنے اسٹک دیکھ کر بولی۔  
 ”ارے، میں سمجھا شاید راستے میں کہیں گر گئی۔“ انہوں نے قصداً حیرت کا مظاہرہ کیا۔  
 ”دگر ہی جاتی تو اچھا تھا۔“ وہ یونہی کہہ گئی۔  
 ”دیکھو کیا تمہیں بھی مدحو کی طرح اس کی آواز بری لگنے لگی ہے۔“ انہوں نے افسردہ سی مسکراہٹ کے  
 پوچھا تو وہ اپنی یونہی کسی گئی بات پر جڑ جڑی ہو کر بولی۔  
 ”نہیں تو۔“

”اچھا جاؤ اپنا کام کرو۔ میں نے خواہ مخواہ تمہیں ڈسٹرب کیا۔“ وہ اپنی رائفنگ نیل پر بیٹھتے ہوئے بولے۔  
 ”میں کوئی کام نہیں کر رہی تھی۔“ اس نے ان کے ہیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا تو نیل نے ذرا سی گردن موڑ کر  
 دیکھا پھر اپنے سامنے فائل کھول دی اور بظاہر اس پر نظریں دوڑانے لگے جبکہ ذہن مدحیہ کو سوچنے لگا تھا۔  
 آواز ہمیشہ کی طرح کھنکتی ہوئی تھی۔ کہیں سے بھی نہیں لگ رہا تھا کہ وہ کسی دباؤ میں ہے۔ بلکہ یہاں سے بھی  
 آزاد جب ہی تو اپنے بارے میں فیصلہ کر کے خوش ہو کر انہیں بتا رہی تھی۔ ان کی ساعتوں میں ابھی بھی اس  
 الفاظ گونج رہے تھے۔ جو ان کی روح پر کسی تازیانے سے کم نہیں تھے اور جب آئیہ پھو بھی سنیں گی تو۔  
 اس سے آگے سوچ کر ہی وہ پریشان ہو گئے اور بے حد مضطرب۔ تب ہی صباحت انہیں پکار کر پوچھنے لگی۔  
 ”نیل بھائی! اس کا فون تھا؟“

”کب؟“ انہوں نے بہت سنبھل کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔  
 ”ابھی کچھ دیر پہلے جب آپ لابی میں کھڑے تھے۔ مجھ سے مت چھپائیے میں نے خود تیل سنی تھی اور  
 اٹنڈ کرتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ صباحت کے ذہن میں علی جمائیکر کا خیال تھا جب ہی وہ جاننا چاہتی تھی کہ ا  
 کیا کہا۔

”پھر اس میں اچھنے کی کیا بات ہے۔ کیا میرا فون نہیں ہو سکتا۔“ انہوں نے تنبیہی انداز میں کہا۔  
 ”ہو کیوں نہیں سکتا۔“ وہ الجھ گئی۔  
 ”پھر؟“

”پھر یہ کہ آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔“  
 ”ہاں چھپا رہا ہوں، ضروری نہیں ہے کہ ہر بات تمہیں بتائی جائے۔“ انہیں ایک دم غصہ آ گیا۔ شا  
 ضبط کرنے کی وجہ سے۔

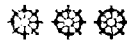
”اور تم آپ کیا جاننا چاہتی ہو۔ تمہارے بارے میں پھوپھو نے جو فیصلہ کرنا تھا اگر لیا اور اس پر تم سے  
 کروالیے اور شاید علی جمائیکر کو بھیجا بھی چکی ہیں۔“  
 ”میں جانتی ہوں۔“ وہ ان کے غصے سے خائف ہو کر بولی۔

”پھر اور کیا جاننا چاہتی ہو۔ اس نوٹس پر علی جمائیکر کا رد عمل تو مجھے نہیں معلوم اور نہ ہی میں قیاس  
 ہوں۔“ ان کا لہجہ ہنوز تھا۔ جس پر وہ پڑ کر کہنے لگی۔  
 ”آپ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ بالکل میری طرح ہیں آپ۔ بزدل اور کم ہمت آپ نے آپ پر ذرہ برابر بھرا

”اچانک جیسے ٹوٹ گئے۔“ اپنے آپ پر بھروسہ ہوتا تو یوں جانے دیتا اسے، کبھی نہیں اور وہ بھی کیسی  
 بوں کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔  
 وہ ان کے ٹوٹتے لیجے پر کچھ گم صم سی ہو گئی تھی۔  
 ”نئی ہو، آپ وہ کیا کرنے جا رہی ہے؟“ انہوں نے اپنے خیال سے نکل کر اسے دیکھا اور اس کے نفی  
 پر غمی سانس کھینچ کر بولے۔

احت کے صرف ہونٹ کھلے تھے، حلق سے آواز نہیں نکلی تھی اور نیل بھی جیسے کسی پاتال میں سے

اس کا فون آیا تھا۔ خود تار رہی تھی کہ وہ شادی کر رہی ہے۔ شاہ تیور کے ساتھ۔“  
 صباحت کا سر نفی میں ہلٹا چلا گیا اور نیل نے جیسے تھک کر چیڑ کی بیک پر سر نکالیا تھا۔



یہ بعد صباحت اپنی جگہ سے اٹھ کر نیل کے پاس آئی اور آہستہ سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی  
 بانی! یہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ کن گناہوں کی سزا مل رہی ہے ہمیں۔“

”کا کا تھا تھام کر اپنے سامنے کرتے ہوئے کہنے لگے۔  
 ”ارائیں، ہمارے ماں باپ کا ہے۔ جنہوں نے اپنی اپنی انامیں اولاد کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ اگر ہماری  
 ماںیں کبیر ومانز کر لیتیں تو ہم ادھورے ہوتے نہ ہمیں ایسے حادثات پیش آتے۔ میں مدحو، تم، ہم  
 ابھی مکمل نہیں ہے۔ ہمارے اندر ہمیشہ ایک محرومی کا احساس رہا جس نے ہماری شخصیت کی تکمیل  
 دی۔“

”رجہ حساس۔ اس کے ساتھ تمہارے لاشعور میں ہمیشہ یہ خوف رہا کہ کہیں کوئی تمہیں تمہاری ماں یا  
 نہ دے مارے۔ ہر مقام پر جھٹکتی اور ٹوٹی چلی گئیں۔ یہ نہیں تھا کہ تمہارے اندر لڑنے اور احتجاج  
 اقت ہی نہیں تھی۔ تھی، لیکن اس خوف نے تمہیں اپنا دفاع تک نہیں کرنے دیا۔“

”جو اس خوف نے الٹا اثر ڈالا۔ یعنی تمہارے بالکل برعکس وہ بے حس، خود سر اور باغی ہو گئی اور اپنی  
 نہ ہر ایک سے لینے لگی اور وہی ٹھیک ہے۔ جو نہ جھٹکتی ہے نہ ٹوٹی ہے۔ اور جو چاہتی ہے، پھینکتی  
 اپنا دامن کرتی۔ میں اب سے نہیں، شروع سے اسے پسند کرتا ہوں۔ مجھے وہ چیخ چلا کر اپنی بات منوالی  
 چلی تھی۔ لیکن وہی بات جو ابھی تم نے کہی کہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ مجھے اپنے آپ پر بھروسہ

بستہ اور اعتماد کی کمی نے ہی مجھے بزدل بنا دیا، جو میں اس کے سامنے اظہار نہیں کر سکا اور تمہاری طرح  
 نظام پر جھٹکا اور ٹوٹنا چلا گیا۔ حالانکہ سب لوگ ہم سے بہت محبت کرتے ہیں، لیکن یہ ساری محبتیں بھی  
 ”محرومی کے احساس کو کم نہیں کر سکیں۔ اس لیے ابھی صحیح وقت پر صحیح فیصلہ نہیں کر سکے۔ ہم ڈرتے  
 اتر رہیں گے۔“

”کچھ نہیں دیکھ تھا،“ تنہی بھی سمٹ آئی تھی۔  
 ”آپ کھڑی انہیں سن رہی تھی۔ جب آخر میں انہوں نے ہونٹ بھیج کر جانے بقیہ تنہی اپنے اندر  
 دھکیلی گویا ہر آنے سے روکا۔ تنہی: ”ہی: بولی آواز میں پوچھنے لگی۔“

اپنے آپ کو قصور وار سمجھ رہے تھے۔ شاید ان کے لاشعور میں کہیں یہ خیال تھا کہ وہ اگر صحیح وقت پر اپنے اظہار کرنے کے ساتھ اسے خوبصورت زندگی دینے کا وعدہ کرتے تو وہ بھی فرار کا راستہ اختیار نہ کرتی اور یہ اس کے ہر عمل کے ذمہ دار رہی ہوں گے۔

ان میں تمہیں سمجھا سکتا روک سکتا ہو؟ انہوں نے بے بسی اور دکھ سے سوچا تھا۔  
ہرات کے تیسرے پیر جب وہ ہر طرح سونے کی کوشش میں ناکام ہو گئے تو اٹھ کر میسر پر آ گئے۔ خاموش ہو کر سر سر ہاٹ، بہت لمبا سا ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ جبکہ روشنی کہیں نہیں تھی۔ ان کا دل چاہا، ساری وجہ تک کریمیں ننگے فرش پر سو جائیں۔ کتنی دیر ادھر سے ادھر ٹھل کر وہ اپنے ذہن کو پرسکون کرنے کی کرتے رہے اور جب کسی حد تک کامیاب ہو گئے تب لائی میں آکر امریکا کی کال مانے لگے، کیونکہ خود کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ انہیں بار بار امریکا کا خیال بھی آ رہا تھا کہ وہ اگر مدیہ کے ساتھ وفاداری نبھاتا تو وہ کبھی بے نہ جاتی۔ بہر حال چند لمحوں بعد جب ادھر اچلاؤں پر آیا تو وہ چھوٹے ہی بولے تھے۔

نہارے ایک غلط قدم نے یہاں کس کس کی زندگی خراب کی۔ کبھی سوچا تم نے؟  
وہ؟ نیل بھائی! کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ "احمران کی آواز سن کر جہاں خوش ہوا وہاں الجھ بھی گیا تھا۔  
مرا اچھی طرح سمجھ رہے ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔" انہوں نے چیخ کر کہا تو آخر جیسے سمجھ کر گمری سانس کھینچ

میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا جس پر شرمندہ ہوں۔"  
اب تم کیوں شرمندہ ہو گے۔ شرمندہ تو میں ہوں، میں نے پھپھو کو یقین دلایا تھا کہ مدحو کے لیے تم سے بہتر اور بس ہو سکتا۔ "ان کا لہجہ ہنوز تھا۔

نپ کو شرمندہ ہونا بھی چاہیے، کیونکہ آپ نے پھپھو سے غلط بیانی کی تھی۔ ورنہ آپ اچھی طرح جانتے مدحو کے لیے بہتر کتنا تھا۔ "احمران کی بات سے خائف ہونے کے بجائے آرام سے بولا تو انہوں نے مکر پر چھا۔

ان؟  
نیل۔ "احمران نے ان پر چڑھے آہنی خول پر کاری ضرب لگائی تھی کہ ان کا پورا وجود جھنجھٹا گیا۔ بند ہونٹ کھلے اور آواز نکلی تھی۔

نیل۔  
نیل۔ کیوں خود کو چھپائے رکھا آپ نے۔ محبت گناہ تو نہیں ہے جس کے اعتراف پر آپ کو دار پر لٹکا دیا

نیل کیا کہہ رہے ہو احمران! وہ ملتی لمبے میں بولے۔ جیسے خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ۔  
نیل کہہ رہا ہوں۔ غلط کام میں نے نہیں، آپ نے کیا تھا۔ میں تو شکر ہے بچ گیا اور نہ اگر مدحو سے شادی کے

نیل آپ کے جذبات کی خبر ہوئی تو میں ساری زندگی انگاروں پر چلتا۔ اب آپ پوچھیں گے مجھے کیسے خبر ہوئی تو میں وقت پر رخصت جب میں نے آپ سے کہا تھا مدحو کا خیال رکھیے گا تو آپ نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ اس وقت آپ کے دھیان میں یقیناً "مدحو تھی جو آپ نے بہت دھیمی آواز میں خود کھائی کی تھی۔ "کوئی

نیل سے بھی غافل ہوتا ہے۔ "احمران روائی میں بول رہا تھا۔ ایک لحظہ کو رکا پھر شروع ہو گیا۔  
نیل بھائی! وہ ایک لمحہ تھا جس نے آپ کو مجھ پر عیاں کر دیا تھا۔ اس کے بعد مجھے اپنا آپ کیس نظر نہیں

اسے منظر دلوں میں آپ ہی آپ تھے، پھر میں کیوں زبردستی اپنا آپ منوانا اور اگر منوانا بھی لیتا تو کیا ملتا مجھے۔"  
نیل وہ جو کم صدم کھڑے تھے چونک کر بولے۔ "وہ تو تم سے محبت کرتی ہے۔"  
نیل صرف اپنا آپ منوانا چاہتی تھی اور آپ تو اسے شروع سے مانتے ہیں۔ اس لیے وہ صرف آپ کے

"اور نیل بھائی! مدحو؟"  
"اس نے فرار کا راستہ اختیار کیا ہے۔ اپنے آپ سے بھی بھاگ رہی ہے۔ پتا نہیں کہاں تک جائے گی۔  
کرے کسی راستے میں جج جج اس کی منزل آ جائے۔ وہ پالے اپنی منزل۔ ہم میں سے کوئی ایک تو۔" وہ بولے۔

خود ہی چونے اور جیسے اپنی بات سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔  
"مجھے بہت دکھ ہو رہا ہے۔ نیل بھائی! اور جب ممانیں گی تو کتنی پریشان ہوں گی۔" وہ رو بائی ہوئی۔  
"دکھ اور پریشانی کی بات تو ہے، لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں۔ بہر حال ابھی پھپھو کو معلوم نہیں ہوتا چاہیے۔

تمہاری ٹینشن انہیں کیا کم ہے۔"  
"اور۔ اور کیا کہہ رہی تھی مدحو؟"  
"کچھ نہیں، بس یہی بتایا کہ وہ شادی کر رہی ہے۔"

"مجھے لگتا ہے۔ وہ پاگل ہو گئی ہے یا پھر اسے معلوم ہی نہیں ہو گا کہ میرا معاملہ کورٹ میں چلا گیا ہے۔  
نے پر سوچ انداز میں کہا تو نیل کچھ دیر تک اسے دیکھتے رہے پھر اٹھتے ہوئے بولے۔  
"بس ختم کرو یہ موضوع۔ کہیں پھپھو سنتی ہوئی نہ آ جائیں۔ اور ہاں دیکھو، میں تمہارے لیے ایک کتاب

تھا۔ وہ نیکیے کیس رکھی ہے، لے لو۔"  
اس نے وہیں کھڑے کھڑے کتاب کی طرف دیکھا پھر منہ بنا کر بولی۔  
"میرا کچھ پڑھنے کو دل نہیں چاہتا۔"

"دل چاہے یا نہ چاہے پھر بھی پڑھنی ہے۔ اٹھاؤ اسے۔" انہوں نے رعب سے کہا تو اس نے بڑھ کر  
اٹھائی اور وہیں کھڑے اٹھنے لگی تھی کہ وہ ٹوک کر بولے۔  
"یہاں نہیں آپ نے کمرے میں جاؤ۔ مجھے لیکچر تیار کرنا ہے۔"

"تیار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ ایسے ہی لیکچر دینے میں ماسٹر ہیں۔"  
وہ تپتی ہوئی ان کے کمرے سے نکل گئی تو انہوں نے آہستہ سے دروازہ بند کر دیا پھر آکر لیٹ گئے۔  
کرنے کا تو بہانا تھا۔ اصل میں تنہائی چاہتے تھے۔ حالانکہ جانتے بھی تھے کہ تنہائی کتنی عذاب ہوگی مگر

انیت پسند ہو رہے تھے۔ اپنے جرم پر خود اپنے آپ کو سزا دینا چاہتے تھے۔ مدیہ سے محبت کر کے انہوں  
ہی کیا تھا۔ وہ تو ایسا ہی سمجھ رہے تھے۔ بلکہ شروع سے خود کو سرزنش کرتے آ رہے تھے۔ جانے کیوں وہ  
کے قابل نہیں سمجھتے تھے۔ حالانکہ وہ کوئی بہت اعلا و ارفع اور ناقابل حصول نہیں تھی، لیکن انہیں اپنے

تھی۔ سب سے الگ، سب سے جدا۔ شاید اس لیے کہ نظروں میں سما کر ان کے دل میں اتر گئی تھی اور  
اتر جائیں وہ یوں ہی سب سے الگ، سب سے جدا لگتے ہیں۔ بہر حال اس میں ان کا شعوری عمل دخل  
یوں بھی دل کے معاملے میں کبھی کبھی انسان بالکل بے اختیار ہو جاتا ہے۔ وہ بھی بے اختیار تھے اس

انہوں نے بھی اس کے حصول کی تمنا نہیں کی تھی۔ اپنی محبت کو اس غرض سے پاک ہی رکھا تھا اور  
سوچا کہ وہ ان کی نہیں تو کسی کی نہیں ہو سکتی۔ اس کے برعکس اس کے لیے اچھا ہی سوچتے تھے۔ جب  
کے ساتھ مل گئی ہوئی تھی، تب بھی وہ خوش تھے تو اس خیال سے کہ وہ احمر کے ساتھ خوش رہے گی۔

تمی دامنی کا خیال آتا تو وہ فوراً "سربھٹک دیتے تھے۔  
پھر انہیں احمر کے باہر شادی کر لینے کا دکھ بھی اس کی وجہ سے تھا۔ ایک بار بھی اپنی محبت میں خود  
نہیں سوچا۔ بس اس کے دکھ کا احساس تھا جو وہ اب تک احمر سے ناراض تھے۔

اور اب گو کہ اس نے بہت خوش ہو کر بتایا تھا کہ وہ شاہ تیمور کے ساتھ شادی کر رہی ہے، لیکن انہیں  
لگتا تھا۔ اس لیے نہیں کہ ان کے اندر اسے پانے کی کوئی تمنا جاگ اٹھی تھی، بلکہ انہیں یقین تھا کہ اگر  
دیر یا نہیں ہو سکتی۔ وہ یقیناً "دھوکا کھانے جاری ہے اور یہ سراسر اس کا اپنا عمل، اپنا فعل تھا۔ اس کے

ساتھ ہی خوش رہ سکتی ہے۔ بس اب دیر نہیں کریں خلیل بھائی! س سے پہلے کہ۔۔۔“ احمک بات جاری لائن کٹ گئی۔  
 ”میرے خدا!“ ان کا ریسور والا ہاتھ یوں نیچے گرا جیسے اس میں جان ہی نہ ہو، پھر اپنے کمرے میں بجز گھٹیتے ہوئے آئے تو مدحیہ کے ساتھ احمک کا وہ بھی ان کے ساتھ تھا۔

\*~\*~\*

شاہ تیور اسے پیچھو شہر یانو کے پاس جموڑ کر خود شاہ پور چلا گیا تھا۔  
 اور گو کہ رست باؤس اور کالج کی نسبت وہ پھوپھی کے گھر میں خود کو محفوظ محسوس کر رہی تھی اسے سکون سے سو نہیں سکی۔ رات بھر وقفہ وقفہ سے اس کی آنکھ کھلتی رہی تھی پھر بھی صبح اس نے جلدی دیا اور منہ ہاتھ دھوئے کے بعد کمرے سے نکل کر پیچھو شہر یانو کو ڈھونڈتی ہوئی گول برآمدے میں آئی تو بیٹی سحر رنگین بیاہوں والی چارپائی پر بیٹھی روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے مرغیوں کے آگے ڈال، اسے دیکھا تو قدرے حیرت سے پوچھنے لگی۔

”تم اتنی جلدی اٹھ گئیں؟“  
 ”بس اچانک آنکھ کھل گئی پھر میں نے دوبارہ سونے کی کوشش نہیں کی۔“ وہ کہتی ہوئی چارپائی کے کنارے گئی۔

”آرام سے بیٹھو۔ لمبی پیوگی۔“  
 ”نہیں۔ لمبی نہ چائے۔ سب کے ساتھ ناشتا کروں گی۔“ وہ اس کے سامنے سے روٹی کے ٹکڑے مرغیوں کو ڈالتے ہوئے بولی۔

سحر خاموش رہی تو قدرے توقف سے پوچھنے لگی۔  
 ”پیچھو کب آئیں گی؟“  
 ”امی تو ان کے وقت ہی اٹھ جاتی ہیں۔ ابھی قرآن شریف پڑھ رہی ہیں۔ پھر پہلے احمد اور حسن کو گی اس کے بعد ہماری باری آئے گی۔“ سحر یہی کہتی تھی کہ وہ ناشتے کی وجہ سے پیچھو کا پوچھ رہی ہے؟

پورا پروگرام بتا ڈالا۔ تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔  
 ”ہماری باری نہ بھی آئے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔“  
 ”کیوں تم ناشتا نہیں کرتیں؟“  
 ”کبھی کرتی ہوں، کبھی نہیں۔ ویسے جب سے یہاں آئی ہوں۔ میرا مطلب ہے شاہ پور تو بلی کر جاتی ہیں۔“ اس نے کہا اور شہر یانو کو آتے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”السلام علیکم پیچھو!“  
 ”جیتی رہو۔ بیٹھو کھڑی کیوں ہو گئیں۔ یا اگر ناشتا کرنا چاہو تو احمد حسن۔“  
 ”نہیں پیچھو! میں آپ کے ساتھ کروں گی۔“ وہ فوراً ”کہہ کر بیٹھ گئی۔“  
 ”اچھی بات ہے۔“ شہر یانو آگے بڑھ گئیں تو سحر اسے متوجہ کر کے پوچھنے لگی۔  
 ”سنو رات شاہ تیور تارے تھے کہ بابا جان تم دونوں کی شادی کر رہے ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟“

اس نے اثبات میں سر ہانے پر اکتفا کیا۔  
 ”لیکن تمہاری امی اس شادی کو تو مان نہیں رہیں۔ وہ جو تمہاری بہن کی ہوئی ہے۔ ر کر رہیں۔“  
 ”میرا خیال ہے میری شادی کے بعد مہما صبا کی رخصتی پر آمادہ ہو جائیں گی۔“ اس نے یقین سے پوچھنے لگی۔

ماری شادی پر آمادہ ہو گئیں؟“

”یہاں نہ ہوں میں تو آمادہ ہوں۔“ وہ اپنی بات پر خود ہی ہنسی۔

”یہ دیکھ رہی تھی جیسے اسے سمجھ نہ پاری ہو۔“

”ہیں یہ بات عجیب کیوں لگ رہی ہے۔ میری شادی کا فیصلہ میرے دادا نے کیا ہے اور میں ان کے فیصلے سے ڈوں۔ جس پر مہما کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے اور اگر اعتراض کریں تب بھی بابا جان کے نزدیک میری خوشی مہمہ میں شاہ پور میں رہنا چاہتی ہوں اور مجھے شاہ تیور پسند ہیں۔“

”ماری نا سمجھی پر تعجب کا اظہار کرنے کے بعد وضاحت کر رہی تھی کہ اپنے پیچھے آہٹ محسوس کر کے خاموش برزوا سی گردن موڑی تھی کہ شاہ تیور سامنے آگیا۔ اس کے ہونٹوں میں دلی دنگش مسکراہٹ دیکھ کر وہ سمجھ رہی تھی کہ اس کی آخری بات سن چکا ہے۔ پھر بھی انجان سی ہنسنے کی کوشش کرنے لگی۔ تو وہ براہ راست اس کی باتیں دیکھ کر بولا۔

”باکھ رہی تھیں ذرا پھر سے کہو۔“

”یہاں بات دہرایا نہیں کرتی۔“ وہ ایک اداسے کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”یہاں کہاں رہی ہو؟“ شاہ تیور نے فوراً ”آگے آکر اس کا راستہ روکا تو وہ مسکرا کر بولی۔

”ہیں میں ڈائننگ ہال تک۔“ پھر لیٹ کر سحر سے مخاطب ہوئی۔ ”چلو سحر! ناشتا کر لیں۔“

”ہماسو ناشتے کے بعد کیا پروگرام ہے۔ میرا مطلب ہے میں رہنے پر جا رہا ہوں۔ اگر چلنا چاہو تو۔“

”میں میں آج پیچھو کے پاس رہوں گی۔ رات تو وہ جلدی سو گئی تھیں۔ میری ان سے زیادہ بات ہی نہیں اس نے سہولت سے منع کرتے ہوئے کہا تو شاہ تیور کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگا۔

”اٹھک ہے۔ تم ابھی ایک دو دن نہیں رہو بلکہ جب تک تمہارا دل چاہے۔“

”دل کی بات نہ کریں۔ دل تو بتاتا نہیں کیا کیا چاہتا ہے۔“ وہ کہتی ہوئی آگے بڑھ گئی تو اس کے پیچھے دیکھتے

اتھ پور ذرا سے کندھے اچکا کر مسکرایا پھر سحر کو اپنے جانے کا کہتا کر وہیں سے باہر نکل گیا تھا۔

کہ شہر یانو کا رویہ اس کے ساتھ لیا دیا تھا۔ اس کے باوجود ناشتے سے فارغ ہوتے ہی وہ اسے گھر کر بیٹھ گئی

بریک یوں ہی ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی ساتھ لگاؤ کا مظاہرہ بھی کیا۔ جس سے شہر یانو کی سرد مہری

ناکھی۔ وقفہ وقفہ سے بے اختیار ہو کر کبھی اس کا گل جھوٹی، کبھی پیار سے ہاتھ ہاتھوں میں لے لیتی اور

نا سے بھی اظہار کر دیا۔

”بہت پیاری بیٹی ہو۔ اگر بابا جان تمہیں تیور کے ساتھ منسوب نہ کر چکے ہوتے تو میں تمہیں ہمیشہ کے لیے

ن لے لیتی۔“ وہ ان کا مطلب سمجھ کر شرمائی تو شہر یانو نے اسے گلے لگا کر پیار کیا پھر پوچھنے لگی۔

”خوش ہوتا؟“

”لیکن مجھے ڈر بھی لگ رہا ہے۔“ اس نے اپنے ناخنوں سے کھیلے ہوئے کہا۔

”ہاؤ ڈر کریں لگ رہا ہے۔ تیور ماشاء اللہ بہت اچھا بہت محبت کرنے والا لڑکا ہے۔“

”لیکن۔“ وہ چٹکائی۔

”نہ کیا؟ کہو بیٹی! جو بھی بات ہے کہہ ڈالو۔ کیوں ڈرتی ہو۔“ شہر یانو نے بہت اچانکیت سے کہا۔

”ناخنوں پیچھو! اصل میں امی کے ساتھ جو کچھ ہوا۔ وہ کہتی تھیں، اگر ہم شاہ پور گئے تو ہمارے ساتھ بھی

میں سوچ کر ڈرتی ہوں۔“ اس نے رک رک کر اپنے ڈرنے کا سبب بتایا تو شہر یانو فوراً ”بولی تھیں۔“

”سے نہیں بیٹا! تمہارے ساتھ ایسا کیوں ہو گا۔ تم اور صبا تو اس گھر کی بیٹیاں ہو اور اپنی بیٹیوں کے لیے

مکے پرے تخت اصول ہیں۔“

تو کہیں فوراً چلا گیا اور چند لمحوں بعد ہی علی جاگ کر اٹھا۔  
 غائب ہو گئے تھے تم؟ انہوں نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے اسے دیکھا۔  
 میں تھا بچا جان! علی جاگ کر ان کے پاس آ بیٹھا اور ہاتھ میں پکڑ لیا کہ ان کے سامنے کر دیا۔  
 یا ہے؟ انہوں نے لفافہ لیتے ہوئے پوچھا۔  
 چوہہ کھ لیں۔

ن نے چائے کا کپ رکھ کر لفافے میں سے پیپر نکال لے اور پھر تحریر پر نظریں دوڑاتے ہوئے ان کی پیشانی پر  
 کا خیال نہ کیا تھا۔

ناگہ بغور انہیں دیکھ رہا تھا۔ آخر میں ان کے ہونٹ بھیپنے پر کہنے لگا۔  
 ایسا نہیں چاہتا بچا جان! اور صبا بت بھی نہیں چاہتی۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس اقدام کے  
 مجبور کیا گیا ہے۔

ثبوت ہے تمہارے پاس؟ انہوں نے سوچتے ہوئے انداز میں پوچھا تھا۔

ی محبت۔ وہ کہہ کر ہونٹ بھیچ گیا۔

مکندہ جو تک کر دیکھنے لگے تو قدرے توقف سے مزید گویا ہوا۔

چاہیں تو صبا بت سے تصدیق کروا سکتے ہیں۔ میں کسی پلاننگ کے تحت اس کی زندگی میں داخل نہیں ہوا  
 نے اس وقت ایک دوسرے کو پسند کیا جب ہم ایک دوسرے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے اور تب  
 تھا مجھے بھی آپ کی طرح سب کی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑے گا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ کیونکہ بابا جان نے  
 ات میں ہی جان لیا تھا کہ وہ آپ کی بیٹی ہے۔

جان نے۔ وہ کسی طرح اپنی حیرت نہیں چھپا سکے۔ وہ کب کہاں ملے تھے صبا بت سے؟

اں اسی گھر میں۔ اتفاق سے جس روز وہ آئی تھی بابا جان یہیں موجود تھے اور یہ جاننے کے بعد کہ وہ آپ کی  
 انہوں نے مجھے منع کیا تھا کہ میں اسے اپنے بارے میں کچھ نہ بتاؤں۔

کی تفصیل بتا رہا تھا اور شاہ سکندر کا ذہن کہیں اور بھٹک گیا۔ جب بابا جان نے ایک دن اچانک انہیں بلا کر  
 کہہ ڈاکٹر آسیہ کے پاس ان کی کوئی اولاد ہے اور اگر ہے تو اسے اس کا حق ملنا چاہیے۔ اس وقت وہ کتنے  
 گائے تھے کہ پتا نہیں آسیہ کے پاس کا بیٹا ہے یا بیٹی۔ جبکہ بابا جان جانتے تھے اور باقاعدہ اسے لانے کا پلان  
 بناتے تھے۔

پاکیا سوچنے لگے چچا جان؟ میرا یقین کریں میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں صبا بت کے ساتھ اتنا ہی فیئر ہوں  
 آپ کے ساتھ۔ علی جاگ کر نے عاجزی سے ٹوکتے ہوئے کہا۔

ا۔ انہوں نے اسی سوچتے ہوئے انداز میں ہوں کی آواز نکالی پھر سگارا اٹھا لیا اور اسے سلگانے کے بعد  
 علی جاگ کر کو دیکھ کر پوچھنے لگے۔

ہم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟

ماچا ہوتا ہوں، آپ ایک بار ڈاکٹر آسیہ سے ملیں۔ انہیں بتائیں کہ صبا بت اور میں۔۔۔ وہ روانی سے بولتا  
 خاموش ہو گیا۔

ہم سے پہلے میں صبا بت سے بات کرنا چاہوں گا۔ تمہارے پاس اس کا نمبر تو ہو گا؟ انہوں نے جب سے  
 لے ہوئے پوچھا اور جو لفافہ وہ لایا تھا اس پر نمبر لکھنے کے بعد اسے جانے کا کہا تو وہ کچھ جربز سا ہو کر کمرے  
 لیا تھا۔

مکندہ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد اپنے موبائل پر نمبر پیش کیے تھے۔

لپا رہیو اور اٹھنے کے ساتھ ہیلو کی آواز آئی تھی۔

”جی میں نے سنا ہے کہ وہ اپنی بیٹیاں غیروں میں نہیں رہا ہے۔“  
 یہ حقیقت ہے اور جو کچھ تمہاری ماں نے تم سے کہا۔ اس پر میں یہی کہوں گی کہ وہ عورت اپنی جگہ سمجھ  
 اس کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کے بعد وہ تمہارے سامنے شاہ پور والوں کی کوئی اچھی تصویر تو پیش نہیں کرنا  
 تھی۔ یقیناً اس نے تمہیں ڈرایا ہو گا۔ اس لیے تمہارے اندر خوف ہے۔“ شہرانا نے کچھ غیر جانب دار  
 مظاہرہ کرتے ہوئے کہا تو وہ تائید کرتے ہوئے بولی۔

”جی، اور بے بنیاد تو نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے۔ بابا بھی تو بہت اچھے بہت محبت کرنے والے انسان ہیں  
 بھی انہوں نے مہم کو طلاق دے دی تھی۔“

”اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اگر بابا جان تمہاری ماں کو طلاق نہ دلاتے تو یہاں دو گھر برباد ہو جاتے  
 شہرانا کے ایک ہی جملے سے ان ساری باتوں کی تصدیق ہو گئی تھی جو اسے شاہ تیور نے بتائی تھیں۔

”ہاں۔“ اس نے ماں کی صورت گہری سانس کھینچی۔  
 ”میری بات سمجھ گئی ہو نا۔ علی اور تیور کے ساتھ وہ مسئلہ نہیں ہے جو تمہارے باپ کے ساتھ تھا۔ بابا جان  
 جتنی محبت تمہارے باپ کو واپس لانے میں کرنی پڑی تھی اس سے زیادہ تمہارے اور صبا کے حصول کے لیے

پڑ رہی ہے۔ صرف اس لیے کہ ہمیں شاہوں کی بیٹیاں غیروں میں نہ چلی جائیں۔ تم اپنے دل سے سارے  
 سارے خوف نکال دو۔ تمہارے اور صبا کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ بلکہ بہت خوش رہو گی تم یہاں۔“  
 ”میں ابھی بھی بہت خوش ہوں۔“ اس نے خوشی کا اظہار شہرانا کے گلے میں بازو ڈال کر کیا تھا۔

\*...\*

ٹھیک دسویں دن شاہ سکندر کی واپسی ہوئی تھی اور اپنے استقبال کے لیے آنے والوں میں علی جاگ کر کو دیکھ  
 کچھ مشکوک تھے۔ حالانکہ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی، البتہ اس کے چہرے پر سنجیدگی غیر معمولی تھی  
 انہوں نے پہلی نظر میں ہی محسوس کی اور اس سے بغل گیر ہوتے ہوئے پوچھا۔

”سب خیریت ہے نا؟“

”جی! اس وقت وہ یہی جواب دے سکتا تھا، پھر فوراً پوچھنے لگا۔

”اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟“

”دو تین روز کے لیے شاہ پور جاؤں گا اس کے بعد۔“

”نہیں چچا جان!“ وہ فوراً بول پڑا۔ ”آج آپ میرے مہمان ہوں گے۔ میں اسپیشلٹی۔ آپ کو بلے  
 ہوں۔“

”کوئی خاص بات؟“ انہوں نے کھوجتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔  
 ”جی! علی جاگ کر نے جی کہہ کر ہونٹ بھیچ لیے تو انہوں نے مزید کچھ نہیں پوچھا۔ اسے ساتھ آنے کا

کر کے باہر نکلے اور پھر پہلے اپنے ساتھیوں کو رخصت کیا اس کے بعد اس کی گاڑی میں بیٹھے تھے۔  
 تمام راستہ انہوں نے قصداً ”کچھ پوچھنے سے گریز کیا تھا اور گھر آ کر علی جاگ کر نے چاہتا تھا کہ وہ کچھ  
 کر لیں اس کے بعد بات کرے گا۔ اس لیے انہیں خاص ان کے لیے مخصوص کیے گئے بیڈ روم میں جا کر

چائے کا کمنے کے بہانے نکل گیا تھا۔  
 شاہ سکندر ایک سگارا پیتے تک بیٹھے پھر شاور لینے کے ارادے سے واش روم کا رخ کیا۔

کچھ دیر بعد جب وہ شاور لے کر نکلے تو کہیں تو کہیں گئے کے ساتھ موجود تھا۔ انہوں نے چھوٹے ہی پوچھا۔  
 ”علی کہاں ہے؟“

”جی اپنے کمرے میں۔“  
 ”وہاں کیا کر رہا ہے۔“

”جی جو اسے میرے پاس۔“ وہ اب مزید صبر نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے قدرے درشت

”مجھے صباحت سے بات کرنی ہے۔“ انہوں نے اپنا سارا دھیان دوسری طرف رکھ کر کہا۔  
 ”جی آپ کون؟“ ادھر سے پوچھا گیا۔ آواز بالکل مدیحہ جیسی تھی۔ وہ سمجھ گئے صباحت ہی ہے۔ کیونکہ مدیحہ  
 آپ کون کا سوال نہیں اٹھا سکتی تھی۔  
 ”بیٹا صاحب! میں ہوں شاہ سکندر حیات۔“ انہوں نے بڑی محبت سے اس کا نام لے کر کہا۔  
 دوسری طرف ایک دم خاموشی چھا گئی۔ پتا نہیں وہ کس کیفیت میں گھبرائی تھی۔ وہ سمجھ نہیں سکے اور چند لمحوں  
 رک کر ایک بار کرکے نکلے۔  
 ”بیٹا! مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ آپ سن رہی ہو نا؟“

کوئی جواب نہیں آیا۔  
 ”صبا! خاموش مت رہو بیٹا۔ میں بہت جلد آپ کے پاس آؤں گا۔ اس وقت مجھے صرف ایک بات کا جو ار  
 د ہے۔ یہ جو قطع کا نوٹس آپ نے بھجوا دیا ہے۔ کیا اس میں آپ کی مرضی شامل ہے؟“  
 بہت ہلکی سی آواز آئی تھی۔ جیسے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر سسکی کو دیا گیا ہو۔  
 ”آپ رو رہی ہو؟“ انہوں نے بہت بے چین ہو کر فوراً پوچھا تھا۔

ادھر سے سلسلہ منقطع ہو گیا۔  
 ”ہائی گاڈ!“ انہوں نے موبائل آف کر دیا اور اس کے رونے کا سبب سوچنے لگے، لیکن کچھ دیر بعد ہی ان کا ذہن  
 اس سے آگے کی سوچنے لگا تھا اور پھر وہ اسی وقت آسیر کے پاس جانے کے لیے تیار ہو گئے۔  
 شام کے سات بج رہے تھے جب انہوں نے ڈاکٹر آسیر کے روم کے کھلے دروازے پر ہلکے سے دستک  
 تھئی۔

آسیر ایک خاتون کا بلڈ پریشر چیک کر رہی تھی۔ دستک کی آواز پر ادھر متوجہ ہوئی اور انہیں دیکھ کر ہنسنے  
 کے ساتھ پیشانی پر بل ڈال کر قدرے ناگواری سے بولی۔

”آپ پلیمز باہر انتظار کریں۔“  
 وہ ان سنی کر کے آگے بڑھ آئے اور بڑے آرام سے اس کے سامنے والی کرسی کھینچ کر بیٹھ بھی گئے تو آسیر  
 تماشا کرنے کے خیال سے جلدی جلدی خاتون کو چیک کر کے میڈیسن لکھ کر اسے تھما کر جانے کا اشارہ کر دیا۔  
 ”سنسن! باقی مریضوں سے کہہ دیں کہ ڈاکٹر صاحب ایک ایمرجنسی کے سلسلے میں باہر جا رہی ہیں۔ اس لیے ا  
 کل دیکھیں گی۔“ خاتون کے جاتے ہی شاہ سکندر نے سنسن کو مخاطب کر کے کہا تو وہ آسیر کو دیکھنے لگی۔  
 آسیر نے ناچار سنسن کو جانے کا اشارہ کیا پھر چیر کی بیک سے کمر نکاتے ہوئے بولی۔

”میں کہیں نہیں جا رہی۔“  
 ”اچھی بات ہے۔“ شاہ سکندر اٹھ کر دروازے کے پاس گئے اور ایک نظریا ہر دیکھنے کے بعد دروازہ بند کر  
 آسیر کی طرف پلٹے تو وہ بہت ضبط کرتے کرتے بھی چیخ پڑی۔

”شاہ سکندر حیات! آپ بہت غلط کر رہے ہیں۔“ وہ کہتے ہوئے دوبارہ اسی جگہ آ بیٹھے۔  
 ”اب تک جو کچھ میرے ساتھ ہوا تارباہ بہت ٹھیک تھا؟“ وہ کہتے ہوئے دوبارہ اسی جگہ آ بیٹھے۔  
 ”مجھے نہیں معلوم آپ کے ساتھ کیا ہوا اور نہ میں جانتا چاہتی ہوں۔ آپ پلیمز صاف لفظوں میں اپنے  
 مقصد بیان کریں اور۔“

وہ روانی میں بولتی ہوئی ہونٹ بھیجنے لگی تو وہ کچھ دیر تک اس پر نظر نہیں جمائے خاموش بیٹھے رہے پھر نہ  
 لفافہ نکال کر اس کے سامنے بھینکتے ہوئے بولے۔  
 ”جب میں نے آپ سے کہا تھا کہ صباحت کے بارے میں آپ خود سے کوئی فیصلہ نہیں کریں گی پھر نہ  
 نوٹس کیوں بھجوا دیا؟“

”لیے کہ مجھے یہ رشتہ قائم نہیں رکھنا۔“ وہ ہٹو ہٹو سے بولی تھی۔  
 ”صباحت! وہ کیا چاہتی ہے؟“ انہوں نے جھپٹتے ہوئے لمبے میں پوچھا۔  
 ”اگر ہے اس کی مرضی سے۔“

”نہیں۔“ وہ فوراً ”نوٹ“ گئے۔ ”اس کی مرضی آپ کو معلوم ہی نہیں ہے ڈاکٹر آسیر! آپ خود جو کچھ کرنا  
 میں اس پر زبردستی محبت سے یا کسی بھی طرح اسے راضی کر لیتی ہیں۔ یہ جاننے کی آپ نے کبھی ضرورت ہی  
 مجھی کہ اصل میں وہ کیا چاہتی ہے۔“

”ماف۔“ کیجئے گمشادہ سکندر! میں اپنی بیٹی کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ بہت نیک سعادت مند اور محبت  
 والی بچی ہے۔ اس نے کبھی میری کسی بات سے اختلاف نہیں کیا اور اس معاملے میں تو اس نے شروع ہی  
 را اختیار مجھے سوچ دیا تھا کہ میں جو چاہوں فیصلہ کروں۔“ آسیر نے صباحت کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔  
 ”تو خوب اس محبت کرنے والی بچی کی سعادت مندی کا یہ صلہ دیا آپ نے اسے کہ اس کے دل کی بہتی  
 نے کا سامان کر دیا۔“ وہ طنز آمیز لمبے میں بولے تھے۔  
 ”مطلب ہے آپ کا؟“ آسیر کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

”نہ آپ کی بے خبری پر افسوس ہے ڈاکٹر آسیر! میرا تو خیال تھا۔ ماں ہونے کے ناطے آپ بیٹیوں سے بہت  
 دران کی ہر بات سے آگاہ ہوں گی اور یہ بھی جانتی ہوں گی کہ صباحت اور علی جہاگیر ایک دوسرے کو پسند  
 ہیں۔“ انہوں نے تاسف کے اظہار کے ساتھ کہا تو آسیر کی پیشانی کی شکنوں میں مزید اضافہ ہو گیا لیکن  
 انہیں۔

”رحال میں آپ کو آگاہ کر رہا ہوں۔ اس کے بعد یہ کہوں گا کہ جو ظلم آپ نے اپنے ساتھ کیا وہ صباحت پر  
 دنا چاہیے۔“ ان کے انداز میں وارننگ تھی۔

”آپ سے کس نے کہا کہ میں نے اپنے ساتھ ظلم کیا تھا۔ نہیں شاہ سکندر حیات! میں زندگی میں کبھی نہیں  
 اور میری بیٹی بھی نہیں پچھتائے گی۔ ابھی ہو سکتا ہے اسے دکھ ہو اور میرے اس فیصلے کو ظلم سمجھ رہی ہو  
 تھ وقت گزرنے کے بعد وہ سمجھ جائے گی کہ میں نے اس کے ساتھ ظلم نہیں کیا تھا بلکہ آنے والے مظالم  
 لیا تھا۔“ وہ ان کی وارننگ پر تیز ہو کر بول رہی تھی۔

”در شاہ سکندر حیات! آپ کیوں اپنی بیٹی کے دشمن ہو رہے ہیں۔ بھتیجی کی محبت میں بیٹی کو نظر انداز کر رہے  
 صرف اس لیے کہ اس نے میری کوکھ سے جنم لیا۔“

”خاموش ہو جائیں آسیر! انہوں نے غصے سے ٹوکا تو وہ نوزاسی لمبے میں بولی۔  
 ہل چک نہیں سن سکتے۔“

”ٹائی سننا چاہتا ہوں سچ ہی کہنا چاہتا ہوں اور سچ ہے کہ میں آج بھی آپ سے محبت کرتا ہوں۔“ جانے  
 ماہذبہ اچانک غالب آکر انہیں بے اختیار کر گیا تھا پھر فوراً ”ہونٹ بھیجنے گئے۔“

”براؤں میں آگئی تھی۔“  
 ”اٹ دو! یہ کس موڑ پر لے آئی تھی۔“

ضبط کا عہد بھی ہے، شوق کا پیاں بھی ہے  
 عہد و پیاں سے گزر جانے کو جی چاہتا ہے  
 درد اتنا ہے کہ ہر رگ میں ہے نحر برپا  
 اور سکون ایسا کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے  
 کتنے لمحے بہت حیران ہو کر ان ساکت وجودوں کو دیکھ رہے تھے۔ جن کے دل ایک ہی لے پر دھڑک رہے  
 ٹکٹن کتنے بے بس تھے دونوں کے درمیان میں۔ جانشین خلیفہ عبور کرنے کا حوصلہ کر بھی لیتے تب بھی ایک

۔ بڑی مشکل سے خود کو کچھ کہنے سے باز رکھا۔

”تم روری ہو؟“ فیمل نے آہستہ سے اس کے منہ پر سے تکیہ ہٹایا اور جل تھل کا سماں دیکھ کر پریشان ہو گئے۔  
”صبا! کیا ہو گیا ہے۔ کیوں اس طرح روری ہو؟“ انہوں نے پہلے نرمی سے پوچھا پھر اسے جھنجھوڑا لا تو وہ جیج کر

”میری مرضی، میرا دل چاہ رہا ہے رونے کو۔ اور اس سے آپ کا کیا بگڑ رہا ہے۔ خواہ خواہ پریشان ہو رہے ہیں۔  
مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔“

”یہی تو مشکل ہے کہ تم ایسا نہیں کر سکتا۔“ وہ اس کے چیخنے پر حیران ہوتے ہوئے بولے تھے۔  
”کوئی مشکل نہیں ہے۔ اپنے کمرے میں جا کر آرام سے بیٹھ جائیں۔“ وہ دوپٹے سے آنکھیں اور ناک صاف  
تے ہوئے بولی۔

”آرام سے۔“ ان کی ذرا سی ہنسی میں دکھ تھا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولے۔ ”چلو منہ دھو کر آؤ۔  
پو آنے والی ہوں گی۔“

”تو آجائیں، ان کے سامنے کیا میں نہیں رو سکتی۔“

”کوئی وجہ بھی ہو رونے کی۔“  
”ضروری نہیں ہے۔ بس مراد دل چاہ رہا ہے اور آپ پلیز مجھے منع نہیں کریں۔“ اس نے پھر لٹ کر تکیہ منہ پر  
لایا تو فیمل ابھ گئے کہ آخر ایسی کیا بات ہو گئی ہے جو وہ ان سے چھپا رہی ہے۔ گواہیں یقین تھا کہ کوئی بات ہوئی  
نہر ہے کچھ دیر تک قیاس کرتے رہے۔ زیادہ گمان یہی تھا کہ علی جمائیکر کا فون آیا ہو گا اور اسی نے کوئی ایسی  
بات کہی ہے جس سے وہ ہرٹ ہوئی ہے یا پریشان ہو کر روری ہے۔ اور یہ طے تھا کہ اس وقت وہ کچھ نہیں بتائے  
ہیں۔ اس لیے انہوں نے مزید اصرار کا ارادہ ترک کر دیا اور اسے مخاطب کر کے بولے۔

”سو، میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں لیکن آرام سے نہیں بیٹھوں گا۔ یہ تم بھی اچھی طرح جانتی ہو۔ اس لیے  
رونے سے دل بھر جائے تو میرے آرام سے سونے کا خیال کر لینا۔“ اپنی بات ختم کرتے ہی وہ اس کے کمرے  
نکل گئے۔

”ہرگز نہیں۔ اب میں کسی کا خیال نہیں کروں گی۔ ماما کا بھی نہیں۔“  
”جو کبھی کسی سے ناراض نہیں ہوتی تھی، سب سے ناراض ہو کر سوچنے لگی تھی۔ بے سرو پا سوچیں تھیں جو  
، ہر احساس سے عاری کر رہی تھیں۔ اور اس سے پہلے کہ کوئی ایک احساس بیدار ہوتا، فینڈ نے اسے اپنے  
ہستے بھی غافل کر دیا تھا۔

بلکہ ادھر فیمل اس کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ ہمیشہ کی طرح کچھ دیر میں ہی وہ ان کے پیچھے  
نائے گی اور کھڑے کھڑے ایک ہی سانس میں اپنے رونے کا سبب بتا کر کہے گی۔ اب بہت خراب ہیں فیمل  
نے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ کچھ دیر نہیں بہت دیر ہو گئی۔ تب فیمل تشویش میں مبتلا ہو گئے اور کسی طرح رہا نہیں  
تھیں۔ اس کے کمرے میں آگئے۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ انہوں نے آہستہ آواز میں ایک دوبار پکارا کہ شاید بچی  
نہیں بیدار ہو جائے، لیکن اس پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ تب اس کے پاس بیٹھے ہوئے انہوں نے بغور اس کا چہرہ  
نہل اس کی پکیوں پر موتی چمک رہے تھے اور گالوں پر ٹیکریں سی بن گئی تھیں۔

”یہ رونا بے سبب تو نہیں ہو سکتا۔“  
”میں جیتھیا“ بہت دکھ ہو رہا تھا۔ بہت احتیاط سے اس کے دوپٹے سے اس کا چہرہ صاف کیا پھر اٹھتے ہوئے بے  
ناراض کی پیشانی چوم لی۔ اس سارے جہاں میں ایک وہی تو تھی جس کے ساتھ وہ دکھ سکھ شیئر کرتے تھے اور  
ایک ذرا سی تکلیف انہیں اپنے دل پر محسوس ہوتی تھی۔ وہ کچھ دیر اس کے چہرے پر نظریں جمائے کھڑے رہے  
پہاں اکر علی جمائیکر کے نمبر اکاؤنٹ پر گئے۔

دوسرے تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔  
”آئی ایم سوری۔ میں نے آپ کا بہت وقت خراب کیا۔“ کتنی دیر بعد شاہ سکندر بولنے کے قابل ہوئے تو  
معذرت کرتے ہوئے کہنے لگے۔

”ہم کر کریں تو ایک بار اور میرا اعتبار کر لیں۔ میرے پیش نظر پہلے بھی صحبت کی بہتری تھی اور ابھی بھی میں  
اس کا خیال کر کے آیا ہوں۔ آپ کی خاطر وہ علی سے نا آتا تو نے پر آتا تو ہو گئی ہے، لیکن اس کے بعد وہ خوش رہتا تو  
دور کی بات، زندہ بھی نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ وہ آپ کی طرح بہادر نہیں ہے۔ مجھے مدد دینے سے تباہ تھا کہ وہ بہت  
بزدل ہے۔ ایسی صورت میں تو آپ کو اس کا اور خیال کرنا چاہیے۔ میں ابھی بھی آپ کو فورس نہیں کر رہا، بلکہ  
درخواست کر رہا ہوں کہ اگلا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے میری باتوں پر غور ضرور کیجیے گا اور بالکل غیر جانبدار  
ہوں۔“

وہ اپنی بات ختم کر کے اٹھ کھڑے ہوئے تو آسیہ کے سینے سے بے اختیار گرمی سانس خارج ہوئی، پھر کچھ ناراض  
لہجے میں بولی تھی۔

”میں کچھ نہیں سوچ سکتی جب تک مدد میرے پاس نہیں آ جاتی۔“  
”مدد!“ وہ بری طرح چونکے لیکن خود کو مزید کچھ کہنے سے روک بھی لیا۔ جبکہ ان کا ذہن تیزی سے سوچنے  
تھا۔

”جی، شاہ جمائیکر کی دھمکی کے بعد میں اس کی طرف سے بہت فکر مند ہوں اور صحبت کا فیصلہ بھی اس دھم  
کا مہم ہون منت ہے۔ میں کیسے اس گھر میں اپنی بیٹی دے سکتی ہوں جہاں اس کی سلامتی کی کوئی ضمانت نہیں۔  
سوچتے ہوئے انداز میں بول رہی تھی۔ میں ابھی شاہ پور جا رہا ہوں اور کل انشاء اللہ مدد کو ملے آ  
دیں ہوں نا ان کا باپ۔ آپ فکر نہیں کریں۔ میں ابھی شاہ پور جا رہا ہوں اور کل انشاء اللہ مدد کو ملے آ  
گا۔“

انہوں نے بہت سنبھل کر اسے اطمینان دلایا اور خدا حافظ کہہ کر ہانکے تو ان کا اپنا اطمینان رخصت  
تھا۔ وہ یہ بھی بھول گئے کہ علی جمائیکر کس شدت سے ان کا انتظار کر رہا ہو گا۔ صرف مدد کا خیال تھا جو دیر  
گاڑی شاہ پور کے راستے پر ڈال دی تھی۔

\*\*\*~\*\*\*~\*\*\*  
اس کے اندر بھی شاہ سکندر کو دیکھنے اور ان سے ملنے کی آرزو تھی۔ لیکن اس نے کبھی مدد کی طرح  
نہیں کیا تھا۔ بلکہ اسے بھی اظہار سے روکتی تھی۔ کیونکہ اسے آسیہ کا خیال تھا اور اسے دکھ دینے کا وہ سو  
نہیں سکتی تھی۔ اس لیے باپ سے فطری محبت کو اس نے ہمیشہ دیا تھا اور اس کے لیے اسے زیادہ تردد نہ  
پڑتا تھا۔ بس ایک سوچ ہی کافی تھی کہ اس شخص نے اس کی ماں کو دکھ دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ان  
بھرا تاتا اور محبت جانے کن کوئے کھدروں میں جا بھیجتی، جو اگر کبھی سراجا رہی بھی تو اس کی بڑی اسے تھکے  
کر سادتی تھی۔ لیکن ابھی شام میں شاہ سکندر نے فون کر کے جس محبت سے اسے مخاطب کیا تھا اس سے  
بری طرح بکھری تھی کہ اس کے بعد سے اب تک خود کو سنبھالنے میں ناکام ہو گئی تھی۔ آٹھ بجوان کی آوا  
جھلکے تھے، اتنا وقت گزرنے کے بعد بھی ان کی شدت میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ  
باندھنے کی اس نے کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ البتہ چیخوں کو روکنے کے لیے اس نے منہ پر تکیہ رکھ لیا تھا  
آٹھ بجے کے قریب فیمل آئے اور حسب عادت پہلے اس کے کمرے میں بھانکا تو اسے بے وقت  
میں منہ چھپائے دیکھ کر کچھ ہنسنے لگے۔ پھر پکارتے ہوئے اس کے سر پر آکھڑے ہوئے۔

”صبا! کیا ہوا بیٹا!“  
اسے زندگی میں پہلی بار فیمل کی آمد بہت بری لگی تھی۔ دل چاہا سارے لحاظ بھلا کر انہیں چلے  
468

اُدھر سے پہلی بیل کے ساتھ ہی جس طرح ریسو راٹھایا گیا اس سے یہی لگا جیسے وہ فون کے انتظار میں بیٹھا تھا۔  
 ”میں ہوں نیل۔“ انہوں نے اس کی بیلو کے جواب میں کہا تو اس بار اس کا انداز مایوسی لیے ہوئے تھا۔

”جی فرمائیے۔“

”مجھے یہ پوچھنا ہے کہ شام میں آپ کی صباحت سے کیا بات ہوئی تھی؟“ انہوں نے بغیر کسی تمہید کے اور بڑے یقین سے پوچھا۔

”میری۔“ علی جمالی کی حیرت بھری آواز پر وہ زردے کر بولے۔

”جی آپ کی۔“

”جی نہیں، میری صباحت سے بات نہیں ہوئی۔ البتہ چچا جان نے فون کیا تھا۔“

”چچا جان؟“

”شاہ سکندر حیات کیوں خیریت؟“ علی جمالی نے نام تکرار فوراً ”پوچھا۔ لیکن وہ شاہ سکندر کا نام سنتے ہی ایک دم خاموش ہو گئے اور فون بھی رکھ دیا۔ کیونکہ مزید کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ صباحت کا رونا ان کی سمجھ میں آگیا تھا اور اس کا سبب نہ بتانا بھی حیرت انگیز نہیں رہا تھا۔ کیونکہ دو سال پہلے طویل مدت بعد جب وہ اپنی ماں سے ملے تھے تو ان کی بھی یہی کیفیت تھی اور انہوں نے تو ابھی تک کسی کو نہیں بتایا تھا کہ وہ شام میں یونیورسٹی کے بعد اپنی ماں کے پاس چلے جاتے ہیں۔ جہاں ان کے دو بہن بھائی اور بھی ہیں۔ جو ان سے اسی طرح ملتے ہیں۔ جیسے اپنی اولادیں۔ سمیر، راجا اور موم۔

”کتنے چائے والے ہیں ہمارے پھر بھی ہم اکیلے ہیں۔“ انہوں نے صباحت کے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا پھر اپنے کمرے میں آکر آرام سے بیٹھ گئے تھے۔

\*~\*~\*

شاہ سکندر رات بارہ بجے کے بعد شاہ پور پہنچے تھے اور باباجان کے آرام کا خیال کیے بغیر اسی وقت سیدھے ان کے کمرے میں چلے آئے۔ زیر پاؤں کی مدھم مدھم روشنی میں باباجان پتا نہیں سو رہے تھے یا یوں ہی آنکھیں بند کیے لیے تھے۔

”باباجان!“ سکندر نے انہیں ہلکانے کے ساتھ ٹیپ لائٹ کاٹھن آن کر دیا۔

باباجان نے ذرا سی آنکھیں کھولیں اور انہیں دیکھ کر ٹکیے سے سرواٹھا کرتے ہوئے بولے۔

”نم سکندر! ابھی آرہے ہو؟“

”مدیہ کہاں ہے؟“ شاہ سکندر نے ان کی بات سیکر ان سنی کر کے پوچھا۔ سرے ہوئے سرواٹھے میں جیسے کوئی طوفان چھپا تھا۔

باباجان ایک لمحہ کو ٹھٹھکے پھر فوراً ”انجان بن گئے۔“

”کون؟“

”مدیہ، میری بیٹی۔ کہاں چھپا دیا ہے آپ نے؟“ اور کیوں؟“ شاہ سکندر کسی طرح ضبط نہیں کر پا رہے تھے۔

”آرام سے آرام سے بیٹھ کر بات کرو۔“ باباجان نے انہیں پرسکون کرنے کی سعی کی۔

”میں آرام سے نہیں بیٹھ سکتا باباجان! جب تک مجھے مدیہ نہیں مل جاتی۔ آپ بتائیں کہاں ہے وہ؟“

”ہم کیا بتائیں۔ ہم تو اسے کراچی چھوڑ کر آئے تھے۔ تم کراچی والوں سے معلوم کرو۔ وہ یقیناً پھر تمہیں دے رہے ہیں۔ جیسے پہلے انہوں نے تم سے تمہاری بیٹی کو چھپایا تھا۔“

باباجان نے اتنے ٹھوس لہجے میں کہا کہ کچھ دیر کو وہ خاموش ہو گئے تھے۔ کیونکہ اس بات میں واقعی صداقت تھی۔ آئیہ نے انہیں ایک بیٹی کا بتایا تھا۔

”میں کراچی ہی سے آ رہا ہوں باباجان! اور مجھ کو وہیں سے معلوم ہوا ہے کہ مدیہ وہاں نہیں پہنچی۔“ اس بار شاہ سکندر کا لہجہ کمزور تھا۔

”کیسے نہیں پہنچی۔ ہم خود اسے اس کے دروازے پر چھوڑ کر آئے تھے۔“ باباجان اپنی بات پر قائم رہ کر تیز لہجے میں بولے۔ ”معلوم کرو اس ڈاکٹرنی سے کہ اب وہ ہم سے اور کیا چاہتی ہے۔ ہم اپنی بوتلیوں کے صدمے میں اسے بہت کچھ دے سکتے ہیں۔“

شاہ سکندر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس کا یقین کریں۔ آئیہ کا یا باباجان کا۔ ان دونوں کے درمیان وہ خود کو الٹی احمق لگنے لگے تھے۔

”بیٹا! تم ناحق پریشان ہو رہے ہو۔ مدیہ اپنی ماں کے پاس ہے اور اس کی ماں بہت شاطر عورت ہے۔ اس کی س تم نہیں سمجھ سکتے۔ جانتے ہو صباحت کی طرف سے وہ طلع کا دعوا کر چکی ہے۔“

باباجان ان سے ہمدردی جتا کر آئیہ کے خلاف بولنا شروع ہو گئے تھے۔

”جی، مجھے علی نے بتایا ہے اور میں اس سلسلے میں آئیہ کے پاس گیا تھا۔ تاکہ اسے نوٹس واپس لینے پر مجبور سکوں۔“ ادھر سے ادھر ٹھٹھکتے ہوئے شاہ سکندر نے رک کر بتایا تو باباجان نے فوراً ”پوچھا۔

”پھر کیا کہا اس نے؟“

”اس کا کہنا ہے جب تک مدیہ اس کے پاس نہیں پہنچ جاتی، وہ کچھ نہیں سوچ سکتی۔“

”دیکھ لو اس کی چالاکی۔“

اگرچہ اس کی چالاکی سے تو بہت ہنگامی پڑے گی اسے۔ شاہ سکندر نے انتہائی تنفر سے کہا اور ایک نظر باباجان کی طرف کران کے کمرے سے نکل آئے تھے۔

پھر مر النساء کی نیند خراب ہونے کے خیال سے وہ بیڈ روم میں جانے کی بجائے اپنے اخڑی روم میں آگئے۔ تاکہ جو توں کی قید سے آزاد کیا۔ گلے سے ٹائی کھینچ کر ایک طرف ڈالی پھر گارسلنگ کر صوفے پر دراز ہو گئے۔ ان اربعہ کی طرح سو رہا تھا۔ کیونکہ باباجان اور آئیہ دونوں کی باتیں ایک ساتھ ان کے ذہن پر حملہ آور ہو رہی تھیں۔ اور اس میں وہ یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ ان دونوں میں سے کون سچا ہے۔ اور کوئی بھی ہوا انہیں مدیہ کا پتا چلنا ہے۔

”کس سے معلوم کروں؟“ انہوں نے سلگتے ذہن کے ساتھ سوچتے ہوئے گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ یہاں سب سو رہے تھے لیکن کراچی میں تو اس وقت رات شروع ہوئی تھی۔ اس خیال کے ساتھ وہ اٹھ کر

اور اپنا موبائل اٹھا کر آن کیا تھا کہ بزرگ بچے لگی۔ غالباً کوئی مسلسل ٹرائی کر رہا تھا۔

پہلو! انہوں نے بہت بے دلی سے پہلو کہا تھا۔

”چچا جان! کہاں ہیں آپ؟“ دوسری طرف علی جمالی تھا۔ ان کی آواز سن کر جیسے اس کی جان میں جان آئی

تھی۔

”میری بیٹا! میں بالکل بھول گیا کہ مجھے تمہارے پاس آنا تھا۔ میری سوری۔“ انہیں ایک دم احساس ہوا کہ وہ

کس انتظار میں چھوڑ آئے تھے۔ بہت معذرت کرتے ہوئے کہنے لگے۔

”اصل میں بات یہی ایسی ہو گئی تھی کہ میں وہاں رک نہیں سکا اور سیدھا شاہ پور چلا آیا۔“

”کس کی کیا بات؟“ وہ غالباً اپنے متعلق سوچ کر پریشان ہوا تھا۔

”وہ بیٹا! مدیہ کا معلوم کرنا تھا کہ کہاں ہے وہ؟“ انہوں نے قصداً سرسری انداز اختیار کرتے ہوئے اسی قدر کہا

”دو دو بول پڑا۔“

”رہے پر۔“

”کہاں؟“ وہ ایک دم پوری جان سے متوجہ ہوئے تھے۔

”رہے پر چچا جان! جہاں ماما جی کا کاش ہے۔ جس روز آپ کینیڈا جا رہے تھے اس روز میں نے اسے وہیں دیکھا

دور کہہ رہی تھی کہ اسے وہ جگہ بہت پسند آتی ہے۔ میں رہے گی۔ میرا خیال ہے اس کی خواہش کو دیکھتے



ہوئے بابا جان نے اسے وہاں رہنے کی اجازت دے دی ہے۔ آپ بابا جان سے معلوم کر لیں۔“

علی جہانگیر نے تفصیل بتانے کے ساتھ مشورہ بھی دیا تو وہ چونک کر نکلے۔

”ہاں، ابھی تو بابا جان سو رہے ہیں۔ صبح معلوم کروں گا اور سنو صبح جتنی جلدی ممکن ہو سکے رستے پر پہنچ جائیں۔“

”جی ہمت۔“

”خدا حافظ۔“ انہوں نے موبائل بند کر دیا اور دل تو چاہا اس وقت جا کر بابا جان کو جھنجھوڑا لیں، لیکن ان کی شاعرانہ چالوں کا سوچ کر انہیں ضبط کرنا پڑا۔ اور یہ بھی سوچ لیا کہ جب تک مدیہ کو حاصل نہیں کر لیتے بابا جان کچھ ظاہر نہیں ہونے دیں گے۔ کیونکہ ان سے کچھ بعد نہیں تھا۔ اپنی بات سچ ثابت کرنے کے لیے وہ مدیہ کو جان بھی لے سکتے تھے۔ بہر حال انہیں مدیہ کا پتا چل گیا تھا، اس کے بعد اپنا اگلا اقدام کا سوچ کر وہ کافی حد تک مطمئن بھی ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود تمام رات سو نہیں سکے اور فجر کی اذان کے ساتھ ہی حویلی سے نکل آئے تھے۔

مسلسل ڈیزہ گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد جب وہ کامیج پہنچے۔ سورج نکل آیا تھا۔ سرخ۔ بھری کی روش پر گاڑی روک کر وہ نیچے اترے تو جو کیدار دور سے بھاگا آیا۔

”سلام صاحب!“

وہ سر کے اشارے سے جواب دیتے تیز قدموں سے آگے چل پڑے۔ کامیج گاڑی کھلا تھا۔ وہ رکے بغیر اندر چلے آئے۔ کوریڈر اور پھر ہال میں کوئی نہیں تھا، نہ کسی کی موجودگی کے آثار نظر آ رہے تھے پھر بھی انہوں نے قدرے اونچی آواز میں پکارا۔

”مدیہ!“ خاموشی میں ان کی آواز گونج کر رہ گئی۔

”لی لی یہاں نہیں ہیں صاحب!“ عقب سے جو کیدار نے کہا تو وہ فوراً اس کی طرف پلٹے۔

”پھر کہاں ہے؟“

”چنانچہ صاحب! مجھے بتا کر تو نہیں گئیں۔“ جو کیدار ان کے جارحانہ انداز سے خائف ہو کر بولا۔

”بتا کر نہیں گئی۔ اس کا مطلب ہے یہاں آئی تھی۔“ انہوں نے پر سوچ انداز میں خود کا می کی بھرپور کیدار

دیکھ کر پوچھنے لگے۔

”یہاں سے کب گئی ہیں؟“

”چار پانچ روز ہو گئے ہیں۔“

”کون نے لے گیا تھا اسے؟“

”شاہ تیور۔“

”یہاں کتنے دن رہی تھی؟“

”پہلے تو جی دو دن رہیں پھر چلی گئیں پھر آئیں تو چار دن رہیں اور جاتے ہوئے پھر آنے کا بھی گئی ہیں۔“

جو کیدار نے باقاعدہ انگلیوں پر حساب لگاتے ہوئے بتایا تو انہوں نے فوراً پوچھا۔

”کب؟“

”یہ تو نہیں بتایا تھا۔ کیا پتا آج آجائیں یا کل۔ آپ شاہ تیور سے معلوم کر لیں۔“

”اچھا ٹھیک ہے، تم جاؤ اور کوئی ناشتہ وغیرہ کا انتظام کرو۔“

وہ جو کیدار کو بھیج کر گرنے کے انداز میں صوفے پر بیٹھ اور دونوں باتوں میں سرگم لیا۔ اب اس مقام پر کاہن مزید کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔ رات بھر گانے نے انہیں اتنا نہیں تھکا تھا جتنا ناکامی نے تو فرکر دیا تھا۔ کچھ دیر بعد جو کیدار نے ناشتہ لکر ان کے سامنے رکھا تو اس وقت علی جہانگیر بھی آگیا۔

”السلام علیکم پچا جان!“

ہیں نے علی جہانگیر کی آواز پر ہاتھوں سے سرو اٹھایا تھا اور اسے دیکھ کر انہیں کافی حوصلہ ہوا۔

”بیٹا اب وقت پر آگئے۔“

بابا جان! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ علی جہانگیر نے ان کے تے ہوئے چہرے کو دیکھ کر ہنس پوچھا۔

”ٹھیک ہوں۔ بیٹا! دوا کرو، آگے سب ٹھیک ہو جائے۔“ انہوں نے جو کیدار کو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے چائے کا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

”یہ کہاں ہے؟“ علی جہانگیر کی نظریں ادھر ادھر بہکتے لگیں۔

”کی تلاش میں تو آیا ہوں۔ پتا نہیں تیور اسے کہاں لے گیا ہے۔ ادھر میں آئیہ سے وعدہ کر آیا ہوں کہ سورت مدیہ کو اس کے پاس لے کر آؤں گا۔ اب بتاؤ میں کیا کروں۔ کہاں تلاش کروں اسے۔“

”مات لوان کا۔ سب کیا دھرا ان ہی کا ہے۔“ ان کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

”جہانگیر حیران اور قدرے خائف بھی ہو گیا تھا۔“

”دیر بعد خود پر قابو پا کر شاہ سکندر نے ساری باتیں تفصیل سے بتا ڈالیں۔ جنہیں سن کر وہ واقعی چکر اٹھا۔“

”نہی خاطر خود کو سنبھال کر بولا۔“

”ب کفر نہیں کریں پچا جان! مدیہ کو کچھ نہیں ہو گا۔“

بابا جان تک وہ بابا جان کے قبضے میں ہے۔ میں اس کی فکر سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ ایسا کرو تم ابھی شاہ پور جاؤ۔ بے طور پر بابا جان سے معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ مدیہ کے بارے میں انہوں نے کیا سوچا ہے اور ہاں، اگلے انہیں یہ بتا دینا کہ رقبے پر تمہاری مدیہ سے ملاقات ہو چکی ہے۔ جبکہ مجھ سے ملاقات نہیں ہوئی۔“

”یہ ہوتا ہے؟“

”نہی علی جہانگیر سمجھ کر انہیں میں سر ہلانے لگا۔“

”اب تم جاؤ۔“ انہوں نے اس کا کندھا تھپک کر اٹھایا تھا۔

\*\*\*

”کون سی جگہ ہے؟“ مدیہ نے سرزوں پر اچھی خاصی رونق دیکھ کر پوچھا تو شاہ تیور نے کچھ بے دھیانی میں

”یہاں۔“

”یہاں آباد۔“

”یہاں آباد ہے۔“ وہ اشتیاق سے بولی تو اس بار وہ متوجہ ہو کر پوچھنے لگا۔

”یہاں تھیں حیدر آباد دیکھنے کا شوق تھا؟“

”اس نے سوچا آج تمہیں شاپنگ کرادوں۔“ شاہ تیور نے شاہانہ انداز سے کہا تو وہ ہنس پڑی۔

”ہاں۔“

”سے کیا سمجھتی ہو۔ جو درائی اور کوالٹی یہاں سے کہیں نہیں ملے گی۔“ وہ گاڑی بند کرتے ہوئے بولا۔

”یہ دیکھ لیتے ہیں۔“ وہ احسان کرتی ہوئی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اتری تو سامنے کھڑی بس کے پاس کھڑا

”یہاں۔“

”یہاں۔“ شاہ تیور چکر کاٹ کر اس کے پاس آکر بولا تو وہ چونک کر اس کے ساتھ چل پڑی۔ لیکن اس کا دھیان

”یہاں۔“



اس کے قدموں کی رفتار بہت سست تھی۔ شاہ تیمور نے ٹوکا تیرہ سر جھٹک کر تیز چل پڑی۔  
پھر کئی دکانوں پر رک کر شاہ تیمور نے اپنی پسند سے اس کے لیے سوٹ خریدے۔ وہ کہیں ویسی ظاہر  
کسین چپ چاپ دیکھتی رہی۔ آخر اسے آگاہ ہونے لگی تو مزید آگے چلنے سے انکار کر دیا۔  
”بس تیمور! میں تھک گئی ہوں۔“  
”ارے اتنی جلدی ان کے ساتھ میچنگ شوز اور جیولری نہیں لوگی؟“ شاہ تیمور نے دوسری چیزوں کے  
کراے مزید چلنے کے لیے اسکا ناچا لیکن وہ منہ بنا کر بولی۔  
”پھر سی۔“  
”شوز لے لو جیولری پھر سی۔ چلو مجھے بھی جو گر زینے ہیں۔“ شاہ تیمور نے کہا اور اسے کچھ کہنے کا مو

بغیر چل پڑا۔ تو اسے ناچار اس کی تقلید کرنی پڑی۔  
پھر شوز اور سینڈل وغیرہ دیکھنے کے لیے وہ شوئیس کے پاس ہی رک گئی تھی۔  
شاہ تیمور دکان کے اندر داخل ہو گیا اور سیلز مین سے جو گر زد کھانے کا کمرہ کر بیچ پر بیٹھ گیا۔  
سیلز مین فوراً حرکت میں آ گیا اور ایک کے بعد ایک ڈیڑھ کھول کر اس کے سامنے رکھنے لگا۔  
اس نے باری باری سب میں بیرو ڈال کر دیکھا پھر چونپند آیا اسے پیک کرنے کا کمرہ کہ جس کی طرف  
وہ شوئیس کے پاس موجود نہیں تھی اس نے اپنے اطراف — نظروں سے گزر دکان سے باہر نکل کر ادھر  
کے بعد کاؤنٹر پر آکر منیجر کو مخاطب کیا۔  
”ہیکس کجوزی۔ یہاں ایک لڑکی شوز دیکھ رہی تھی۔ کچھ بتائیں گے کس طرف گئی ہے؟“

منیجر نے پہلے ادھر ادھر دیکھا پھر نفی میں سر ہلایا۔  
”کہاں چلی گئی؟“ اس نے سوچتے ہوئے انداز میں سامنے دیکھا جہاں کچھ لڑکیاں کھڑی تھیں۔ پھر  
دکان میں جھانکتا ہوا مارکیٹ سے نکلا تو ایک دم سے احساس ہوا کہ وہ اسے چھو چکا ہے اور اس خیال نے  
پریشان کر دیا تھا۔ بابا جان کے سامنے جواب دی سے زیادہ اسے اپنا خیال تھا کہ وہ صحیح گج اسے چاہئے لگاؤ  
”نہیں وہ کہیں نہیں جاسکتی اور جائے گی کہاں، کسی دکان میں کھڑی ہوگی۔“  
وہ خود کو تسلی دیتا ہوا دوبارہ مارکیٹ کے اندر گیا اور پھر ایک ایک دکان دیکھ ڈالی۔ لیکن وہ کہیں منیر  
واپس آتے ہوئے اس کی پریشانی میں غصہ بھی شامل ہو گیا تھا کہ وہ لڑکی اسے چکر دے گئی تھی اور  
دے کر۔

”قریب نہیں، نہیں۔“ اس کا دل ماننے کو تیار ہی نہیں تھا۔ وہ اسے چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔ یقیناً  
کے لیے کہیں چھپ گئی ہے۔ وہ ٹریفک میں ادھر ادھر دیکھتا ہوا اپنی گاڑی کے پاس آیا اور جوشا پڑا  
رکھنے کے لیے پچھا اور واڑہ کھولا تو کھٹک گیا، وہاں وہ سارے شاہ زرخے تھے جو مدحیہ کے ہاتھ منیر  
مطلب تھا کہ وہ باتو نہیں کہیں موجود ہے یا اس کی چیزیں واپس کر کے گئی ہے۔ ایک جسم سی امید۔  
کتنی دیر گاڑی کے پاس کھڑا رہا۔ شاید ایک گھنٹے سے بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ تب بہت سانس ہو کر وہ گاڑی  
وہیں سے شاہ پور چل پڑا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد وہ حویلی پہنچا تو سید بابا جان کے کمرے کا رخ کیا۔  
”السلام علیکم بابا جان!“ اس نے دروازے سے داخل ہوتے ہوئے سلام کیا۔ تو بابا جان یوں جو  
آمد غیر متوقع ہو۔ پھر فوراً ”سامنے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔  
”آؤ تیمور! ابھی علی تمہارا ہی پوچھ رہا تھا۔“

”علی۔“ وہ ادھر متوجہ ہوا تو علی جہانگیر اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی طرف مصافحے کے لیے آئے۔  
”بولا۔“

ہوتے ہو یا ر! کیا کایج میں مستقل ذرہ جمایا ہے؟“  
”میں بابا جان کے کام سے حیدر آباد گیا تھا۔ ابھی وہیں سے آ رہا ہوں۔“ اس نے علی جہانگیر کا برہنہ ہوا  
رکھا۔ پھر اس کے ساتھ بیٹھا تو پوچھنے لگا۔ ”تم کب آئے؟“  
”آؤ اٹھنٹہ ہوا ہے اور بس ابھی جانے ہی والا تھا۔“  
”ار! ابھی آتا ابھی جانا میری سمجھ میں نہیں آتا۔“  
ری ملازم ہوں۔ اپنا کام بس ایسے ہی چلتا ہے۔“ علی جہانگیر کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اچھا بابا جان! میں  
لیلی جان سے مل لوں۔“

ناؤ۔ تمہاری ماں انتظار کر رہی ہوگی۔“ بابا جان نے کہا۔  
انگیر نے جاتے جاتے شاہ تیمور کو اشارہ کیا کہ وہ بابا جان سے فارغ ہو کر اس کے پاس آئے۔  
درنے اثبات میں سر ہلایا اور اس کے جانے کے بعد بابا جان کو دیکھ کر کہنے لگا۔

”ابن لودھ حیدر پتا نہیں کہاں چلی گئی۔“  
”؟“ بابا جان نیکیے کا سہارا چھوڑ کر یکدم سیدھے ہوئے ”کیا کہا تم نے کہاں چلی گئی؟“  
”نہیں معلوم کہاں چلی گئی۔ بس کچھ دیر کو میری توجہ اس کی طرف سے ہٹی تھی اور اتنی ہی دیر میں وہ  
شاہ تیمور کے انداز میں حد درجہ پچھتاوا تھا۔“

”شہر ناؤ کے گھر سے؟“ بابا جان نے پوچھا تو وہ کتنی دیر نفی میں سر ہلانے کے بعد بولا تھا۔  
”میں آج اسے حیدر آباد لے گیا تھا۔ کچھ اپنی چیزیں لینی تھیں کچھ اس کے لیے، بس وہیں سے لگتا ہے  
لے کی تلاش میں بھی پھر میں نے بہت ڈھونڈا اسے۔ کہیں نہیں ملی۔“

”تم آگئے۔“ بابا جان کے لیے میں ایسی چھین تھی کہ وہ تمل گیا۔  
”ار! ساری زندگی وہیں کھڑا رہتا۔ میں یہ بھی کر سکتا تھا اگر جوہ خود سے نہ گئی ہوتی۔ اور مجھے اس کے جانے  
بائیں بہ دکھ اس بات کا ہے کہ اس نے مجھ پر اعتماد نہیں کیا۔“  
”ار! بابا جان نے اس کا مطلب سمجھ کر نخوت سے سر جھکا پھر اٹھ کر ادھر سے ادھر شلتے ہوئے بولے۔  
”اکی ہماری توقع سے زیادہ چالاک نکلی۔ ادھر سکندر الگ، ہمیں پریشان کر رہا ہے۔ خیر یہ بھی اچھا ہے کہ ہم  
اس سے کہہ چکے ہیں کہ وہ کراچی چلی گئی اور سنو۔“

”ابن لودھ م رک کر اس سے مخاطب ہوئے۔  
”ابن لودھ حیدر کے بارے میں ضرور پوچھ گچھ گا“ اسے یہی بتانا کہ وہ آٹھ دس دن پہلے ہی چلی گئی تھی۔ ہم چھوڑ  
نے اسے سمجھے۔“

”نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نہ ہی اثبات میں سر ہلایا تو بابا جان غصے میں بولے۔  
”تم نے ہم نے کیا کہا۔“

”اس نے بابل خواست جی کی آواز نکالی تھی پھر اٹھ کھڑا ہوا تو بابا جان نے سخت لمحے میں تنبیہ نہ کی۔  
”ار علی کے سامنے کچھ اگلی مت دینا۔ ہمیں اس وقت اس کی آمد خاصی مشکوک لگ رہی ہے۔“

”نور محمد بعد میری آمد بھی مشکوک لگے گی۔“ وہ سوچتا ہوا ان کے کمرے سے نکل آیا۔  
”ناگہ میری نہیں کہاں تھا۔ اس نے لاؤنج میں رک کر جہاں سے پوچھا اور اس کے لائسنس ظاہر کرنے پر اپنے  
میں چلا آیا۔ خود اس کا اس وقت کسی سے بھی بات کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ علی  
نور اس کے پاس آئے گا اس لیے اس سے ہر قسم کی بات کرنے کے لیے وہ خود کو تیار کرنے لگا تھا۔“

♥ ♥ ♥ ♥  
”نور بے حد خوفزدہ تھی اس لیے مٹھی میں جتنے پیسے تھے رکشہ والے کو تھما دیے اور بھاگ کر گیٹ پار کر

میں تمہارے لیے بہت محبتیں، بہت چاہتیں ہیں۔ بہت پیار کرتے ہیں سب تم سے۔ تمہارے گھر بہت سونا ہو گیا تھا اور ہم سب بہت اداس۔“  
 بن تو سب کو بہت تنگ کرتی تھی۔“ وہ گم سم سے انداز میں بولی تھی۔ تب ہی صباحت نے کمرے میں ما۔  
 ہی ہیں۔“

نے گردن موڑ کر دیکھا تو صباحت جڑبڑی ہو کر واپس پلٹنے لگی کہ وہ پکار کر بولی۔

اے ماما کیوں پریشان کیا۔“  
 انہیں تو ماما تو بہت خوش ہو گئیں تمہارا سن کر اور ہاں تم نیچے سب سے مل کر آ رہی ہو! صباحت  
 ارا وہ ترک کر کے اس کے پاس آئی تھی۔

کوئی نظری نہیں آیا۔ میں سیدھی اور چلی آئی۔ اس نے جواب دیتے ہوئے بیڈ کی بیک پر سر رکھا تو  
 اس مسافت کو سوچنے لگا جو وہ طے کر کے آئی تھی۔  
 در اسے دیکھ رہے تھے اور صباحت کی نظریں نیل پر تھیں۔

بہت خاموشی سے سرکتے جا رہے تھے۔ تینوں میں سے کسی کو پتا نہیں چلا کہ آسہ کمرے میں داخل  
 اس کی پکار نے ایک دم بالچل بچادی تھی۔

ور صباحت چونک کر اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ جبکہ وہ چوتنے کے ساتھ ہی چھلانگ لگا کر آسہ کے  
 جاگتی اور یوں چل چل کر روئی کہ اسے چپ کراتے کراتے آسہ نڈھال ہو گئی تھی۔ آخر سکون کا  
 نارا سے سلا دیا اور کچھ دیر اس کے پاس رکنے کے بعد نیل اور صباحت کو لے کر کمرے سے نکل کر آئی  
 ہری انداز میں پوچھنے لگی۔

پچوڑ گیا ہے مدھو کو۔“

میں پچوڑ گیا اس نے کچھ بتایا ہی نہیں اور مجھے اس وقت خیال ہی نہیں آیا کہ میں باہر نکل کر دیکھتا۔ اصل  
 اہل اتنی خوفزدہ تھی اور اتنا رو رہی تھی کہ میں۔“

ہاتے ہوئے ایک دم خاموش ہو گئے تو آسہ نے مزید نہیں کرید اور ان دونوں کو کھانا کھانے کی تاکید کرتی  
 بارے میں آگئی کل شاہ سکندر اس سے کہہ کر گئے تھے کہ وہ آج مدیہ کو لے آئیں گے۔ اس کے خیال  
 سے پچوڑ گئے ہوں گے۔ لیکن مدیہ کا خوفزدہ ہونا اور رونا اس کے خیال کی نفی کر رہا تھا۔ کتنی دیر وہ اسی  
 لپٹی رہی۔ پھر سر جھٹک کر لیٹ گئی کہ اصل بات مدیہ سے معلوم ہو جائے گی۔ جسے اس نے انجکشن  
 ہاتھ اور شام سے پہلے اس کا اٹھنا متوقع نہیں تھا۔ اس لیے اس کی طرف سے کچھ بے فکر ہو کر آسہ خود  
 مٹی۔ یوں بھی دوپہر کی نیند اس کے معمول میں تھی اور معمول کے مطابق ہی وہ ساڑھے چار بجے اٹھ  
 پہلے مدیہ کے پاس جا کر اسے چیک کیا پھر اس کے قریب پریشان بیٹھی صباحت کو دیکھ کر قصداً مسکرا کر

بالر کی بات نہیں ہے بیٹا یہ ابھی تھوڑی دیر میں بہت فریش اٹھے گی۔ جب تک تم چائے کے ساتھ کچھ  
 نظام کر لو۔ کیونکہ اس نے دوپہر میں کچھ نہیں کھایا تھا۔“

پہلے بھی تو کھانا نہیں کھایا تھا؟“ صباحت نے اٹھتے ہوئے کہا۔

مجھے بھی بھوک لگ رہی ہے۔ لیکن پہلے میں شاور لوں گی۔“

بس ہے ماما! اتنے میں بسکٹ اور کیک منگوا لیتی ہوں اور ہاں ماما جی دوبارہ مدھو کو دیکھ کر جا چکی ہیں کہہ  
 نا کہ جب یہ اٹھے تو مجھے بلا لیتا۔“ صباحت نے دراز میں سے پیسے نکال کر اسے دیکھا۔

آئی۔ آنگن اور برآمدے میں کوئی نظر نہیں آیا تو اس نے کسی کو پکارا بھی نہیں اور اسی طرح بیٹھتی ہوئی یہ  
 پھاٹک کر اوپر آئی تو بالی سے نکلتے نیل کو دیکھ کر بالکل بے اختیار ہو کر ان کے سینے سے جا لگی اور ایسے  
 اختیار اس کے آنسو چھلکے تھے۔ جبکہ پورا دو چوتے کی طرح لرز رہا تھا۔

”مدھو! نیل کو اس اچانک اور غیر متوقع صورت حال نے گنگ کر دیا تھا۔ بہت آہستہ سے اس کے کمرے  
 جا مل کر کے اسے اپنی پناہوں میں تولے لیا پھر بھی غیر یقین سے تھے۔

”نیل بھائی! مجھے چھپا لیں، مجھے چھپا لیں نیل بھائی۔ وہ میرے پیچھے آ رہا ہو گا۔“ وہ روتی ہوئی کہہ رہی  
 ”کون؟ کوئی نہیں آئے گا۔“ نیل عمل طور پر ان لمحوں کی گرفت میں تھے۔ جانے کیسے یہ چند لفظ کہہ  
 ”آپ نہیں جانتے انہیں۔ بس آپ سارے دروازے بند کر دیں۔“ وہ ان کے بازوؤں میں چل کر چڑھ  
 کی آواز سن کر صباحت اپنے کمرے سے نکلتی ہوئی پوچھنے لگی۔

”کون ہے نیل بھائی؟“ پھر ایک دم ٹھٹھک کر دیکھنے لگی تو نیل جیسے ہوش میں آ گئے۔ فوراً اسے  
 سے تھا مگر جو اسے الگ کرتے ہوئے بولے۔

”مدھو ہے۔“

”مدھو! صباحت بھاگ کر اس سے لپٹ گئی۔ ”کیا ہوا مدھو! تم رو کیوں رہی ہو؟“

”یہ سوال جواب بعد میں کرنا، پہلے اسے کمرے میں لے جاؤ۔“ نیل نے صباحت کو نوکتے ہوئے کہا۔

”آپ! آپ کہاں جا رہے ہیں؟“ اس نے صباحت کو چھوڑ کر نیل کا بازو تھام لیا۔

”کہیں نہیں، میں تمہارے ساتھ ہوں۔ آؤ؟“ نیل اس کا ہاتھ تھام کر صباحت کے کمرے میں لے  
 اس کے ساتھ خود بھی بیٹھتے ہوئے بولے۔

”صبا! جاؤ پانی بلکہ گلو کو زلا کر لے آؤ۔“

صباحت اٹھ کر قدموں واپس پلٹ گئی اور کچھ ہی دیر میں گلو کو زلا کر آگئی تو نیل نے گلاس لے کر  
 ہو نہٹوں سے لگا دیا۔

وہ ایک ہی سانس میں پورا گلاس خالی کر گئی۔ پھر باری باری ان دونوں کو دیکھ کر بولی۔

”میں سچ گھر آگئی ہوں۔ صبا! نیل بھائی میں خواب تو نہیں دیکھ رہی ناں۔“

”اف مدھو! تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔ تم کیسی باتیں کر رہی ہو اور تم کسی کے ساتھ ہو؟“

حسب عادت پریشان بھی تھی اور فوراً ”ساری باتیں جان بھی لینا چاہتی تھی اور جانتا تو نیل بھی چاہے  
 اس کی حالت کے پیش نظر بہت حمل کا مظاہرہ کر رہے تھے اور صباحت کو بھی ایک بار پھر نوک دیا۔

”تم صبر نہیں کر سکتیں۔ ذرا آرام کرنے دو اسے۔“

”ہاں، میں بہت تھک گئی ہوں۔“ اس نے ناگہم سیدھی کرتے ہوئے کہا تو نیل اٹھ کھڑے ہو۔

”طیبت جاؤ لیکن سونا نہیں۔ میرا مطلب ہے کھانا کھا کر سونا۔“

”مما! آئیں گی تو ج رہے ہیں۔“ اس نے سامنے وال کلاک پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”مما آج دیر سے نہ کا کہہ گئی ہیں۔ کم تو فون کر دوں۔“

”نہیں، انہیں پریشان مت کرو۔“ اس نے تکیے پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن پھر فوراً

گئی اور بے حد خوفزدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔

”میں ماما کو فون کرتی ہوں۔“ صباحت نے کہا اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی تو نیل اس  
 ہوئے بولے۔

”سنو، تم تو بہت بہادر ہو۔ تمہیں ڈرنا نہیں چاہیے اور پھر اب تو تم اپنے گھر میں ہو۔“  
 وہ بہت خاموشی سے انہیں دیکھنے لگی۔ اس کی سرخی مائل آنکھوں میں ابھی بھی نمی تیر رہی تھی۔

”ہاں بلا لو۔“ وہ کہہ کر اپنے کمرے میں آگئی اور وارڈروب سے کپڑے نکال کر واش روم کا رخ کیا۔  
 کچھ دیر بعد جب دوبارہ مدھیہ کے پاس آئی تو وہ چھت پر نظر میں جمائے ساکت بیٹھی تھی۔  
 ”یہ جو ایسی ہو بیٹا؟“ آسیہ نے اس پر جھک کر پوچھا تو اس نے ذرا سی پلکیں جھپکیں پھر گری سانس کے ساتھ بولی تھی۔

”میں ماما کے پاس سوؤں گی نہیں۔ میرا مطلب ہے جب وہ سو جائیں گی تو تمہارے پاس آ جاؤں گی تم سونا  
 بچہ خند کہاں آئے گی؟“ صبا حث نے کہا۔  
 ”کے پھر میں آئی ہوں۔“ وہ کہہ کر آسیہ کے کمرے میں آئی تو زیر و پاؤں کی مدھم روشنی میں نیم دراز آسیہ  
 نگار کر رہی تھی۔

”ٹھیک ہوں ماما۔“  
 ”نہ! آسیہ نے اس کی پیشانی چومی پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولی۔ ”چلو منہ ہاتھ دھو لو پھر چلا  
 نہیں گئے۔“

”مجھے بھوک بھی لگ رہی ہے لیکن ابھی کھانا نہیں کھاؤں گی۔“ وہ واش روم کی طرف جاتے ہوئے بولی۔  
 ”صبا نے انتظام کر لیا ہے تم آؤ تو۔“

وہ جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر آسیہ کے ساتھ کمرے سے نکل کر رآمدے میں آگئی جہاں صبا حث نے چائے  
 ساتھ اچھا خاصا ایتھام کر ڈالا تھا۔ اور خود جانے کہاں تھی۔

”صبا کہاں چلی گئی اور نیل بھائی؟“ اس نے کرسی کھینچ کر بیٹھے ہوئے پوچھا۔  
 ”نیل! آسیہ نے وہیں سے نیل کو پکارا۔ پھر اسے دیکھ کر بولی۔ ”صبا آ رہی ہے تمہاری مائی جی کو لے کر۔“

”اماں جی اور اباجی کیسے ہیں؟“  
 ”سب ٹھیک ہیں بیٹا! چائے پی کر پھر نیچے چلتے ہیں۔“ آسیہ نے پلیٹ اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ تب

نیل آگئے اور ادھر سے صبا حث بھی میمونہ بھائی کے ساتھ آ رہی تھی۔  
 السلام علیکم مائی جی! ان کے قریب آنے پر اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر سلام کیا اور میمونہ بھائی کے گلے

لگی۔  
 ”جیتی رہو۔ خوش رہو۔“ میمونہ بھائی نے اس کے گال پر پیار کیا پھر بیٹھے ہی پوچھنے لگیں۔ کس کے ما

آئی ہو؟“  
 آسیہ اس کا جواب سننے کے لیے بے اختیار اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

”کسی کے ساتھ نہیں۔ اکیلی آئی ہوں۔“ اس کے جواب پر آسیہ کی پیشانی پر ہلکی ہلکی لکیریں ابھر آئی تھیں  
 جبکہ میمونہ بھائی اچھل پڑیں۔

”اکیلی شاہ پورا والوں نے تمہیں اکیلا بھیج دیا؟“  
 ”انہوں نے نہیں بھیجا بلکہ وہ تو بھیجنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ میں خود آئی ہوں کسی کو بتائے بغیر۔“ وہ ابھی

کے خلاف کچھ نہیں بولنا چاہتی تھیں۔ اس لیے سارا الزام اپنے سر لیا اور پھر خود بھی حیران سی ہوئی۔ شاید  
 لیے کہ یہ سارا موقع تھا جو اس نے کسی مصلحت کا دامن تھا تھا۔

”کسی کو بتائے بغیر۔“ آسیہ نے کچھ دیر سوچا پھر اٹھتے ہوئے بولی۔ ”میں کلینک فون کروں۔“  
 ”آپ کلینک جا رہی ہیں ماما؟“ مدھیہ نے فوراً پوچھا۔

”نہیں بیٹا! اس لیے تو فون کر رہی ہوں۔“ آسیہ اس کا گال تھپک کر آگے بڑھ گئی تو اس کے پیچھے دیکھتے ہو۔  
 جانے کیا سوچنے لگی تھی۔

وہ دیکھ رہی تھی کہ صبا حث اس سے شاہ پورا والوں خصوصاً ”شاہ سکندر کے بارے میں جاننے کے لیے آئی  
 ہیں۔ اور وہ خود بھی اب تک کی ساری روداد کی کو سننا چاہتی تھی اور اس کے لیے دونوں انتظار کر رہی  
 کہ نیل اور آسیہ سونے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں جائیں لیکن جب سونے کا وقت آیا تو آسیہ نے اسے  
 پاس بلا لیا۔ جس پر اسے حیرت تو نہیں ہوئی البتہ حیرت زدہ رہی۔ اور جاتے جاتے مڑ کر صبا حث سے کہنے لگی۔

”وہ اندھھی لیٹی اور دونوں ہاتھ ملا کر ان پر ٹھوڑی ٹکا کر پوچھنے لگی۔  
 ”آسیہ نے ذرا سائنات میں سر ملایا پھر اس کی پیشانی سے بال ہٹاتے ہوئے کہنے لگی ”پریشان تو میں  
 یہ خیال بھی تھا کہ تم اپنے باپ کے پاس ہو۔ اس لیے اتنا وقت میں نے خاموشی میں گزار دیا۔“

”بہت کم شاہ پور میں رہتے ہیں۔ بس یوں سمجھیں آرام کی غرض سے ایک دو دن کے لیے جاتے ہیں ورنہ  
 دل کبھی کہاں۔ ابھی بھی شاید کینڈا میں ہیں۔“

”آسیہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ پھر سنبل کر اصل بات کی طرف آتے ہوئے کہنے لگی۔  
 ”ابھی مجھے صبا حث کی فکر سے انجانے میں جو ہو گیا سو ہو گیا۔ لیکن اب جان بوجھ کر تو میں اسے کسی مشکل میں  
 ال کتی۔ پتا نہیں سب لوگ کیسے ہیں۔ اگر اچھے ہوں تب بھی میرا دل نہیں مانتا۔ مجھے لگتا ہے ان کا مقصد  
 مجھ سے بیٹیاں چھیننا ہے۔ تم تو ہاں رہ کر آئی ہو۔ تمہیں کیا لگتا ہے؟“

”یہاں ہے ماما! میں نے خود سنا تھا۔ بابا جان۔ جہانگیر چاچا سے کہہ رہے تھے کہ وہ آپ سے کہہ دیں کہ اگر  
 اسلام آتی چاہتے ہیں تو صبا حث کو رخصت کر دیں اس کے بعد سے ماما مجھے لگائیں آپ کو کبھی نہیں دیکھ  
 گا۔“ وہ ایک دم ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔

”میں نہیں بیٹا! روؤ نہیں روؤ نہیں میری جان۔“ آسیہ نے اس کا سراپے سینے پر رکھ لیا۔ ”تم تو بہت  
 روتی ہو۔ یہ بات اپنے باپ سے کیوں نہیں کہتی۔“

اس وقت بابا کو بالکل سمجھ نہیں پاری تھی۔ پھر بھی میں نے ان سے کہا تھا کہ مجھے کراچی لے چلیں  
 ان نے آئندہ پر ناں دیا جس سے میں یہی سمجھ گئی کہ وہ بھی بابا جان کے ساتھ شریک ہیں۔ اس لیے دوبارہ  
 ان سے یہاں آنے کی بات نہیں کی بلکہ شاید موقع ہی نہیں ملا تھا۔ ہاں وہ اسلام آباد چلے گئے تھے۔ پھر میں  
 بہت کر کے بابا جان سے کہا تو وہ مجھے یہاں لانے کا کہہ کر اپنے رقبوں پر چھوڑ آئے تھے۔“ وہ بولتی جا رہی

تھی۔ ”اس نے اس رات کے تصور سے جھرجھری لی پھر آسیہ کا ہاتھ اپنے گال پر رکھتے ہوئے  
 ”آپ کو بہت تنگ کرتی تھی نا ماما! اس لیے میرے ساتھ ایسا ہوا۔“

”بیٹا! ایسا مت سوچو۔“ آسیہ نے جھک کر اس کی پیشانی چومی۔ پھر پوچھنے لگی۔ ”تم وہیں رست ہاؤس  
 ہو؟“

”ماما! وہاں سے شاہ تیمور مجھے کہیں اور لے گئے تھے پھر پھوپھو شہر بانو کے پاس تین دن چھوڑا اور آج دن  
 آباد لے کر آئے تھے۔ شاہنگ کے لیے وہیں مجھے موقع ملا اور میں انہیں چھوڑ کر بس میں سوار ہو گئی۔“

”یہ تو آسیہ پر سوچ انداز میں اسے دیکھ گئی۔  
 ”ابھی مجھے ڈر لگ رہا ہے ماما! وہ لوگ یہاں تو نہیں آجائیں گے۔“ اس نے آسیہ کا ہاتھ ہلا کر کہا۔

”کون؟“ آسیہ نے چونک کر پوچھا۔  
 ”شاہ پور سے کوئی تھی۔ آپ کسی کو نہیں بتائیے گا کہ میں آپ کے پاس ہوں۔ میں اب کہیں نہیں جاؤں گا اور شاہ پور تو کبھی بھی نہیں پایا کروا کر ملنا ہو گا تو وہ یہیں۔“ اس نے ایک دم پچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا اور پتہ خائف بھی ہو گئی تھی۔

”یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ تم دو رومت۔ کسی میں اتنی جرات نہیں ہے کہ میرے پاس سے تمہیں باہر نکال دے۔“ آسیہ نے اس کا گال تھپک کر تسلی دی پھر اپنے پیچھے سے ایک تکیہ نکال کر برابر میں رستے ہوئے بولی۔

”چلاؤ اب تم سو جاؤ۔“  
 ”یہاں نہیں مہمان! میں اپنے کمرے میں سوؤں گی۔“ وہ صباحت کا خیال کر کے اٹھ گئی۔

”ڈور لگی تو نہیں؟“  
 ”اگر ڈور لگا تو آپ کے پاس آ جاؤں گی۔“ وہ آسیہ کے گلے میں بائیں ڈال کر بولی۔ پھر شرب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

دو بج رہے تھے لیکن صباحت جاگ رہی تھی۔ وہ اس کے برابر لیٹتے ہوئے بولی۔  
 ”میں آتی ہوں لیکن تمہاری کس بات کا جواب نہیں دے سکوں گی کیونکہ مجھے نیند آ رہی ہے۔“

صباحت خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ بولی کچھ نہیں۔  
 ”ایسے کیا دیکھ رہی ہو۔“

”تم ذرا بھی نہیں بدلیں۔“ صباحت نے کہا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔  
 ”کیا مطلب ہے تمہارا۔“

”کوئی مطلب نہیں چلو سو جاؤ۔“ صباحت کروٹ بدلنے لگی تھی کہ وہ اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر بولی۔  
 ”سونا ہوتا تو میں مہمان کے پاس نہ سو جاتی۔ تمہارے لیے آتی ہوں میں یہاں مجھے پتا ہے تم اندر سے کتنی

چین ہو اور کس کے بارے میں جاننا چاہتی ہو۔“  
 ”کس کے؟“

علی جمالیہ کے اور کس کے۔“ اس نے شرارت سے اس کے بازو میں چنگی کاٹ کر کہا۔  
 ”جی نہیں، میں اس کے بارے میں جان کر کیا کروں گی۔ بلکہ مجھے کسی سے کوئی غرض ہے نہ دلچسپی۔ تم صرف

اپنی بات کرو۔ تم نے ہم سب کو اتنا پریشان کیوں کیا؟“ صباحت نے اپنے اندر کے سارے جتنیں گھونپ کر بات کرنا اس کی طرف موڑ دیا۔ تو وہ حیران ہو کر بولی۔  
 ”میں نے میں نے کیا پریشان کیا۔“

”کیوں شاہ پور پہنچنے کے کتنے عرصے بعد تم نے یہاں اپنی خیریت کی اطلاع دی تھی اور میں نے جب تم سے آئے کا کہا تم نے یہی جواب دیا کہ تم کبھی نہیں آؤ گی اور ابھی کچھ دن پہلے تم نے اپنی شادی کی اطلاع دے کر ہم پر برا احسان کیا تھا۔“ صباحت خاصی ناراضی سے اسے لٹاؤنے لگی تھی۔ وہ سن کر کبھی کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی۔

گہری سانس کھینچ کر کہنے لگی۔  
 ”یہ صحیح ہے، البتہ میں نے قصداً سب کو پریشان کیا۔ یہاں اور وہاں بھی کیونکہ میں سب سے متنفر تھی اور اس متنفر کی وجہ سب کی تمہارے ساتھ محبت جبکہ میرے لیے کسی کے دل میں کوئی جگہ نہیں۔ اب پتا نہیں

واقعی ایسا تھا یا محض میری سوچ نے مجھے سب سے شاک کی دیا تھا۔ بہر حال شاہ پور جا کر میں نے یہی سوچا تھا کہ جب کسی کو میری پروا نہیں تو پھر میں کیوں اپنی خیریت کی اطلاع دوں جبکہ وہاں بھی سب خصوصاً باباجان علی جمالیہ اور پاپا اس بات سے پریشان تھے کہ میں مہمان کو فون کیوں نہیں کر رہی۔ وہ تو خیر یہ جاننا چاہتے تھے کہ یہاں مہمان کی

بیت رہی ہے اور میں انہیں کوئی اطمینان نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس لیے ان کے بار بار ٹوکنے پر ہی میں نے فون

نہ کیا اور جب کیا تو تم پر ہی ظاہر کیا کہ میں وہاں بہت خوش ہوں اور کبھی واپس نہیں آؤں گی اور میں سچ کہوں تو رقت میرے اندر عجیب سی رقابت تھی کہ یہاں وہاں ہر جگہ صبا صبا کی پکارے اور میں کہیں نہیں۔ مقررہ رکھنے لے لے کر سب کچھ تمہارے کھاتے میں کیوں ڈال دیا۔ میرے لیے کیوں کچھ نہیں۔ یہ تو مجھے بہت بعد میں

لیم ہوا کہ کائنات کے سارے نظام دو اور لوگ کے اصول پر چل رہے ہیں اور میں تو دینا جانتی ہی نہیں صرف لینا سچی ہوں ہونہ۔“

اس کا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔  
 ”ماں صم سے انداز میں اسے دیکھتے جا رہی تھی۔“

”وہاں بھی میں شاید صرف لینا چاہتی تھی۔“ اس نے پھر بولنا شروع کیا۔ ”خود سے کسی کی طرف دوستی کا ہاتھ نہ بٹھایا اور یہ توقع کرنے لگی کہ سب میری طرف آئیں گے جیسے میں کوئی بہت اہم ہستی ہوں۔ اہم تو کیا میری

ن کے نزدیک رہی برابر حیثیت نہیں تھی یہ مجھے اس وقت معلوم ہوا جب میں نے باباجان کی باتیں سنیں۔ تب مسامتہ تو خطرے میں نظر آئی ہی ساتھ تمہاری فکر نے بھی گھیر لیا تھا۔ میں سوچتی تھی اگر مہمان باباجان کی رہمان کر تمہیں رخصت کر دیا تو پھر وہ ہمیشہ کے لیے دونوں بیٹیوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں گی اور میں چاہتی تھی کہ

بہن جو دار کروں لیکن جب بھی فون کرتی کوئی نہ کوئی اس پاس آن موجود ہوتا تب اسے سنانے کے لیے مجھے یہ کہنا کہ میں بہت خوش ہوں اور کبھی نہیں آؤں گی کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ باباجان کو میری طرف سے ذرا سا شہہ ہو جس طرح وہ بظاہر مجھ سے اچھے طریقے سے ملتے تھے تو میں بھی ان پر ایسا ہی ظاہر کرتی تھی۔

پھر ایک بار میری وہی پہلے والی خود سری عود کر آئی اور میں نے سوچا کہ میں کیوں ان لوگوں سے ڈر رہی ہوں مجھے لفظوں میں کہہ دینا چاہیے کہ میں واپس جانا چاہتی ہوں اور جب میں نے باباجان سے ضد کی تو وہ مجھے رقبے ڈائے اس رات مجھے تم سب بہت یاد آئے۔ تم سب کی محبتیں اپنی زیادتیاں کیا کیا نہ یاد آیا اور مجھے لگانا اور چاہتوں سے منہ موڑنے کی سزا مل رہی ہے مجھے اور ملتی بھی چاہیے تھی۔ ہے نا۔“

اس نے صباحت کی پوری کھلی آنکھوں میں دیکھ کر تائید چاہی۔ لیکن اوپر کوئی جہش نہیں ہوئی۔ تو قدرے سے وہ مزید گویا ہوئی۔

اس کے بعد مجھے باباجان کی مرضی کا کھیل کھیلنا پڑا۔ شاہ تیور پر میں نے یہ ظاہر کیا جیسے مہمان کے گھر میں ہمیں میر نہیں ہے مزید سب کے رویے بھی ناقابل برداشت ہیں اور یہ کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں بابا بابا۔“

اپنی آخری بات پر وہ خود ہی ہنسی پھر کہنے لگی۔

بہر حال میں اس کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی اور اس کے موبائل پر میں نے یہاں فون کر کے

فاک میں اس سے شادی کر رہی ہوں۔ اس کے بعد میرا خیال تھا میں کسی دن اس سے کراچی چلنے پر اصرار

ماں کی تو وہ منع نہیں کرے گا، لیکن اتفاق سے مجھے اس سے پہلے ہی موقع مل گیا اور میں اسے چکر دینے میں

ب ہو گئی اور دیکھ لو تمہارے سامنے بیٹھی ہوں۔ زندہ سلامت۔ حالانکہ خود مجھے یقین نہیں آ رہا۔ یوں لگ

یہ جیسے ابھی آنکھ کھلے گی اور ارف نہیں۔“

اس نے جھرمجھری لی پھر صباحت کا بازو ہلا کر بولی۔

”کچھ بولو گی نہیں۔ اچھا باباں تمہارے علی جمالیہ کا تو میں نے بتایا نہیں وہ بے چارہ۔“

”جو چاہیے۔“ صباحت نے عاجزی سے ٹوکا۔ ”مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

”کیوں؟“

”اسی لیے کہ مہمان نے اسے خلع کاٹوٹس بھجوا دیا ہے۔“ صباحت نے بتایا تو وہ اچھل پڑی۔

”اب کیوں؟“

”کیوں کا کیا مطلب تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا اس کے بعد کیا یہ رشتہ قائم رہ سکتا ہے۔“

ہاں کی آخری بات پر پری طرح چونکے تھے۔  
”وہ شہراناو کے ہاں کب گئی تھی؟“

”چہ نہیں، مجھے تو آج صبح شہراناو کا فون آیا تو اس نے بتایا کہ مدیحہ دو تین دن اس کے پاس رہ کر گئی ہے۔ کیوں کیا ہاں اس کے شہراناو کے گھر جانے پر اعتراض ہے؟“ ”لی بی جان نے جواب دینے کے ساتھ پوچھا۔  
”ہمیں“ اعتراض کیوں ہو گا۔ بلکہ میں تو خود چاہتا تھا کہ وہ سب سے ملے اور اور کیا کہہ رہی تھی شہراناو۔“ وہ بدی مشکل سے خود پر ضبط کر رہے تھے۔ ورنہ دل یہ چاہ رہا تھا ایک دم سے ہر بات اٹھا لیں۔  
”ہاں اسی کی باتیں تھیں اور ہاں یہ تم باپ بیٹے نے اتنی خاموشی سے کیسے مدیحہ کی بات طے کر دی۔“ ”لی بی جان بے اچانک یاد آیا تھا۔

”نہیں تو میرا مطلب ہے آپ سے کس نے کہا؟“ وہ مزید ٹھنھکے تھے۔  
”وہی شہراناو بتا رہی تھی بلکہ گلہ کر رہی تھی کہ بابا جان نے مدیحہ اور تیمور کی نسبت طے کر دی اور اسے بلایا۔ میں نے لاکھ کہا یہاں ایسی کوئی بات نہیں ہوئی لیکن وہ مانی نہیں۔ کتنے کلمی مدیحہ نے خود محرک بتایا ہے کہ لی تیمور کے ساتھ شادی ہونے والی ہے۔“

”جانتا نہیں لی بی جان! یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میں تو کچھ بھی نہیں سمجھ پا رہا۔“ ان کا ذہن چٹختے لگا تھا۔ بالوں میں ہل چٹنا کر سر کو جھکا دیتے ہوئے بولے تھے۔

”نہیں تمہیں بھی معلوم نہیں ہے۔“ ”لی بی جان نے تعجب سے پوچھا۔  
”مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ میری بیٹی کہاں ہے۔ زندہ بھی ہے یا نہیں۔“ ان کی بے بسی اور ٹوٹے ہوئے پر لی بی جان دہل گئیں۔

”کیا کہہ رہے ہو؟“

”بابا جان سے پوچھیں جا کر کہ وہ میری بیٹیوں کو کس جرم کی سزا دے رہے ہیں۔ میں اگر ان کے مقابل کھڑا ہوا تو بات ادھوری چھوڑ کر خاصے جارحانہ انداز میں اٹھ کھڑے ہوئے تو لی بی جان حواس باختہ ہو گئیں۔

”ک کہاں جا رہے ہو سکندر؟“

”انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور تیزی سے کمرے سے نکل آئے۔ پیچھے لی بی جان پکار رہی تھیں۔ لیکن وہ نہیں پہلے شاہ یونس حیات کے پورشن میں جا کر ان سے شاہ تیمور کا پوچھا پھر وہیں سے باہر نکلے اور گاڑی میں بی بی ڈرائیور سے شاہ یونس کے ہاں چلنے کو کہا تھا۔

”فریبا“ دو گھنٹے بعد وہ شہراناو کے پاس موجود تھے۔  
”شہراناو نے انہیں دیکھ کر بے پناہ خوشی کا اظہار کیا۔ لیکن ان کے ذہن پر مدیحہ سوار تھی۔ اس کے استے والہانہ

”کے جواب میں بس اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور فوراً پوچھا۔  
”مدیحہ آئی تھی؟“

”آئی تھی، ماشاء اللہ۔“

”کس کے ساتھ آئی تھی؟“ ”انہوں نے فوراً دو سرا سوال کیا تو خوشی کا اظہار کرتی ہوئی شہراناو یکدم خاموش ہو کر ان کے تیمور دیکھ کر کچھ خائف سی ہو کر بولی۔

”تیمور کے ساتھ؟“

”نہیں دن رہی تمہارے پاس؟“

”نہیں دن؟“

”تیمور بھی ساتھ تھا؟“

”نہیں وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔“

مدیحہ فوراً ”کوئی جواب نہیں دے سکی۔ تو وہ پیراری سے ٹوک کر بولی۔

”چھوڑو اس بات کو۔ تم مجھے پایا کا بتاؤ۔ وہ کیسے ہیں اور تمہارے ساتھ اتنا کچھ ہوا انہوں نے کچھ نہیں کیا؟“

”شینڈ نہیں لیا۔“

”وہ کیا اشینڈ لیتے انہیں تو شاید کسی بات کا پتا ہی نہیں اور مجھے موقع ہی نہیں ملا۔ بلکہ پہلے تو میں یہ سمجھتی رہی کہ بابا جان کے منصوبوں میں وہ بھی شامل ہیں۔ اس لیے میں نے ان سے کوئی بات نہیں کی اور بعد میں میری اور سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ وہ کنیڈا چھپ گئے تھے ابھی بھی شاید وہیں ہیں۔“

مدیحہ نے بتایا تو وہ کچھ دیر تک پرسوج انداز میں اسے دیکھتی رہی پھر اس انداز میں کہنے لگی۔  
”میرا خیال ہے وہ یہیں کراچی میں ہیں۔ کل انہوں نے میس سے فون کیا تھا مجھے۔“

”پاپائے؟“ مدیحہ نے فوراً پوچھا۔  
”ہاں۔“

”کیا کہہ رہے تھے؟“

”کہہ رہے تھے میں جلد تم سے ملنے آؤں گا۔“ وہ بتا کر خائف سی ہو گئی پھر اس کا ہاتھ تھام کر منت سے بولی۔  
”سنو ماکو نہیں بتاتا۔“

”کیوں؟ جب وہ ملنے آئیں گے تب ماکو پتا نہیں چلے گا یا وہ کوئی سلیمان ٹوپی پہن کر آئیں گے۔“ مدیحہ۔  
”تک کر کہا۔“

”جب آئیں گے تب دیکھا جائے گا۔ تم سہر حال ماکو نہیں بتاؤ گی، سمجھیں۔“ ”صباحت بھی تیز ہو کر بولی تھی۔  
”سمجھ گئی۔“ خلاف عادت وہ بڑی جلدی مان کر لیٹ گئی تھی۔



شاہ سکندر اس امید پر دو دن کا بیچ میں رکے تھے کہ شاید مدیحہ آجائے حالانکہ علی جمائگیر نے شاہ تیمور۔  
معلوم کرنے کے بعد انہیں بتا دیا تھا کہ وہ کراچی جا چکی ہے اور پھر اس نے انہیں اپنے ساتھ چلنے پر اصرار بھی کیا۔

لیکن وہ نہیں مانے۔ انہیں اب کسی کی بات کا اعتبار نہیں تھا۔ اس لیے بھی کہ اگر مدیحہ کراچی پہنچ چکی ہو

آسیہ اس کی واپسی کا مطالبہ نہ کرتی اور اب تو خود انہیں بھی اس کی سامتی کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ بابا جان بات سچ ثابت کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتے اور اس بار اپنے اشاروں پر چلانے کے لیے انہوں نے شاہ تیمور

انتخاب کیا تھا۔

ان دو دنوں میں شاہ سکندر نے بہت ساری باتیں سوچی تھیں تو انہیں بابا جان کی وہ بات بھی یاد آئی جو انہ

نے کہا تھا کہ آسیہ سے صباحت کی رخصتی کی بات کرو تو مدیحہ کی بات بھی کر لیتا۔ شاہ تیمور کے ساتھ۔ گویا وہ

دوسری بیٹی کے لیے بھی باقاعدہ پان بنا چکے تھے اور وہ اتنے بے خبر تھے انہیں اپنی بے خبری پر بھی غصہ آیا۔

سہر حال میرے دن صبح وہ شاہ یونس کے ساتھ بابا جان سے بس سلام دعا کی حد تک ہی ملاقات کی۔ مدیحہ کے بارے

کوئی سوال نہیں کیا کیونکہ جانتے تھے اوہر سے ایک ہی جواب آئے گا۔ جس کا انہیں یقین نہیں تھا اور بابا

سے مزید نہ اچھنے کا وہ پہلے ہی طے کر چکے تھے۔ اس لیے ان پر ظاہر بھی نہیں کیا کہ وہ مدیحہ کی تلاش میں گئے۔

نہ اس کی طرف سے فکر مندی کا اظہار کیا تھا البتہ وہ دوسرے کھانے کے بعد لی بی جان کے پاس آکر بیٹھے اور پ

کا حال احوال پوچھا پھر اوہر اوہر کی باتیں کرتے ہوئے مدیحہ کا ذکر لے آئے۔

”مدیحہ کے جانے سے آپ کو بھی کوئی فرق پڑا ہے لی بی جان کہ نہیں؟“

”کیوں نہیں۔“ ”بجی صبح شام میرے پاس آکر بیٹھتی تھی۔ یعنی اور دوسری لڑکیوں کو بلاؤ تو سہماٹے ہوتے تھے۔“

آتی تھی۔ بہت محبت کرنے والی تھی ہے۔ شہراناو بھی عرفیہ کر رہی تھی کہ دو دن میں اس کے ساتھ ایسے

گئی جیسے پتا نہیں کب سے اس کے پاس رہ رہی ہو۔“ ”لی بی جان مدیحہ کی عرفیہ کرتے ہوئے بتا رہی تھیں۔“

”پھر اسے لینے بھی دی آیا تھا؟“  
 ”جی۔ خیر تو ہے ناں بھائی! کیا ہوا ہے؟“ شہر بانو نے تشویش سے پوچھا۔ لیکن انہوں نے جیسے سنا ہی نہیں۔  
 ”کہاں لے گیا ہے؟“  
 شہر بانو نے کوئی جواب نہیں دیا۔  
 ”بتاؤ شہر بانو! تم سے کچھ تو کہا ہو گا تیور نے۔“  
 ”میاں سے کہاں جانے کا پروگرام تھا اس کا؟“ وہ اس کی چند لمحوں کی خاموشی سے جھنجھلا گئے تھے۔  
 ”پتا نہیں بھائی! مجھے تو کچھ نہیں بتایا۔ خدا کے لیے آپ یہ تو بتائیں کیا جرا ہے؟“ شہر بانو ان کے سوا در سے پریشان ہو کر عاجزی سے بولی۔  
 ”ناجرا! وہ نہ۔“ وہ بہت مضطرب سے ادھر سے ادھر ٹھٹھلنے لگے۔  
 شہر بانو اندیشوں کی زد میں آکر اندر ہی اندر ہولنے لگی تھی۔ انہیں مخاطب کرنا چاہتی تھی، لیکن بہت نہیں ہو رہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ رک کر اس سے مخاطب ہوئے۔  
 ”سنو شہر بانو! اب اگر تیور مدیحہ کو لے کر یہاں آئے تو فوراً“ مجھے اطلاع کرنا اور میرے آنے تک مدیحہ کو اپنے پاس روکے رکھنا۔“  
 شہر بانو سمجھی یا نہیں، لیکن فوراً ”اثبات میں سر ہلا دیا۔“  
 ”میں چلتا ہوں۔“ وہ جانے کا کہہ کر چل بھی پڑے تو شہر بانو حیران پریشان سی ان کے پیچھے لپکی۔  
 ”بھائی! اتنے عرصے بعد آئے ہیں، کچھ دیر بیٹھیں تو کوئی چائے پالی۔“  
 ”ابھی بہت کام ہیں شہر بانو! پھر آؤں گا۔“ انہوں نے پلٹ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا پھر تیز قدموں سے باہر تھے۔  
 ”میاں سے مایوس ہو کر اب انہیں کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا مزید آئیہ کے سامنے جواب دی کا خیال پریشان کرنے لگا۔ وہاں سے اگلے دن ہی مدیحہ کو لانے کا کہہ کر آئے تھے اور یہاں چار دن ہو گئے تھے۔  
 ”یا اللہ کہیں تو اس عورت کے سامنے مجھے سر خرودے۔“ انہوں نے پہلے آسمان پر نظریں جماتے ہوئے سیٹ کی بیک پر رکھ لیا۔  
 گاڑی اونچی نیچی راستوں سے نکل کر شفاف سڑک پر دوڑنے لگی تھی۔ دور سے چوراہا دیکھ کر انہوں نے دم کراچی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اور ڈرائیور سے گاڑی شہر جانے والی سڑک پر موڑنے کا کہہ کر پھر آئیہ کو سولہ گس کے سامنے چند دن پہلے وہ اعتراف کر کے آئے تھے کہ وہ ابھی بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔ اور اسے جتا کہ ان کی زندگی میں آنے والے سارے امتحان، ساری آزمائشیں اور ساری تکلیفیں اسی محبت مرہون منت ہیں۔

شام کے سائے گرے ہو رہے تھے جب وہ علی جمائیکر کے بنگلے پر پہنچے مسلسل سفر اور مسلسل منشن نے اُپری طرح تھا کہ دیا تھا پھر بھی ان کا آرام کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ خیال تھا شاور لیں گے۔ اور ایک لپ کے ساتھ علی جمائیکر سے شاید کوئی نئی بات معلوم ہو جائے، بس اسی لیے اس کے بنگلے پر آ گئے تھے۔  
 علی جمائیکر کچھ دیر پہلے ہی اُس سے آیا تھا۔ ان کی آمد پر توجہ ان نہیں ہوا لیکن ان کا غلیہ پریشان کن تھا۔  
 ”خیریت چچا جان؟“ ان کے گلے لگتے ہوئے اس نے فوراً پوچھا۔  
 ”مدیحہ کا کچھ پتا چلا؟“ ان کے سوال میں جواب موجود تھا۔  
 ”مدیحہ!۔“ وہ ان کی پریشانی سمجھ کر خاموش ہو گیا۔

”میں سارے میں معلوم کر آیا ہوں بابا جان نے پتا نہیں اسے کہاں چھپا دیا ہے اور اس بار یہ کھیل انہیں بہت پڑے گا۔ خیر تم جلدی سے چائے بناؤ مجھے آئیہ کے پاس جانا ہے۔“ انہوں نے اچانک عود کر آنے والے بڑبڑا کر کہا۔

وہ پوچھنا چاہتا تھا۔ آئیہ کے پاس کس سلسلے میں لیکن ان کی پریشانی سمجھتے ہوئے خاموش رہا پھر کمر دین کو پکار کر نکلے جانے کا کہا۔ اس کے بعد انہیں دیکھ کر بولا۔  
 ”چائے سے پہلے آپ ہاتھ لے لیں۔“  
 ”ہاں! وہ اپنے کسی خیال سے چونک کر اٹھے تھے۔  
 پھر کچھ دیر میں وہ ہاتھ لے کر آئے تو غالباً وہی کپڑے دوبارہ پہننے کی وجہ سے خاصے جھنجھلائے ہوئے تھے۔  
 نے بیٹھے ہوئے بھی ان کے چہرے پر مسلسل ناگواری کا تاثر رہا۔  
 علی جمائیکر کچھ دیر انتظار کر رہا کہ وہ کچھ کہیں گے لیکن جب وہ متوجہ ہی نہیں ہوئے تب اسے خود مخاطب کرنا

چاہا جان! وہ میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ کیا آپ کو یقین ہے مدیحہ کو بابا جان نے کہیں ادھر ادھر۔“

ان حالات کی ظاہر کرتے ہیں۔ مجھے سے انہوں نے اس وقت جب میں کنیڈا جا رہا تھا۔ کہا تھا کہ وہ مدیحہ کو ہجومز آئے ہیں۔ جبکہ وہ رہے برنجی۔ خود تم نے اسے کانچ میں دیکھا۔ اس کے بعد وہ تین چار دن شہر بانو ن رہی۔ وہاں سے پتا نہیں چل رہا کہ تیور اسے کہاں لے گیا ہے، سر حال کہیں بھی ہو میں اسے۔“ وہ بولتے ایک دم ہونٹ بھیج گئے پھر چائے کا آخری گھونٹ لے کر اٹھ کھڑے ہوئے تو وہ ان کی تقلید کرتے ہوئے لگا۔

آپ ڈاکٹر آئیہ کے پاس کیوں جا رہے ہیں؟ میرا مطلب ان سے مدیحہ کے بارے میں کیا کہیں گے؟“  
 ”جی کہ میں اس کی بیٹی کی حفاظت نہیں کر سکا۔“ وہ بے اختیار کہہ گئے۔ پھر کچھ یوں وضاحت کرنے لگے۔  
 کہاں تک میں ان سے غلط بیانی کروں غلط بیانی کی وجہ سے ہی سارے کام خراب ہو رہے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ یہ حقیقت معلوم ہو جانی چاہیے۔“  
 ہر جا نگیر اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس لیے بس سر ہلا کر رہ گیا۔  
 اس کے ”میں چلتا ہوں۔“

آپ واپس بیٹیں آئیں گے نا۔“ وہ ان کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھنے لگا۔  
 کچھ کہہ نہیں سکتا۔ تم انتظار نہیں کرنا۔“ وہ اس کا کندھا تھپک کر گاڑی میں بیٹھ گئے تھے۔  
 ہوں نے علی جمائیکر سے تو بڑے آرام سے کہہ دیا تھا کہ آئیہ کو حقیقت معلوم ہو جانی چاہیے۔ لیکن جیسے ٹینک قریب آ رہا تھا ان کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی اور اس بار وہ سیدھے آئیہ کے کمرے میں داخل نہیں ہوئے۔ پہلے چوکیدار سے کہلوایا اور اس کا جواب سن کر باہری اسٹول پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگے، اس وقت انہیں انی نشیت یاد نہیں تھی۔ بلکہ ایسا باپ جو گمشدہ بیٹی کی تلاش میں ناکامی کے بعد اب اس کی ماں کے سامنے سے خوفزدہ ہو کر اسے کیا کہے گا۔

”نہا! آئیہ گھنے بعد غالباً آئیہ نے اپنے مریضوں سے فارغ ہو کر انہیں بلوایا تھا۔ اور اتنی دیر میں وہ بجائے ہر کم کی صورت حال کے لیے تیار کرنے کے منہی سوچوں میں گھر رہے تھے۔ جب ہی آئیہ کے کمرے کی جگہ کی طرح داخل ہوئے تھے اور ان کے برعکس وہ بڑی پراعتاد تھی۔“  
 ”خیریت رہیں۔“

کی معمول کی طرح بیٹھ گئے، تو آئیہ نے یوں دروازے کی سمت دیکھا جیسے کسی اور کی آمد متوقع ہو پھر ان کی متوجہ ہو کر پوچھا۔

”مدحو نہیں آئی؟“  
انہوں نے خاموشی سے سر جھکا دیا۔ جبکہ اندرا چانک ایک جنگ شروع ہو گئی تھی کہ وہ کیوں اس سے خائف ہو رہے ہیں۔ مدحہ صرف اس کی بیٹی تو نہیں ہے۔

”آپ کچھ پریشان ہیں؟“ ”اسیہ ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔  
”ہاں نہیں۔“ ”وہ اچھے گئے۔ پھر بالوں میں انگلیاں پھنسا کر وہ جیسے بے اختیار ہو گئے تھے۔  
”میں تھک گیا ہوں اسیہ! اتنا سفر جانے کیسے طے ہو گیا۔ مزید ایک قدم نہیں چل سکتا۔ کوئی سارا نہ لے نہیں کیا کروں کس سے کہوں کہ کس جرم کی سزا پائی ہے میں نے جو ختم ہونے میں نہیں آتی تمہاں تم سے گواہ گا۔ کیونکہ ابتدا تم سے ہوئی تھی۔“

اسیہ سر اٹھادی انہیں ٹوٹا بھرتا دیکھ رہی تھی۔  
اور انہیں جیسے کسی بہت اپنے کا کاندھا میسر آیا تھا جس پر سر رکھ کر رو لینے سے دل کا سارا غبار دھل جاتا ہے وہ بھی اپنی کتاب زندگی کے تمام اوراق اس کے سامنے الٹ کر شانت ہو گئے تھے۔ کرسی کی بیک پر سر رکھ آٹکھیں بند کر لیں۔

اسیہ کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے۔ اس بے قصور شخص کو معاف کر دے یا اس کے گریبان میں ہاتھ ڈال پوچھے کہ یہ ساری باتیں اس نے اس وقت اسے کیوں نہیں بتائیں جب اس کے دل کی بستی اس کے دم سے نکلی۔ اب کیوں تیار ہے جب اندر سب کھنڈر ہو چکا۔

اس کی زندگی کی خاطر بابا جان کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے یہ کیوں نہ سوچا کہ اس کے بنا وہ کیسے جئے گی۔  
اف سکندر حیات تم نے تو حد کر دی۔ اب اس مقام پر یہ کہہ رہے ہو کہ یہ زندگی بھی بابا جان کی بخشی ہے۔

میرے خدا! اشرف المخلوقات بنایا تو ایک ذرا سا اختیار وقت پر بھی دیا ہوتا۔ میں ایسا کیا کروں جو گزرے سالہ سمٹ کر میری مٹھی میں آجائیں پھر یا تو میں اپنا ہر دن اس شخص کو دان کرتی جاؤں یا خود اپنے ہاتھوں سے زندگی کا خاتمہ کروں۔

تم ایسے بزدل سکندر حیات! اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی لے ڈوبے۔  
کاش یہ اعتبار پہلے کرتے مجھ پر تو شاید پور کار میں ہو گیا دنیا کی کوئی طاقت میرے دل کی بستی نہیں اجاڑ سکتی! کتنا کھن مہر ملے آیا تھا جو گزر کے نہیں دے رہا تھا۔ اس کے اندر صف ماتم کچھ گئی تھی۔ سارے دکھ ساتھ سکھنے لگے تھے وہ بھی جو ابھی ابھی شاہ سکندر نے اس کی جھولی میں ڈالے تھے اور سدا کا بے رحم وقت نظریں چرائے گزر رہا تھا کیونکہ ان دکھوں کا دوا انہیں کر سکتا تھا۔

کتنی دیر بعد شاہ سکندر نے آٹکھیں کھول کر دیکھا تھا۔ وہ پیہر ویٹ پر نظریں جمائے جانے کس کرب رہی تھی۔ جو اس کی آنکھوں سے جھٹک رہا تھا۔ وہ قصداً ”ذرا سا کھائے تو وہ جو نکلنے کے ساتھ سیدھی ہوئی کچھ دیر خود پر قابو پانے کے بعد کہنے لگی۔

”حالات و واقعات مقدر کے تابع ہوتے ہیں شاہ سکندر حیات! جو کچھ ہمارے لیے لکھا گیا ہوتا ہے وہ ضرور ہوتا ہے۔ خواہ کسی بھی طرح سہی۔ میرے لیے اب ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں رہی کہ کسی نے کیا کیا نصیب تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ اندھے کنویں میں یہ سوچ کر چھلانگ لگا دوں کہ مٹا اگر دونا مرنا نہیں لکھا تو میں زندہ سلامت نکل آؤں گی۔ نہیں اللہ نے ذہن دیا ہے سوچنے سمجھنے کی صلاح ہے پھر حالات و واقعات ہمیں اور بہت کچھ سکھاتے ہیں اور سیکھنے کے بعد بھی اگر دوبارہ وہی غلطی دہرائی اس کے نتائج پہلے سے بھی زیادہ خوفناک نکلتے ہیں۔ آپ میری اس بات سے تو اتفاق کریں گے ناں۔“

شاہ سکندر بہت آہستہ آہستہ اثبات میں سر ہلانے لگے تھے۔

ہر آپ بتائیں میں کیا کروں۔ جس راستے پر کانٹے ہی کانٹے بچھے ہوں میں جانتے بوجھتے اپنی بیٹیوں کے لیے ہ کا انتخاب کیسے کروں۔ گزشتہ بار آپ نے کہا تھا کہ میں ایک بار اور آپ کا اعتبار کر لوں! ایسے کر لوں آپ کو معلوم نہیں ہے کہ مدحہ کہاں ہے جبکہ صاحت کے بارے میں آپ جانتے تھے۔ میرا مطلب ہے اس بی کے سلسلے میں آپ کے بابا جان نے جو پلانا تنگ کی اس سے آپ بے خبر نہیں تھے بلکہ آپ ان کے ساتھ تھے کیوں؟“ وہ ان کا محاسبہ کرتے ہوئے سوال نشان بن گئی تھی۔

میں نے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی یہی کہوں گا کہ میرے پیش نظر صاحت کی بہتری تھی اور ہے۔ ”انہوں نے پھر زور دے کر گویا اس رشتے کو قائم رکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔  
”وہ کتنی دیر ان پر تاسف سے نظریں جمائے بیٹھی رہی پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

میں شاہ سکندر حیات! آپ پتا نہیں کس پہلو سے صبا کی بہتری سوچ رہے ہیں کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کے بے ایک بار پھر۔“

میں۔ ”وہ فوراً بولی پڑے۔“ ”یہ صحیح ہے کہ بابا جان نے صاحت کے حصول کے لیے غلط طریقہ اختیار کیا تھا اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔“

یہ نہیں پہنچا سکتے۔ مدحہ گئے ساتھ انہوں نے کیا کیا۔ ”وہ زوج ہو کر بولی تھی۔  
سکندر ابھی خود ہر بات کا اعتراف کر چکے تھے اس لیے لا جواب ہو کر رہ گئے پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے

جیہ کو انہوں نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ ان کی دونوں پوتیاں شاہ پور میں بیاباں اور اسی مقصد سے انہوں نے مدحہ کو اپنے پاس روک رکھا ہے۔ شادی کے بعد اس پر کوئی پابندی نہیں ہو جب چاہے گی آپ کے پاس آئے گی۔ اس طرح صاحت بھی۔“

لیکن مجھے اپنی بیٹیاں شاہ پور میں نہیں بیاباں اور یہ صرف میری ضد نہیں ہے میری بیٹیاں بھی ایسا نہیں م۔ آئی ایم سوری شاہ سکندر حیات!“ وہ جتنی انداز میں کہہ کر گھڑی دیکھتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

سکندر اسے جانے پر آمادہ دیکھ کر بھی خاموش بیٹھے رہے۔  
اپنی چیزیں سمیٹ کر انہیں دیکھنے لگی۔ لیکن وہ متوجہ نہیں ہوئے پتا نہیں قصداً ”انجان بن رہے تھے یا بوجھ میں تھے۔

بارہن رہے ہیں، بچے انتظار کر رہے ہوں گے۔“ وہ انہیں مخاطب کیے بغیر خود کلائی کے انداز میں بولنے

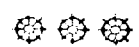
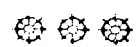
بچے۔ ”انہوں نے سوچا اور کھوجتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔ وہ کہیں سے بھی پریشان نہیں لگ رہی مدحہ مدحہ کا سن کر اس تمام عرصے میں اس نے کوئی دوا دیا یا چایا تھا کہ اسے ہر صورت اپنی بیٹی چاہیے۔

”آپ۔“ وہ ان کی نظروں سے الجھ کر بس اسی قدر کہہ سکی۔  
”ہاں چلنا چاہیے۔“ وہ ہاں کی صورت گہری سانس کھینچتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے پھر دروازے کے پاس جا کر

پہلٹ کر اسے مخاطب کیا۔  
”الکر اسیہ! میں صاحت اور مدحہ سے ملنا چاہتا ہوں اور میرا خیال ہے اس پر آپ کو اعتراض نہیں ہوگا۔ کل

بچے سپہر گاڑی بھیج دوں گا۔ اوکے۔“  
”ابھی سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ یقین سے بولے۔

میں جانتا ہوں مدحہ آپ کے پاس ہے۔“ اس کے ساتھ ہی دوبا ہر نکل آئے تھے۔





شاہ سکندر واپس علی جمالتگیر کے پاس آئے تھے اور اسے اپنے انتظار میں بیٹھے دیکھ کر انہیں تعجب و نہیں ہوا  
پھر بھی نوک گئے۔

”تم ابھی تک جاگ رہے ہو؟“  
”میں آپ کا انتظار کر رہا تھا۔“ علی جمالتگیر نے صاف گوئی سے کہا۔  
”لیکن میں نے یقین سے تو واپس یہاں آنے کو نہیں کہا تھا۔“ وہ بیٹھتے ہوئے بولے۔  
”کھانا گرم کروں آپ کے لئے؟“ علی جمالتگیر ان کی بات ان سنی کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔  
”ہاں یا رہا! بھوک تو لگ رہی ہے اور بس کھانے کے بعد کافی بھی ضروریوں گا۔ گرم دین سے کتنا۔“  
”گرم دین نہیں ہے۔ میں بناؤں گا کافی بھی۔“ علی جمالتگیر کہتا ہوا کچن کی طرف چلا گیا تو انہوں نے آرام سے  
سامنے ٹیبل پر ٹائلیں سیدھی کر لیں اور اگلے دن کا پروگرام سوچنے لگے جو وہ آتے ہوئے آسیہ سے کہہ آئے تھے  
کہ کل مدحیہ اور صباحت کے لئے گاڑی بھیج دیں گے۔

”آئیے چچا جان۔“ کچھ دیر بعد علی جمالتگیر نے آکر کہا تو انہوں نے چونک کر اسے دیکھا پھر فوراً اٹھ کر اس کے  
ساتھ ڈائننگ روم میں آگئے اور کرسی بھیج کر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگے۔  
”تم نے کھانا کھایا یا میرے انتظار میں۔۔۔؟“

”کھانا تھا۔“ وہ ان کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑا۔  
”گڈ!“ شاہ سکندر کھانے میں مصروف ہو گئے۔  
علی جمالتگیر بہت توجہ سے ان کا چہرہ دیکھنے لگا تھا، جس پر اب کسی تردد، کسی پریشانی کی لکیر نہیں تھی۔ اس  
برعکس اطمینان بھٹک رہا تھا جس سے وہ سمجھ گیا کہ انہیں مدحیہ کا سراغ مل گیا ہے۔  
”مدحیہ نہیں کراچی میں ہے نا؟“ قدرے توقف سے اس نے تصدیق کی خاطر پوچھا۔  
”ہاں!“ انہوں نے نمبکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اسے دیکھا۔

”نک سے۔۔۔ آئی مین کون چھوڑ گیا ہے اسے؟“  
”چائیں۔ یہ ساری تفصیل نہیں پوچھی میں نے۔ مدحیہ سے معلوم کروں گا۔ ہاں، تم کافی بنانے وا۔“

تھے۔ ”شاہ سکندر اٹھ کھڑے ہوئے۔“  
”جی۔ آپ چلیں میں لے کر آتا ہوں۔“ وہ فوراً کچن کی طرف بڑھ گیا۔  
شاہ سکندر لاؤنج سے ہوتے ہوئے اپنے رہائشی کمرے میں آگئے اور کپڑے نکالنے کی غرض سے الماری کھولا  
لیکن پھر خیال آیا کہ وہ تو بغیر کسی پروگرام کے ہونسی چلے آئے تھے۔ یعنی اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لائے تھے۔  
”چچا جان!“ علی جمالتگیر نے غالباً ”کمرے میں داخل ہونے سے پہلے پکارا تھا۔“

”ہاں۔ آجاؤ۔“ انہوں نے الماری بند کر کے کہا۔  
علی جمالتگیر اندر آیا تو جھولی ٹیڑھے میں کافی کے دو گم تھے۔  
”تمہیں صبح آفس نہیں جانا؟“ انہوں نے ایک گم اٹھاتے ہوئے پوچھا تو وہ سمجھ کر بولا۔  
”جانتا ہے، بس یہ ہے کہ کچھ لیٹ ہو جاؤں گا۔“  
”اور اس کا ذمہ دار مجھے ٹھہراؤ گے۔“ انہوں نے مسکرا کر کہا تو علی جمالتگیر قدرے جھینپ لیا۔  
”نہو سر! آپ نے تو نہ مجھے انتظار کرنے کو کہا تھا اور نہ اپنے ساتھ کافی پینے کی آفر کی۔“

”گویا اپنے ہر عمل کے تم خود ذمہ دار ہو۔“  
شاہ سکندر نے کافی کے ایک دو سبب لینے کے بعد سگریٹ ساگن تھی اور ایک ساتھ دونوں سے شغاف  
ہوئے، چائیں علی جمالتگیر کی موجودگی بھول گئے یا قصداً ”نظر انداز کر رہے تھے۔ کچھ بھی تھا بہر حال علی جمالتگیر  
لے ان کی لالچائی خاصی تکلیف دہ تھی۔ کچھ دیر ہی وہ خود پر جبر کر سکا، پھر پہلے ذرا سا کھاس کر انہیں اپنی موہ

دلایا اس کے بعد مخاطب کر کے کہنے لگا۔

چچا جان! وہ میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ ڈاکٹر آسیہ نے ہمارے بارے میں کیا سوچا ہے۔ آئی مین میرے اور  
نک سے۔۔۔؟“

آئی ڈونٹ نوٹینا! میری ان سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔“ انہوں نے پہلے سرسری انداز میں کہا پھر  
احساس ہونے پر اسے تسلی دیتے ہوئے بولے۔  
”تم نہیں کرو میں انشاء اللہ جلد ڈاکٹر آسیہ سے بات کروں گا۔ اصل میں وہ سب سے زیادہ تمہارے باپ  
نفر ہیں۔ اگر تم غیر جانبداری سے دیکھو تو وہ حق بجانب ہیں اس لئے میں انہیں زیادہ فورس نہیں کر سکتا۔  
شش کروں گا اور مجھے امید ہے کہ وہ صباحت کی خاطر مان جائیں گی۔“  
”صباحت سے ملے؟“ علی جمالتگیر نے جانے کس خیال کے تحت پوچھا تھا۔  
”نہی کل۔۔۔“ شاہ سکندر اسی قدر کہہ کر خاموش ہو گئے تھے۔

نی ماما! دونوں ایک ساتھ کمرے سے نکلیں تو آسیہ ایک نظر ان پر ڈال کر ڈائننگ کی طرف بڑھتے ہوئے  
ہوینا! کھانا کھالیں۔“

نی ماما! ٹیبل بھائی تو ابھی آئے نہیں۔“ صباحت اچھنے میں گھر کر بولی۔  
نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتی ہوئی اس کے پیچھے ڈائننگ روم میں آگئیں۔  
ارات تمہیں بتانا بھول گئی۔“ آسیہ ڈونگا اٹھا کر ان دونوں کی پلٹوں میں سالن نکالتے ہوئے بظاہر  
نڈاز میں بولنے لگی۔ ”اور صبح بھی یاد نہیں آیا ورنہ اسی وقت تم سے کہہ جاتی۔ خیر ابھی کافی وقت ہے۔ تم  
ہتاری کر سکتی ہو۔ تین بجے تمہارے بیاہ کی گاڑی آئے گی۔ تم دونوں چلی جانا۔“

”دونوں کے منہ حیرت سے کھل گئے تھے۔“  
میں نہیں کہہ سکتی کہ وہ کہاں ملیں گے بہر حال وہ تم دونوں سے ملنا چاہتے ہیں اور مجھے اس پر کوئی اعتراض  
ہو کہ تم دونوں اب سمجھ دار ہو۔“ آسیہ بہت سرسری انداز میں کہہ کر اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔  
اگر وہ ہمیں شاہ پور لے گئے؟“ مدحیہ نے فوراً خدشہ ظاہر کیا تو آسیہ ایک دم سراوٹا کر کے اسے دیکھنے لگی  
خود بھی اس خدشے سے پریشان تھی لیکن ان پر ظاہر نہیں کر رہی تھی۔ اب جو مدحیہ نے کہا تو وہ سوچ میں  
رکتی دیر بعد اس نے ان دونوں سے زیادہ جیسے خود کو تسلی دی تھی۔

بہ میرا خیال ہے، وہ ایسا نہیں کریں گے۔“  
می ماما! ”مدحیہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس نے نوک دیا۔“  
ایا کوئی بات نہیں ہے بیٹا! پھر تم تو پہلے بھی ان سے مل چکی ہو کئی مرتبہ۔۔۔ یہ نے دینا صباحت گم  
تھی۔

ٹھیک ہے ماما! لیکن انہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں۔“ مدحیہ نے ایک دم خیال آنے پر پوچھا تو  
تے ہوئے بولی۔  
ہو گیا معلوم۔ اب تم جلدی سے کھانا کھا کر تیار ہو جاؤ۔ شاہ سکندر کی گاڑی زیادہ دیر تک اس دروازے پر  
نہاٹے۔ اوکے۔“ آسیہ اپنی بات ختم کرتے ہی کمرے سے نکل گئی

”بھئی جلدی کرو۔“  
”نہیں جاؤں گی۔“ صباحت نے اسی گم صم انداز میں کہا۔  
”ان کیوں نہیں جاؤ گی؟ اب تو ماما خود بھیج رہی ہیں ہمیں۔ چلو اٹھو۔ کھانا دانا بھی وہیں کھالیں گے بیٹا کے

ساتھ۔ ”وہ زبردستی اسے وہاں سے اٹھا کر کمرے میں لے آئی اور الماری کھول کر کپڑوں کا انتخاب کرتے ہوئے کہنے لگی۔ ”تو یہ تھی ماما کی پریشانی۔ عجیب ہیں ماما بھی۔ اگر انہیں پیلا پر اعتبار نہیں ہے تو صاف منع کر دیتیں۔ خیر یہ دیکھو یہ سوٹ تم پہن لو۔ یہ میں۔“

”ہاں میں۔“ صاحبہ اچھل پڑی۔ ”ہم کسی شادی میں نہیں جا رہے۔“

”تو تمہیں کیا پتا شاہ پور کی خواتین گھر میں بھی ایسے ہی بلکہ اس سے اچھے اور جھللاتے ہوئے کپڑے ہیں۔“ وہ بڑے آرام سے صحبت کے اعتراض کو نظر انداز کرتے ہوئے وہی کپڑے استری کرتے کھڑی ہو گئی۔

”تمہاری مرضی لیکن میں یہ نہیں پہنوں گی۔“ صحبت نے اپنے لئے دوسرا سوٹ نکال لیا تھا۔

پھر ٹھیک تین بجے وہ دونوں آسیہ سے کمرہ کر نیچے اتریں تو اسی وقت گاڑی بھی آئی تھی۔

”مدحو! اس سے پوچھو پیلا کہاں ہیں؟“ صحبت نے اسے کہنی مار کر ڈرائیور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یا اللہ! یہ تم اتنا ڈر کیوں رہی ہو۔ تمہاری زبردست دیکھ کر تو پیلا، لیکن نہیں، انہیں پتا ہے تم بہت ڈر ہو۔“ مدحہ اس سے کمرہ کر فوراً ڈرائیور کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”سنو پیلا اس وقت کہاں ہیں؟“

”جی گھر پر۔“ ڈرائیور نے بڑے ادب سے جواب دیا۔

”گھر پر۔“ مدحہ کو پہلا خیال شاہ پور کا آیا جب ہی فوراً پوچھنے لگی۔ ”تمہارا مطلب ہے شاہ پور میں۔“

”نہیں جی۔ یہاں کا فیشن روڈ پر۔“

”اچھا۔“ مدحہ نے ”اچھا“ کو یوں لبا کھینچا جیسے بہت اچھی طرح واقف ہو پھر صحبت کی طرف جھوٹے سرگوشی میں کہنے لگی۔

”سن لیا۔ ہم منسٹر ہاؤس جا رہے ہیں۔ اب اپنی شکل ٹھیک کرو اور ڈرائیور بھی اکرالو۔“

”بکو مت۔“ صحبت نے دانت پیسے۔ ”میری جان پرینی ہے اور تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔“

”مذاق امیں ہر مذاق نہیں کر رہی۔“

”اچھا بس چپ رہو۔“

”انتہائی فضول ہو تم۔“ وہ سر جھٹک کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔

کچھ دیر بعد گاڑی بڑے سے سیاہ گیٹ میں داخل ہو کر رک گئی۔ تب وہ صحبت کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے ”چلو، تمہیں پیلا سے ملو اؤں۔“

”سنو، یہاں صرف پیلا ہی ہیں یا۔۔۔؟“ صحبت نے اس کے پیچھے اترتے ہوئے پوچھا تو وہ کندھے اچکا کر ”مجھے کیا پتا۔ یہ تو اندر جا کر معلوم ہو گا کہ اور کون کون ہے اور کوئی ہو بھی تو نہیں گیا۔“

”آئیے لی لی! صاحب انتظار کر رہے ہیں۔“ ایک باوردی ملازم نے قریب آکر کہا تو وہ صحبت کا ہاتھ باندھ کر پیچھے چل پڑی۔

طویل گلی کے بعد گول کمرہ تھا۔ وہیں شاہ سکندر موجود تھا۔

”ہاں!۔“ مدحہ انہیں دیکھتے ہی بھاگ کر ان سے مل پڑی۔

”تیسے ہو بیٹا! شاہ سکندر نے اس کی پریشانی جو مہلی پھر صحبت کی طرف دیکھا جو کچھ فاصلے پر رہی رک پڑا۔“

”صبا! آؤ بیٹا! انہوں نے اپنا دوسرا بازو اس کی طرف پھیلا دیا تو وہ بہت دھیرے دھیرے چلتی ہوئی ان کی آغوش میں آکر پھر اگلے بل بے اختیار ان کے سینے میں منہ چھپایا تو اس کے آنسو بھی بے اختیار جھٹک گئے۔“

”نہیں نہیں بیٹا! روتے نہیں۔“ شاہ سکندر نے فرط محبت سے اسے اپنے بازوؤں میں گھیر لیا تو۔

جیسے طویل مسافتوں کے بعد شجر سایہ دار میسر آیا ہو، جس کی ٹھنی ٹھنڈی چھاؤں میں وہ جی بھر کر روتی تھی۔

نے غلط تو نہیں کہا تھا یا! یہ روتی بہت ہے۔“ مدحہ نے بڑی مشکل سے اسے الگ کر کے بٹھاتے ہوئے سکندر قصداً ”ذرا سا مسکرائے پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے بولے۔

”نہیں روئے گی۔“

”کو نہیں بتا۔ اس کی آنکھوں میں مسند روں بتنا پانی ہے۔“

”روں بتنا۔“ شاہ سکندر خامسے محفوظ ہوئے۔ ”کیوں بیٹا صبا! یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔“

ت نے نفی میں سر ہلا کر دوپٹے سے اپنی آنکھیں اور چہرہ صاف کرنے لگی تو شاہ سکندر نے آہستہ سے اس کا ہاتھ پھران دونوں کے درمیان سے اٹھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”نے کھانا کھالیا یا۔۔۔“

نے تو تھوڑا بہت کھالیا تھا، البتہ صبا نے بالکل بھی نہیں کھایا۔ ”مدحہ ان کی بات پوری ہونے سے پہلے پہلے کھانا کھاؤ۔“ شاہ سکندر نے کمرہ کر ملازم کو پکارا اور اس کے آگے اپنا دونوں کوڈا خٹنگ ہال میں لے آکر مدحہ کو مخاطب کر کے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

”اگر وہ بیٹا! آپ دونوں کھانے کے بعد ادھر ہی آجانا۔“

کھانا نہیں کھا میں گے؟“ مدحہ نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”نچ نام دو بجے ہے۔“ وہ کمرہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔



نے کے بعد وہ دونوں شاہ سکندر کے کمرے میں آئیں تو کچھ دیر تک وہ ہلکے ہلکے انداز میں ان کی تعلیم ان کی منہ کے بارے میں پوچھتے رہے اور یہ کہ جڑواں ہونے کے ناتے کون سی باتیں اور عادات دونوں میں ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے مدحہ سے پوچھا تھا کہ وہ شاہ تیور کے ساتھ رہنے پر اپنی مرضی سے گئی تھی یا نے زبردستی اسے بھیجا تھا اور یہ کہ وہ کراچی کس کے ساتھ آئی ہے۔

بائیں مدحہ نے انہیں تمام حالات کہہ سنائے۔ وہ بہت متنفر ہو رہی تھی اور برملا اظہار بھی کر رہی تھی۔

میں کتنی بار صحبت نے اسے خاموش ہونے کا اشارہ کر کے احساس دلانا چاہا کہ اسے شاہ سکندر کا خیال ہے یعنی ان کے سامنے ان کے خاندان کو برا نہیں کہنا چاہئے لیکن وہ اس کا اشارہ سمجھ کر بھی خاموش رہی۔

کندہ رٹا ہر بڑے سکون سے سن رہے تھے اور اس کے خاموش ہونے پر اسی سکون سے بولے تھے۔

پہاں پریشان ہوئیں اور مجھے بھی پریشان کیا۔ حولی میں تو آپ کو کوئی تکلیف نہیں تھی۔ وہیں رہ کر آپ انتظار کرنا چاہئے تھا۔ میں کینڈا گیا تھا یا امریکہ۔ مجھے واپس تو وہیں آنا تھا۔ اس طرح آنے کا مطلب تو یہ ہے کہ مجھ پر بھی بھروسہ نہیں تھا؟ ان کے تھہرے ہوئے پر سکون لہجے میں تسنیمہ بھی کیا چیخیں ”مدحہ کو نہ بہت ڈرگا، سر جو کا کراہنے ناخن دیکھنے لگی۔“

بکے اس اقدام سے میری پوزیشن کتنی آکڑ ہو گئی ہے۔ خود اپنے آپ میں گھٹی فیل کر رہا ہوں میں کہ بیٹا! مدحہ رو پڑی تو وہ ہونٹ چبھنے لگا اسے دیکھنے لگا۔

”شکال اندر رہی اندر بیٹھنے لگا کہ جانے اب وہ کیا کہیں اور اگر اس کے معاملے پر بات کرنے لگے تو وہ کیا

”آئیے بیٹا! شاہ سکندر نے یکدم لہجہ بدل لیا اور مدحہ کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بولے۔ ”میں تو آپ کو خیر چھوڑوں، باتوں کو اور یہ بتاؤ! اس کرم کیسی تھی؟“

”ماگھی۔“ وہ روٹھے لہجے میں بولی۔

”صرف اچھی۔“ انہوں نے صباحت کو دیکھا تو وہ فوراً بولی۔  
”بہت اچھی۔“

”گڈ! اور اب آپ دونوں میں سے مجھے بہت اچھی چائے کون پلائے گا؟“ انہوں نے باری باری دونوں کو دیکھ کر صباحت نے اپنی طرف اشارہ کیا اور مدحیہ بھی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔  
”صبا! صبا! اچھی چائے بناتی ہے۔“

”اور آپ!“  
”میں صرف اچھی۔“ اس نے یوں برا سامنے بنا کر کہا کہ وہ صاف منع کر دیں لیکن وہ موڈ میں تھے۔  
”چلو تو آج ہم صرف اچھی چائے پی لیتے ہیں، بہت اچھی پھر سی۔“  
”مجھے پتا تھا آپ بیس کہیں گے۔“ وہ سدا کی کام چور بہت بے دلی سے انہی تھی مزید صباحت کی مسکراہٹ سے تپ گئی تو جاتے جاتے اس کے بازو میں چٹکی کا تکی گئی تھی۔  
”اف!“ صباحت اپنا بازو سہلانے لگی۔

شاہ سکندر نے قصداً اس کی طرف سے دھیان ہٹالیا اور اٹھ کر دیوار گیر ریک کا شیشہ کھولا تھا کہ فون کی بیل واپس پلٹ کر اسی جگہ آئی تھی اور ریپور اٹھالیا۔  
”بس شاہ سکندر۔“  
”اوہ علی! کیسے ہو بیٹا؟“

صباحت کا دل اتنی زور سے دھڑکا کہ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔  
شاہ سکندر نے پہلے تا سبھی کے عالم میں اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر ایک دم سمجھ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھالیا جبکہ ادھر کی بات بھی توجہ سے سن کر کہہ رہے تھے۔  
”نہیں، میرا ایسا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ البتہ کل میں شاہ پور جانے کا سوچ رہا ہوں۔ وہ بھی کنفرم نہیں ہے۔“  
”ابھی، نہیں ابھی نہیں۔ کل آجانا۔“  
”اوکے خدا حافظ۔“ انہوں نے ریپور رکھ دیا اور کچھ دیر جانے کیا سوچنے کے بعد بہت آہستہ سے صباحت کے کندھا تھپک کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

♥ ♥ ♥ ♥  
جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، نیل کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ کبھی لابی میں آکر فون کے پاس کھڑے ہو جاتے کبھی میز پر جا کر دور تک دیکھتے۔ اس پریڈ میں آٹھ بج گئے تو ان کے اضطراب میں خدشات بھی شامل ہو جینیں وہ کسی طرح دبا نہیں سکے تو آسیر کو فون کر ڈالا۔

”پھوپھو! بدحواس اور صابھی تک نہیں آئیں؟“  
”آجائیں گی بیٹا!“ آسیر کے لہجے کے اطمینان نے انہیں مزید منتشر کر دیا۔  
”کب میرا مطلب ہے کب تک آئے گا کہہ گئی تھیں۔ آٹھ بج گئے ہیں۔“  
”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ جب ان کا باپ پیجے کا گائب ہی آئیں گی ناں۔“  
”کیا ہو گیا ہے پھوپھو آپ کو۔ آپ نے انہیں جانے کیوں دیا تھا۔ پتا نہیں شاہ سکندر انہیں کہاں لے گئے۔“  
”نیل نے خدشہ ظاہر کرتے ہوئے بھی مصلحتاً ”شاہ پور کا نام نہیں لیا۔“  
”نہیں نہیں لے گئے۔ میں اسی شہر میں ہیں۔ تم فکر نہیں کرو آجائیں گی۔“ آسیر نے پھر خود کو تسلی دینا شروع کر دیا۔

”میرے خدا!“ نیل ریپور رکھ کر پھر میز پر نکل آئے اور ریڈنگ کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھنے لگا۔  
تک مسلسل ٹھنڈے کے باعث ان کی اکڑی ہوئی کمریں نہیں اٹھنے لگی تھیں۔

شہ غلط فیصلے کرتی ہیں پھوپھو۔“ چیرے کی بیک سے کمر نکالتے ہوئے انہوں نے سوچا۔ اور اس بار تو انہوں نے اپنی نہیں کہ شاہ سکندر رہیں۔ سے ملنا چاہتے ہیں۔ شاید تھک گئی ہیں پھوپھو یا پھوپھو۔“  
”ہنسی کی آواز سے وہ بری طرح چوکنے اور انہی اٹھنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ صباحت نے لابی سے پکارا۔  
بل بھائی!“

”نیل!“ انہوں نے گہری سانس کھینچی اور اٹھنے کا ارادہ ترک کر کے چیرے کی بیک پر سر رکھ لیا۔  
بل بھائی۔“ دوسری پکار کے ساتھ ہی صباحت سامنے آتی ہوئی بولی۔

”پہاں کیا کر رہے ہیں۔ سو گئے کیا؟“  
”نیل نے آنکھیں کھول دیں لیکن بولے کچھ نہیں۔“  
”ہوا نیل بھائی!“ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟“ صباحت متوحش سی ہو کر آگے آئی اور ان کی پیشانی پر ماتوہ آہستہ سے اس کی کلائی تھام کر بولے۔  
”ٹھیک ہوں بالکل! بس ذرا پریشان ہو گیا تھا۔“

”بات سے؟“ وہ بھی نہیں۔  
”جا جائے دو۔ تم اپنی سناؤ۔ مل آئیں اپنے پیارے؟“  
”نیل بھائی!“ اس کی آنکھوں میں ایسی ہی چمک تھی جیسے برسوں کی آرزو پوری ہوئی ہو اور ایک جذبہ میں کرسی کے بازو پر دونوں ہاتھ جما کر فرش پر گھٹنے ٹیک گئی تھی۔  
”ہے گے!“

”اتجھے۔ بہت محبت کرنے والے، مجھے لگا جیسے۔“ مدحیہ کی آمد سے اس کی بات ہونٹوں میں رہ گئی۔  
مدحیہ کی آمد خاموشی سے نہیں ہوئی تھی خاصی اونچی آواز میں بول رہی تھی۔  
”نیل!“ تم یہاں ہو۔ یقیناً۔“ نیل بھائی کو پوری سہنی سناری ہوئی۔ بس کو صبا! اسرال جاؤ گی تو بڑا مسئلہ روزانہ بھاگ کر آنا پڑے گا تمہیں۔ نیل بھائی کو ان بھر کی روداد سنانے کے لئے۔“

”ومت۔“ اسے غصہ آ گیا۔  
”نیل نہیں رہی۔ عرض کر رہی ہوں کہ خدا کی بندی رحم کو نیل بھائی پر۔ بے چارے عاجز آگئے ہوں یوں نیل بھائی؟“

”نیل کوئی جواب نہیں دیا تو وہ جھنجھلا کر بولی۔  
”آپ کبھی سچ نہیں بولیں گے۔“  
”نیل لے لے کہ تم میں سچ سننے کا حوصلہ ہی نہیں ہے۔“ صباحت نے کہا تو نیل فوراً مداخلت کرتے ہوئے

”ہو جاتا ہے تم دونوں کو۔ فضول میں لڑنے لگتی ہو۔ چلو جاؤ جینج کر کے کھانا گاؤ۔“  
”نا تو ہم کھا کر آئے ہیں۔“ مدحیہ نے کہا۔  
”کھا کر آئے ہیں۔ ماما اور نیل بھائی تو ہیں۔ آپ چلیں نیل بھائی میں بس ابھی جینج کر کے آتی ہوں۔“

”نیل بھائی! اندر چلی گئی تو نیل مدحیہ کو دیکھ کر بولے۔  
”نیل روکا نہیں انہوں نے۔“ نیل جانے کیا معلوم کرنا چاہ رہے تھے۔  
”نیل۔ وہ زیادہ یہاں رہتے کب ہیں۔ آج یہاں ہیں۔ کل شاہ پور میں ہوں گے۔“ وہ انتہائی لاپرواہی سے دے رہی تھی۔

”اور تم سے پوچھا نہیں انہوں نے کہ تم شاہ پور سے کیسے آئیں؟“  
”پوچھا تھا اور انا مجھ پر ناراض ہو رہے تھے کہ میں اس طرح کیوں آئی۔ مجھے وہیں شاہ پور میں رہ کر ان کا

انتظار کرنا چاہئے تھا۔ ”مدحیہ کو اب اس بات پر غصہ آنے لگا تھا۔

”یعنی سارے حالات سننے کے بعد بھی کہہ رہے تھے کہ میں وہیں رہتی۔ آپ بتائیں میں روکتی تھی۔“  
فیصلی ذرا سانس فی میں سر ہلا کر پوچھنے لگے۔

”اور صبا کے بارے میں کیا کہا انہوں نے؟ میرا مطلب ہے اس کی رخصتی شادی کی کوئی بات کی۔“

”بالکل کچھ نہیں۔ حالانکہ اب انہیں اس مسئلے کو سلجھانا چاہئے۔ بے ناں۔“ اس نے پھر تاکید چاہی تو منہ پر ساختہ مسکراہٹ کے ساتھ بے ساختہ بولے تھے۔

”ہاں ناں۔“

رات کے گیارہ بج رہے تھے جب علی جمالیگر شاہ پور پہنچا تھا۔ بھوک اور سفر کی تھکان دونوں ہی غالب تعمیر پہلے اس نے سوچا چپ چاپ جا کر سو جائے لیکن خالی پیٹ نیند آنی بھی مشکل تھی۔ اس نے پٹن میں جھانک دیکھا تو جیراں نظر آئی۔

”جیراں! جو بھی کھانا ہو گرم کر کے نکالو میں ابھی آتا ہوں۔“ وہ دروازے میں سے کہہ کر واپس پلٹا اور قدموں سے اپنے پورشن میں آیا تو شاہ جمالیگر کے کمرے کی آواز آئی تھی جس کا مطلب تھا وہ سوئے نہیں ہیں۔ اس نے رک کر ان کے دروازے پر دستک دینے کے ساتھ کہا۔

”اباجی! میں ہوں علی۔“

”علی! ہاں اندر آ جاؤ۔“ شاہ جمالیگر کے لہجے میں تعجب غالباً اس کی بے وقت آمد پر تھا۔

اس نے ہینڈل گھما کر دروازہ کھولا اور سر اندر کر کے بولا۔ ”السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام۔ خیریت سے تو ہونا بیٹا۔“

”جی۔ دعائیں ہیں آپ کی۔“

”تو اندر آؤ۔“

”وہ بابا میں نے کھانا نہیں کھایا۔ اگر آپ۔۔۔“

”ہاں! ہاں چلو پہلے کھانا کھاؤ۔ کوئی ہے کچن میں یا سو گئے سب۔“ شاہ جمالیگر بول کر کھڑے ہو گئے جیسے نو کے لئے کھانا گرم کرنے کو تیار ہوں۔

”جیراں ہے اب اور میں اس سے کھانا نکالنے کا کہہ آیا ہوں۔ آپ بیٹھیں آرام سے میں کھانا کھا کر آپ

پاس ہی آؤں گا۔ آپ ابھی سو تو نہیں رہے نا؟“

”نہیں۔“ شاہ جمالیگر دوبارہ بیٹھ گئے تو وہ آہستہ سے ان کا دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں آیا۔ اس کا صرف منہ ہاتھ دھونے کا تھا لیکن جب آئینے میں خود کو دیکھا تو پھر شاور لے کر ہی نکلا اور ڈائمنگ میں جا کر کھانا

اس کے بعد دوبارہ شاہ جمالیگر کے کمرے میں آیا تو اب وہ باقاعدہ اس کا انتظار کر رہے تھے۔

”سوری! میں نے بے وقت آپ کو تنگ کیا۔“ اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

”نہیں نہیں بیٹا! میں تو جاگ ہی رہا تھا اور کھانا تو تمہاری ماں کو بھی اٹھا دوں۔“ شاہ جمالیگر نے اسے کھوج

نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو فوراً بولا۔

”نہیں امی کو نہیں اٹھائیں۔ مجھے بس آپ سے بات کرنی ہے۔“

”کیا بات؟“ ان کے تھکنے پر وہ اپنے آپ میں الجھ کر اور جیسے آگیا کر بولا تھا۔

”کوئی نئی بات نہیں ہے اب! ابھی پرانا قصہ ہے میری شادی کا۔ کیا سوچا ہے آپ نے؟ اگر آپ صبا سے

نہیں بتانا چاہتے تو صاف کہہ دیں میں خود اسے طلاق دے کر سارا قصہ ہی ختم کر دیتا ہوں۔“

”بابا! میں۔۔۔ شاہ جمالیگر اچھل پڑے۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہو تنگ چھوڑ دو گے۔“

”ہاں چھوڑ دوں گا۔ صرف اسے ہی نہیں آپ سب کو بھی۔ زندگی بھر میری صورت نہیں دیکھی ہیں۔“

بس ابھی فیصلہ کر لیجئے۔ صباحت کو بوسہ دینا ہے کہ نہیں۔“ اس نے ٹھوس حتمی لہجے میں کہا تو شاہ جمالیگر

نا توچکے ہیں۔ میرا مطلب ہے نکاح ہوا ہے تمہارا اس سے۔ باقی رخصتی کے لئے اس کی ماں نہیں مان رہی

یوں نہیں مان رہی۔“ وہ فوراً بول پڑا۔ ”آپ گئے تھے اس کی ماں کے پاس؟“

ن۔۔۔ نہیں۔“ شاہ جمالیگر نظریں چرا گئے۔

نب گئے ہی نہیں تو پھر کیسے کہہ رہے ہیں کہ وہ نہیں مان رہی۔ آپ ایک بار جائیں تو اور بابا جان کے

بے بن کر نہیں بلکہ میرے باپ بن کر جائیں۔ اگر آپ کو میری خوشیاں میری زندگی مطلوب ہے تو اس کے

پ کو دامن پھیلائے میں بچکچا نا نہیں چاہیے اور یہ کام تو آپ کو بہت پہلے کرنا چاہئے تھا لیکن آپ منظر سے

بے ہوش تھے۔“

یہاں تو بات وہیں پہلے مرٹلے پر ہی ختم ہو جاتی۔“

بابا! اس لئے کہ آپ لوگ فیئر نہیں تھے۔ اگر فیئر ہوتے تو آپ کے اندر پہلے مرٹلے پر ہی بات ختم ہونے

کا بلکہ یقین نہ ہوتا۔“

ابا! مطلب ہے تمہارا؟“ شاہ جمالیگر نے ناگواری سے دیکھا تھا۔

آپ اچھی طرح سمجھ رہے ہیں اب!۔ پھر بھی اگر میرے منہ سے سننا چاہتے ہیں تو سنیں کہ بابا جان کے دل میں

کے خلاف جو نفرت، بغض اور دشمنی تھی وہ انہیں طلاق دلوانے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتی تھی۔ جب ہی تو

انہیں صباحت کا پتا چلا تو وہ ایک بار پھر ڈاکٹر آسیہ کو زیر کرنے کا سوچنے لگے۔ انہیں میری شادی سے کوئی

نہیں تھا۔ ان کا مقصد صرف ڈاکٹر آسیہ سے بیٹی چھیننا تھا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو بھی چکے تھے۔

یہ نے درمیان میں اگر سارے کئے کرانے پر پانی پھیر دیا۔ جس سے وہ اور تھملا گئے اور صباحت کے

کے لئے مدحیہ کو استعمال کرنے لگے۔ کیس کیسی مقام پر انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ وہ دونوں لڑکیاں ان کا اپنا

ہ۔ ان کے ذہن پر صرف آسیہ سوار رہی اور وہ بس اس کے خلاف سوچتے اور پلٹا بنا تے رہے۔ اگر پوتوں

میں اور واقعی ان کی بہتری سوچ کر وہ آسیہ سے بیٹی مانگتے تو میں یقین سے کھوں گا کہ وہ بھی انکار نہ

تھی۔“

نہیں جانتے بیٹا وہ عورت۔۔۔۔۔“

رت ہی سے نا۔“ وہ فوراً بول پڑا۔ ”جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ پہلی سے پیدا کی گئی ہے۔ اسی کی

رک اور بیڑھی اگر آرام سے محبت سے سیدھا کرو گے تو سیدھی ہو جائے گی ورنہ ٹوٹ جائے گی اور ٹوٹی

رت کو رام کرنا بہت مشکل ہوتا ہے کیونکہ وہ ٹوٹ کر صرف بھرتی ہی نہیں پھر بھی جاتی ہے۔ آپ خدا کے

مہا بجان کے اشاروں پر چلنا بند کریں اپنے ذہن سے سوچیں کیا مباحات اور مدحیہ سکندر ریچا کی بیٹیاں نہیں

ملیں۔ میں کیا آپ کی اولاد نہیں ہوں۔“

ابا! نہیں۔“ شاہ جمالیگر مکمل طور پر اس کی گرفت میں آ چکے تھے۔

رکوں آپ میری خوشی کا خیال نہیں کر رہے۔ مجھے تو اس سارے فتنے میں آپ نے ایک طرف ڈال دیا

بے میری کوئی اہمیت، کوئی حقیقت ہی نہیں۔“

نہیں بیٹا۔“

نہیں۔ اس تمام عرصے میں ایک بار بھی آپ نے مجھ سے پوچھا کہ میں کیا چاہتا ہوں یا میرا خیال کر کے

مل آپ صرف بابا جان کے اشاروں پر چلتے رہے۔ ان ہی کی زبان بولتے رہے اور ابھی تک وہی کرتے

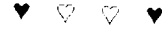
اجان کہتے ہیں۔“

فک لیجئے گا بابا! میں کاٹھ کا الو نہیں ہوں جو خاموش تماشائی بنا دیکھتا رہوں اور نہ ہی میں مزید انتظار کر سکتا

ہوں۔ صاحت میری منکوحہ ہے اور یہ طے ہے کہ ڈاکٹر آسیہ خود اسے لاکر میرے گھر نہیں پہنچاؤں گی۔ آپ جانا پڑے گا۔ امی اور آپ اور یہ سمجھ لیجئے کہ میری زندگی کی ذرا سی رشتے کے ساتھ بندھی ہے۔“  
اس کے آخری جملے پر شاہ جمنا نکیر منہ کھولے اسے دیکھتے رہ گئے کیونکہ اس نے ان کے کچھ کہنے کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی اور وہ انہی اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن گھڑی دیکھ کر پھر کسی وقت پر چھوڑنا ہوا انہی نے۔

”اچھا بابا۔ اب آپ آرام کریں بہت رات ہو گئی۔“  
”نہیں۔ تم کہاں جا رہے ہو؟“ شاہ جمنا نکیر نے چونک کر پوچھا۔  
”میں کمرے میں جاؤں؟“ وہ ہنسا کر مسکرایا۔

”ہاں اور یہ لائٹ آن کرتے جاؤ۔“  
”اوکے شب بخیر۔“ وہ لائٹ آن کر کے ان کے کمرے سے نکل آیا۔  
دو بج رہے تھے جب اس نے تکیے پر سر رکھا اور اپنی باتوں کو سوچتے ہوئے کچھ ہی دیر میں سو بھی گیا تھا۔



کافی دن چڑھ آیا تھا جب عارف بیگم نے آکر اسے اٹھایا تھا۔  
اس نے آنکھیں کھولیں تو پہلے حیران ہوا پھر ایک دم یاد آیا کہ وہ رات ہی یہاں آیا تھا۔ فوراً اٹھتے ہوئے ”السلام علیکم امی!“  
”جیتے رہو۔ رات کس وقت آئے تھے؟“ عارف بیگم نے اس کی ہلا میں لیتے ہوئے پوچھا۔

”گیارہ بج رہے تھے شاید۔“  
”گیارہ تمہارے ہاتھ بتا رہے تھے دو بجے سوئے ہو تمہیں جب ہی میں صبح تمہیں اٹھایا نہیں۔“  
”جی آیا تو میں گیارہ بجے تھا پھر ابا کے ساتھ باتوں میں دو بج گئے تھے۔ ابا اٹھ گئے یا سو رہے ہیں ابھی۔“  
”وہ تو صبح ہی اٹھ گئے تھے۔ چلو تم منہ ہاتھ دھو لو۔ میں تمہارے لئے ناشتہ بھجواتی ہوں۔“ عارف کھڑکیوں سے پردے ہٹاتے ہوئے کہا۔

”یہاں بھجوائیں گی۔ نہیں میں ادھر ہی آ رہا ہوں۔ حیران سے کہنے لگا جائے میں دودھ کم ڈالے۔“  
کچھ دیر بعد نیچے اتر کر آیا تو بس برائے نام ناشتا کیا۔ اس کے بعد بابا جان کے کمرے کی طرف جا رہا تھا سے شاہ تیور نے اسے پکار لیا۔

”علی سنو!“  
اس نے پلٹ کر دیکھا پھر قصداً ”مسکرا کر بولا۔

”ہیلو کیسے ہو۔“  
”ٹھیک ہوں۔ تم کہاں جا رہے ہو۔“ شاہ تیور نے بہت عجلت سے جواب دے کر پوچھا۔  
”یہیں بابا جان کے پاس آؤ چلو۔“ اس نے بہت سادہ سے انداز میں کہا۔  
”نہیں تم جاؤ بلکہ بعد میں چلے جانا پہلے میرے ساتھ آؤ۔“ شاہ تیور نے اسی عجلت میں آگے آکر پکڑا تو وہ حیرت سے بولا۔

”ارے میں کہیں بھاگا تو نہیں جا رہا اور جانا کہاں ہے؟“  
”تم آؤ تو۔“ شاہ تیور نے اس کا ہاتھ کھینچا تو وہ تاجا را اس کے ساتھ چل پڑا۔  
برآمدے میں آکر شاہ تیور رک گیا اور اس کا ہاتھ چھوڑ کر رازداری سے پوچھنے لگا۔  
”سنو تم نے مدیہ کو دیکھا ہے؟“  
”ہاں۔“ اس نے بڑے آرام سے اثبات میں گردن ہلائی تو شاہ تیور یک دم پر جوش ہو گیا۔

”کہاں۔ کہاں دیکھا ہے؟“  
”یہیں اسی گھر میں۔“

”اسی گھر میں! میں یہاں کی بات نہیں کر رہا۔“ شاہ تیور کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔  
”پھر کالج میں۔“ ہاں آخری بار میں نے اسے تمہارے ساتھ کالج میں دیکھا تھا۔ کیوں کیا ہوا اسے؟“ وہ سارا لمحہ سمجھ کر انتہائی معصوم اور انجان بن گیا تھا۔  
”کچھ نہیں۔“ شاہ تیور مایوسی سے نفی میں سر ہلانے لگا۔  
”نہیں۔ تم کچھ چھپا رہے ہو۔ بتاؤ کیا بات ہے؟“ اس نے اصرار سے پوچھا تو شاہ تیور کچھ دیر پر سوچ انداز میں دیکھنے کے بعد کہنے لگا۔  
”مدیہ چلی گئی یہاں سے۔ کسی کو بتائے بغیر۔ کیا تم اس کے گھر سے معلوم کر سکتے ہو کہ وہ خیریت سے پہنچ گئی۔“

”میں! امیرا تو ہاں آنا جانا نہیں ہے۔“ اس نے ایک طرح سے مددوری ظاہر کی۔  
”آنا جانا نہیں ہے فون تو کرتے ہو گے۔“ شاہ تیور نے بے قراری سے کہا۔  
”وہ بھی نہیں۔“  
”کیوں؟“

”میں کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔“ اس کے آرام سے کہنے پر شاہ تیور جنملا گیا۔  
”عجب آدمی ہو تم۔ اپنی منکوحہ کو فون بھی نہیں کرتے نمبر چھپی ہے تمہارے پاس یا وہ بھی نہیں ہے۔“  
”ہے نمبر ہے۔“ وہ اندر ہی اندر اس کی حالت سے خاصا غصہ ظاہر ہوا تھا۔  
”تو بھائی میرے، میری خاطر ہی فون کر کے مدیہ کا معلوم کرو۔“ شاہ تیور نے خوشامد سے کہا۔  
”اگر تو یوں لیکن فرض کرو اگر مدیہ وہاں نہیں پہنچی تو میں تو پھنس جاؤں گا۔ سوری یا راسا کرو مجھ سے نمبر لے لو معلوم کرنا ہے خود کرو۔“ اس نے بین کے لئے جیسے ٹٹولتے ہوئے کہا پھر اسے دیکھا۔ ”بین ہے تمہارے؟“

”ہاں۔“ شاہ تیور نے جب سے بین نکال کر اسے دیا تو وہ اس کے ہاتھ پر نمبر لکھ کر بولا۔  
”اگر تمہاری بات ہو مدیہ سے تو میری منکوحہ کو میرا سلام کھلوانا۔“  
”صرف سلام۔“ شاہ تیور نے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔  
”صرف سلام۔“ وہ کھل کر مسکرایا اور اسے ہاتھ ہلاتا ہوا اندر آیا تو کچھ دیر بی بی جان کے پاس بیٹھا پھر بابا جان کے کمرے میں آیا۔

”السلام علیکم بابا جان!“ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سلام کیا تھا۔  
”کونسا جزاؤں! ہم کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ بابا جان نے کہا تو وہ بڑھ کر پوچھنے لگا۔  
”اب کو میری آمد کی اطلاع کس نے دی؟“  
”مجھ تمہارے باپ نے بتایا تھا کہ رات گیارہ بجے تم آئے بغیر کسی اطلاع کے۔“  
”گوئی اتنی دور سے تو نہیں آتا ہو تا بابا جان جو پہلے سے پروگرام بنایا جائے اور یہاں اطلاع کی جائے۔ بس جب پابنتا چل پڑتا ہوں۔ آپ سنائیں کیا مصروفیات ہیں آج کل؟“ اس نے اپنی بات سرسری انداز میں کہہ کر ان مصروفیات جاننے میں دلچسپی ظاہر کی۔

”ہماری مصروفیات وہی ہیں جو ہمیشہ سے چلی آ رہی ہیں۔ زمینوں کے بکھیرے پھر تم لوگوں کے مسائل۔ کیا ہوا اڑی شادی کا۔ کچھ بات بنی؟“ بابا جان نے یوں کہا جیسے اس مسئلے کو سلجھاتے سلجھاتے تھک گئے ہوں۔  
”بات بنانے سے بنی ہے بابا جان! جبکہ ادھر سے ایسی کوئی کوشش ہی نہیں کی گئی۔“ اس کی صاف گوئی پر بابا

جان کی پشانی شکنیں آلود ہو گئی۔  
 ”جی نہیں۔ میں نے اسے نہیں دیکھا۔“

ابو اس بند کو سکندر اور چلے جاؤ ہمارے سامنے سے ورنہ۔۔۔ ”بابا جان کا اشتعال انتہا کو چھو رہا تھا۔  
 ورنہ کیا۔ شوٹ کریں گے مجھے گردیں۔“ شاہ سکندر اٹھ کھڑے ہوئے تو وہ خاموشی سے دیکھ اور سن رہا  
 دم حرکت میں آیا۔  
 چچا جان! پلیر چلیں۔“

میں۔۔۔ آج دیکھ لینے دو کہ کتنا دم خم ہے ان میں۔“ شاہ سکندر کی طرف سے کھلا چیلنج تھا۔  
 م خم دیکھنا چاہتے ہو؟“ بابا جان دیوار پر لگی ہندو کی طرف دیکھتے ہوئے اٹھے تھے۔  
 جگڑا۔ وہ دماغی پریشان ہو گیا اور بھاگ کر بابا جان کے سامنے آکر بولا۔ ”خدا کے لئے بابا جان! یہ کوئی مذاق  
 ہے۔“

اٹھ جاؤ علی۔“ بابا جان نے اسے دھکیلنے کے لئے ہاتھ اٹھائے تو اس نے ان کی دونوں کانیاں تھام لیں۔  
 اتنی مضبوط تھیں کہ بابا جان کی آنکھوں کی پتلیاں سڑک گئیں اور اس سے پہلے کہ ان کی کمزوری ظاہر ہوئی وہ  
 اور شاہ سکندر کی طرف سے منہ موڑتے ہوئے بولے۔  
 لے جاؤ اسے یہاں سے۔“

سکندر نے اونہ کے انداز میں سر جھٹکا اور کین کی چیر کو پیر سے ٹھوکر مارتے ہوئے کمرے سے نکل گئے تو  
 ے مطمئن سے ہو کر بابا جان کے بیروں کے پاس بیٹھنے ٹیکتا ہوا بولا۔  
 یس بابا جان، ریلیکس۔“ پھر ادھر ادھر کی باتیں کر کے انہیں ریلیکس کر کے ہی ان کے کمرے سے نکلا

”اس نے صباحت کو پکارتے ہوئے نیل کے کمرے میں جھانکا تو وہ کتاب سے نظرس ہٹائے بغیر بولے۔  
 نہیں ہے۔“

ماں ہے؟“ اس نے پورا دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا۔  
 لی ہوگی۔“ اس بار نیل نے کتاب بند کر کے اسے دیکھا تو وہ برا سامنہ بنا کر بولی۔  
 ناگوئی نام ضرور ہونا چاہئے۔ کتنا عجیب لگتا ہے۔ نیچے۔ نیچے۔ نیچے۔ نیچے۔ نیچے۔ نیچے۔  
 بے ساختہ مسکرائے لیکن بولے کچھ نہیں۔  
 آپ کو عجیب نہیں لگتا؟“ وہ نیچے اوپر کی گردان سے جھنجھلا کر ان سے پوچھنے لگی۔

لئے کہ آپ خود عجیب ہیں۔“ وہ بے ساختہ بولی تھی۔  
 نے تھک گیا۔“ نیل نے خاصے محفوظ انداز میں تاکید کی تو وہ جاتے جاتے پلٹ آئی۔  
 کہا۔“

بس عجیب ہوں۔“ نیل نے کہا تو وہ کچھ دیر انہیں دیکھنے کے بعد بولی۔  
 رگستہ عجیب بھی نہیں ہیں۔“  
 واہ تھوڑا سا۔“ نیل بھی بھی ہی اس موڈ میں آتے تھے۔  
 سے بھی صبا کی وجہ سے ہیں۔“ اس نے کہا تو نیل حیران ہوئے۔  
 مباح کی وجہ سے کیوں؟“

پوری عجیب بلکہ عجوبہ ہے اور آپ پر تھوڑا بہت اس کا اثر آیا ہے۔“  
 تم نے نئی بات بتائی۔“ نیل نے بمشکل جیسی مضطرب کر کے کہا تب ہی فون کی بیل پر وہ انہیں ابھی آئی  
 کرفون کے پاس آئی تھی۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا بابا جان۔“ وہ خاصا جڑ بڑ ہوا۔  
 ”پھر کیا مطلب ہے تمہارا کیا چاہتے ہو تم؟“ بابا جان کے لہجے میں طنز تھا جیسے تم مجھے مشورہ دو گے۔  
 اس نے مصلحتاً ”خاموشی اختیار کر لی اور پھر اسی خاموشی سے اٹھ کر جانے لگا کہ اسی پل دروازہ کھلی سی رہ سکے  
 ساتھ کھلا اور شاہ سکندر اندر داخل ہوئے تھے۔  
 ”السلام علیکم چچا جان۔“ اس نے سلام میں پھل کی۔  
 ”شاہ سکندر سر کے اشارے سے جواب دے کر بابا جان کی طرف متوجہ ہو کر بولے۔  
 ”السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام۔“ بابا جان نے انہیں جواب دے کر فوراً علی جمائیکر کو دیکھ کر پوچھا۔ ”تم دونوں ساتھ آ  
 تھے؟“  
 ”جی نہیں۔ میں رات کو آیا تھا اور چچا جان شاید ابھی آرہے ہیں۔“ اس نے کہا تو شاہ سکندر آگے آتے ہو  
 بولے۔

”شاید نہیں یقیناً۔“  
 ”ہوں۔“ بابا جان نے یوں ہٹکارا بھرا جیسے ان دونوں کی آمد کو کوئی معنی پہنارہے ہوں۔  
 ”آپ کس سوچ میں پڑ گئے بابا جان۔“ شاہ سکندر نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بابا جان کو نوکا تو وہ چو  
 کر بولے۔

”ماں بیٹھو۔“  
 ”شکریہ۔“ شاہ سکندر نے بیٹھتے ہوئے علی جمائیکر کے کندھے پر دباؤ ڈال کر اسے بھی اپنے ساتھ بیٹھایا تھا  
 قصداً ”بابا جان کو سنا کر اس سے کہنے لگے۔  
 ”کل میں نے تمہیں اپنے ماں آنے سے روک دیا تھا تم نے ضرور مانتا کیا ہو گا۔“ آئی ایم سوری۔ اصل

اس وقت صباحت اور مدحیہ میرے پاس آئی ہوئی تھیں۔“  
 ”مدحیہ۔“ بابا جان بے اختیار بول کر خاموش ہو گئے تو شاہ سکندر انہیں دیکھتے ہوئے بولے۔  
 ”جی مدحیہ۔ آپ نے تھیک کہا تھا کہ وہ کراچی میں ہے۔ اپنی ماں کے پاس لیکن آپ اسے چھوڑ کر نہیں  
 تھے۔“

”کوئی بھی چھوڑ آیا ہو۔“ بابا جان نے اس بات کو قطعی غیر اہم قرار دے کر اپنی طرف سے موضوع ختم کر دیا  
 ”کوئی بھی نہیں بابا جان! کوئی بھی نہیں۔“ شاہ سکندر ایک دم آپ سے باہر ہو گئے۔ ”دکھ تو اس بات کا۔  
 میری بیٹی کو یہاں سے اپنی جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ کیوں۔۔۔ کیوں کیا آپ نے اس کے ساتھ ایسا۔ رقبے پر  
 چھوڑ دیا۔“  
 ”شکر کرو رقبے پر چھوڑا، کہیں اور نہیں پہنچا دیا۔“ بابا جان کا کھیل ختم ہو چکا تھا لیکن وہ بارہائے والوں میں  
 نہیں تھے۔

”ارادہ تو آپ کا ایسا ہی تھا، لیکن۔۔۔“  
 ”خدا الزام مت لگاؤ سکندر۔۔۔“ بابا جان زور سے دھاڑے۔ ”اگر ہمارا ایسا کوئی ارادہ ہوتا تو تم کبھی اس  
 دیکھ نہیں سکتے تھے کیونکہ ہم کبھی اپنے ارادے میں ناکام نہیں ہوئے۔“  
 ”ناکامی ہی نے آپ کو بولکھا دیا ہے بابا جان! جو آپ کوئی رشتوں کی پہچان بھی بھول گئے ہیں۔“ شاہ سکندر  
 کے دھاڑنے کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

”مدحیہ ہیں۔“ دوسری طرف شاہ تیمور تھا۔ جانے آواز بدل کر بولا تھا یا وہ نہیں پہچانی تھی۔  
”جی آپ کون۔“

”مدحیہ، میں ہوں تیمور۔“ شاہ تیمور نے اس بار اسے پہچان کر کہا تو وہ لہک کر بولی۔

”اوشاہ تیمور، کیسے ہیں آپ؟“  
”کیسا رکھنا چاہتی ہو تم؟“ شاہ تیمور کے جذباتی لہجے پر وہ ایک لحظہ کو کھنٹی پھر فوراً سنبھل کر کہنے لگی۔  
”جیسے آپ ہیں۔ ویسے یہ امید کم ہے کہ میں دوبارہ آپ کو دیکھ سکوں گی۔“

”کیوں؟“

”جانتی نہیں۔“ وہ ٹال کر موضوع بدل گئی۔ ”اور سب لوگ کیسے ہیں؟“  
”تھیک ہیں۔ یہ بتاؤ تم اس طرح کیوں چلی گئیں بغیر بتائے۔“ شاہ تیمور کے لہجے میں چور تھا۔ وہ زور سے نہ  
”بابا! آپ کا مطلب ہے مجھے بتا کر آنا چاہئے تھا۔ کسے آپ کو یا بابا جان کو؟“

”کسی کو بھی۔“ وہ اس کی ہنسی سے مزید جڑ بڑھا تھا۔  
”چھا! آئندہ خیال رکھوں گی اور کوئی بات۔“ اس نے بے نیازی سے کہہ کر پوچھا تو وہ فوراً بولا۔

”میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”کیوں؟“  
”مدحیہ! آیا ہو گیا ہے تمہیں۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ میں تم سے کیوں ملنا چاہتا ہوں؟“ شاہ تیمور نے ٹوکر  
کیا۔

”کیوں ملنا چاہتے ہیں؟“ وہ بیکہ مدما جہنی بن گئی۔  
”تم جانتی ہو۔“ اچھی طرح جانتی ہو کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔“ شاہ تیمور نے زور سے کہہ کر کہا تو وہ چیخ  
”شٹ اپ شاہ تیمور! مجھے اس حال میں پھانسنے کی کوشش مت کرو۔ میں تم سے، تمہارے پورے  
سے نفرت کرتی ہوں۔ شدید نفرت۔ مجھے تم اور آئندہ کبھی مجھے فون مت کرنا۔“

اس نے انتہائی غصے سے ریسورٹ کر لیا اور جیسے ہی ہلکی سا نکیل اٹھائی اور صباحت کھڑے نا سمجھنے والے ایک  
دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔



”اوشاہہ محبت! ایسی ہی باگل احق ہوں تا میں جوان کے قریب میں آ جاؤں گی۔ سو بارعت بھیج  
اسے جرات کیسے ہوئی یہاں فون کرنے کی۔“ وہ بقیہ غصہ اپنے آپ بول کر نکالنے لگی تھی۔  
”اوشاہہ! کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ کون تھا؟“ نیل کے اشارے پر صباحت نے اس کے قریب آ کر پوچھا۔  
”وہ شاہہ۔ شاہ تیمور جسے میں چکروے کر بھاگی تھی۔“ اس نے یوں بتایا جیسے اگر وہ سامنے ہوتا تو اسے  
لیتی۔

”کیا کہہ رہا تھا؟“ صباحت نے اس کے غصے سے خائف ہو کر کچھ ڈرتے ڈرتے پوچھا۔  
”کہہ رہا تھا کہ اسے مجھ سے محبت ہے اور ملنا چاہتا ہے۔ ہونہ۔“  
اس نے استہزائیہ انداز میں کہہ کر سر جھکا تو صباحت نے بے اختیار نیل کی طرف دیکھا۔ جن  
ایک سایہ سالہا لیا تھا۔ پھر بھی بڑے ضبط سے بولے تھے۔

”تو اس میں ناراض ہونے والی کیا بات ہے؟“  
”کیا! وہ مزید سلگ کر چینی۔“ آپ کے خیال میں مجھے خوش دونا چاہیے؟“  
”ہے تو خوش کی بات کہ تمہارے لیے جی شاہ پورے۔“  
”بس نیل بھائی! خاموش ہو جائیں۔“ وہ چیخ کر بولی اور پھر ایک مہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔

رہے۔“ نیل نے پریشان ہو کر صباحت کو دیکھا تو اس نے اشارے سے اسے چھپڑنے سے منع کیا لیکن  
وہ نہیں سکے اور قریب آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا کہ وہ ایک جھٹکے سے ان کا ہاتھ ہٹا کر پیچھے ہٹتے  
پول۔

بات بات کر رہی تھی۔ مجھ سے۔ میں جانتی ہوں آپ سب مجھ سے تنگ ہیں۔ میں چلی جاؤں گی یہاں سے۔“  
جلی، تو تم بالکل۔ ایسا کیا کہہ دیا ہے نیل بھائی نے جو تم ان پر ناراض ہو رہی ہو۔“ صباحت نے ٹوکتے ہوئے  
نیل یہ شاہ پور والوں کی فیور نہیں کر رہے۔“ وہ روتے ہوئے اسی طرح بولی۔

”میں نے کب کسی کی فیور کی ہے۔ میں تو یونہی ایک بات کہہ رہا تھا۔“ نیل نے کہا تو وہ چیخ کر بولی۔  
”نی ضرورت نہیں ہے آپ کو یونہی ایک بات کہنے کی۔ بہت برے لگتے ہیں مجھے شاہ پور والے، بد نیز، ظالم  
“

”نیل نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ پھر تیسہ ہی انداز میں کہنے لگے۔“ سوچ سمجھ کر  
غصے میں بالکل ہی آؤٹ ہو جاتی ہو۔ شاہ پور میں تمہیں تو دیں گے کن گاری تمہیں۔ یہاں آتا ہی نہیں  
تھیں۔“

”نیل نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ پھر تیسہ ہی انداز میں کہنے لگے۔“ سوچ سمجھ کر  
غصے میں بالکل ہی آؤٹ ہو جاتی ہو۔ شاہ پور میں تمہیں تو دیں گے کن گاری تمہیں۔ یہاں آتا ہی نہیں  
تھیں۔“

”نیل نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ پھر تیسہ ہی انداز میں کہنے لگے۔“ سوچ سمجھ کر  
غصے میں بالکل ہی آؤٹ ہو جاتی ہو۔ شاہ پور میں تمہیں تو دیں گے کن گاری تمہیں۔ یہاں آتا ہی نہیں  
تھیں۔“

”نیل نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ پھر تیسہ ہی انداز میں کہنے لگے۔“ سوچ سمجھ کر  
غصے میں بالکل ہی آؤٹ ہو جاتی ہو۔ شاہ پور میں تمہیں تو دیں گے کن گاری تمہیں۔ یہاں آتا ہی نہیں  
تھیں۔“

”نیل نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ پھر تیسہ ہی انداز میں کہنے لگے۔“ سوچ سمجھ کر  
غصے میں بالکل ہی آؤٹ ہو جاتی ہو۔ شاہ پور میں تمہیں تو دیں گے کن گاری تمہیں۔ یہاں آتا ہی نہیں  
تھیں۔“

”نیل نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ پھر تیسہ ہی انداز میں کہنے لگے۔“ سوچ سمجھ کر  
غصے میں بالکل ہی آؤٹ ہو جاتی ہو۔ شاہ پور میں تمہیں تو دیں گے کن گاری تمہیں۔ یہاں آتا ہی نہیں  
تھیں۔“

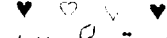
”نیل نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ پھر تیسہ ہی انداز میں کہنے لگے۔“ سوچ سمجھ کر  
غصے میں بالکل ہی آؤٹ ہو جاتی ہو۔ شاہ پور میں تمہیں تو دیں گے کن گاری تمہیں۔ یہاں آتا ہی نہیں  
تھیں۔“

”نیل نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ پھر تیسہ ہی انداز میں کہنے لگے۔“ سوچ سمجھ کر  
غصے میں بالکل ہی آؤٹ ہو جاتی ہو۔ شاہ پور میں تمہیں تو دیں گے کن گاری تمہیں۔ یہاں آتا ہی نہیں  
تھیں۔“

”نیل نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ پھر تیسہ ہی انداز میں کہنے لگے۔“ سوچ سمجھ کر  
غصے میں بالکل ہی آؤٹ ہو جاتی ہو۔ شاہ پور میں تمہیں تو دیں گے کن گاری تمہیں۔ یہاں آتا ہی نہیں  
تھیں۔“

”وہ کیا چاہتے ہیں؟“ کاش تم جان سکو۔“ صباحت کی دھیمی آواز اس نے سن لی تھی پھر بھی پوچھنے لگی۔  
”کیا کام ہے؟“

”کچھ نہیں۔ چلو آؤ نیچے چلتے ہیں۔ میں نے عمر سے کچھ کتابیں منگوائی تھیں پتا نہیں لایا ہے کہ نہیں۔  
صباحت بات بدل گئی۔  
”تم جاؤ۔“ وہ اس کے بات بدلنے پر چڑ کر بولی اور اس کے بنے۔ بعد دھیمی آواز میں نیپ آن کر کے یہ  
گئی تھی۔



شاہ سکندر آج تیسرے دن بھی حویلی ہی میں تھے۔ لیکن بابا جان سے دوبارہ ان کا سامنا نہیں ہوا تھا۔  
قصداً ”گریز کر رہے تھے کیونکہ ان کے اندر ابھی بھی غصہ بھرا تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ بابا جان سے پھر ان کا  
کامی ہو۔ اتنا تو وہ جان گئے تھے کہ بابا جان کو صباحت اور مدیحہ سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ انہوں نے صرف آہ  
اپنی ضد بنا رکھا ہے۔ جبکہ خود ان کے پیش نظر ان کی دونوں بیٹیاں تھیں اور وہ صرف باپ بن کر ان کے لیے  
رہے تھے تو ان کی خواہش تھی کہ بابا جان نے جس طرح اپنی دوسری اولادوں اور ان کی اولادوں کی شادیاں کر  
اسی طرح اور اسی شان سے ان کی بیٹی صباحت کو بھی رخصت کرالائیں۔ اور وہ اس سلسلے میں بابا جان سے سہ  
سے بات کرنا چاہتے تھے۔ لیکن مدیحہ کے معاملے میں جو ان کے ساتھ بچ کما ہی ہوئی تھی اس کی وجہ سے خود  
مؤذ ابھی تک خراب تھا۔ کتنی بار مرنساء نے ان سے بات کرنے کی کوشش کی، لیکن ہر بار انہوں نے جھڑپ  
اسے خاموش کر دیا تھا اور اس بار تو کمرے سے ہی نکل جانے کو کہا تو وہ بری طرح تپ کر ان کے مقابل آگئی تھیں  
”شاہ! یہ گھرتویں بھی آپ کے لیے سرائے ہے۔ دو ایک دن کے لیے آتے ہیں ان میں بھی اپنے مسائل  
الجھے رہتے ہیں۔ میرے لیے بچوں کے لیے آپ کیسے کوئی وقت نہیں۔“  
”میرے مسائل الگ نہیں ہیں۔ بچوں ہی کے لئے پریشان ہوں۔“ وہ اس کا تپا ہوا سرخ چہرہ دیکھ کر قند

نرم ہو گئے لیکن انداز میں ناگواری تھی جیسے بات نہ کرنا چاہتے ہوں۔  
”میں بھی بچوں کی بات کرنا چاہتی ہوں۔“ مرنساء نے کہا تو اس بار وہ کچھ سنبھل کر بولے۔  
”کیا بات؟“

”آغا! ماشاء اللہ شادی کے قابل ہو گیا ہے۔ اس کے لیے میں شہر بانو کی بیٹی لانے کا سوچ رہی ہوں۔ بابا جان  
بھی یہی چاہتی ہیں اور الماس کے لیے۔“  
”الماس ابھی چھوٹی ہے۔“ وہ فوراً بول پڑے۔ ”اس کے لیے تمہیں ابھی سے فکر کرنے کی ضرورت  
ہے۔ میں اسے بہت بڑھانا چاہتا ہوں۔ انٹرمیڈیٹ مارکس لے آئی تو میڈیکل میں ایڈمیشن کرا دوں گا۔“  
مرنساء نے فوراً کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ کچھ دیر تک سوچتی رہی پھر ان کی بات سے متفق ہو کر کہنے لگی۔  
”ٹھیک ہے الماس پڑھے گی لیکن آغا تو زمین جائیداد دیکھنے والا ہو گیا ہے اس کی شادی میں دیر کیوں کریں؟  
”دیر صرف صباحت کی شادی میں ہے۔ وہ بھی بابا جان کر رہے ہیں۔ آج اگر وہ اسے رخصت کرالائیں۔“  
میں۔“

”اس کی شادی سے ہمارا کیا تعلق؟“ مرنساء نے چڑ کر ان کی بات کاٹ دی۔  
”تمہارا ہونا نہ ہو میرا تعلق ہے۔ اور گو کہ وہ آغا سے چھوٹی ہے، لیکن خود بابا جان نے پہلے اس کی شادی کی  
چھٹی تھی اور یہ طے ہے کہ جب تک اس کا معاملہ سلجھ نہیں جاتا میں اور کسی بچے کی شادی کا سوچوں؟  
نہیں۔“ شاہ سکندر نے جتنی انداز میں کہہ کر بات ختم کر دی۔  
”اس کا معاملہ تو ساری زندگی نہیں سلجھے گا۔ اپنی ماں کی طرح وہ بھی بیٹھی رہے گی اس گھر میں۔“ مرنساء  
جل کر کہا تو وہ چیخ پڑے۔

”شٹ اپ مرنساء۔“

”نہیں خاموش ہو سکتی میں۔ آپ میری اولاد کا حق مار رہے ہیں۔ آپ کا بس چلے تو ساری زمین جائیداد ان ہی  
دیکوں کے نام لکھ دیں اور لکھ بھی دیتے اگر میری جگہ کوئی عام سی عورت ہوتی۔ میں نے اپنا حق چھوڑا نہ اولاد کا  
بڑوں کی اور سن لیں اس لڑکی کا معاملہ سلجھنے نہ سلجھنے مجھے آغا کی شادی کرنی ہے۔“  
شاہ سکندر بند منہ بھی ہونٹوں پر جمائے شعلہ بار نظروں سے اسے چلاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ جب وہ خاموش  
ہو تو بہت ضبط سے بولے تھے۔

”سنو مرنساء! میں اگر چاہوں تو ابھی بھی اپنا سب کچھ مدیحہ اور صباحت کے نام لکھ سکتا ہوں، کوئی نہیں روک  
مجھے لیکن میری صرف وہی دوستیاں نہیں ہیں، تین بچے یہاں بھی ہیں اور میں سب کے لیے ایک جیسا سوچتا  
ہوں۔“

”ایک جیسا سوچتے ہیں تو پھر آغا کی شادی پر اعتراض کیوں کر رہے ہیں؟“  
”میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس کی شادی وہیں ہوگی جہاں تم چاہتی ہو، لیکن صباحت کی شادی کے بعد  
اس کے لیے تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ میں ابھی بابا جان سے بات کرتا ہوں۔“ وہ ایک دم بابا جان  
بات کرنے پر آمادہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

ور جب بابا جان کے کمرے میں داخل ہو کر انہیں سلام کیا تو وہ یہی سمجھے کہ اپنے اس روز کے رویے پر نادم  
آئے ہیں۔ جب ہی چھوٹے ہی کہنے لگے۔

”تم کبھی کبھی حد سے بڑھ جاتے ہو سکندر! اور یہ جرات تم اس لیے کرتے ہو کہ جانے ہو، ہم اپنی اولادوں میں  
سے زیادہ تمہیں چاہتے ہیں۔“

اے سکندر نے صرف اس لئے انہیں نہیں جھٹلایا کہ اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے تھے۔  
کھڑے کیوں ہو۔ بیٹھو۔“ بابا جان نے ان کی خاموشی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا بابا جان۔“ وہ بیٹھتے ہوئے کہنے لگے۔ ”مجھے صباحت کے سلسلے میں یہ پوچھنا  
راس کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے۔ کب تک وہاں کے گھر بیٹھی رہے گی؟“

”تب تک اس کی ماں چاہے گی۔“ بابا جان نے فوراً کہا تو وہ زور دے کر بولے۔  
”اس کی ماں کو چھوڑیں۔ میں اس کا باپ اسے رخصت کرنا چاہتا ہوں کیونکہ میرے آگے اور بھی اولاد ہے اور  
باحث کے فرض سے سیکدوش ہو کر ہی اوروں کے بارے میں سوچ سکتا ہوں۔“

”تو اچھی بات ہے۔ جہاں تک مدیحہ کے ساتھ بیٹھ کر کوئی قریبی تاریخ طے کرلو۔“  
”بلے سارے معاملات میں نے اور جہاں تک بھائی نے طے نہیں کیے تھے۔“

”ی نے بھی کیے ہوں، تمہیں اب بیٹی رخصت کرنی ہے۔“  
”لیکن اس طرح جس طرح آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ آئیہ سے بیٹی چھینیں گے نہیں بلکہ اس کے  
ر رخصت کرا کے لائیں گے۔“ شاہ سکندر نے انہیں ان کا وعدہ یاد دلایا۔

”لیا، ہم گئے نہیں تھے۔“ بابا جان کے اطمینان سے کہنے پر وہ بری طرح مسک گئے۔  
”بے گئے تھے۔“

”لندرا! کیا چاہتے ہو تم؟“

”اب اچھی طرح جانتے ہیں اور میں آپ کو فوراً اس لئے کر رہا ہوں کہ یہ سارا کھیل آپ نے شروع کیا تھا  
میری طرف سے پہل ہوئی تو میں خود اس سے بیٹیاں چھین لانا۔ خیر چھوڑیں ان باتوں کو جو ہو گیا سو ہو گیا۔  
نزدیک اب سب سے اہم صباحت کی رخصتی ہے اور وہ اسی وقت عمل میں آئے گی جب آپ خود جا کر آئیہ  
نا کریں گے۔“ شاہ سکندر جتنی الامکان اپنے لہجے پر قابو پا کر بول رہے تھے۔ پھر بھی ان کی آواز قدرے تیز



ہو گئی تھی۔

”جی ہاں!“ الماس فوراً ہی آگئی تھی۔  
دینا میری الماری میں جتنا سامان ہے، سوٹ کیس میں پیک کر دو۔“ انہوں نے الماس سے بات کرتے ہوئے  
مجھ نرم کر لیا تھا۔

”سارا سامان۔“ الماس کو حیرت اس بات پر تھی کہ سارا سامان ایک سوٹ کیس میں کیسے آئے گا اور وہ سمجھ کر  
”سوٹ کیس لے لو، دو میں تو آجائے گا ناں۔“

”شاید۔“ الماس ڈرینگ روم کی طرف بڑھ گئی تو انہوں نے قصداً ”مہر النساء کو نظر انداز کر دیا اور اپنا بریف  
اٹھا کر بیڈ پر رکھا پھر دراز کھول کر اس میں سے تمام کاغذات اور دوسری چیزیں نکال کر بریف کیس میں رکھنے

”شاہ! آپ نے بابا جان سے کہہ دیا ہے کہ آپ یہاں سے جارہے ہیں۔“  
”کیوں؟“ وہ سراوٹھائے بغیر اسے دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔ ”ان سے کہنا ضروری ہے کیا یا تم یہ سمجھتی ہو کہ وہ  
”روک لیں گے۔ نہیں مہر النساء! روک تو وہ مجھے پہلے بھی نہیں سکے تھے۔“  
”آپ گئے ہی ایسے تھے کہ۔۔۔“

”اب اس طرح رات کے اندھیرے میں نہیں جاؤں گا۔“ وہ فوراً بول پڑے۔  
”جاؤ کرو سارے میں اعلان کہ میں ہمیشہ کے لئے یہاں سے جارہا ہوں۔ جاؤ مہر النساء۔“  
مہر النساء ان کے غضب ناک ہونے پر خائف سی ہو کر کمرے سے نکل گئی۔  
”ٹان سینس۔“ انہوں نے سر جھٹکاتے ہی الماس ڈرینگ سے نکل کر پوچھنے لگی۔

”کیا ہوا بابا؟“  
”کچھ نہیں بیٹا! تم اپنا کام کرو۔ اور ہاں سنو، اسٹڈی میں رائننگ نیبل کی دراز میں جتنی ڈائریاں ہیں وہ سب  
”ایس کیس میں رکھ دو۔“

”آپ کہاں جارہے ہیں بابا! میرا مطلب ہے کیا بہت زیادہ دنوں کے لئے جارہے ہیں؟“ الماس نے قدرے الجھ  
”پوچھا تو وہ یوں اسے دیکھنے لگے جیسے سمجھ نہ پا رہے ہوں کہ کیا جواب دیں۔ پھر اسے قریب بلا کر پوچھنے لگے۔  
”تم چلو گی میرے ساتھ!“  
”کہاں؟“

”کراچی۔ میں نے مستقل وہیں سکونت کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ انہوں نے کہا تو وہ فوراً پوچھنے لگی۔  
”اسی جی جا رہی ہیں؟“

”میں نے تو ان سے طے کر لیا ہے آگے ان کی مرضی۔“ وہ کہہ کر پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے تو الماس کچھ  
”ہونے کے بعد پوچھنے لگی۔  
”بابا! اگر امی نے انکار کر دیا تب بھی آپ جائیں گے؟“

”ہوں۔“ انہوں نے پہلے مصروف انداز میں جواب دیا پھر اسے دیکھ کر کہنے لگے۔ ”بیٹا! جیسے تم میری بیٹی ہو اسی  
”نہ صاحب اور مدد مجھ میں ہیں۔“

”تو اب ان کے لئے جارہے ہیں۔“ ان کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ الماس بول پڑی تھی۔  
”ہاں! لیکن اس کا یہ مطلب ہمیں ہے کہ میں تم سے غافل ہو جاؤں گا۔ ہرگز نہیں۔“ وہ بریف کیس بند کر کے  
”کھڑے ہوئے۔“ چلو بیٹا! جلدی سے پیکنگ کرو مجھے ابھی جانا ہے۔“

”الماس بڑی بے دلی سے اٹھ کر دوبارہ ڈرینگ روم میں چلی گئی تو وہ بی بی جان سے ملنے کے ارادے سے نیچے آئے  
”لڈو جی میں بی بی جان کے ساتھ بابا جان اور مہر النساء کو دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ ان کے خلاف کیا محاذ کھل چکا ہے  
”وہ اس کے لئے تیار بھی تھے لیکن لڑنا نہیں چاہتے تھے، کیونکہ جانتے تھے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔“

بابا جان ان کی آخری بات پر یوں بن گئے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔

”یہ آسیہ کی ضد نہیں ہے بابا جان!“ وہ ان کے انجان بننے پر زچ ہو کر کہنے لگے۔ ”وہ دوسرے سے صحبت  
یہاں بیٹھنا ہی نہیں چاہتیں۔ آپ جانتے ہیں وہ خلع کا دعویٰ دائر کر چکی تھیں۔ اگر میں درمیان میں نہ آتا تو  
تک فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ پھر تباہ میں آپ کیا کرتے۔ اتنی پلاننگ کے بعد کیا حاصل ہوتا آپ کو۔ انا آپ کا وقت  
مجرور ہوتا اور میں زیادہ عرصہ تک آسیہ کو مزید اقدام سے نہیں روک سکوں گا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس  
کے اگلے نوٹس سے پہلے ہی آپ صحبت کو رخصت کرالائیں۔“

”جب وہ ڈاکٹری اسے یہاں بیٹھنے کو تیار ہی نہیں ہے تو پھر تم کس حساب سے ہمیں اس کے پاس جانے  
مجبور کر رہے ہو؟“ ان کی پوری بات سننے کے بعد بڑے سکون سے کہا تھا۔  
”وہ آپ کی بات نہیں ٹالے گی۔ مجھے یقین ہے۔“ انہوں نے بڑی امید سے کہا۔

”یہ یقین ہمیں اس ڈاکٹری نے دیا ہے؟“ بابا جان کے مشکوک لہجے نے انہیں بری طرح ہرٹ کیا تھا  
انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی برداشت کی حد ختم ہو چکی ہے مزید اگر بابا جان نے ایک لفظ بھی کہا تو وہ پھٹ پڑ  
گئے۔ ”بس بابا جان!“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”میں نے جان لیا کہ آپ کسی قیمت پر صحبت کو رخصت کرانے نہ

جائیں گے۔“  
ان کے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جانے کیا تھا۔ بابا جان ایک لحظہ کو ٹھٹکے پھر فوراً بولے تھے۔  
”ہم یہاں اس کا استقبال۔“

”نہیں۔“ انہوں نے بھی فوراً ٹوک دیا۔ ”صحبت یہاں نہیں آئے گی۔“  
”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ بابا جان نے کوشش سے اپنے لہجے کو مضبوط بنایا تھا۔  
”اس کی ماں نے جو فیصلہ کیا ہے وہی ٹھیک ہے۔ میں ناحق اسے روکتا رہا۔“ وہ بابا جان کی طرف دیکھے بغیر

اپنے آپ سے کہتے ہوئے ان کے کمرے سے نکل آئے تھے۔  
♥ ♥ ♥ ♥  
”مہر النساء! میرا سارا سامان پیک کر دو۔“ شاہ سکندر نے اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی مہر النساء کو نما

کر کے کہا تو وہ تعجب سے پوچھنے لگی۔  
”سارا سامان کیوں؟“

”میں یہ جو ملی ملکہ شاہ پور چھوڑ رہا ہوں، ہمیشہ کے لئے تم اور بچے بھی اگر میرے ساتھ چلو تو مجھے  
ہوگی۔“ انہوں نے بہت سادہ لہجے میں کہہ کر سگریٹ کیس اٹھالیا اور اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر  
میں دیا۔ پھر لاٹری تلاش میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے انہیں خیال آیا کہ مہر النساء نے کوئی جواب نہیں دیا۔  
پلٹ کر دیکھا تو وہ پیشانی پر بے شمار شکنیں ڈالے جانے لگا سوچ رہی تھی۔

”مہر النساء! سنا نہیں تم نے، میں نے کیا کہا ہے۔“ انہوں نے قدرے اونچی آواز میں اسے پکارا تو وہ چونچ  
بولی۔ ”ہاں، جو ملی چھوڑ رہے ہیں، لیکن کیوں؟“

”میری مرضی۔ تم یہ بتاؤ میرے ساتھ چلو گی کہ نہیں۔“ انہوں نے فیصلہ کن انداز میں پوچھا۔  
”کیا ہو گیا ہے شاہ آپ کو۔ اگر بابا جان نے کچھ کہہ دیا ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ آپ دوبارہ  
دیں۔ ایسا کریں آپ دو چار دنوں کے لئے شہر چلے جائیں۔ واپس آئیں گے تو بابا جان کا غصہ ٹھنڈا ہو چکا  
النساء! انا انہیں سمجھانے کھڑی ہو گئی۔

”تو تم نہیں جاؤ گی۔“ وہ اس کے سمجھانے پر تپ کر بولے اور اونچی آواز میں الماس کو پکار لیا۔  
504

وہ جب سے شاہ جہانگیر کو اپنے حق میں ہموار کر کے کراچی آیا تھا تب سے صباحت سے رابطہ کرنے کی کوشش رہا تھا۔ لیکن ادھر کا شاید فون خراب تھا جو مسلسل تیل بجتی تھی اور کوئی اٹھاتا نہیں تھا۔ وہ صبح شام اور آفس بھی جب اسے موقع ملتا اس کے نمبر ڈائل کرتا اور پھر بایوس ہو کر اپنی قسمت کو کوٹنے لگتا کیونکہ اب اسے بن ہو چلا تھا کہ اس کی قسمت اس کا ساتھ نہیں دے رہی۔ جب ہی ایک طرف کچھ حالات بہتر ہوتے ہیں تو سری طرف پہلے سے زیادہ خراب بہر حال اسے شاہ پور سے آئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا اور شاہ جہانگیر نے اس سے رہ کیا تھا کہ وہ زمینوں کے کچھ کام نمٹا کر ہفتہ دس دن کے بعد اس کی ماں کو لے کر اس کے پاس آئیں گے۔ پھر ساوہ کے گے گاویا کریں گے اور اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ انہیں آسیہ کے پاس بھیجے گا اور یہ اس کی طرف سے فری کوشش ہوگی۔ آسیہ مان گئی تو ٹھیک دو سری صورت میں وہ خود صباحت کو طلاق دے کر یہ سارا قصہ ختم دے گا کیونکہ اس سے زیادہ وہ اپنی تدبیر برداشت نہیں کر سکتا تھا اور یہی بات وہ صباحت سے کہنا چاہتا تھا۔ اس وقت اس نے بہت بے دلی سے ٹیلی فون سیٹ قریب کھینچ کر نمبر ڈائل کئے اور دو سری طرف کی تیل سننے۔ خلاف توقع دو سری تیل پر ہی ریسپورڈ اٹھنے کے ساتھ تیز آواز آئی تھی۔

”ہیلو!“  
”کون مل رہی ہے؟“ وہ فوراً سیدھا ہو بیٹھا تھا۔  
”جی آپ کون؟“ مدیحہ کا وہی لٹھ مارنے والا انداز تھا۔ وہ گہری سانس کھینچنے کے بعد بولا۔  
”علی!“  
”علی کیسے ہیں آپ؟“

”تم سناؤ، خیریت سے پہنچ گئیں اپنی بہن کے پاس۔“ وہ فوراً ہی صباحت کا ذکر لے آیا تو ادھر وہ بڑی زور سے ہنسی مچا۔  
”سیدھے سیدھے کیوں نہیں کہتے کہ آپ کو صبا کی خیریت مطلوب ہے تو جناب وہ بالکل ٹھیک ہے اور میں آپ کی خیریت بھی اس تک پہنچاؤں گی۔“  
”نہیں۔ تم بس اتنی زحمت کرو کہ اسے بلا دو۔“ اس نے ایک دم سنجیدہ ہو کر کہا۔  
”کیوں گیوں بلا دوں؟“

”مدیحہ پلیز۔“ وہ اندر ہی اندر چیخ و تاب کھا رہا تھا لیکن اس کی عادت سے بھی واقف تھا اس لئے بہت لجاجت کا مظاہرہ کیا۔  
”بس بس۔ زیادہ خوشامد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے فوراً ٹوک کر وہیں سے صباحت کو پکار کر کہا۔  
”نہ! صبا! تمہارا فون ہے۔“

وہ دو سری طرف کی تمام حرکات و سکنات یوں محسوس کر رہا تھا گویا دیکھ رہا ہو۔  
”ہیلو!“ چند لمحوں بعد صباحت کی آواز سن کر وہ مطمئن سا ہو کر بولا تھا۔  
”صبا! میں ہوں علی۔“  
”جی۔“ وہ غالباً ”گھبرا گئی تھی۔“  
”سنو، مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے۔ کیا تم مجھ سے مل سکتی ہو؟“ وہ اس کی گھبراہٹ محسوس کر کے بھی نظر انداز کر گیا۔

”مشکل ہے۔“ صباحت نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا تو وہ بے لہجے میں چیخ پڑا۔  
”ناممکن تو نہیں ہے نا۔“  
”نہیں، ناممکن تو شاید کچھ بھی نہیں ہے۔ بس یہ ہے کہ مجھے ڈر لگتا ہے۔“ اس کے لہجے میں آزر دگی سمٹ آئی تھی جسے محسوس کر کے وہ نرم ہو گیا۔  
”چلو جانے دو، میں تمہیں مجبور نہیں کرتا لیکن خدا کے لئے اب ڈرنا چھوڑ دو۔ تمہیں میرا ساتھ دینا ہے۔ میں

”مجھے اجازت دیجئے لی بی جان۔“  
لی بی جان کچھ گھبرا کر بابا جان کو دیکھنے لگیں تو وہ آگے آتے ہوئے بولے۔  
”تو مہر النساء ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اس ڈاکٹرنی کے لئے تم ہمیں“ اپنے بال بچوں کو چھوڑ کر جا رہے ہو۔“  
شاہ سکندر ان کے ڈاکٹرنی کہنے پر بری طرح تلملا گئے تھے۔  
”بابا جان۔ اگر آپ ہرجیت کا ٹھیک ٹھیک رہتے تو ان لیں کہ آپ بارگئے کیونکہ اس عورت کو میری سے بے شک آپ نے نکال دیا لیکن اپنے ذہن سے کبھی نہیں نکال سکے۔ وہ ہمیشہ آپ کے لئے چیلنج بنی حالانکہ اس نے کبھی آپ کو چیلنج نہیں کیا۔ بہر حال آپ سن لیں کہ میں اس کے لئے جا رہا ہوں یا کسی اور لئے اپنے بال بچوں کو نہیں چھوڑ رہا۔ مہر النساء سے میں پہلے ہی ساتھ چلنے کو کہہ چکا ہوں۔ لیکن اسے جانے بات کا زعم ہے۔ شاید سمجھتی ہے کہ پہلے کی طرح۔“  
وہ گزشتہ بائیس دہرانہیں چاہتے تھے اس لئے سرجھٹک کر خاموش ہو گئے۔

بابا جان کو ان کی پہلی ہی بات نے گویا آسمان سے زمین پر لا کھڑا کیا تھا۔ اس کے بعد اتنی دیر انہیں اپنی حیات پر قابو پانے اور خود کو سہارا دینے میں لگی تھی۔ پھر بھی جب بولے تو آواز میں وہ دبہ تھا نہ کرج۔  
”ہماری اولاد ہی ہمارے خلاف ہوئی سکندر! تو ہم کسی اور کو کیا کہیں۔ تم جانا چاہتے ہو تو شوق سے جاؤ! ایک بات یاد رکھنا کہ ہم کبھی جھک سکتے ہیں نہ ٹوٹ سکتے ہیں اور ہر ناتواہماری لغت ہی میں نہیں ہے اور یہ بھی کہ ہم ہرجیت کا ٹھیک ٹھیک نہیں ٹھیک رہے تھے۔ ایسے ٹھیک ہم اپنے برابر والوں کے ساتھ ٹھیکے ہیں۔ ہمیں ہ تمہاری بیٹیوں کا خیال تھا اور ابھی بھی ہے۔“

”بہت شکریہ بابا جان! آپ جتنا ان کا خیال کر سکتے تھے کر لیا۔ اب وہ میری ذمہ داریاں ہیں۔“ وہ بات کرتے ہوئے لی بی جان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔  
”چلو تمہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس تو ہوا۔“ بابا جان نے طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو وہ بھی ان ہی انداز میں بولے۔

”دیر آید درست آید۔ اب یقیناً“ میں ان کے بارے میں بہتر فیصلے کر سکوں گا۔“  
”یقیناً“ لیکن یہ کبھی مت بھولنا کہ ہم شاہ ہیں اور شاہوں کی بیٹیاں شاہوں میں ہی بیاہی جاتی ہیں۔“ بابا نے انہیں باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ کچھ بھی کرو مدیحہ اور صباحت کو ہر حال میں یہیں آنا ہے اور وہ کہنے لگے۔

”یہ اصول آپ کے ہیں بابا جان! آپ کے۔ وہ جو شاہوں کے شاہ ہیں جنہیں کل عالم کے لئے رحمت بنا کر گیا انہوں نے انسانوں کے درمیان فرق پیدا کرنے والے سارے نفرتے مٹا ڈالے تھے۔ ذات پات، نسب، گھور کالا، میاں تک کہ عربی کو بھی بر فضیلت نہیں ماسوائے تقویٰ کے اور مجھے افسوس ہے کہ نہاد رہا۔ جان! کہ آپ اپنی نسبت تو ان ہی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جوڑ رہے ہیں لیکن ان کی تعلیم عمل نہیں کر رہے۔“

”جاؤ سکندر! ہمیں تم سے کوئی غرض ہے نہ تمہارے کسی معاملے سے۔ جو تمہارا دل چاہے کرو۔“ بابا لا جواب ہو کر وہ بڑے تھے اور رکے بھی نہیں۔ فوراً اپنے کمرے کا رخ کیا تھا۔  
شاہ سکندر کچھ دیر ان کے پیچھے دیکھتے رہے۔ پھر دوبارہ لی بی جان کے پاس بیٹھے ہوئے مہر النساء کو مخاطب ہوئے تھے۔

”مہر النساء! دیکھو الماس نے میرا سامان پیک کر دیا۔ اس سے کمو جلدی کرے میں شام اترنے سے پہلے سے جانا چاہتا ہوں۔“  
”شام تو ہو جائے گی شاہ! مجھے اپنا سامان اکٹھا کرتے کرتے۔“

بہت جلد اپنے امی ابا کو تمہارے گھر پہنچ رہا ہوں۔ انہیں وہاں سے باپوس نہیں لوٹنا چاہئے، سمجھیں تم۔“  
”نہیں“ میرا مطلب ہے میں کیا کر سکتی ہوں۔“ وہ رو بہاکی ہو گئی تھی۔

”بس صبا! میں اب یہ نہیں سننا چاہتا کہ تم نے سارا اختیار اپنی ماما کو دے رکھا ہے اور وہ جو چاہیں فیصلہ کر رہے۔ ان کا فیصلہ اب بھی وہی ہوگا۔ وہ اور بابا جان ہمارے لئے نہیں سوچتے۔ یہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔ پھر ان کے فیصلے پر سر جھکانے کا مطلب یہ ہے سراسر اپنی ذات کے ساتھ ظلم ہے صبا! میری بات سمجھ رہی ہوں اور یہ بھی سن لو کہ یہ میری آخری کوشش ہے اگر میرے امی ابا تمہارے گھر سے باپوس لوئے تو پھر واقعی ہمارے راستے الگ ہو جائیں گے اور اس کا زہم دار میں سب سے زیادہ تمہیں ٹھہراؤں گا اور کبھی معاف بھی نہیں کروں گا۔ خدا حافظ۔“

اس نے اپنی بات ختم کرتے ہی ریسیور رکھ دیا کیونکہ اس کا رونا محسوس کر رہا تھا۔ اس لئے کمزور پڑنے سے پہلے ہی سلسلہ منقطع کر دیا اور کچھ دیر اس کی بڑبڑی پر کڑھتا رہا پھر اپنا دھیان بنانے کے لئے باہر نکلا تو رات کے ٹیگ سڑکوں پر ہی گاڑی دوڑا رہا تھا۔ حقیقتاً ”وہ بے حد مضرب تھا اور بے حد باپوس۔ شاید اس مقام سے بھی آگے نکل آیا تھا جہاں انسان کے اندر کسی معجزے کے رونما ہونے کی ایک آخری امید زندہ رہتی ہے۔ اس کے اندر وہ بھی نہیں سمجھ رہا تھا کہ وہ اتنا شاکہ ہو رہا تھا۔ اور جب گھر لوٹا تو مزید خاموشی اور تنہائی کا احساس ہونے لگا۔ حالانکہ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پھر بھی وہ شدت سے محسوس کرتا ہوا وہیں لاؤنج میں صوفے پر دراز ہو گیا تھا۔

صبح نہ تو معمول کے مطابق خود سے اس کی آنکھ کھلی اور نہ کرم دین کے اٹھانے پر اٹھا تھا۔ بس ذرا سی آنکھیں کھولیں اور اسے جانے کا اشارہ کر کے دوبارہ سو گیا تھا۔ اس کے بعد کرم دین نے اسے اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ گیارہ بجے کے قریب اسے اپنے سر پر شاہ جہانگیر کی آواز سنائی دی تو منہ میں ہونے کے باعث پہلے وہ یہی سمجھا کہ خواب دیکھ رہا ہے لیکن دوسرے پل عارفہ بیگم اس کا بازو ہلا کر پکارنے لگیں۔

”علی علی! آخر تو ہے۔ ابھی تک سو رہے ہو اور یہاں۔“

وہ ہڑبکا کر اٹھ بیٹھا اور آنکھیں ملنے کے بعد سلام کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”آپ کب آئے؟“

”ابھی آ رہے ہیں۔“ شاہ جہانگیر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہنے لگے۔ ”تمہیں کرم دین نے نہیں بتایا۔ رات میں نے فون کیا تھا۔“

”وہ۔۔۔ میں اصل میں دیر سے آیا تھا۔ آپ بیٹھیں امی میں منہ ہاتھ دھو کر آتا ہوں۔“ وہ ان کے مزید دیر سے آنے اور اتنی دیر تک سونے سے متعلق سوالوں سے بچنے کی خاطر منہ دھونے کے بہانے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا اور پہلے آفس فون کر کے اپنے آنے کا بتایا پھر وارڈروب سے کپڑے نکل کر واش روم کا رخ کیا۔

نہانے سے وہ کافی ہلکا ہوتا تو ہو گیا تھا لیکن باپوسی کا ابھی بھی وہی عالم تھا۔ شاہ جہانگیر اور عارفہ بیگم کی آمد نے بھی کوئی امید نہیں جگائی تھی پھر بھی وہ آخری کوشش ضرور کرنا چاہتا تھا تاکہ بعد میں کوئی ملال نہ رہے۔  
”ہاں تو کیا کہتے ہو تم۔ ہم آسیہ کے پاس جائیں۔“ وہ ناشتے سے فارغ ہوا تو شاہ جہانگیر نے اصل بات چھیڑ دی۔  
”جی۔۔۔!“

”جانے کو تو تم تیار ہیں لیکن بابا جان کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ تم جانتے ہو وہ۔۔۔ خیر چھوڑو یہ بتاؤ سکندر یہاں آنے کے بعد کیا کہتا ہے۔“ شاہ جہانگیر نے بات ادھوری چھوڑ کر پوچھا۔

”کیا مطلب؟“ وہ سمجھا نہیں۔

”تمہارے چاچا سکندر، وہ ادھر ہی آگئے ہیں ناں! اپنے بال بچوں کو لے کر۔ تمہیں پتا نہیں ہے؟“ عارفہ بیگم نے بتا کر اس کی لاعلمی پر تعجب کا اظہار کیا۔

”چچا جان فیملی کے ساتھ یہاں آگئے ہیں۔ کب؟“ اس کی حیرت میں الجھن بھی تھی اور سوچ بھی۔  
”ایک ہفتہ تو ہو گیا ہے اور میرا خیال ہے ہمیں آسیہ سے پہلے اس کے پاس جانا چاہئے کیونکہ یہی تو اس کی بھو

ہے۔ پھر اگر وہ کہے گا تو ہم ادھر بھی چلے جائیں گے۔“ شاہ جہانگیر اسے یوں دیکھنے لگے جیسے وہ فوراً تائید کرے گا لیکن اس کا ذہن شاہ سکندر میں الجھ گیا تھا۔ اس لئے ان کی بات کا جواب نہیں دے سکا۔

”آپ چھوڑیں نا سکندر کو۔ بس جہاں علی کہتا ہے وہیں چلتے ہیں۔ ہمیں اپنی اولاد کی خوشی دیکھنی ہے۔“ عارفہ بیگم اس کی خاموشی سے جانے کیا سمجھی تھیں۔

”اسی کی خوشی کی خاطر تو یہاں آیا ہوں۔ بتاؤ ناں علی۔ کیا کہتے ہو تم؟“ شاہ جہانگیر نے اسے مخاطب کیا تو وہ ذرا باجوں کا چھوڑوٹوں ہاتھوں سے سر تھا م لیا۔

”میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا بابا! جو آپ کا دل چاہے کریں۔“

”کیا۔۔۔ کیا سمجھ میں نہیں آ رہا۔ تم کچھ پریشان لگ رہے ہو۔ بابا جان نے کچھ کہا ہے تم سے یا سکندر نے مجھے بتا دیا کیا بات ہوئی ہے۔“

”میرے ساتھ کوئی بات نہیں ہوئی۔ آپ بتائیں بیچا جان فیملی کے ساتھ یہاں کیوں آئے ہیں۔ میرے سامنے انہوں نے بابا جان سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔“

”مجھے خود نہیں بتایا! میں زمینوں پر تھا واپس آیا تو معلوم ہوا سکندر حویلی چھوڑ گیا ہے اور میرا خیال ہے اسی کی شادی کے لئے چھوڑی ہوگی اس لئے میں کہہ رہا ہوں پتہ اس پتے میں چلتے ہیں ہو سکتا ہے اس کی آسیہ کے ساتھ اس سلسلے میں کوئی بات ہوئی ہو۔“

شاہ جہانگیر نے اس کے اٹھنے پر دھیرج سے کہا تو وہ کچھ دیر تک انہیں دیکھتا رہا پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے

لا۔

”ہوں! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ پہلے آپ چچا جان کے پاس جائیں۔“

”ہم جائیں! تم نہیں چلو گے؟“ شاہ جہانگیر نے قدرے تعجب کا اظہار کیا۔

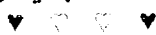
”نہیں۔ میں کیوں جاؤں! اپنا رشتہ لے کر کیا میں گیا تھا؟“ اس نے روٹھے لہجے میں کہا تو عارفہ بیگم فوراً اس کی نیکرتی ہوئی بولیں۔

”ہاں ٹھیک تو کہہ رہا ہے۔ یہ کیوں جائے گا۔ اسے تو بس اب سرابا ندھ کر ہی لے جائیں گے۔“

”انشاء اللہ! اچھا بیٹا پھر ہم چلتے ہیں۔“ شاہ جہانگیر نے کہا تو وہ گھڑی دیکھ کر بولا۔

”اس وقت کہاں جائیں گے کھانے کے بعد۔۔۔“

”کھانا ہم سکندر کے ساتھ کھائیں گے۔ چلو عارفہ! اب دیر نہیں ہونی چاہئے۔“



شاہ جہانگیر اور عارفہ بیگم کو کچھ کر شاہ سکندر کا ٹھکانا فطری بات تھی اور انہیں پہلا خیال ہی آیا تھا کہ بابا نانے ایک بار پھر ان کے خلاف سازش کر کے انہیں بھیجا ہے۔ اس لئے انہوں نے مروتاً بھی ان کی آمد پر دشمنی کا اظہار نہیں کیا اس کے برعکس خاصا لیا دیا انداز تھا۔

”کیسے آئے آپ لوگ؟“

”برا! کا ہمارا آنا؟“ شاہ جہانگیر فوراً ہی ان کی بے اعتنائی محسوس کر گئے تھے۔

شاہ سکندر نے کوئی جواب نہیں دیا اور کچھ بیکانے پن کا بھی مظاہرہ کر گئے تو شاہ جہانگیر نے آگے بڑھ کر انہیں اندھوں سے تھا م لیا۔

”میں جانتا ہوں سکندر! تم کیا سوچ رہے ہو۔ بخدا مجھے بابا جان نے نہیں بھیجا۔ میں خود آیا ہوں تمہارے پاس۔ اسے بیٹے کی خوشیاں مانگنے اور میں تو بہت پہلے تم سے مانگنا چاہتا تھا لیکن تمہارا اصرار تھا کہ بابا جان آسیہ لپکاس جائیں۔ مجھے تو کسی نے کچھ سمجھا ہی نہیں۔ بابا جان نے نہ تم نے۔ حالانکہ علی کا پاپ میں ہوں۔ بہر حال ناماری باتوں سے قطع نظر میں یہ کہوں گا کہ ہمیں اپنی اولاد کی خوشیاں دیکھنی چاہئیں۔ آخر ان کا کیا تصور ہے؟“

شاہ سکندر آہستہ سے اپنے کندھوں سے ان کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولے۔  
 ”میری تو میں پوچھتا رہا کہ میری بیٹی کا کیا قصور ہے۔ اس کے لئے بابا جان اس طرح کیوں نہیں سوچتے جیسے دوسری اولادوں کے لئے سوچتے ہیں۔“

”دوسری اولادوں کے لئے سوچتے ہوئے بھی وہ ان کی خوشی کا خیال کب کرتے ہیں۔ وہ تو زبردستی اپنے فیصلے مسلط کرنے کے عادی ہیں اور جو ذرا سا ان کے فیصلے سے اختلاف کرتا ہے اسے وہ اپنی ضد بنالیتے ہیں لیکن خدا کے لئے سکندر تم اس بات کو ضد مت بناؤ کہ بابا جان ہی صاحت کو رخصت کرانے جاتیں گے۔“

”نہیں، میرا بابا جان سے کوئی تعلق نہیں اور جہاں تک صاحت کی رخصتی کا سوال ہے تو اس کا فیصلہ اس کی ماں کرے گی اور مجھے نہیں معلوم اس کی ماں نے کیا سوچا ہے؟“ شاہ سکندر صاف دامن بچا گئے۔  
 ”ہم اسی لئے تمہارے پاس آئے ہیں کہ تمہاری اجازت سے ہم آئیہ کے پاس جانا چاہتے ہیں۔“ شاہ جہانگیر

ان کے پہلو تھمی کرنے پر اندر ہی اندر جڑبڑہو کر بولے تھے۔  
 ”مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ جب آپ کا دل چاہے جائیں۔  
 پھر کھانے کے بعد شاہ سکندر معذرت کر کے اپنے کسی کام سے چلے گئے تھے۔

عارف بیگم، مہر النساء کے ساتھ باتوں میں لگ گئیں تو شاہ جہانگیر کچھ دیر آرام کی غرض سے لیٹ گئے۔ انہیں شاہ سکندر کے روتے ہوئے نے خاصا مایوس کیا تھا اگر علی کا خیال نہ ہوتا تو وہ بیسوں سے واپس شاہ پور لوٹ جاتے لیکن انہیں علی کی بات یاد بھی جو اس نے کہا تھا۔ ”میری زندگی کی دورا سی رشتے سے بندھی ہے۔“ جسے مضبوط کر کے لئے وہ اب اپنا سب کچھ داؤ پر لگا سکتے تھے۔ جب ہی شاہ سکندر کے رویے سے دلبرداشتہ ہونے کے باوجود وہ

ٹھیک چار بجے عارف بیگم کے ساتھ آئیہ کے دروازے پر موجود تھے۔  
 تیل کے جواب میں گیٹ ٹوپیہ نے کھولا تھا اور وہ عارف بیگم کو پہچانتی تھی اس کے باوجود فوری طور پر انہیں اندر آنے کو نہیں کہا بلکہ اس کی سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔

”ڈاکٹر صاحبہ ہیں یا ان کے والد صاحب۔ ہمیں ان سے ملنا ہے۔“ شاہ جہانگیر نے اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے کہا تو وہ گیٹ اسی طرح کھلا چھوڑ کر اندر بھاگ گئی۔  
 عارف بیگم یوں شاہ جہانگیر کو دیکھنے لگیں جیسے بڑی بے عرق ہو گئی۔

”اولاد کی خاطر عارف بیگم! بہت کچھ سہنا رہا ہے اور پھر شروعات تو ہماری طرف سے ہوئی تھیں۔ اب جو وہ کہیں چپ چاپ سہنا رہے۔“ شاہ جہانگیر ان کی نظروں کا مفہوم سمجھ کر آواز دبا کر بول رہے تھے تب ہی اباجی نے آکر پورا گیٹ کھول دیا۔

”السلام علیکم۔“ شاہ جہانگیر بس ایک نظر اس بوڑھے شخص کو دیکھ سکے پھر سر جھک گیا تھا۔  
 ”وعلیکم السلام۔ آئیے۔“ اباجی اگر خندہ پیشانی سے نہیں ملے تو پیشانی پر برہا پے کی عطا کردہ شکنوں میں کو

نگاوار شکن کا اضافہ بھی نہیں ہوا تھا۔  
 ”شکر ہے!“ شاہ جہانگیر نے عارف بیگم کو آگے چلنے کا اشارہ کیا اور ان کے پیچھے اباجی کے ساتھ ان کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو انہیں اچانک وقت بہت پیچھے لے گیا تھا۔ پہلی بار جب وہ یہاں آئے تھے تو انہیں دیکھ کر سب لوگوں کے چہرے کھل گئے تھے اور وہ سب کے درمیان راجہ اندر رہنے سب کو حیران کر رہے تھے۔ اب خود حیران تھے کہ زندگی کیسے کیسے مذاق کرتی ہے۔

”آپ بیٹھیں میں آئیہ کو بلاتا ہوں۔“ اباجی کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئے تو عارف بیگم ان کا ہاتھ ہلاتے ہوئے چلے گئیں۔  
 ”شاہ جی! آپ کو کیا ہوا؟“

”ہیں۔“ وہ چونک کر دیکھنے لگے۔

بجہ جا بس۔ وہ آئیہ کو بلانے گئے ہیں۔“  
 ”انہوں نے ماں کی صورت گہری سانس کھینچی پھر بیٹھنے کے لئے اس جگہ کا انتخاب کیا جہاں برسوں پہلے تھے لیکن کتنا فرق تھا اب اور اب میں۔ جو گردن غور سے تھی تھی اسے وقت نے جرم کا احساس دے کر غا۔

نادر ہو گئی۔ اباجی آئے نہ آئیہ نہ کسی اور نے جہانگیر کو دیکھا تھا۔  
 فہ بیگم پہلو پر پہلو بدلنے لگی تھیں۔ کسی وقت بڑبڑانے بھی لگتیں۔ لیکن شاہ جہانگیر ان کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ وہ مسلسل اپنا محاسبہ کرنے میں لگے ہوئے تھے۔

چا آدھے گھنٹے بعد اباجی آئیہ کو ساتھ لے کر آئے تھے۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ بہت مجبور کرنے پر آئی ہے۔  
 جہانگیر اسے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے اور عارف بیگم بھی اٹھنے لگی تھیں کہ آئیہ نے ہاتھ اٹھا کر

ایا۔  
 لہذا تشریف رکھیں۔“  
 جہانگیر بیٹھ گئے تو پوچھنے لگی۔  
 یہ زحمت کی آپ نے؟“

اری آمد کا مقصد آپ جانتی ہیں۔“ شاہ جہانگیر کو حقیقتاً ”بولنے میں دقت ہوئی تھی۔  
 ما نہیں، میں بالکل نہیں جانتی۔“ وہ رکھائی سے بولی تو اباجی فوراً ”کہنے لگے۔

ن جانتا ہوں۔ آپ یقیناً ”صاحت کے لئے آئے ہیں۔“  
 ما، صاحت بیٹی کے لئے نہیں آتا تو بہت پہلے چاہئے تھا لیکن۔“ شاہ جہانگیر کوئی بات نہیں بناسکے تھے۔  
 مان کیوں نہیں کہتے کہ اپنی ساری چالوں میں ناکام ہونے کے بعد۔“ وہ زہر خند سے بول رہی تھی کہ اباجی

ہوا۔  
 سہ! تمہیں گھر آئے ممانوں کا خیال کرنا چاہئے۔“ پھر ان دونوں کو دیکھ کر بولے تھے۔ ”آپ اس کی باتوں کا سامانے گا۔“

نی نہیں، انہیں حق ہے۔ چاہیں تو ہمیں گھر سے ہی نکال دیں۔ لیکن اس طرح یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔“  
 یہ نے ہونٹ پیچھے لئے کیونکہ اباجی نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

س سے پہلے جو کچھ ہوا اس کے لئے میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔“ شاہ جہانگیر نے اپنا سر اباجی کی طرف ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تو آئیہ ہونہ کے انداز میں سر جھکتی ہوئی فوراً اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔  
 ما کے پیچھے پردہ ہل رہا تھا۔ باقی سب ساکت ہو گئے تھے۔

میں اجازت۔“ لکھی دیر بعد شاہ جہانگیر غالباً ”کنا کچھ اور چاہتے تھے اور کچھ گئے تو بول کھلا کرو صاحت لگے۔“ م بھی ڈاکٹر صاحبہ کا موڈ ٹھیک نہیں ہے، ہم پھر آجائیں گے۔“

ل! لیکن چائے۔ چائے آ رہی ہے۔“ اباجی کو فوراً ہی بات سمجھ میں آئی اور وہاں سے اٹھنے کا سامانہ بھی مل گیا

ب کیا کر س شاہ جی! ڈاکٹر کی تو بات سننے کو بھی تیار نہیں ہے۔“ اباجی کے کمرے سے نکلتے ہی عارف بیگم سے بولیں۔  
 ہر کرو۔ اس کے اباجی سے بات کرتا ہوں، وہ اسے سمجھالیں گے۔“ شاہ جہانگیر خود بھی فکر مند تھے لیکن بیگم نہیں کر رہے تھے۔

سیر جے پیر کی ملی کی طرح سارے میں چکراتی پھر رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ شاہ جہانگیر اور عارف دھکے دے کر نکال باہر کرے۔

”میں سمجھتی ہوں۔“ عقب سے میمونہ بھا بھی نے کہا تو اس نے پہلے گردن موڑ کر انہیں دیکھا پھر اٹھتے ہوئے کہا: ”ماں جی کو بھی سمجھاؤ۔“

”ہاں جی کو بھی سمجھا میں۔“  
 ”ان کو میں سمجھا لوں گی، پہلے تم سمجھ لو کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کرنا۔“  
 ”آئندہ۔“ اس کی سوالیہ نظروں میں بے باکی تھی۔  
 ”یہاں آئندہ وہ پھر آنے کا کہہ گئے ہیں۔“ میمونہ بھابی نے کہا تو اس نے بمشکل خود کو ”کب؟“ کہنے سے روکا  
 زرا سا اثبات میں سر ہلا کر بولی۔

”چھا! ابھی تو مجھے کلینک سے دیر ہو رہی ہے۔ واپس آکر آپ سے بات کروں گی تب تک آپ اماں جی کو عذاب دے کر مجھ سے ناراض نہ ہوں۔“

”رے تم سے کون ناراض ہوتا ہے۔ نہ کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔ پتا نہیں کون سے جہاں میں رہتی ہو۔“

”میں تو ابھی کچھ اس سے یہی شکوہ تھا جس پر وہ ہمیشہ کی طرح ہنسی ہوتی باہر نکل آتی۔“

پس! شاہ سکندر حیات!“

”السلام علیکم“ اس نے اپنا نام بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی کیونکہ یہ ان اسے حاصل ہو گیا تھا کہ وہ بار کر بھی

”وعلیکم السلام۔ کیسی ہیں آپ؟“ شاہ سکندر کو جیسے خوشگوار احساس ملا تھا۔  
 ”میں بالکل ٹھیک ہوں اور آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ اگر آپ مصروف نہیں ہیں تو یہاں میرے کلینک  
 آئیں۔ مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔“ اس نے بغیر کسی جھجک کے کہا۔  
 ”ظاہر ہے،“ ضروری بات ہی کرنی ہوگی لیکن کیا یہ بھی ضروری ہے کہ ہم کلینک ہی میں بیٹھ کر بات کریں۔“ شاہ  
 درے قدرے جٹا کر کہا تو وہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولی۔  
 ”نہیں۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔“

”تھنک یو۔“ ٹھیک پندرہ منٹ بعد میں آپ کو وہاں سے پک کرول گا“اوکے۔“  
 ”اوکے۔“ اس نے ریسپوررکھ کرگھڑی دیکھی اور پھرپونہی مینے کے بجائے راؤنڈ پر نکل گئی۔ پندرہ منٹ میں وہ  
 فب جزل وارڈی کا راؤنڈ لگا سکی تھی۔ وہ بھی بڑی عجلت میں۔ پھر سسٹر کے کہہ کر وہیں سے باہر نکل آئی۔  
 ٹامہ سکندر گاڑی سے اترے تھے اسے دیکھا تو وہیں رک گئے اور دروازہ اس کے لیے کھلا چھوڑ دیا۔  
 جس اعتماد سے چل رہی تھی اسی اعتماد سے ان کے ساتھ بیٹھی تھی اور پندرہ منٹ بعد ایک فانیو اشار میں  
 با آئے سامنے تھے۔

”میرے صباحت کے سلسلے میں بات کرنی ہے۔“ اس نے بیٹھتے ہی کہا تھا۔  
 ”توہوں کیا بات؟“ شاہ سکندر نے۔ گار سگمانے کے بعد پوچھا تھا۔  
 ”وہی اس کی شادی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کروں۔ آج آپ کے بھائی شاہ جمالیہ حیات اپنی بیگم کے  
 مرنے آئے تھے۔“

ابجی! ”وہ چونک کر کی اور برآمدے میں سب کو بیٹھ دیکھ کر اپنی بے دھیانی پر تادم سی ہو کر اس طرف آتی ہوئی سلام علیکم!“  
 سلام علیکم! کیا بہت تھک گئی ہو یا بھوک زیادہ لگ رہی ہے؟“ میمونہ بھابی نے سلام کا جواب دینے کے پوچھا۔

ہاں پہلے اسے کھانا کھلاؤ۔“ اس کے جواب دینے سے پہلے اباجی نے کہا تو وہ ان کے سامنے خالی کرسی پر بیٹھے بولے۔  
 کھانا میں کھا چکی ہوں۔“

کہاں باسپہل میں؟“  
 قصداً ”ان سنی کر کے بات بدل گئی۔  
 لگتا ہے یہاں کوئی اہم مسئلہ زیر بحث تھا۔“  
 ہاں، ہم صیاحت کی شادی کی بات کر رہے تھے۔ تمہیں تو شاید احساس نہیں ہے اور نہ ہی تمہارے پاس ت سے کہ تم اپنی بیٹیوں کے بارے میں سوچ سکو۔“ اباجی نے بہت شرے ہوئے لہجے میں اسے سخت ست شروع کیا تھا۔

تمہیں صرف بیٹیاں اپنے پاس رکھنے کا شوق تھا۔ ان کی تعلیم اور تربیت پر تم نے کوئی توجہ نہیں دی نہ تمہیں لکھ پڑھنے سے دلچسپی ہے۔ آخر کیا سوچا ہے تم نے ان کے بارے میں اگر ان کی شادی نہیں کرنا چاہتیں تو کم تنی تعلیم تو لاؤ کہ وہ تمہاری طرح۔۔۔“

نہیں اباجی! میری طرح نہیں۔“ وہ جو سر جھکائے سن رہی تھی ایک دم بول پڑی۔“ وہ دونوں میری طرح ہو میں سکتیں کیونکہ ان کے اندر شروع سے میری جیسی کوئی بات نہیں ہے۔ پڑھائی میں دونوں بس نارمل مزید کتنا بھی پڑھاؤں ڈاکٹر بن سکتی ہیں نہ لیکچرار پھر بہتری ہے کہ ان کی شادی ہو جائے۔“

ہاں یہی میں تم سے کہنا چاہتا ہوں۔“ اباجی فوراً بول پڑے تھے۔ ”میں نے شاہ جہانگیر کو جمعہ کے دن بلایا اس دن ہم شادی کی تاریخ رکھ دیں گے، تمہیں اگر اعتراض ہو تو ابھی بتا دو۔“  
 نہیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ اس نے کہا تو سب ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے۔ غالباً ”کسی کو بھی کے اتنی جلدی مان جانے کی امید نہیں تھی۔

یہی اباجی! اسے تو کوئی اعتراض نہیں۔ آپ کس بات سے پریشان ہیں۔“ غلیل بھائی نے اباجی کو مخاطب بہ قدرے سنبھلا گئے۔

نہیں پریشانی تو کوئی نہیں۔“  
 اس کو کوئی قریبی تاریخ طے کر لیجیے کیونکہ تیاری تو ہوگی کیوں آسیہ؟“ غلیل بھائی نے اس سے پوچھا۔  
 جی تیاری تو ہے۔“

کی خوشی میں میں چاہے لاتی ہوں۔“ میمونہ بھابی اٹھ کھڑی ہوئیں تو وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولی۔  
 پیرے لیے نہیں لایئے گا بھابی! اوپر بچوں نے میرے انتظار میں کھانا نہیں کھایا ہو گا۔“  
 نے نو کھایا ہے نا؟“

جی میں تو کھا چکی ہوں۔“  
 اس تو بیٹھو آرام سے۔ میں ٹوپیہ سے کھلاؤ دیتی ہوں کہ وہ کھانا کھالیں۔“ میمونہ بھابی کہتے ہوئے اندر چلی۔

تھوڑے بعد اس نے جس تیزی سے ٹوپیہ کو بیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیکھا اس سے سمجھ گئی کہ میمونہ بھابی نے نے کھانا کھانے کے ساتھ صیاحت کو نئے موسموں کا سندیہ بھی بھیج دیا ہے۔

بات کروں گی۔ شاید آپ کو یاد ہو ایک بار آپ نے کہا تھا کہ میں صرف ایک پہلو سے سوچ رہی ہوں اس سے مجھے صیاحت کی بہتری نظر نہیں آتی۔ کیا آپ اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے دوسرے پہلوؤں کو اجاگر کریں گے یا ان سب باتوں کو چھوڑ دیں۔ مجھے صرف آپ کی ضمانت چاہیے۔“  
 اس نے بات مختصر کرنے کی خاطر آخر میں ایک ہلکہ کھاتھا اور فوری طور پر خود اسے احساس نہیں ہوا کہ وہ ان پر بھروسہ کا مظاہرہ کر رہی ہے۔

”صرف میری!“ شاہ سکندر گویا پھر سے زندہ ہو گئے تھے جو تھوڑی توجہ سگارنے سمجھنے کی تھی انہوں نے وہ بھی اس کی طرف مبذول کرنے کی خاطر سگار ریش ٹرے میں ڈال دیا پھر براہ راست اسے دیکھ کر کہنے لگے۔

”یہ سچ ہے کہ میرے پیش نظر صیاحت کی بہتری تھی اور ہے کیونکہ مجھے علی جہانگیر پر اور اس کی محبت پر پورا بھروسہ ہے۔ وہ ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ میں اس کی ضمانت لے سکتا ہوں۔ وہ کبھی اپنی محبت کے ساتھ فریب نہیں کرے گا اور میں اس بات کا بھی آپ کو یقین دلانا ہوں کہ شاہ پور کا کوئی شخص علی اور صیاحت کی زندگی میں مداخلت نہیں کرے گا، نہ کوئی سازش ہو سکتی ہے۔ اس لئے نہیں کہ صیاحت میری بیٹی ہے اس لئے کہ وہ علی کی بیوی ہوگی۔ آپ اپنے دل سے تمام خدشات نکال دیں۔ آپ کی بیٹی انشاء اللہ بہت خوش رہے گی اور جب تک آپ نہیں چاہیں گی علی اسے شاہ پور نہیں لے جائے گا۔ یہ ساری باتیں میں خود علی سے طے کروں گا۔ اس کے علاوہ اگر آپ کی کوئی شرط ہو تو وہ بھی کہہ دیں۔“

”نہیں، کوئی شرط نہیں۔“ وہ جوان کی باتوں کے دوران کچھ گم صم سی ہو گئی تھی اسی انداز میں بولی تھی۔  
 ”پھر بھی آپ سوچ لیجیں اور جب تک آپ کا دل اس رشتے پر مکمل طور پر مطمئن نہ ہو جائے شادی کی ہائی نہ بھرس۔“ شاہ سکندر ہر طرح سے اسے اہمیت دے رہے تھے۔

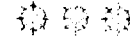
اسے لگا جیسے ساری دنیا کا اختیار اس کے ہاتھ میں آ گیا ہو اور اس انہوں نے اور انوکھے سے خیال سے اس کے ہونٹوں پر بے ساختہ سی مسکراہٹ در آئی تھی۔  
 شاہ سکندر کو اس کی مسکراہٹ بڑی بھلی لگی لیکن وہ اسے کوئی نام نہیں دے سکے۔

”چلیں!“ کچھ دیر بعد وہ اپنے خیال سے نکل کر انہیں دیکھنے لگی۔  
 ”نہیں، آئی میں کھانا اس کے بعد کافی اور اس دوران ہم اچھے دوستوں کی طرح بہت ساری باتیں کریں گے۔ بے مقصد باتیں۔“ انہوں نے کہا تو وہ قدرے حیران ہو کر بولی۔

”بے مقصد!“  
 ”ہاں، کبھی کبھی بے مقصد گفتگو بھی کر لینی چاہئے۔ ذہن فریش ہو جاتا ہے کیونکہ ایسی گفتگو میں مسائل کا ذکر نہیں ہوتا۔“ انہوں نے ویدر کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”گویا فرامس!“  
 ”رائے۔“ ان کے ہنر انداز سے خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔ ”ویسے ہم موسموں کی رنگوں اور خوشبوؤں کی باتیں بھی کر سکتے ہیں۔ ابتدا آپ کریں گی یا میں۔“

”آپ۔“ وہ بالکل غیر راوی طور پر ان کے ساتھ شامل ہو گئی تھی۔



تمام راستہ آسیہ کے ہونٹوں سے مسکراہٹ جدا نہیں ہوئی تھی اور یہ سارا اکمال اس بے مقصد گفتگو کا تھا۔  
 ”واقعی، کبھی کبھی بے مقصد گفتگو بھی کر لینی چاہیے۔“ اس نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے سوچا اور کچھ گن سی زینے کی طرف جاری تھی کہ میمونہ بھابی نے پکار لیا۔  
 ”آسیہ!“

”نبیل نے انہیں ٹوک کر کہا۔  
 ”نسا کو میں بلاتی ہوں“ آپ چلیں۔“ مدحیہ بھاگ کر اپنے کمرے میں آئی تھی۔  
 بابت الماری کے اندر سرگھسائے جانے کیا کر رہی تھی۔  
 ”نہیں نہیں ملے گا۔“ مدحیہ نے اس کے قریب آکر زور سے کہا تو وہ اچھل پڑی۔  
 ”کیا؟“  
 ”علی۔“

”افسوس! تم بہت بد تمیز ہو۔“  
 وہ تو میں ہوں اور خالی پیٹ میں اور بھی بہت کچھ ہو جاتی ہوں۔“ مدحیہ نے بڑے آرام سے اعتراف کے  
 بھوک کا احساس دلایا۔  
 ”تو جاؤ کھانا کھاؤ۔“  
 کھانے ہی کے لیے بلائے آئی ہوں تمہیں چلو۔“

”جیہ نے جھپٹ کر اس کی کلاں پکڑ لی اور اس کی ایک ٹمبل سنی۔ کچھنی ہوئی ڈرائنگ روم میں لے آئی تھی۔  
 رکھانے کے دوران ٹمبل یوں سے رہے جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو اور انہوں نے مدحیہ اور ثوبیہ کو بھی اشارا  
 اٹھا لیکن وہ کہاں باز آنے والی تھیں۔ مسلسل اسے چھیڑتی رہیں جس سے وہ کھانا چھوڑ کر اٹھنے لگی تھی کہ  
 لو آتے دیکھ کر ٹمبل کے نیچے مدحیہ کو پیر مارتے ہوئے بولی۔

”مما آ رہی ہیں۔“  
 ”مما! آپ نے بہت اچھا کیا۔“ مدحیہ نے بے اختیار ہو کر نعرہ لگایا پھر ایک دم سٹپا بھی گئی کیونکہ آسیہ تینہ ہی  
 اسے دیکھنے لگی تھی۔  
 ”آئیے پھوپھو!“

”بس بیٹا! تم لوگ آرام سے کھاؤ میں ذرا چینیج کر لوں۔“ آسیہ ایک نظر صباحت پر ڈال کر وہیں سے واپس پلٹ  
 ”نبیل مدحیہ کو دیکھ کر پوچھنے لگے۔  
 ”تمہیں کیا ہوا تھا؟“

”چھوڑیں نبیل بھائی! ممابھی بس ایسی ہی ہیں انضمام الحق جیسی۔“  
 ”جیہ نے برا سامنہ بنا کر کہا تو وہ تینوں بے ساختہ ہنسنے کے ساتھ بولے تھے۔  
 ”لیا مطلب ہے تمہارا۔“

”انضمام الحق جیہ کا لگائے یا بولڈ ہو جائے اس کی شکل پر کوئی تاثر نہیں ابھرتا۔“ مدحیہ ہنوز اسی انداز میں کہہ کر  
 کھڑی ہوئی تو ثوبیہ بمشکل اپنی ہنسی روک کر کہنے لگی۔

”جی نہیں پھوپھو کا چہرہ پیٹ نہیں ہے۔ پھر ان کی آنکھیں بھی بولتی ہیں۔“ بے نا نبیل بھائی۔“  
 ”نبیل نے استابت میں سر ہلانے پر اکتفا کیا پھر مدحیہ کو جاتے دیکھ کر فوراً ”پکار کر بولے۔  
 ”مدحو! تم نے کھانے کے بعد چائے پلانے کا کہا تھا۔“

”نبیل لاتی ہوں چائے۔ ثوبیہ! ہم جانا نہیں۔“ صباحت کو وہاں سے اٹھنے کا بہانہ مل گیا تھا۔  
 ”نہیں میں آکر اسے جو لمے پر چائے کا پانی رکھنا پھر اسٹول کھینچ کر بیٹھی تو اس کا دل چاہا اب کوئی اس کے پاس نہ  
 نا اور نہ اسے بلائے۔ اس کے گرد جو ایک خوب صورت ساحصار کھینچ گیا تھا وہ اس سے نکلتا نہیں چاہتی تھی،  
 چند لمحوں بعد ہی مدحیہ کی آواز نے سارا طلسم توڑ دیا تھا۔ وہ چتا نہیں کس سے کیا کہہ رہی تھی اور شاید اسی  
 سے آ رہی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹا میں چائے دم کرنے لگی تب ہی مدحیہ کچن میں آکر بولی۔  
 ”اگرے چائے تمہارا رہی ہو؟“

”مدحیہ نبیل پر کھانا لگا کر دوبارہ آنگن میں نبیل اور صباحت کے پاس آکر بیٹھی تھی کہ میز چیلوں پر قدموں کی آ  
 سن کر نبیل کہنے لگے۔

”میرا خیال ہے پھوپھو آ رہی ہیں۔“  
 ”دھنیک گاؤ، چلیں اب آپ دونوں بھی انھیں مجھے بہت بھوک۔“ ثوبیہ کو دیکھ کر مدحیہ نے بات دہرائی پھوپھو  
 برا سامنہ بنایا تھا۔

”او ٹوبیہ! کیا خبر لائی ہو؟“ نبیل نے اس کے بھاگ کر آنے پر یونی کہہ دیا تھا جس پر وہ حیران ہو کر بولی۔  
 ”آپ کو کیسے پتا کہ میں کوئی خبر لائی ہوں؟“  
 ”اس کا مطلب ہے واقعی کوئی خبر ہے۔“ نبیل نے داد طلب نظروں سے صباحت کو دیکھا لیکن وہ متوجہ نہ  
 تھی۔ البتہ مدحیہ نے ان کی بات میں غلڑا لگایا تھا۔  
 ”وہ بھی اچھی۔“

”ہاں اچھی بہت دنوں سے کوئی اچھی خبر نہیں سنی۔ جلدی بتاؤ ثوبیہ کیا بات ہے۔“ نبیل نے مدحیہ کی ت  
 کرتے ہوئے کہا تو ثوبیہ نے باری باری تینوں کو دیکھا پھر بڑے آرام سے بولی تھی۔  
 ”وہ پھوپھو کہہ رہی ہیں۔ آپ تینوں کھانا کھالیں۔“

”اور مما خود کہاں ہیں؟“  
 ”نیچے سب کے ساتھ بیٹھی ہیں اور وہ کھانا کھا کر آئی ہیں۔ اس لیے انہوں نے کہا ہے کہ تم لوگ ان کا  
 نہیں کرو۔“ ثوبیہ نے مدحیہ کو جواب دے کر نبیل کو یوں دیکھا جیسے یہ بھی اچھی خبر۔  
 ”یہاں آؤ۔“ نبیل نے تحام سے اسے اپنے پاس بلایا تو اس کی ساری شوخی ہوا ہو گئی۔  
 ”کیوں نبیل بھائی؟“

”میں کہہ رہا ہوں یہاں آؤ۔“  
 ”میں بیٹیں سے بتا دیتی ہوں۔ پھوپھو صبا کی شادی کرنے پر آمادہ ہو گئی ہیں۔“  
 ثوبیہ نے نبیل کے غصے سے ڈر کر جس تیزی سے کہا اسی طرح صباحت نے جھکا ہوا سر اونچا کیا تھا جبکہ نبیل  
 مدحیہ خوشگوار حیرت میں گھر گئے تھے اور اسی انداز میں دونوں نے پہلے ایک دوسرے کو پھر صباحت کو دیکھا تو  
 کراٹھ کھڑی ہوئی۔

”ایک منٹ روک صبا!“ مدحیہ اپنی جگہ سے اچھل کر اس سے لپٹ گئی اور اس کے کان میں دھیرے سے س  
 کی۔ ”مبارک ہو۔“

”صباحت کے چہرے پر بڑے خوب صورت رنگ اتر آئے تھے۔ دھڑکنیں الگ بے ترتیب ہو گئی تھیں۔  
 ”یہ بے ایمانی ہے نبیل بھائی! ان سے بھی تو پوچھیں کہ یہ چپکے چپکے کیا باتیں کر رہی ہیں۔“ ثوبیہ نے نبیل  
 دونوں کی طرف متوجہ کر کے احتجاج کیا تو اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے صباحت خود کو چھڑا کر اندر بھاگ گئی۔  
 ”ہاں کیا کہہ رہی ہو تم؟“ مدحیہ نے ثوبیہ کی طرف گھوم کر پوچھا تو وہ روٹھے لمبے میں بولی۔

”کچھ نہیں۔“  
 ”اگرے تم تو ناراض ہو گئیں۔ چلو آؤ ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ۔ اس کے بعد میں تمہیں بہت اچھی چا  
 گی۔“ مدحیہ نے اسے مناتے ہوئے کہا۔

”تم چائے پلاؤ گی؟“ ثوبیہ نے حیرت سے آنکھیں پھیلایں تو وہ چیخ پڑی۔  
 ”کیوں کیا پہلے بھی نہیں پلائی۔“  
 ”ہاں میں یہ تم دونوں کس خوشی میں لڑنے لگیں۔ چلو مدحو! تمہیں بہت بھوک لگ رہی تھی اور اسے“

”اچھا سنو ابھی میں مماسے تمہاری شادی کا پوچھ کر آرہی ہوں، ان کا ارادہ ایک مہینے میں تمہیں رخصت دینے کا ہے اور میں نے سوچا ہے اب جتنے دن تم یہاں ہو میں تمہیں کوئی کام نہیں کرنے دوں گی۔ البتہ شادی بعد جب تم علی کے ساتھ آؤ گی تب میں سارے کام تم سے کراؤں گی چاہے علی کو برا لگے یا بھلا۔ ویسے تمہارا خیال ہے اسے برا لگے گا۔“ مدحیہ نظارہ بڑی بنیدگی سے پوچھ رہی تھی لیکن وہ اس کی شرارت سمجھ رہی تھی۔ یہ کوئی جواب نہیں دیا اور اڑے اٹھا کر اسے تنہا ہی۔



شاہ جمانگیر جمعہ کے دن پھر عارفہ بیگم کو ساتھ لے کر آگئے تھے۔ گوکہ گزشتہ بار آسیہ کا رویہ انتہائی مایوس تھا۔ لیکن اس کے بعد اباجی اور میمونہ بھابی نے اپنے طور پر آسیہ کے رویے کی تلافی کرنے کی کوشش کی تھی یہ بھی کہا تھا کہ وہ اسے سمجھائیں گے۔ لیکن اس کے مان جانے کا یقین نہیں دلایا تھا اس لیے شاہ جمانگیر کچھ ز پر امید نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا وہ ابھی بھی ٹال دیے جائیں گے۔ البتہ کھڑے چلتے ہوئے علی کو سلیو آئے تھے۔ کیونکہ انہوں نے اسے آسیہ کے رویے کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ صرف اس لیے کہ انہیں خد تھا کہ علی دوبارہ انہیں آسیہ کے پاس نہیں جانے دے گا اور خود فیصلہ کرے کہ نہ صرف اس رشتے کو ختم کر دے گا سب سے بھی تانا توڑے گا۔ وہ یقیناً ”ان دونوں ہر ایک سے اس قدر متنفر ہو رہا تھا کہ اس سے ہر قسم کے اقدام توقع کی جا سکتی تھی اور جیسا کہ اس نے کہا تھا کہ وہ اپنی زندگی سے ہی کھیل جاتا۔ اسی لیے شاہ جمانگیر اور عارفہ جہاں بول کھلائے ہوئے تھے وہاں اس کے سامنے محتاط بھی اتنے ہی تھے جتنے تھے کہ وہ کتنا اصول پسند ہے۔ اس کے دل میں ہر رشتے کی اپنی جگہ اور مقام ہے۔ وہ کسی کو کسی پر فوقیت نہیں دے سکتا۔ نہ صباحت کی خاطر ماں با کو چھوڑے گا اور نہ ماں باپ کی خاطر صباحت کو اگر انتخاب کا مرحلہ آتا تو وہ خود کو درمیان سے ہٹالے گا۔ اس میں اور شاہ سکندر میں یہی فرق تھا اور یہ شاہ سکندر بھی جان گئے تھے جب ہی اس کی ضمانت لیتے ہو انہوں نے آسیہ سے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ شاہ پور چھوڑ دے گا بلکہ صباحت کے جانے کا بھی مبہم سا اشارہ دے کہ جب آسیہ چاہے گی تب وہ بھی جائے گی۔

بہر حال شاہ جمانگیر اور عارفہ بیگم اس وقت کوئی اچھی امید لے کر نہیں آئے تھے۔ البتہ یہ اطمینان ضرور گھر کے دوسرے افراد ان سے اچھی طرح سے ملیں گے، حسب سابق اباجی ہی انہیں ڈرائنگ روم تک لا تھے اور انہیں بٹھا کر اندر چلے گئے تھے۔

”سوری“ آپ کو انتظار کی زحمت ہوئی میں اصل میں ابھی افسس سے آیا تھا۔“

”پھر تو ہم نے آپ کو زحمت دی۔“ شاہ جمانگیر نے کہا۔

”بالکل نہیں، پلیز تشریف رکھیں۔“

شاہ جمانگیر نے اباجی کو دیکھا اور ان کے بیٹھنے کے بعد بیٹھے تھے کہ دوبارہ کھڑے ہو گئے کیونکہ میمونہ بھابی جی کے ساتھ داخل ہوئی تھیں اور ان کے پیچھے آسیہ بھی۔

پھر ابتدائی رسمی جملوں کے بعد کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی تھی۔

شاہ جمانگیر کو اندازہ نہیں تھا کہ ادھر سب لوگ کیا طے کیے بیٹھے ہیں اس لیے اپنا مدعا ہرانے کے لیے انہ سوچنا پڑا تھا جبکہ ادھر سب منتظر تھے کہ بات وہ شروع کریں۔

عارفہ بیگم کو پہلے ہی گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ اس طویل ہوئی خاموشی سے مزید گھبرا کر وہ بول پڑیں۔

”پھر کیا سوچا آپ نے؟“

شاہ جمانگیر نے چونک کر اپنی بیگم کو دیکھا پھر ان کی بات آگے بڑھاتے ہوئے بولے۔

”ہمارا اچھی امید لے کر آئے ہیں۔ آپ بڑے ظرف کے لوگ ہیں۔“ یقیناً ”اچھا سوچا ہو گا جس میں پورا

بہتری ہوگی۔“

”ماں باپ تو بہتری ہی سوچتے ہیں۔ دعا کریں۔ آگے لکھنے والے نے بہتری لکھی ہو۔“ خلیل بھائی نے کہا تو اباجی ان کی بات کی تصحیح کرتے ہوئے کہنے لگے۔

”لکھنے والا بہتری ہی لکھتا ہے بس ہم انسان اس کی مصلحتیں نہیں سمجھتے۔ ٹوٹے رشتے پھر سے استوار ہونے میں بھی یقیناً“ اس کی کوئی مصلحت ہوگی اور ہمیں چاہیے ہم گزشتہ ساری باتوں ساری رنجشوں اور کدورتوں کو مٹا کر ایک دوسرے کو معاف کر دیں، ہمارے دل صاف ہوں گے تو آگے راستہ خود بخود صاف ہو جائے گا۔“ اباجی نے خاموش ہو کر باری باری سب کے ہتھکے ہوئے سروں کو دیکھا پھر کہنے لگے۔

”بہر حال آپ اچھی امید لے کر آئے ہیں اور ہم اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے آپ کو مایوس نہیں کریں گے، شاہ جمانگیر اور عارفہ بیگم کو اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ سرا سیمہ سے اباجی کو دیکھ رہے تھے۔

”کچھ چاہئے وغیرہ۔“ خلیل بھائی نے ان دونوں کو اس کیفیت سے نکالنے کی خاطر فہرے اونچی آواز میں کہا تو باقی وہ بری طرح چونکے، پھر ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کر اباجی کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بے حد ممنون لہجے میں بولے تھے۔

”آپ نے تو ہمیں خرید لیا۔ میرے پاس الفاظ نہیں جو میں آپ کا اور ڈاکٹر صاحبہ کا شکریہ ادا کر سکوں۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ اباجی نے ان کا کندھا تھک کر انہیں بیٹھنے کے لیے کہا پھر عارفہ بیگم کو کھڑے دیکھ کر آسیہ کو اشارہ کیا تو وہ اٹھ کر ان کے گلے لگتے ہوئے بولی تھی۔

”مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔“

شاہ جمانگیر اور عارفہ بیگم کو ان کی توقع کے بالکل برعکس اور اچانک جو خوشی ملی تھی، وہ ان سے چھپائی نہیں جا رہی تھی۔ عارفہ بیگم کا بس نہیں چل رہا تھا کہ فوراً ”علی کو اطلاع دے کر اس خوشی میں شریک کریں۔ بڑی مشکل سے انہوں نے صبر کیا تھا۔ تاریخ رکھنے کے بعد چائے پینے تک رکھیں پھر سب نے کھانے کے لیے بہت اصرار کیا لیکن وہ معذرت کر کے اٹھ کھڑی ہوئیں البتہ شاہ جمانگیر نے بہت محل کا مظاہرہ کیا تھا۔ فردا ”فردا“ سب سے ملے اور اپنے ہاں آنے کی دعوت دے کر آئے تھے۔

”کمال ہو گیا شادی! اس روز تو ڈاکڑنی۔“ عارفہ بیگم شروع ہوئی تھیں کہ انہوں نے نوک دیا۔

”بس عارفہ بیگم! اس روز کیا ہوا کیا نہیں پچھلی ساری باتیں بھول جاؤ۔ بس آج کو یاد رکھو اور آج کے بعد آنے والا ہر دن ایسا ہی خوشیوں بھرا ہونا چاہیے۔“

”انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا۔“ عارفہ بیگم فوراً بولی تھیں۔

اور جب وہ گھر پہنچے تو آگے علی ان کا انتظار تو کر رہا تھا، لیکن کھانے کے لیے جب ہی دیکھتے ہی کہنے لگا۔

”بس اسی جلدی سے آجائیں۔ مجھے بہت بھوک لگی ہے۔“ اس کے ساتھ ہی ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا تو شاہ جمانگیر نے عارفہ بیگم کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا، پھر علی کے پیچھے ڈرائنگ روم میں آتے ہوئے پوچھنے لگے۔

”کوئی خاص ڈش بنوائی ہے کیا؟“

”ہاں نہیں اب! اگر مہین نے کیا کیا بنایا ہے آئیے بیٹھیں۔“

”بھوک تو نہیں ہے پھر بھی تمہارے ساتھ کھا لیتے ہیں۔ بیٹھو عارفہ!“ شاہ جمانگیر نے عارفہ بیگم کے لیے کرسی کھینچ پھرانے کے لیے کھینچ کر بیٹھے تو بظاہر سرسری انداز میں کہنے لگے۔

”کھانے کے لیے وہ لوگ بھی بہت روک رہے تھے لیکن تمہاری ماں کو بہت جلدی تھی۔“

”کس بات کی؟“ اس نے سالن کا ڈونگا ان کے سامنے کرتے ہوئے بول ہی پوچھ لیا۔

”تمہیں خوشخبری سنانے کی، ہم تمہاری شادی کی تاریخ طے کر آئے ہیں۔“ عارفہ بیگم نے ابھی بھی بہت جلدی کھائی تھی۔

اور علی جمانگیر کی بھی وہی حالت ہو گئی جو ان دونوں کی ہوئی تھی۔ سرا سیمہ باری باری دونوں کو دیکھ گیا۔



”تمہاری ماں ٹھیک کہہ رہی ہے بیٹا! اگلے مہینے کی بارہ تاریخ طے ہوئی ہے۔“ شاہ جمائگیر پوری تفصیل کے ساتھ آئندہ کاروگرام بھی بتانے لگے اور وہ بظاہر سب سن رہا تھا لیکن اس کا ذہن کہیں اور بھٹک گیا تھا۔ وہ بڑبڑلائی لڑکی جو اس کی ہر بات کے جواب میں رونے لگتی تھی۔ یا پھر ایک بات کہتی۔  
”میں کیا کروں۔ میں ماما کو دکھ نہیں دے سکتی۔“  
ادھر شاہ جمائگیر سارا پروگرام بتانے کے بعد پتا نہیں کیا پوچھ رہے تھے اس نے سنا ہی نہیں تو جواب کیا دیا۔  
تب عارفہ بیگم اونچی آواز میں اسے پکار کر بولی تھیں۔  
”علی تم سے پوچھ رہے ہیں۔“

”جی!“ وہ چونکنے کے ساتھ بیٹھا بھی گیا۔ ”جی بابا کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“  
”میں کہہ رہا ہوں ادھر کا مسئلہ تو حل ہو گیا اب بابا جان سے کیا کہوں؟“ شاہ جمائگیر نے اس بار زور دے کر اپنی بات دہرائی تھی۔  
”کیا مطلب؟“ وہ سمجھا نہیں۔

”مطلب یہ کہ میں بابا جان سے کہہ کر نہیں آتا تھا کہ یہاں میں تمہاری شادی کے معاملات طے کرنے آرہے ہوں اور اس بات پر وہ ناراض ہوں گے کہ ان کے علم میں لائے بغیر اور ان سے مشورہ کیے بغیر میں نے شادی طے کر دی۔“

”بابا! نا حق پریشان ہو رہے ہیں۔ کیا بابا جان یہ نہیں چاہتے تھے کہ ڈاکٹر آسیہ بغیر کسی شرط کے صباحت کو رخصتی پر آمادہ ہو جائیں اور اسے وہ اپنی کامیابی سمجھ کر خوش ہوں گے تاکہ ناراض۔“  
اس نے زنج ہو کر ماما عارفہ بیگم نے اس کی تائید کی۔

”ٹھیک تو کہہ رہا ہے۔“ شاہ جمائگیر نے یوں سر جھٹکا جیسے ان دونوں سے بات کرنا فضول ہے۔ پھر علی اکبر جانے کا اشارہ کر کے اٹھ گئے تھے۔

جس روز شاہ سکندر حوطی چھوڑ کر گئے تھے بابا جان اپنے سب کام بھول گئے تھے۔ ملنے ملانے کا سلسلہ ہم ترک کر رکھا تھا سارا وقت اپنے کمرے میں بند۔ بس یہی سوچتے کہ سکندر نے ڈاکٹر انی اور اس کی بیٹیوں کو ان ترجیح دے کر اچھا نہیں کیا۔ اس کے بعد ان کا ذہن مسلسل ان کے خلاف سوچتا رہتا تھا۔ شاہ سکندر سے تو انہوں نے کہہ دیا تھا کہ وہ ہرجیت کا کھیل نہیں کھیل رہے تھے اور لاکھ وہ خود کو بھی یہی کہہ کر فریب دیتے لیکن ان کی کیفیت اس جواری کی سی تھی جو ہارنے کے بعد انتقام پر اتر آتا ہے اور ان کے اندر انتقام کی آگ تو شروع ہو چکی تھی اب مزید شعلے بھڑک اٹھے تھے۔ لیکن وہ کسی پر ظاہر نہیں کرتے تھے۔  
اس وقت بھی جب شاہ جمائگیر نے ان کے کمرے میں داخل ہو کر سلام کیا تو وہ سر کے اشارے سے جواب دے کر بہت بلکے بھٹکے انداز میں پوچھنے لگے۔  
”کہاں چلے گئے تھے تم؟“

”راجی گیتا تھا بابا جان!“ شاہ جمائگیر ان کے موڈ کا اندازہ کرتے ہوئے بولے۔  
”علی کے پاس گیا ہے علی، آیا نہیں بہت دنوں سے؟“  
”ملازم آدمی ہے بابا جان! چھٹی مل جاتی ہے تو آ جاتا ہے۔“  
”ہوں۔“ وہ ہوں کے انداز میں لمبی سانس باہر نکال کر خاموش ہو گئے۔

شاہ جمائگیر کو کہ خود کو بہت تیار کر کے آئے تھے، پھر بھی انہیں اپنی بات کہنے میں بہت دقت ہو رہی تھی۔ اس میں انہیں اندازہ نہیں تھا کہ بابا جان کا رد عمل کیا ہو گا اور یہی دیکھنے کے لیے وہ بہت سوچ کر بولے۔

وہ بابا جان میں علی کی سرال گیا تھا۔“

علی کی سرال؟“ بابا جان نے یوں دیکھا جیسے ہم سے پوچھتے بغیر۔

جی وہ علی کی شادی طے کرنے۔“ شاہ جمائگیر نظریں چرا کر بولے جیسے کسی جرم کا اعتراف کر رہے ہوں۔

ہو گئی طے؟“ بابا جان نے طنز سے پوچھا۔

جی اگلے مہینے کی بارہ تاریخ۔“ شاہ جمائگیر اسی قدر کہہ سکے۔

ہوں۔“ بابا جان کچھ دیر سوچنے کے بعد پوچھنے لگے۔ ”کیا شرائط رکھی ہیں اس ڈاکٹر انی نے؟“

شرائط! نہیں بابا جان! انہوں نے کوئی شرط نہیں رکھی۔“

اب جواب سے بابا جان کو اپنی اہمیت کم ہونے کے احساس سے شدید دھچکا لگا تھا۔ کتنی دیر انہیں خود پر قابو میں لگی پھر بھی طنز سے بولے تھے۔

اس کا مطلب ہے بیٹی بہت بھاری ہو گئی ہے اس پر۔“

ناہ جمائگیر مصلحتاً ”خاموش رہے۔“

خیر مبارک ہو نہیں۔ اپنی بی بی جان کو بتایا؟“ بابا جان اب انہیں ٹالنا چاہتے تھے۔

جی نہیں میں سیدھا آپ کے پاس آ رہا ہوں۔“

تو اب جا کر بتاؤ انہیں تاکہ وہ تیاری کر سکیں۔“

آپ! آپ چلیں گے بابا جان؟“ شاہ جمائگیر نے ایک دم خوش ہو کر پوچھا تو وہ سمجھ کر بھی انجان بن گئے۔

کہاں؟“

راجی! میرا مطلب ہے شادی میں شریک ہوں گے نا؟“

ہم کیا چاہتے ہو؟“ بابا جان بڑی کھوجتی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھنے لگے تھے۔

میں تو یہی چاہوں گا کہ علی کے سر پر سہرا آپ سجائیں۔“ شاہ جمائگیر ہر طرح سے ان کا مان ان کی بڑائی رکھنا چاہتے تھے۔

”ہاں!“ بابا جان نے طویل وقفہ لگایا پھر کہنے لگے۔

”ہم اپنی اولاد کی خواہش رد نہیں کرتے جمائگیر! یہ تم جانتے ہی ہو۔ سکندر نے شہر میں شادی کرنی چاہی تھی تو ہم خود نہیں بھیج کر اس کی شادی کرادی تھی۔ علی نے جو چاہا اس کے لیے ہمیں کیا کچھ نہیں کرنا پڑا۔ ہم اس ننگ چین سے نہیں رہے جب تک اس لڑکی کو علی کی منکوحہ نہیں بنادیا اور اب تم چاہتے ہو کہ علی کے سہرا راہم سجائیں تو تمہاری یہ خواہش ہم علی کی دوسری شادی میں پوری کر دیں گے۔“

”جی!“ شاہ جمائگیر حقیقتاً ”چکرا گئے تھے دیواریں گھومتی ہوئی لگ رہی تھیں اور ساعتوں میں بابا جان کی زحمتی کہ پکھلا ہوا سیہ کس قدر سفائی سے بول رہے تھے۔

”جی!“ شاہ جمائگیر نے اس کے لیے ہمیں خواہ بستیوں کی بستیاں اجاڑنی ہیں،  
”جی!“ شاہ جمائگیر نے اس کے لیے ہمیں خواہ بستیوں کی بستیاں اجاڑنی ہیں،  
”جی!“ شاہ جمائگیر نے اس کے لیے ہمیں خواہ بستیوں کی بستیاں اجاڑنی ہیں،

”جی!“ شاہ جمائگیر نے اس کے لیے ہمیں خواہ بستیوں کی بستیاں اجاڑنی ہیں،  
”جی!“ شاہ جمائگیر نے اس کے لیے ہمیں خواہ بستیوں کی بستیاں اجاڑنی ہیں،  
”جی!“ شاہ جمائگیر نے اس کے لیے ہمیں خواہ بستیوں کی بستیاں اجاڑنی ہیں،

کا حق بھی چھین رہے ہیں۔" شاہ جہانگیر ان کے عراظم سوچ کر پریشان ہو گئے تھے۔  
 "ہم چھین رہے ہیں۔ ہم اپنا تم کو ان شر والیوں نے باطل کر دیا ہے جو ایک کے بعد ایک ہمارے مقابلہ کھڑا ہو رہے ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں آخر ایسی کیا بات ہے ان ماں بیٹیوں میں جن کے لیے پہلے سکندر ہمیں چھوڑ گیا تم ہمیں نفع نقصان سمجھا رہے ہو۔"

بابا جان غصے سے بول رہے تھے، لیکن آخر میں آپ ہی آپ ان کے لمحے میں بے بسی سمٹ آئی تھی۔  
 "آپ نہیں سمجھ سکتے بابا جان! کیونکہ آپ کے نزدیک جذبات کی کبھی اہمیت نہیں رہی۔ محبت پر آپ کا نہیں تھا۔ ورنہ آسہ کو طلاق دلوانے سے پہلے ایک بار تو ضرور سوچتے اور اس وقت ہمیں تو اب سوچ لینا کہ عورت کے لیے کوئی کمی نہیں تھی، پھر بھی اس نے خود پر سارے دروازے بند کر دیے کیوں اس لیے کہ جو ایک بار دل سے جس کو اپنا مان لے پھر ہمیشہ کے لیے اسی کی ہو جاتی ہے۔ خواہ اس کا محبوب اسے مٹی میں دے، ٹھوکر مار کر کہیں چلا جائے یا بیوی کی چادر اوڑھا کر۔ اس کے دل سے نہیں نکلتا اور ایسی عورت کے چھوڑنے والے تخت و تاج چھوڑ دیتے ہیں۔ سکندر تو پھر ڈنڈی مار گیا ہے۔ اپنی زندگی بڑے آرام سے گزارا بھی ہے وہ اس کی خاطر یہاں سب چھوڑ کر نہیں گیا۔ اپنی بیٹیوں کے لیے جنہیں آپ ان کا اصل مقام دیتا رہیں اور چاہتے ہیں کہ باپ بھی ان کے بارے میں نہ سوچے، وہ اپنی بیٹی کے لیے گیا ہے بابا جان اور میرے بیٹے کی محبت سے مجبور ہوں۔"

شاہ جہانگیر بولنے پر آئے تو بولنے چلے گئے تھے۔  
 "اب ہمیں اپنی مجبوریوں کی داستان مت سناؤ جہانگیر! جاؤ جو تمہارا دل چاہے کرو۔"  
 بابا جان بہت دیر سے ضبط کر رہے تھے بلا تخریج پڑے اور انہیں کمرے سے نکل جانے کا اشارہ بھی کیا جہانگیر نے یوں ہونٹ پیچھے جیسے مزید پتھر سے سر نکلانے کا کوئی فائدہ نہیں پھر کمرے سے نکل گئے تھے۔  
 "مجبور ہو نہ، ہم تو کبھی مجبور نہیں ہوئے یہ ہماری اولاد بتائیں۔"  
 بابا جان سخت سے سر جھٹک کر اپنے آپ بول رہے تھے کہ شاہ تیمور کے آنے پر ہونٹ بھیجنے کراے لگے ان کی آنکھوں سے ابھی بھی غصہ جھلک رہا تھا۔ جس سے شاہ تیمور خائف سا ہو کر دروازے کباب رک گیا۔

"کیا بات ہے؟" بابا جان نے پوچھا تب وہ آگے آتے ہوئے بولا۔  
 "میں ایک ضروری بات کہنے آیا ہوں بابا جان!"  
 "ضروری بات۔" بابا جان کی پیشانی سکڑ گئی۔  
 شاہ تیمور کو اگر معلوم ہو تاکہ اس کے آنے سے پہلے یہاں شاہ جہانگیر اور بابا جان کے درمیان کیا بات تھی تو وہ ہرگز اس وقت نہ آتا لیکن اسے کیونکہ معلوم نہیں تھا اس لیے سہولت سے کہہ گیا۔  
 "جی میں مدیحہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور یہ شادی آپ ہی کر سکتے ہیں۔"  
 "مدیحہ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟" بابا جان پر سوچ انداز میں کہتے ہوئے اٹھ کر ادھر سے ادھر ٹھٹھلے گئے دم رک کر بولے تھے۔

"کیوں خاندان میں اور لڑکیاں بھی تو ہیں مدیحہ سے زیادہ خوب صورت پڑھی لکھی اور جائیداد والی! نظر نہیں آتیں۔"  
 شاہ تیمور خاموش رہا لیکن اس کے ہر انداز سے بغاوت جھلک رہی تھی۔ بابا جان کچھ دیر تک اسے بے پردہ جیسے پرکار زرداری سے پوچھنے لگے۔  
 "کیوں کرنا چاہتے ہو مدیحہ سے شادی؟"

"اس نے میری توہین کی ہے بابا جان! میرا مذاق اڑایا ہے۔ مجھے دھوکا دیا ہے اور میں اسے بتاؤں گا۔"

وہ ہے۔" شاہ تیمور کا سگلتا ہوا لہجہ بتا رہا تھا کہ اس کے اندر کیسی آگ بک رہی ہے۔  
 "ہوں! بابا جان کے سینے سے اطمینان بھری سانس خارج ہوئی تھی۔ پھر بیٹھے ہوئے اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا ورنہ کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگے۔

"یہ سبق تو اسے ضرور ملنا چاہیے۔ وہ اتنی سی لڑکی، ہم سب کو دھوکا دے گئی۔ خیر تم فکر نہیں کرو۔ ہم تمہارے آپ سے کہتے ہیں کہ وہ پہلی فرصت میں سکندر کے پاس جائے اور مدیحہ سے تمہاری شادی کی بات کرے۔"

"سکندر رچا نہیں مانیں گے۔" شاہ تیمور نے باپ سے کہا۔  
 "کیوں کیوں نہیں مانے گا۔ علی کی شادی ہو رہی ہے کہ نہیں۔ تمہاری بھی ہو جائے گی اور پھر تمہارے باپ کا وہ بہت لحاظ کرتا ہے۔ اس کی بات خود نالے گا، نہ ڈاکٹری کو نالے دے گا مجھے۔ تم فکر مت کرو۔"

♥ ♥ ♥  
 "آج اتوار تو نہیں ہے پھر نیل بھائی گھر پر۔" وہ سوچتے ہوئے نیل کے کمرے میں آئی اور انہیں بیڈ پر دیکھ کر بت کے مطابق پریشان ہو گئی۔

"کیا ہوا نیل بھائی! آپ کی طبیعت خراب ہے۔"  
 "نہیں، بس ذرا سر میں درد تھا، وہ بھی اب نہیں ہے۔" نیل نے بوا کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتے ہوئے اطمینان بولا۔

"لیکن آپ کی تو آنکھیں بھی لال ہو رہی ہیں۔" وہ کہاں مطمئن۔ ہونے والی تھی۔  
 "سو کر اٹھا ہوں اس لیے ہو رہی ہوں گی۔ اب تم زبردستی مجھے کوئی بیماری لگا دو۔" نیل نے چڑ کر کہا۔  
 "بیماری لگے آپ کے دشمنوں کو۔ آپ کو تو میری عمر لگ جائے۔"  
 "صبا! نیل نے فوراً ٹوکا۔" "فضول باتیں مت کیا کرو۔"  
 "ڈانٹ کیوں رہے ہیں۔ ایک تو میں پہلے ہی بور ہو رہی ہوں۔" وہ منہ پھلا کر بولی۔  
 "کیوں مدحو کہاں ہے؟"

"بازار گئی ہے۔ میں بھی چلی جاتی تو اچھا تھا۔"  
 "ہاں ذرا سکون ہو جاتا۔" نیل نے اس کا پھولا ہوا منہ دیکھ کر مزید چھیڑا تو وہ جھنجھڑ کر بولی۔  
 "فکر نہیں کریں میں آج جا رہی ہوں پھر آپ سکون سے رہے گا۔"  
 "کہاں؟ تم کہاں جا رہی ہو؟" نیل نے چائے کا گھونٹ لے کر پوچھا۔  
 "پیلا کے پاس! ابھی ان کی گاڑی آئے گی اور اب بس میں وہیں رہوں گی۔ یہاں نہیں آؤں گی آپ کو سکون ہے نا اور ہاں مدحو بھی میرے ساتھ جائے گی۔"

وہ ناراض سی ہو کر بولی چلی گئی اور جب خاموش ہوئی تب بھی نیل کچھ نہیں بولے جانے کیا سوچنے لگے تھے۔  
 "نیل بھائی! اس نے پہلے پکارا پھر ان کے پاس آئی تھی اور آہستہ سے ان کا ہاتھ ہلا کر پوچھنے لگی۔" آپ کیا کہتے تھے؟"

"ہاں! نیل نے چونک کر اسے دیکھا پھر افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ "کچھ نہیں۔"

"اچھا بتائیے میں کیا کہہ رہی تھی؟"  
 "تم اپنے جانے کی بات کر رہی تھیں۔ خیر تمہارا جانا تو یوں بھی طے ہو گیا ہے لیکن مدحو کو تو ابھی یہیں رہنا ہے جب تک اس کی کہیں بات طے نہیں ہوتی۔"  
 نیل نے نظارہ ٹکے جھلکے انداز میں کہا تو وہ کچھ دیر تک انہیں دیکھتی رہی پھر بہت سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔  
 "آپ چاہتے ہیں مدحو کی کہیں بات طے ہو؟"

"ہاں کیوں نہیں۔ ساری زندگی وہ بوہنی تو نہیں بیٹھی رہے گی اس گھر میں۔" نیل نے نظرس چرا کر بولے تھے۔

”جانا اپنے اختیار میں ہے آنا نہیں۔ خدا حافظ۔“ وہ بیگ اٹھا کر جس تیزی سے کمرے سے نکلی اس سے مدد چاہنے لگی۔ اس نے ہٹا ہوا کمرے سے اور اسے منانا کون سا مشکل تھا جو وہ اس کے پیچھے بھاگتی بس گہری سانس کھینچ کر نکلی۔

”کیا بات ہے؟ کچھ چاہیے؟“

”ہاں تمہارے در سے میں ہمیشہ کچھ لینے ہی تو آتا ہوں۔“ عمر نے کہا تو وہ آکٹا کر بولی۔

”میں اس وقت تم سے کوئی بحث نہیں کروں گی۔“

”بحث کون کر رہا ہے۔ یہ بتاؤ صبا ناراض ہو کر کیوں گئی ہے؟“

”میں اس کے ساتھ نہیں گئی اس لیے اب یہ مت پوچھنا کہ میں کیوں نہیں گئی۔“

”تو یہ کرو مجھے کیا یاد لے کتے نے کاٹا ہے جو میں تم سے کچھ پوچھوں گا۔“ عمر کاٹوں کو ہاتھ لگاتا ہوا وہیں سے پلٹا تو اس نے ایک دم پکار لیا۔

”سنو عمر!“

عمر رک گیا لیکن اس کی طرف رخ نہیں موڑا تھا۔

”وہ ماما کیلی ہو جاتیں نا میں اس لیے نہیں گئی۔“ اس نے کہا تو عمر جھٹکے سے اس کی طرف پلٹا اور حیرت سے اس میں ہٹا کر بولا۔

”یہ تمہیں دوسروں کا احساس کب سے ہونے لگا۔ تمہاری بلا سے کوئی اکیلا ہوا۔“ عمر اس کے گھورنے پر ادھوری پھوڑ کر ہاتھ ہلاتا ہوا کمرے سے نکل گیا تھا۔

ایک میری ہی ہر بات پر گرفت کیوں ہوتی ہے۔ وہ سوچتی ہوئی دروازے تک آئی۔ پھر اسے ہند کر کے اس ساتھ کمر ٹیک کر کھڑی ہو گئی اور یونہی ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اچانک اس کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں شاید کوئی ماس ملا تھا۔ کچھ کھونے کا کچھ پانے کا لیکن وہ سمجھ نہیں پاری تھی۔

”یہ صبا کیا کہہ رہی تھی نیل بھائی ہے؟“

اس نے ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتے ہوئے سوچا اور ست روی سے آکر بیڈ پر لیٹ گئی۔ اس کے اندر دل کسی شے میں آگیا تھا اور ذہن کے پردوں پر کہیں دھندلے عکس ابھر رہے تھے، کہیں بہت واضح اور ہر جگہ ایک مت نمایاں تھا جسے اس نے ہمیشہ نظر انداز کیا تھا اور آپ ہی آپ اس سے دشمنی بھی باندھ لی تھی کہ وہ کیوں اہمال کی محبت میں حصہ دار بن کر آگیا تھا۔

بہت چھوٹی تھی تب بھی آسمان کی نیل پر ذرا سی توجہ پر چچ چلا کر احتجاج کرتی تھی اور اس پر بس نہیں تھا اس حد نیل سے بھی لڑتی تھی، لیکن انہوں نے کبھی اس کی کسی بات کا برا نہیں مانا تھا۔ الٹا اس کی طرف داری تھے اور اب تک ایسا ہی تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کی اسی عادت کو صبا نے محبت سمجھ لیا تھا یا واقعی وہ اس سے محبت تھے۔ کتنی دیر تک وہ اس بات میں الجھتی رہی لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی اور نہ ہی مجھے کیا کہہ کر اس وزہن سے جھٹک سکی۔ شاید یہ نیل کے جذبے تھے جو اپنا آپ منوار ہے تھے۔

صبا اہمال صبا سے پوچھتی ہوں۔ ”اسے ایک دم صبا کا خیال آیا تو فوراً اٹھ کر کھڑی ہوئی اور اسے فون نے کے ارادے سے لابی میں آئی تو اسی وقت فون کی بیل بجنے لگی تھی۔

”ہیلو صبا!“ وہ کیونکہ صبا نے اسے ہی بات کرنے کا سوچ رہی تھی اس لیے رسیور اٹھاتے ہی اسے پکارا تھا۔

”نیل صبا نہیں اصرہ ہوں۔“ دوسری طرف سے اصرہ کی آواز سننے ہی وہ سنبھل گئی۔

”جی کیسے ہیں آپ؟“

”نم کیسی ہو۔“ اصرہ نے جواب نہیں دیا تو وہ بھی گول کر گئی۔

”آپ چاہیں تو وہ اس گھر میں رہ سکتی ہے اور یونہی نہیں۔“ اس نے زور دے کر کہا تو نیل اس کا مطلب کر خاموش ہو گئے۔

”مسئلہ یہ ہے کہ آپ چاہتے ہی نہیں ہیں۔“ وہ ان کے خاموش رہنے پر اپنے آپ بولنے لگی تھی۔ ”پتا نہ کیا سوچ کر کھا ہے آپ نے یا آپ کو کسی خاص وقت کا انتظار ہے، یہی بات ہے نا۔“

”میرا خیال ہے مجھے چلنا چاہیے۔ تمہاری فضول باتیں سننے سے بستر ہے میں۔“ وہ بولتے ہوئے بیڈ دوسری طرف اتر گئے۔

”فضول باتیں! آپ مدحو سے محبت کرتے ہیں یہ فضول بات ہے۔“

”بس خاموش ہو جاؤ صبا!“ نہیں جانے کیوں غصہ آگیا تھا۔

”آپ واقعی بزدل ہیں نیل بھائی اور آپ کو اپنی محبت پر بھروسہ بھی نہیں ہے، ورنہ مدحو کوئی آسمانی مخلوق نہ ہے جس کے سامنے اعتراف نہ کیا جاسکے۔ میں بتاؤں گی اسے کہ آپ۔“

”ہاں بتا دینا اور اس کے بعد بھول جانا کہ یہاں کوئی نیل بھی تھا۔“ انہوں نے اسی غصے سے کہا تو وہ اچھل کھڑی ہو گئی۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“

نیل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وارڈ روپ سے کپڑے نکال کر واش روم میں چلے گئے۔ تو وہ پہلے جنملائی پڑی دل ہی دل میں افسوس کرتی ہوئی وہاں سے نکل کر اپنے کمرے میں آئی اور آگے مدحہ کو کھڑے کر کتبہ بولی۔

”ہائیں۔ تم لوگ اتنی جلدی آگئے۔“

مدحہ نے کوئی جواب نہیں دیا نا ہی اس کی طرف متوجہ ہوئی تو وہ چند قدم آگے آکر اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھ گئی۔

”کیا بات ہے مدحو؟“

”وہ میں یہ بیگ دیکھ رہی تھی۔ کہیں جا رہی ہو کیا؟“ مدحہ نے ابھی بھی اس کی طرف نہیں دیکھا اور بیگ کے اندر ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگی تھی۔

”صرف میں نہیں، ہم دونوں جا رہے ہیں پاپا کے پاس۔ وہ چاہتے ہیں میں کچھ دن ان کے ساتھ رہوں۔“

”ہاں پھر تو تمہاری شادی ہو جائے گی۔“ مدحہ نے یہ بات بھی کچھ کھونے ہوئے انداز میں کہی تھی۔

”اچھا دیکھو میں نے تمہارے یہ سوٹ رکھے ہیں۔“ اس نے بیگ اپنی طرف کھینچ کر مدحہ کے سوٹ نکال کر اس کے سامنے کیے تو وہ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے بولی۔

”میرے کیوں؟ میں تو نہیں جا رہی۔“

”کیوں؟“

”کیوں کا کیا مطلب۔ یہاں اتنے کام ہیں وہ کون کرے گا پھر ماما بھی اکیلی ہو جائیں گی۔ نہیں میں نہیں جاؤں گی۔“ مدحہ قدرے ترشی سے کہتی ہوئی الماری کی طرف بڑھ گئی۔

”ٹھیک ہے پھر میں بھی نہیں جاتی۔“

”جو کومت پاپا نے بلایا ہے تمہیں ضرور جانا ہے۔ چلو اور جو کچھ رکھنا ہے رکھو بیگ میں ورنہ میں ابھی ماما کو فون کرتی ہوں پھر ان کی ڈائنٹ سن کر روٹی ہوئی جاؤ گی۔“ مدحہ پتا نہیں کیوں ناراض ہو رہی تھی۔

”صبا! منشر صاحب کی گاڑی آگئی ہے۔“

”آ رہی ہوں بلکہ جا رہی ہوں۔“ اس نے بیگ بند کر کے مدحہ کو دیکھا تو وہ بے اختیار بولی تھی۔

”زیادہ دن مت رکنا۔“

ایا توں کوڈہن سے جھٹک دے، لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ جتنا اپنا دھیان ادھر ادھر کرتی کوئی نہ کوئی بات جانی۔

نیل بھائی کیا چاہتے ہیں۔ کاش تم جان سکو۔ ”ایک بار صباحت نے کہا تھا۔  
وہ بہت گہرے ہیں، کبھی ظاہر نہیں کریں گے۔ پتا نہیں احمر پر کیسے ظاہر ہو گئے تھے جو وہ کہہ رہا تھا۔  
نادان لڑکی! اصل بات سوچو دنیا میں بے غرض و بے لوٹ محبت نایاب ہے۔ تم خوش قسمت ہو کہ۔“  
بے غرض و بے لوٹ محبت۔ ناممکن۔ وہ جھٹلائے کی سعی کرنے لگی۔ کائنات کا سارا نظام دو اور لو کے اصول پر  
ہا ہے۔ سودے بازی ہر جگہ سودے بازی۔  
نڈیا ادھار۔

سود سوچتے ہیں۔  
ندگی کے کاروبار میں گھائلے کا سودا کوئی نہیں کرتا۔  
بت بھی کاروبار ہے۔ سراسر دکانداری۔  
کے عوض دل۔

یوں ہی اوٹ پانگ سوچے جاری تھی کہ آسیہ کی آواز پر چونک گئی۔  
سہ نیل کو پکار رہی تھی۔ وہ سامنے کی تو کچھ حیرت سے پوچھنے لگی۔  
تم گئیں نہیں بیٹا۔ ”پھر خود ہی کہنے لگی۔“ اچھا کیا یہاں اتنے کام ہیں۔“  
جی ماما! میں اسی لیے نہیں گئی اور میں یہ بھی دیکھنا چاہتی ہوں کہ صبا چلی جائے گی تو کیسا لگے گا۔“ اس نے  
، صورتی سے بات بنائی۔ تب ہی نیل کمرے سے نکل کر آئے تو آسیہ جو اس سے کچھ کہنے جاری تھی، نیل  
رف متوجہ ہو کر بولی۔  
چلو بیٹا! بوائے کھانا لگا دیا ہے۔ آؤ دو۔“  
جی ماما چلیں۔“ اس نے آسیہ کے بعد نیل کو اندر جانے دیا پھر ان کے پیچھے ڈانٹنگ میں داخل ہوئی تھی۔



صباحت کے ساتھ مہر النساء اور الماس کا رویہ خاصا نرم تھا اور ناگواری لیے ہوئے تھا۔ بس شاہ سکندر کے  
نے الماس نے اس سے رسمی جملے بولے تھے جبکہ مہر النساء نے اس کی بھی ضرورت نہیں سمجھی تھی اور وہ مدح  
تھی جو جو اب اس کے ہر عمل سے ان پر یہ جتا کی کہ اسے بھی ان کی پروا نہیں ہے۔ اسے پروا بھی جب ہی تو اسے  
رف بری طرح محسوس ہو رہا تھا بلکہ بہت دکھ بھی ہو رہا تھا اور رات جب تک اسے نیند نہیں آئی، وہ کڑھتی  
تھی۔

محصول سے بہت پہلے اس کی آنکھ کھل گئی۔ شاید نئی جگہ کی وجہ سے بہر حال اس نے دوبارہ سونے کی  
ش نہیں کی اور اٹھ کر نماز پڑھی۔ اس کے بعد کھڑکی کے پاس آکھڑی ہوئی۔ کراچی کے موسم کا کچھ پتا نہیں  
دسمبر شروع ہو چکا، لیکن سردی بس برائے نام ہی تھی۔ صبح کے وقت کچھ ٹھنڈک محسوس ہوتی یا پھر شام

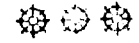
س وقت فضا میں قدرے خنکی تھی جو کہ بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ دھیرے دھیرے اترتے اجالے میں  
لے منظر واضح ہونے لگے تھے اس نے کھڑکی میں آگے کی طرف جھک کر یاں سمت دیکھا تو لان کا کچھ حصہ  
آیا۔ اتنے سے حصے میں ہی خوش رنگ پھولوں کی بہتات تھی اور وہ پھولوں کی دیوانی وہیں سے کود کر لان میں آئی  
تھا۔ ”اس کی روح تک سرشار ہو گئی۔ ایک کونے سے دوسرے کونے تک اس نے تلتے چکر لگا ڈالے اور ابھی  
کایہ خفیل جاری تھا کہ شاہ سکندر آ گئے۔

”صبا اور نیل بھائی دونوں نہیں ہیں اس وقت اور ماما بھی کلینک گئی ہوئی ہیں۔“  
”اور مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“ احمر نے فوراً کہا۔  
”جی! اس نے سننے کا اشارہ دیا تو وہ جلدی سے بولا۔

”بیٹھو ابھی توبہ کے خط سے صبا کی شادی کا پتا چلا ہے میں نے سوچا ماما کب ادے دوں۔“  
”شادی اگلے مہینے کی بارہ تاریخ کو ہے۔ بہر حال پیشگی مبارکباد کا پیشگی شکریہ اور کوئی بات؟“  
”ہاں ایک بات اور ہے تم ہر اتو نہیں مانو گی۔“ احمر نے رک کر پوچھا تھا۔  
”میرے برائے نہ مانے کو چھوڑیں۔ آپ اپنی بات کہیں۔“ وہ خاصی بے مروتی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔  
”میں تمہیں اس شخص کا بتانا چاہتا ہوں جو تمہارے ساتھ سب سے زیادہ مخلص ہے بہت محبت کرتا ہے وہ تم  
سے۔“

”کون؟“ اس کی دھڑکنیں رکنے لگی تھیں۔  
”نیل بھائی! احمر بتا کر خاموش ہو گیا تھا۔  
اسے لگا وہ اس سچائی کو کبھی نہیں جھٹلا سکے گی۔ اس کے ساتھ ہی اسے ایک خیال آیا تھا۔ فوراً احمر کو پکار کر  
پوچھنے لگی۔

”احمر! آپ کو کس نے بتایا۔“  
”تمہارا کیا خیال ہے نیل بھائی نے بتایا ہو گا۔ نہیں وہ بہت گہرے ہیں، کبھی ظاہر نہیں کریں گے۔“ احمر نے  
کہا تو وہ اندر ہی اندر ابھڑ کر بولی۔  
”پھر آپ کو کیسے پتا چلا؟“  
”اس بات کو چھوڑو نادان لڑکی اور اصل بات سوچو۔ دنیا میں بے غرض و بے لوٹ محبت نایاب ہے، تم خوش  
قسمت ہو کہ۔“  
شاہ لائن کٹ گئی تھی۔ اس نے چونک کر دو تین بار کریڈل پر ہاتھ مارا پھر ریسیور رکھ کر پلٹی تو سامنے سے نیل کو  
آتے دیکھ کر وہ ان ہی کے انتظار میں وہیں رک گئی تھی۔



اور جب نیل قریب آئے تو وہ کچھ شپٹا کر نظروں کا زاویہ بدل گئی۔  
”کیا بات ہے؟“ نیل نے رک کر پوچھا تو وہ آہستہ سے بولی۔  
”کچھ نہیں۔“  
”پھر یہاں کیوں کھڑی ہو۔ میرا مطلب ہے کسی کے فون کا انتظار ہے۔“ نیل کا انداز ہوش کی طرح سادہ تھا۔  
کہیں سے بھی نہیں لگ رہا تھا کہ وہ اپنے اندر اس کے لیے سب سے الگ جذبے چھپائے کھڑے ہیں۔  
”وہ میں صبا کو فون کر رہی تھی لیکن نمبر ہی نہیں مل رہا۔“ اس نے بات بنائی۔  
”صبا کو! اچھا ہاں، شام میں اس نے بتایا تھا کہ وہ اپنے پیارے ہاں جاری ہے۔ تم نہیں گئیں؟“ نیل نے ایک  
دم باوا آنے پر پوچھا۔

”نہیں۔“  
”کیوں؟“  
”بس بدل نہیں چاہا۔“  
”دل نہیں چاہا۔“ نیل ذرا سا مسکرائے پھر آگے بڑھتے ہوئے بولے۔ ”ٹھیک ہے، تم نمبر ڈال کر۔“  
اس نے خاموشی سے انہیں کمرے میں جاتے ہوئے دیکھا پھر میز پر نکل آئی اور بہت چاباکہ صباحت اور پھر

”سلاام علیکم یابا۔“ وہ انہیں دیکھتے ہی تیز قدموں سے ان کے قریب چلی آئی تھی۔  
 ”و علیکم سلام آج کی صبح ہمیشہ سے زیادہ خوب صورت لگ رہی ہے۔“ شاہ سکندر خوش دلی سے بولے۔  
 ”مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔“ اس نے کہا تو شاہ سکندر نے ہلکا سا قہقہہ لگایا پھر اس کے ساتھ لان چیر چر بیٹھے اور کچھ دیر ایسی ہی ہلکی پھلکی گفتگو کرنے کے بعد کہنے لگے۔  
 ”بیٹا! مجھے افسوس ہے کہ الماس اور اس کی ممی نے آپ کے ساتھ کچھ اچھا بھلا ہیو نہیں کیا۔ آپ نے ضرور مانتا دیکھا ہوگا۔“

”نہیں بیٹا۔“ وہ فوراً بول پڑی۔ ”مجھے دکھ ضرور ہوا لیکن ان سے کوئی شکایت نہیں ہے اور میں کو شش کروا گیا کہ انہیں بھی مجھ سے شکایت نہ ہو۔“  
 ”گندبو آراؤلی ڈائر۔“ شاہ سکندر کو اس کے جواب سے خوشی ہوئی۔  
 ”تھینک یو۔“

”اور بیٹا! آپ کے ساتھ مدھیہ نہیں آئی۔“  
 ”ہاں نہیں بیٹا! اس کے موڈ کا کچھ پتا نہیں چلتا۔“  
 ”ہوں۔“ موڈی لڑکی ہے۔“ انہوں نے سوچتے ہوئے انداز میں کہا۔ غالباً ”ان کا ذہن کیوں اور ہٹک گیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک انہیں دیکھتی رہی۔ پھر پکار کر پوچھنے لگی۔  
 ”بیٹا! آپ کے لیے چائے لاؤں۔“  
 ”چائے۔“ انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔  
 ”ابھی تک چائے نہیں آئی۔“

”میں لاتی ہوں۔“ وہ فوراً اٹھ کر اندر آئی تو آگے خانساں چائے لیے بکھن سے نکل رہا تھا۔ اس نے ٹرے میز ایک کپ دیکھا تو وہیں سے اپنے کمرے میں آگئی۔ کیونکہ اس کا چائے پینے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔  
 پھر ناشتے کے بعد شاہ سکندر چلے گئے تو وہ کتنی دیر انہیں کی طرح لاؤنج میں بیٹھی رہ گئی۔ حالانکہ دو تین بار الماس وہاں سے گزری تھی لیکن مروتاً بھی اس سے بات نہیں کی اور مہر النساء تو اپنے کمرے ہی سے نہیں نکلی تھی۔ اس لیے الماس سے بڑی ہونے کے باوجود اس نے پہل کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کی اور خود اس کے کمرے میں چلی آئی۔

الماس ایک کونے میں نیچے کاربٹ پر بیٹھی اپنے سامنے اخبار پھیلائے اس پر جھکی ہوئی تھی۔ جبکہ اس کے اطراف کچھ ساوہ پیہر زکھرے ہوئے تھے۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے فوراً ”سراونجا کیا تھا اور اسے دیکھ کر اس تیزی سے ادھر ادھر بکھرے پیہر زسمینے میں لگ گئی۔ تو وہ اس کی اس حرکت کو قصداً ”نظر انداز کرتی ہوئی دوستانہ انداز میں بولی۔

”کیا ہو رہا ہے۔“ الماس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ یوں جیسے سنا ہی نہیں۔  
 ”میں بہت بور ہو رہی ہوں۔ حالانکہ یہاں میرے شوق اور دلچسپی کے لیے بہت کچھ ہے لیکن پتا نہیں کیوں نہ میرا لپٹا کی لاہر بری میں دل لگانا۔“  
 وہ اپنے آپ بولتی ہوئی ایک دم خاموش ہو گئی تو الماس بلا ارادہ اسے دیکھنے لگی اور اس کا مقصد اسی طرح اسے متوجہ کرنا تھا۔

”تم کوئی کام کر رہی تھیں۔ میں تمہیں ڈسٹرب نہیں کروں گی۔ تم آرام سے اپنا کام کرو۔“ وہ اس سے کہہ فاصلے پر نیچے بیٹھ گئی۔ پھر ادھر ادھر دیکھتی ہوئی بولی۔  
 ”تمہارے کمرے کی سینگ بہت خوب صورت ہے۔ اگر تم نے خود کی ہے تو یقیناً تم آرٹسٹک مائنڈ ہو تمہارے سبھی کھٹ کیا ہیں؟“

الماس خاموشی سے اسی دیکھے جا رہی تھی۔ وہ بالکل مدھیہ جیسی لگ رہی تھی، لیکن اس کا ہر انداز اس سے مختلف تھا نہ لہجے میں تنفر نہ آنکھوں میں خشونت اس کے برعکس اپنائیت کا احساس دیتی لگ رہی تھی۔  
 ”فائن آرٹس۔“ اس نے جواب نہ پا کر خود ہی قیاس کر کے کہا تو اس بار الماس بے اختیار بولی تھی۔  
 ”نہیں سائنس۔“

”اے تم سائنس کی اسٹوڈنٹ ہو۔ کون سی کلاس میں ہو۔“ اس نے حیرت کے اظہار کے ساتھ دلچسپی بھی ظاہر کی۔  
 ”انٹر کا امتحان دیا ہے۔“

”دیری گنڈ۔ آگے کیا ارادہ ہے؟“  
 ”بیٹا! کاراؤم میڈیکل میں میرا ایڈمیشن کرانے کا ہے۔“ الماس قدرے جھجک کر جواب دے رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس سے پہلے کبھی کسی نے اس کی ذات میں اس طرح دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی۔  
 ”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ اس نے فوراً کہا پھر اس کی بات پر غور کر کے پوچھنے لگی، ”کیا تم نے بیٹا کا ارادہ ٹھیک نہیں شوق نہیں ہے ڈاکٹر بننے کا۔“

”مجھے بھی ہے لیکن امی نہیں چاہتیں۔“ الماس نے کہا۔  
 ”کیوں؟“ وہ کچھ کر خود ہی جزیبہ ہو گئی کیونکہ سمجھ گئی تھی کہ اس کی امی کیوں نہیں چاہتیں۔  
 ”آپ نے کہاں تک پڑھا ہے؟“ الماس خوب صورتی سے بات بدل گئی۔  
 ”میں تھریڈ ایر کے پیہر دے چکی تھی اس کے بعد کالج چھوڑ دیا۔“  
 ”کیوں؟“ الماس نے بھی اس کی طرح فوراً پوچھا لیکن پھر خود ہی سمجھ کر کہنے لگی۔  
 ”اچھا ہاں، پھر آپ کی شادی ہو گئی تھی۔“  
 ”شادی۔“ وہ ہنسی تو الماس قدرے جھینپ کر بولی۔  
 ”شادی ہی تھی۔“

”اچھا چھوڑ دیا۔ بتاؤ۔“ وہ جانے کیا کہنے جا رہی تھی کہ مہر النساء کی آواز پر خاموش ہو گئی۔  
 مہر النساء نے الماس کو یکاڑے کے ساتھ کمرے کا دروازہ کھولا تھا۔ لیکن جب اسے دیکھا تو اندر نہیں آئی اور وہیں دروازے ہی میں رک کر بولی تھی۔

”الماس! میں عمیر کے ساتھ بازار جا رہی ہوں۔ تم بھی چلو۔“  
 ”میں چلوں۔“ الماس نے چند لمحے رک کر سوچا پھر کہنے لگی۔ ”میں نہیں جا رہی۔ صابجی اکیلی ہو جائیں گی۔“  
 مہر النساء کو اس جواب سے خاصی مایوسی ہوئی جبکہ وہ بے انتہا خوش لیکن بہت سنبھل کر بولی۔  
 ”اے نہیں۔ میری وجہ سے تم اپنا جانا ملتوی نہیں کرو۔“

”نہیں۔ بس میں نہیں جا رہی۔“ الماس نے اس سے کہتے ہوئے مہر النساء کو دیکھا۔  
 ”اچھا تھک ہے، تم لوگ کھانا کھا لیتا۔“  
 پھر دو دن میں الماس اس کے ساتھ بہت گھل مل گئی تھی اور مہر النساء کو کہ خود اس سے بات نہیں کر رہی تھی، لیکن اس کی بات کا جواب دینے لگی تھی۔ اس کے انداز میں وہ تنفر اور ناگواری بھی نہیں رہی تھی اور اس کے لیے فی الحال یہی بہت تھا۔ یوں بھی وہ بہت زیادہ دنوں کے لیے نہیں آئی تھی۔ اس کا خیال تھا مزید دو دن تک کروہ چلی جائے گی۔ اس وقت الماس کے ساتھ لان میں کھلتے ہوئے وہ اس سے بھی یہی کہہ رہی تھی کہ کل یا ہول ہو چلی جائے گی۔

”کیوں، میرا مطلب ہے اتنی جلدی کیوں جائیں گی۔ ابھی تو آپ کی شادی میں بہت دن ہیں۔“ الماس نے توجاہ کرتے ہوئے کہا تو وہ رک کر بولی۔

”وہ تو ہیں لیکن مجھے مدحو کا خیال آ رہا ہے۔ جب میں آ رہی تھی تو وہ کچھ خفا سی لگ رہی تھی اور دیکھو اس نے فون بھی نہیں کیا۔“

”آپ فون کریں۔ میں امی کے پاس سے ہو کر آتی ہوں۔“ الماس اسے لابی میں جھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔ وہ نمبر وائل کر کے انتظار کرنے لگی۔ ماما اور نیکل بھائی کا تو اسے پتا تھا کہ اس وقت دونوں گھر پر نہیں ہوں گے اور مدح نے تفتی دیر بعد رسوراٹھایا تھا۔

”کیا کر رہی تھیں؟“ اس نے چھوٹے ہی ٹوکا۔

”سہ سرج۔“ ادھر مدح یہ جانے کس موڈ میں تھی وہ سمجھ نہیں سکی۔

”کھا ہے؟“

”یہ میں تجھ سے نہیں بتاؤں گی۔ بلکہ میں اب کوئی بات تمہیں نہیں بتاؤں گی۔“ مدح نے زور دے کر کہا۔

”کیوں مجھے کیوں نہیں بتاؤ گی۔“ اس نے حیران ہو کر ٹوکا۔

”اس لیے کہ تم ہر بات مجھ سے چھپاتی رہی ہو۔“

”کیا میں نے کیا بات چھپائی ہے؟“

”اے آپ سے پوچھو۔“

”میں بالکل نہیں جان پاؤں گی۔ تم بتا دو پلیز۔“ اس نے لجاجت سے کہا۔

”جو مدت یہ بتاؤ واپس کب آ رہی ہو۔“

”اگلے ہفتے۔“ وہ روٹھے لہجے میں بولی۔

”اگلے ہفتے کیوں؟ اگلے مہینے آنا۔“ مدح پر اس کی لجاجت کا اثر ہوا تھا نہ روٹھنے کا، فوراً ”فون بند کر دیا۔“



علی جمائیکیر کو اس وقت صبح کے نمبر وائل کرتے ہوئے ادھر سے کسی اور کے رسوراٹھانے کا خدشہ نہیں تھا۔ پھر بھی وہ چاہتا تھا کہ اس کی آواز سننے کو ملے۔ لیکن دوسری طرف مدح بھی جس کی آواز سننے ہی وہ برا سامنہ بنا کر بولا۔

”تمہیں کیا پیرے پر بٹھایا ہوا ہے۔“

”جناب! آپ کو کوئی اعتراض ہے۔“ وہ ہنسی کے درمیان بولی تھی۔

”اعتراض ہو بھی تو تم کون سا سامنے والی ہو۔ چلو بلاؤ اسے۔“ اس نے رعب سے حق جتایا تو ادھر سے کورا جواب آیا۔

”وہ نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب وہ یہاں نہیں ہے۔ پیپا کے ہاں گئی ہوئی ہے۔“ مدح روانی سے بتا کر پوچھنے لگی ”اور بتائیں کس کو بلاؤں۔“

”کسی کو نہیں۔ بس سب کو سلام کہہ دینا۔“ وہ غلت میں فون بند کر کے اٹھ کھڑا ہوا اور وہیں سے عارفہ بیگم کو پکار کر بولا تھا۔

”امی! میں پچا جان کی طرف جا رہا ہوں۔“

اور پھر آدھے گھنٹے کا فاصلہ اس نے بیس منٹ میں طے کر لیا تھا۔ طویل راہداری سے گزر کر جب وہ گول کمرے میں داخل ہوا تو سامنے ہی وہ الماس کے ساتھ بیٹھی نظر آئی، جس پر اسے حیرت ہوئی کیونکہ مدح کو اس نے شاہ پور میں کسی کے ساتھ اس طرح باتیں کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

”سلام علیکم۔“ اس نے اپنی حیرت چھپا کر قدرے اونچی آواز میں سلام کیا تو جہاں وہ چونک کر بھاڑا کھڑی ہو گئی وہاں الماس نے خوشی کا اظہار کیا تھا۔

”اے علی بھائی آپ۔“

”ہاں مجھے ابھی پتا چلا تھا کہ جسے میں سارے شہر میں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں وہ تمہارے پاس ہے۔“ وہ کن اکھیوں سے اسے دیکھتا ہوا بولا۔

”جہ نہیں۔ ابھی آپ ان سے نہیں مل سکتے۔“ الماس فوراً ”صباحت کے سامنے کھڑی ہو گئی اور دونوں بازو انہیں بائیں پھیلا دیے۔“

”پھر کب مل سکتا ہوں۔ ان سے پوچھ کر بتاؤ۔“ اس نے شرارت سے اسے دیکھنے کی سعی کرتے ہوئے کہا تو وہ ہالگ کر کمرے میں چلی گئی۔

”مل گیا جواب، وہ ملنا ہی نہیں چاہتیں۔“ الماس نے کہا تو وہ مایوس سی شکل بنا کر بولا۔

”اب کیا کروں؟“

”صبر۔“ الماس ہنسی۔

”شٹ اپ! یہ بتاؤ پچا جان اور چچی جان کہاں ہیں؟“

”وہ کئی تقریب میں گئے ہیں۔“

”اور تم یہاں کیا کر رہی ہو۔ جاؤ جائے کے ساتھ کچھ کھانے پینے کا انتظام کرو، میں اتنے دنوں بعد آیا ہوں۔“ وہ اسے سامنے سے ہٹاتا ہوا اسی کمرے کی طرف چل پڑا۔ پیچھے الماس نے اسے روکنے کی کوشش میں یہاں تک کہا کہ دیکھیں پیپا آ رہے ہیں لیکن اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا اور کمرے میں داخل ہو کر رہی رکھا تھا۔

وہ کھڑکی کا پردہ ہٹا کر اس میں چھپنے کی کوشش کر رہی تھی، گھبراہٹ میں کبھی پردہ ادھر پھینکتی کبھی ادھر۔ ”لاؤ میں تمہاری مدد کر دوں۔“ وہ اس کے قریب جا کر بولا اور پردے کے بجائے اس کا ہاتھ تھام کر اپنی طرف کھینچا تو وہ بمشکل اپنا توازن قائم رکھ کر بولی۔

”آپ کیوں آئے ہیں۔“

”یہ دیکھنے کے اپنے دل کی بستی میں تم نے میرے نام کے جو گل کھلائے تھے، ان میں کتنا اضافہ ہوا ہے۔“ وہ پرشوق نظروں سے اس کے چہرے پر اترتے رنگ بکھ رہا تھا۔

”میرا ہاتھ جھوڑیں۔“ وہ بہت نرم ہو رہی تھی۔

علی جمائیکیر نے ایک بار اس کے ہاتھ کو زور سے دیا پھر ہونٹوں سے لگا کر آنکھیں بند کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ”مجھے یقین کر لینے دو صبا کہ ہم ساری آزمائشوں سے گزر کر اس مقام پر آ گئے ہیں جہاں سے ہمیں کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ سنو، تمہارے دل میں اگر کوئی خدشہ باقی رہ گیا ہو تو اسے بھی نکال پھینکو۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ ہمارے راستے میں اب صرف پھول ہی پھول کھلیں گے کوئی کانٹا نہیں ہو گا۔ بہت کانٹے ہوں گے جتنے پھول ان سے زیادہ کانٹے۔ لیکن میں تمہیں ان سے نہیں الجھنے دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“

وہ اس کے دلنشیں لہجے میں کھو کر اسے دیکھ جا رہی تھی۔

”اور ہاں۔“ مجھے تمہاری ثابت قدمی نے بہت امپریس کیا ہے۔ اول روز تم نے جو بات کہی، آخر تک اس پر قائم رہیں کہ تمہاری ممانجہ فیصلہ کریں گی۔ تمہیں وہی قبول کرنا ہے اور اب جبکہ ہمارے حق میں فیصلہ ہو چکا ہے تو کیا میں امید رکھوں کہ تم میری محبت میں بھی ایسی ہی شدت پسندی کا مظاہرہ کرو گی۔“ وہ اپنی نظریں اس کی پوری کھلی آنکھوں میں اتار کر سوالیہ نشان بن گیا تھا۔

صبحات نے پلکیں جھپکا کر ذرا سا اثبات میں سر ہلایا پھر اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ نکال کر غیر محسوس طریقے سے پیچھے ہٹتے ہوئے بولی تھی۔

”اگر کبھی آپ کو میری آزمائش مطلوب ہو تو جان مانگیے گا۔“  
 ”اوس ہوں۔“ اس نے اپنی شہادت کی انگلی سے بہت نرمی سے اس کے ہونٹوں کو چھوا تھا۔  
 ”ماٹوں گا، نہیں، جان دوں گا۔“

وہ اس کی مزید کسی جسارت سے بچنے کی خاطر، قدم اور پیچھے ہٹ کر دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔  
 ”الماس آ رہی ہے شاید۔“

”مستی بیوقوف نہیں ہے وہ۔“ وہ مسکراتا ہوا پھر اس کے قریب آنے لگا تھا کہ دروازے پر دستک کے ساتھ  
 اس پکار کر بولی۔

”معلیٰ بھائی! لایا آگئے ہیں۔“

”افسوس تو واقعی ہے ووقوف ہے۔“ وہ گہری سانس کے ساتھ بڑبڑایا تو وہ بے ساختہ ہنسی کے ساتھ پردہ کھینچ کر پھر  
 اس کی اوٹ میں ہو گئی۔

”اوکے، جلدی ملیں گے۔“ وہ اس کے پردے کو مضبوطی سے تھامے ہاتھ کو ہلاتا ہوا کمرے سے نکل آیا اور  
 اس کے اشارے پر جلدی سے اس جگہ آ بیٹھا جہاں کچھ دیر پہلے وہ بیٹھی تھی۔

چند لمحوں بعد ہی شاہ سکندر اور مہر النساء اس کمرے میں داخل ہوئے تھے۔  
 ”اسلام علیکم۔“ اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر سلام کیا تو شاہ سکندر خوش دلی سے بولے۔

”معلیٰ! کیسے ہو۔ بڑے دنوں بعد آئے؟“

”بس چچا جان! سوچتا تو روز تھا آنے کا لیکن۔“ وہ اس قدر کہہ کر خاموش ہو گیا۔

”ابا کہاں ہیں تمہارے؟“ شاہ سکندر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے پوچھا۔  
 ”شاہ پور۔ امی البتہ یہیں ہیں۔“

”میں نہیں بھی لے آئے۔“ مہر النساء نے کہا۔

”لے آؤں گا چچی جان! ابھی میں گھر سے نہیں آ رہا۔“ اس نے مبالغے سے کام لیا۔  
 ”اور کھانا وغیرہ کھایا۔“

”نہیں۔ چائے کا کھا تھا الماس سے۔“ اس نے الماس کو دیکھا تو وہ جلدی سے بولی۔  
 ”چائے آپ کو ضرور ملے گی لیکن کھانے کے بعد۔“



شادی کی تیاریوں میں دن بڑی تیزی سے گزر رہے تھے اور اس بار مدیہ ہر کام میں پیش پیش تھی۔ اسلام آباد  
 سے سیما بھائی، سمینہ اور سونیا بھی آ گئی تھی۔ سمینہ کی گود میں چند ماہ کا بیٹا تھا اور سب کی زیادہ توجہ اس بچے نے

بھیجی لی تھی۔ سمینہ سارا وقت اسے ڈھونڈتی پھرتی۔  
 ”ابھی عمر کس تھا۔“

”مدو سے پوچھو، وہ اس کے کپڑے بدل رہی تھی۔“ سارا دن ایسی آوازیں گونجتی رہتیں اور رات میں ڈھولک  
 کے ساتھ ہنسی مذاق میں محفل کتنے رنگ بدلتی تھی۔ کبھی سب سنجیدہ ہو جاتے بھی بہت شوخ، ایسے میں جب

جیسے چائے لے کر آتی تو وہ ہر روز نئے سرے سے باقاعدہ حیرت کا اظہار کرتے اور اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ  
 تھی کہ وہ برا نہیں مان رہی تھی اور پلیٹ کر جواب دینا تو جیسے بھول ہی گئی تھی۔

اس وقت وہ چائے لے کر آئی تو سب سے پہلے عمر شروع ہوا تھا۔

”واؤ! مدو چائے لے آئی۔ آج ضرور سورج مشرق سے طلوع ہوا ہو گا۔“

”مشرق ہی سے ہوتا ہے۔“ شمر نے کہا تو وہ روالی میں بولا تھا۔

”میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں۔“ سب کے بے ساختہ قہقہوں سے وہ بوکھلا گیا تھا۔  
 ”بس عمرا اب اور کچھ مت کہنا۔ کیونکہ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔“ نیل نے دھیرے سے عمر کو ٹوکا تو وہ سر  
 کھجاتے ہوئے بولا۔

”گیا کروں نیل بھائی! مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا۔ اس لڑکی سے پانی ماٹو ٹوکروا جواب ملتا ہے۔ خودی لو کہاں  
 چائے آفراس میں یہ انقلاب آیا کیسے۔“

”کیسے آیا۔“ نیل خود حیران تھے۔ اسے کیا جواب دیتے۔ بس ذرا سے کندھے اچکا کر مدیہ کو دیکھنے لگے  
 پھر رات دو بجے تک یہ محفل جی رہی اور آسیر کے کہنے پر ہی سب اٹھے تھے۔ مدیہ ڈراٹنگ روم اور لابی کی

لائسنس آف کرتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی تو آگے صباحت کو بیٹھے دیکھ کر تعجب سے بولی۔  
 ”ہائیں! تم جاگ رہی ہو؟“

”تختے شور میں بھلا میں سو سکتی تھی۔“ صباحت اپنی نیند خراب ہونے کی وجہ سے ناراض تھی۔

”تو کیا چاہتی ہو تم۔ خاموشی سے ہم تمہیں رخصت کر دیں۔“ وہ اپنی جگہ پر لیٹتے ہوئے بولی۔

”نہیں خوب دھوم دھڑکے سے کرنا۔ لیکن یہ پندرہ دن پہلے سے ڈھولک پینے کی کیا تک ہے۔“

”ناراض کیوں ہوتی ہو۔ یہ تو میری خوشی ہے تمہیں اگر اچھا نہیں لگ رہا تو کل سے نہیں بجے گی ڈھولک  
 دو لک۔“ وہ کہتی ہوئی دوسری طرف کروت بدل گئی۔ جانے کیا تھا اس کے کچے میں کہ صباحت پہلے ایک دم

خاموش سی ہو کر اسے دیکھ گئی۔ پھر آہستہ سے اٹھ کر اس کے بیڈ پر آ بیٹھی اور اس کا کندھا ہلا کر بولی۔  
 ”مدو! ادھر میری طرف دیکھو۔“ اس نے دیکھا نہ کچھ بولی۔

”مدو! کیا ہوا ہے تمہیں۔ تم رو رہی ہوناں۔“ صباحت کو اس کا رونا محسوس ہو رہا تھا۔ جب ہی بے چین ہو کر  
 اسے جھنجھوڑنے لگی۔

”تم رو رہی ہوناں مدو! تم رو رہی ہوناں۔“

”ہاں۔“ وہ ایک دم اٹھ بیٹھی اور گھٹنوں میں چہرہ چھپا کر سسکنے لگی تو صباحت نے اس کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنا  
 یا اور اس کے سر پر اپنی پیشانی ٹکائی ہوئی بولی۔

”ممت رو مدو! مجھے بتاؤ تمہیں کیا ہوا ہے۔ میری بات بری لگی ہے تمہیں یا کسی اور نے کچھ کہا ہے۔“  
 اس نے آہستہ سے سراؤ نچایا اور ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتی ہوئی بولی۔

”کسی نے کچھ نہیں کہا۔“

”بھئی! تم میرا دل چاہ رہا تھا رونے کو۔“ اس نے کہا تو صباحت کچھ دیر تک اس کے بھیگے چہرے کو دیکھتی رہی پھر اس  
 کی ٹھوڑی چھو کر بولی۔

”پتا ہے بنا کسی بات کے رونے کو دل کب چاہتا ہے۔ جب اندر کوئی احساس جاگتا ہے یا کوئی درد۔“  
 اس کی بھیگی آنکھوں میں کچھ تیر سٹ آیا تھا۔

”میں غلط تو نہیں کہہ رہی۔ اس احساس اس درد کا نام ہے محبت۔“ صباحت نے معنی خیز شریر مسکراہٹ کے  
 ماتھے کاٹوہ نظرس چرائی ہوئی بولی۔

”مجھے پتا ہے۔“

”واقعی پھر جلدی سے بتاؤ کون ہے؟“ صباحت نے خوش ہو کر پوچھا۔  
 ”کیا مطلب ہے تمہارا۔“

”انجان مت بنو مدو! میں بہت دنوں سے تمہیں نوٹ کر رہی ہوں۔ باتیں کرتے کرتے کھو جاتی ہو۔ آنٹوں پر  
 بوکتی ہو اور صبح تو میں نے تمہیں اپنے آپ مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ جبکہ ابھی رو رہی تھیں بنا کسی بات کے۔“

”تھینکس۔“ شاہ سکندر کی نظروں میں تشکر تھا اور ممنونیت کہ اس نے ان کا بیان رکھ لیا تھا۔  
 گو کہ رات اتر آئی تھی پھر بھی انہوں نے گاڑی ساحل کے قریب جا کر روکی تھی۔ اندھیرے میں سمندر نظر  
 نہیں آ رہا تھا لیکن لہروں کا شور اس کے ہونے کا یقین دلا رہا تھا۔  
 وہ ان کے ساتھ چلتی ہوئی بالکل انجانے میں اس جگہ آئی جہاں برسوں پہلے انہوں نے لفافے میں بند  
 آزادی کا پروانہ اسے تھمایا تھا۔

شاہ سکندر جتنے سرشار آئے تھے اس جگہ کو دیکھ کر انہیں شدید دھچکا لگا تھا اور بیٹھتے ہوئے بے اختیار کہہ  
 گئے: ”یہاں سے ہم جدا ہوئے تھے۔“

آسیہ نے جو کمر پہلے انہیں دیکھا پھر اپنے اطراف دیکھتے ہوئے اس کی آنکھیں یکثرت دھندلا گئی تھیں۔  
 ”بہت مشکل ہے فرار، کم از کم اس شہر میں تو ناممکن۔“ قدم قدم پر یادیں بھری پڑی ہیں۔ ”شاہ سکندر نے کہہ کر

سمری سانس کھینچی تھی۔ اس کے بعد دونوں کے درمیان خاموشی کی ایک دیوار حائل ہو گئی۔

خاموشی	کا	تو	نام	ہوتا	ہے
دور	یوں	بھی	کلام	ہوتا	ہے
آنکھ	سے	آنکھ	نہیں	ملتی	ہے
دل	ہم	کلام	ہوتا	ہے	ہے

اور سانس بدل رہے تھے۔

جذبہ بول رہے تھے، جو وقت اور عمر کے محتاج نہیں ہوتے۔

میں برسوں میں کس پر کیا بیتی؟ ہوا میں بوجھ رہی تھیں۔

آسیہ کی نظریں تاریک آسمان پر دوڑتے بھٹکتے لگیں۔ کب کوئی ستارہ نہیں تھا۔

پتا نہیں کہاں چھب گئے تھے وہ سب تارے جو اس کے رت جھگوں کے امین تھے۔ وہ چاند جو اس کے

آنسوؤں پر بھی مسکراتا اور کبھی بادلوں میں چھپ جاتا تھا۔

وہ لکھاؤں کی راہ گز جہاں ہر قدم پر اس سے ایک ہی سوال ہوتا۔ تیرا ہم سفر کہاں ہے۔

کیسی دھندھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

”آسیہ۔“ شاہ سکندر نے دھیرے سے پکارا تھا۔

بہ ذرا سا چونکی پھر ان کی طرف متوجہ تو ہوئی لیکن انہیں دیکھا نہیں۔

”ایک بات پوچھوں؟“ شاہ سکندر براہ راست اسے دیکھتے ہوئے پکڑا رہے تھے۔

اس نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا تو وہ قدرے رک کر بولے تھے۔

”تم نے پھر شادی کیوں نہیں کی؟“

”کیا سنا جاہیں گے۔“ چچ یا جھوٹ؟“ وہ اپنی انگلی میں وائٹ گولڈ کے رنگ کو بہت دھیرے دھیرے گھما رہی

تھی۔ اس کی نظریں بھی اس پر جمی تھیں۔

”جو تم آسانی سے بول سکو۔“ شاہ سکندر نے کہا تو اس نے ایک دم سرواں چا کر کے انہیں دیکھا پھر دکھ سے گویا

ہوئی۔

”آسانی سے تو ایک ہی بات کہی جاسکتی ہے کہ بچوں کی خاطر۔ ہر وہ عورت جو ایسے کسی ایسے سے دو چار ہوتی

ہے وہ بیک وقت ہی ہے اور شروع میں تو یہی چاہتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا ہے عورت اپنے لیے سوچنے لگتی

یہ ساری علامات ظاہر کرتی ہیں کہ کسی مسافر نے تمہارے دل کی کشتی میں ٹھکانا کر لیا ہے۔“ صبا کچھ ہلکے  
 پھلکے انداز میں اس پر گرفت کر رہی تھی۔

”لیکن مدد! اب تم کوئی دھوکا مت کھانا۔ پہلے دیکھ لینا کہ اس کی محبت میں کتنی سچائی! کتنی ایمانداری ہے۔“

”سچائی ہی سچائی! ایمانداری ہی ایمانداری۔“ وہ اپنے آپ بولنے لگی تھی۔

”میں حیران ہوں کہ میری تمام تر خامیوں، میری نظروں اور عداوتوں کے باوجود وہ مجھ سے محبت کرتا رہا کرتا

ہے۔ میں اس کی نفی کرتے کرتے بارگئی صبا، وہ محبت کا آسمان ہے۔ جانے کب سے اس نے میرے لیے اپنی

بانہیں وا کر رکھی ہیں۔ میں سراٹھا کر اسے دیکھ سکتی ہوں لیکن چھو نہیں سکتی کیونکہ اس کے سامنے مجھے اپنا آپ

بہت کمتر بہت حقیر لگنے لگا ہے۔ میں اس کے قابل نہیں ہوں صبا! پھر تم کیوں اسے مجبور کرتی ہو کہ وہ مجھ سے اپنی

محبت کا اظہار کرے۔“



شاہ سکندر کے لیے شاہ بونس کا آنا اور مدیہ کے لیے شاہ تیمور کا پرنسزل دنیا دونوں باتیں ہی غیر متوقع تھیں

لیکن انہوں نے ظاہر نہیں کیا کیونکہ شاہ بونس سب سے بڑے تھے اور وہ ہمیشہ سے ان کا بہت احترام کرتے تھے۔

اس لیے انہیں صاف جواب بھی نہیں دے سکے اور یہی کہا کہ وہ مدیہ کی ماں سے مشورہ کر کے بتائیں گے۔ پھر ان

کا ارادہ تو نہیں تھا اس سلسلے میں آسیہ سے بات کرنے کا لیکن یہ سوچ کر کہ شاہ پور میں قیام کے دوران ہو سکتا ہے

مدیہ اور شاہ تیمور کے درمیان اندراشیدنگ ہوئی ہو انہوں نے آسیہ سے بات کر لینا ضروری سمجھا۔ ان کے

خیال میں اگر آسیہ اس رشتے پر راضی ہوئی تو پھر صبا جت کے ساتھ ہی مدیہ کی شادی بھی کر دیں گے، اسی لیے

انہوں نے جلدی کی تھی اور اس شام آسیہ کے کھینک پہنچ گئے تھے۔

اس بار آسیہ نے ان کے ساتھ جانے کے بجائے وہیں اپنے کمرے میں انہیں بلا لیا تھا اور ابتدائی رسمی جملوں

کے بعد ان کی آمد کا مقصد پوچھا تو وہ کہنے لگے۔

”میں مدیہ کی بات کرنے آیا ہوں۔ اتنی مین اس کی شادی کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے۔“

”صبا کے بعد۔“ آسیہ نے بہت مختصر ”جواب دیا۔“ تو وہ قدرے رک کر پوچھنے لگے۔

”کوئی ہے آپ کی نظر میں اس کے لیے کیا؟“

”میرا جیتنا بیکل۔“ وہ ان کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔

”بیکل۔“ انہوں نے کچھ دیر سوچا پھر کہنے لگے ”اوکے! یوں لگتا ہے کہ آپ نے اسے پسند کر لیا ہے۔“

خیال ہے اب اس کے بارے میں کچھ کہنا فضول ہے یا آپ جاننا چاہیں گی۔“

”بالکل نہیں۔“ اتنی اہم سوری۔“

”تو سوری بھول جائیں کہ میں نے آپ سے ایسی کوئی بات کی ہے۔“ وہ کہہ کر فوراً ”موضوع بدل گئے۔“

”پھر کیا خیال ہے۔“ انہوں نے کہا پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولے۔ ”لیکن یہاں رنگ ہیں نہ خوشبو اور موسم

کا بھی پتا نہیں چل رہا۔ کیا خیال ہے کہیں باہر چلیں، کھلی فضا میں کھلے آسمان تلے۔“

آسیہ فوراً ”جواب نہیں دے سکی اور سوچنے کے بعد بھی شش در شش میں تھیں۔ انہوں نے اپنا لٹریچر جو خانی

میں اس کی ٹیبل پر رکھ دیا تھا وہ اٹھا کر جیب میں رکھتے ہوئے گویا چلنے کا اشارہ دیا تھا پھر شہر گر گیا ہوئے۔

ہمارے بعد ہیں کچھ لوگ کیسے دیکھ تو آئیں

چلو اس شہر کو آگ بار پھر سے دیکھ تو آئیں

آسیہ کسی غیر مرئی طاقت کے زیر اثر اٹھتی ہوئی بے ساختہ گویا ہوئی تھی۔

بہت دن سے سمندر کی ہوا گم صم سی آتی ہے۔

نہ ہوں طوفانوں کے سن پر بیٹھنے دیکھ تو آئیں



ہے لیکن اس کے ساتھ بڑا المیہ یہ ہوتا ہے کہ اسے بچوں کے ساتھ کوئی قبول نہیں کرتا اور وہ بچوں کو چھوڑنا بھی نہیں چاہتی، یوں بقیہ ساری زندگی ایک ایسے شخص کو ڈھونڈنے میں گزر جاتی ہے جو اس کے ساتھ اس کے بچوں کو بھی تحفظ دے سکے اور ایسا شخص ہزاروں نہیں لاکھوں میں کوئی ایک ہوتا ہے۔“

شاہ سکندر بغور اسے دیکھ اور سن رہے تھے۔ اس کی بات حتم نہیں ہوئی تھی۔ غالباً ”سانس لینے کو رکھی تھی کہ وہ بے صبری کا مظاہرہ کر گئے۔“

”نہیں۔“ وہ فوراً بول پڑی۔ ”میں نے کبھی سوچا ہی نہیں۔ حالانکہ میرے ماں باپ، بھائیوں اور بھانجوں نے بہت چاہا اور وہ جولا کھوں میں کوئی ایک ہوتا ہے وہ بھی خود چل کر میرے پاس آیا۔ وہ بہت نائس، بہت فیر تھا لیکن۔“

وہ بولتے ہوئے کچھ کھوسی گئی تھی۔

لیکن شاہ سکندر کی دھڑکنیں رکنے لگی تھیں۔

”میرا دل نہیں مانتا کہ میں اس کے ساتھ منافقت کروں۔ اس کے سچے جذباتوں کے ساتھ بے ایمانی کروں۔ گوکہ اپنے دل کی بستی سے میں نے وہ سارے پھول خود اپنے ہاتھوں سے نوج ڈالے تھے جن کی آبیاری میں میری ساری محبتیں شامل تھیں اور محبتیں تو فنا نہیں ہوتیں شاہ سکندر!“

انسان فانی ہے، روح کو فنا نہیں اور جو روح میں بس جائے اس کے لیے کوئی دروازہ بند نہیں ہوتا پھر میں ایسی کوشش کیوں کرتی۔

کیا ہوا بادل کی بستی ا جڑ گئی۔

کیا ہوا جو قربتیں فاصلوں میں بدل گئیں۔

یہ سب تو وقت کی ادائیں ہیں۔

کبھی دے جاتا ہے۔

کبھی لے جاتا ہے۔

یہی زندگی ہے۔

اور زندگی کے ساتھ وقت خواہ کتنی آنکھ پھولی کھیل لے، روح کی گرد کو بھی نہیں پاسکتا۔

اور میری روح میں جو محبت رچ بس گئی اسے نکال پھینکنے پر میں قادر ہی نہیں تھی۔ پھر کیسے میں کسی اور کا ہاتھ تمام لیتی۔ یہ تو سراسر بے ایمانی ہوتی۔ اس کے ساتھ خود اپنے ساتھ اور اس بے ایمانی پر میری محبت روتی، تڑپتی سکتی۔ نہیں یہ مجھے منظور نہیں تھا۔“

شاہ سکندر اپنی جگہ بالکل ساکت ہو گئے تھے۔ نظریں اس محبت و وفا کی دیوی پر جم کر رہ گئی تھیں اور سماعتوں میں صرف اس کی آواز تھی۔ جیسے کائنات میں بس ایک وہی سچ ہے، وہی حقیقت، بالی سب فریب۔

جانے ایک طویل خواب کے بعد اب بیداری کا وقت آیا تھا۔

یا۔

ساری عمر جاگتے جاگتے تھکی ہوئی آنکھوں میں اب نیند اتری تھی۔ کچھ بھی ہو، یہ لمحے خواب یا حقیقت، زندگی کا حاصل تھے ان کے سینے میں ہلکا ہلکا درد کروٹیں لینے لگا تھا۔

”اے وقت بس اب ٹہر جا۔ اس سے آگے اب کچھ نہیں ہے۔

نہ کوئی آرزو نہ کوئی خواہش۔

نہ امنگ نہ ترنگ۔

نہ کوئی آرزو نہ کوئی خواہش

نہ رنگ نہ ترنگ

تو اب کس کے ساتھ آنکھ پھولی کھیلے گا

زندگی تو بس یہیں تک تھی

اس کے بعد روح کا سفر ہے اور تو روح کی گرد کو بھی نہیں پاسکتا۔

کہہ دے اس بے درد دنیا سے کہ

روح سے روح کا ناتا جڑ گیا ہے اب اسے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ تو بھی نہیں، تو بھی نہیں۔

ان کے سینے میں درد بڑھتے بڑھتے ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔

”اس!“ ساری توانائیاں صرف کر کے بھی ان کے ہونٹوں سے بہت مدھم آواز نکلی تھی۔ پھر بھی آسیہ نے فوراً سراونچا کیا اور انہیں سینے پر ہاتھ رکھے جھکتے دیکھ کر اس کے ہاتھ پیر پھول گئے۔

”سکندر! سکندر!“ بے حد پریشان ہو کر وہ انہیں پکارنے لگی۔ اس کے حواس ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ پھر بھی اس نے بہت بہت کر کے انہیں گھسیٹ کر وہیں پھرتی زمین پر لٹا دیا اور ان کے سینے پر دونوں ہاتھ جما کر زور زور سے دبانے کے ساتھ مدد کے لیے لوگوں کو پکارنے لگی۔

ادھر ادھر سے کافی لوگ جمع ہو گئے کسی نے موبائل پر ایمری لینس بلالی۔

اور ایمری لینس کے آنے تک وہ مسلسل اپنی کوشش میں مصروف رہی تھی۔



ایک ایک بل قیامت تھا۔ اس کی نظریں بند دروازے پر جمی ہوئی تھیں، جبکہ ذہن اور دل دونوں ہی کسی نامعلوم شے میں جکڑ گئے تھے۔ جب ہی ہونٹوں پر کوئی دعا نہیں تھی۔ جانے کتنا وقت بیت گیا تھا اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ جب ڈاکٹر نے آکر اسے متوجہ کیا تب بھی وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”آپ کے ساتھ کوئی اور نہیں ہے؟“ ڈاکٹر نے پوچھا تو اس کا سر آپ ہی آپ نفی میں ہل گیا۔

”کسی کو بلا لیں۔“ ڈاکٹر نے پھر کہا تو اس کا سما ہوا دل مزید سہم گیا۔ بہت کوشش کر کے بولنا چاہا تو بس ایک ہی لفظ کہہ سکی۔

”ک۔ کیوں؟“

”اس لیے کہ آپ پریشان ہو رہی ہیں۔ پلیز بیٹھ جائیں۔“

”مم۔ میں ٹھیک ہوں۔ آپ بتائیں وہ۔“ اس نے بند دروازے کی طرف دیکھا۔

”دعا کریں۔“ ڈاکٹر اسی قدر کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

”دعا۔“ اس کے احساسات پر جیسے کوئی ہتھیوڑنے والی ضرب پڑی تھی، اور دل یکبارگی زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

”میرے اللہ۔ میرے اللہ۔“ اس سے آگے اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ یونہی اللہ اللہ کا درد کرتے ہوئے اس نے پی سی او کا رخ کیا۔ پھر گھر کے نمبر ڈائل کرتے ہوئے سامنے وال کلاک پر نظر ڈالی۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔

دوسری طرف مسلسل بیل جا رہی تھی۔ کتنی دیر بعد ریپور اٹھنے کے ساتھ ہی ڈھولک کی آواز نے اس کے اندر کی دنیا تہہ بالا کر دی تھی۔ اس کے بعد غالباً ”مدحہ تھی۔“

”ہیلو۔ ہیلو۔“

”میرے خدا۔“ اس نے آہستہ سے کریڈل پر ہاتھ رکھ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد علی جمائیکر کے نمبر ڈائل کیے تو ادھر زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چند لمحوں بعد ہی اس کی آواز آئی تھی۔

”ہیں۔۔۔ علی جمائیکر۔“

”علی! یہ میں ہوں“ آئیہ“ وہ کسی طرح اپنی آواز کی لرزش پر قابو نہیں پاسکی تھی۔

”جی آئی! آخریت؟“ علی جہانگیر نے اس کی بدلی ہوئی آواز سے ٹھٹھک کر پوچھا۔

”خیریت نہیں ہے بٹا! میں یہاں کارڈیو سے بول رہی ہوں۔ تم آگے آ سکتے ہو تو فوراً آ جاؤ۔“

”میں آ رہا ہوں آئی! آپ پریشان نہیں ہوں اور پلیز یہ تو بتائیں کہ کون۔“

”بس تم آ جاؤ۔“ اس نے غلی جہانگیر کی بات پوری ہونے سے پہلے کہا اور فون رکھ دیا۔ پھر کو ریڈور تک آئے اس کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

”میرے اللہ۔ میری بچیوں کو اب کا باپ ملا ہے۔ ان کے سروں پر یہ سائبان سلامت رکھنا۔“ اس نے کے لیے ہاتھ اٹھائے پھر ان ہی ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا کیونکہ آنسو روانی سے چھٹک گئے تھے اور اس تیزی سے ا کے ہونٹ حرکت کرنے لگے تھے۔ ساری دعائیں اس شخص کے لیے تھیں جو اس کا کچھ نہیں تھا اور بہت تھا۔

تقریباً اندرہ منٹ بعد علی جہانگیر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پکارا تھا۔

”بہن! آئی!“

اس نے چونک کر ہاتھ نیچے گرائے تو اس کی آنسوؤں سے بھری ہتھیلیاں دیکھ کر علی جہانگیر مزید پریشان ہو گیا۔

”آئی! پلیز! بتائیں کیا ہوا ہے۔ صاحت اور مدحیہ۔“

وہ زور زور سے نفی میں سر ہانے لگی۔

”پھر کون ہے یہاں؟“ وہ اس کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا اور اس کی آنسوؤں سے بھری ہتھیلیوں پر ا ہاتھ رکھ کر پوچھا تو وہ رک کر بولی۔

”شاہ سکندر۔“

”سکندر بچا۔ کیا ہوا ہے انہیں؟“ علی جہانگیر ضبط کرنے کی کوشش میں اس کے ہاتھوں کو زور سے دبایا تھا۔

”ہارٹ۔“ وہ اسی قدر کہہ کر خاموش ہو گئی۔

”اوہ گا! آئی! جہانگیر کے ذہن میں کتنے سوال ابھرے۔ کب، کہاں، کیسے لیکن اس کی حالت کے پیش نظر ا نے مزید کچھ نہیں پوچھا اور تسلی دیتے ہوئے بولا۔

”سب ٹھیک ہو گا آئی! آپ پلیز خود پر قابو رکھیں، میں ڈاکٹر سے مل کر آتا ہوں۔“

”سنو! میرے گھر فون کر گئے نیل سے کہنا یہاں آ جائے۔ خیال رکھنا دھو اور صبا کو ابھی معلوم نہیں، چاہیے۔“

”جی بہتر۔“ وہ تسلی کے انداز میں اس کے ہاتھ تھپک کر پہلے کاؤنٹر پر آیا اور وہاں موجود نرس سے ڈاکٹر کا محلہ کر کے فوراً اس طرف چل پڑا۔

راہداری میں تیسرے دروازے پر ڈاکٹر اکرام اللہ کے نام کی تختی دیکھ کر اس نے اس دروازے پر آہستہ۔

دستک دی اور کم ان کی آواز پر اندر داخل ہو کر بولا۔

”السلام علیکم سرب!“

”و علیکم السلام۔“ جواب کے ساتھ ڈاکٹر صاحب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے تو وہ جب سے اپنا کارڈ نکال ان کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔

”سر شاہ سکندر حیات میرے بچا ہیں۔“

”اوہ۔“ ڈاکٹر نے ہونٹ، سکیٹر کر اس کے کارڈ پر نظر ڈالی پھر اسے دیکھ کر کہنے لگے۔

”بہت سیریس کنڈیشن ہے ان کی۔ اگلے چوبیس گھنٹوں تک میں کچھ نہیں کہہ سکتا سوائے اس کے کہ کریں۔“ اس بات کے جواب میں وہ کیا کہتا۔ چپ چاپ انہیں دیکھے گیا۔

”ہم اپنی سی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ آجے زندگی موت اللہ کے اختیار میں ہے۔ دعا کریں ان کی زندگی۔“

”آمین!“ اس نے پیپر پر ہاتھ جما کر گویا خود کو سہارا دیا پھر ٹیلی فون کی طرف دیکھا تو ڈاکٹر اکرام اللہ نے اسے کا اشارہ کرنے کے ساتھ ٹیلی فون سیٹ اس کی طرف کھسکا دیا۔

”ٹھیک ہو۔“ اس نے بیٹھے ہی آئیہ کے گھر کے نمبر ڈائل کیے اور اس کے ساتھ بھی وہی وا۔ رلیو رائٹسے بھونک کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تو ایک لحظہ کو وہ چکرا گیا کہ جہاں خوشی کے شادیانے بج رہے ہیں وہ یہ خبر کیسے دے۔

”ہیلو، ہیلو۔“ اس بار ادھر سے نیل بول رہے تھے۔

”السلام علیکم نیل بھائی! میں علی جہانگیر۔“ وہ بہت سنبھل کر بولا۔

”خیریت علی! اس وقت کیسے فون کیا؟“ رات کے دو بجے نیل کی تشویش فطری تھی۔

”بس نیل بھائی خیریت ہے بھی اور نہیں بھی۔ آپ ابھی کسی سے نہیں کہیں اور فوراً کارڈیو آ جائیں۔ سکندر و میریس انٹیک ہوا ہے۔ آئی! آئیہ بھی ہمیں ہیں۔“

اس نے ایک ہی سانس میں ساری بات کہہ کر ان کا جواب نے بغیر فون بند کر دیا۔ پھر شاہ پور کے نمبر ڈائل نے لگا، کیونکہ ڈاکٹر اکرام اللہ نے اسے کوئی امید نہیں دلائی تھی اس لیے اس نے بابا جان کو اطلاع کرنا ضروری تھا۔

”ہیلو!“ کتنی دیر بعد بابا جان کی نیند میں ڈوبی آواز آئی تھی۔

”السلام علیکم بابا جان! میں علی بات کر رہا ہوں۔“

”علی! بابا جان کو غالباً“ بیدار ہونے میں کچھ وقت لگا۔“ ہاں علی! کیا بات ہے؟“

”وہ بابا جان۔“ وہ اسی قدر کہہ رکھا۔

”ہاں کو، ہم سن رہے ہیں۔ کیا پھر تمہاری شادی میں کوئی۔۔۔“

”میری شادی کو گولی ماریں بابا جان! بس آپ فوراً یہاں آ جائیں، سکندر بچا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ وہ ان ات کاٹ کر بولا۔

”ک۔ کیا ہوا ہے اسے؟“ بابا جان اب ٹھٹھکے تھے۔

”آپ آ کر دیکھ لیں۔“ وہ ہارٹ انٹیک کا بتانا نہیں چاہتا تھا۔

”پہلے ڈاکٹر کو تو دکھاؤ۔“ بابا جان دھاڑے تھے۔

”ڈاکٹر کی کپاس ہیں کارڈیو میں۔ آپ کو آنے میں تین گھنٹے لگیں گے بابا جان۔“ اس نے وقت کی نزاکت کا س دلا لیا۔

”ہاں، ہاں، ہمیں معلوم ہے۔ ہم بس ابھی آرہے ہیں۔ تم سکندر کے پاس رہو۔“

”ہاں ہی کے پاس ہوں۔“ اس نے کہہ کر فون رکھ دیا پھر ڈاکٹر کا شکریہ ادا کر کے ان کے کمرے سے نکلا تو اری ہی میں نیل مل گئے۔

”کیسے ہیں انکل سکندر؟“ نیل نے اسے دیکھتے ہی پوچھا تو وہ بس ذرا سے کندھے اچکا کر رہ گیا۔

”ڈاکٹر کیا کہہ رہے ہیں؟“

”دعا کریں، جو میں گھنٹے خیریت سے گزر جائیں۔“

”تتی سیریس کنڈیشن ہے؟“

”ہوں۔“ اس نے ہوں کی صورت گہری سانس خارج کی پھر انہیں لے کر آئیہ کے پاس آ لیا۔

آئیہ نے ایک نظر ان دونوں کو دیکھ کر دوبارہ سر جھکا لیا تھا۔

”پھوپھو!“ نیل نے اس کے پاس بیٹھ کر اسے اپنے بازو کے حلقے میں لے لیا۔ ”آپ بہت ہمدرد ہیں پھوپھو! آپ کو حوصلہ نہیں ہارنا چاہیے۔ اللہ چاہے گا انکل بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔“  
 ”آسیہ کی آنکھوں میں رنے ہوئے آنسو پھر قطرہ قطرہ اس کے ہاتھوں پر ٹپکنے لگے۔  
 ”رو میں نہیں پھوپھو پلیز۔“ نیل نے اپنے ہاتھ سے اس کے آنسو صاف کیے۔  
 ”مدد کرو اور صبا اپنے باپ سے مل کر کتنی خوش تھیں۔“ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔  
 ”ان کی یہ خوشی قائم رہے گی انشاء اللہ۔“ نیل نے فوراً کہا تو وہ دل میں آمین کہہ کر پوچھنے لگی۔  
 ”تم نے انہیں بتایا تو نہیں؟“  
 ”نہیں البتہ حلیل بچا سے کہہ آیا ہوں۔“ نیل اسے جواب دے کر علی جمائیگری کی طرف متوجہ ہو گئے۔  
 ”علی! بیٹھ جاؤ یا ر! ٹھیک جاؤ گے۔“  
 ”آئی تھک گئی ہیں۔ میرا خیال ہے آپ انہیں گھر لے جائیں۔“ علی جمائیگری نے رک کر کہا تو نیل نے آ۔

کویوں دیکھا جیسے چل رہی ہیں۔  
 ”نہیں بیٹا! جب تک ڈاکٹر طہینان نہیں دلاتے میں نہیں جاسکتی۔“ آسیہ کا جواب سن کر علی جمائیگری نے م کچھ نہیں کہا اور اپنی رسٹ وائچر پر نظر ڈال کر ٹھٹھا ہوا آگے چلا گیا۔  
 پھر جس طرح وہ بار بار گھڑی دیکھنے کے ساتھ ریٹنگ سے بچے جھانک رہا تھا اس سے نیل سمجھ گئے کہ اسے ک کا انتظار ہے اور ان کا ذہن شاہ جمائیگری کی طرف گیا تھا۔ اس لیے وہ بھی لاشعوری طور پر ان ہی کا انتظار کرنے لگے۔  
 ”آسیہ جتنی قرآنی آیات یاد تھیں ان کا ورد کرنے میں لگ گئی تھی۔  
 پھر جرجی اذانوں کے ساتھ ہی بابا جان کی آمد ہوئی تھی۔ ان کے ساتھ شاہ جمائیگری تھے۔  
 نیل نے دور ہی سے شاہ جمائیگری کو دیکھ لیا تھا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کی طرف بڑھنا چاہتے تھے کہ ان ساتھ بابا جان کو دیکھ کر وہ قدرے خائف سے ہو گئے اور دوبارہ بیٹھ کر آسیہ کو متوجہ کرتے ہوئے بولے۔  
 ”پھوپھو! شاہ پور سے لوگ آرہے ہیں۔“

آسیہ نے چونک کر سر اٹھا لیا تو اس کی پہلی نظری بابا جان پر پڑی تھی۔ گو کہ اس سے پہلے اس نے انہیں نیل دیکھا تھا پھر بھی وہ انہیں پہچان سکتی تھی۔ اونچا شملہ سر پر سجائے اس وقت وہ بہت کمزور لگ رہے تھے۔ ان چال بھی بہت وہمی تھی۔ اس نے بہت خاموشی سے انہیں اپنے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا پھر سرگوشی میں نیل سے بولی۔  
 ”گھر چلو نیل! اذان ہو رہی ہے۔ نماز گھر میں پڑھوں گی۔“

بابا جان نے بہت چاہا کہ وہ ایک نظری شاہ سکندر کو دیکھ لیں لیکن ڈاکٹر نے اجازت نہیں دی۔ تب وہ بہت مایوس ہو کر اس جگہ آ بیٹھے تھے جہاں کچھ دیر پہلے آسیہ بیٹھی تھی اور وہ تو نہیں البتہ شاہ جمائیگری آسیہ کو دیکھ چکے تھے اس لیے بابا جان کے ساتھ بیٹھے ہوئے انہوں نے اشارے سے علی سے پوچھا کہ آسیہ کہاں گئی۔ جواب میں انہوں نے لا علمی کا اظہار کیا تھا۔  
 ”کون لایا تھا سکندر کو یہاں؟“ بابا جان نے علی کو دیکھ کر پوچھا تو وہ بہت سنبھل کر بولا۔

”جانتا نہیں بابا جان۔“  
 ”تمہیں کیسے خبر ہوئی تھی؟“  
 ”میرے پاس فون آیا تھا۔ رات ایک بجے کے قریب کہ شاہ سکندر کو انیک ہوا ہے اور وہ کارڈیو میں ہیں۔ بہر اتنا سن کر ہی میں بھاگا چلا آیا۔ پھر ڈاکٹر نے ان کی کنڈیشن معلوم کرنے کے بعد میں نے آپ کو فون کیا تھا۔“  
 پورے دھیان سے بابا جان کی طرف متوجہ تھا تاکہ ان کی ہر بات کا جواب دے سکے۔

اس کے گھر میں خبر ہے، مہرا النساء اور بچوں کو؟“ بابا جان نے سوچتے ہوئے انداز میں پوچھا۔  
 ”میرا خیال ہے کہ نہیں۔ اگر ہوئی تو مہرا النساء بچی یہاں موجود ہوتیں۔“  
 ہوں۔“ بابا جان ہنکارا بھر کر خاموش ہو گئے پھر قدرے توقف سے پوچھنے لگے۔  
 ”اکثر کیا کہتے ہیں؟“

”جہا نکیر نے کوئی جھوٹی اس دلائے کے بجائے خاموشی اختیار کر لی۔  
 جاؤ معلوم کرو ڈاکٹر سے۔ اگر اس کے بس میں نہیں ہے تو ہم باہر لے جاتے ہیں سکندر کو۔ جاؤ جمائیگری تمہا بات۔“ بابا جان کو علی کی خاموشی بری طرح کھٹکی تھی۔

”میرے بابا جان! صبر سے۔ ایسی حالت میں ہم سکندر کو کہیں نہیں لے جاسکتے۔ دیئے اس طرف سے آپ ان رہیں۔ یہاں بہت قابل ڈاکٹر موجود ہیں۔“ شاہ جمائیگری نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔  
 ”قابل ڈاکٹر ہمیں دیکھنے کیوں نہیں دے رہے۔“ بابا جان ٹوٹ رہے تھے۔ ”ایک نظر ہمیں ہمارے بچے کو بہت ناراض ہو کر آیا تھا وہ ہم سے ہمیں اسے منالینے دو۔“  
 بابا جان! بابا جان پلیز۔“ علی جمائیگری نے انہیں کندھوں سے تھام لیا۔ ”حوصلے سے کام لیں، چچا جان ٹھیک ہوں گے۔“

”ٹھیک ہوتا ہے اسے۔ اس کی بیٹی کی شادی سر پر کھڑی ہے۔ جاؤ، بناؤ اسے ہم آئے ہیں۔ اس کی بیٹی کو ت کرانے۔“ بابا جان کچھ دم لاچار بوڑھے نظر آنے لگے تھے۔  
 ”جہا نکیر کے لیے وہاں ٹھہرنا مشکل ہو گیا تو آہستہ سے ان کے کندھوں سے ہاتھ ہٹا کر دھیرے دھیرے کھسکتا ہداری میں نکل آیا۔ لیکن اس کا دھیان ابھی بھی بابا جان کی طرف تھا۔ بڑے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کرنے اب تقدیر کے سامنے کس قدر بے بس ہو گئے تھے۔ سب آن بان شان دھری رہ گئی تھی۔

”ناراض نہ بھٹائیوں نہیں۔  
 تقدیر کے آگے کوئی تدبیر نہیں چلتی۔  
 رو خدا سمجھنے والے بھول جاتے ہیں کہ ایک دن خدا کے سامنے جانا ہے۔  
 رخصتو بڑا بے نیاز ہے اور اسی قدر باخبر۔  
 اسے کچھ پوشیدہ نہیں۔  
 سب دیکھتا ہے سب جانتا ہے۔

”انسان کس زعم میں ہے۔ سمجھتا ہی نہیں لیکن کب تک وہ ایک حد تک ہی دراز کرتا ہے۔  
 اس کے لیے کچھ مشکل نہیں۔ چاہے تو اولین لمحوں میں ہی گرفت کرے، لیکن وہ بندوں کو موقع دیتا

”کی شان ہے  
 اس شان والے سے کون لڑے گا ہے  
 میں  
 کے سامنے سب بے بس ہیں۔

”ان لیتا ہے اور کوئی نہیں مانتا اور جو نہیں مانتا اس سے وہ یوں منواتا ہے۔  
 یہی سوچتا ہوا ہر نکل کر آیا تو اس کا دل چاہا یہاں سے کہیں بہت دور چلا جائے جہاں نہ کوئی بے بس ہو نہ بالاختیار۔ سب کے دکھ سکھ ایک جیسے ہوں۔ شاید بابا جان کی بے بسی پر اسے رحم آنے لگا تھا۔ اس لیے وہ نہیں سکا اور گھر چلا آیا۔  
 بیگم اس کے بارے میں کرم دین سے سوال جواب کر رہی تھیں۔ اسے دیکھا تو اس پر ناراض ہونے

”یہ رات میں کون سی ڈیوٹی ہوتی ہے تمہاری اور مجھے جا کر نہیں جاسکتے تھے۔“

”آپ سو رہی تھیں۔“ وہ تھکا تھکا سا صوفے پر ڈھلے گیا۔

”اب تو جاگ رہی ہوں۔ اب بتاؤ کہاں سے اُڑے ہو؟“ عارفہ بیگم اس کے سر پر آن کھڑی ہوئیں۔

”کرم دین! ایک گھر پاس چائے اور ناشتے کا فن تیار کرو، جلدی۔“ اس نے پہلے کرم دین کو مخاطب کر کے کہا پھر

عارفہ بیگم کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے بولا۔

”میں رات ہسپتال میں تھا، سکندر بچا کے پاس۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”ہائیں۔ اسے کیا ہوا؟“ عارفہ بیگم پریشان ہو گئیں۔ ”بتاؤ ناں کیا زیادہ طبیعت خراب ہے؟“

”بس امی دعا کریں۔ شاہ پور سے بابا جان بھی آگے ہیں۔ وہیں ہسپتال میں ہیں ابائے ساتھ۔ میں نے رات

انہیں فون کر کے بلایا تھا۔ البتہ سکندر بچا کے گھر میں ابھی کسی کو بتا نہیں ہے۔ آپ ایسا کرس ڈرائیور کے ساتھ

مہر النساء بچی کے پاس چلی جائیں لیکن انہیں کچھ بتائیے گا نہیں، جب تک میں فون کر کے آپ کو چچا جان کی خبریت

سے آگاہ نہ کر دوں۔“ وہ جیسے سوچ سوچ کر لول رہا تھا۔

”کیا کہہ رہے ہو علی؟“ عارفہ بیگم کا دل ہولنے لگا تھا۔

”فوفہ آپ تو... بس آپ کہیں نہیں جا رہیں، میں بیٹھی رہیں۔“ وہ جھنجھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کرم دین سے

کہیں جلدی کرے میں دو منٹ میں شاور لے کر آتا ہوں۔“

”میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔“ عارفہ بیگم نے کہا، لیکن وہ اُن سنی کرتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا کیونکہ

یہ بحث کا وقت نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد وہ کمرے سے ہی کرم دین کو پکارتا ہوا نکلا تو آگے عارفہ بیگم تھرا س اور فٹن لیے کھڑی تھیں۔ اس

نے بڑی مشکل سے انہیں اپنے ساتھ جانے سے روکا اور ان کے ہاتھ سے دونوں چیزیں لے کر جلدی سے باہر نکل

آیا۔

شاہ جہانگیر راجداری میں ٹھل رہے تھے اور بابا جان پتا نہیں کہاں تھے۔ وہ ان کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں

دوڑاتا ہوا شاہ جہانگیر کو پکار کر پوچھنے لگا۔

”بابا! بابا جان کہاں ہیں؟“

”ڈاکٹر کے کمرے میں۔ تم نے ناحق انہیں بلا لیا۔ بہت پریشان ہو رہے ہیں۔“ شاہ جہانگیر نے جواب دینے کے

ساتھ کہا تو وہ گہری سانس کھینچتے ہوئے بولا۔

”پریشانی کی بات تو ہے۔ چلیں آپ بھی ادھر ہی چلیں، میں آپ کے لیے ناشتا لایا ہوں۔ کسی طرح بابا جان کو

بھی کچھ کھلا لیا دیں۔“

”تم کو شش گرد دیکھو، مجھے تو منع کر چکے ہیں۔“ شاہ جہانگیر نے کہا اور اس کے ساتھ ڈاکٹر کے کمرے میں آئے تو

آگے بابا جان بڑی عاجزی سے شاہ سکندر کو ایک نظر دیکھنے پر اصرار کر رہے تھے اور ڈاکٹر صاحب ان کے مسلسل

اصرار سے تنک ہو رہے تھے جب ہی شاہ جہانگیر کو دیکھتے ہی کھٹکے لگے۔

”پلیز! آپ انہیں گھر لے جائیں۔ جب مریض کو ہوش آئے گا تب میں خود انہیں کال کر لوں گا۔“

شاہ جہانگیر نے یوں سر ہلایا جیسے یہ نہیں جائیں گے پھر آگے بڑھ کر بابا جان کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے

بولے۔

”بابا جان! دیکھیں علی آپ کے لیے گھرے ناشتا لایا ہے۔“

”پہلے ہم سکندر کو دیکھیں گے۔“ بابا جان کی انہی ضد تھی۔

”اوکے! ایسے! ایسے! ایسے! اگر وہ اجازت دیں گے تو۔“ ڈاکٹر اکرام اللہ کہتے ہوئے اٹھ کر چلے

گئے۔ ”چلو! ہمیں لے چلو! ڈاکٹر صدیقی کے پاس۔“ بابا جان بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

آسیہ کی رات تو کارڈیو ہی میں آنکھوں میں کئی تھی پھر گھر آکر فجر کی نماز کے بعد وہیں جا نماز پر کچھ دیر کو اس کی

لہ لگ گئی تھی۔ اس کے بعد سے اب تک وہ جلے پیر کی بلی کی مانند سارے میں چکرانی پھر رہی تھی۔ کبھی اپنے

رے میں بند ہو کر نماز پچھا کر بیٹھ جاتی اور کبھی بھاگ کر فون کا ریہ پورا اٹھاتی۔

نبیل کے کتنے پر میونہ بھا بھی نے مدحیہ اور صاحت کو نیچے بلا کر کسی کام میں مصروف کر دیا تھا۔ اس لیے وہ

ن بالکل بے خبر تھیں ورنہ آسیہ کی حالت سے اگر وہ اصل بات تک نہ پہنچتیں تب بھی متوحش ضرور ہوتیں۔

پھر جانے کی کوشش بھی کرتیں اور نبیل کے لیے ان کے بے تگہ سوالوں کے جواب دیتا تھا مشکل تھا کیونکہ

کا پیاز ہن بری طرح متاثر ہوا تھا۔ خاص کر آسیہ کی پریشانی ان سے دیکھی نہیں جا رہی تھی اور مشکل یہ تھی کہ

سے تسلی بھی نہیں دے پارے تھے نہ کچھ کھانے پر مجبور کر سکے۔

دوسرے میں میونہ بھا بھی اوپر نہیں توانوں نے زبردستی آسیہ کو تھوڑا کھانا کھلایا

”کوئی فون نہیں آیا۔ پتا نہیں سکندر کیسے ہیں؟ انہیں ہوش آیا کہ نہیں۔“

”آجائے گا ہوش اور وہ ٹھیک بھی ہو جائیں گے۔“ میونہ بھا بھی اسے تسلی دیتے ہوئے کہنے لگیں۔ ”تم پہلے

نے آپ کو تو سنبھالو اگر مدحو اور صابے تمہیں اس حالت میں دیکھ لیا تو۔“

”آپ نے انہیں بتایا تو نہیں؟“ اس نے فوراً پوچھا۔

”ابھی تک تو نہیں بتایا لیکن اب بتانے جا رہی ہوں، کیونکہ کسی بھی وقت ان کا ہسپتال سے بلاوا آسکتا ہے۔“

نہ بھا بھی نے کہا تو اس نے چونک کر پوچھا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ ان کے دادا کہہ سکتے ہیں کہ بچوں کو باب کے پاس ہونا چاہئے اور ایسی حالت میں ہم منع بھی

کر سکتے یا تم منع کرو گی؟“ میونہ بھا بھی نے وضاحت کر کے پوچھا تو وہ آہستہ آہستہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

پھر کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ہم پہلے سے انہیں تیار کر لیں۔ میں ابھی انہیں بلا کر بتاتی ہوں کہ۔۔۔“ دروازہ کھلنے

لواڑے میونہ بھا بھی بات ادھوری چھوڑ کر ادھر متوجہ ہو گئیں تب ہی نبیل اندر آئے اور کارڈیس آسیہ کی

بہرہاتے ہوئے بولے۔

”چھو پھو! شاہ جہانگیر آپ سے بات کریں گے۔“

آسیہ نے جھپٹنے کے انداز میں کارڈیس لے کر کان سے لگایا تھا۔

”ہیلو!“

السلام علیکم ڈاکٹر صاحبہ! کیسی ہیں آپ؟“

میں ٹھیک ہوں۔ آپ سکندر کا بتائیں انہیں ہوش آیا؟“ وہ کسی طرح اپنی بے تالی چھپا نہیں سکی۔

آپ کو بلانے کے لیے اس کا ہوش میں آنا شرط تو نہیں ہے۔ امی انی وہ بے ہوشی میں بھی آپ ہی کو پکار رہا

”شاہ جہانگیر نے کہا تو وہ کچھ بوکھلا کر میونہ بھا بھی کو دیکھنے لگی تھی۔

”بلو! ڈاکٹر صاحبہ!“ ادھر سے شاہ جہانگیر نے پکارا تب وہ سنبھل کر بولی۔

”جی فرمائیے!“

آپ آج امی پلیز! اپنے مریض کے پاس۔“ شاہ جہانگیر نے ہاتھی لہجے میں کہا۔

میں۔۔۔“ وہ کہنے جا رہی تھی کہ میں آ رہی ہوں، لیکن اچانک بابا جان کا خیال آنے پر ہونٹ بھیج گئی جبکہ

بن منتظر تھیں اور اس بار اس کی ساتویں سے جو آواز ٹکرائی وہ شاہ جہانگیر کی نہیں تھی۔

”مارے سکندر کی ہر سانس تمہیں پکار رہی ہے۔ آس تم ہی ہونا۔“

”لوں؟“ وہ بوڑھی کمزور آواز اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں الجھ گئی۔

”ہم شاہ حیات محمد۔“ بابا جان جو بیٹا اپنا نام بتاتے ہوئے فخر سے گردن اکڑایا کرتے تھے اس وقت ان کا بھرانہ سالانہ تھا۔

آسیہ کی سمجھ میں نہیں آیا وہ کیا کہے گیا کرے۔ خود کو بے بس ہی محسوس کر رہی تھی بڑی مشکل سے خود کو سہارا دے کر بولی۔

”جی شاہ صاحب! کیا چاہتے ہیں آپ مجھ سے؟“

”ہم کیا چاہیں گے وہ جو چاہئے والا ہے وہ تمہیں پکار رہا ہے۔ اس کی پکار پر آؤ گی یا ہم فریاد کریں؟“

”جی نہیں آپ کو فریاد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آ رہی ہوں۔“ اس نے جلدی سے کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا اور کارڈ لیس ایک طرف رکھ کر آنکھوں میں اتر آنے والی نمی آنکھوں سے صاف کرنے لگی۔

”کیا کہہ رہے تھے جہانگیر ہوش آگیا سکندر کو؟“ میمونہ بھابھی نے اس کی کلائی تھام کر پوچھا۔

”چتا نہیں بھابھی! کچھ بتایا نہیں انہوں نے۔ میں... میں جا رہی ہوں، نیل، مدحو اور صبا کو بلاؤ انہیں بھی لے چلیں گے۔“ وہ میمونہ بھابھی سے نظریں چرا کر بولتی ہوئی بید سے اتر گئی۔

”انہیں کیوں لے جاؤ گی؟“ میمونہ بھابھی نے ٹوکا۔

آسیہ نے کوئی جواب نہیں دیا اور نیل کو اشارہ کر کے ڈرائنگ روم میں چلی گئی تھی۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد جب وہ نیل کے ساتھ گاڑی میں آکر بیٹھی تو صبا تھیں اور مدحیہ سے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

”کیا ہوا سپا کو؟“

”کہاں ہیں وہ اس وقت؟“

”آپ کو کس نے بتایا؟“

”تم دونوں اگر اس طرح کرو گی تو میں اتار دوں گا۔“ نیل کی تنبیہ پر دونوں ایل دم خاموش ہو گئیں تو قدرے توقف سے آسیہ گردن پیچھے موڑ کر انہیں دیکھتے ہوئے بولی۔

”بیٹا! صبر اور حوصلے سے کام لو۔ تمہارے پیارے کارڈیو میں ہیں اور وہاں ان کے پاس تمہارے دادا اور چچا بھی آئے ہوئے ہیں انہوں نے ہی ہمیں بلایا ہے۔“

”دادا! یعنی بابا جان؟“ صبا تھیں خفیف نظروں سے مدحیہ کو دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا پھر آسیہ سے پوچھنے لگی۔

”مما! بابا کو ایک ہوا ہے؟“

”ہاں۔“ آسیہ نے اختصار سے کام لے کر اپنا رخ سیدھا کر لیا اور کچھ دیر آگے بھاگتی ہوئی گاڑیوں کو دیکھتی رہی۔

پھر ٹریفک سے سرٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ذہن کے پردوں پر کچھ جانے، کچھ انجانے نقوش ابھرنے لگے۔

”بیٹا! اس وقت تمہیں صرف اپنے پیارے خیال کرنا ہے انڈر اسٹینڈ۔“

”جی ممما! مدحیہ اثبات میں سر ہل کر سامنے دیکھنے لگی۔

بابا جان شاہ جہانگیر کے کندھے پر ہاتھ رکھ بہت ست روی سے اسی طرف آرہے تھے۔

”مما وہ... بابا جان آرہے ہیں۔“ مدحیہ نے دھیمی آواز میں آسیہ کو متوجہ کر کے کہا۔

”ہاں، جاؤ ملوان سے۔ صبا کو بھی لے جاؤ۔“ وہ ان دونوں کو بھیج کر نیل کو پیچھے پرہیٹنے کا اشارہ کرتی ہوئی دیر سے پلٹ کر ڈاکٹر اکرام اللہ کے کمرے میں آئی۔

”اسلام علیکم ڈاکٹر صاحب! میں ڈاکٹر آسیہ صلاح الدین۔“

”جی۔“ میں نے کل رات ہی آپ کو پہچان لیا تھا۔ آپ ڈاکٹر عبدالوہاب۔ کے پاسٹل میں ہوتی ہیں۔“

”آپ کی یادداشت کی داد دینی پڑے گی ڈاکٹر صاحب! کیونکہ یہ بہت پرانی بات ہے تقریباً پندرہ سال پرانی۔“

س نے کہا تو ڈاکٹر اکرام اللہ حیرت سے بولے۔

”واقعی۔“

”جی۔“

”اور اب آپ کہاں ہوتی ہیں؟“

”اپنے کلینک میں اور اس وقت میں اپنے عزیز شاہ سکندر حیات کو دیکھنے آئی ہوں۔“ اس نے رسمی گفتگو مختصر کر کے اپنی آمد کا مقصد بیان کر دیا۔

”ہاں۔ رات آپ شاہ سکندر کے ساتھ آئی تھیں۔ وہ آپ کے عزیز ہیں؟“

”جی۔ اب کیسے ہیں وہ؟“

”بہتر تو نہیں کہہ سکتا بہر حال خطرے سے باہر ہیں۔“ ڈاکٹر اکرام اللہ اٹھتے ہوئے بولے۔

”تھینک گاڈ! وہ ان کے ساتھ باہر آئی اور پھر آئی سی یو کی طرف جاتے ہوئے اس نے قصداً اس طرف نہیں دیکھا جہاں بابا جان اس کی بیٹیوں کے ساتھ بیٹھے تھے، جبکہ ان کی نظریں اسی پر تھیں اور وہ محسوس بھی کر رہی تھی ہر بھی انہیں دیکھنے بغیر نکل آئی۔

شاہ سکندر کے چہرے پر آسجین مارک فٹ تھا۔ سانسون کے ساتھ ان کی بند پلکیں بہت دھیرے دھیرے رکت کر رہی تھیں۔

وہ ان کے پیروں کے پاس رک گئی اور ایک ٹک انہیں دیکھتے ہوئے بالکل غیر ارادی طور پر اس نے اپنا ہاتھ ان کے پیروں پر رکھ کر ہلکے سے دبایا تھا کہ ان کی سانسون میں لسی اس کے نام کی منک نے سارے میں پائل چا دی۔

”آس۔ آس۔“

اس کے احساسات پر نرم نرم پھوار پڑنے لگی تھی۔

انسان فانی ہے روح کو فنا نہیں اور جو روح میں بس جائے اس کے لیے کوئی دروازہ بند نہیں ہوتا۔

زندگی کے ساتھ وقت خواہ کتنی آنکھ پھولی پھیل لے، روح کی گرد کو بھی نہیں پاسکتا۔

یہی کہا تھا ناں میں نے۔ یہی سچ ہے اب وقت ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ہم اس کی آنکھ پھولی سے بہت آگے نکل آئے ہیں جہاں دنیاوی بندھن کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

اے میری روح کے امین۔ اس نے ایک بار پھر ان کپاؤں دیا تھا۔

شاہ سکندر کی آنکھیں ذرا سی کھلیں اور پھر نظریں اس دفائی دیوی پر جم گئیں۔

کتنے لمحے سرک گئے۔ درمیان میں کوئی پردہ حائل نہیں تھا۔ جانے کون سی دنیا کے دروازے پر تھے۔

”آس! آس! شاہ سکندر کی آواز واضح تھی۔

وہ چونکنے کے ساتھ جیسے ہوش میں آگئی۔ تب ہی اپنے سر پر ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔

”کون؟“ اس نے ذرا سی گردن موڑی اور اپنے ساتھ بابا جان کو کھڑے دیکھ کر سن سی ہو گئی۔

بابا جان نے آہستہ سے اس کا سر تھکا پھر شاہ سکندر کو آنکھیں بند کرتے دیکھ کر عاجزی سے بولے تھے۔

”ہم سے روٹھو مت سکندر! ہم تمہاری خوشی پوری کرنے آئے ہیں۔ تمہاری بیٹی کو بہت شان سے رخصت

کرا کے لے جائیں گے۔ سن رہے ہوں نا۔“ شاہ سکندر سب سن رہے تھے لیکن انہوں نے آنکھیں نہیں

کھولیں کیونکہ بند پلکوں کے اندر آنے والے دنوں کا بڑا حسین تصور تھا جس کی دلکشی ان کے چہرے کا احاطہ

کر رہی تھی۔

♥ ♥ ♥ ♥

”نیل بھائی! آپ کو ماما بلارہی ہیں۔“ صبا تھیں نے نیل کے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔

”کہاں ہیں پچھو۔“ نیل اٹھ کھڑے ہوئے۔

”اپنے کمرے میں۔“

”چلو۔“

”مجھے نہیں آپ کو بلایا ہے، آپ جائیں۔“ وہ کتابوں کے ریک کی طرف برحق ہوئی بولی۔  
”اچھا دیکھو ابھی یہاں سے کوئی کتاب مت اٹھانا۔“ نیل اسے تنبیہ کرتے ہوئے اپنے کمرے سے نکل کر آسیر کے کمرے میں آگئے۔

”جی پھوپھو۔“

آسیر جانے کس خیال میں تھی چونک کر انہیں دیکھا پھر اپنے برابر اشارہ کرتی ہوئی بولی۔

”آؤ بیٹا بیٹھو۔ کوئی ضروری کام تو نہیں کر رہے تھے؟“

”نہیں پھوپھو۔“ نیل بیٹھ گئے۔ ”آپ کو کوئی کام ہے تو بتائیں۔“

”کام تو نہیں ہے البتہ ضروری بات کرنی ہے۔“

”جی۔“ نیل پوری طرح متوجہ ہو گئے تو کچھ دیر رک کر وہ کہنے لگی۔

”یہ اس روز کی بات ہے جس دن شاہ سکندر کو ہارٹ انیک ہوا تھا۔ اس وقت وہ میرے پاس آئے تھے۔ مدیہ کا رپوئل لے کر شاہ تیور غالباً ان کا بھتیجا ہے لیکن میں نے انہیں منع کر دیا تھا کیونکہ میں جانتی تھی کہ تم مدیہ کو پسند کرتے ہو۔“

نیل کے ہونٹوں پر مسرہمی مسکراہٹ نے چھب دکھائی تھی جس سے آسیر مطمئن ہو کر بولی۔

”تم پر کوئی زبردستی نہیں ہے بیٹا اور نہ ہی تم اسے میری خواہش سمجھ کر پوری کرنے کی سوچنا۔ تم صرف اپنا سوچو۔“

”آپ نے مدیہ سے پوچھا ہے وہ کیا چاہتی ہے۔“ نیل نے اس کی یہ بات آن سنی کرتے ہوئے پوچھا تو وہ بے اختیار بولی تھی۔

”وہ تمہیں چاہتی ہے۔“ پھر فوراً ہی احساس بھی ہو گیا تو بات بناتے ہوئے بولی۔ ”میرا مطلب ہے میں نے اس سے نہیں پوچھا اور نہ پوچھوں گی کیونکہ وہ اپنے بارے میں بہتر فیصلہ نہیں کر سکتی، مجھے یقین ہے کہ وہ میرے فیصلے سے اختلاف بھی نہیں کرے گی۔“

”پھر بھی پھوپھو! آپ اس سے پوچھ لیں۔“ نیل نے کسی خیال کے تحت کہا۔

”یہ کام تم خود کر لو۔ اس کے بعد خود تمہیں فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی۔“ آسیر نے بڑے آرام سے خود کو بری

”فیصلہ تو ہو چکا۔“ نیل نے سوچا پھر آسیر کی اجازت لے کر اپنے کمرے میں آئے تو صباحت کو خونخوار نظروں سے گھورنے لگے۔

”کیا وہ اپنے نیل بھائی؟“ صباحت واقعی ڈر گئی۔

”پھوپھو کو تم نے بتایا ہے؟“ انہوں نے ایسے ہی خونخوار لہجے میں پوچھا۔

”نہیں کیا؟“

”کہ میں مدحو کو پسند کرتا ہوں۔“

”نہیں ایمان سے میں نے نہیں۔“ وہ اپنی صفائی میں بولتی ہوئی ایک دم خاموش ہو کر ان کی بات پر غور کرنے لگی پھر چیخ پڑی۔

”ہائے نیل بھائی! ماما کو پتا چل گیا۔ سچ یہ تو بہت اچھا ہوا۔ اب آپ اور وہ مدحو بھی کچھ نہیں کر سکتی۔ بہت ایک دوسرے سے چھپایا آپ دونوں نے لیکن ممدادی گریٹ۔“

”شٹ اپ!“ نیل نے اسے خاموش کرانے کی کوشش کی۔

”کوئی شٹ اپ وہاں نہیں۔“ وہ انہیں چراتی ہوئی بھاگ گئی۔

”نیل بھائی۔“ صباحت پھر دروازے میں آکھڑی ہوئی۔

”مما کہہ رہی ہیں مجھے باپٹل لے جائیں بیبا کے پاس۔“

”کیوں وہاں مدحو ہے تو۔“

”مدحو ہے تو ایسا مطلب۔ مجھے نہیں جانا چاہئے اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے، مجھے باباجان نے بلایا ہے ابھی ماما کے پاس ان کا فون آیا تھا۔“ وہ نفسیلت ہٹانے لکھڑی ہو گئی۔

”اچھا چلو تم میں آ رہا ہوں۔“ وہ اسے لوگ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

کچھ دیر بعد جب وہ صباحت کے ساتھ شاہ سکندر کے پاس پہنچے تو انہیں کمرے میں مدیہ نظر نہیں آئی جبکہ تمام راستے وہ اس کے بارے میں سوچتے آئے تھے تب ہی کچھ بے چین سے ہو گئے اور شاہ سکندر سے مصافحہ کرتے ہوئے بے اختیار ان سے پوچھ لیا۔

”مدیہ کہاں ہے؟“

”مدیہ ابھی تو نہیں تھی۔“ شاہ سکندر نے باباجان کو دیکھا۔

”کون مدیہ؟ وہ مہر النساء کے ساتھ بیچے اسٹور تک گئی ہے ابھی آتی ہوگی، تم بیٹھو بر خودارٹ باباجان نے ان کے لیے اپنے برابر جگہ بنائی تو بیٹھے ہوئے ان کی نظر صباحت پر پڑی جو انہیں دیکھ کر شرارت سے مسکرا رہی تھی۔

”ننان سینس“ وہ اسے ٹھور کر فوراً ”شاہ سکندر کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”اب کیسی طبیعت ہے انکل آپ کی؟“

”پہلے سے بہتر۔“ شاہ سکندر نے مسکرا کر کتاب ہی مدیہ آگئی اس کے پیچھے مہر النساء تھی جسے دیکھ کر نیل اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر بولے۔

”السلام علیکم۔“

مہر النساء جواب دینے کے بجائے شاہ سکندر کو دیکھنے لگی تو ان سے پہلے صباحت بول پڑی۔

”یہ نیل بھائی ہیں آئی! ہمارے سب سے بڑے ماموں کے سب سے بڑے بیٹے۔“

”اچھا اچھا علیکم السلام۔“ مہر النساء نے اب جواب دیا تو مدیہ بے ساختہ ہنسی پھر فوراً ”ہونٹوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

”بس چلتا ہوں، صبا کو چھوڑنے آیا تھا اور ہاں مدحو تم چلو میرے ساتھ۔“ انہوں نے آخر میں ایک دم مدیہ کو مخاطب کر کے کہا تو صباحت نے بھی فوراً ”ان کی تائید کی۔

”ہاں مدحو! تم جاؤ نیل بھائی کے ساتھ بیبا کے پاس اب میں رہوں گی۔“

”نہیں نہیں۔“ مدیہ نے اسی قدر کہا تھا کہ باباجان ہاتھ اٹھا کر بولے۔

”باری باری ادھر الماس آنے کو تیار ہے۔ ویسے اب تین چار دنوں کی بات ہے ہجر انشاء اللہ سکندر گھر جائے گا تو سب مل کر اس کی سیوا کر لینا۔ کیوں سکندر؟“

”جی!“ شاہ سکندر اثبات میں سر ہلا کر مدیہ اور نیل کو دیکھنے لگے۔ اچانک انہیں آسیر کی بات یاد آئی تھی، جب ہی کچھ کھوسے گئے تھے۔

”اوکے انکل!“ نیل مصدفے کے لیے شاہ سکندر کی طرف ہاتھ بڑھا کر پوچھنے لگے۔

”آپ کی اجازت سے مدیہ کو لے جاؤں۔“

”ہاں ضرور۔“ شاہ سکندر نے ان کا ہاتھ تھام کر کہا۔

”تھینک یوس۔“ نیل نے ان کا شکریہ ادا کر کے باباجان سے معافہ کیا پھر مدیہ کو ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آئے۔

رانداری میں انہوں نے اپنے قدموں کی رفتار آہستہ کر لی تھی پھر بھی انتہام تک پہنچ گئے تھے تب مدیہ آتی ہوئی نظر آئی تو انہوں نے رک کر اس کا انتظار کیا پھر اسے ساتھ لے کر باہر آئے تھے۔

”تین چار دن کی تو بات تھی میں رہ جاتی بیبا کے پاس۔“ گاڑی میں بیٹھے ہی مدیہ نے انہیں سنا کر کہا۔

انہوں نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا خاموشی سے گاڑی اشارت کر کے آگے بڑھا دی تو وہ سامنے سے کیسٹ اٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی پھر اسے رکھ کر دو سرا کیسٹ اٹھایا پھر تیسرا آخر میں مایوس سی ہو کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی تھی۔

نیل وقفے وقفے سے مر میں اس پر نظر ڈال رہے تھے اس کے رخ موڑنے پر انہوں نے ایک کیسٹ لگا کر آن کر دیا۔

دل نے یہ کہاتے دل سے  
محبت ہو گئی ہے تم سے

میری جان میرے دلیر میرا اعتبار کرو  
بتنا ہے قرار ہوں میں خود کو بے قرار کرو

نیل نے تو بونہی ایک کیسٹ اٹھا کر لگا دیا تھا اب یہ اتفاق تھا کہ گانے کے بول ان کے جذبوں سے ہم آہنگ بلکہ ترجمانی بھی کر رہے تھے۔ اور یہ حسین اتفاق انہیں برا بھلا لگ رہا تھا جب ہی ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ اس موڈ میں نہیں تھے بلکہ کچھ اور ہی سوچے بیٹھے تھے۔

اب یہ نیل بھائی کو کیا ہو گیا ہے۔ اس نے اپنی شور مچانی دھڑکنوں سے پریشان ہو کر سوچا۔ پھر بہت ہمت کر کے اپنا رخ سیدھا کیا اور ایکسٹ آف کر دیا تو ایک دم خاموشی چھا جانے پر نیل نے گردن موڑ کر اسے دیکھا لیکن بولے کچھ نہیں۔

اور دوبارہ ونڈا اسکرین پر نظریں جمادیں۔

کچھ راہ نہ خاموشی میں کٹ گیا پھر باہر دیکھتے ہوئے وہ چونک کر پوچھنے لگی۔

”یہ آپ کس طرف جا رہے ہیں؟“

نیل پتا نہیں کیوں خاموش تھے۔

”نیل بھائی!“ وہ ان کا بازو ہلانے لگی ”کہاں جا رہے ہیں؟“

”گھر۔۔۔ گھر۔۔۔ پر۔۔۔ گھر۔۔۔“ عجیب جواب تھا وہ الجھ گئی۔

”کیا مطلب؟“

”کتے حصوں میں بنا ہوا ہوں میں پتا نہیں میری جڑیں کہاں ہیں، کہیں بھی مضبوطی سے قدم جما کر کھڑا نہیں ہو سکتا۔“ نیل بولنا شروع ہوئے تھے کہ خاموش ہونے کے ساتھ ہی گاڑی بھی روک دی۔ تو وہ گھر دیکھ کر بولی۔

”ارے یہ تو بڑے ماموں کا گھر ہے۔“

”ہاں میرے باپ کا گھر اسے میں اپنا گھر نہیں کہتا جیسے تم اپنے باپ کے گھر کو اپنا گھر نہیں کہتیں یہ ایک قدر مشترک ہے ہم میں۔“ نیل نے کہہ کر ایک نظرات سے دیکھا پھر گاڑی آگے بڑھا دی۔

وہ ان کی بات میں الجھ گئی تھی جب ہی ٹوکا نہیں کہ وہ جاہری سے کیوں جا رہے ہیں اور ابھی وہ ٹھیک سے کچھ نہیں پاتی تھی کہ پھر گاڑی رک گئی۔ اس بار سامنے عالیشان گھر تھا۔

”یہ۔۔۔؟“ اس کی الجھن مزید بڑھ گئی۔

”یہ میری ماں کا گھر ہے، چلو تمہیں ان سے ملو اؤں۔“ نیل کہتے ہوئے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اتر گئے۔ پھر نیل کا مٹن پیش کرتے ہوئے انہوں نے اسے دیکھا وہ خاصی حیران اور پریشان سی آ رہی تھی۔

”ارے تم تو یوں حیران پریشان ہو جیسے۔“

”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ وہ فوراً بولی۔

”بے وقوف۔۔۔“ وہ مسکرائے اور گیٹ کھلنے پر اس کا ہاتھ تھام کر اندر لے آئے۔

”سنی۔۔۔!“ لاؤنج میں رک کر انہوں نے پکارنا شروع کر دیا۔ ”رونا بھی کہاں ہیں آپ۔“

”نیل بھائی، ممی! نیل بھائی آئے ہیں۔“ سامنے کے دروازے سے ایک لڑکی بھاگتی چلاتی، دوئی آئر نیل سے ٹکرائی پھر اسے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”یہ کون ہے نیل بھائی؟“

”مدھیہ میری پھوپھو کی بیٹی اور مدھیہ میری بہن رونا ہے۔“ انہوں نے تعارف کرایا۔

”ہاؤ سوئیٹ، گلیڈ ٹو میٹ یو۔“ رونا کا حلیہ ہی نہیں لہجہ بھی انگریزی تھا۔

”ٹھیک یو۔“ وہ کچھ خائف سی، دو گئی تھی جب ہی تو ہاتھ مارا کچھ بے ہوش گئی تب ہی نیل ایک کمرے سے نکلتی

نیل بولیں۔

”نیل! کیسے ہو بیٹا! اتنے دنوں بعد آئے کہیں باہر چلے گئے تھے کیا؟“

”نہیں ممی! نہیں تھا، آپ کیسی ہیں؟“

”بالکل ٹھیک یہ لڑکی؟“ نیل اسے دیکھ کر بولیں۔

”مدھیہ ممی، پھوپھو کی بیٹی۔“

”آہ کی، ارے یہاں آؤ بیٹی میرے پاس۔“ نیل نے اسے کھینچ کر اپنے ساتھ لگایا پھر اپنے ساتھ لے کر بیٹھنے لگیں۔

”تمہاری ماں کیسی ہے؟“

”جی ٹھیک ہیں۔“

”ارے۔۔۔!“ نیل نے اس کی منمناتی آواز پر زور سے نہیں۔ ”تم تو بالکل اپنی ماں جیسی ہو۔ ڈرپوک، بزدل۔“

”کیا؟“ نیل اچھل پڑے۔ ”پھوپھو ڈرپوک بزدل نہیں ہیں ممی۔“

”تمہیں کیا پتا، اس عمر میں ایسی ہی ہوتی تھی۔ اپنے بھائیوں کے سامنے جائز بات بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔“

”لیکن یہ تو کسی سے نہیں ڈرتی ممی! بلکہ سب اس سے ڈرتے ہیں۔“ نیل نے شرارت سے اسے دیکھا۔

وہ رونا کیسی ہو کر اپنے ناخنوں سے کھیلنے لگی تھی۔ تب نیل کو اس پر رحم آیا، موضوع بدل گئے۔

”سنی! نظر نہیں آ رہا ممی۔“

”وہ اپنے باپ کے ساتھ اٹلی گیا ہے۔“

”تم نہیں جانتیں۔“ نیل نے رونا سے پوچھا تو وہ تڑخ کر بولی۔

”جہاں سنی جانے کا وہاں میں کبھی نہیں جاؤں گی۔“

”اؤں، وہ! تمہیں سنی کے ساتھ ضد میں اگلی چاہیے، جیو نا تب وہ تم سے۔“ نیل نے نرمی سے ٹوکا۔

”یہ بات آپ اسے سمجھائیں۔“

”اؤکے بابا اؤکے اسے بھی بتا دوں گا۔“ نیل کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”اچھا ممی! اجازت دیجئے۔“

”ارے ابھی تو آئے ہو، بیٹھو میں کھانا لآؤاتی، وہ۔“

”کھانا پھر سنی ابھی ہمیں آگے جانا ہے۔“ نیل نے سہولت سے کھانے کو منع کر دیا اور آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانا چاہتے تھے کہ وہ خود ہی کھڑی ہو گئی۔

”اچھا بیٹی! اپنی ماں کو میرا سلام کہنا اور تم پھر نہ بڑھو آنا۔“ نیل نے اس کے گلے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”جی۔۔۔“ وہ رونا سے ہاتھ مار کر جلدی سے باہر نکل گئی۔ تو اس کے پیچھے دیکھتے ہوئے نیل کہہ گئے۔

”ممی آپ پوچھتی تھیں تاکہ میں کس سے شادی کروں گا تو آج آپ نے اسے دیکھ لیا۔ اچھی بہنار۔“

”بہت اچھی۔“ نیل نے پہلے رونا بول دی۔ ”میں بھی آؤں گی آپ کی شادی میں۔“

”ہاں! رات ڈھل گئی۔“ بابا جان نے اباجی کو گئے وقت سے نکال کر آنے والے روشن دنوں کی نوید دے کر بٹھایا پھر کہنے لگے۔

”ہم کبھی گئے وقت کا ملال نہیں کرتے۔ ہماری نظرس ہمیشہ آنے والے وقت پر رہتی ہیں۔“

”چوتھی بات ہے جو دسترس سے نکل گیا اس کا ملال کیسا۔“ اباجی کی تائید دیکھ بھری تھی۔

آسیہ نے ذرا سی ٹپکیں اٹھا کر اباجی کو دیکھا تھا پھر بابا جان کی طرف متوجہ ہو گئی، دپو چھ رہے تھے۔

”پھر آپ نے کیا طے کیا۔ دونوں بچوں کی شادی ایک ساتھ کریں گے؟“

”جی ہاں! میں یہی چاہتی ہوں“ آگے آپ کی مرضی۔“

”ہماری کیا مرضی، ہم تو ایک عرض لے کر آئے ہیں۔“ بابا جان نے کہا تو اباجی فوراً بولے۔

”جی فرمائیے۔“

”دونوں بچوں کی شادی ایک ساتھ ٹھیک ہے لیکن ہماری خواہش ہے کہ مدیہ ہمارے گھر سے رخصت ہو۔

یعنی شاہ پور سے، ہم وہاں سے علی کی بارات لے کر آئیں گے اور صاحت رخصت ہو کر وہیں شاہ پور جائے گی پھر

اگلے روز ویسے کی تقریب کے ساتھ ہم مدیہ کی رخصتی رکھیں گے۔“ بابا جان اپنا پروگرام تکرار کرتے ہوئے

لگے۔ فوراً کسی نے جواب نہیں دیا۔ یوں بھی گفتگو صرف بابا جان اور اباجی کے درمیان ہو رہی تھی۔ اس لیے سب

اباجی کو کہنے لگے کہ وہ کیا کہتے ہیں اچھوہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولے تھے۔

”ہوں! اچھی بات ہے ایک بیٹی ماں کے گھر سے رخصت ہوگی تو ایک باپ کے گھر سے۔“

”واہ کیا پروگرام طے کیا ہے۔“ میوندہ بھابھی نے آسیہ کو کہنی مار کر سرگوشی میں کہا پھر اٹھ کر مٹھائی لینے چلی

گئیں۔

پچھوہ دیر بعد میوندہ بھابھی واپس آئیں تو مٹھائی کے ساتھ مبارک سامت کی آوازیں گونجنے لگی تھیں۔ پھر بابا

جان نے اسی وقت مدیہ کو اپنے ساتھ لے جانے کی بات کی تو آسیہ کے اشارے پر میوندہ بھابھی اسے تیار کرنے

کے لیے اوپر آگئیں۔ ”صابینا! جلدی سے ایک بیگ میں مدھو کے کچھ کپڑے رکھ دو۔“ میوندہ بھابھی نے ان کے کمرے میں داخل

ہوتے ہی کہا تو وہ حیران ہو کر بولیں۔

”کیوں مای! مدھو کہاں جا رہی ہے؟“

”شاہ پور اپنے بابا جان کے ساتھ۔“

”کیوں مای! میں نہیں جا رہی۔“ اس نے احتجاج کیا تو میوندہ بھابھی آگے جا کر اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر

بولیں۔

”بیٹا! اچھوہ دنوں کی بات ہے پھر ہم تمہیں رخصت کرا کے یہیں لے آئیں گے۔“

”بلے!“ صاحت سمجھ کر خوشگوار حیرت میں گھر گئی۔

”کیا کہہ رہی ہیں مای؟“ مدیہ کچھ عجیبی کچھ تھیں۔

”صابینا! جلدی کرو وہ لوگ جانے کو تیار ہیں۔“ میوندہ بھابھی اس کا گال تھپک کر صاحت

سے کہتی ہوئی چلی گئیں۔

”بے وقوف تمہاری شادی طے ہو گئی ہے نیل بھائی کے ساتھ۔“ عمر جانے کب سے دروازے میں کھڑا تھا۔

مدھو کی ہونٹ شکل دیکھ کر چلتا پھرتا سرف کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

”ہائے بے چارے نیل بھائی! ان کی ساری زندگی تمہیں ذرا ذرا سی بات کا مطالبہ سمجھانے گزر جائے گی۔“

”خیر! جو آگے ایک لفظ کہا تو ورنہ میں ابھی نیل بھابھی۔“

”نیا ہے تم کوئی خوشامی ہوئی ایسے ہے۔“ مٹی ہے۔“

”بولے۔“ نیل جانے کس سوچ میں تھیں اپنے آپ اثبات میں سر ہانپتے تھیں۔

”لوک تمہیں۔“ نیل نے متوجہ کیا تو دپو ٹپک کر رہی تھی۔

”اچھا بیٹا! میں تمہاری چوچہ کو فون کروں گی مجھے اپنے بیٹے کے ساتھ اس کی بیٹی بہت اچھی لگی۔“

”تھیں۔“ نیل نے منکرات ہو کر خدا کا نام لیا کہ ابابا! آج تو وہ دپو کی بیٹی تھیں۔

”یہ تمہیں ہاں ہاں۔“ نیل کا اپنی انارٹ کر کے اسے مخاطب ہے بغیر کہنے لگے۔

”یہاں میں! ایشیا! تو۔“ نیل نے اپنے ماں سے اتنی ہی محبت ہے جتنی باپ سے۔ اور اسے میں اپنی بہن

نہیں مانتا کہ مجھے باپ کے اپنے پاس رحمان ماں سے زیادہ کچھ ان دونوں سے پیہ کر جانے والی ہستی ملی۔

پھوپھو ان کی عظمتوں میں پوشہ سلام کرتے رہوں۔ انہوں نے تمہوں کے ساتھ مجھے بھی اپنی آغوش میں بڑ

دئی۔ بلکہ تم دونوں سے ہی پتہ چلتا ہے کہ باپ ساتھ تھے ان وقت ہی میں زیادہ پھوپھو ہی کے پاس ہوتا تھا

اور اب وقت نے میری آزمائش کی کہ مجھے ماں باپ اور پھوپھو میں۔ انتخاب کرنا پڑا تو میں پھوپھو کا اختیار

کروں گا۔

بہر حال ایسا وقت خدا کرے کبھی نہ آئے کہ مجھے انتخاب کرنا پڑے۔ زندگی جس ڈگر پر چل رہی ہے یہی ٹھیک

ہے۔ میں ہمیشہ پھوپھو کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں ایک سعادت مند بیٹی کی طرح لیکن اس گھر میں نہیں۔ وہ اباجی

گھر ہے اور میری ماں جیسی پھوپھو نے ہماری خاطر اپنی زندگی اپنے اباجی کے گھر گزار دی لیکن ابھی بہت زندگی با

تہ۔ ان کا بیٹا اس قابل ہو گیا ہے کہ انہیں اپنا گھر دے سکے۔ ہاں؟“ انہوں نے اسے گم سم حالت سے

نکالنے کی خاطر تائید چاہی تو گہری سانس کے ساتھ اس نے سر جھکا دیا۔

”جانتی ہو آج پھوپھو نے مجھ سے کیا کہا۔؟“ وہ آہستہ سے اس کے کندھے سے اپنا کندھا ٹکرا کر بولے۔ ”م

وہ اپنی سر پھری بیٹی کی شادی مجھ سے کرنا چاہتی ہیں۔“

”میرے خدا! اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

”اور میں ان کی بات تو نہیں ٹال سکتا۔“ انہوں نے کن اکھیں اسے دیکھا۔

”کیوں کیوں نہیں ٹال سکتے؟“ وہ ایک دم چیخ گئی۔

”مجھو رہی ہے۔“

”کوئی مجھو رہی نہیں! آپ چاہیں تو صاف منع کر دیں۔“ وہ ساری محبتیں بھول کر ان کا بازو جھنجھوڑ کر بولی تھی۔

”اور اگر میں نہ چاہوں تو۔؟“ وہ ایک جھپٹے سے گاڑی روک کر براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ کر

مسکرائے تو وہ بری طرح سیٹھا گئی۔

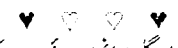
”آہ! آپ۔۔۔ بہت۔۔۔“

نیل نے آہستہ سے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔

”برا نہیں ہوں میں۔“

”اچھے بھی نہیں ہیں۔“ وہ کہہ کر رخ موڑ گئی۔

تو نیل نے شاید زندگی میں پہلی بار قہقہہ لگایا تھا۔



شاہ سکندر دسپارچ ہو کر گھر آگئے تھے اور اگلے ماہ انہیں بائی پاس کے لیے امریکہ جانا تھا اس لیے اس سے پہلے

ہی مدیہ اور صاحت کی شادی طے کرنے کے لیے شاہ سکندر اور شاہ جانیگر بابا جان کو بھی اپنے ساتھ لے آئے

تھے۔ جنہیں دیکھ کر اباجی بے اختیار رو لے تھے۔

”بہت دیر گزری۔“



”ارے ارے۔۔۔“ عمر نے فوراً ”ٹوکا“ بھائی مت کہہ دینا نکاح ٹوٹ جائے گا۔“  
 ”کہوں گی ایک بار نہیں سو بار کہوں گی۔ نبیل۔۔۔!“ بے ساختہ بولتے ہوئے اس کی زبان تالو سے چپک  
 گئی۔  
 ”ہاں ہاں بولو آگے بولو۔“ عمر اکسانے لگا۔  
 ”تمہارا سہ۔“ اس نے تکیہ اٹھا کر عمر کے سر پر دے مارا تو وہ زور زور سے ہنسنے لگا، تب ہی ثوبیہ بھاگتی  
 آئی۔  
 ”چلو ہمیں مدحو صبا نیچے سب بار ہے ہیں۔“

”مجھے بھی۔“ صبا حث نے اپنی طرف اشارہ کیا۔  
 ”کیوں تمہارا پردہ ہے سب سے؟“ عمر نے کہا تو وہ اسے دھکیل کر سب سے آگے چل بڑی لیکن ڈرائنگ  
 میں داخل ہوئے کی ہمت نہیں ہوئی وہیں رک کر انتظار کیا پچھد جیہ اور عمر کے ساتھ اندر داخل ہوئی تھی۔  
 ”او بیٹا!“ آسیہ اور شاہ سکندر بیٹیوں کو دیکھ کر ایک ساتھ اپنی اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے نئے اور دونوں ہی  
 ہاتھ ان کی طرف برصائے تھے بالکل بے اختیاری حرکات تھیں جس نے سب کو اپنی اپنی جگہ جیسے ساکت کر  
 دیا۔

مدحیہ اور صبا حث نے بہت خاموش نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر دھیرے دھیرے چلتی، دوئیں صبا  
 آسیہ اور مدحیہ شاہ سکندر کے پہلو میں رکی تو ساکت و چوریکدم مختصر ہو گئے تھے۔  
 ”چلو بیٹا۔“

”اجازت دیجئے۔“  
 ”انشاء اللہ جلد ملیں گے۔“ مختلف آوازیں گونج رہی تھیں ساتھ گنگے مل رہے تھے اور ان گنگے ملنے لوگوں۔  
 درمیان وہ ندی کے دو کنارے ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ ان کے اندر اب گئے وقتوں کا ملال نہیں  
 تھا بلکہ آئے وقتوں کا حسین تصور جہاں ان کی اولاد کی خوشیاں رقص کر رہی تھیں۔ جن کی دھمک انہیں اب  
 سے اپنے دل پر محسوس ہو رہی تھی۔

اور وہ دل جس میں محبت گھر کرے وہ پھولوں کی بستی اجاڑنے والے اسے خواہ کتنا ہی اجاڑ لیس وہ سدا مسک  
 رہتی ہے۔  
 ”کیونکہ۔۔۔“  
 ”محبت کبھی فنا نہیں ہوتی۔“

